

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

الحمد لله الذي هدانا لهذا
 الذي كنا لنهتدي لولا
 أن هدانا الله
 والله أعلم بالصواب
 سنة ١٢٤١

مكتبة جامع الزيتونة

بغداد



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ نَسْتَعِينُكَ يَا رَبَّنَا فِي كِتَابِنَا بِمِثْلِ كِتَابِكَ

ایضاح البیان



جلد اول

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال کی مستند اور کامیاب شرح، اکابر کی تحقیقات اور تمام شروح کا عطر، تراجم البواب پر محققانہ کلام زندہ اسلوب کیساتھ پہلی بار اردو زبان میں۔

از وفادار

فخر الاسلام، امین شیخ الہند و وارث اور شاہ، جانشین شیخ الاسلام
حضرت مولانا سید فخر الدین احمد رضا نورانی

مرتب : مولانا ریاست علی بجنوری — مدرس دارالعلوم دیوبند
مراجع : مولانا القمان الحق فاروقی مرحوم — سابق مدرس دارالعلوم دیوبند

مکتبہ تبیین قادیان دیوبند

111882

انتساب

پھوپھا جان حضرت مولانا سلطان الحق ذاکر فاروقی (المتوفی: ۱۴۰۷ھ)
سابق ناظم کتب خانہ دارالعلوم دیوبند، اس دنیائے آب و رنگ میں راقم کے لیے
حقیقی مسبب الاسباب کے بعد سب سے بڑے مربی تھے، اس سلسلے میں انہیں
جن جانکا ہیوں کا سامنا کرنا پڑا انہیں خداوند قدوس بہتر جانتے ہیں۔
اس موقع پر اپنی اس متاع حقیر کو انہیں کے نام سے منسوب کرتا ہوں۔

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ

ریاست علی بجنوری کان اللہ

تفصیلات

جملہ حقوق بحق مکتبہ مجلس قاسم المعارف دیوبند، یو، پی محفوظ ہیں

ایضاح البخاری جلد اول	نام کتاب
فخر الحدیث حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب سابق صدر المدرسین و شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند و صدر جمعیت علماء ہند	افادات
۱۴۳۰ھ، مطابق ۲۰۰۹ء	طبع سوم
ریاست علی بجنوری	ترتیب
مولانا القمان الحق فاروقی مرحوم و مغفور	مراجعت
محمد امجد العظمیٰ مٹوی	کمپوزنگ
۳۵۰/-	قیمت مجلد
پانچ سو تین (۵۰۳)	صفحات
ایک ہزار	تعداد

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ عرض ناشر ﴾

الحمد لله وكفى وسلام على عباده الذين اصطفى! قارئین کرام کو معلوم ہے کہ ایضاح البخاری ابتدا میں قسط وار لیتھو پر طبع ہوتی تھی، پھر دس سال پہلے اس کو جلدوں کی صورت میں آفسیٹ پر طبع کیا گیا، اور اب الحمد للہ ان جلدوں کو مندرجہ ذیل خوبیوں کے ساتھ طبع کیا جا رہا ہے۔

۱- اس ایڈیشن کی کتابت کمپیوٹر کے ذریعہ کرائی گئی ہے کہ اب اس کو پسند کیا جا رہا ہے۔

۲- کتاب کا سائز $\frac{26 \times 20}{8}$ کے بجائے $\frac{30 \times 20}{8}$ کر دیا گیا ہے کہ اس سائز کا ہر طرح کا کاغذ بازار میں

ہمہ وقت دستیاب ہے۔

۳- صحیح بخاری کی تمام عربی شروح میں فؤاد عبد الباقی مرحوم کی ترقیم کے مطابق احادیث پر نمبرات ڈالے

جا رہے ہیں، ایضاح البخاری میں بھی احادیث پر وہی نمبر ڈال دئے گئے ہیں، اس سے مطالعہ کرنے والوں کو انشاء اللہ سہولت ہوگی۔

۴- ہر حدیث کے بارے میں اس نشاندہی کا اہتمام کیا گیا ہے کہ یہ حدیث جزوی یا کلی طور پر صحیح بخاری میں

کہاں کہاں آئی ہے، اگر وہ حدیث گذر گئی ہے تو (گذشتہ:) لکھ کر حدیث نمبرز ذکر کیا گیا ہے، اور اگر آئندہ آرہی ہے تو (آئندہ:) لکھ کر نمبرات دئے گئے ہیں، یہ کام صحیح بخاری کے جدید مصری ایڈیشنوں میں ہو چکا ہے، مطالعہ کرنے والوں کی سہولت کے لیے اس کو ایضاح البخاری میں دے دیا گیا ہے۔

۵- تمام جلدوں کے صفحات برابر کر دئے گئے ہیں اور ہر جلد تقریباً پانچ سو صفحات کی ہے، اس لیے سابقہ

مطبوعہ چار جلدوں کے صفحات میں ضروری رد و بدل کیا گیا ہے۔

۶- کتاب کو تا بمقدور بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کی گئی ہے، تصحیح کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، کاغذ، طباعت اور

جلدوں میں بہتر معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جن احباب نے ان امور کی تکمیل میں تعاون فرمایا، ہم ان کے شکر گزار ہیں، اور بارگاہ خداوندی میں دست بدعا

ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کرم فرماؤں، مرتب اور ناشر کو اجر جزیل عطا کرے۔ آمین

فہرست مضامین ایضاح البخاری جلد اول

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	فہرست مضامین		۲۳	رواۃ حدیث میں جرح و انتقاد کی ضرورت	۳۲
۲	عرض مرتب	۱۵	۲۳	بخاری کی راہ عمل	۳۳
۳	حضرت الاستاذ رحمہ اللہ	۱۷	۲۵	اپنی ذات کے بارے میں امام کا طریقہ	۳۳
۴	سلسلہ نسب	۱۷	۲۶	ذریعہ معاش اور اس میں احتیاط کا پہلو	۳۴
۵	خاندانی روایات	۱۷	۲۷	صبر و تحمل کی واردات	۳۵
۶	آباء و اجداد	۱۸	۲۸	جذبہ ایثار و اخلاص	۳۵
۷	ولادت اور ابتدائی تعلیم	۱۸	۲۹	سنت کے ساتھ شغف	۳۶
۸	تعلیم کے لئے رحلت	۱۹	۳۰	شوق عبادت اور اس میں استغراق	۳۷
۹	دور امتحانات	۱۹	۳۱	تواضع اور بے نیازی	۳۷
۱۰	دارالعلوم میں تشریف آوری	۲۰	۳۲	امام کی بے پناہ شہرت	۳۸
۱۱	دور تدریس	۲۱	۳۳	امام کی قوت حافظہ اور اس کے امتحانات	۳۹
۱۲	جذبہ ایثار و اخلاص	۲۲	۳۴	امام کے متعلق علماء سلف و متاخرین کی آراء	۴۰
۱۳	قیادت دارالعلوم	۲۲	۳۵	امام بخاری کا ادب اور منظوم کلام	۴۱
۱۴	سیاسی زندگی	۲۲	۳۶	امام علیہ الرحمہ کا مسلک	۴۲
۱۵	علمی و سیاسی مقام	۲۳	۳۷	سائخہ وفات	۴۲
۱۶	وفات	۲۳	۳۸	تصانیف امام بخاری علیہ الرحمہ	۴۳
۱۷	سوانح امام بخاری	۲۵	۳۹	کتاب الوحی	
۱۸	نام و نسب	۲۶	۴۰	باب کیف کان بدء الوحی الخ	۴۹
۱۹	تاریخ ولادت اور اس کی خصوصیات	۲۷	۴۱	آغاز کتاب میں امام بخاری کا انوکھا انداز	۴۹
۲۰	ایام طفولیت و تعلیم و تربیت	۲۷	۴۲	توضیح اشکال	۴۹
۲۱	طلب علم کے لئے امام کے اسفار	۲۹	۴۳	جوابات	۵۰
۲۲	علم علل احادیث میں امام کی انفرادی شان	۳۱	۴۴	حضرت شیخ الہند کا ارشاد	۵۱

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۶۳	علامہ عینیؒ کی اپنی رائے	۶۷	۵۲	ذکر وحی سے کتاب کے آغاز کی وجہ	۴۵
۶۳	حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد کہ عالم ایک شخص اکبر ہے	۶۸	۵۲	دوسرے محدثین کرام کا انداز	۴۶
۶۳	دور شباب	۶۹	۵۲	امام بخاری علیہ الرحمہ کا افتتاحیہ	۴۷
۶۳	عہد ماضی کا تذکار	۷۰	۵۲	حضرت علامہ کشمیریؒ کی رائے گرامی	۴۸
۶۳	تائید شباب	۷۱	۵۳	مقصد ترجمہ	۴۹
۶۵	حمیدیؒ کی وجہ تقدیم	۷۲	۵۳	ایک عام طریقہ، امام بخاریؒ کا طریق ترجمہ	۵۰
۶۶	شان ورود	۷۳	۵۳	زیر بحث ترجمہ	۵۱
۶۶	حدیث و ترجمہ کا انطباق	۷۴	۵۵	اسماعیلی علیہ الرحمہ کا اعتراض	۵۲
۶۷	حضرت علامہ کشمیریؒ کی تحقیق	۷۵	۵۵	حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا ارشاد	۵۳
۶۷	حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد	۷۶	۵۵	علامہ سندھیؒ کا جواب	۵۴
۶۸	نیت کیا ہے؟	۷۷	۵۵	علامہ کشمیریؒ کا ارشاد	۵۵
۶۸	اعمال کے ثمرات و نتائج	۷۸	۵۶	علامہ کشمیریؒ کی تائید	۵۶
۶۹	پیغمبر علیہ السلام کے اعمال	۷۹	۵۶	خاتمۃ الکلام	۵۷
۷۰	انقلاب عظیم	۸۰	۵۶	تراجم کے انطباق کی آسان راہ	۵۸
۷۰	حدیث نیت کی تقدیم کی وجہ	۸۱	۵۷	زیر بحث ترجمہ	۵۹
۷۰	حدیث کا منشا کیا ہے؟	۸۲	۵۹	حاصل کلام	۶۰
۷۳	ایک اشکال اور اس کا جواب	۸۳	۵۹	آیت کریمہ اور اس کے انتخاب کی وجہ	۶۱
۷۳	ایک فرق	۸۴	۶۰	وحی کلامی کا وزن	۶۲
۷۳	علامہ کشمیریؒ کا جواب	۸۵	۶۰	نزول وحی کی حکمت	۶۳
۷۳	دونوں جملوں کا فرق	۸۶	۶۱	حضرت نوحؑ اور ان کے بعد آنے والے	۶۴
۷۵	علامہ سندھیؒ کا ارشاد	۸۷	۶۲	انبیاء کرام کے ساتھ تخصیص کی وجہ	۶۵
۷۶	تشریح	۸۸	۶۲	دیگر علماء پر علامہ عینیؒ کا انتقاد	۶۶
				حضرت الاستاذؒ کا استدراک	۶۶

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱۱۱	مولانا عبدالرحمن صاحب امر وہوئی کی رائے	۱۱۲	۷۷	ایک نحوی اشکال	۸۹
۱۱۲	تحویل کا مقصد	۱۱۳	۷۷	صلصلۃ الجرس	۹۰
۱۱۳	جو دو سخا کا فرق	۱۱۴	۷۸	علامہ کشمیری کا ارشاد	۹۱
۱۱۴	خداوند کریم کا جو کیا ہے؟	۱۱۵	۷۹	شدت وحی کی وجہ	۹۲
۱۱۶	پیغمبر علیہ السلام کا جو	۱۱۶	۸۱	تمثیل ملک	۹۳
۱۱۷	حدیث اور ترجمہ کا ربط	۱۱۷	۸۲	ترجمہ سے حدیث کا ربط	۹۳
۱۲۳	تشریح حدیث	۱۱۸	۸۵	حل لغات	۹۵
۱۳۹	حدیث و ترجمہ کا انطباق	۱۱۹	۸۷	شرح حدیث	۹۶
۱۴۲	کتاب الایمان	۱۲۰	۸۸	اعطاء نبوت	۹۷
۱۴۳	ایمان اصطلاح شریعت میں	۱۲۱	۸۹	دبوجنے کا مقصد	۹۸
۱۴۵	ایمان کے بارے میں مختلف مذاہب	۱۲۲	۹۰	مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری کی رائے	۹۹
۱۴۸	باب قول النبی ﷺ ہنی الاسلام الخ	۱۲۳	۹۲	حضرت شاہ عبدالعزیز کا ارشاد	۱۰۰
۱۴۹	ترجمہ باب	۱۲۳	۹۳	حضرت شیخ الہند کا ارشاد	۱۰۱
۱۵۰	مقصد ترجمہ	۱۲۵	۹۶	ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ	۱۰۲
۱۵۰	اعمال کی جزئیات کا مسئلہ	۱۲۶	۹۹	ایک اشکال اور اس کا جواب	۱۰۳
۱۵۷	ایمان میں کمی زیادتی کا بیان	۱۲۷	۱۰۲	تشریح آیات	۱۰۴
۱۷۱	تشریح حدیث	۱۲۸	۱۰۲	متابعت کا فائدہ	۱۰۵
۱۷۲	امام بخاری کا مقصد	۱۲۹	۱۰۳	سب سے پہلی وحی	۱۰۶
۱۷۳	حل لغات	۱۳۰	۱۰۳	حدیث و ترجمہ کا ارتباط	۱۰۷
۱۷۴	الفاظ حدیث میں تقدیم و تاخیر کی وجہ	۱۳۱	۱۰۵	تشریح حدیث	۱۰۸
۱۷۷	باب امور الایمان	۱۳۲	۱۰۵	ایک اشکال اور اس کا حل	۱۰۹
۱۷۷	مقصد ترجمہ	۱۳۳	۱۰۸	ترجمہ سے ربط	۱۱۰
۱۷۸	ترجمہ کا آیت ذیل سے ربط	۱۳۴	۱۰۸	آیت کریمہ کا ما قبل و ما بعد سے ربط	۱۱۱

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۳۵	تشریح حدیث	۱۸۱	۱۵۷	باب حلاوة الایمان الخ	۲۱۳
۱۳۶	بضع وستون کا مطلب	۱۸۲	۱۵۸	مقصد ترجمہ	۲۱۴
۱۳۷	تشریح حدیث	۱۸۴	۱۵۹	تشریح حدیث	۲۱۵
۱۳۸	باب المسلم من سلم المسلمون الخ	۱۸۴	۱۶۰	باب علامة الایمان حب الانصار	۲۱۸
۱۳۹	الفاظ ترجمہ میں امام کا تفسیر	۱۸۵	۱۶۱	تشریح حدیث	۲۱۸
۱۴۰	تشریح حدیث	۱۸۶	۱۶۲	باب	۲۲۰
۱۴۱	زبان اور ہاتھ کی تخصیص کی وجہ	۱۸۸	۱۶۳	باب کا مقصد	۲۲۰
۱۴۲	تعلیق کا مقصد	۱۸۹	۱۶۴	تشریح حدیث	۲۲۳
۱۴۳	باب ای الاسلام الفضل	۱۹۰	۱۶۵	حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟	۲۲۵
۱۴۴	تشریح	۱۹۰	۱۶۶	باب من الدین الفوار من الفتن الخ	۲۳۱
۱۴۵	باب اطعام الطعام من الاسلام	۱۹۱	۱۶۷	حل لغات	۲۳۱
۱۴۶	تشریح	۱۹۱	۱۶۸	مقصد ترجمہ	۲۳۲
۱۴۷	الفاظ حدیث پر ایک اصولی اشکال اور اس کا حل	۱۹۲	۱۶۹	فرار کی اجازت اور اس کا حکم	۲۳۲
۱۴۸	فضیلت اعمال کے سلسلے میں جامع اصول	۱۹۳	۱۷۰	تشریح حدیث	۲۳۴
۱۴۹	باب من الایمان ان یحب لایحہ ما یحب لنفسہ	۱۹۹	۱۷۱	ترجمہ حدیث کے درمیان انطباق	۲۳۴
۱۵۰	تبدیلی عنوان کی وجہ	۱۹۹	۱۷۲	باب قول النبی ﷺ انا اعلمکم باللہ الخ	۲۳۵
۱۵۱	اختلاف اسناد	۲۰۰	۱۷۳	مقصد ترجمہ	۲۳۵
۱۵۲	تشریح حدیث	۲۰۰	۱۷۴	علامہ سندھی کا ارشاد	۲۳۶
۱۵۳	باب حب الرسول ﷺ من الایمان	۲۰۲	۱۷۵	تشریح حدیث	۲۳۷
۱۵۴	سابق سے ربط	۲۰۳	۱۷۶	مسئلہ عصمت انبیاء اور یہود و نصاریٰ کا مسلک	۲۳۸
۱۵۵	ترجمہ کا مفہوم	۲۰۳	۱۷۷	اہل سنت والجماعہ کا ارشاد	۲۳۸
۱۵۶	تشریح حدیث	۲۰۴	۱۷۸	عصمت انبیاء کرام کی اہم دلیل	۲۳۴

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱۷۹	قرآن کریم میں بیان کردہ واقعات کی حقیقت	۲۳۲	۲۰۲	تشریح حدیث	۲۸۱
۱۸۰	حضرت آدم علیہ السلام	۲۳۵	۲۰۳	باب تفاضل اہل الایمان فی الاعمال	۲۸۲
۱۸۱	حضرت آدم علیہ السلام کا دوسرا واقعہ	۲۳۸	۲۰۴	مقصد ترجمہ	۲۸۲
۱۸۲	حضرت نوح علیہ السلام	۲۵۰	۲۰۵	تفاضل کے معنی	۲۸۳
۱۸۳	حضرت ابراہیم علیہ السلام	۲۵۳	۲۰۶	نہر حیات اور اس کا اثر	۲۸۳
۱۸۴	جوابات	۲۵۶	۲۰۷	حدیث و ترجمہ کا انطباق	۲۸۳
۱۸۵	ایک آخری الزام	۲۵۹	۲۰۸	روایت کا مزید فائدہ	۲۸۶
۱۸۶	حضرت الاستاذ کا ارشاد	۲۵۹	۲۰۹	حدیث کی غرض منطوق	۲۸۶
۱۸۷	حضرت یوسف علیہ السلام	۲۶۱	۲۱۰	ایک سرسری اشکال اور اس کا حل	۲۸۷
۱۸۸	برہان رب کی حقیقت	۲۶۲	۲۱۱	حضرت الاستاذ کا رجحان	۲۸۸
۱۸۹	ایک دوسرا الزام	۲۶۳	۲۱۲	باب الحیاء من الایمان	۲۹۰
۱۹۰	اخوة یوسف کا کردار	۲۶۵	۲۱۳	حدیث کا مفہوم	۲۹۰
۱۹۱	حضرت موسیٰ علیہ السلام	۲۶۶	۲۱۴	حیاء کے کہتے ہیں؟	۲۹۱
۱۹۲	نبوت کے بعد	۲۶۷	۲۱۵	باب فان تابوا واقاموا الصلاة الخ	۲۹۲
۱۹۳	حضرت یونس علیہ السلام	۲۷۰	۲۱۶	باب اور اس کا مقصد	۲۹۲
۱۹۴	حضرت داؤد علیہ السلام	۲۷۳	۲۱۷	مفہوم حدیث کی وضاحت	۲۹۳
۱۹۵	قرآن عزیز کی آیات	۲۷۳	۲۱۸	توبہ اور اقرار شہادتین	۲۹۳
۱۹۶	اصل حقیقت	۲۷۴	۲۱۹	قرآن سے روکنے کے متعدد صورتیں اور حدیث باب	۲۹۴
۱۹۷	حضرت سلیمان علیہ السلام	۲۷۶	۲۲۰	اقامت صلوة کا مسئلہ	۲۹۷
۱۹۸	مولانا عبدالرحمن صاحب امرہوی کی رائے گرامی	۲۷۷	۲۲۱	باب من قال ان الایمان هو العمل	۲۹۷
۱۹۹	حضرت خاتم الانبیاء ﷺ	۲۷۸	۲۲۲	مقصد ترجمہ	۲۹۸
۲۰۰	باب من کفر ان یعود فی الکفر الخ	۲۸۱	۲۲۳	آیت کریمہ سے استدلال	۲۹۸
۲۰۱	مقصد ترجمہ	۲۸۱	۲۲۴	آیت کریمہ پر دو اشکال	۲۹۹

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۳۲۲	ترجمہ کا مقصد	۲۴۸	۳۰۱	دوسری آیت کریمہ، حدیث باب	۲۲۵
۳۲۲	آیت کریمہ	۲۴۹	۳۰۲	باب اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ الخ	۲۲۶
۳۲۳	اشکال کی آئینی حیثیت اور جواب	۲۵۰	۳۰۳	ترجمہ کا مقصد	۲۲۷
۳۲۳	حضرت نانوتویؒ کا ارشاد گرامی	۲۵۱	۳۰۴	حدیث شریف کی توضیح	۲۲۸
۳۲۳	ایک علمی لطیفہ	۲۵۲	۳۰۵	ترجمہ و حدیث کا ارتباط	۲۲۹
۳۲۳	باب علامات المنافق	۲۵۳	۳۰۶	باب افشاء السلام من الاسلام	۲۳۰
۳۲۳	ترجمہ کا مقصد	۲۵۴	۳۰۷	مقصد ترجمہ	۲۳۱
۳۲۵	نفاق کیا ہے؟	۲۵۵	۳۰۷	سلام کی اشاعت کے حدود	۲۳۲
۳۲۵	نفاق کی علامتیں	۲۵۶	۳۰۸	حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد	۲۳۳
۳۲۶	علامت اور علت کا فرق	۲۵۷	۳۰۹	حدیث باب	۲۳۴
۳۲۷	مفہوم حدیث پر اشکال	۲۵۸	۳۰۹	باب کفران العشیر و کفر دون کفر	۲۳۵
۳۲۹	علامت نفاق کی تعداد	۲۵۹	۳۱۰	مقصد ترجمہ	۲۳۶
۳۳۰	تین علامات میں انحصار کی وجہ	۲۶۰	۳۱۲	حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت	۲۳۷
۳۳۰	باب قیام لیلۃ القدر من الایمان	۲۶۱	۳۱۲	حدیث باب کی وضاحت	۲۳۸
۳۳۰	باب سابق سے ربط	۲۶۲	۳۱۲	زوج کے حقوق	۲۳۹
۳۳۱	لیلۃ القدر کیا ہے؟	۲۶۳	۳۱۳	باب المعاصی من امر الجاہلیۃ الخ	۲۴۰
۳۳۱	ایمان و احتساب	۲۶۴	۳۱۴	ترجمہ الباب کا مقصد	۲۴۱
۳۳۱	علامہ کشمیریؒ کا ارشاد	۲۶۵	۳۱۶	حدیث باب	۲۴۲
۳۳۲	باب الجہاد من الایمان	۲۶۶	۳۱۷	جنگ جمل اور حدیث شریف	۲۴۳
۳۳۲	باب سابق سے ربط	۲۶۷	۳۱۸	تاریخی واقعہ اور مروان کی خیانت	۲۴۴
۳۳۲	حل لغات	۲۶۸	۳۲۰	تشریح حدیث	۲۴۵
۳۳۲	مفہوم حدیث	۲۶۹	۳۲۱	مقصد سے ربط	۲۴۶
۳۳۵	درجہ نبوت و شہادت	۲۷۰	۳۲۱	باب ظلم دون ظلم	۲۴۷

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۳۴۹	حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد	۲۹۳	۳۳۵	مقدار اجر	۲۷۱
۳۵۱	بیت اللہ کا معاملہ	۲۹۴	۳۳۶	کیا تمنائے قبال تمنائے کفر ہے؟	۲۷۲
۳۵۲	بیت المقدس کے استقبال کی حکمت	۲۹۵	۳۳۶	باب تطوع قیام رمضان من الایمان	۲۷۳
۳۵۲	احوال واجداد	۲۹۶	۳۳۷	مقصد ترجمہ	۲۷۴
۳۵۵	مدینہ میں استقبال بیت المقدس کی مدت	۲۹۷	۳۳۷	تطوع اور مغفرت ذنوب	۲۷۵
۳۵۵	یہود اور اہل کتاب کی مسرت	۲۹۸	۳۳۸	باب صوم رمضان احتساباً من الایمان	۲۷۶
۳۵۶	تحويل قبلہ اور نماز عصر	۲۹۹	۳۳۸	صوم رمضان اور نوافل کی ترتیب	۲۷۷
۳۵۶	نماز ہی میں عمل تحويل	۳۰۰	۳۳۹	باب الدین یسر	۲۷۸
۳۵۷	فقہی مسئلہ	۳۰۱	۳۳۹	مقصد ترجمہ	۲۷۹
۳۵۷	بخاری کا دوسرا طریق	۳۰۲	۳۴۱	حنیفیت سم	۲۸۰
۳۵۷	باب حسن اسلام المرء	۳۰۳	۳۴۲	تشد فی الدین کا مطلب	۲۸۱
۳۵۸	باب سابق سے ربط	۳۰۴	۳۴۲	میانہ روی کی تعلیم	۲۸۲
۳۵۸	مقصد ترجمہ	۳۰۵	۳۴۳	اوقات کی تعیین	۲۸۳
۳۵۹	مفہوم حدیث	۳۰۶	۳۴۴	باب الصلوٰۃ من الایمان الخ	۲۸۴
۳۵۹	کافر کے اچھے اعمال کا حکم	۳۰۷	۳۴۵	باب سابق سے ارتباط اور مقصد	۲۸۵
۳۶۰	علامہ کشمیریؒ کا ارشاد	۳۰۸	۳۴۶	آیت کریمہ اور اشکال	۲۸۶
۳۶۲	باب احب الدین الی اللہ اذومہ	۳۰۹	۳۴۶	علامہ سندھی کا ارشاد	۲۸۷
۳۶۲	مقصد ترجمہ	۳۱۰	۳۴۶	حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد	۲۸۸
۳۶۳	ترجمہ سابق سے مناسبت	۳۱۱	۳۴۶	ایک اور اشکال اور اس کا جواب	۲۸۹
۳۶۳	مفہوم حدیث	۳۱۲	۳۴۷	کئی زندگی کا قبلہ	۲۹۰
۳۶۳	ملال کے معنی	۳۱۳	۳۴۸	آیت میں ضیاع کا مفہوم	۲۹۱
۳۶۳	دوام عمل کا فائدہ	۳۱۴	۳۴۸	تحويل قبلہ کے بارے میں شبہ کا اصل منشاء	۲۹۲

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۳۸۳	احساب کی وجہ	۳۳۷	۳۶۴	الفاظ حدیث پر ایک اشکال اور اس کا جواب	۳۱۵
۳۸۳	جنازے کے ساتھ کہاں رہنا بہتر ہے	۳۳۸	۳۶۵	باب زیادة الايمان ونقصانه	۳۱۶
۳۸۳	آگے رکھنے کی دو وجہیں	۳۳۹	۳۶۶	الزام تکرار اور اس کی حقیقت	۳۱۷
۳۸۳	حدیث شریف	۳۴۰	۳۶۷	حدیث وتر جمعہ کا ارتباط	۳۱۸
۳۸۵	باب خوف المومن من ان يحبط عمله وهو لا يشعر الخ	۳۴۱	۳۶۷	متابعت کے فوائد	۳۱۹
۳۸۵	مقصد ترجمہ	۳۴۲	۳۶۷	ایک دوسرا اشکال اور اس کا حل	۳۲۰
۳۸۶	حبط کے دو معنی	۳۴۳	۳۶۸	علامہ کشمیری کا ارشاد	۳۲۱
۳۸۶	ابراہیم تیمی کا ارشاد	۳۴۴	۳۶۹	حدیث شریف کا مفہوم	۳۲۲
۳۸۶	ابن ابی ملیکہ کا ارشاد	۳۴۵	۳۷۰	سوال و جواب کی مطابقت	۳۲۳
۳۹۰	حضرت حسن بصری کا ارشاد	۳۴۶	۳۷۰	مسئلہ زیادت و نقصان کا ثبوت	۳۲۴
۳۹۱	دوسرا ترجمہ	۳۴۷	۳۷۱	باب الزکوٰۃ من الاسلام الخ	۳۲۵
۳۹۲	تشریح حدیث	۳۴۸	۳۷۲	مقصد ترجمہ	۳۲۶
۳۹۳	تشریح حدیث	۳۴۹	۳۷۲	حدیث باب	۳۲۷
۳۹۳	احادیث کا ترجمہ سے ربط	۳۵۰	۳۷۳	وجوب وتر کا مسئلہ	۳۲۸
۳۹۳	حضرت شیخ الہند کا ارشاد	۳۵۱	۳۷۵	قضاء تطوع کا اختلاف	۳۲۹
۳۹۳	باب سوال جبریل النبی ﷺ عن الايمان الخ	۳۵۲	۳۷۵	حضرات شوافع کے دلائل	۳۳۰
۳۹۵	ترجمہ اور اس کا مقصد	۳۵۳	۳۷۶	احناف رحمہم اللہ کا ارشاد	۳۳۱
۳۹۷	بروز کا معنی	۳۵۴	۳۷۶	احناف کا اصل استدلال	۳۳۲
۳۹۷	ایمان کیا ہے؟	۳۵۵	۳۷۷	دو بر حاضر کا ایک فتنہ	۳۳۳
۳۹۸	لقاء کے معنی	۳۵۶	۳۷۸	ایک اہم اشکال اور اس کی توضیحات	۳۳۴
۳۹۹	اسلام کیا ہے؟	۳۵۷	۳۸۲	باب اتباع الجنائز من الايمان	۳۳۵
۴۰۰	احسان کے معنی	۳۵۸	۳۸۲	باب سابق سے ربط	۳۳۶

نمبر شمار	مضمون	صفحہ	نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۳۵۹	عام شارحین بخاری	۲۰۰	۳۸۲	عمل کی صحت و ثواب اور نیت	۲۱۶
۳۶۰	حضرت گنگوہی کا ارشاد	۲۰۱	۳۸۳	باب قول النبی ﷺ اللین النصیحة الخ	۲۱۷
۳۶۱	حضرات صوفیاء رحمہم اللہ	۲۰۱	۳۸۴	مقصد ترجمہ	۲۱۸
۳۶۲	قیامت کا سوال اور اس کا ماقبل سے ربط	۲۰۲	۳۸۵	تشریح حدیث	۲۱۸
۳۶۳	حضرت الاستاذ کا ارشاد	۲۰۳	۳۸۶	کتاب العلم	
۳۶۴	علامات قیامت	۲۰۴	۳۸۷	باب فضل العلم الخ	۲۲۰
۳۶۵	غیب کی پانچ چیزیں	۲۰۵	۳۸۸	کتاب الایمان سے ربط	۲۲۰
۳۶۶	باب	۲۰۶	۳۸۹	علم کی تعریف	۲۲۱
۳۶۷	ترجمہ نہ رکھنے کی وجہ	۲۰۶	۳۹۰	اختلاف تراجم اور الزام تکرار	۲۲۱
۳۶۸	جواز خرم کا اختلاف	۲۰۶	۳۹۱	تکرار کا صحیح جواب	۲۲۲
۳۶۹	باب فضل من استبرأ لدينه	۲۰۷	۳۹۲	فضیلت علم اور آیات ذیل	۲۲۲
۳۷۰	ابواب سابق سے ربط	۲۰۸	۳۹۳	باب من سئل علما الخ	۲۲۳
۳۷۱	مشتبهات کا حکم	۲۰۸	۳۹۴	باب سابق سے ربط اور مقصد	۲۲۳
۳۷۲	مشتبهات سے نہ بچنے کا نتیجہ	۲۰۹	۳۹۵	حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد	۲۲۳
۳۷۳	حی کیا ہے؟	۲۰۹	۳۹۶	حضرت شیخ الہند کا ارشاد	۲۲۳
۳۷۴	اللہ کی چراگاہ	۲۰۹	۳۹۷	سوال و جواب کا واقعی حکم	۲۲۵
۳۷۵	مدار صلاح و فساد	۲۰۹	۳۹۹	مفہوم حدیث	۲۲۵
۳۷۶	باب اداء الخمس من الایمان	۲۱۰	۴۰۰	امانت کیا ہے؟	۲۲۶
۳۷۷	تشریح حدیث	۲۱۱	۴۰۱	باب من رفع صوته بالعلم	۲۲۶
۳۷۸	اجمال و تفصیل میں گنتی کا تضاد	۲۱۳	۴۰۲	مقصد ترجمہ	۲۲۷
۳۷۹	ابواب سابقہ سے ربط	۲۱۳	۴۰۳	حضرت شیخ الہند کا ارشاد	۲۲۷
۳۸۰	باب ما جاء ان الاعمال بالنية الخ	۲۱۴	۴۰۴	مفہوم حدیث	۲۲۸
۳۸۱	ترجمہ اور مقصد ترجمہ	۲۱۵	۴۰۵	باب قول المحدث حدثنا واخبرنا الخ	۲۲۹

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۴۴۶	حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد	۴۲۹	۴۳۰	ما سبق سے ربط	۴۰۶
۴۴۸	حمیدی کا استدلال	۴۳۰	۴۳۰	ترجمہ کے مقاصد	۴۰۷
۴۵۰	تشریح حدیث	۴۳۱	۴۳۱	نقل روایت کے مختلف طریقے	۴۰۸
۴۵۱	ترجمہ حدیث کا ارتباط	۴۳۲	۴۳۱	محدثین کرام کے رجحانات	۴۰۹
۴۵۲	تشریح حدیث	۴۳۳	۴۳۳	حدیث شریف	۴۱۰
۴۵۲	ربط حدیث و ترجمہ	۴۳۳	۴۳۳	باب طرح الامام المسئلة علی اصحابہ الخ	۴۱۱
۴۵۳	باب من فعد حیث ینتہی بہ المجلس الخ	۴۳۵	۴۳۳	ترجمہ کا مقصد اور ربط	۴۱۲
۴۵۳	مقصد ترجمہ	۴۳۶	۴۳۳	حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد	۴۱۳
۴۵۳	تشریح حدیث	۴۳۷	۴۳۳	طریقہ سوال	۴۱۴
۴۵۵	باب قول النبی ﷺ رب مبلغ الخ	۴۳۸	۴۳۵	حدیث شباب کی پہلی	۴۱۵
۴۵۶	مقصد ترجمہ اور باب سابق سے ربط	۴۳۹	۴۳۵	وجہ شبہ کیا ہے؟	۴۱۶
۴۵۸	تشریح حدیث	۴۴۰	۴۳۶	باب القراءة والعرض علی المحدث الخ	۴۱۷
۴۵۹	باب العلم قبل القول والعمل	۴۴۱	۴۳۷	باب سابق سے ربط	۴۱۸
۴۶۰	مقصد ترجمہ	۴۴۲	۴۳۷	مقصد ترجمہ	۴۱۹
۴۶۰	حضرت الاستاذ کا ارشاد	۴۴۳	۴۴۰	تشریح حدیث	۴۲۰
۴۶۱	انبیاء کی وراثت	۴۴۳	۴۴۱	حج سے سکوت اور ابن اسین کی لغزش	۴۲۱
۴۶۳	باب ما کان النبی ﷺ یتخولہم	۴۴۵	۴۴۳	علوسند پر استدلال	۴۲۲
۴۶۵	بالموعظة والعلم کئی لا یغروا	۴۴۶	۴۴۳	موسیٰ بن اسماعیل کی روایت	۴۲۳
۴۶۶	مقصد ترجمہ	۴۴۶	۴۴۳	تشریح حدیث	۴۲۳
۴۶۶	تبشیر و تفسیر کا تقابل	۴۴۷	۴۴۵	حدیث عالم کا اثبات	۴۲۵
۴۶۷	شیخ الہند کا ارشاد	۴۴۸	۴۴۵	ترجمہ سے ربط	۴۲۶
۴۶۸	باب من جعل لاهل العلم ایاما معلومة	۴۴۹	۴۴۵	باب ما یدکر فی المناولة الخ	۴۲۷
۴۶۸	مقصد ترجمہ	۴۵۰	۴۴۶	مقصد ترجمہ	۴۲۸

صفحہ	مضمون	نمبر شمار	صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۴۸۲	حضرت شیخ الہند کا ارشاد	۴۷۳	۴۶۹	تشریح حدیث	۴۵۱
۴۸۲	تشریح حدیث	۴۷۴	۴۷۰	باب من یرد اللہ بہ خیراً الخ	۴۵۲
۴۸۲	باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہم علمہ الكتاب	۴۷۵	۴۷۰	مقصد ترجمہ	۴۵۳
۴۸۲	مقصد ترجمہ	۴۷۶	۴۷۰	خیراً کی تئوین	۴۵۴
۴۸۵	تشریح حدیث	۴۷۷	۴۷۱	تشریح حدیث	۴۵۵
۴۸۷	باب متی یصح سماع الصغیر	۴۷۸	۴۷۲	جماعت سے کیا مراد ہے؟	۴۵۶
۴۸۷	ترجمہ کا مقصد اور باب سابق سے ربط	۴۷۹	۴۷۳	باب الفہم فی العلم	۴۵۷
۴۸۸	تشریح حدیث	۴۸۰	۴۷۳	مقصد ترجمہ	۴۵۸
۴۸۹	تشریح حدیث	۴۸۱	۴۷۳	حضرت شیخ الہند کا ارشاد	۴۵۹
۴۹۰	باب الخروج فی طلب العلم	۴۸۲	۴۷۴	باب الاغتباط فی العلم والحکمة	۴۶۰
۴۹۱	مقصد ترجمہ	۴۸۳	۴۷۴	مقصد ترجمہ اور باب سابق سے ربط	۴۶۱
۴۹۳	بَابُ فَضْلِ مَنْ عَلَّمَ وَ عَلَّمَ	۴۸۴	۴۷۵	حضرت عمرؓ کا ارشاد	۴۶۲
۴۹۳	مقصد ترجمہ اور تشریح حدیث	۴۸۵	۴۷۶	تشریح حدیث	۴۶۳
۴۹۵	مثال اور مثال لہ کی تطبیق	۴۸۶	۴۷۷	باب ما ذکر فی ذہاب موسیٰ فی البحر الخ	۴۶۴
۴۹۶	غلامہ سندھی کا ارشاد	۴۸۷	۴۷۸	مقصد ترجمہ	۴۶۵
۴۹۷	فائدہ	۴۸۸	۴۷۹	حضرت شیخ الہند کی رائے گرامی	۴۶۶
۴۹۷	باب رفع العلم وظهور الجهل الخ	۴۸۹	۴۸۰	حضرت عمرؓ کا مقولہ	۴۶۷
۴۹۸	مقصد ترجمہ	۴۹۰	۴۸۰	سفر موسیٰ علیہ السلام کی تحقیق	۴۶۸
۵۰۰	تشریح حدیث	۴۹۱	۴۸۰	حافظ ابن حجرؒ کی توجیہ	۴۶۹
۵۰۱	تشریح حدیث	۴۹۲	۴۸۱	قسطلانی کا رجحان	۴۷۰
۵۰۲	دونوں روایات کی علامتیں	۴۹۳	۴۸۱	ابن منیر کا جواب	۴۷۱
			۴۸۱	ابن رشیدؒ کی رائے اور ابن حجرؒ کی تائید	۴۷۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ عرض مرتب ﴾

بگیرایں ہمہ سرمایہ بہار از من
کہ گل بدست تو از شاخ تازہ تر ماند

۱۳۷۷ھ میں راقم الحروف شریک دورہ حدیث تھا اور دارالعلوم کے افادہ بخش دستور کے مطابق حضرت الاستاذ کے درسی افادات قلم بند کر رہا تھا، ابتدا میں یہ بات کہیں حاشیہ خیال میں بھی نہ تھی کہ اپنی شکستہ تحریر کو منضبط و مرتب بھی کرنا ہوگا لیکن پھر بھی دوران تحریر امکان بھر یہ کوشش ہوتی تھی کہ حضرت الاستاذ کے افادات کو لفظ بہ لفظ لکھ لیا جائے، بحمد اللہ مجھے پابندی اور استقامت کیساتھ اس مقصد میں کامیابی نصیب ہوئی، سالانہ امتحان کے بعد درسی افادات کا جائزہ لیا تو وہ بڑے سائز کے ہزاروں صفحات پر محیط تھے۔

آئندہ سال یعنی ۱۳۷۸ھ میں پھر درس بخاری میں حاضری ہوئی اور اس سال افادات قلمبند کرنے کا زیادہ اہتمام کیا، اس سال کے خاتمہ پر بعض بزرگوں اور دوستوں کے مشورے اور اصرار سے یہ طے پایا کہ اس کی اشاعت کا سروسامان اور انتظام کیا جائے، چنانچہ تعمیل حکم کیلئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ حضرت الاستاذ کے دونوں سالوں کے افادات کو سامنے رکھ کر ایک تیسرا مقالہ مرتب کیا جائے، میرے لئے اسی قدر کام بہت تھا کہ حضرت الاستاذ کے دونوں سال کے افادات کو ایک تیسری شکل دیدوں اور درمیان میں مناسب مقامات پر ذیلی سرخیاں قائم کر دوں، اس لئے مراجعت کی بھاری ذمہ داری میرے بس کی بات نہ تھی، خداوند قدوس جزائے خیر دے برادر محترم جناب مولانا لقمان الحق فاروقی کو کہ موصوف نے اس ذمہ داری کو سنبھالا اور بہت خوب انجام دیا۔

درسی افادات کی اشاعت بہت مفید ہے لیکن مراجعت کے سلسلے میں مرتب کی جانب سے بڑی کوتاہی ہوتی ہے، دوسری کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ درسی انداز بیان کو دائرہ تحریر میں بھی باقی رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے، جبکہ لکھنے والے عام طور پر افادات اس دور میں قلم بند کرتے ہیں، جب انہیں جمع و ترتیب کا پورا سلیقہ نہیں ہوتا۔ میں نے بساط بھر کوشش کی ہے کہ تحریر کا انداز بالکل ہی درسی نہ ہو جائے بلکہ تقریر و تحریر کا ایسا امتزاج ہو جائے جس سے ہر ذہن کا انسان مستفید ہو سکے اس لئے ترتیب کے وقت جو خاص دقت مجھے پیش آئی وہ یہ تھی کہ حضرت کے علوم و افادات کو ایک عام فہم انداز میں ہر طبقہ فکر کے سامنے کر دیا جائے، اس کام کی دشواری کا اندازہ صحیح طور پر وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں کبھی کسی تقریر کو مضمون کے رنگ میں ڈھالنے کی نوبت آئی ہو۔

پیش نظر درسی تحریر ایضاح البخاری کی سب سے بڑی خصوصیت اور قارئین کی خوش نصیبی یہ ہے کہ حضرت الاستاذ نے اپنی دوسری اہم مصروفیات اور ضعف کے باوجود نظر اصلاح کیلئے وقت عنایت فرمایا، راقم الحروف شب و روز کی کاوش کے بعد دونوں سالوں کے ارشادات عالیہ سامنے رکھ کر انہیں مرتب کرتا اور برادر م مولانا لقمان الحق صاحب فاروقی مرحوم مراجعت کرتے پھر ہم دونوں حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہوتے، حضرت بغور سماعت فرماتے اور کوئی کمی محسوس ہوتی تو آپ اس کی اصلاح یا وضاحت فرمادیتے یا مسودہ اپنے پاس رکھ لیتے اور اپنے قلم سے اصلاح کر دیتے۔

اس طرح حضرت الاستاذ کی زندگی میں تیرہ سو صفحات مرتب ہو کر طبع ہوئے اور اس طرح کام کرنے سے جمع و ترتیب کا بھی سلیقہ پیدا ہوا لیکن نہایت افسوس ہے کہ حضرت کی حیات میں یہ کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا، پھر ۱۴۰۷ھ میں برادر محترم مولانا لقمان الحق فاروقی بھی جو اررحمت میں منتقل ہو گئے لیکن حضرت الاستاذ کی زیر نگرانی کام کی توفیق و سعادت نے مرتب کو جو ذوق و سلیقہ اور ہمت و حوصلہ عطا کیا اسکے سبب کام کا سلسلہ اس طرح جاری ہے کہ پہلے شروع بخاری اور متعلقات سے مراجعت کر لی جاتی ہے، پھر حضرت کے دونوں سال کے افادات کو سامنے رکھ کر مقالہ مرتب کیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اہل علم کو زبان و بیان یا ترتیب کے سلسلے میں کچھ فروگزاشتیں نظر آئیں جنکا مجھے خود بھی احساس ہے لیکن میری مجبوریوں اور میرے موقف کو صحیح طور پر سمجھنے کے بعد مجھے اس سلسلہ میں معذور تصور کیا جائے۔

تا دست رسم بود ز دم چاک گریباں شرمندگی از خرقہ پشینہ نہ دارم

بہر کیف مقدور بھر کوشش کے بعد ایک علمی تحفہ علم دوست حضرات کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے، توقع ہے کہ اس کو شرف قبولیت سے نوازا جائے گا اور اس سلسلے میں مرتب اور ادارے کی ہمت افزائی کی جائیگی، دعا ہے کہ پروردگار عالم اپنے فضل و کرم سے اتمام کی توفیق عطا کرے، مشکلات کو دور فرمائے، اخلاص عطا کرے اور اپنی بارگاہ میں حسن قبول سے سرفراز کرے۔

می توانی کہ دہی اشک مرا حسن قبول اے کہ دُر ساختہ ای قطرة بارانی را

ریاست علی غفرلہ

مکتبہ مجلس قاسم المعارف دیوبند

﴿ حضرت الاستاذ رحمہ اللہ ﴾

مختصر کوائف

جن لوگوں سے باری تعالیٰ دین کی کوئی بڑی خدمت لیتے ہیں ان حضرات کی زندگی ہمہ تن سادہ ہونے کے باوجود ہزار ہزار رعنائی و جمال کا مظہر ہوا کرتی ہے، یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے جسے ہر اہل نظر محسوس کرتا ہے، تاریخ نے ہر قسم کے لوگوں کو محفوظ کیا ہے لیکن جو رعنائی دین کے ان جاں سپاروں کے حصہ میں آئی ہے وہ کسی دوسرے کا حصہ نہیں، یہ ان ہی کی زندگیوں کا ثمرہ ہے کہ انسانی زندگی برابر تقائی منزلیں طے کرتی رہتی ہے، اور اپنے لئے صراطِ مستقیم محسوس صورت میں پاتی رہتی ہے، بس اسی مناسبت سے حضرت الاستاذ کی حیاتِ طیبہ کے چیدہ چیدہ واقعات ہلکے سے تسلسل کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

میں حقیر گدایان قوم راکیں قوم شہان بے کمر و تاجدار بے کلمہ اند

سلسلہ نسب | حضرت الاستاذ قدس سرہ کا سلسلہ نسب امام حسینؑ تک بتیس واسطوں سے پہنچتا ہے ملاحظہ ہو (۱) حضرت مولانا السید فخر الدین صاحب (۲) بن سید عالم (۳) بن سید عبدالکریم (۴) بن سید مردان علی (۵) بن سید محمد خضر (۶) بن سید عبداللہ (۷) بن سید عبداللہ (۸) بن سید عالم (۹) بن سید عبدالکریم (۱۰) بن سید سید احمد (۱۱) بن سید عبدالحمید (۱۲) بن سید قاضی عبدالغنی (۱۳) بن سید مطہر (۱۴) بن سید طاہر (۱۵) بن سید سلطان الدین (۱۶) بن سید سوندن (۱۷) بن سید چمن (۱۸) بن سید منتخب الدین (۱۹) بن سید احمد (۲۰) بن سید علی (۲۱) بن سید محمد (۲۲) بن سید قاسم (۲۳) بن سید علاء الدین (۲۴) بن سید شہاب الدین (۲۵) بن سید طاہر (۲۶) بن سید نعمت اللہ (۲۷) بن سید فضل اللہ (۲۸) بن سید عبداللہ (۲۹) بن سید صادق (۳۰) بن سید محمد یا المامون (۳۱) بن سید جعفر صادق (۳۲) بن سید محمد باقر (۳۳) بن سید امام زین العابدین (۳۴) بن سید امام حسین رضی اللہ عنہ۔

خاندانی روایات | حضرت الاستاذ قدس سرہ کا اصلی وطن شہر ہرات تھا، جیسا کہ حضرت نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے، اور اسکی تصدیق کے لئے حضرت نے ایک واقعہ بھی سنایا کہ ایک بار ہرات سے ایک معمر بزرگ تشریف لائے اور حضرت رحمہ اللہ کے کسی خاندانی بزرگ سے ہاپوڑ میں ملاقات کی، انہوں نے بتلایا کہ آپ کے مکانات کے آثار اب بھی وہاں موجود ہیں اور اس گفتگو میں محلے کا نام جامع مسجد ہرات بھی معلوم ہوا، نیز سولہویں سترھویں پشت میں بزرگوں کے اسماء سید سوندن اور سید چمن ہیں جس سے فارسی ممالک میں طویل اقامت کا یقین

ہوتا ہے، پھر یہ خاندان کسی دور میں وہاں سے نکل کر لاہور اور ملتان میں اقامت کرتا ہوا عہد شاہ جہاں میں دہلی پہنچا، دہلی اس وقت اہل اللہ کا مرکز تھا، اس وقت دہلی میں اپنے دور کے ایک خدارسیدہ بزرگ سید حسن صاحب رسول نما تھے، جو معمولی مجاہدہ کے بعد رسول اکرم ﷺ کی زیارت کر دیتے تھے، حضرت رحمہ اللہ کے ایک خاندانی بزرگ سید قطب ان کی خدمت میں رہنے لگے اور سید حسن علیہ الرحمہ نے مرض وفات میں انہیں خلافت بھی عنایت فرمائی، شاہجہاں جو ایک علم پرور اور بزرگوں سے عقیدت و محبت رکھنے والا شہنشاہ تھا اس نے سید قطب اور ان کے تینوں بھائیوں (سید مرید، سید فرید، سید عالم) کیلئے ہاپوڑ میں ایک قلعہ نما مدرسہ تعمیر کرا دیا، اور دوسرے محلہ میں ان بزرگوں کے لئے مکانات بنام شیش محل بنائے گئے جن کے کھنڈرات اب بھی موجود ہیں۔

یہ حضرات علم معقول و منقول میں امتیازی شان رکھتے تھے، اس مدرسہ میں پانچ سو طلبہ بخوبی قیام کر سکتے تھے مصارف کے لئے تیرہ گاؤں وقف کردئے، مدرسہ کی عظیم الشان عمارت مغلیہ مذاق تعمیر کی ایک یادگار تھی، یہ مدرسہ ۱۸۵۷ء تک تشنگان علوم کے لئے برابر سیرابی کے اسباب مہیا کرتا رہا، لیکن انگریزی گورنمنٹ نے اسے بغاوت کے جرم میں برباد کر دیا، وقف ضبط کر لیا گیا اور عمارت نیلام کر دی گئی، انجام کار بزرگوں نے اسے خرید کر اپنے لئے درست فرمایا اور آج بھی یہ محلہ مدرسہ سادات کے نام سے مشہور ہے۔

آباء و اجداد | افسوس ہے کہ آباء و اجداد کے سلسلہ میں اس سے زیادہ اور کچھ معلومات فراہم نہ ہو سکیں کہ وہ ہر دور میں علم و فن کی خدمات انجام دیتے رہے، تفصیل کہیں نہیں ملتی، آپ کے دادا مرحوم جناب منشی سید عبدالکریم صاحب تھانیداری کے عہدہ پر پنجاب اور اجمیر کے علاقہ میں فائزر رہے، وہ خواجہ معین الدین اجمیری کے مزار پر ہفتہ میں ایک بار ضرور تشریف لے جاتے تھے اور حضرت الاستاذ کو بھی ساتھ لیجاتے تھے، ہاپوڑ تشریف لے آئے تو دنیوی معاملات سے بالکل کنارہ کشی اختیار فرمائی، تہجد کے بعد مصلے پر بیٹھ جاتے تھے، اور شجرہ مشائخ چشت پڑھ کر خوب رویا کرتے تھے، والد مرحوم جناب حکیم سید عالم صاحب اپنے وقت کے صاحب نظر عالم بہترین حافظ اور حاذق طبیب تھے، قرآن کریم کے ساتھ شغف خاطر کا یہ عالم تھا کہ مطب جانے سے پہلے روزانہ ایک منزل تلاوت فرماتے تھے۔ حکیم صاحب نے اجمیر کے قریب ”نیانگر“ میں ساٹھ روپے ماہوار پر ملازمت اختیار فرمائی تھی لیکن بعد میں پابندی کے باعث ملازمت ترک فرمادی اور ہاپوڑ میں آکر مطب شروع فرمایا، دونوں بزرگوں نے ایک ہی سال میں تین دن کے فاصلہ سے وفات پائی وفات کے وقت والد صاحب مرحوم کی عمر بیالیس سال تھی۔

ولادت اور ابتدائی تعلیم | والد مرحوم جناب حکیم سید عالم صاحب کے ارشاد کے مطابق حضرت الاستاذ قدس سرہ ۱۳۰۷ھ میں بمقام اجمیر پیدا ہوئے، ولادت کے بعد جدا مجد جناب منشی سید عبدالکریم صاحب سجادہ نشین درگاہ کے پاس لے گئے اور خصوصی دعا کرائی، جب عمر چار سال کی ہو گئی تو ابتدائی تعلیم شروع کر دی

گئی، قاعدہ اور قرآن کریم والدہ محترمہ ہی سے پڑھا، اور اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم بھی گھر ہی کے افراد سے حاصل کی، پھر فارسی کی پانچ اونچی اونچی کتابیں اپنے نانا مولانا مظفر علی صاحب سے پڑھیں، جن میں امیر خسرو کی بہشت بہشت بھی شامل ہے، یوسف زلیخا، سکندر نامہ، بہار دانش، دیوان حافظ، تحفۃ الاحرار، مخزن اسرار، رسالہ عبدالواسع ابوالفضل فارسی کے مشہور استاذ میاں جی کلو سے تعلیم پائیں، اور کچھ حصہ مثنوی مولانا روم کا بھی پڑھا۔

گیارہ سال کی عمر میں فارسی کی مکمل تعلیم سے فراغت حاصل ہو گئی تو عمر کے بارہویں سال ایک خاندانی عالم مولانا خالد صاحب سے عربی شروع فرمادی، مولانا خالد کانپور تشریف لے گئے، تو خاندان کے دوسرے بزرگوں سے پڑھتے رہے، اسی اثناء میں والد صاحب مرحوم کو خیال ہوا کہ قدیم مدرسہ کا احیاء کر دیا جائے، چنانچہ چند ہمدردوں کے مشورہ سے انہوں نے از سر نو ”بنام برکات الاسلام“ مدرسہ کی بنیاد ڈالی، حسن اتفاق کہ ان ہی دنوں استاد وقت مولانا عبدالحی صاحب لاہوری ہاپوڑ تشریف لائے اور والد مرحوم کے کہنے پر انہوں نے مدرسہ میں قیام منظور فرمایا، مولانا لاہوری طالب علم کو کتابیں زبانی یاد کراتے تھے اور عشاء کے بعد صف بندی فرما کر شاگردوں سے کتابیں سنتے تھے، حضرت الاستاد کے اس وقت کے ہم سبق مولانا عبد الماجد اور مولانا فخر الحسن تھے، اس کے بعد مدرسہ کو باقاعدہ ترقی دی گئی اور مولانا محمد علی صاحب خوش آبادی کو بلا یا گیا۔ مولانا محمد علی صاحب صدرا، شمس بازغہ اور بخاری شریف کا درس بلا تکلف دیتے تھے۔

والد مرحوم نے اس نظریہ کے ماتحت کہ گھر پر خانگی امور میں الجھنے کے باعث تعلیم میں خلل پیدا ہوتا ہے، حضرت الاستاذ کو حصول علم کے لئے گلاؤٹھی ضلع بلند شہر جانے کا حکم دیا، جہاں استاد وقت مولانا ماجد علی صاحب جو پوری صدر مدرس تھے، اور مولانا محی الدین صاحب مہتمم، حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ میں قیام کے دوران شرح جامی بحث فعل، مختصر المعانی، ہدیہ سعیدیہ، قطبی، میبذی وغیرہ مولانا عبد الماجد صاحب سے پڑھیں، اور کنز الدقائق مولانا محی الدین صاحب سے اور مولانا کریم بخش صاحب سے فن ہیئت کی کچھ کتابیں پڑھیں، مولانا کریم بخش صاحب اس وقت فن ہیئت، ریاضی، اقلیدس کے امام سمجھے جاتے تھے، کچھ دنوں بعد جب مولانا ماجد علی صاحب مدرسہ حسین بخش دہلی تشریف لے آئے تو حضرت الاستاذ بھی ان کے ہمراہ دہلی تشریف لے گئے، اس وقت حضرت الاستاذ نے مولانا سے ملاحسن، بحر العلوم، حمد اللہ، شرح عقائد نسفی، خیالی، ترمذی وغیرہ پڑھی ہیں، تقریباً ایک سال قیام کے بعد مولانا ماجد علی صاحب مدرسہ فتحپوری میں منتقل ہو گئے تو حضرت الاستاذ بھی ان کے ہمراہ فتحپوری چلے گئے۔

دور امتحانات | حضرت الاستاذ کو جنہیں اپنے دور کا امام ہونا تھا ایسے ابتلاءات سے گزرنا ضروری تھا جس سے آپ کی عزیمت و استقلال کی مثال قائم ہو سکے، چنانچہ حضرت الاستاذ کو جہاد زندگی میں ایسے متعدد حوادث پیش آئے کہ جن میں ثبات قدمی کے بعد اس مقام بلند تک پہنچنا اہل ہو گیا، جسکے لئے آپ کا انتخاب کیا گیا تھا حضرت الاستاذ کے ہمراہ انکے بڑے بھائی جناب نصیر الدین صاحب تھے، اس وقت دہلی میں طاعون پھیلا ہوا تھا، مولانا

نصیر الدین صاحب بھی نمونہ کے بیمار ہو گئے۔

حضرت الاستاذ انہیں ہمراہ لیکر ہاپوڑ پہنچے تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی، حضرت الاستاذ جب گھر پہنچے تو کپڑے بھیگ گئے تھے، اور مولانا نصیر الدین بے ہوش تھے، والد مرحوم طبیب حاذق ہونے کے باوجود اس حالت سے گھبرا گئے، صبح کے وقت ڈاکٹر کو بلوایا تو اس نے آلات لگا کر درد کھینچنا شروع کیا جس سے وقتی طور پر کچھ آفاقہ ہوا لیکن دو یوم کے بعد اسی مرض میں وصال ہو گیا، والدہ محترمہ اس صدمہ جانکاہ کے اثر سے دوسرے ہی دن اسی مرض میں مبتلا ہوئیں، اور غم و مرض کے حملوں کی تاب نہ لا کر تیسرے ہی دن مرحوم بیٹے سے جا ملیں، والدہ مرحومہ حضرت الاستاذ کے دادا مرحوم کی بھانجی ہوتی تھیں، اور دادا عمر کے تقاضے اور بیماریوں کے باعث پہلے ہی سے مضمحل تھے، جب ان حادثات کی اطلاع ہوئی تو فوراً ہی حالت نزع طاری ہو گئی، اور والدہ مرحومہ کے ایک گھنٹہ کے بعد وہ بھی واصل بحق ہو گئے، والد مرحوم بھی ان جانگداز اور پیہم حوادث کے اثر سے تیسرے دن بیمار ہو گئے اور انہوں نے بھی اسی مرض میں تین دن کے بعد جان جاں آفریں کے سپرد کر دی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس وقت گھر میں حضرت الاستاذ اور ان کے دو چھوٹے بھائی نثار احمد، اور علی احمد رہ گئے، علی احمد بالکل ہی صغیر السن تھے، کچھ دن قبل جو گھر مسرتوں کا گہوارہ تھا اب ماتم کدہ بن گیا، حضرت الاستاذ کی ذمہ داری یوں اور بھی بڑھ گئی کہ وہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑے تھے، بالآخر چھوٹے بھائی کو چھوٹی پھوپھی سکندر آباد لے گئیں، مولانا اور نثار احمد دوسرے پھوپھی کے پاس ہاپوڑ رہے، اس طرح تربیت و کفالت کا مسئلہ تو حل ہو گیا، لیکن تعلیم بالکل ختم ہو گئی، اور اسی حالت میں ایک سال گزر گیا، اس وقت مدرسہ برکات الاسلام کی ایک شاخ جامع مسجد میں بھی کھولی گئی جہاں مولانا کریم بخش سنبھلی صدر مدرس تھے، حضرت الاستاذ ان کے پاس تشریف لے گئے، انہوں نے اظہار ہمدردی کیا اور سلسلہ تعلیم شروع ہو گیا، اسی اثناء میں مولانا سید محمود صاحب ہزاروی بھی تشریف لائے جن سے حضرت الاستاذ کو مطالعہ میں کافی مدد ملی۔

دارالعلوم میں تشریف آوری | اس زبوں حالی کے ایام میں حضرت کے ماموں جناب سید اسماعیل صاحب نے سرپرستی فرمائی، اور تعلیم کیلئے دیوبند بھیجنا مناسب سمجھا، حسن اتفاق کہ انہی دنوں حکیم اہلق صاحب کٹھوری جو حضرت کے گھرانہ سے مخصوص تعلق رکھتے تھے تشریف لائے اور دیوبند آنے کا مشورہ دیا لیکن خود حضرت الاستاذ یہاں آنے کے لئے اس لئے تیار نہ تھے کہ حضرت کے اپنے علم کے مطابق یہاں معقولات سے دلچسپی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا اور خود حضرت کا مذاق متعدد اساتذہ کی تربیت کے باعث یکسر معقولی تھا، لیکن حضرت الاستاذ نے خود تشریف لا کر اس خبر کی تحقیق فرمائی اور حضرت شیخ الہند کے درس بیضاوی و ابوداؤد میں بیٹھ کر اندازہ لگایا کہ دیوبند کے علماء معقولات پر کس طرح حاوی ہیں بالآخر شوال ۲۶ھ کو انیس سال کی عمر میں حضرت الاستاذ دارالعلوم میں داخل ہو گئے، حضرت الاستاذ نے اول اول احاطہ مولسری میں کنویں کے داہنی جانب واقع کمرہ میں قیام فرمایا

اور امتحان کے لئے ہدایہ اولین، جلالین اور مشکوٰۃ وغیرہ کا نام لکھوا دیا، امتحان کیلئے حضرت الاستاذ کو عصر کی اذان سے آدھ گھنٹہ قبل کا وقت دیا گیا، حضرت الاستاذ وقت مقررہ پر حاضر ہو گئے حضرت شیخ الہند پہلے طالب علم کو مانوس فرماتے تھے پھر امتحان لیتے تھے، چنانچہ اس طرز عمل کے بعد حضرت شیخ الہند نے مشکوٰۃ کھول کر ابواب وتر میں سے پوچھنا شروع کیا، حضرت الاستاذ نے ترجمہ و مطلب بیان فرمایا حضرت شیخ الہند نے اعتراض فرمایا تو حضرت الاستاذ نے اس کا جواب دیا حضرت شیخ الہند نے پھر نقد فرمایا تو حضرت الاستاذ اس کا جواب نہ دے سکے، پھر ہدایہ کا امتحان لیا اور کہا کہ معقول کی کوئی کتاب نہیں پڑھی؟ حضرت الاستاذ نے فرمایا جس کتاب میں چاہیں امتحان لے سکتے ہیں، نماز کا وقت قریب آ گیا حضرت مسجد میں تشریف لے گئے، دیوان جی اللہ دیئے جو اس وقت طلبہ کے نام لکھا کرتے تھے نمبر نہ دیکھ کر متعجب ہوئے اور راستہ ہی میں حضرت سے پوچھا کہ نمبر نہیں لگائے؟ حضرت نے فرمایا کہ ”انعامی نمبر“ ہیں۔

حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ نے امتحان کے بعد مشورہ دیا کہ تم دورہ حدیث دو سال میں پڑھو، چنانچہ حضرت الاستاذ نے دورہ کی کتابیں دو سال میں پڑھیں اور ہر سال حدیث کی کتابوں کے ساتھ فتون کی متعدد کتابیں پڑھتے رہے مثلاً دونوں سالوں میں ہدایہ آخرین، یضای شریف، جلالین، توضیح، حسامی، عروض المفتاح، دیوان متنبی، حماسہ تفسیر مدارک اور در مختار کا کچھ حصہ، دونوں سالوں کے امتحانات میں حضرت الاستاذ نے سب سے زیادہ نمبرات حاصل کئے، دوسرے سال خصوصی انعام کے طور پر زوجہ مشفق احمد ڈپٹی کلکٹر مظفر نگر کی طرف سے ایک عمدہ گھڑی بھی دی گئی، ایام طالب علمی میں ایک خاص بات یہ تھی کہ حضرت الاستاذ نے اونچی اونچی کتابوں کا درس بھی دیا جن میں حمد اللہ، جواہر عالیہ فی الحکمتہ المتعالیہ، ملا جلال، ملاحسن اور شرح وقایہ وغیرہ شامل ہیں، اسی دور تعلیم و تعلم میں متعدد بار دوسرے طلباء و اساتذہ سے نوک جھونک رہی لیکن خداوند قدوس نے ہر میدان میں حضرت الاستاذ ہی کو کامیابی عطا فرمائی۔

دور تدریس | دارالعلوم سے فراغت کے بعد صدر مہتمم صاحب علیہ الرحمہ حضرت الاستاذ کے پاس تشریف لائے، فرمایا کہ ہم نے دارالعلوم کے مروجہ نظام کو ایک کالج کا درجہ دیکر دوسرا ایک اسکول کا درجہ قائم کیا ہے، جن میں تین مدرس ہیں، ایک آپ دوسرے مولانا امین احمد مروہی اور تیسرے مولانا نبیہ حسن دیوبندی اور اس درجہ کا صدر مدرس آپ کو بنایا گیا ہے، مشاہرہ پندرہ روپیہ ماہوار تھا، حضرت نے تین ماہ تنخواہ لی اور پھر حسبہ اللہ خدمت انجام دی، اس وقت حضرت الاستاذ نے قطبی، میر قطبی شرح جامی، کنز الدقائق اور فقہ الیمن کا درس دیا جو اس درجہ کی اعلیٰ کتابیں تھیں، جب دارالعلوم کی زندگی کا یہ تیسرا سال ختم ہو گیا تو حضرت الاستاذ کو صدر مہتمم صاحب نے بلایا اور فرمایا ہم تمہیں دارالعلوم کی طرف سے مدرسہ شاہی مراد آباد کے لئے بھیج رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۲ شوال ۱۲۹ھ کو حضرت الاستاذ کا باقاعدہ تقرر کر دیا گیا، اس وقت مدرسہ شاہی کے صدر مدرس مولانا محمود الحسن سہوانی تھے، حضرت الاستاذ کی متعلقہ کتابیں جلالین شریف، ابوداؤد، شرح عقائد، میبذی، ملاحسن تھیں۔

چونکہ حضرت الاستاذ کا یہ تقرر اکابر دارالعلوم کی جانب سے ہوا تھا اسلئے اس دوران میں ہوی جذبہ ایثار و اخلاص | تنخواہوں کی بھی حضرت نے پرواہ نہیں کی، مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے ایک سو پچاس روپیہ کی پیش کش کی گئی جبکہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں پچیس روپیہ مل رہے تھے لیکن حضرت الاستاذ نے یہ کہہ کر انکار فرمادیا کہ میں جن بزرگوں کے حکم سے آیا ہوں انکے ایماء کے بغیر کسی دوسری جگہ جانے کے لئے تیار نہیں ہوں، اسی طرح مدرسہ امدادیہ مراد آباد ہی کے صدر مدرس جناب مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے کچھتر تک تنخواہ دینے کے لئے فرمایا لیکن حضرت الاستاذ نے ان ہی الفاظ میں معذرت کر دی، کلکتہ کے مدرسہ سے تین سو پچاس کی پیش کش کی گئی جبکہ شاہی سے صرف ساٹھ مل رہے تھے لیکن حضرت الاستاذ نے تحریر فرمادیا کہ میں سرکاری ملازمت کو جائز نہیں سمجھتا، اسی تدریس شاہی کے دوران متعدد بار مناظروں کی بھی نوبت آئی جن میں آریہ سماج، اہل حدیث، مبتدعین وغیرہ سب ہی شامل ہیں لیکن ہر موقع پر حضرت کے بے پناہ علم اور سحرانہ انداز بیان نے حضرت ہی کو کامیابی عطاء فرمائی، مبتدعین کے ساتھ کیا گیا ایک مناظرہ ”مناظرہ موٹہا ڈھکیا“ کے نام سے طبع بھی ہو چکا ہے۔

قیادت دارالعلوم | تدریس کی بیشتر زندگی تو حضرت الاستاذ نے مدرسہ شاہی میں صرف فرمائی، لیکن درمیان میں جب بھی اکابر علماء نے دارالعلوم کے لئے طلب فرمایا حضرت الاستاذ نے اسے کچھ شرائط کیساتھ قبول فرمایا، حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہ نے نینی جیل سے حضرت الاستاذ کو تدریس دارالعلوم کے لئے لکھا کہ دارالعلوم میں بخاری شریف تمہیں پڑھانی ہوگی، پھر کافی تامل کے بعد اہتمام کی جانب سے خط و کتابت کی گئی تو حضرت محترم ۴۲ء میں تشریف لائے اور بخاری شریف کا درس دیا اور قائم مقام صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز رہے دوبارہ ۴۵ء کے الیکشن میں جب حضرت شیخ الاسلام نے پانچ ماہ کی رخصت لی حضرت الاستاذ کو ترمذی شریف پڑھانے کے لئے بلایا گیا اور قائم مقام صدر المدرسین قرار دیا گیا، پھر تیسری بار حضرت شیخ الاسلام کی وفات کے بعد ۱۳۷۷ھ میں حضرت الاستاذ کو شیخ الحدیث مقرر کیا گیا پھر ۱۳۸۷ھ میں صدر المدرسین نامزد کئے گئے اور دارالعلوم میں بخاری شریف کا درس آخر عمر تک پوری علمی شان و شوکت کے ساتھ جاری رہا۔

سیاسی زندگی | حضرت الاستاذ کی سیاسی زندگی کا آغاز دور خلافت سے ہوتا ہے حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ نے اس وادی پر خار کی دعوت دی تھی جس پر حضرت الاستاذ نے مثالی کردار پیش فرمایا، ایک بار سنبھل ضلع مراد آباد میں کسی سیاسی رہنما کی گرفتاری کے سلسلہ میں جلسہ تہنیت کا انعقاد عمل میں آیا، حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں نہایت گرم تقریر فرمائی جسکے نتیجہ میں حضرت الاستاذ رحمہ اللہ پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔

مراد آباد میں نہایت عظیم الشان نمائش ہوتی تھی اور یونین کا جھنڈا لہراتا تھا، مراد آباد میں اس سلسلہ میں حضرت نے رضا کارانہ نظام قائم کیا اور سات سو رضا کاروں کی جماعت قائم کی اور لوگوں کو نمائش میں شرکت سے

روکا اس مشن کی کامیابی کے لئے محلہ در محلہ جلسے کئے گئے مفتی ٹولہ مراد آباد کے اجلاس میں تو خاتم الحدیثین حضرت علامہ انور شاہ کشمیری کو بھی مدعو کیا گیا اور علامہ قدس سرہ نے اس بارے میں پرزور تقریر بھی کی تھی، غرض حضرت الاستاذ نے اس بارے میں اہم اور موثر اقدامات کئے، بالآخر ایک تقریر کے الزام میں حضرت کو گرفتار کر لیا گیا اور منصب کے موافق حضرت کو اے کلاس میں رکھا گیا، حضرت کے ساتھ تقریباً پچاس رضا کاروں نے گرفتاری دی، ایک سال قید محض کی سزا تھی، لیکن تقریباً پانچ ہی ماہ کے بعد گاندھی ارون مصالحت کے تحت رہائی ہو گئی، اسکے بعد حضرت الاستاذ نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہر جائز پروگرام کی تکمیل کے لئے سعی فرمائی، حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ کے دور صدارت میں دو مرتبہ جمعیت العلماء ہند کے نائب صدر بھی مقرر کئے گئے، متعدد مرتبہ اہم جلسوں کی صدارت فرمائی جن میں صوبہ دہلی کے ۱۹۴۴ء کا خطبہ صدارت طبع بھی ہوا تھا، بہار پور میں جمعیت احرار کے اجلاس کی صدارت اور ضلع مظفر نگر کانفرنس کی صدارت بھی حضرت کی سیاسی زندگی کے اہم واقعات ہیں، اجلاس احرار کا خطبہ صدارت نہایت عظیم الشان تھا، متعدد اخبارات نے اس کے اقتباسات کو اپنی اشاعتوں میں اہمیت کے ساتھ لیا تھا۔

سبحان الہند حضرت مولانا احمد سعید صاحب کے وفات کے بعد حضرت الاستاذ کو جمعیت علماء ہند کی صدارت کے لئے منتخب کیا گیا اور ۱۹۶۰ء سے وفات (۱۹۷۲ء) تک کے درمیان جمعیت علماء ہند کے ہر اجلاس عام کی صدارت فرماتے رہے، ان تمام جلسوں کے خطبات صدارت طبع کئے گئے۔

علمی و سیاسی مقام | حضرت الاستاذ قدس سرہ کو ابتداء ہی سے اپنے معاصرین کے درمیان امتیازی مقام حاصل رہا، وہ مدرسہ شاہی مراد آباد میں رہتے ہوئے بھی ہندوستان کے صف اول کے علماء و قائدین میں شمار کئے گئے، اسی لئے شیخ الاسلام حضرت مدنی کو جب بھی تدریس سے مانع کوئی عذر پیش آتا تو مراد آباد سے حضرت الاستاذ کو دعوت دی جاتی تھی، مرض الوفا کے آخری ایام میں جب حضرت شیخ الاسلام کو معالجین نے درس سے منع کر دیا تو حضرت الاستاذ کو مراد آباد سے دیوبند بلا یا گیا اور مجلس شوری نے دارالعلوم کے لئے آپ کے قیام کو ضروری سمجھتے ہوئے دیوبند ہی میں روک لیا، اور آپ پہلے ۱۳۷۷ھ میں شیخ الحدیث پھر ۱۳۸۷ھ میں صدر المدرسین مقرر کئے گئے اس طرح آخر عمر میں ہندوستان کی علمی و سیاسی قیادت حضرت الاستاذ کی ذات پر انحصار کرتی تھی اور جو منصب ان کو ملتا تھا بلاشبہ حضرت الاستاذ کی ذات سے اس کی توقیر میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

وفات | افسوس کہ دارالعلوم کے مسند حدیث کو اعزاز، منصب صدر المدرسین کو زیب و استحکام اور جمعیت علماء ہند کی صدارت کو توقیر و احترام عطا کرنے والا علوم و کمالات کا یہ آفتاب چند ماہ کی علالت کے بعد ۲۰ صفر ۱۳۹۲ھ ۱۵ اپریل ۱۹۷۲ء کو مراد آباد کے افق میں غروب ہو گیا فانا للہ وانا الیہ راجعون، وفات کا حادثہ نصف شب کے بعد پیش آیا، وفات کی رات میں ایک روشنی چارپائی کے نیچے بار بار نمودار ہوتی تڑپتی اور رخصت ہو جاتی، جب وفات

ہوئی تو دور کے متعدد اہل محلہ نے دیکھا کہ ایک روشن قندیل زمین سے آسمان کی طرف صعود کر رہا ہے وہ اس علامت کو دیکھ کر حضرت الاستاذ کے گھر پہنچے تو وفات ہو چکی تھی۔

وفات کی خبر سن کر قرب و جوار اور دور و دراز کے ہزاروں غم گسار مراد آباد پہنچے، حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد طیب صاحب قدس سرہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور دوپہر کے بعد یہ گنجینہ بر علم و عرفان ہزاروں سوگواروں کے اشکپائے گرم اور تہ سرد کے ساتھ سپرد خاک کر دیا گیا۔

اللہم اغفر له وارفع درجته فی المہدیین واخلفه فی عقبہ فی الغابریں

واغفر لنا ولہ یا رب العالمین (آمین)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿سوانح امام بخاری رحمہ اللہ﴾

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على خير خلقه سيدنا ومولانا محمد وآله وصحبه أجمعين
اما بعد! یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ انسان کے سب سے قدیم علم کا نام ”علم تاریخ“ ہے گو اس کے نام ہر دور میں بدلتے رہے ہیں، انسان نے اس کی تدوین اپنے حافظہ سے شروع کی تھی اور آج وہ ہزاروں ہزار صفحات کی شکل میں تبدیل ہو چکی ہے۔

تاریخ ہی کا ایک شعبہ سیرت نگاری ہے یا یہ کہئے کہ تاریخ صرف دو چیزوں سے عبارت ہے ایک سلطانی قوت و جبروت کا مظاہرہ اور دوسرے کسی اصلاح شعار شخصیت کے جمال جہاں آرا کا پر تو! سچ پوچھے تو اگر تاریخ سے چند ایسی شخصیات کو نکال لیں تو تاریخ ایک صدائے بے ہنگام ہو کر رہ جائے۔

کلام الہی نے دنیا کے سامنے اس فن کی غرض و غایت کو صحیح طریق پر پیش کیا اور مقصد معین کر دیا کہ یہ سب کچھ کیوں کیا جاتا ہے، تفحص کے بعد دو باتیں سامنے آتی ہیں ایک یہ کہ شخصیت کے متعلق جو غلط درغلط حجاب پڑ جاتے ہیں ان کو اٹھا دیا جائے اور وہ بالکل نکھر کر سامنے آجائے، دوسرے یہ کہ اس کو قدوہ حسنہ یا بہتر سنگ میل کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے، دونوں باتیں انسان ہی کی آفریدہ ہیں، انسان کو جب حد سے زیادہ بغض و حسد کا شکار ہونا پڑتا ہے یا وہ حد سے زیادہ محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ شخصیت کے گرد اوہام کا ایک ایسا جال پھیلا دیتا ہے کہ جس میں شخصیت یکسر روپوش ہو جاتی ہے، پھر یہ کہ انسان کسی بھی دعوت خیر کو مجرد قانون کی شکل میں نہیں اپنا سکتا تا آنکہ اس کے سامنے دعوت کا کوئی جاذب نظر نمونہ نہ ہو۔

اسلام کے بعد فن تاریخ و سیرت نے ایک زبردست انقلاب دیکھا اور وہ یہ کہ فن اپنی قدامت اور حقیقت کے باوجود قصص و اوہام کا جال تھا، اسلام کے بعد اس سے انسانی زندگی پر اثر ڈالنے کا کام لیا گیا، اسلام کے بعد انسانی زندگی اور معاشرہ مختلف حصوں میں بٹ گیا، لیکن سیرت اور تاریخ ایک قدر مشترک ہیں جو تمام ہی طبقات میں پائی جاتی ہے، ان سب طبقات میں نمایاں محدثین کرام ہیں کیونکہ ان کے کام کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ سرور عالم ﷺ کے پیام اور آپکی زندہ جاوید شخصیت کو تمام و کمال محفوظ رکھیں اور روایۃ حدیث کے سلسلہ کو علم و نقد کا ایک زریں سلسلہ بنا دیں، امام بخاری علیہ الرحمہ اس جماعت کے سرخیل ہیں، لیکن یہ عجیب اتفاق زمانہ ہے کہ امام کی شخصیت تاریخ کے صفحات میں اس طرح محفوظ نہ رہ سکی جس طرح رہنی چاہئے تھی، میرے کہنے کا یہ مقصد نہیں کہ

مورخین نے امام کی سیرت نگاری میں تساہل سے کام لیا نہیں، بلکہ حافظ شمس الدین ذہبی نے ”تذکرۃ الحفاظ“ میں جہاں امام بخاری کا والہانہ انداز میں ذکر فرمایا ہے وہاں امام کی سیرت کے بارے میں اپنی ایک مستقل تالیف کا بھی پتہ دیا ہے حافظ ابن الملقن نے ”العقد المذہب“ میں سیرت امام کے بارے میں اپنی ایک جامع تالیف کا تذکرہ فرمایا ہے، علامہ محمد بن اسمعیل امیر یمنی اپنی تصنیف ”سبل السلام“ میں امام کی سوانح پر ایک مستقل تالیف کا پتہ دے رہے ہیں، علامہ اسمعیل عجلونی نے ”الفوائد الدراری“ کے نام سے امام کی سیرت پر ایک کتاب لکھی ہے لیکن مؤخر الذکر کے علاوہ اور کسی کتاب کا پتہ نہیں چل سکا اور مؤخر الذکر کتاب بھی صرف خان بہادر خدابخش صاحب مرحوم کے کتب خانہ پٹنہ میں موجود ہے، چنانچہ آج جب ڈھونڈنے والے ڈھونڈتے ہیں تو انہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن جو کچھ بھی تاریخ نے محفوظ رکھا ہے وہ اپنی بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ باختصار پیش خدمت ہے اور اس پیش کش کا مقصد داستان سرائی نہیں ہے بلکہ حکایت مہر و وفا کی طرف ایک بازگشت ہے، یعنی مقصد خواہ کتنا ہی اونچا کیوں نہ ہو اگر توفیق الہی اور ہمت و ارادہ کی بلندی نے ساتھ نہیں چھوڑا تو وہ کام سرانجام پا کر رہے گا اور اس طرح سرانجام پائے گا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی، دوسرے یہ کام انسان کے سامنے بلند سے بلند تر ہونا چاہئے تاکہ اس کام کی عظمت خود کام کرنے والے کو عظیم بنا دے، امام بخاری قدس سرہ کی زندگی اور ان کے کارناموں کی اصل عظیم صرف یہی دو چیزیں ہیں آپ دیکھیں گے کہ امام بادشاہ وقت نہ تھے امام کا گھرانہ پشتہا پشت سے علمی گھرانہ نہ تھا لیکن کام کی عظمت و اہمیت بتلا رہی ہے کہ شخصیت کس طرح ابھرتی اور واضح ہوتی ہوئی اس مقام تک پہنچتی ہے جہاں ہم دیکھ رہے ہیں۔

علم دین کے طالب علموں سے خاص طور پر یہ کہنا ہے، وہ جس علم کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ان میں سب سے بڑا دشمن ریاء و سمعہ ہے، یہ دنیا عجیب کارخانہ ہے یہاں اگر کوئی خود کو نمایاں کرتا ہے تو نمایاں نہیں ہوتا اور اگر نمایاں نہیں کرتا تو نمایاں ہوتا ہے میری اس گزارش کا زندہ ثبوت امام بخاری علیہ الرحمۃ کی ذات گرامی ہے۔

نام و نسب | امام بخاری کا نام ”محمد“ اور کنیت ابو عبد اللہ ہے، امیر المؤمنین فی الحدیث کے لقب سے مشہور ہیں سلسلہ نسب یہ ہے محمد بن اسمعیل بن المغیرہ بن بردزبہ بن بذبہ الجعفی البخاری

عام طور پر تمام مورخین امام کے سلسلہ نسب کو بردزبہ پر تمام کر دیتے ہیں لیکن علامہ تاج الدین سبکی نے طبقات کبریٰ میں بذبہ کا بھی اضافہ کیا ہے لیکن بذبہ اور بردزبہ دونوں کے بارے میں تاریخ بالکل خاموش ہے، ناموں کی ترکیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی النسل تھے، حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے بردزبہ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی قوم کے ہم مذہب تھے جس سے ان کا آتش پرست ہونا متبادر ہے، امام کے پردادا مغیرہ نے یمن الجعفی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا جو اس وقت حاکم بخارا تھے اور پھر بخارا ہی میں سکونت پذیر ہو گئے، اسی وجہ سے امام بخاری کو جعفی کہا جاتا ہے

کیونکہ قدیم زمانہ میں دستور یہ رہا ہے کہ جو شخص کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتا تھا اسی سے نسبت ولاء متعلق ہو جاتی تھی احناف اس کے قائل بھی ہیں اور اس سلسلہ میں ان کے پاس ابوداؤد کی روایت ہے۔

عن تمیم الداریؓ انه قال يا رسول الله ما السنة في الرجل يسلم علي يدي الرجل من المسلمين قال هو اولي الناس بمحياه ومماته (ابوداؤد جلد ثانی کتاب الفرائض)

حضرت تمیم داریؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! اس شخص کے بارے میں کیا طریقہ ہے جو مسلمانوں میں سے کسی کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے، فرمایا کہ وہی مسلمان لوگوں میں اسکی زندگی اور موت میں سب سے اولیٰ ہے۔

امام علیہ الرحمہ کے والد اسمعیل بڑے درجہ کے محدثین میں شمار کئے جاتے تھے، ان کی کنیت ابوالحسن ہے، یہ امام مالکؒ کے تلمیذ تھے، اور انہوں نے امام مالک، حماد بن زید اور ابو معاویہ وغیرہم سے احادیث روایت کی ہیں، عبداللہ بن مبارک سے بھی شرف صحبت حاصل رہا ہے، احمد بن حفص، نصر بن الحسین وغیرہ آپ کے شاگرد ہیں، اسمعیل بڑے ستودہ صفات اور پاکباز انسان تھے، ان کے شاگرد احمد بن حفص کا بیان ہے کہ میں وفات کے وقت حاضر خدمت تھا اس وقت اسمعیل نے فرمایا کہ میں اپنے کسب کردہ مال میں ایک درہم بھی مشتتبہ نہیں پاتا۔

تاریخ ولادت اور اسکی خصوصیات | امام بخاریؒ شہر بخارا میں نماز جمعہ کے بعد مورخہ ۱۳ شوال ۱۹۴ھ میں پیدا ہوئے، اول تو ماہ شوال حج کے مہینوں کا آغاز ہے جو اپنی اس خصوصیت کے لحاظ

سے کہ ایک طرف ماہ رمضان المبارک واقع ہے اور دوسری طرف ذوالقعدہ جو اشہر حرم کا پہلا مہینہ ہے ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور تیسری خصوصیت یہ ہے کہ ایام اسبوع میں بھی جمعہ کے دن کو دوسرے ایام پر مخصوص فضیلت ہے جو بہت سی روایات سے ثابت ہے۔

ایام طفولیت و تعلیم و تربیت | امام بخاری علیہ الرحمہ ابھی چھوٹے ہی تھے کہ امام کے والد اسمعیل رحمہ اللہ کا وصال ہو گیا، اور امام کی تربیت کی ذمہ داری والدہ محترمہ پر آگئی، امام کی والدہ بڑی عبادت گزار و خدا رسیدہ خاتون تھیں، بچپن ہی میں امام کی بصارت جاتی رہی تو والدہ کو بڑا صدمہ ہوا، والد کی وفات کا سانحہ ہی کچھ کم نہ تھا کہ ادھر بچہ کی آنکھیں بھی جاتی رہیں، وہ خداوند قدوس سے دعائیں کیا کرتیں، ایک رات جب دعا کرتے کرتے آنکھ لگی تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خواب میں دیکھا وہ فرماتے ہیں کہ تمہارے بیٹے کی آنکھیں خداوند قدوس نے روشن فرمادیں، صبح کو دیکھا تو واقعہ امام بخاری کی آنکھیں بالکل درست ہو گئی تھیں، بینائی واپس آ جانے کے بعد امام کی قوت بصارت اسقدر بڑھ گئی کہ انہوں نے تاریخ کبیر کا مسودہ چاندنی راتوں میں لکھا۔

۱ شرح السنہ لالکائی و تاریخ بخارا للنجار۔

تاج الدین سبکی نے طبقات کبریٰ میں لکھا ہے کہ دھوپ اور گرمی کی شدت میں امام نے طلب علم کے لئے سفر کئے تو دوبارہ امام کی پینٹی ختم ہو گئی، چنانچہ خراسان پہنچنے پر کسی نے کہا کہ سر کے بال صاف کرالیں اور پھر گل خطمی کا ضماد لگائیں؛ چنانچہ اس نسخہ کے استعمال سے پھر خداوندوں نے بصارت عنایت فرمادی بصارت عنایت ہو گئی تو امام سپرد مکتب کر دیئے گئے ابھی دس ہی سال کی عمر تھی کہ امام تعلیم مکتب سے فارغ ہو گئے اور اسی اثناء میں احادیث یاد کر نیکا شوق دل نشیں ہوتا گیا اور امام مختلف حلقہ ہائے درس میں شامل ہونے لگے۔

اسی زمانہ میں امام، بخارا کے مختلف حلقہ ہائے درس میں جانے لگے، محدث داخلی رحمہ اللہ بھی یہاں درس حدیث دیا کرتے تھے، ایک دن حضرت الاستاذ نے سند بیان کرتے وقت سفیان عن ابی الزبیر عن ابراہیم فرمایا، امام بخاری نے استاذ سے عرض کیا، سند اس طرح نہیں ہے کیونکہ ابوالزبیر نے ابراہیم سے روایت نہیں کی، محدث داخلی نے امام بخاری کو طفل نو آموز سمجھ کر ڈانٹ دیا؛ لیکن امام بخاری نے بڑی متانت، جرأت اور ادب سے عرض کیا کہ اگر آپ کے پاس اصل ہو تو مراجعت فرمائیں، بات معقول تھی محدث داخلی اٹھے اور اپنی جگہ جا کر کتاب نکالی، امام کی بات درست تھی واپس آئے اور فرمایا کہ لڑکے! اصل سند کیا ہے؟ امام نے لکھا: هو الزبیر وهو ابن عدی عن ابراہیم کسی نے امام سے پوچھا کہ اس وقت آپ کی عمر کیا تھی؟ فرمایا گیا: بارہ سال، یہ امام بخاری کی شہرت کا پہلا دن تھا، امام بخاری نے پہلے تو تمام شیوخ بخارا سے احادیث کا ذخیرہ جمع کیا جو اس وقت ممتاز محدث شمار کئے جاتے تھے اور جن کی درسگاہیں طالبین حدیث کے لئے مرکز تھیں، جن میں محمد بن سلام بیکندی، عبد اللہ بن محمد مسندی اور ابراہیم بن الأشعث کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں، ان ہی ایام میں امام بخاری نے عبد اللہ بن مبارک کی کتابیں حفظ کر لی تھیں، امام بخاری سے اساتذہ کے مرعوب ہونے کا یہ عالم تھا کہ اساتذہ امام کے شریک درس ہونے سے سنبھل جاتے تھے کہ کہیں امام کے سامنے کوئی اعز ش نہ ہو جائے علامہ بیکندی نے تو یہ فرمایا بھی ہے کہ محمد بن اسمعیل کے آجانے سے مجھ پر عالم تحیر طاری ہو جاتا ہے اور میں ان کی وجہ سے احادیث بیان کرتے ہوئے ڈرتا ہوں، اسی وقت کا ایک یہ بھی واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ سلیم بن مجاہد، محمد بن سلام بیکندی کے پاس تشریف لائے تو علامہ بیکندی نے سلیم بن مجاہد سے فرمایا کہ اگر تم ذرا دیر پہلے آجاتے تو ایسا لڑکا دیکھتے جسے ستر ہزار حدیثیں یاد ہیں سلیم بن مجاہد کا بیان ہے کہ مجھے یہ سنکر بڑی حیرت ہوئی اور میں امام کی تلاش میں نکلا، ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ کیا تمہیں کو ستر ہزار احادیث یاد ہونے کا دعویٰ ہے اس پر امام نے فرمایا کہ بیشک مجھے اس قدر بلکہ اس سے بھی زائد یاد ہیں صرف احادیث ہی پر کیا منحصر ہے سلسلہ سند میں تم جسکے متعلق بھی پوچھو گے ان میں سے اکثر کی جائے سکونت اور تاریخ وفات کا بھی پتہ دے سکتا ہوں اور اپنے روایت کردہ

اقوال صحابہ و تابعین کے بارے میں یہ بھی بتلا سکتا ہوں کہ وہ کن کن آیات و احادیث سے ماخوذ ہیں ایک مرتبہ محمد بن سلام بیکندی نے امام سے فرمایا کہ تم میری تصنیف کو ایک مرتبہ اپنے مطالعہ سے نکال دو اور اسمیں جہاں غلطی ہو اس کی اصلاح کر دینا، کسی نے بڑے استعجاب سے کہا کہ یہ لڑکا کون ہے جسکا مطلب یہ تھا کہ آپ امام العصر ہو کر بھی اس سے اپنی اصلاح کے لئے کہہ رہے ہیں، بیکندی علیہ الرحمہ نے کہا کہ اس کا کوئی ثانی و مقابل نہیں ہے۔

محمد بن سلام بیکندی کے یہ تمام ارشادات اسی وقت کے ہو سکتے ہیں کہ جب تک امام بخاری علیہ الرحمہ نے طلب علم کے لئے بخارا سے باہر کہیں سفر نہیں فرمایا تھا کیونکہ سفر کے بعد واپسی پر بیکندی سے امام کی ملاقات نہیں ہوئی۔

طلب علم کیلئے امام کے اسفار | حدیث یا حدیث کی عالی سند کے حصول کے لئے جو سفر کیا جاتا ہے اسے محدثین کی اصطلاح میں رحلت کا نام دیا گیا ہے، صحابہ کرام اور تابعین کو اس سفر کے ساتھ شغف رہا ہے اور صرف ایک ہی حدیث کے لئے ان حضرات نے ایک ایک ماہ کی مسافت طے کی ہے، قرآن کریم نے بھی حصول تفقہ اور واپسی پر اصلاحی کام کرنے کی غرض سے سفر کی تاکید فرمائی ہے، حضرت ابراہیم بن ادہم کا مقولہ ہے کہ اصحاب حدیث کے اسفار کی برکت سے خداوند قدوس اس امت سے بلاؤں کو اٹھا لیتا ہے امام بخاری علیہ الرحمہ کو اس سلسلہ میں طویل اسفار کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ امام کا دور اسلام کی فتوحات کا دور ہے اور اسلامی مملکت کے وسیع ہو جانے سے تابعین، تبع تابعین اور حاملین حدیث دور دور تک پھیل گئے تھے لیکن حرمین کو مہبط وحی ہونے کی حیثیت سے ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے، امام بخاری علیہ الرحمہ عمر کے سولہویں سال تک مقامی طور پر مشائخ بخارا سے کسب فیض کرتے رہے اور پھر سولہ سال کی عمر میں ۲۱۰ھ میں والدہ محترمہ اور اپنے بھائی احمد کے ہمراہ حج کیلئے تشریف لے گئے، حج سے فراغت کے بعد والدہ اور امام کے بھائی واپس تشریف لے آئے اور امام نے علوم حدیث کی تحصیل کے لئے وہیں اقامت اختیار کی، اس وقت نغمہ کے مشہور محدثین میں ابوالولید احمد بن الازرقی، عبداللہ بن یزید، اسمعیل بن سالم الصائغ، ابوبکر عبداللہ بن الزبیر اور جمیدی خاص امتیاز رکھتے تھے، مکہ مکرمہ کے ارباب علم سے تحصیل کمال کے بعد امام بخاری مدینہ کے لئے روانہ ہوئے، مدینہ کے مشہور محدثین میں ابراہیم بن المنذر، مطرف بن عبداللہ، ابراہیم بن حمزہ، ابو ثابت محمد بن عبید اللہ، عبدالعزیز بن عبداللہ الاویسی قابل ذکر ہیں، اسی سفر میں امام نے تاریخ کبیر کا مسودہ چاندنی راتوں میں تحریر فرمایا ہے، مؤرخین نے بلاد حجاز میں امام بخاری کی اقامت کی مدت چھ سال بتلائی ہے لیکن یہ مدت ایک سفر کی نہیں ہو سکتی بلکہ اسے کئی اسفار پر تقسیم کرنا ہوگا، مدینہ کے بعد امام نے بصرہ کا رخ فرمایا اور وہاں امام ابو عاصم النبیل، صفوان بن عیسیٰ، محمد بن عرعہ، بدل بن الحکم، حرمی بن عمارہ، عفان بن مسلم، سلیمان بن حرب، ابوالولید الطیالسی غارم، محمد بن سنان وغیرہم سے احادیث حاصل کیں، امام صاحب کا بیان ہے کہ میں نے بصرہ کا سفر چار مرتبہ

کیا ہے بصرہ کے بعد امام صاحب نے کوفہ کا قصد فرمایا، ذرا بخاری نے کوفہ اور بغداد کے سلسلہ میں امام کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے۔

لا احصى كم دخلت الى الكوفة وبغداد مع المحدثين میں شمار نہیں کر سکتا کہ میں محدثین کے ہمراہ کوفہ اور بغداد کتنی بار گیا ہوں، امام نووی نے تہذیب الاسماء میں کوفہ کے ان مشاہیر علماء کے اسماء گرامی شمار کرائے ہیں جن پر امام بخاری نے اعتماد فرمایا ہے، عبد اللہ بن موسیٰ، ابو نعیم، احمد بن یعقوب، اسمعیل بن ابان، الحسن بن الربیع، خالد بن مخلد، سعید بن حفص، طلاق بن غنام، عمر بن حفص، عروہ، قبیصہ بن عقبہ، ابو غسان وغیرہم، بغداد چونکہ عباسی سلطنت کا پایہ تخت رہا ہے، اس لئے حکومت کی علم پروری نے بغداد کو علوم و معارف کا مرکز بنا دیا تھا، اسی وجہ سے امام کو بغداد میں بار بار آنے کی ضرورت ہوئی، ابو علی غسانی نے تقلید المہمل میں تحریر فرمایا ہے کہ جب امام بخاری بغداد کے آٹھویں اور آخری سفر سے واپس ہونے لگے تو امام احمد بن حنبل سے ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، اس وقت امام احمد نے پردرد لہجہ میں فرمایا۔

اترك الناس والعصر والعلم
وتصير الى خراسان
کیا تم لوگوں کو عصر و علم کو چھوڑ دو گے اور خراسان چلے جاؤ گے۔

چنانچہ جب حاکم بخارا ابوطاہر نے امام بخاری پر بیجا الزام تراشی کے بعد امام کو بخارا سے نکلوانے کی ناپاک تدبیر کی تو امام بخاری امام احمد کے اس مقولے کو افسوس کیساتھ یاد فرماتے تھے، بغداد کے مشائخ حدیث میں امام احمد بن حنبل، محمد بن سائق، محمد بن عیسیٰ الصباغ اور سرتج بن العثمان کے اسماء گرامی قابل ذکر ہیں، طلب علم ہی کیلئے امام بخاری نے شام مصر اور جزیرہ کا سفر فرمایا ہے، شام کے مشائخ میں یوسف فریابی، ابو نصر، اسحاق بن ابراہیم، آدم بن ابی ایاس، حکم بن نافع، حیوہ بن شریح اور مصر کے مشائخ میں عثمان بن الصالح، سعید بن ابی مریم، عبد اللہ بن صالح، احمد بن صالح، احمد بن شعیب، اصبح بن الفرغ، سعید بن ابی عیسیٰ، سعید بن کثیر، یحییٰ بن عبد اللہ اور جزیرہ کے مشائخ میں احمد بن عبد الملک الحرانی، احمد بن یزید الحرانی، عمر بن خلف، اسمعیل بن عبد اللہ الرقی کے اسماء قابل ذکر ہیں، گوطبات کبریٰ میں سبکی نے امام کی جزیرہ میں تشریف آوری سے انکار کیا ہے اور کہا ہے کہ مشائخ جزیرہ سے امام بالواسطہ روایت کرتے ہیں لیکن انکایہ فرمانا ابن حجر اور نووی کے اقوال سے مختلف ہے اسی طرح امام بخاری نے خراسان میں مرو، بلخ، ہراة، نیشاپور، رقی وغیرہ کے محدثین سے استفادہ کیا ہے، مرو میں علی بن حسن، عبدان، محمد بن مقاتل، بلخ میں یحییٰ بن ابراہیم، یحییٰ بن بشیر، محمد بن ابان، حسن بن شجاع، یحییٰ بن موسیٰ، قتیبہ اور ہراة میں احمد بن ابی الولید الحنفی اور نیشاپور میں یحییٰ بن یحییٰ، بشر بن الحکم، اسحاق بن راہویہ، محمد بن نافع وغیرہ سے علوم حاصل فرمائے۔

غرض امام بخاری نے طلب حدیث کیلئے تقریباً تمام ہی اسلامی ممالک کا سفر فرمایا جعفر بن محمد بن حطان کہتے

ہیں کہ میں نے امام بخاری کی زبان سے یہ الفاظ سنے ہیں کہ میں نے ایک ہزار سے زیادہ مشائخ حدیث سے احادیث سنی ہیں، اور میرے پاس جس قدر بھی حدیثیں ہیں، ان کی سند بھی مجھے محفوظ ہے۔

علم علل احادیث میں امام کی انفرادی شان | اصطلاح حدیث میں علت اس پوشیدہ سبب کا نام ہے جس سے حدیث کی صحت مجروح ہوتی ہے، علم حدیث میں کمال حاصل

کرنے کے لئے جن فنون کی ضرورت ہے ان میں صرف یہی چیز ایسی ہے جس کے لئے بے پناہ قوت حافظہ، سیال ذہن اور نقد و انتقاد کی کامل دسترس درکار ہے، اس کیلئے ضروری ہے کہ تمام روایۃ حدیث کے بارے میں پیدائش اور وفات کے اوقات کی خبر ہو، ان کی باہمی ملاقات کی تاریخ کا علم ہو، ان کے نام، القاب، اور کنیتیں یاد ہوں اور جملہ راویوں کے الفاظ حدیث پوری طرح ضبط ہوں، اس علم کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ علی بن مدینی کے اس قول سے کیا جاسکتا ہے کہ مجھے میں نامعلوم حدیثیں لکھنے سے کہیں زیادہ یہ مرغوب ہے کہ کسی حدیث کی علت قادم معلوم ہو جائے، امام بخاری اس بارے میں انفرادی شان کے مالک تھے، امام ترمذی نے کتاب العلیل میں فرمایا ہے کہ میں نے جامع ترمذی میں احادیث کی جس قدر علتیں بیان کی ہیں، یا فن رجال و تاریخ کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اسکا بیشتر حصہ خود امام بخاری سے یا ان کی تاریخ سے لیا ہے، ہاں چند مقامات پر امام داری اور ابو زرہ سے بھی استفادہ کیا ہے، حافظ بن حجر نے اسکے لئے متعدد واقعات نقل فرمائے ہیں، حافظ احمد بن حمدون کا بیان ہے کہ میں عثمان ابوسعید بن مروان کے جنازہ میں حاضر ہوا امام بخاری بھی تشریف فرما تھے، اس موقع پر امام محمد بن یحییٰ ذہلی نے امام بخاری سے اسما، رواۃ اور علل احادیث کے سلسلہ میں کچھ پوچھا تو امام نے اس قدر بر جستگی سے ان کے جوابات عنایت فرمائے جیسے کوئی قل ہو اللہ کی تلاوت کر رہا ہو۔ امام بخاری کے قیام نیشاپور کے زمانے کا ایک واقعہ ابو احمد عمش اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ میں امام بخاری کی مجلس میں حاضر ہوا، امام مسلم تشریف لائے اور ایک حدیث کا ابتدائی حصہ معلق سنا کر پوچھا کہ یہ حدیث اگر آپ کے پاس ہو تو اسے متصل فرمادیتے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ عبید اللہ بن عمر عن ابی الزبیر عن جابر قال بعثنا رسول اللہ ﷺ فی سرية ومعنا ابو عبیدة الحدیث۔

سوال کے مقاصد یہ ہو سکتے ہیں کہ عبید اللہ تابعی ہیں، اس لئے یہ حدیث امام کے پاس ہے یا نہیں، اگر ہے تو متصل السند ہے یا نہیں، اور اگر سند ہے تو معلل ہے یا غیر معلل یعنی صحیح ہے پھر اگر معلل ہے تو امام کو اس کی خبر ہے یا نہیں؟ امام بخاری نے اسی وقت حدیث کو متصل السند فرمادیا کہ حدثنا ابن ابی اویس حدثنی اخی عن سلیمان بن بلال عن عبید اللہ الی اخر الحدیث۔

اسی مجلس کا ایک یہ بھی واقعہ مشہور ہے کہ کسی شخص نے یہ سند پڑھی۔

حجاج بن محمد عن ابن جریج عن موسی بن عقبہ عن سہیل بن ابی صالح عن ابیہ عن ابی

ہریرہ عن النبی ﷺ كفارة المجلس اذا قام العبد ان يقول سبحانك اللهم وبحمدك استغفرك واتوب اليك. حدیث سکر امام مسلم نے عرض کیا کہ اس حدیث کی اس سے اونچی سند پورے عالم میں نہیں ہے، امام نے فرمایا نعم لکنہ معلول۔ اور احمد بن حمدون کے بیان کے مطابق اس سلسلہ سند کو جسے معلول فرمایا تھا اور دو طریق سے بیان کیا اور فرمایا کہ علت سے خالی نہیں، امام مسلم لرز گئے اور فرمایا کہ مجھے علت سے آگاہی ہونی چاہئے، امام نے فرمایا کہ جس پر اللہ نے پردہ ڈال رکھا ہے تمہیں اسے چھپانا چاہئے، لیکن امام مسلم نے اس قدر اشتیاق ظاہر کیا کہ رونے کے قریب ہو گئے تو امام بخاری نے فرمایا کہ اگر تم ضروری ہی سمجھتے ہو تو غیر معلول سلسلہ سند اس طرح ہے، حدثنا موسی بن اسماعیل حدثنا وهيب حدثنا موسى بن عقبة عن عون بن عبد الله قال قال رسول الله ﷺ كفارة المجلس اذا قام العبد ان يقول سبحانك اللهم وبحمدك استغفرك واتوب اليك. اسکے بعد امام مسلم نے اصرار فرمایا کہ حدیث کی علت بھی بتلا دیں تو امام بخاری نے فرمایا کہ موسی بن عقبہ کی کوئی حدیث سہیل سے مرفوع نہیں ہے اور پھر امام نے اسکا ثبوت پیش فرمایا۔ اسماء و کنی کی معرفت میں امام کا مشہور واقعہ ہے کہ علامہ فریابی نے امام بخاری کی موجودگی میں اپنی مجلس میں ایک حدیث سند سفیان عن ابی عروہ عن ابی الخطاب عن ابی حمزة روایت فرمائی، حاضرین سفیان کے بعد کے مشائخ میں سے کسی کو نہ پہچان سکے امام بخاری نے فرمایا کہ ابو عروہ معمر بن راشد ہیں، اور ابو الخطاب قتادہ بن دعامہ اور ابو حمزہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔

رواۃ حدیث میں جرح و انتقاد کی ضرورت | حدیث بیان کرنے والے حضرات میں یہ ضروری ہے کہ انکی صداقت و ثقاہت مسلم و مشہور ہوتا کہ بات نکھر کر سامنے آجائے۔

ارشاد ربانی ہے۔

اے ایمان والو! اگر آئے تمہارے پاس کوئی فاسق خبر لیکر تو تحقیق کر لو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا.

لیکن چونکہ کسی کے متعلق کاذب یا غیر ثقہ ہونیکا فیصلہ کرنا بھی ایک نہایت اہم اور ذمہ داری کی بات ہے اسلئے حضرات صوفیہ کی ایک معتد بہ جماعت کا فیصلہ ہے کہ جرح و انتقاد ایک گونہ غیبت ہے جس کے لئے قرآن کریم میں لَا يَغْتَاب بَعْضُكُمْ بَعْضًا فرمایا گیا ہے، لیکن سچ یہ ہے کہ ان کا یہ فرمانا سرتا سرتا سادگی ہے شریعت خواہ مخواہ کسی شخص کے بارے میں بدکلامی و بدگمانی سے روکتی ہے، لیکن اگر دینی سلسلہ میں اسکی ضرورت پڑ جائے تو ایسا کرنا نہ صرف جائز بلکہ بعض صورتوں میں ضروری بھی ہے، احادیث کے سلسلہ میں بھی اسکی ضرورت محسوس کی گئی، مخالفین اسلام کا تو کہنا کیا خود

۱۔ محمد بن سلام حدثنا محمد بن یزید أخبرنا ابن جریج، اور دوسری سند احمد بن حنبل و یحیی بن معین قال حدثنا حجاج بن

محمد عن ابن جریج۔ ۲۔ مقدمۃ الفتح ۳۔ ایضاً ۱۲۔

مسلمانوں کا اور ان میں بھی نیک لوگوں کا ایک گروہ فضائل اعمال کے بارے میں احادیث وضع کرنا باعث اجر و ثواب سمجھتا تھا، عبدالکریم وضاع نے اپنے بیان کے مطابق چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس چھان بین اور جرح و تعدیل کا سلسلہ خود اصحاب کرام کے دور ہی میں شروع ہو گیا تھا کیونکہ خوارج اور روافض کے ظہور کے بعد تفتیش ہی سے روایت لی جاتی تھی اور پھر جب درمیانی وساطت بڑھتی گئی جرح و انتقاد کا دائرہ وسیع تر ہوتا چلا گیا لیکن اتنا ضرور ہے کہ اسکی اہمیت و نزاکت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، جہاں قرآن کریم میں چھان بین اور تفتیش کا حکم ہے وہاں مسلمان کی غیبت کے بارے میں وعید شدید سے کام لیا گیا ہے۔

بخاری کی راہ عمل | امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس سلسلہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، ان کے یہاں عام محدثین کی طرح کذاب اور وضاع کا استعمال نہیں ہے بلکہ ان کے یہاں کثیر الاستعمال الفاظ ”ترکوه“، ”انکرہ الناس“، ”لمتر وک“، ”الساقط“، ”فیہ نظر اور سکتوا عنہ“ وغیرہ ہیں اور جب امام کسی کے بارے میں واجب التردید ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کے لئے ”منکر الحدیث“ کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں، ابن قطان نے امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مقولہ نقل فرمایا ہے کل من قلت فیہ منکر الحدیث لایحل الروایۃ عنہ یعنی میں جس کے بارے میں منکر الحدیث کہوں اس سے روایت لینا درست نہیں ہے، امام کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے فرمایا ما غبت مذ علمت ان الغیبة حرام یعنی جب سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ غیبت حرام ہے میں نے کسی کی غیبت نہیں کی، فرمایا کرتے تھے کہ غیبت کے بارے میں قیامت میں کوئی مجھ سے دادخواہ نہ ہوگا۔ وراق نے کہا کہ لوگ آپ کی تاریخ کے بارے میں اتہام غیبت لگاتے ہیں فرمایا کہ ہم نے تاریخ میں متقدمین کے اقوال نقل کرنے کا اہتمام کیا ہے، ہماری اپنی جانب سے اس میں کچھ نہیں ہے۔

اپنی ذات کے بارے میں امام کا طریقہ | امام علیہ الرحمہ خود اپنے اور اپنی تصانیف کے بارے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے ایک مرتبہ کسی شخص نے امام سے ایسی حدیث کے بارے میں سوال کیا جس میں تدلیس کا گمان تھا، امام نے فرمایا کیا تمہیں میرے بارے میں تدلیس کا شبہ ہے حالانکہ اسی تدلیس کے اشتباہ پر میں نے ایک محدث کی دس ہزار بلکہ اس سے بھی کچھ زائد احادیث ترک کر دیں اور صرف اندیشہ تدلیس ہی پر ایک اور محدث کی بھی تمام ہی احادیث کو چھوڑ دیا۔

اسی طرح امام بخاری اپنی کتابوں کے بارے میں بھی سخت احتیاط فرماتے، ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں نہ دیتے بلکہ شیخ مسدد کے بارے میں وہ فرمایا کرتے تھے۔

مسدد اپنے نام کی طرح قابل اعتماد ہیں مجھے اس بات کی پرواہ نہیں کہ میری کتابیں میرے پاس ہوں یا ان کے۔

مسدد کاسمہ مسدد لا ابالی ان
تکون کتبی عنده او عندی۔^۲

۱۔ مقدمہ فتح الباری، طبقات کبریٰ۔ ۱۲ ۲۔ الفوائد الدرداری، بحوالہ سیرت البخاری۔ ۱۲

صاحب فتح الباری نے علامہ عجلونی سے امام کی احتیاط کے بارے میں ایک عبرت آموز واقعہ نقل فرمایا ہے کہ ایام طالب علمی میں ایک بار امام کو دریائی سفر پیش آیا، امام ایک ہزار اشرفیاں لیکر دریا میں سوار ہوئے، ایک رفیق سفر بھی مل گیا جس نے عقیدت مندانہ راہ و رسم کی بنا پر اپنا اعتماد قائم کر لیا، امام نے اسے اشرفیوں کی بھی اطلاع دیدی، ایک صبح جب یہ عقیدت مند سوکراٹھا تو باواز بلند رونا پینا شروع کیا، لوگوں نے باصرار پوچھا تو اس نے بتلایا کہ میری ایک ہزار اشرفیاں گم ہو گئی ہیں، اسکی اس درجہ پریشانی کے پیش نظر جہاز والوں کی تلاشی لی جانے لگی، امام نے یہ دیکھ کر وہ تھلی سمندر میں ڈال دی، امام کی بھی تلاشی لی گئی لیکن جب کہیں سے بھی وہ اشرفیاں ہاتھ نہ آئیں تو جہاز والوں نے اسے بہت شرمندہ کیا، جب سفر ختم ہو گیا اور جہاز سے تمام مسافر اتر گئے تو اس شخص نے امام صاحب سے ملاقات کی اور اشرفیوں کے بارے میں دریافت کیا، امام نے فرمایا کہ میں نے انہیں سمندر میں پھینک دیا تھا، اس نے کہا کہ اتنی بڑی رقم کا ضیاع آپ نے کس طرح برداشت فرمایا، امام نے فرمایا کہ جس دولتِ ثقاہت کو میں نے عمر عزیز گنوا کر حاصل کیا ہے اسے چند ٹکوں کے عوض نہیں لٹایا جاسکتا، ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امام نے اپنے لئے جس راہ عمل کو اختیار فرمایا تھا وہ کس قدر اخلاص، دیانت، تقویٰ اور احتیاط پر مبنی تھی۔

ذریعہ معاش اور اسمیں احتیاط کا پہلو | امام بخاری کو میراث میں اپنے والد اسمعیل سے غیر معمولی دولت ملی تھی

احمد بن حفص تلمیذ اسمعیل کا بیان ہے کہ وفات کے وقت میں حاضر خدمت تھا، اسمعیل نے فرمایا کہ میں اپنے مال میں ایک درہم بھی مشتبہ نہیں پاتا، امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس پاکیزہ مال کو تجارت میں (مضاربت کی صورت میں) لگا دیا تھا۔ تاکہ خود تجارت کے جھمیلوں سے فارغ ہو کر بہ سکون قلب خدمت دین کر سکیں، وراق کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ کسی مضارب نے امام صاحب کی پچیس ہزار روپے کی کثیر رقم دہالی، امام سے عرض کیا گیا کہ آپ یہاں کے گورنر سے مقروض کے مقام اقامت کے گورنر کے نام ایک مکتوب حاصل فرمائیجئے، رقم باسانی وصول ہو جائے گی، لیکن امام صاحب نے فرمایا کہ اگر آج میں گورنر سے مکتوب حاصل کروں گا تو کل وہ لوگ میرے معاملات میں دخل انداز ہوں گے اور میں دنیا کی بدولت اپنے دین کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا، درمیان میں کچھ معاملات پیش آئے اور بالآخر امام نے مقروض سے اس بات پر صلح کر لی کہ وہ ہر ماہ دس درہم امام کو ادا کیا کریگا لیکن وہ تمام مال ضائع ہو گیا اور کچھ وصول نہ ہو سکا، وراق بخاری کا بیان ہے کہ امام نے فرمایا میں نے کبھی خرید و فروخت کا معاملہ نہیں کیا بلکہ میں دوسرے انسان کی معرفت یہ کام کراتا ہوں، اس کا سبب پوچھا گیا تو امام نے فرمایا کہ خرید و فروخت میں ادھر ادھر کی جھوٹی سچی باتیں کرنی پڑتی ہیں جو مناسب نہیں، ابو حفص نے امام کی خدمت میں کچھ مال ارسال کیا، شام کے وقت کچھ تاجر آئے اور انہوں نے پانچزار نفع دیکر مال خریدنا چاہا، امام نے فرمایا کہ آج

رات تو رہنے دیجئے، صبح ہوئی تو دوسرے تاجر آئے اور انہوں نے دس ہزار نفع دیکر وہ مال خریدنا چاہا، لیکن امام نے یہ فرما کر انہیں انکار کر دیا کہ میں کل شام آئیوں لے تاجروں کو دینے کی نیت کر چکا ہوں اور اب اس نیت کو لوٹانا پسند نہیں کرتا۔

صبر و تحمل کی واردات | اس قدر فارغ البالی کے باوصف امام بخاری علیہ الرحمہ نے طالب علمی کے ایام میں صبر و استقلال کا وہ اہم کردار پیش کیا ہے جو اس فراوانی عیش کے ساتھ امام ہی کا حصہ تھا وراق بخاری کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امام علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ میں طلب حدیث کیلئے آدم بن ابی ایاس کے پاس گیا اور خرچ ختم ہو گیا تو میں نے اس سفر میں گھاس اور پتے کھانے شروع کر دیئے۔ جب تین دن ہو گئے تو ایک اجنبی انسان نے مجھے تھیلی دی جس میں دینار تھے۔

حفص بن عمر الاشقر کا بیان ہے کہ ہم چند ہم سبق جن میں امام بخاری بھی شریک تھے بصرہ میں احادیث لکھا کرتے تھے لیکن درمیان میں یہ واقعہ پیش آیا کہ امام کئی دن تک نہ آئے تفتیش کے بعد معلوم ہوا کہ خرچ ختم ہو گیا تھا اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ امام کو بدن کے کپڑے بھی فروخت کرنے پڑ گئے چنانچہ ہم نے امام کے لئے چندہ کیا اور کپڑے تیار کرائے، پھر امام نے درس میں شرکت فرمائی، اسی فقر کیشی کا اثر تھا کہ ایک مرتبہ امام بخاری بیمار ہو گئے تو ان کا قارورہ اطباء کو دکھلایا گیا، اطباء نے تشخیص کے بعد کہا کہ یہ قارورہ ان راہوں کے قارورہ کے مشابہ ہے جو روٹی کے ساتھ نانخورش کا استعمال نہیں کرتے اور پھر اطباء نے مرض کا علاج بھی نانخورش کا استعمال تجویز کیا، امام سے جب اس بارے میں دریافت کیا گیا، تو فرمایا کہ چالیس سال سے استعمال نہیں کیا ہے لیکن جب علاج کے بارے میں عرض کیا گیا تو اسکے قبول کرنے سے انکار کر دیا مگر جب زیادہ اصرار کیا گیا تو کھانے کیساتھ صرف شکر کا استعمال منظور فرمایا۔

اس طرح مشقتیں برداشت کرنا امام کی فطرت میں داخل ہو گیا تھا شہر بخارا سے باہر ایک مہمان خانہ تعمیر کرایا تو اینٹیں پہنچانے والے مزدوروں کے ساتھ امام بھی اپنے سر پر اینٹیں اٹھاتے تھے، کسی شاگرد نے کہا آپ کیوں تکلیف فرماتے ہیں، لیکن امام نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کہ دراصل کام آئیوں کی خدمت یہی ہے، وراق بخاری کا بیان ہے کہ کتاب التفسیر لکھتے وقت امام رات میں پندرہ بیس مرتبہ اٹھتے تھے اور احادیث پر نشان لگاتے تھے، میں بھی حاضر خدمت رہتا تھا، ایک روز میں نے عرض کیا کہ آپ مجھے جگا دیا کریں میں چراغ روشن کر دیا کرونگا اور دوسرے کام بھی انجام دوں گا، امام نے فرمایا تم جو ان آدمی ہو میں تمہاری نیند میں خلل ڈالنا پسند نہیں کرتا۔

جذبہ ایثار و اخلاص | امام بخاری علیہ الرحمہ خود تو بہت سادہ مزاج اور بے تکلف انسان تھے امام کے اپنے مصارف کے بارے میں تو کرمانی کا بیان ہے کہ وہ کئی کئی دن تو بغیر کھائے گزار دیتے تھے اور کبھی صرف دو تین بادام کھا لینا بھی ان کے لئے کافی ہوتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ امام صاحب خیر انسان تھے اپنی تجارت

سے حاصل کیا ہوا نفع طلبہ و محدثین پر صرف فرماتے تھے، مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں ہے کہ امام ہر ماہ فقراء و مساکین اور طلبہ و محدثین پر اپنی آمدنی سے پانچ سو درہم صرف فرماتے تھے، امام کی بے نفسی کا واقعہ عبداللہ بن محمد صیاری نے بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ امام کے مکان پر حاضر ہوا، امام بخاری کی باندی اس طرف سے گزری اور دوات پر ٹھوکر لگ جانے کی وجہ سے روشنائی فرش پر گر گئی، امام نے ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا کس طرح چلتی ہے؟ باندی نے جواب دیا کہ جب کسی جانب راستہ ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے، امام یہ جواب سن کر ناراض نہیں ہوئے بلکہ ہاتھ دراز کر کے فرمایا کہ جاؤ میں نے تمہیں آزاد کیا، اس پر کسی نے امام سے پوچھا کہ اس نے تو ناراضگی کے اسباب مہیا کئے تھے امام نے فرمایا کہ میں نے اس کے اسی کام سے اپنے کو راضی کر لیا یعنی اپنے نفس کی اصلاح کی۔

سنت کے ساتھ شغف | جس طرح صحابہ کرام کو رسول اکرم ﷺ کے ہر عمل کو اپنانے کا بے انتہا شوق تھا اسی طرح ہر وہ انسان جسے آپ کیساتھ شغف خاطر ہوگا اس کو ضرور آپ کے اعمال اختیار کرنے کا بھی اشتیاق ہوگا، خصوصاً وہ حضرات جن کا شب و روز کا مشغلہ ہی علم حدیث رہا ہو، اسی لئے محدثین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ عمل بالحدیث میں پیش پیش رہتے ہیں، امام احمد نے فرمایا کہ میری نظر سے جو حدیث بھی گزری میں نے اس پر ضرور عمل کیا ہے حتیٰ کہ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے سچھنے لگوائے اور حجام کو اسکی اجرت ایک دینار عنایت فرمائی تو میں نے بھی سچھنے لگوا کر حجام کو ایک دینار دیا، دوسرے اور محدثین سے بھی اس قسم کے جملے منقول ہیں کہ ہم حدیث یاد کرنے کے لئے اسپر عمل کرتے تھے، امام بخاری علیہ الرحمۃ بھی عمل بالحدیث کے بارے میں بہت مستعد تھے، انہوں نے اس سلسلے میں یہ ضروری نہیں سمجھا کہ وہ جو بھی کام کریں وہ علمی ہی ہو بلکہ جس چیز کا ثبوت حدیث سے ہو جائے اس پر عمل کرنا چاہئے، انہوں نے اسوۂ حسنہ کی تقلید میں مزدوروں کیساتھ بھی کام کیا، موقع آجانے پر گھاس اور پتیوں پر بھی گزری اور انتہا یہ ہے کہ نشانہ بازی کے بارے میں چونکہ فضیلت کی احادیث وارد ہوئی ہیں اسلئے امام نے اس کی بھی مشق کی، اور وراق بخاری کے بیان کے مطابق امام اسقدر اچھے تیر انداز تھے کہ بارہا امام کی خدمت میں حاضری کے باوجود انہوں نے صرف دو مرتبہ کے علاوہ کبھی امام کا نشانہ چوکتا ہوا نہیں دیکھا، ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ امام ”فربز“ کے باہر تیر اندازی کے لئے نکلے، تیر اندازی شروع ہوئی تو امام کا تیر پل کی میخ پر جاگا جس سے پل کو نقصان پہنچ گیا امام سواری سے اتر گئے اور میخ سے تیر نکال لیا، ہمیں بلایا اور فرمایا کہ ابو جعفر تم پل کے مالک کے پاس جاؤ اور اس سے کہنا کہ ہمارے تیر سے تمہارے پل کو نقصان پہنچ گیا ہے اس لئے یا تو ہمیں پل کی مرمت کی اجازت دی جائے ورنہ ہم سے اس نقصان کا تاوان لے لیا جائے تاکہ ہم کسی صورت غلطی کی تلافی کر سکیں، پل کے مالک حمید بن الاخضر نے جواب میں کہلا بھیجا کہ امام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ آپ بہر صورت بے قصور ہیں میری تمام دولت آپ

پر قربان ہے، پیغام پہنچے پر امام بخاری نے پانچ سو احادیث بیان فرمائیں۔ اور فقراء و مساکین پر تین سو دراهم بطور صدقہ تقسیم فرمائے۔

یوں تو امام بخاری علیہ الرحمہ کی عبادت گزاری کے لئے یہی وصف کیا کم ہے **شوق عبادت اور اسمیں استغراق** کہ ان کا ہر کام رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں ہوتا تھا لیکن اس کے علاوہ امام کا ہمیشہ کا معمول تھا کہ آخر شب میں تیرہ رکعتیں ادا فرماتے تھے اور ماہ رمضان المبارک میں اس کی رفتار فزوں تر ہو جاتی تھی، حافظ ابو عبد اللہ الحاکم کا بیان ہے کہ جب رمضان کی پہلی شب آتی تو لوگ امام کی خدمت میں جمع ہو جاتے اور امام اس شان سے انہیں نماز پڑھاتے تھے کہ ہر رکعت میں بیس آیتوں کی تلاوت کرتے اور اس طرح رمضان شریف میں ایک قرآن کریم ختم فرماتے تھے، اور پھر خود تنہا نصف شب سے لیکر سحر تک تلاوت فرماتے رہتے تھے، اور اس طرح ہر تیسرے دن ایک قرآن پاک ختم فرمادیتے اور پھر رمضان شریف میں دن بھر تلاوت فرماتے، اور روزانہ ایک قرآن پاک ختم فرمادیتے اور فرمایا کرتے تھے کہ ہر ختم پر ایک دعاء قبول ہوتی ہے۔^۱

عالم استغراق کا اندازہ وراق بخاری کے نقل کردہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ امام کو کسی باغ میں آنے کی دعوت دی گئی، جب امام ظہر کی نماز سے فارغ ہو گئے تو نوافل کی نیت باندھ لی، جب نماز سے فارغ ہو گئے تو قمیص کا دامن اٹھا کر کسی سے فرمایا کہ دیکھنا قمیص میں کوئی موذی جانور تو نہیں ہے، دیکھا گیا تو ایک زنبور نے سترہ جگہ نیش پیوست جسم کر رکھا ہے اور نیش زدہ عضو پرورم بھی آ گیا ہے، کسی نے امام سے عرض کیا کہ آپ نے پہلی ہی بار میں نماز کیوں نہ منقطع فرمادی، امام نے فرمایا کہ میں نے ایک ایسی سورت شروع کر رکھی تھی کہ جس کو درمیان میں قطع کرنا گوارا نہ تھا، سنتوں کے ساتھ اس شغف خاطر اور عبادت گزاری کا نتیجہ تھا کہ امام نے فرمایا کہ میں نے دو مرتبہ خداوند قدوس سے دعاء کی، دونوں مرتبہ مستجاب ہوئی، اسلئے مجھے خطرہ ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے اعمال کی جزا اسی دنیا میں مجھے دیدی جائے اور میں آخرت میں فلاح یاب نہ ہو سکوں، چنانچہ میں نے دعائیں مانگنا ہی ترک کر دیا، اسلئے امام بخاری فرمایا کرتے تھے کہ انسان کو ہمہ وقت ایسی حالت میں زندہ رہنا چاہئے کہ جب وہ دربار خداوندی میں دست سوال دراز کرے تو اس کی دعاء قبول کر لی جائے، امام کا یہ مقولہ انسان کی زندگی کے لئے ایک لائحہ عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔^۲

تواضع اور بے نیازی امام بخاری علیہ الرحمہ کی تواضع اور بے نیازی کے بارے میں کئی باتیں عرض کی جا چکی ہیں، کبھی باندی نے بھی غلطی کی تو امام نے اپنے نفس کی اصلاح کی کوشش فرمائی، ایک مرتبہ ابو معشر نابینا سے فرمایا کہ ابو معشر! تم مجھے معاف کر دو، ابو معشر نے حیرت و استعجاب کے ساتھ عرض کیا کہ امام معافی کیسی؟ فرمایا کہ آپ ایک مرتبہ فرط مسرت میں حدیث بیان کرتے ہوئے انوکھے انداز میں سر اور ہاتھوں کو حرکت دے

۱۔ مقدمہ الفتح الباری۔ ۲۔ مقدمہ الفتح۔ ۳۔ مقدمہ الفتح و طبقات کبری۔

رہے تھے جس نے مجھ کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا، ابو معشر نے جواب میں عرض کیا کہ امام آپ سے کسی قسم کی باز پرس نہیں ہے لیکن یہ بے نفسی اور تواضع اسی وقت تک تھی جو حد و شرع میں جواز کا درجہ رکھتی ہے۔

خالد بن احمد ذہلی حاکم بخارا نے امام کی خدمت میں یہ درخواست بھیجی کہ آپ دربار شاہی میں تشریف لا کر مجھے اور میرے شاہزادوں کو صحیح بخاری اور تاریخ کا درس دیں لیکن امام نے اسی قاصد کی زبانی کہلا بھیجا کہ میں دربار شاہی میں آ کر تملق پسند حضرات کی فہرست میں داخل نہیں ہونا چاہتا، اور نہ مجھے علم کی بے قدری گوارا ہے، اس نے دوبارہ کہلایا کہ اگر تشریف نہیں لا سکتے تو شاہزادوں کے لئے کوئی مخصوص وقت عنایت فرمادیں، امام نے جواب دیا کہ میراث نبوت سب کے لئے یکساں ہے اس میں کسی کی تخصیص نہیں ہے اور اگر میرا یہ جواب ناگوار خاطر ہو تو زبردستی میرا درس روک دو تا کہ میں خداوند قدوس کے دربار میں عذر پیش کر سکوں، اس جواب سے حاکم بخارا کو سخت برہمی ہوئی اور اس نے الزام تراشی کے بعد امام کو بخارا سے نکالنے کی سازش کی۔

گویا جہاں امام مسکین صفت اور تواضع پسند انسان تھے وہاں اپنے موقع پر استغناء اور بے نیازی کا جوہر بھی امام کی ذات میں بدرجہ اتم موجود تھا، وہ اپنے نفس کے بارے میں ہر تلخ گھونٹ گوارا فرما لیتے، لیکن علم کی بے قدری ان کے لئے ناقابل برداشت تھی امام کا مقولہ ہے کہ ”امراء کی صحبت میں علم کی تذلیل ہے اور ان کی صحبت میں دین کا نقصان شدید“

امام کی بے پناہ شہرت | ایک دن سلیمان بن حرب نے ایام طالب علمی میں امام کو دیکھ کر فرمایا تھا اس لڑکے کی بے پناہ شہرت ہوگی اور یہی مقولہ احمد بن حفص سے بھی منقول ہے۔ چنانچہ اساتذہ کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صادق آئی، امام کی نادراہ روزگار شخصیت جسکے بارے میں سینکڑوں ناقابل یقین واقعات ممالک اسلامیہ کے اندر شہرت پا چکے تھے لوگوں کے لئے باعث حیرت و استعجاب تھی۔

امام جہاں بھی تشریف لے جاتے پورا شہران کے استقبال کے لئے انڈ پڑتا تحصیل علم و کمال کے بعد جب امام بخارا واپس ہوئے تو پورا شہران کے استقبال کے لئے ٹوٹ پڑا، شہر کے تمام ہی صاحب حیثیت لوگ باہر آگئے اور دینار و دراہم بھی امام پر نچھاور کئے گئے۔

امام مسلم کا بیان ہے کہ جب نیشاپور والوں کو امام کی تشریف آوری کی اطلاع پہنچی تو شہر والوں نے تین تین منزل سے امام کا استقبال کیا امام مسلم کا بیان ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں اس شان و شوکت کا استقبال نہ کسی اہل علم کا دیکھا نہ کسی حاکم کا، محمد بن منصور کے بیان کے مطابق گھوڑے سوار چار ہزار تھے، پیادہ پا اور خچروں اور گدھوں پر سوار

ہونے والوں کا کوئی شمار نہ تھا۔

امام کی قوت حافظہ اور اسکے امتحانات | امام کی اس بے پناہ علمی شہرت کا نتیجہ تھا کہ امام جہاں بھی پہنچ جاتے تھے وہاں کے اہل علم امام کے علمی مقام اور فنی دستگاہ کو معلوم کرنے کے لئے

طرح طرح کی صورتیں اختیار کرتے، ایک مرتبہ امام دار الخلافہ بغداد میں تشریف لے گئے بغداد اس وقت علوم اسلامیہ کا مرکز تھا، سینکڑوں شیوخ حدیث اقامت پذیر تھے، بغداد کے تمام محدثین نے امام کا امتحان لینے کیلئے سوا حدیث منتخب کیں اور پھر ان احادیث کے اسانید و متون بدل دیئے اور ان احادیث کو ان آدمیوں پر برابر تقسیم کر دیا گیا تا کہ کسی مجلس میں امام کا امتحان لیا جائے، چنانچہ امام سے وقت لے لیا گیا وقت آنے پر مجلس کا انعقاد عمل میں لایا گیا، اہل شہر بھی جمع ہو گئے اور اطراف و جوانب سے بھی لوگ آ گئے، بغداد والوں نے اختلاط کی ہوئی احادیث امام کے سامنے پڑھنی شروع کیں، محدثین کی ہر ہر حدیث کے جواب میں امام بخاری لا اعر فہ یعنی مجھے معلوم نہیں فرماتے رہے امام کے اس جواب سے سامعین امام کے بارے میں مختلف الخیال تھے کسی کا خیال تھا کہ امام حقیقت حال کو پہچان چکے ہیں اور کسی کا خیال تھا کہ امام نے ان محدثین کے آگے سپر ڈال دی ہے لیکن اہل بغداد جب اپنی منتخب کردہ تمام احادیث پیش کر چکے تو امام پہلے شخص کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ تمہاری پیش کردہ پہلی حدیث جسے تم نے اس طرح بیان کیا تھا درست نہ تھی صحیح اس طرح ہے، اسی طرح دوسری اور تیسری حدیث صحیح فرمائی اور پھر تمام ہی لوگوں کی پیش کردہ غلط احادیث غلط اور صحیح دونوں اسی طرح ترتیب کے ساتھ سنادیں، جب امام اصلاح فرما چکے تو اہل بغداد کو امام کے حافظہ اور ان کے مبلغ علم کا اندازہ ہوا، حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ امام کی جانب سے احادیث کا صحیح فرمادینا تو اتنی تعجب خیز بات نہیں ہے کیونکہ امام پہلے ہی سے حافظ حدیث تھے، حیرت تو اس پر ہے کہ ان لوگوں نے جس ترتیب کیساتھ امام کے سامنے احادیث پیش کی تھیں، امام نے اسی ترتیب کے ساتھ ان کی اصلاح بھی فرمائی، حاشد بن اسماعیل کا بیان ہے کہ بخاری ہمارے ساتھ مشائخ بصرہ کے پاس جاتے تھے لیکن امام کچھ لکھتے نہیں تھے، سولہ دن کے بعد ہم نے امام کی شان میں ملامت کے کلمات استعمال کرنا شروع کئے، امام نے اس پر فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے بارے میں بہت کچھ کہہ لیا ہے، ذرا اپنی لکھی ہوئی یادداشتیں تولاؤ، ہم نے ضبط کردہ تحریریں دکھا دیں، چنانچہ وہ پندرہ ہزار سے زائد احادیث پر مشتمل تھیں، اور امام نے شروع سے آخر تک اپنے حافظہ سے پڑھ سنائیں حتیٰ کہ ہم اپنے نوشتوں کو امام کے حافظہ سے درست کرنے لگے۔

فضلک رازی سے کسی نے پوچھا کہ محمد بن اسماعیل اور ابو زرعدہ میں سے کس کا علمی مقام اونچا ہے فضلک رازی نے فرمایا کہ حلوان اور بغداد کے درمیان اتفاقاً امام بخاری سے میری ملاقت ہو گئی میں اپنے سفر کو موقوف کر کے ساتھ چلنے لگا اور ایک منزل تک برابر ساتھ چلتا رہا اس درمیان میں میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ امام کے سامنے کوئی ایسی

بمقدمت البخاری

حدیث پیش کروں، جس کا انہیں علم نہ ہو لیکن میں اپنے ارادہ میں ناکام رہا، رہے ابو زرعہ تو ان کے سر کے بالوں کی تعداد میں میں ایسی حدیثیں گن سکتا ہوں جنکا انہیں علم نہیں حالانکہ ابو زرعہ بلند پایہ محدث تھے، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کے شیوخ میں سے تھے۔

یوسف بن موسیٰ مروزی کہتے ہیں کہ میں بصرہ کی جامع مسجد میں حاضر تھا، اعلان کیا گیا کہ محمد بن اسماعیل آپہونچے ہیں، چنانچہ لوگ ان کے استقبال کے لئے نکلے، میں بھی شریک تھا اس وقت امام بخاری ایک سیاہ ریش جوان تھے، امام نے پہلے مسجد میں نماز ادا فرمائی پھر لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور مجلس املاء کے لئے وقت کی درخواست کی، امام نے منظور فرمایا اور دوبارہ مجلس املاء کی منظوری کا اعلان بھی کر دیا گیا، اگلے دن محدثین و حفاظ کا اجتماع ہوا امام بخاری ممبر پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا کہ اے اہل بصرہ! میں آج کی مجلس میں تمہارے سامنے اہل بصرہ کی وہ روایات پیش کروں گا جو تمہارے پاس نہیں ہیں، اور پھر امام نے املاء کرایا۔

حدثنا عبد الله بن عثمان بن جبلة بن ابي رواد العتكي ببلدكم قال حدثني ابي عن شعبة عن منصور وغيره عن سالم بن ابي الجعد عن انس بن مالك ان اعرابياً جاء الى النبي ﷺ فقال يا رسول الله الرجل يحب القوم . الحديث

حدیث املاء فرما کر ارشاد فرمایا کہ اے اہل بصرہ! تمہارے پاس یہ حدیث منصور کے واسطے سے نہیں ہے، اور اسی شان کے ساتھ امام بخاری علیہ الرحمہ نے پوری مجلس میں احادیث کا املاء کرایا۔

علی بن حسین بن عاصم البیکندی نے کہا کہ ہماری مجلس میں ایک بار امام تشریف لائے، کسی شریک مجلس نے کہا کہ اسحاق بن راہویہ نے فرمایا ہے کہ گویا میں اپنی کتاب میں ستر ہزار احادیث دیکھ رہا ہوں، امام بخاری نے فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ شاید اس زمانہ میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اپنی کتاب میں دو لاکھ احادیث دیکھ رہے ہیں، اور اس سے اپنی ذات مراد تھی۔

مؤرخین اور امام کے احوال لکھنے والوں نے بہت سے قصے امام کی قوت حافظہ کے سلسلہ میں نقل کئے ہیں، لیکن ان کے احاطہ کے لئے وقت اور صفحات درکار ہیں، اسلئے ان چند ہی باتوں پر اکتفاء کیا جا رہا ہے۔

امام کے متعلق علمائے سلف و متاخرین کی آراء | امام بخاری علیہ الرحمہ کے فضل و کمال کے اعتراف میں علمائے امت نے جو اقوال فرمائے ہیں ان کا احصاء تو مشکل ہے، اجمالی طور پر اتنا ہی کہنا کافی ہے کہ امام کے اساتذہ و شیوخ امام سے اس درجہ مرعوب تھے کہ انہیں مناظروں میں حکم بناتے تھے کسی نے امام کو سید الفقہاء کہا، کسی نے ان کے تلمذ پر فخر کیا، کسی نے انہیں امام مالک کا ہم پایا قرار دیا، اس سلسلہ میں وہ

باتیں بھی کم قابل التفات نہیں ہیں جو اکابر امت نے امام کے طالب علمی کے دور میں پیشگوئی کے طور پر فرمائی تھیں، امام پر اعتماد اور ان کے درجہ علمی کے اعتراف کی اس سے زیادہ اور کیا سند ہو سکتی ہے کہ اساتذہ اپنی کتابیں برائے اصلاح امام کو دیا کرتے تھے اور امام کی منتخب کردہ احادیث کو الگ نوٹ کر لیا کرتے تھے کہ یہ محمد بن اسمعیل کی منتخب کردہ ہیں۔

غرض ہم عصر اساتذہ فن سے لیکر متاخرین تک ہر انصاف پسند انسان نے امام کے بارے میں اونچی سے اونچی رائے قائم کی ہے اور اس دور کے علماء مستشرقین بھی امام کے فضل و کمال کے اعتراف میں پیش پیش نظر آتے ہیں لیکن ان تمام آراء کا نقل کر دینا یقیناً مشکل ہے۔

امام بخاریؒ کا ادب اور منظوم کلام | امام علیہ الرحمہ کے ادب اور زبان پر بے پناہ قدرت کیلئے تو ان کے تراجم کی جامع عبارتیں ہی بہترین شاہد ہیں، نیز امام کے وہ مقولے بھی امام کی

قدرت کلام پر ایک حجت ہیں جو نہایت اختصار کے باوصف اپنے معنی کے اعتبار سے مبسوط مضمون کے طالب ہیں، اتنی ہی یہ بات بھی کچھ کم حیرت افزا نہیں ہے کہ امام نے گو عمر کے کسی بھی حصہ میں شعر گوئی سے دلچسپی نہیں لی لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ارتجالاً اور بدلتہ ان کی زبان پر مرصع اور منظوم کلام بھی آ گیا ہے، ابو عبد اللہ الحاکم نے اپنی تاریخ میں امام کے یہ دو اشعار نقل فرمائے ہیں۔

اغتنم فی الفراغ فضل رکوع فعی ان یکون موتک بفتة

کم صحیح رأیت من غیر سقم ذہبت نفسہ الصحیحة فلتة

جب امام الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے حافظ عبد الرحمن علیہ الرحمہ کی خبر وفات سنی تو برجستہ یہ شعر پڑھا

ان عشت تفجع بالاحبة کلهم وبقضاء نفسک لا ابالك افجع

علامہ تاج الدین سبکی علیہ الرحمہ نے طبقات کبریٰ میں امام کے دو حکمت اثر اشعار نقل فرمائے ہیں۔

مثل البهائم لا تری آجالها حتی تساق الی المجازر تنحصر

خالق الناس بخلق واسع لاتکن کلباً علی الناس تهر

امام بخاری علیہ الرحمہ کے یہ اشعار ظاہر ہے کہ امام کے مذاق اور ان کے فکر عاقبت کے ترجمان ہیں، آخری

شعر کے علاوہ پچھلے چاروں اشعار میں موت کا تذکرہ ہے اور خاص تذکیر و انذار کے انداز میں ہے گویا یہ اشعار جہاں

افرمات کے اوقات میں فضیلت نماز کے حصول کو غنیمت سمجھو، ہو سکتا ہے کہ تمہاری موت اچانک ہی آجائے، کتنے ہی تندرست آدمی ہیں جنہیں میں نے

تندرست و توانا دیکھا تھا، یکبارگی موت کے نذر ہو گئے۔ ۱۱ اگر زندگی باقی رہی تو تمہیں تمام دوستوں کی موت کا غم اٹھانا گزیر ہے اور بایں سنی

تمہاری زندگی ایک درد انگیز شئی ہے ۱۲۔ ۱۳ غفلت شعار لوگوں کی مثال ان چوپایوں جیسی ہے جنہیں اپنی عاقبت کا قطعاً احساس نہیں ہوتا، اور بالآخر

انہیں مذبح میں ایجا کر ذبح کر دیا جاتا ہے ۱۴ لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ تمہاری مثال اس کتے کی نہ ہونی چاہئے جو بھونکنا رہتا ہے ۱۵۔

امام کی دستگاہ زبان و ادب کی سند ہیں وہاں انکے افکار و مزاج کی جھلک بھی ان کے آئینہ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

امام علیہ الرحمہ کا مسلک ابو عاصم نے امام بخاری علیہ الرحمہ کو طبقات الشوافع میں شمار فرمایا ہے، کیونکہ انہوں نے کراچی، ابوثور اور زعفرانی رحمہم اللہ سے احادیث سنیں اور حمیدی سے فقہ حاصل کیا اور یہ تمام حضرات امام شافعی رحمہ اللہ کے تلامذہ ہیں، اسلئے امام بخاری شافعی ہوئے، دوسری طرف علامہ ابوالحسن ابن العزاقی فرماتے ہیں کہ امام رحمہ اللہ حنبلی ہیں، کیونکہ امام کے اپنے بیان کے مطابق بغداد میں امام کی تشریف آوری آٹھ مرتبہ ہوئی ہے اور ہر مرتبہ حضرت امام احمد کے پاس حاضری بھی۔ اور آخری بار تو امام احمد نے امام بخاری کو اجازت دیتے ہوئے تامل بھی فرمایا تھا اسلئے امام حنبلی ہوئے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کسی شافعی یا حنبلی سے تلمذ اور تحصیل علوم کی بنا پر کسی کو شافعی یا حنبلی کہنا مناسب نہیں۔ بلکہ امام کے تراجم بخاری کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ایک مجتہد ہیں انہوں نے جس طرح احناف رحمہم اللہ سے اختلاف کیا ہے وہاں حضرات شوافع سے اختلاف کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ احناف رحمہم اللہ کے ساتھ ان کا کالب و لہجہ کرخت ہے اور مشہور مسائل میں ان کی رائے حضرات شوافع کے موافق ہے۔

حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے بھی یہی فرمایا کہ دراصل امام کے شافعی مشہور ہونے کی وجہ یہ ہوئی کہ مشہور اختلافی مسائل میں ان کی رائے شوافع علیہم الرحمہ کے موافق تھی اور لہذا صرف ان دلیل کے پیش نظر کہ انہیں حضرات شوافع سے شرف تلمذ رہا ہے انہیں شافعی کہنے کا جواز نکالا جاسکتا ہے تو ہمام بخاری اسحاق بن راہویہ کے بھی شاگرد ہیں جو حنفی المسلمک تھے اور تحصیل علوم کے لئے رحلت سے قبل امام نے فقہ حنفی حاصل بھی کیا تھا اسلئے انہیں سب سے پہلے حنفی کہنا چاہئے تھا، لیکن امام کے اجتہاد اور تراجم ابواب میں انکی بالغ نظری کے پیش نظر ان کو کسی فقہ کا پابند نہیں کہا جاسکتا۔

سانحہ وفات خالد بن احمد ذہلی حاکم بخارا کا اجمالی واقعہ تو گزر چکا ہے کہ امام بخاری علیہ الرحمہ نے اسکے گھر تشریف لیجا کر درس دینے یا اس کے شاہزادوں کے لئے مخصوص وقت متعین فرمانے سے قطعی انکار فرمادیا تھا، اس سے حاکم بخارا اور امام کے درمیان اختلاف کی بڑی خلیج حائل ہوگئی تھی لیکن چونکہ امام کا پورے شہر بخارا بلکہ تمام ممالک اسلامیہ پر گہرا علمی اثر تھا اس لئے محض حکومت کے اعتماد پر امام کے خلاف کسی قسم کے اقدام کا کامیاب ہونا بہت مشکل تھا، چنانچہ حاکم بخارا نے یہ تجویز پاس کی کہ پہلے امام کو دین اور عقائد کے بارے میں متہم کیا جائے اور پھر ان کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے تاکہ عوام کے جذبات امام کے موافقت میں مشتعل نہ ہوں، اس اسکیم کے تحت حاکم بخارا نے اس دور کے بعض علماء سوء کو استعمال کیا، انہوں نے امام پر عقائد کے بارے میں اتہام تراشی کی اور پھر عوام کے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے امام کو بخارا سے نکال دینے کا حکم نافذ کر دیا گیا۔ امام بخارا سے جانے لگے تو فرمایا۔

اللہم ارہم ما قصدونی بہ فی
الفسہم واولادہم واهالیہم
خدایا ان لوگوں نے میرے ساتھ جو ارادہ کیا تھا انہیں وہی
صورت حال اپنے اہل و عیال کے بارے میں دکھلا دے۔
چند روز ہی گزرے تھے کہ امام کی مظلومیت رنگ لائی اور تاریخ نے خالد ذہلی کو گدھے پر بٹھا کر تشہیر کرنے کا
حکم سنوا دیا، اسی طرح ان شریف علماء کو بھی بارگاہ خداوندی سے سخت تنبیہ کی گئی۔

امام صاحب علیہ الرحمہ بخارا سے چل کر بیکند پہنچے لیکن چونکہ امام پر عائد کئے ہوئے الزام کی شہرت دور دور
تک ہو چکی تھی، اس لئے اہل بیکند امام کی آمد کے سلسلے میں دو گروہوں میں بٹ گئے کچھ لوگ امام کو بلانا چاہتے تھے
اور کچھ مخالف تھے، امام نے اس تحزب کے اکھاڑے میں رہنا پسند نہیں فرمایا اور اسی اثناء میں اہل سمرقند نے امام کو اپنے
یہاں بلانے کی پیشکش کی، امام نے دعوت قبول فرمائی کہ یہاں تک پہنچے تھے کہ طبیعت خراب ہو گئی وہاں اقامت
پذیر ہے، اہل سمرقند کی دعوت بھی قبول فرما چکے تھے، اس لئے حالت مرض ہی میں پہنچنے کی سعی فرمائی، لیکن معلوم ہوا کہ
بخارا اور بیکند سے متجاوز ہو کر یہ عقائد کا مسئلہ سمرقند تک پہنچ گیا ہے اور وہاں کے علماء و عوام بھی امام کے بارے میں
دورائے پر ہیں، اس لئے امام نے تہجد کی نماز میں دعاء کی کہ خدایا میرے اوپر تیری زمین اپنی تمام تر کشادگی کے باوجود
تنگ ہو گئی ہے اس لئے مجھے اپنے پاس بلا لے، پھر اہل سمرقند نے تحقیق واقعات کے بعد بلا لینے کی رائے پر اتفاق کر لیا
تو امام نے سواری طلب کی، موزے پہنے اور عمامہ باندھا ایک جانب سے غالب بن جبرئیل نے سہارا دیا اور دوسری
جانب سے کسی اور نے، امام سواری کی جانب چند ہی قدم چلنے پائے تھے کہ فرمایا ضعف بڑھتا جا رہا ہے مجھے چھوڑ دو،
سہارا دینے والوں نے چھوڑ دیا امام نے کچھ دعائیں کیں۔ اور پھر شب عید الفطر ۲۵۶ھ میں تیرہ یوم کم بانٹھ سال کی عمر
میں وفات پائی۔ انا لله وانا اليه راجعون۔ اور یکم شوال ۲۵۶ھ میں نماز ظہر کے بعد خرتنگ میں مدفون ہوئے دفن
کے بعد مزار مبارک سے بہت تیز خوشبو پھوٹی جس کے متعلق مورخین کا بیان ہے کہ وہ مشک و عنبر سے بھی اچھی تھی، لوگ
قبر پر مٹی نہ چھوڑتے تھے اسلئے اسکی حفاظت کے لئے قبر کا احاطہ کیا گیا۔

خطیب عبد الواحد بن آدم کا ایک واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کو خواب میں چند اصحاب
کرام کیساتھ کسی کا منتظر دیکھا سلام کے بعد عرض کیا حضور کس کا انتظار ہے؟ فرمایا میں محمد بن اسمعیل کا انتظار کر رہا ہوں،
چند روز کے بعد جب امام کے انتقال کی خبر پہنچی تو میں نے خواب کے وقت کے بارے میں سوچا، امام کے انتقال کا وہی
وقت تھا کسی نے امام کی تاریخ ولادت، عمر اور وفات کو دو شعروں میں اس طرح لکھا ہے۔

جمع الصحيح مکمل التحرير

فیہا حمید و انقضی فی نور

۲۵۶

۶۲

کان البخاری حافظاً و محدثاً

میلادہ صدق و مدۃ عمرہ

۱۹۴

﴿ تصانیف امام بخاری علیہ الرحمہ ﴾

قضایا الصحابة والتابعین | تاریخی اعتبار سے یہ کتاب امام بخاری علیہ الرحمہ کی سب سے پہلی تصنیف ہے جو عمر کے اٹھارہویں سال تاریخ کبیر سے پہلے ۲۱۲ھ میں امام نے لکھی ہے کتاب کے نام سے ظاہر ہے کہ کس قدر مفید ہو سکتی ہے لیکن افسوس کہ ابھی تک کتاب کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔

التاریخ الکبیر | امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس تالیف کو عمر کے اٹھارہویں سال حجۃ السعادة اور منبر کے درمیان بیٹھ کر چاندنی راتوں میں تصنیف فرمایا، اس تصنیف کے بارے میں خود مصنف علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ تاریخ میں جن لوگوں کا میں نے ذکر کیا ہے ان کے متعلق کوئی نہ کوئی قصہ بھی مجھے معلوم ہے لیکن طوالت کے خوف سے میں نے ان کا استیعاب نہیں کیا اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں جن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے جب یہ کتاب دیکھی تو امیر عبداللہ بن طاہر خراسانی کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا۔

ایہا الامیر الاریک سحرأ اے امیر کیا میں آپ کو جادو نہ دکھاؤں

اس پر عبداللہ نے بہت حیرت و استعجاب کا اظہار کیا۔ صاحب کشف الظنون کا ارشاد ہے کہ اس تصنیف کو امام بخاری سے ابو احمد محمد بن سلیمان بن فارس اور ابوالحسن بن سہل اللغوی نے روایت کیا ہے اور اس پر ابوالقاسم مسلمہ بن قاسم اور سعد بن جناح نے ایک ایک ذیل لکھا ہے امام نے اس میں صحابہ تابعین و تبع تابعین اور رواۃ حدیث کا حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ استیعاب فرمایا ہے اور اگر چند ہم نام جمع ہو گئے ہیں تو ان کے والد کے اسماء میں یہ ترتیب رکھی ہے اور اگر کہیں وادیت نہ معلوم ہو سکی تو ان کو آخر میں بعنوان ”من افناء الناس“ ذکر فرمایا ہے کہیں کہیں جرح و تعدیل بھی ہے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اجزاء کی شکل میں اسے طبع کیا تھا خداوند قدوس جزائے خیر عنایت فرمائے۔

التاریخ الاوسط | صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ امام بخاری سے اس کی روایت کر نیوالے عبداللہ احمد بن عبد السلام الخفاف اور ابو محمد زنجویہ بن محمد اللباد ہیں، اس کتاب کا کامل نسخہ دوسری جنگ عظیم سے پہلے جرمن کے سرکاری کتب خانہ میں محفوظ تھا۔

التاریخ الصغیر! | امام بخاری سے اس کتاب کے نقل کرنے والے عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمن الاشرق ہیں، یہ تاریخ الہ آباد سے طبع ہو چکی ہے، جس کی روایت ابو محمد زنجویہ بن محمد انیشاپوری نے کی ہے، امام علیہ الرحمہ نے اس کی ترتیب سنین کے ساتھ رکھی ہے۔ ایک سن میں وفات پانے والے مشاہیر علماء کو لکھ کر دوسرے سن کو شروع فرمایا ہے۔

الجامع الکبیر | فن حدیث ہی میں امام کی یہ تالیف بھی ہے صاحب کشف الظنون نے اس کے بارے میں صرف اس قدر تحریر فرمایا ہے کہ ابن طاہر نے اس کا ذکر کیا ہے حافظ ابن کثیر کے قلم کا لکھا ہوا ایک قلمی نسخہ کامل دوسری جنگ عظیم سے قبل کتب خانہ دارالعلوم جرمن میں موجود تھا۔

خلق افعال العباد | محدثانہ رنگ میں باطل عقائد کا رد فرمایا ہے، صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ امام ذہلی سے مناظرہ خلق قرآن کے بعد امام نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، یوسف بن ریحان اور فربری نے امام سے اس کو روایت کیا ہے، کتاب طبع ہو چکی ہے۔

کتاب الضعفاء الصغیر | اس میں امام بخاری علیہ الرحمہ نے حروف تہجی کی ترتیب پر متروک اور ضعیف رواۃ کے اسماء گنائے ہیں، امام سے اس کتاب کے روایت کرنے والے ابو البشر محمد بن احمد دلابی ابو جعفر بن سعید اور آدم بن موسیٰ بخاری ہیں جرح و تضعیف میں امام نے جس احتیاط سے کام لیا ہے اسکی شان گزر چکی ہے، یہ کتاب دارالمعارف سے طبع ہو چکی ہے۔

المسند الکبیر | صاحب کشف الظنون نے صرف یہ لکھا ہے کہ نویری نے اس کا ذکر کیا ہے، فربری نے بھی ذکر کیا ہے اور دوسری جنگ عظیم سے قبل علامہ ابن تیمیہ کا لکھا ہوا کامل قلمی نسخہ کتب خانہ جرمن میں موجود تھا۔

علامہ ابن الملقن نے کتاب شرح توضیح میں لکھا ہے کہ ابوسعدا اسماعیل بن ابی القاسم البوشنجی نے امام بخاری سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے فن حدیث میں ایک ایسی کتاب لکھی ہے کہ جس میں ایک لاکھ احادیث جمع کی ہیں۔ لیکن علامہ ابن الملقن اور اسی طرح علامہ بوشنجی نے کتاب کا نام نہیں ذکر فرمایا ممکن ہے کہ انہوں نے مسند کبیر ہی کے بارے میں اظہار خیال فرمایا ہو۔

الادب المفرد! | اخلاق نبوی ﷺ کے موضوع پر عدیم النظر تصنیف ہے امام بخاری سے اسکی روایت کرنے والے احمد بن محمد بن جلیل المزاز ہیں، ہندوستان میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے اس کا فارسی ترجمہ نواب صدیق حسن مرحوم نے آگرہ سے شائع کیا تھا، اردو کے بھی متعدد تراجم شائع ہو چکے ہیں۔

التفسیر الکبیر | حافظ نے کہا ہے کہ فربری نے اس کا ذکر کیا ہے۔ وراق بخاری نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے ”باب سیرتہ و مناقبہ“ میں وراق کا بیان نقل فرمایا ہے کہ ایک دن میں نے قیام فربر کے زمانے میں امام کو لیٹے ہوئے کتاب التفسیر تصنیف فرماتے ہوئے دیکھا، امام تھکے ہوئے تھے وراق کہتے ہیں میں نے عرض کیا آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ میں کوئی کام علم و تدبیر کے بغیر نہیں کرتا، اسلئے کیا آپ فرما سکتے ہیں کہ اس لیٹنے میں کیا فائدہ ہے، امام نے فرمایا کہ آج میں بہت تھک گیا ہوں اور یہ سرحد کا علاقہ ہے مجھے ڈر ہے کہ دشمن کی جانب سے کوئی نئی بات پیش نہ آجائے، اسی غرض سے تھکن دور کرنے کے لئے لیٹ گیا ہوں تاکہ وقت آنے پر پوری طرح کام کر سکوں۔

جزء القراءة خلف الامام | امام بخاری کا مشہور رسالہ ہے جو قراءة خلف الامام کے اثبات میں لکھا گیا ہے، مصر میں طبع ہو چکا ہے امام علیہ الرحمہ نے رسالہ کے اندر احادیث و سنن کی روشنی میں قراءة خلف الامام کا اثبات کیا ہے ایک صاحب نظر دیکھ سکتا ہے کہ اس رسالہ میں کتنی روایات قابل احتجاج ہیں اور کتنی روایات پایہ احتجاج سے ساقط، تفصیل کا یہ مقام نہیں ورنہ کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا جواب نہ ہو۔

جزء رفع الیدین | امام علیہ الرحمہ نے اس رسالہ میں رفع الیدین کا اثبات فرمایا ہے، امام سے ان دونوں اجزاء کے روایت کرنے والے محمود بن اسحاق الخزاعی ہیں، یہ محمود امام بخاری کے وہ شاگرد ہیں جنہوں نے بخارا میں سب سے آخر میں زانوائے ادب طے کیا ہے۔

کتاب الفوائد | اس کتاب کا ذکر امام ترمذی علیہ الرحمہ نے ترمذی کی کتاب المناقب میں کیا ہے لیکن یہ نہ معلوم ہو سکا کہ امام نے کس قسم کے فوائد کتاب میں ذکر فرمائے ہیں۔

اسامی الصحابہ | امام کی یہ تالیف غالباً اس موضوع پر سب سے پہلی تالیف ہے امام کے بعد اس موضوع پر امت کے بہت سے افراد نے لکھا ہے جن میں علامہ ابن عبدالبر، حافظ ابن حجر اور ابن مندہ رحمہم اللہ قابل ذکر ہیں، ابوالقاسم بن مندہ نے اس کتاب کا ذکر فرمایا ہے اور وہ خود اسکو ابن فارس کے طریق سے نقل کرتے ہیں، ابوالقاسم بغوی علیہ الرحمہ نے کتاب ”معجم الصحابہ“ میں امام کی اس تالیف سے بھی نقل فرمایا ہے اسکا کامل قلمی نسخہ دوسری جنگ عظیم تک دارالعلوم جرمن میں موجود تھا۔

کتاب الوجدان | اس کتاب میں امام بخاری علیہ الرحمہ نے ان صحابہ کرام کا ذکر فرمایا ہے جن سے صرف ایک ہی حدیث مروی ہے، امام بخاری نے سب سے پہلے یہ خدمت انجام دی اور امام کے بعد امام مسلم اور امام نسائی نے بھی کتاب الوجدان لکھی، امام مسلم اور امام نسائی کی کتاب الوجدان آگرہ میں طبع ہو چکی ہے۔

کتاب العلل | اس کتاب کا ذکر ابوالقاسم بن مندہ نے کیا ہے، امام تک ابوالقاسم بن مندہ کا سلسلہ سند یہ ہے، ابن مندہ عن محمد بن عبد اللہ بن حمدون عن ابی محمد عبد اللہ بن الشرفی عن الامام البخاری، امام بخاری علیہ الرحمہ کو فن علل احادیث میں جو انفرادی شان حاصل تھی وہی اس کتاب کی خوبی کی ضامن ہے۔

کتاب المبسوط | خلیل نے ”کتاب الارشاد“ میں اسکا ذکر کیا ہے اور امام بخاری سے فہیب بن سلیم نے اس کتاب کو روایت کیا ہے حافظ ابن مندہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ دوسری جنگ عظیم سے قبل کتب خانہ دارالعلوم جرمن میں موجود تھا۔

کتاب الاثریۃ | دارقطنی علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب ”المؤتلف و المتخلف“ میں جہاں کیسہ (ایک راوی) کا ترجمہ لکھا ہے وہاں اس کتاب کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

کتاب الکنی | حاکم ابو احمد نے اس کا ذکر کیا ہے اور وہ اپنی تصانیف میں اس کتاب سے نقل بھی فرماتے ہیں یہ چیز بہت اہم ہے، امام بخاری علیہ الرحمہ کے بعد امام مسلم اور امام نسائی نے بھی کتاب الکنی تصنیف فرمائی، علامہ شمس الدین ذہبی نے فرمایا کہ اس موضوع پر سب سے مفصل کتاب امام نسائی علیہ الرحمہ نے تصنیف فرمائی ہے اور پھر حاکم نے اس پر مزید اضافہ کر کے اسکو چودہ مجلدوں تک پہنچا دیا ہے لیکن کنتیوں کے حروف معجم کی ترتیب پر نہ ہونے کے باعث استفادہ مشکل تھا اس لئے (امام ذہبی) نے اسکو مرتب و مختصر کر دیا امام ذہبی نے اس کوشش کا نام المقتنی فی سرد الکنی رکھا ہے۔

کتاب الہبۃ | امام بخاری علیہ الرحمہ کے کاتب محمد بن ابی حاتم نے اس کتاب کا ذکر فرمایا ہے اور اسکے بارے میں اس طرح اظہار خیال فرمایا ہے کہ امام بخاری علیہ الرحمہ کی تصنیف ”کتاب الہبۃ“ میں تقریباً پانچ سو احادیث ہیں جبکہ وکیع بن جراح کی ”کتاب الہبۃ“ میں صرف دو یا تین احادیث مستند ہیں اور ابن المبارک کی ”کتاب الہبۃ“ میں تقریباً پانچ سو احادیث، لیکن افسوس کہ اب تک اس کتاب کے بھی کسی نسخہ کا سراغ نہ لگ سکا۔

بر الوالدین | محمد بن دلوٰیہ الوراق نے اس کتاب کو امام سے روایت کیا ہے، صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے کہ بقول حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ یہ کتاب امام کی ان تصانیف میں سے ہے جو موجود ہیں لیکن اب تک اس کتاب کے بھی کسی نسخے کا پتہ نہ چل سکا۔

کتاب الرقاق | صاحب کشف الظنون نے اس کتاب کو امام کے مصنفات میں ذکر کیا ہے، تعارف کچھ نہیں، صرف یہ الفاظ ہیں کتاب الرقاق للبخاری من کتب الاحادیث کتاب الرقاق جو امام بخاری کی تصنیف ہے کتب حدیث میں ہے۔

الجامع الصغیر فی الحدیث | اس کتاب کو امام سے عبداللہ بن محمد الاشرق نے روایت کیا ہے اور بقول حافظ ابن حجر یہ امام کی ان تصانیف میں سے ہے جو موجود ہیں، حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک کامل قلمی نسخہ دوسری جنگ عظیم تک کتب خانہ دارالعلوم جرمن میں موجود تھا۔

الجامع الصحیح | یہ امام کی وہ عظیم تصنیف ہے جس کی وجہ سے امام کو امیر المؤمنین فی الحدیث جیسے عظیم الشان خطاب سے نوازا گیا ہے اس کی مقبولیت سے امام کے اخلاص اور جذبہ خدمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ابوالہشیم الکشمہینی نے بحوالہ فربری امام بخاری سے یہ نقل فرمایا ہے کہ میں نے اپنی کتاب میں کوئی حدیث اس وقت تک داخل نہیں کی جب تک کہ اس سے پہلے غسل نہ کیا ہو اور دو رکعت نہ ادا کی ہوں، اور سلیمان بن داؤد ہروی نے متصل سند کیساتھ نقل کیا کہ امام نے فرمایا میں نے یہ کتاب جامع مسجد حرام میں لکھی ہے اور اسوقت تک کوئی حدیث نہیں لکھی جب تک کہ استخارہ نہ کر لیا ہو اور دو رکعت نہ ادا کی ہو اور اس کی صحت کا مجھے پورا پورا یقین نہ ہو گیا ہو، اس سلسلہ میں نجم

بن فضیل اور وراق بخاری کا خواب بھی قابل لحاظ ہے کہ رسول اکرم ﷺ قبر سے باہر تشریف لائے اور جب آپ قدم مبارک اٹھاتے ہیں بخاری اپنا قدم رکھ دیتے ہیں، ابو زید مروزی کا خواب حافظ ابن حجر نے نقل فرمایا ہے کہ میں (ابو زید) رکن اور مقام کے درمیان سو رہا تھا خواب میں آنحضور ﷺ کو دیکھا، فرمایا ابو زید! کب تک شافعی کی کتاب کا درس دیتے رہو گے اور ہماری کتاب کا درس نہ دو گے، عرض کیا، حضور! آپ کی کونسی کتاب ہے؟ فرمایا جامع محمد بن اسمعیل!

یہ سب باتیں امام کے اخلاص اور صدق نیت کی دلیل ہیں، امام کو اس تصنیف کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ گو امام کے دور تک کتب احادیث کا معتد بہ ذخیرہ جمع ہو چکا تھا لیکن جب امام نے اپنی ناقدانہ نظر سے انہیں پرکھا تو صحیح و ضعیف روایات کو مخلوط پایا۔ امام کو خیال ہوا کہ ابھی ایک ایسی کتاب کی ضرورت ہے جس میں صحیح احادیث کا التزام کیا گیا ہو، ابھی امام کا خیال ارادہ ہی کے درجہ میں تھا کہ ایک مرتبہ جب امام اسحاق بن راہویہ کی مجلس میں تشریف لے گئے۔ تو اسحاق نے فرمایا کہ اگر تم احادیث صحیحہ جمع کر دیتے تو بہتر ہوتا۔

امام کا بیان ہے کہ امام اسحاق کا یہ بیان میرے جذبات کے موافق تھا میں نے اسی وقت سے تالیف شروع کر دی، اس ارادہ کی تائید امام کے اس خواب سے بھی ہوئی کہ انہوں نے آنحضور ﷺ کو اس طرح خواب میں دیکھا کہ امام مور چھل لئے چہرہ انور سے لکھیاں دفع کر رہے ہیں، تعبیر پوچھی تو معلوم ہوا کہ تم سے جھوٹی احادیث کی تہذیب و تنقیح کا کام لیا جائیگا۔ چونکہ کتاب جامع صحیح فن حدیث کی سب سے اونچی کتاب ہے اس لئے اس پر مفصل بحث اور تراجم ابواب پر اصولی کلام کے لئے مقدمہ علم حدیث کا انتظار ناگزیر ہے جو انشاء اللہ العزیز حضرت الاستاذ کے ارشادات کے اختتام پر پیش کیا جائے گا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلَى تَوَاتُرِ الْآيَةِ وَالصَّلَاةِ وَالسَّلَامِ عَلَى رَسُولِهِ مُحَمَّدٍ وَآلِهِ وَصَحْبِهِ وَأَوْلِيَآئِهِ

[۱] **کتاب الوحي**

[۱] بَابٌ كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَقَوْلِ اللَّهِ جَلَّ ذِكْرُهُ إِنَّا

أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَى نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ . (نساء آیت: ۱۶۳)

ترجمہ | باب، رسول اکرم ﷺ پر وحی کا نزول کس طرح ہوا اور خداوند قدوس کا یہ فرمان کہ ہم نے آپ پر وحی کا نزول اسی طرح فرمایا ہے جس طرح حضرت نوح اور ان کے بعد آئیوں والے انبیاء علیہم السلام پر فرمایا تھا۔

آغاز کتاب میں بخاری کا انوکھا انداز | مصنف علیہ الرحمہ نے ایک انوکھے انداز پر اپنی کتاب جامع صحیح کا آغاز کیا ہے، مصنفین عام طور پر جب کوئی کتاب شروع کرتے ہیں تو حمد و

صلوٰۃ کو مقصد سے مقدم لاتے ہیں لیکن امام بخاریؒ اس عام روش کا ساتھ نہیں دیتے، گو اس مخالفت کا الزام امام بخاری پر عائد نہیں ہوتا کیونکہ امام کسی کی روش کے پابند نہیں، ہاں عام مصنفین امام کی مخالفت کے باعث مورد الزام ہیں، نیز یہ بھی کہ مصنف علیہ الرحمہ کے معاصرین اور اسلاف کی یہ عام عادت نہ تھی، سلف میں اسحق بن راہویہ اور امام احمد کی سند موجود ہے، اور معاصرین میں ابوداؤد قابل ذکر ہیں، ہاں اگر خطبہ ہو تو اسکے لئے حمد و ثناء سے آغاز عام عادت ہے اور ایک اعرابی نے جاہلیت کے طور پر خطبہ شروع کر دیا تھا تو آپ نے تعلیم دی تھی۔

کل خطبة لم یبدء ببسم الله

ہر وہ خطبہ جو اللہ کے نام سے یا اس کی حمد سے شروع نہ کیا جائے وہ ایک در ماندہ ہاتھ کی طرح ہے

توضیح اشکال | لیکن اشکال در اصل یہ نہیں ہے بلکہ امام بخاری علیہ الرحمہ کا یہ طریق احادیث کی ہدایت کے موافق معلوم نہیں ہوتا ارشاد فرمایا گیا۔

ہر وہ اہم کام جسکو اللہ کے ذکر اور بسم اللہ الرحمن الرحیم

سے شروع نہ کیا جائے نا تمام ہوتا ہے۔

کل امر ذی بال لم یبدء فیہ بذكر الله

و بسم الله الرحمن الرحيم فهو اقطع

حدیث شریف کے دوسرے الفاظ یہ ہیں۔

کل کلام لم یبدء فیہ بحمد اللہ فهو اجزماً
 کل امر ذی بال لم یبدء فیہ بالحمد فهو اقطعاً
 ہر وہ کلام جس کو اللہ کی حمد سے شروع نہ کیا جائے ناقص ہوتا ہے
 ہر وہ اہم کام جو اللہ کی حمد سے شروع نہ کیا جائے ناقص رہتا ہے
 ان تمام احادیث کے پیش نظر امام بخاریؒ کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ اپنی کتاب کا آغاز حمد و صلوة کے بغیر
 فرمادیتے، اور خصوصاً جب کہ کتاب اللہ کا آغاز بھی حمد خداوندی سے ہوتا ہے پھر امام بخاری علیہ الرحمہ نے کس لیے ان
 تمام چیزوں کو نظر انداز فرمادیا۔

جوابات | جواب دینے والوں نے امام بخاری کی جانب سے اس کے بہت سے جوابات دیئے ہیں مثلاً یہ کہ اس
 حدیث کا مدار قرۃ بن عبد الرحمن پر ہے اور وہ ضعیف ہیں اس لیے امام بخاری نے اس کی طرف التفات نہیں
 فرمایا، یہ جواب جس درجہ سقیم ہے ظاہر ہے، اول تو قرۃ تنہا نہیں اس لیے کہ ان کے متابع سعید بن عبد العزیز موجود
 ہیں اور اگر متابع موجود نہ بھی ہو تو جب ایک روایت سے فضائل اعمال کے سلسلہ میں کوئی چیز ثابت ہو تو اس باب
 میں روایات کے اندر زیادہ چھان بین نہیں کی جاتی، بلکہ ضعیف روایتیں بھی معتبر مانی جاتی ہیں اس بنا پر امام
 بخاری کا ان احادیث سے صرف نظر کر لینا درست نہیں معلوم ہوتا، نیز یہ کہ اس روایت کو ضعیف کہنا بھی درست
 نہیں ہے، علامہ کشمیریؒ نے روایات کی صحت کے متعلق جو چار معیار قائم کیے ہیں ان میں سے دو معیاروں پر یہ
 حدیث پوری اترتی ہے۔

پہلا معیار یہ ہے کہ اس روایت کے بیان کرنے والے عدول وثقات ہوں، روایت متصل السند ہو اور شکوک و علل
 سے بری ہو، دوسرا معیار یہ ہے کہ ائمہ حدیث میں سے کسی ایک نے اس پر صحت کی مہر ثبت کر دی ہو، تیسرا معیار یہ ہے کہ اس
 روایت کا استخراج ایسی کتابوں میں کیا گیا ہو جن میں صحیح روایات کا التزام ہے، چوتھا معیار یہ ہے کہ رواۃ غیر مجروح ہوں اور
 روایت عملاً قبولیت کا درجہ حاصل کر چکی ہو اگر کوئی راوی مجروح ہو تو متابعت سے اس کا تدارک کر دیا گیا ہو۔

ان معیاروں میں سے آخر کے دو معیاروں پر پورا اترنے کی وجہ سے یہ روایت صحت کا درجہ رکھتی ہے، اس لیے
 کہ ابن صلاح نے اس کی تحسین بلکہ تصحیح کی ہے، صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان میں یہ روایت موجود ہے اور یہ حضرات
 اپنے بیان کے مطابق صرف وہی روایتیں لیتے ہیں، جو ان کی شرائط کے اعتبار سے صحیح ہوں، پھر محدثین کی تصحیح کے
 باوجود اس روایت سے بالکل ہی صرف نظر کر لینا درست نہیں ہے اور نہ یہ جواب امام کے مرتبہ حدیث کو سامنے رکھ کر دیا
 گیا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اہم کام کا آغاز حمد و صلوة سے ہو، اس کے معنی یہ ہرگز

نہیں ہیں کہ حمد و صلوة کی کتابت بھی ضروری ہے، پھر آپ امام بخاریؒ سے اس قدر بدگمانی کیوں قائم کر رہے ہیں کہ انہوں نے حمد و صلوة کے بغیر ہی کتاب کو شروع کر دیا ہوگا اور جیسا کہ مقدمہ میں معلوم بھی ہو چکا ہے کہ امام نے ایسا ہرگز نہیں کیا بلکہ انہوں نے انتہائی اہتمام کے ساتھ یہ خدمت انجام دی ہے، یہ جواب صحیح ہے اور میرے نزدیک کافی بھی۔

بعض حضرات نے یہ جواب دیا کہ امام بخاریؒ نے بسم اللہ اور الحمد للہ دونوں سے ابتداء کی حدیث پر عمل فرمایا ہے اور یہ دونوں بدایتیں ایک ساتھ اس طرح ہوئی ہیں کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے فرمایا اس لیے بسم اللہ کے ساتھ آغاز تو ظاہر ہے اور حمد خداوندی کا پہلو اس طرح نکلتا ہے کہ خود ان کلمات میں ”الرحمن الرحیم“ موجود ہیں جو خداوند قدوس کی صفات عالیہ ہیں، ہاں اگر لفظ حمد پر کسی اہم کام کی تمامیت موقوف کی جاتی تو واقعی امام بخاریؒ کو مورد الزام ٹھہرایا جاسکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہے اس لیے امام بخاریؒ نے دونوں بدایتوں کو ایک ساتھ جمع فرما کر دونوں ہی حدیثوں پر بیک وقت عمل کی کامیاب راہ نکالی ہے، کیونکہ حمد کے لیے صیغہ حمد کا تلفظ ضروری نہیں، بلکہ حمد کے اور بھی پیرایہ ہو سکتے ہیں، چوتھا جواب یہ ہے کہ ان تمام احادیث میں قدر مشترک یہ ہے کہ کسی اہم کام میں برکت اور امداد خداوندی کے حصول کے لیے ذکر خداوندی ضروری ہے اور اگر ذکر خداوندی کے بغیر ہی شروع کر دیا گیا تو تشنگی باقی رہ جائے گی، پھر یہ کہ ذکر خداوندی کا ایک ہی طریق نہیں بلکہ بسم اللہ الرحمن الرحیم سے آغاز بھی اس کے لیے کافی ہے، آخر کے یہ تینوں جوابات گوچلنے والے ہیں مگر امام بخاریؒ کے شایان شان نہیں۔

امام بخاریؒ کے شایان شان ایک جواب تو یہ ہے کہ سب سے پہلے کتاب اللہ کی اقتداء ضروری تھی اور کتاب اللہ میں سب سے پہلے یہ ارشاد ہوا اقرأ باسم ربک (خداوند قدوس کا نام لے کر شروع کرو) اور مصنف نے اپنی کتاب کا آغاز نام خدا یعنی بسم اللہ الرحمن الرحیم سے فرمایا ہے اور دوسرا مناسب شان جواب وہ ہے جو حضرت شیخ الہندؒ نے ارشاد فرمایا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے اس سلسلہ میں امام بخاریؒ کے طرز کے مطابق یہ فرمایا ہے کہ دراصل امام بخاریؒ اپنے طرز عمل سے یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کے عمل کو دیکھو کہ آپ لکھوائی ہوئی تحریروں کا آغاز صرف بسم اللہ الرحمن الرحیم سے فرماتے ہیں اس کی شہادت کے لیے آنحضرت ﷺ کے سلاطین عالم کے نام لکھے ہوئے دعوتی خطوط دیکھئے اگر حمد کا لکھنا ضروری ہوتا تو آپ ضرور اس پر عمل فرماتے لیکن آپ نے ایسا نہیں فرمایا اور امام بخاریؒ کا عزم ہے کہ اس کتاب کی تمام چیزیں اور باتیں سنت رسول اکرم ﷺ کے بالکل مطابق ہوں، اس لیے امام بخاریؒ کا یہ عمل آنحضرت ﷺ کے اتباع میں ہے اس بارے میں امام کو مورد الزام ٹھہرانا امام کے مرتبہ حدیث سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

ذکر وجی سے کتاب کے آغاز کی وجہ

دوسرے محدثین کرام کا انداز | امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں سب سے پہلے جس مضمون کو اختیار فرمایا وہ سب سے ممتاز اور جداگانہ ہے، دوسرے حضرات محدثین نے بھی اپنے اپنے مذاق کے مطابق احادیث کی کتابوں کی افتتاحیے لکھے ہیں، مثلاً امام مسلم نے سب سے پہلے مسئلہ اسناد کو پیش فرمایا، کیونکہ دین کا مدار سنت رسول ﷺ پر ہے، اور سنت میں صحیح و سقیم کا امتیاز صرف اسناد کے ذریعہ ہوتا ہے، اسی لیے امام مسلم نے سب سے پہلے مسئلہ اسناد پر سیر حاصل بحث فرمائی۔

ترمذی اور ابو داؤد رحمہم اللہ نے کتاب الطہارت اور مسائل وضو سے کتاب کا افتتاح کیا، اس لیے کہ دین کی سب سے اہم عبادت نماز ہے، جو وضو پر موقوف ہے، اور جس طرح حشر میں سب سے پہلا سوال نماز کے بارے میں ہوگا، اسی طرح قبر میں سب سے پہلا سوال وضو کے بارے میں ہوگا، اور ابن ماجہ نے اتباع سنت سے کتاب کا آغاز فرما کر ایک نئی راہ تلاش کی، اس لیے کہ دین سنت کا نام ہے، اور اگر سنت و بدعت کا امتیاز اٹھ جائے تو دین کی حقیقت ہی ختم ہو جائے۔ اور اس کے بعد مناقب صحابہ کا ذکر اس لیے فرمایا کہ جب تک حضرات صحابہؓ پر پورا اعتماد نہ ہوگا اس وقت تک نہ قرآن پر ایمان کامل ہو سکتا ہے نہ سنت پر، آپ نے ان حضرات ہی سے فرمایا تھا کہ حاضر غائب تک یہ دعوت پہنچادیں، اور یہ ارشاد بھی اسی حکمت کے ماتحت تھا کہ میرے پاس اہل عقل کھڑے ہوا کریں، امام مالکؒ نے سب سے الگ اوقات صلوٰۃ سے اپنی کتاب شروع کی کیونکہ نماز کا ادا کرنا اوقات کے معلوم کر لینے پر موقوف ہے اور نماز سب سے اہم فریضہ اسلامی ہے۔

امام بخاریؒ کا افتتاحیہ | تمام محدثین کرام کے طریقوں سے بالکل الگ امام بخاریؒ نے اپنے مقام اور منصب کے مناسب ایک نہایت اونچی بات فرمائی کہ دین کا مدار وجی پر ہے، اور سب سے زیادہ اعتماد اور وثوق کی چیز وجی ہے، لہذا جب تک وجی کی عظمت سامنے نہ آجائے اس وقت تک نہ کسی چیز پر اعتماد ہو سکتا ہے اور نہ اس کی صحت کا یقین۔

اس میں شک نہیں کہ مسئلہ اسناد بھی اپنی جگہ نہایت اہم ہے، مناقب اصحاب کرام کی بھی ضرورت ہے، سچ ہے کہ حشر میں سب سے پہلے نماز کے بارے میں باز پرس ہوگی، اور بلاشبہ حدیث کا مقصد سنت و بدعت کا امتیاز ہی ہے لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ یہ سب کچھ وجی کے ثبوت پر موقوف ہے، جب تک وجی کا ثبوت نہ ہو اور اس کی حقانیت و عظمت ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک کسی دوسری جانب توجہ نہیں دی جاسکتی۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کی رائے گرامی | حضرت علامہ کشمیریؒ نے ارشاد فرمایا کہ وجی کے ساتھ افتتاح فرمانے سے امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ دراصل خدا کے ساتھ بندے کا تعلق

وجی کے ذریعہ قائم ہوتا ہے، اس لیے سب سے پہلے اس ثبوت کی ضرورت ہے کہ ہم خدا سے متعلق ہیں اور اگر خدا سے تعلق ہے تو وہ وجی ہی کے ذریعہ سے ہوا ہے اور یہ خدا سے تعلق عمل کو چاہتا ہے اور عمل کے لیے علم کی ضرورت ہے اسی مناسبت سے امام بخاریؒ نے سب سے پہلے وجی کے ابواب قائم فرمائے اور اس کے بعد علم کے ابواب لائے اور پھر اعمال کا سلسلہ شروع فرمایا۔

مقصد ترجمہ امام بخاریؒ نے کتاب کے اندر تراجم کے سلسلہ میں اپنی کسی عادت یا طریقے کا اظہار نہیں فرمایا حضرات شارحین نے اپنے مذاق کے مطابق احادیث پر نظر کرنے کے بعد اس کا مقصد و مطلب متعین کیا ہے، اسی لیے مقاصد تراجم کی تعیین میں حضرات شارحین کے درمیان سب سے زیادہ اختلاف رہا کیونکہ خود امام علیہ الرحمہ کی جانب سے اس بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے۔

ایک عام طریقہ عام طور پر تراجم کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ترجمہ الباب کو دعویٰ کی حیثیت میں رکھتے ہیں اور پیش کردہ حدیث کو اس کی دلیل سمجھا جاتا ہے، اس عمومی قاعدہ کے مطابق یہ دیکھا جاتا ہے کہ حدیث اور ترجمہ میں مطابقت ہے یا نہیں، اگر مطابقت ظاہر ہوتی ہے تو فہما، اور اگر مطابقت ظاہر نہیں ہے تو اس لحاظ سے کہ مؤلف کی عظمت شان اور جلالت اس کی اجازت نہیں دیتی کہ بے سوچے سمجھے ان پر اعتراض کر دیا جائے اس لیے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ کسی طرح ترجمہ اور حدیث کے درمیان مطابقت پیدا ہو جائے یہی شارحین کی کوشش اور ان کا کمال ہے۔

امام بخاریؒ کا طریق ترجمہ محدثین کرام کی اس عمومی عادت کے امام بخاریؒ پابند نہیں ہیں، بلکہ امام نے اپنے تراجم میں بہت سے علوم داخل فرمادیئے ہیں، کسی موقعہ پر وہ حدیث کی تشریح کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، کسی موقعہ پر اجمال کی تفصیل کرتے ہیں، کسی موقعہ پر روایات کے اختلاف اور پھر اس اختلاف کے رفع کی صورت کو ظاہر فرماتے ہیں، کہیں اختلاف ائمہ کا لحاظ رکھتے ہوئے ترجمہ کو خاص شکل میں پیش نہیں فرماتے بلکہ ایک سوال کی صورت میں ترجمہ منعقد فرما کر احادیث لے آتے ہیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اس میں گنجائش ہے خواہ اس مسلک کو قبول کر لو یا دوسرے کو اختیار کر لو، کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ترجمہ کی حیثیت دعویٰ کی نہیں ہوتی بلکہ وہ تنبیہ ہوتی ہے جسے سمجھ دار سمجھ لیتے ہیں، لیکن جو بخاری کے انداز سے واقف نہیں وہ الجھ جاتے ہیں، کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ ترجمہ کا ظاہر کچھ ہوتا ہے لیکن بخاری کا مقصد ظاہر سے متعلق ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ کسی التزامی معنی کو مراد لے کر اسی کی مناسبت سے احادیث پیش فرمادیتے ہیں، جس سے ظاہر دلالت سے ترجمہ کا مقصد معین کرنے والوں کو پریشانی ہوتی ہے اور جب مطابقت نظر نہیں آتی تو اعتراض پیدا ہو جاتا ہے یہ سب باتیں انشاء اللہ اپنی اپنی جگہ تفصیل سے آئیں گی۔

زیر بحث ترجمہ زیر بحث ترجمہ باب کیف كان بدء الوحي الى رسول الله ﷺ رسول اکرم ﷺ پر وجی کا آغاز کس طرح ہوا؟ بظاہر تو اس ترجمہ کا مقصد بدء وجی کی کیفیت کا سوال معلوم ہوتا ہے مگر

مصنف کا یہ مقصد نہیں ہے ہم پہلے الفاظ کے ظاہر پر نظر کرتے ہوئے ترجمہ کا مطلب بتانے کی کوشش کرتے ہیں ہم الفاظ کو تین طریقے سے پڑھ سکتے ہیں اور تینوں ہی طرح انہیں ضبط بھی کیا گیا ہے۔

(۱) بَابٌ: كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(۲) بَابٌ، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(۳) بَابٌ، كَيْفَ كَانَ بَدْءُ الْوَحْيِ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

پہلی صورت میں اصل ترجمہ باب فی الحدیث ہے جس کو حذف کر دیا گیا ہے اور اس سلسلے کی ایک اہم چیز کو خاص طور پر بیان کر دیا گیا ہے، ترجمہ کا مقصد یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی احادیث ہم تک کس طرح پہنچی ہیں، ان کے پہنچنے کا ذریعہ کیا ہے اور یہ سلسلہ کہاں سے چلا، آغاز وحی کی کیفیت کا بیان اصل مقصد نہیں ہے بلکہ مقصد صرف احادیث کا ذکر ہے، لیکن اس سلسلے کی ایک خاص چیز جو آغاز وحی کی کیفیت سے متعلق تھی نمایاں طریقہ پر بیان کر دی گئی، اب دونوں چیزیں الگ الگ ہو گئیں ایک حدیث کا ذکر ہے اور دوسرے آغاز وحی کا، اور آغاز وحی کا ذکر ترجمہ کے ایک جزء کی حیثیت رکھتا ہے، خود مقصود نہیں ہے۔

اس تفصیل کے بعد ہر روایت میں بدء وحی کی کیفیت کی تلاش امام بخاریؒ کے مقصد سے زائد ہوگی اور اس سلسلے کی وہ تاویلات جو روایات کے انطباق کے سلسلے میں کی جائیں گی محل نظر ہوں گی کیونکہ جب یہ بات امام کے مقصد سے الگ ہے تو پھر اس وقت طلبی کی کیا ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ کی تاویلات کو کے ہر روایت کو بدء وحی سے چسپاں کر ہی دیا جائے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان تمام روایات میں پیغمبر علیہ السلام کا تذکرہ اور وحی کا تعلق قائم ہونا چاہیے، اس لیے کہ باب کا تعلق اسی سے ہے چنانچہ بحمد اللہ یہ بات تمام روایات میں بغیر تاویل کے بھی نمایاں ہے۔

دوسری صورت میں لفظ باب کو کیف کی جانب مضاف کیا گیا ہے اس صورت میں ترجمہ کا مطلب بظاہر آغاز وحی کی کیفیت کا بیان کرنا ہے لیکن جب ہم یہ مقصد قرار دے کر روایات پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے اثبات میں صرف ایک ہی روایت نظر آتی ہے، باقی روایتیں اس بارے میں خاموش ہیں جہاں تاویل کے بغیر چارہ کار نہیں۔ تیسری صورت بھی معنی کے لحاظ سے ان دونوں صورتوں سے الگ نہیں۔

اب اصولی طور پر ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا یہ ضروری ہے کہ ترجمہ کے ذیل میں جس قدر روایات کا استخراج کیا گیا ہے ان میں سے ہر روایت کا ترجمہ سے انطباق ہو یا اگر مجموعہ روایات سے بھی مقصد ثابت ہو رہا ہو تو اسے بھی کافی سمجھا جائے گا، کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہر روایت کا انطباق ضروری ہے لیکن محققین اس کے خلاف ہیں، وہ کہتے ہیں کہ مجموعہ کا اعتبار کیا جائے گا، ہاں اگر مجموعہ روایات سے بھی ترجمہ ثابت نہ ہو سکا تو کہا جائے گا کہ واقعہ امام کے دلائل بیکار ٹھہرے۔

اس خیال کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمارے لیے بہت سی آسانیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اب اگر کوئی روایت کہیں ترجمہ سے غیر منطبق معلوم ہوگی تو فوراً اور بے تکلف اس قاعدہ سے فائدہ اٹھالیں گے کہ مجموعہ کو دیکھا جائے، امام بخاریؒ کی عادت ہے کہ ترجمہ کے ذیل میں ایک صریح روایت کے بعد جو دوسری روایت لاتے ہیں وہ براہ راست ترجمہ سے متعلق نہیں ہوتی بلکہ وہ سابق روایت کی تفصیل و تشریح ہوتی ہے یا کسی اور طریقہ پر اسی حدیث سے متعلق ہوتی ہے اس اعتبار سے اگر ایک روایت مثبت ترجمہ ہو اور باقی روایتیں اس ایک روایت سے متعلق ہوں تب بھی ترجمہ ثابت مانا جاتا ہے۔

اسماعیلی علیہ الرحمہ کا اعتراض | اسماعیلی نے کہا کہ احادیث ذیل ترجمہ سے مربوط نہیں معلوم ہوتیں کیونکہ ترجمہ بدایت وحی کا ہے اور احادیث میں بدایت کا کہیں ذکر نہیں ہے اس بنا پر ترجمہ کے

الفاظ کیف کان بدء الوحی کے بجائے کیف کان الوحی ہوتے تو بہتر تھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا ارشاد | شاہ صاحب علیہ الرحمہ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اگر یہاں اضافت بیانیہ مان لی جائے تو حاصل یہ نکلے گا کہ بدء اور وحی ایک ہی چیز ہو جائیں گے اور عبارت اس طرح ہوگی کیف کان بدء ہو الوحی اور اس صورت میں ترجمہ کا مقصد یہ نہیں ہوگا کہ وحی کا مبدء یا اجزاء اولیں بیان کئے جائیں، بلکہ اضافت بیانیہ ہونے کی صورت میں بدء اور وحی کے ایک ہو جانے کی بنا پر معنی یہ ہوں گے کیف کان الوحی الی رسول اللہ ﷺ اور امام بخاریؒ کے بدایت سے تعبیر فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ دین اور امر نبوت کی بدایت ہی وحی سے ہوتی ہے، اس لیے وحی کو بدایت سے تعبیر کیا گیا۔ اب گویا بدء درمیان سے بالکل نکل گیا، اس تفصیل کے بعد اسماعیلی کا یہ اعتراض کہ احادیث ترجمہ بدایت سے متعلق نہیں، ختم ہو جاتا ہے۔

علامہ سندھیؒ کا جواب | اضافت بیانیہ ہی مان کر ایک صورت یہ بھی ہے کہ وحی سے مراد حدیث رسول اللہ لی جائے اور بدء سے مراد مبدء لیا جائے اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ پیغمبر علیہ السلام کی احادیث مبدء وحی یعنی ذات پاک جل مجدہ سے کس طرح چل کر ہم تک پہنچیں، چنانچہ روایات نے بتلادیا کہ پیغمبر علیہ السلام کی احادیث فرشتہ وحی کے ذریعہ ہم تک پہنچیں۔

علامہ کشمیریؒ کا ارشاد | علامہ کشمیری علیہ الرحمہ اس کی توجیہ ان سب باتوں سے الگ فرماتے ہیں کہ دراصل امام بخاریؒ اس جانب متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جو سلسلہ وحی منقطع ہو چکا تھا، اس فترت کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ کس طرح ظہور پذیر ہوا؟ چنانچہ بدء الوحی میں ایک نسخہ بدء الوحی (معتل لام واوی) بھی ہے، حضرت علامہ کشمیری کی توجیہ پر دونوں نسخوں کا مفہوم ایک ہی نکلتا ہے کہ یہ وحی اپنے تمام متعلقات کے ساتھ اس عالم میں کس طرح پہنچی؟ یعنی جنس وحی جو اپنی بہت سی انواع و اشخاص پر مشتمل ہے اور ایک عرصہ سے اس عالم میں نہیں آئی تھی اب کس طرح وجود اور ظہور میں آئی، اس کا مفہوم یہ نہیں کہ اجزاء وحی کے جزء اول کی کیفیت بتلائی

جائے ہاں اگر وحی کو اجزاء پر تقسیم کر کے جزء اول مراد لیتے تو یقیناً یہ اشکال وارد ہو جاتا کہ غار حراء کی حدیث کے علاوہ اور کسی حدیث میں جزء اول کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن علامہ کشمیری نے ایسا نہیں فرمایا بلکہ پہلے وحی کے لفظ کو تمام متعلقات پر حاوی مان لیا اور جب یہ تمام چیزیں اس لفظ کے تحت آگئیں تو بدء کی اضافت کر دی، اس معنی کے اعتبار سے بدایت نہایت کے مقابل نہیں ہے کہ اولین حصہ مراد لیں بلکہ اس بدایت کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز موجود نہ تھی وہ کیسے رونما ہوئی اور اس کی پہل کی کیا صورت ہوئی جیسا کہ قرآن کریم کی آیت ہے کما بدءنا اول خلق نعیدہ اس آیت میں بھی بدایت، نہایت کے مقابل نہیں بلکہ اسے عدم سے وجود میں لانے کے لیے یہ لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

علامہ کشمیری کی تائید | حضرت علامہ کشمیری کے اس ارشاد کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ بدء کا یہ عنوان امام بخاری نے صرف اسی جگہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ دوسرے اور مقامات پر بھی یہ عنوان موجود ہے مثلاً

کیف کان بدء الاذان، کیف کان بدء الحيض، کیف کان بدء الخلق وغیرہ وغیرہ، نیز یہ کہ جہاں جہاں اس عنوان کو اختیار فرمایا ہے وہاں امام رحمہ اللہ نے صرف ابتدائی احوال پر اکتفاء نہیں فرمایا بلکہ تفصیل کے ساتھ موضوع کا احاطہ کیا ہے، اذان کے بھی صرف ابتدائی حالات نہیں بیان کیے بلکہ پوری تفصیل سے بحث فرمائی، حیض کے بھی تمام ہی احکام ذکر کیے، الحاصل امام ہر جگہ پہلے مجموعہ کا اعتبار فرماتے ہیں اور پھر بدء کو اس کی طرف مضاف کر دیتے ہیں اس صورت میں اضافت بیانیہ نہیں ہوتی، علامہ کشمیری کا یہ ارشاد نہایت جامع اور بے تکلف ہے۔

خاتمة الكلام | حضرت شیخ الہند قدس سرہ اس سلسلہ میں بہت اونچی بات فرماتے ہیں جو خاتمة الكلام کی حیثیت رکھتی ہے، وہ یہ کہ مقصد ترجمہ سمجھنے سے قبل ہمیں الفاظ ترجمہ پر ایک مرتبہ گہری نظر ڈال لینی چاہیے ترجمہ میں تین لفظ ہیں (۱) کیف (۲) بدء (۳) وحی، ان تینوں الفاظ کو امام بخاری نے بغیر کسی قید کے ذکر فرمایا ہے (۱) "وحی" عام ہے متلو ہو یا غیر متلو، منامی ہو یا الہامی، جبرئیل بصورت ملک لائے ہوں یا بصورت بشر (۲) "بدایت" عام ہے زمانی ہو یا مکانی یعنی آغاز مکان سے بھی ہوتا ہے اور زمان سے بھی، بدایت حالی بھی ہوتی ہے کہ کس حال میں شروع ہوا اور بدایت صفات کے اعتبار سے بھی ہوتی ہے۔ (۳) کیف بھی مخصوص نہیں ہے مکان کی کیفیت بھی مراد ہو سکتی ہیں اور زمان کی بھی اور ماحول کے اعتبار سے بھی، اب جو لوگ بدایت سے مراد بدایت زمانی لیتے ہیں اور پھر روایات پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں دور تک مقصد کا پتہ نہیں چلتا اور اعتراض ہو جاتا ہے لیکن یہ اعتراض امام بخاری پر نہیں بلکہ یہ قصور اپنی فہم کا ہے۔

تراجم کے انطباق کی آسان راہ | اس ارشاد کی روشنی میں ہمیں تراجم کے انطباق کے لیے ایک صحیح اور بے تکلف طریقے کی طرف راہنمائی ہوتی ہے اور وہ یہ کہ جہاں ترجمہ بظاہر روایات کے

ساتھ غیر منطبق نظر آئے وہاں پہلے ترجمہ کے الفاظ پر غور کیا جائے اور پھر احادیث پر گہری نظر ڈال کر ایک ایسی بات نکالی جائے جو ترجمہ و حدیث میں قدر مشترک ہو اور پھر اس قدر مشترک کو ترجمہ کا مقصد قرار دے کر احادیث کو منطبق کیا

جائے، یہ راہ شارحین کے ان بے ضرورت تکلفات کی بہ نسبت بدرجہا آسان ہے جہاں اپنی جانب سے الفاظ میں تعقید کے بعد سرکھپانے کی نوبت آتی ہے۔

ترجمہ کا ظاہری مقصد نکالنا تو آپ کے لیے چنداں دشوار نہیں ہے کہ حضرت مصنف علیہ الرحمہ وحی کی بدایت کے احوال ذکر کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ ظاہر بنی کا مال ہے، امام بخاریؒ کا مقصد یہ نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی ضرورت ہے کہ ابتداء کتاب میں ابتداء وحی کا عنوان اختیار کیا جائے جب کہ کتاب التفسیر سے فراغت کے بعد حضرت مصنف علیہ الرحمہ کیف نزول الوحي کے عنوان سے ایک مستقل ترجمہ بیان کر رہے ہیں، جہاں وحی کے پورے متعلقات سے بحث ہے، اس بنا پر امام کا مقصد اصلی ایک اور اہم بات ہے، امام رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ دیکھو دین کا تمام تر انحصار اور مدار وحی پر ہے، اس لیے کہ دین انسانوں کے قیاس و خیال کا نام نہیں ہے، بلکہ دین خداوند قدوس کے احکام کو کہتے ہیں، پھر یہ بات ہمیں کس طرح معلوم ہو سکتی ہے کہ خداوند کریم اس بارے میں کیا فرماتا ہے اور کن چیزوں سے ہمیں روکتا ہے، ظاہر ہے کہ کسی کا قول کسی بڑے فیلسوف کا فیصلہ یا کسی بڑے سے بڑے امام کی رائے ہرگز اس قابل نہیں ہو سکتی کہ اس کو مدار قرار دیا جاسکے، اس لیے کہ رائے خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی، انسانی دماغ کا اختراع ہے اور انسانی دماغ کی رسائی محدود ہے، اس کے دماغ کو خداوند قدوس کی مرضیات و نامرضیات کے لیے معیار بنانا نا قابل ہے، انسان اپنے تحصیل علم کے تمام ذرائع میں ٹھوکریں کھاتا ہے اس کی نگاہ بھی غلط دیکھ سکتی ہے، بہت سی لطیف چیزوں کا تو وہ ادراک بھی نہیں کر سکتا، اس کی قوت ذائقہ بھی بدل جاتی ہے اور اس کے سامعہ میں بھی فرق آجاتا ہے، انسانوں میں عقل کی رو سے ترقی کرنے والا طبقہ جو فلاسفہ کے نام سے موسوم ہے اور جن کے اقوال عظمت کے ساتھ کتابوں میں لکھے جاتے ہیں ان کی عقلی ارتقاء کی معراج ایک دوسرے کی تکذیب پر ہے، ایک عالم کو حادثا مانتا ہے دوسرا قدیم، ایک کہتا ہے کہ آسمان موجود ہے دوسرا کہتا ہے کہ منجھائے نظر کا نام ہے، ایک اعادہ معدوم محال سمجھتا ہے دوسرا بعث بعد الموت کا قائل ہے، جب انسان کے حواس اور اس کی عقل ادراک حقیقت سے قاصر ٹھہرے تو اسے خداوند قدوس کی مرضیات معلوم کرنے کے لیے کسی قطعی اور یقینی چیز کی ضرورت ہے اور وہ قطعی چیز وحی ہے جس کے متعلق خود خداوند قدوس فرماتا ہے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ تَنْزِيلٌ مِّنْ حَكِيمٍ حَمِيدٍ (حم السجدہ) نہ پیچھے سے، یہ خدائے حکیم و محمود کی طرف سے نازل کیا گیا ہے

دنیا میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ قابل اعتبار ہے تو وہ وحی ہے جس کے اندر نہ تغیر کا امکان ہے نہ سہو و نسیان کا، اس بارے میں تردد کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے اور تردد کی گنجائش اس لیے بھی نہیں کہ وحی کا تعلق تین ہی ذات سے ہے ایک موحی، دوسرے واسطہ اور تیسرے موحی الیہ، اور ان تینوں میں سے کسی کے متعلق بھی کسی قسم کا تردد نہیں کیا جاسکتا۔

موحی تو وہ ذات والا صفات ہے جو عزیز و حکیم ہے، قہار و جبار ہے، جس کے متعلق کسی قسم کی کوتاہی کا واہمہ بھی کفر

ہے، واسطہ تو وہ حضرت جبرئیل امین ہیں جن کے اعتماد و ثقاہت کی سند رب العزت نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔
 إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ
 ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ
 (سورہ تکویر)

یعنی یہ ہمارے رسول اور فرستادہ ہیں اول تو فرستادہ ہر کس و ناکس کو نہیں بنایا جاتا بلکہ ارشاد ہے:

اللَّهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلَائِكَةِ رُسُلًا وَمِنَ
 النَّاسِ (سورہ حج)

احکام پہنچانے والے اور آدمیوں میں سے

اور بالخصوص جب کسی اہم بات کے لیے پیغام رسانی کی خدمت لینی ہو تو سب سے زیادہ لائق اعتماد شخصیت کا انتخاب کیا جاتا ہے، پھر ان کی صفت کریم ہے جو لغت عرب میں تمام اوصاف حمیدہ کے لیے جامع ہے، ذی قوۃ یعنی وہ قوت والے ہیں گویا ایسا بھی ممکن نہیں کہ وہ وحی لے کر چلیں اور راہ میں کوئی خلل انداز ہو جائے، قوۃ کی تین تعظیم کے لیے ہے یعنی اتنے قوت ور ہیں کہ اگر تمام دنیا کے شیاطین مل کر چھین لینا چاہیں تو نہیں چھین سکتے ان کی قوت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جبرئیل سے پوچھا گیا کہ کبھی آپ کو تکلف تو محسوس نہیں ہوا؟ فرمایا کہ صرف ایک مرتبہ جب یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے رسی کاٹ کر کنویں میں ڈالا تو مجھے حکم ہوا کہ یوسف پانی پر نہ گرنے پائیں تو میں نے فوراً سدرۃ المنتہی سے چل کر پانی میں گرنے سے قبل انہیں روک دیا۔

عند ذی العرش مکین ذوالعرش کے پاس بڑے درجہ والا ہے یعنی وہ زمین پر نہیں رہتا ہے کہ ماحول کے اثر سے راجح میں تبدیل ہوا! انفعال کا خطرہ ہو بلکہ وہ بڑی عزت و شوکت کا مالک ہے بڑی جگہ رہتا ہے جہاں کی ہر چیز اپنی جگہ قائم اور ہر طرح کے تغیر سے بری ہے۔

مطاع بڑی جماعت کا افسر ہے یعنی وہ تنہا نہیں بلکہ وحی لے کر چلتا ہے تو افسر کی تعظیم اور وحی کے استقبال کے لیے ہزاروں فرشتے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، بعض آیات کے بارے میں تو ستر ستر ہزار فرشتوں کے ہرکاب ہونے کی روایت موجود ہے، اگر جبرئیل تنہا بھی ہوتے تب بھی خطرے کی کوئی بات نہ تھی لیکن جب وہ تنہا بھی نہیں تو اس کا کیا موقع ہے کہ وحی رب العزت کی جانب سے تو صحیح چلے لیکن راہ میں کچھ خلل آجائے، اس سے آگے چل کر موسیٰ الیہ کا حاملہ ہے کہ شاید وہاں سننے یا سمجھنے میں گڑ بڑ ہو جائے یا بیان کرنے میں کچھ لغزش ہو جائے اس لیے امام بخاریؒ کو موسیٰ یہ کے احوال بھی بیان کرنے ہوں گے کہ وہ موجودات کا خلاصہ ہیں جن کو خداوند قدوس نے سب سے پہلے خلعت نبوت سے نوازا تھا، عالم کے وجود سے قبل ہی جن کو نبوت دے دی گئی تھی جو خاتم الانبیاء ہیں اور جنہیں اولین و آخرین کے تمام علوم دے دیئے گئے ہیں ارشاد فرمایا گیا۔

اوتیت علم الاولین والآخرین . شروع سے آخر تک وہ تمام علوم جو اس دنیا میں نازل کیے گئے سب کے سب آپ کو عطاء کیے گئے اور قیامت تک کے لیے آپ کو مبعوث فرما کر آنے والی دنیا کو آپ کی امت قرار دیا گیا، اور پھر یہ اعلان فرمایا گیا:

وَمَنْ يُطِيعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ
وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ
حَفِظًا . (نساء: ۸۰)

جس شخص نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا تعالیٰ کی اطاعت کی اور جو روگردانی کرے سو ہم نے آپ کو ان کا نگرہاں کر کے نہیں بھیجا۔

جس ذات مقدس کی صفات ایسی ہوں اس کے متعلق غلط فہمی یا غلط بیانی کا کیا احتمال ہو سکتا ہے، لیکن پھر بھی بقضائے بشریت سہو کا امکان نکالا جائے تو قرآن کریم میں ارشاد ہے ”إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ“ (ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں) اب غور کیجئے کہ جس وحی کا بھیجنے والا خداوند قدوس ہو، جس کو لے کر اترنے والے قدسی صفات حضرت جبرئیل امین، اور لینے والے جامع الکملات، خاتم الانبیاء محمد ﷺ ہوں، اس کی شوکت و عظمت کا کیا حال ہوگا، اس لیے بخاری فرماتے ہیں: ”کیف کسان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ“ یعنی تم اس پر غور کرو کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس وحی کس طرح آتی تھی؟ کہاں سے آتی تھی؟ کون لاتا تھا؟ کس مکان میں اول اول نزول ہوا؟ کیا حالات تھے؟ اور اس وحی سے عالم میں کیا انقلاب آیا؟

حاصل کلام | اب حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کے ارشاد کے مطابق ترجمہ کا مقصد یہ قرار پایا کہ وحی بڑی پر شوکت و با عظمت شئی ہے، ہر قسم کے تغیرات سے محفوظ ہے، دین کے تمام اصول و فروع کو حاوی ہے، اس مقصد کے پیش نظر اگر روایت پر نظر کی جائے تو حضرت علیہ الرحمہ کی تعلیم کی بناء پر کوئی اشکال وارد نہیں ہو سکتا۔

آیت کریمہ اور اس کے انتخاب کی وجہ | وحی کی عظمت ہی کے اثبات کے لیے موحی، موحی الیہ اور واسطہ کی توثیق کی ضرورت تھی جس کے لیے امام علیہ الرحمہ نے آیت پیش

فرمادی، اس اعتبار سے آیت کوئی مستقل ترجمہ نہیں ہے، بلکہ اسی ترجمہ کا جزء ہے، جس کو تاکید کے لیے بڑھا دیا گیا ہے، آیت کا شان نزول یہ ہے کہ مشرکین نے یہود کے کہنے سے، یا یہود نے خود یہ سوال کیا کہ اگر آپ پیغمبر ہیں تو جس طرح موسیٰ علیہ السلام کتاب دے کر مبعوث فرمائے گئے تھے، اسی طرح آپ پر بھی مکمل کتاب کا نزول ہونا چاہئے، اس کے جواب میں آیت نازل فرمائی گئی، ”إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ“ ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی ہے، جیسے نوح علیہ السلام کے پاس بھیجی تھی، اور ان کے بعد اور پیغمبروں کے پاس، ”إِن“ سے شروع

فرماتے ہیں جو حرف تاکید ہے، اور صیغہ جمع اس لیے ارشاد فرمایا تا کہ یہ معلوم ہو کہ ہم نے شانِ عظمت سے وحی نازل کی ہے، ”السی اوحیت“ ارشاد نہیں فرمایا کہ اس میں اس درجہ وزن نہیں ہے، ”ہم نے بھیجی ہے“ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہر فعل میں تمام تر قوت و جلالت شامل ہے، جملہ اسمیہ کا پیرا یہ بھی دوام و استمرار کے لیے ہے، پھر مسند الیہ کو مسند فعلی پر مقدم فرمایا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ہم ہی ہیں بھیجنے والے اور تم ہماری عظمت سے واقف ہو، اور پھر اس وحی کو اسلاف انبیاء کی وحی سے تشبیہ دے کر اسلاف کی شوکت و عظمت یاد دلائی جا رہی ہے، پھر اس آیت میں اجمال ہے، اس کے بعد کی آیات میں تفصیل موجود ہے۔

وَآتَيْنَا دَاوُدَ زَبُورًا . (نساء: ۱۶۳)

ہم نے داؤد کو زبور دی تھی

اس سے معلوم ہوا کہ وحی کی ایک قسم ایفاء کتاب بھی ہے، اس کے بعد ارشاد فرمایا:

وَكَوَلَّمَ اللَّهُ مُوسَى تَكْلِيمًا . (نساء: ۱۶۴)

اور موسیٰ سے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر کلام فرمایا

وحی کلامی کا وزن | اس سے معلوم ہوا کہ وحی ایفاء کتاب ہی پر منحصر نہیں ہے، بلکہ کلام بھی وحی کی ایک شکل ہے اور اس وحی کلامی کو مؤخر فرمانے کی ایک وجہ اس کی عظمت کا بیان ہے، کہ کتاب دینا اتنی بڑی بات نہیں ہے جتنی بڑی بات خود کلام فرمانا ہے، چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ایفاء کتاب کا تذکرہ نہیں فرماتے، بلکہ کلام کا ذکر کرتے ہیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کلام ایک وقتی چیز تھا جو ختم ہو گیا؛ لیکن آن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ اس کلام کا سلسلہ تیس سال تک برابر جاری رہا، اس لیے یہ کہنا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح کتاب کیوں نہیں دی گئی، اور اس بناء پر آپ کی وحی میں شبہ نکالنا صحیح نہیں، جب کہ معلوم ہو گیا کہ وحی کی مختلف صورتیں ہیں، اور ان سب میں وحی کلامی کا درجہ اعلیٰ و افضل ہے۔

نزول وحی کی حکمت | مقصد وحی کے سلسلہ میں باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

ان سب کو خوشخبری دینے والے اور خوف سنانے والے

پیغمبر بنا کر اس لیے بھیجا تا کہ لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کے

سامنے ان پیغمبروں کے بعد کوئی عذباتی نہ رہے اور اللہ

تعالیٰ پورے زور والے ہیں، بڑی حکمت والے ہیں۔

رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا

يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ

الرُّسُلِ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا .

(نساء: ۱۶۵)

یعنی وحی کے نازل کرنے کی حکمت یہ ہے کہ خداوند قدوس کا پیغام تمام انسانوں تک پہنچ جائے اور بایں معنی حجت قائم ہو جائے کہ انسان خدا کے مقابل یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں پیغام نہیں پہنچا، رسولوں کے ذریعہ پیغامات پہنچا دیئے گئے اور بتلا دیا گیا کہ دیکھو اتمام حجت کے لیے وحی نازل کی جا رہی ہے، اگر تم نے اس کے بعد بھی انحراف کیا تو وہی سزا

ہے جو اس سے پہلے تکذیب کرنے والوں کو دی گئی، اور اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ خداوند قدوس عزیز و حکیم ہے، یعنی غلبہ و حکمت والا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس طرح کی وحی دی جائے اور اس منزلت سے کسے نوازا جائے، چنانچہ حکمت بالغہ کے تحت کسی کو کتاب دی گئی، کسی کو کلام سے نوازا گیا اور کسی کو تسلسل کلام کی نعمت عطاء فرمائی گئی، ایک بار کتاب عطا کرنا کہ اس پر عمل کرو، گو انعام عظیم ہے؛ لیکن اس میں یہ لطف کہاں کہ ہر نئی چیز کے پیش آنے پر ادھر انتظار ہو رہا ہے، اور ادھر سے جواب آرہا ہے جو پیش آمدہ حادثہ کے مناسب ہے جس میں تربیت کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے، چنانچہ اگلی آیت:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ الرَّسُولُ
بِالْحَقِّ مِنْ رَبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَكُمْ .
(نساء: ۱۷۰)

اے لوگو! تمہارے پاس یہ رسول سچی بات لے کر
تمہارے پروردگار کی طرف سے تشریف لائے
ہیں، سو تم یقین رکھو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔

میں صفت ربوبیت کا ہی تذکرہ فرمایا گیا ہے کہ اس وحی کے نازل کرنے سے تمہاری تربیت ہی مقصود ہے، تمہیں پستی سے بلندی کی طرف اٹھانا پیش نظر ہے، جاء صیغہ ماضی پر قد کا داخل فرمانا بھی اس مضمون میں قوت پیدا کرنے کے لیے ہے، پھر آگے فرمایا:

وَإِنْ تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا .
(نساء: ۱۷۱)

اور اگر تم منکر رہے تو خدا تعالیٰ کی ملک ہے یہ سب جو
کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اور اللہ تعالیٰ
پوری اطلاع رکھتے ہیں کامل حکمت والے ہیں۔

اگر نہیں مانو گے تو اس میں ہمارا کچھ نقصان نہیں ہے، اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ ہم علیم ہیں، تم ہم سے چھپ بھی نہیں سکتے، پھر وحی کے بارے میں اہل کتاب سے بھی خطاب فرمایا کیوں کہ خطاب میں تعیم ہے، ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِنْ رَبِّكُمْ
وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ نُورًا مُبِينًا . (نساء: ۱۷۳)

اے لوگو! یقیناً تمہارے پروردگار کی طرف سے دلیل آچکی
ہے اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے۔

برہان اس قوی حجت کو کہتے ہیں جس میں تردد کی گنجائش نہ ہو، اسی طرح ”نور“ کے ساتھ ”مبین“ کی صفت بھی معنوی قوت کے لیے ہے، کیوں کہ نور تو مبین ہوتا ہی ہے، لیکن مبین کہہ کر اس کی وضاحت کو اور روشن و ظاہر فرمایا، ان تمام آیات پر نظر کرنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے کہ امام بخاری نے وحی کے بارے میں جن آیات کا انتخاب فرمایا ہے وہ اپنی جامعیت کے اعتبار سے امام بخاری کی دقت نظر اور وسعت علم پر سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت نوح اور ان کے بعد آنیوالے انبیاء کرام کے ساتھ تخصیص کی وجہ | آیت کریمہ میں ”کسما
أوحينا إلى نوح

والنبيين من بعده“ فرمایا گیا ہے، جس سے حضرت نوح علیہ السلام سے قبل آنے والے انبیاء کرام نکل جاتے ہیں، جن میں حضرت آدم، حضرت شیث اور حضرت ادریس علیہم السلام ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ حضرت حق جل مجدہ نے اس تشبیہ میں تخصیص کس لیے فرمائی ہے، جب کہ تمام ہی انبیاء علیہم السلام پر وحی کا نزول رہا ہے۔

دیگر علماء پر علامہ عینی کا انتقاد | علامہ بدرالدین عینی رحمہ اللہ نے پہلے تو دیگر علماء کے دو قول نقل فرمائے ہیں کہ وجہ تخصیص کے بارے میں بعض علماء نے تو یہ کہا کہ حضرت نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں اور بعض حضرات نے یہ کہا کہ سب سے پہلے عذاب حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر نازل کیا گیا، اس لیے تشبیہ دے کر ڈرانا مقصود ہے، کہ دیکھو یہ وحی اسی قسم کی ہے، اس کی تکذیب پر عذاب آسکتا ہے۔

لیکن علامہ عینی دونوں باتوں سے متفق نہیں ہیں، فرماتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کو پہلا رسول کہنا درست نہیں ہے، پہلے رسول تو حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو اپنی اولاد کی طرف مبعوث ہوئے اور ان کے بعد بار رسالت حضرت شیث علیہ السلام نے اٹھایا جو اولاد قابیل کی طرف مبعوث ہوئے، دوسری بات پر یہ نقد ہے کہ ان سے پہلے بھی قوموں کو عذاب دیا گیا ہے؛ چنانچہ فربری کی تاریخ کے حوالہ سے نقل فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے حضرت شیث علیہ السلام کو وصیت فرمائی تھی کہ قابیل سے ہابیل کا قصاص لینا، چنانچہ شیث علیہ السلام تلوار لے کر قابیل کے پاس گئے اور اسے گرفتار کر لیا تا اس کے قابیل کفر پر مر گیا۔ (عینی جلد اول)

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ کا استدراک | لیکن علامہ عینی کے دونوں انتقاد محل نظر ہیں، علامہ کے پہلے انتقاد کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدم و حضرت شیث علیہما السلام بھی رسول تھے، لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت شیث علیہ السلام کا تو قرآن میں ذکر بھی نہیں ہے، ان حضرات کی پیغمبری تو مسلم ہے، مگر کیا رسول بھی تھے، اس میں کلام ہے، کیوں کہ رسول ہونے کے لیے عند البعض صاحب کتاب ہونا ضروری ہے، نیز یہ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے پہلا رسول ہونے کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ جب امتیں قیامت میں شافع تلاش کرنے نکلیں گی، اور حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سے جواب ملے گا، تو حضرت نوح علیہ السلام کے پاس جائیں گی، اور یہ کہیں گی کہ آپ کو خداوند قدوس نے پہلا رسول بنایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں کفر کی تنظیم ہو گئی تھی، جس کے مقابلہ کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا تھا، خود بخاری شریف ہی میں کتاب التفسیر میں ”باب قول اللہ ولقد ارسلنا نوحا الی قومہ“ کے ذیل میں ایک روایت کے یہ الفاظ ہیں:

أنت أول المرسل إلى أهل الأرض
وسماك الله عبداً شكوراً
آپ اہل زمین کی طرف مبعوث کیے گئے پہلے
رسول ہیں اور اللہ نے آپ کو عبد شکور فرمایا ہے۔

دوسرا انتقاد جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام سے پہلے بھی حضرت شیث علیہ السلام کی امت پر عذاب آچکا ہے، یہ اس لیے محل نظر ہے کہ اگر واقعہ قاتیل کو سزائے قتل دینی تھی تو حضرت آدم علیہ السلام نے خود کیوں نہ قتل فرمایا، حضرت شیث علیہ السلام ہی کو کیوں وصیت فرمائی؟ پھر یہ شخصی معاملہ ہوگا اس کو قومی عذاب کس طرح کہا جاسکتا ہے؟ پھر صرف تاریخ فربری کے حوالہ سے یہ کہنا کہ قاتیل کفر پر مراد درست نہیں، قتل نفس کفر نہیں ہے، اصل بات وہ ہے جو علامہ کشمیری نے مستند تاریخی حوالہ سے ارشاد فرمائی کہ قاتیل کے قتل کی نحوست برابر پھیلتی رہی یہاں تک کہ چھٹی پشت میں کفر شروع ہو گیا۔

دیگر علمائے کرام کے اقوال پر انتقاد کے بعد علامہ عینی نے فرمایا کہ میرے نزدیک اچھا یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا آدم ثانی ہونا اس تخصیص کا باعث ہے؛ چونکہ طوفان نوح میں تمام ہی انسان ختم ہو گئے تھے اور سفینہ نوح میں بچنے والے مؤمنین بھی طوفان کے بعد واصل بحق ہو گئے تھے اور نوح علیہ السلام اور ان کے تین صاحبزادے حام، سام، یافث، بچے تھے اس لیے وجہ تخصیص بھی یہ ہے کہ طوفان کے بعد عالم کا سلسلہ جدید ان ہی سے قائم ہوا۔ (عینی جلد اول)

لیکن یہ اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ اگر آدم ثانی ہونا وجہ تخصیص ہو سکتا ہے تو آدم اول میں یہ بات کیوں نہیں ہو سکتی؟ وہاں تو ابوت حقیقی اور تقدم زمانی دونوں موجود ہیں۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد کہ عالم ایک شخص اکبر ہے | حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ انبیائے کرام علیہم السلام اس عالم کے روحانی مربی بنا کر بھیجے گئے ہیں، اور جب کسی محتاج تربیت کی تربیت کی جاتی ہے تو اسے پہلے چھوٹی چھوٹی باتوں کا عادی بنایا جاتا ہے جس میں بیشتر حصہ وہ ہوتا ہے جس کا تعلق اس کے بقاء جسم سے ہوتا ہے تا اس کہ وہ تکلیف کے قابل ہو جائے، بالکل اسی طرح عالم کی تربیت کا معاملہ ہے، عالم بقول حضرت شیخ الہند قدس سرہ ایک شخص اکبر کی حیثیت میں ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت نوح علیہ السلام تک اس کی طفولت کا دور ہے، حضرت آدم، شیث اور ادریس علیہم السلام کے زمانے میں بھی احکام تھے لیکن بہت کم تھے، اور ان کی وحی کا بیشتر حصہ تکوینیات اور تعمیر عالم سے متعلق تھا، مثلاً حضرت آدم علیہ السلام کو کاشت کے لیے جنت سے بیج دئے گئے اور طریق کاشت کی تلقین کی گئی، مکانات بنانے کے طریقوں کی تعلیم دی گئی، کپڑا بننے کے اصول بتلائے گئے اور حضرت آدم علیہ السلام کے زمانہ میں نماز صرف دو رکعت فرض تھی۔

دور شباب | عالم کا یہ دور طفولت حضرت نوح علیہ السلام پر تمام ہو جاتا ہے، اس وقت کا دور، عالم کے شباب کا دور ہے، جو عالم تکلیف کہلاتا ہے، جوانی کے زمانہ میں ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں، اور ان سے عہدہ برآں

ہونے کی صورت میں تہدید و وعید سے کام لیا جاتا ہے، کبھی اس تہدید و وعید اور دوسرے امور اصلاح کے لیے مدت مدید درکار ہوتی ہے، چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کو اصلاح عالم کے لیے عمر درازی دی گئی کہ وہ بہیمیت دور فرما کر مملکت کے آثار پیدا کرنے کی سعی کریں، اسی لیے ان کو اس قدر دراز عمر دی گئی تھی کہ قوم کے افراد اپنی اولاد کو وصیت کر کے مرتے تھے کہ دیکھو یہ شخص دیوانہ ہے، اس کی ایک نہ سننا، چنانچہ ان لوگوں کا مزاج اس قدر فاسد ہو گیا تھا کہ ہر قسم کی اصلاحی تدابیر کے باوجود انہوں نے ایک نہ سنی، اور سنی بھی تو سنی اُن سنی ایک کر دی، بالآخر جب حجت تمام ہو گئی اور اس کا یقین ہو گیا کہ اب بغیر قوی مسہل کے عالم کا مزاج اعتدال کی طرف مائل نہ ہو سکے گا اور بذریعہ وحی یہ اطلاع دی گئی کہ بس جو ایمان لانے والے تھے لاکھ اب اور کوئی ایمان نہیں لائے گا تو نوح علیہ السلام نے ان کی طرف سے مایوس ہو کر بددعا فرمائی اور عذاب آگیا، یہ تشریحی وحی نہ ماننے کا مہیب طوفان تھا جو عالم کے غرق کی صورت میں نمودار ہوا۔

عہدِ ماضی کا تذکار | اب تشبیہ دی گئی ہے کہ دیکھو حضرت نوح علیہ السلام اور محمد عربی ﷺ کے مابین کچھ زیادہ فاصلہ نہیں ہے، بلکہ دونوں کی شان تشریحی ہے، وہاں تکذیب کا جو رد عمل ہوا یہاں بھی ہو سکتا ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے عالم کو عزت و افتخار کے اصول تلقین کیے تو ان کی توہین کی گئی، انہوں نے وقار و عظمت کا درس دیا تو اس کا جواب تمسخر و استہزاء سے دیا گیا، انہوں نے دعوتِ توحید دی تو پتھراؤ کیا گیا، انہوں نے آوازِ حق بلند کی تو ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے گئے، اگر حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کیے گئے اس طرزِ عمل کو آج بھی دہرانے کی کوشش کی گئی تو آج بھی بساطِ عالم الٹ دی جاسکتی ہے، اس لیے اے مکہ والو! تمہیں اپنے ہر اقدام کے متعلق سوچنا ہوگا اور اپنے ہر فیصلے پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔

تشبیہ کا دورِ پہلو یہ بھی ہے کہ یہ آدم و شیت کی وحی نہیں ہے جس میں تکوینیات کو زیادہ دخل تھا بلکہ یہ وحی اپنے اندر تشریحی پہلو رکھتی ہے، یہ عالم کے شباب کا دور تھا جہاں اسے ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا، اور پہلو تہی کرنے پر تہدید کی گئی۔

تائیدِ شباب | یہی وجہ ہے کہ اس دورِ شباب میں جس کی مدت حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور تک دراز ہے کسی کے بال سفید نہ ہوتے تھے، سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داڑھی سفید ہوئی ہے، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بال سفید ہوئے تو انہوں نے تعجب سے دریافت فرمایا کہ یہ کیا ہے؟ اوپر سے جواب ملا کہ یہ وقار ہے، حضرت ابراہیم کے دور سے یہ وقار شروع ہو کر آنحضرت ﷺ پر تمام ہو جاتا ہے، اور چوں کہ پیرانہ سالی میں علوم پختہ اور تجربات وسیع ہو جاتے ہیں، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے علوم و معارف کا سرچشمہ پھوٹا، اس دور میں جس قدر حکماء اور فیلسوف پیدا ہوئے اتنے کسی دور میں بھی پیدا نہیں ہوئے، علوم ترقی کرتے رہے، اور روحانیت اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتی رہے، یہاں تک کہ علوم و روحانیت کی معراج آں

حضور ﷺ کی بعثت پر ختم ہو گئی، آپ کو وحی کلامی عطاء کی گئی، اور تسلسل کے ساتھ عطاء کی گئی، یہ وحی جو انسانی علوم کی آخری ارتقائی شکل ہے، اسی شخص کو عطاء کی جاسکتی ہے، جو تمام انسانی کمالات کا جامع ہو، کسی پیغمبر کی وحی میں اس قدر وزن نہ تھا کہ خود اس کا جسم بھی بوجھل ہو جائے، اور اگر اس کے جسم سے کسی دوسرے کا جسم مل جائے، تو وہ بھی اس بوجھ کو برداشت کرنے کی قوت محسوس نہ کرے، پھر آپ کی وحی کی عظمت و رفعت کا اندازہ ان اثرات سے ہوتا ہے جو آپ کے بعد ظہور پذیر ہوئے، اور جب تک اس کرۂ ارضی پر انسان نامی کوئی مخلوق موجود ہے ان شاء اللہ آپ کی وحی کے آثار اور بڑھتے اور پھیلتے چلے جائیں گے، آپ کی تبلیغ کی مدت گو بہت قلیل ہے، صرف تیس سال مدت نبوت ہے، جس میں مکی زندگی تو آلام و مصائب کا سامنا کرتے گزری، جب کفار مکہ کے مصائب انتہا کو پہنچ گئے تو آپ ﷺ نے باذن الہی دعوت کے مرکز کو تبدیل کر دیا اور اب افق مدینہ سے رحمت کے بادل برسے شروع ہوئے، صلح حدیبیہ ۶ھ سے قبل مدینہ طیبہ میں بھی ایک گونہ آزادی نہ تھی، لیکن صلح حدیبیہ ۶ھ سے ۷ھ کی مدت میں وحی کے آثار اتنے گہرے اور اتنے وسیع تھے کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، اس سے جہاں وحی کی عظمت کا پتہ چلتا ہے وہاں اس کی عصمت بھی بخوبی واضح ہو جاتی ہے، اور جب بخاری کا مقصد معلوم ہو گیا کہ وحی کی عصمت و عظمت کا بیان کرنا منظور ہے تو روایات میں کسی قسم کا اشکال باقی نہیں رہتا۔

(۱) حَدَّثَنَا الْحَمِيدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ الْأَنْصَارِيُّ قَالَ أَخْبَرَنِي مُحَمَّدُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ التَّمِيمِيُّ أَنَّهُ سَمِعَ عَلْقَمَةَ بْنَ وَقَّاصٍ اللَّيْثِيَّ يَقُولُ سَمِعْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوَى فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ. (آئندہ: ۵۳، ۲۵۲۹، ۳۸۹۸، ۵۰۷۰، ۶۲۸۹، ۶۹۵۳)

ترجمہ | حمیدی نے بیان فرمایا کہ ہم سے سفیان نے یحییٰ بن سعید انصاری سے روایت کرتے ہوئے فرمایا، انہوں نے کہا کہ محمد بن ابراہیم تیمیمی نے خبر دی کہ انہوں نے علقمہ بن وقاص لیشی کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں نے حضرت عمر بن الخطابؓ کو منبر پر فرماتے ہوئے سنا ہے کہ انہوں نے آن حضور ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو وہی چیز دی جائے گی، جو اس کی نیت میں ہے، پس جس کی ہجرت حصول دنیا کے لیے ہو یا کسی عورت سے نکاح کی خاطر ہو تو اس کی ہجرت (اپنی نیت کے مطابق) اسی کی طرف ہوگی۔

حمیدی کی وجہ تقدیم | امام بخاری نے حمیدی کی روایت سے کتاب کا افتتاح فرمایا ہے، یہ قریشی ہیں، ان کا سلسلہ نسب پیغمبر علیہ السلام اور حضرت خدیجہ الکبریٰؓ سے ملتا ہے، اور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا

قدموا قریشاً اور الائمة من قریش .

ان احادیث کے پیش نظر امام بخاری نے ایک قریشی کی حدیث سے کتاب کا آغاز فرمایا، دوسرا نمبر اہل مدینہ کا ہے اسلئے دوسری روایت امام مالک سے بیان فرمائی ہے، کہ وہ مدینہ کے سب سے بڑے عالم ہیں، تو جس طرح اسلام کا آغاز مکہ سے ہوا اور مدینہ سے اسے ترقی کا موقع ملا، اسی طرح بخاری نے سلسلہ حدیث مکہ سے شروع فرما کر مدینہ تک پہنچا دیا۔

اس روایت میں حضرت عمرؓ سے لیکر یحییٰ ابن سعید انصاری تک تفرد ہی تفرد ہے، یحییٰ سے اس روایت کی تشہیر ہوئی، یحییٰ سے روایت کرنے والے حضرات بعض کے یہاں ڈھائی سو، بعض کے یہاں تین سو اور بعض کے یہاں سات سو ہیں لیکن علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ہمیں سونا نام بھی نہیں ملتے اسلئے اسے مبالغہ پر محمول کریں گے۔

شان ورود | یہاں تو صرف اسی قدر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے، ابن بطال نے ذرا اور آگے بڑھ کر یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہجرت کے بعد سب سے پہلا اعلان جو بارگاہ نبوت سے اشاعت پذیر ہوا، یہی تھا، لیکن یہ دعویٰ ابن حجر کے نزدیک محل نظر ہے، فرماتے ہیں کہ ہمیں کوئی روایت اس قسم کی نظر نہیں آتی جس سے یہ معلوم ہو کہ اولین اعلان تھا، اور نہ خود ابن بطال یا کسی اور نے اس قسم کی روایت پیش کی ہے۔

ہاں اس قدر ضرور ہے کہ طبرانی نے ثقہ رواۃ کی سند کے ساتھ لیک واقعہ حضرت عبداللہ بن مسعود سے نقل فرمایا ہے کہ ایک شخص نے ام قیس نامی عورت کو پیغام نکاح بھیجا، اس نے منظور کر لیا اور شرط لگا دی کہ تمہیں ہجرت کرنی ہوگی، چنانچہ انہوں نے ہجرت کی اور عورت سے نکاح ہو گیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کی بنا پر وہ ہمارے درمیان ”مہاجرام قیس“ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

حدیث و ترجمہ کا انطباق | ایک جماعت تو اس کی قائل ہے کہ اس حدیث کا ترجمہ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس حدیث کو پیش کر کے بخاری نے اپنی نیت کی صفائی اور اخلاص پیش فرما رہے ہیں اور اس حدیث کو پیش فرما کر دوسروں کو بھی دعوت اخلاص دے رہے ہیں لیکن حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر یہ اشکال فرمایا ہے کہ اگر یہی مقصد تھا تو اس حدیث کو باب سے بھی پیشتر لاتے تاکہ افتتاح سے قبل نیت کی صفائی اور دعوت اخلاص کا مقصد پورا ہو جاتا، حالانکہ امام بخاری باب کے انعقاد کے بعد یہ حدیث پیش کر رہے ہیں، جو اس توجیہ سے ربط نہیں رکھتا۔

اس سلسلہ میں ایک توجیہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہجرت پر بحث کی گئی ہے اس لئے اگر وحی اور ہجرت میں

مناسبت نکالی جائے تب بھی ترجمہ سے انطباق ہو سکتا ہے ہجرت کے معنی دراصل کسی ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری طرف آنے کے ہیں، اور شریعت میں ہجرت کا مفہوم معصیت چھوڑ کر اطاعت کی طرف آنا ہے۔ المہاجر من ہاجر عن ما نہی اللہ عنہ اسی بنا پر دار الکفر کو چھوڑ کر دار الاسلام میں آنا ہجرت کہلاتا ہے، اسکے بعد دیکھنے کی چیز یہ ہے۔ ہجرتیں دو ہیں، ایک ہجرت آپ کے گھر سے غار حراء تک جس کا سلسلہ کم و بیش چھ ماہ تک جاری رہا۔

یہ نزول وحی کا مقدمہ ہے، اور جب کفار مکہ نے ایذا رسانی میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہیں کیا تو مکہ سے مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت کی گئی، اور وطن کو چھوڑ دیا گیا۔

دونوں ہجرتوں میں قدر مشترک یہ ہے کہ پہلی ہجرت نزول وحی کے لئے مبداء اور دوسری ہجرت ظہور کیلئے مبداء ہے مکہ میں گرد و پیش کی مخالفت کے باعث وحی کو عام کرنے کا موقع نہ مل سکا اور مدینہ کی ہجرت کے بعد اس وحی کی تبلیغ عام کی گئی۔

حضرت علامہ کشمیری کی تحقیق | علامہ کشمیری علیہ الرحمہ نے حدیث و ترجمہ کے انطباق کے سلسلہ میں ایک اور تحقیق بیان فرمائی کہ وحی اور نیت عمل کی دونوں جانبوں میں واقع ہیں۔ عمل کا

تعلق وحی کے ساتھ بھی ہے اور عامل کی نیت کے ساتھ بھی۔ کیونکہ عمل کی دو حیثیتیں ہیں، ایک ورود عمل، ایک صدور عمل۔ ورود: یعنی اوامر و نواہی کے تحت عامل کا مکلف ہونا یہ وحی پر موقوف ہے۔

صدور: یعنی اس تکلیف کے ماتحت عمل کرنا یہ نیت پر منحصر ہے۔

تو جس طرح وحی ورود اعمال کا مبداء ہے اسی طرح نیت صدور اعمال کا مبداء ہے، نہ تو کوئی انسان وحی کے بغیر اچھے اعمال اختیار کر سکتا ہے، اور نہ نیت کے بغیر اچھے اعمال لائق اعتبار ہو سکتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد | حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ نبوت اگرچہ کسی عمل پر موقوف نہیں، ارشاد ہوتا ہے اللہ یصطفیٰ من الملائکۃ رسلاً و من الناس (پ ۱۷-ع ۱۷)

”اللہ تعالیٰ نے منتخب کر لیا ہے فرشتوں میں سے احکام پہچاننے والے اور آدمیوں میں سے“ اللہ اعلم حین یجعل رسالۃ (پ ۸:ع ۲) خدا ہی خوب جانتا ہے جہاں اپنا پیغام بھیجتا ہے، لیکن اعمال کے اثرات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، اور سنت اللہ جاری ہے کہ جب کسی شخص کو اونچا منصب اور بڑا درجہ عطا فرمانا ہوتا ہے تو اول اسکے اندر اس منصب کے لئے استعداد اور صلاحیت ودیعت فرماتے ہیں اور پھر اس قسم کے اعمال پر کار بند کر دیا جاتا ہے جس سے وہ اس جلیل القدر منصب کا واقعی اہل ہو سکے، ارشاد ہے۔

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برادشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنا راستہ ضرور دکھلا دیں گے۔

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا. (پ ۲۱:ع ۳)

اس جہاد میں تعیم ہے مالی ہو یا جسمانی، یعنی جو شخص بھی مرضیات خداوندی کیلئے اپنے نفس کے خلاف جہاد کرے گا تو بالضرور اس پر خدا تک پہنچنے کا راستہ کھول دیا جائے گا، اور جس قدر زیادہ جہاد کرے گا اسی قدر استعداد میں اضافہ ہوگا، روحانیت میں ترقی ہوگی اور اس ارتقاء کی آخری منزل یہ ہے کہ خداوند قدوس اسے اپنے پیغام رسائی کے لئے منتخب فرمائے گا۔

نیت کیا ہے؟ | تو دراصل اعمال انسان کو ترقی بخشتے ہیں، اسے نیچے سے اونچا اٹھاتے ہیں لیکن اعمال میں اگرچہ صورت عمل بھی مطلوب ہے مگر اصل عمل وہ مضر قلبی ہے جس کو عامل کی نیت اور ارادہ کہا جاتا ہے، عمل کی صحت و فساد اور اس کی مقبولیت اور مردودیت کا مدار دراصل وہی نیت ہے، اسی پر اچھے برے ثمرات اور نتائج کا ترتیب ہوتا ہے، صورت عمل کتنی ہی اعلیٰ اور بہتر ہو لیکن اگر نیت میں فساد ہے تو عند اللہ اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں بلکہ الٹا معتوب ہوگا، کتب حدیث میں بالفاظ مختلفہ یہ مضمون منقول ہوا ہے اور حضرت شاہ صاحب سے یہ یا اسکے مقارب الفاظ بھی سنے ہیں یعنی محض صورت کی خوشنمائی سے کام نہیں چلے گا، وہاں تو اصل چیز نیت ہے اسکو صحیح رکھو صورت کا معاملہ تو یہ ہے کہ اس میں مؤمن و منافق کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہو پاتا، نماز مؤمن و منافق دونوں پڑھتے ہیں، شرائط دونوں بجالاتے ہیں، لیکن مؤمن کی نماز کے اثرات منافق کی نماز کے اثرات سے بالکل مختلف ہیں، اس لئے کہ باطن عمل نے دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچ دیا ہے، خود ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے من دخل المسجد لشیء فهو حظه او كما قال عليه الصلوة والسلام پھر اسی نیت کے تفاوت سے ثواب کے درجات میں بھی تفاوت ہو جاتا ہے، کسی کو آدھا ثواب ملتا ہے، کسی کو ایک ثلث، کسی کو ایک ربع اور کسی کو پانچواں حصہ ملتا ہے اسی طرح دسویں حصہ تک کی روایات موجود ہیں، خود آپ ﷺ نے اسکی اطلاع دی:

ان اللہ لا ينظر الى صوركم
واعمالكم ولكن ينظر الى قلوبكم
ونياتكم او كما قال .
اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور ظاہری اعمال کو
نہیں دیکھے گا لیکن تمہارے دلوں اور نیتوں کو
دیکھے گا۔

اعمال کے ثمرات و نتائج | ہر عمل کی ایک تاثیر ہوتی ہے جسکا عامل کو اندازہ ہو یا نہ ہو لیکن بلا کسی اشتباہ کے یہ بات ثابت ہے کہ برے عمل کی تاثیر بری ہوتی ہے اور اچھے عمل کی اچھی، حضرت علامہ کشمیریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ

کایراث خبث البذر خبث نباته
طباعا وليس فيه قال يقول
جس طرح طبعی طور پر نیکے بیج سے پیداوار بھی نکمی ہوتی ہے اور اس میں کسی قسم کی گفت و شنید کی ضرورت نہیں
جس طرح اچھے بیج کے پودے اچھے ہوتے ہیں اسی طرح اچھی نیت کے ساتھ جو عمل کیا جائیگا اس کے آثار بھی گیرائی

اور گہرائی لئے ہوئے ہوں گے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام (جن پر وحی نازل ہو رہی ہے) کے اعمال کیسے ہیں؟ اور ان کے اثرات کیا ہیں؟ تاکہ ہم پورے وثوق کے ساتھ یہ سمجھ سکیں کہ

پیغمبر علیہ السلام کے اعمال

آپ نبی ہیں اور جو چیز آپ پر نازل ہو رہی ہے وہ وحی صادق ہے، چنانچہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ آپ نے اس وقت کلمہ حق کا اعلان فرمایا جبکہ پورا عرب جہالت و غفلت سے ہم آغوش تھا، بد اخلاقی ان کا سرمایہ تھا، اور جہالت ان کا منتہائے کمال، شراب نوشی، قمار بازی، قتل و غارت گری اور دوسرے انسانیت سوز مظاہرے ان کے یہاں معمولی کام سمجھے جاتے تھے، ان کاموں میں کوئی باک نہ تھا بلکہ قبائل کے اجتماعات کے موقع پر ہر قبیلہ انہیں چیزوں کو فخر و مباہات کے لئے پیش کرتا، اعمال کی گندگی کا یہ عالم تھا کہ خدا کے ساتھ بالکل بے تعلق تھے، خود اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے بتوں کے سامنے سر نیاز خم کرتے تھے، حالانکہ بخوبی جانتے تھے کہ نہ یہ مدد کر سکتے ہیں نہ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں یہاں تک کہ مکھی بھی نہیں اڑا سکتے، لیکن یہ سب جانتے ہوئے انہیں اپنا حاجت روا بناتے، ان پر نذر و نیاز چڑھاتے اور ستم بالائے ستم یہ کہ جس پتھر کو اچھا دیکھا عبادت کے لئے منتخب کر لیا، دوسرا پتھر اس سے اچھا ملا، تو اسے معبود بنا لیا اور پچھلے کو پھینک دیا، یا اس سے استنجاء کر لیا، جہالت کا یہ عالم تھا کہ پورے عرب میں معمولی تعلیم یافتہ افراد کا شمار بمشکل نو تھا، فوضویت عام تھی، کوئی شخص اپنے قبیلہ کے سردار کے علاوہ کسی دوسرے کی بات سننا گوارا نہ کرتا تھا، چنانچہ اس اعلان نبوت کے بعد آپ سے عدوات ہو گئی، ہر طرح کی تکلیف و اذیت کے درپے ہو گئے، ابولہب آپ کا چچا کہتا ہے کہ اس کی بات نہ سننا، معاذ اللہ یہ کذاب ہے، اور پتھر مارتا جاتا ہے آپ کو تبلیغ ہیں یا مصروف دعا ہیں، اسلئے کہ حکم ربانی ہے۔

فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيلًا (پ: ۲۹/ع: ۷) سو آپ صبر کیجئے اور صبر بھی ایسا کہ جسمیں شکایت نہ ہو، طائف میں تبلیغ کے لئے تشریف لے گئے وہاں اوباشوں کو آپ پر لہکا دیا گیا، انہوں نے اس قدر پتھراؤ کیا کہ آپ لہولہان ہو گئے یہ عالم تھا کہ ۔

جنوں کے جوش میں نکلے جو گھر سے ادھر سے ہم چلے پتھر ادھر سے

خون کی روانی سے موزے پیروں میں جم گئے، ملک الجبال حاضر ہوا کہ حکم ہو تو ان خشین کو ملا دوں، سب پس کر مرجائیں گے، لیکن ارشاد ہوا کہ میں رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہوں، پھر صرف آپ ہی کی ذات مقدس پر انحصار نہیں بلکہ جو بھی اس کا روان اسلام کا ہمرکاب ہوتا ہے پورے عالم کی دشمنی مول لیتا ہے۔

اے ہم نفسان آتشم از من بگریزید ہر کس کہ شود ہمرہ ما دشمن خویش است

لیکن مجال نہیں کہ کسی بھی شریک کارواں کے لبوں تک حرف شکایت آئے، نہ کسی نفع کی توقع ہے نہ بظاہر عزت دنیوی کا خیال ہے لیکن زخموں پر نمک پاشی ہو رہی ہے تو کیا، کلمہ ایک ہے زبان ایک ہے۔

انقلاب عظیم | حالات کی اس کج رفتاری کے باوصف نیت صادق ثمرہ ہوئی، وہ قوم جو علم و تمدن، تہذیب و شائستگی اور انسانیت سے محروم تھی، ہر تمدن قوم، ہر تہذیب یافتہ معاشرے کی مقتدا بن گئی، آپ سید الکونین ہوئے تو آپ کے اہل کارواں خیر القرون کہلائے۔ اب ان تاریخی حقائق کی روشنی میں آپ کے اعمال کا جائزہ لیکر دیکھئے، جس انسان نے اس سرعت کے ساتھ ترقی کی ہو وہ یقیناً خاتم النبیین ہونا چاہئے تھا، اگر اس عظیم المرتبت انسان کی نیت میں ذرا بھی اشتباہ کیا جاسکتا ہے تو یقیناً یہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ اور ظلم ہے، معلوم ہوا کہ رسالت و نبوت کے لئے سب سے پہلا مبداء خلوص نیت ہے، پھر کیا اس قدر گہرے ارتباط کے بعد بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ روایت ترجمہ کے ساتھ مربوط نہیں، سچ پوچھئے تو یہی روایت ترجمہ کے ساتھ تمام احادیث میں سے سب سے زیادہ مربوط ہے۔

حدیث نیت کی تقدیم کی وجہ | بعض حضرات نے اس حدیث سے یہ فائدہ اٹھالیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا خطبہ ہے جو انہوں نے ممبر پر بیان فرمایا تھا، امام بخاری علیہ الرحمہ نے بھی اسکو مقصد سے قبل بیان فرمایا ہے تاکہ یہ خطبہ کے قائم مقام ہو سکے، بعض حضرات نے یہ کہا کہ اسکا مقصد اپنی نیت کا اظہار اور پڑھنے والوں کیلئے دعوت اخلاص ہے، لیکن یہ سب باتیں اس قابل نہیں کہ انہیں امام بخاری کا مقصد قرار دیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان باتوں سے قطعاً انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، اشارہ ہو سکتا ہے، یعنی امام بخاری یہ فرما رہے ہیں کہ میں جانتا ہوں عمل کا تعلق نیت سے ہے اور میں نے اپنے خیال کے مطابق نیت خیر کیساتھ عمل شروع کیا ہے، اگر میری نیت خیر ہے تو قبول فرمائے، لیکن اس بات کو لفظوں میں یوں نہیں لاسکتے کہ **فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى** (پ: ۲۷/ع: ۶) (تو تم اپنے کو مقدس نہ سمجھا کرو پس تقویٰ والوں کو وہی خوب جانتا ہے)، فرمایا گیا ہے اسی مقصد کے ماتحت آپ نے ہرۃ کے بجائے زینب نام تجویز فرمایا تھا کیونکہ ہرۃ میں اپنے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے، اب کتاب کی اس بے پناہ مقبولیت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام کی نیت کس درجہ صادق تھی، اسکی مقبولیت حلقہ علماء ہی تک محدود نہیں، بلکہ بارگاہ الہی میں بھی اسے مقبولیت حاصل ہے۔ بخاری کا ختم ہر مصیبت کے دفعیہ کے لئے تجربہ کی روشنی میں مفید ثابت ہوا ہے۔

حدیث کا منشاء کیا ہے؟ | بظاہر اس حدیث کے یہاں پیش فرمانے سے امام کا مقصد نہ شوافع کی تائید ہے اور نہ احناف کی تردید، نہ یہ بتلانا مقصود ہے کہ اعمال کی صحت یا ثواب کا مدار نیت پر ہے اگرچہ شوافع و احناف نے اپنے مذاق کے مطابق صحیح، ثواب، حکم وغیرہ کی تقدیر نکالی ہے، گویا بات اتنی اہم نہ تھی کیونکہ ایک مسئلہ وضو کے علاوہ کسی اور مسئلہ میں ایسا اختلاف نہیں، شوافع وضو میں نیت ضروری قرار دیتے ہیں اور احناف اسے غیر ضروری قرار دیتے ہیں، احناف رحمہم اللہ نے یہاں ثواب کی تقدیر نکالی ہے، اور حضرات شوافع رحمہم اللہ نے ”صحیح“ کی، لیکن ان میں ایک تقدیر بھی حدیث کے صحیح منشا کے مناسب نہیں، بلکہ اس سے حدیث کے عموم میں تقیید اور تنگی پیدا ہوتی ہے اس لئے کہ حضرات شوافع کی تقدیر پر جب ”انما الاعمال بالنیات کے معنی انما صححة الاعمال

بِالنِّیَّاتِ، قرار دیئے گئے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ اعمال کا صحیح ہونا نیتوں پر موقوف ہے اور صحت کا یہ مفہوم ہے کہ ذمہ داری کو شرطوں کیساتھ ادا کر دیا جائے، پھر ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا اس دنیا کے احکام سے متعلق ہے، اس لئے حدیث اپنے الفاظ میں عموم کے باوجود صرف احکام دنیا کیساتھ خاص ہوگئی، دوسری تخصیص یہ ہو جاتی ہے کہ بہت سے احکام ایسے ہیں کہ جنہیں صحیح اور فاسد کہنا ہی درست نہیں ہے جیسے قتل و زنا، چوری وغیرہ، علاوہ ازیں ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اگر آپ ”صحیح“ ہی کو مقدر مانتے ہیں تو اس زمانہ میں ہجرت کے بغیر اسلام قبول ہی نہ ہوتا تھا، اور یہاں پیغمبر علیہ السلام کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ ہجرت نکاح کی غرض سے ہوئی ہے، اس لئے نیت صحیح نہ ہونے کی بنا پر ہجرت صحیح نہیں، اس معنی کے پیش نظر ضروری تھا کہ پیغمبر علیہ السلام انہیں واپس بھیج دیتے کہ جاؤ اور دوبارہ نیت کو خالص کر کے آؤ حالانکہ آپ نے ایسا نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ عمل کی صحت کا مدار نیت پر نہیں۔

اسی طرح حضرات احناف رحمہم اللہ کے تقدیر ”ثواب“ بھی مفہوم میں تنگی پیدا کر دیتی ہے، اولاً تو یہ کہ حدیث صرف اخروی احکام کے ساتھ خاص ہو جاتی ہے کیونکہ ثواب اور عقاب کا تعلق آخرت سے ہے، جس طرح صحت اور فساد دنیوی احکام سے متعلق ہے، دوسرے یہ کہ حدیث صرف طاعات ہی کے ساتھ مختص ہو جاتی ہے کیونکہ ثواب صرف انہی کے ساتھ متعلق ہوتا ہے، حالانکہ حدیث طاعات و معاصی دونوں کو عام ہے جیسا کہ حدیث شریف میں مہاجر الی اللہ اور مہاجر الی الدنیا کے تقابل سے واضح ہے، یہ تمام بحثیں ہر مقام پر امام کے مقصد سے زائد ہیں اس لئے بالاختصار عرض کیا گیا۔

در اصل حدیث کا منشا معین کرنے کیلئے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ الفاظ حدیث پر گہری نظر ڈالی جائے اور سیاق و سباق کے بغور مطالعہ کے بعد حدیث کی غرض منطوق کا سراغ لگایا جائے، جب ہم اس حدیث کے سیاق و سباق پر غور کرتے ہیں تو یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ حدیث کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ عمل کی صحت کا مدار نیت پر ہے بلکہ حدیث پر نظر ڈالنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ نیت دو طرح کی ہوتی ہے ایک نیت صحیحہ دوسرے نیت فاسدہ، اور ان دونوں نیتوں کے آثار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، عمل بڑا ہو یا چھوٹا، اگر نیت خیر کے ساتھ کیا جائے گا تو اس میں برکت بھی ہوگی اور ترقی و نمو کے آثار بھی نمایاں ہوں گے اور دوسری تمام خوبیاں بھی اپنے درجہ کے مطابق اس میں پیدا ہو جائیں گی، لیکن اگر عمل خیر کی نیت خیر نہیں ہے بلکہ اس کو غلط جگہ استعمال کیا جا رہا ہے مثلاً نماز اللہ کے لئے نہیں بلکہ مسجد سے سامان چرانے کے لئے ہے تو ایسا عمل منہ پر مار دیا جائے گا، نہ اس میں خیر و برکت ہوگی اور نہ ارتقائی آثار ہی

اس لئے کہ صحت و فساد کا احتمال انہی احکام کے اندر پیدا کیا جاسکتا ہے کہ جن میں حلت و حرمت دونوں جہتیں ہوں، لیکن وہ احکام کہ جن کے حرام ہونے میں

اشتباه ہی نہیں ان میں صحت و فساد کے احتمال کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۲

پیدا ہو سکیں گے، یہی اسلام کا امتیازی وصف ہے کہ وہ کسی بھی شئی کا مدار ظاہر پر نہیں رکھتا، بلکہ وہ ہر جگہ باطن کے تزکیہ پر زور دیتا ہے اسلام کی نظر میں وہ اچھا نہیں جو اچھا نظر آئے بلکہ اچھا وہ ہے جو اللہ کی نظر میں اچھا ہو، ابولہب کو ابولہب کہتے ہی اس لئے تھے کہ اس کے چہرے سے جمال پھوٹا پڑتا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چہرے سے شعلے اٹھ رہے ہیں، لیکن خداوند قدوس کی نظر میں وہ تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ (پ ۳۰ ع ۳۶) (ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں) کا مصداق تھا، اور اس کے بالمقابل حضرت بلال حبشی سیاہ فام تھے لیکن ان کا دل اس قدر منور تھا کہ لیلۃ المعراج میں آپ سے آگے چل رہے ہیں، جیسا کہ مسند احمد کی روایت سے واضح ہو رہا ہے، اکثر حضرات اسکو معراج منامی پر محمول فرما رہے ہیں، معراج منامی کو معراج یقظہ کی تمہید سمجھئے، جس طرح کہ غار حراء میں بحالت بیداری جبرئیل کی آمد سے قبل منام میں جبرئیل کا آنا اور بعض آثار کے مطابق بیداری جیسے واقعات کا پیش آنا بھی مذکور ہے حدیث شریف میں ہے کہ حضرت بلال کے جوتوں کی آواز اپنے اپنے آگے سنی ہے، حضرت بلال بحیثیت خادم آنحضرت ﷺ سے آگے چل رہے ہیں پوچھا گیا آپ کو یہ رتبہ بلند کس عمل کے صلہ میں عطا کیا گیا؟ فرمایا وضو کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھتا ہوں، چنانچہ صحابہ کرامؓ انکے متعلق فرماتے ہیں، سید الناس اعتق سیدنا الناس۔ پہلے سید الناس سے مراد حضرت ابو بکر صدیق اور دوسرے سید الناس سے مراد حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہما ہیں، اصمعی امام لغت اور عطاء بن ابی رباح (امام اعظمؒ کے استاذ) بہت بد صورت تھے لیکن علوم کے انوار نے انہیں جگمگا رکھا تھا۔

یہ سب کچھ عزت و منزلت اسلئے ہے کہ ان کے اعمال میں باطن کی راہ سے تاثیر آئی ہے، اعمال کسی بھی شعبہ زندگی سے متعلق ہوں وہ جانی ہوں یا مالی، منہی ہوں یا اخلاقی، ان کی تاثیر ہمت کے صدق و اخلاص پر منحصر ہے، حدیث شریف میں مثال دیکر اس بات کو واضح کیا جس کی ہجرت اللہ اور رسول اللہ کے لئے ہے اس کے مدارج میں ترقی ہے اسکی ہجرت مقبول ہے اور جس کی ہجرت دنیا کے لئے ہے وہ مقبول نہیں۔ دنیا متاع غرور ہے اور اسے مؤمن کے امتحان کے لئے آراستہ کیا گیا ہے۔

کیا ہے تو نے متاع غرور کا سودا . فریب سود و زیاں لا الہ الا اللہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ چھھر کے پر کے برابر بھی اگر دنیا کی وقعت ہوتی تو کافر کو پینے کے لئے ایک گھونٹ پانی بھی میسر نہ آتا، اسلئے دنیا بالکل بے وقعت چیز ہے صرف مؤمنین کے امتحان کے لئے اسے مزین کیا گیا ہے۔

زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبَّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ
وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ
الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْبِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا . (پ ۱۰ ع ۳)

خوشنما معلوم ہوتی ہے لوگوں کو محبت مرغوب چیز و نکی، عورتیں
ہوں، بیٹے ہوئے، لگے ہوئے ڈھیر ہونے سونے اور چاندی
کے، نمبر لگے ہوئے گھوڑے ہوئے اور زراعت ہوئی یہ
سب استعمالی چیزیں ہیں دنیاوی زندگانی کی۔

لیکن حدیث شریف میں اطمینان دلایا گیا ہے کہ اگر ہجرت ہمارے لئے کی گئی ہے تو مقبول ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ من كانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ فہجرتہ الی اللہ ورسولہ " میں شرط و جزاء ایک ہو گئے ہیں جو نحوی اعتبار سے درست

نہیں، لیکن یہ اعتراض درست نہیں، بلکہ مبالغہ کے لئے ایسا کیا جاتا ہے جیسے "انا ابو النجم و شعری شعری" کہ میں ابو النجم ہوں اور میرے اشعار تو میرے ہی اشعار ہیں، یعنی میرے اشعار کے مقابل دوسرے کے اشعار بیکار ہیں، اسی طرح یہاں فرمایا کہ جس شخص کی ہجرت اللہ کے لئے ہوگی تو وہ اللہ ہی کے لئے ہے پھر کیوں نہ مقبول ہو، وہ تو مقبول ہی ہے، اور جس کی ہجرت دنیا کے کسی فائدہ کی غرض سے ہو جاتی کہ نکاح کی خاطر بھی کہ وہ ایک اچھا مقصد ہے اور فی الجملہ اپنے اندر شان اطاعت بھی رکھتا ہے، مگر وہ ہجرت الی اللہ نہیں کہلائے گی اور نہ اس پر صحیح ہجرت کے آثار مرتب ہوں گے۔

ایک فرق

بالکل اسی طرح کا مقصد ام ھلیم والدہ حضرت انس کا ہے کہ ابو طلحہ نے انہیں پیغام نکاح دیا انہوں نے فرمایا کہ نکاح تو ہو سکتا ہے لیکن میں مسلمہ ہوں تم کافر! اسلئے پہلے اسلام قبول کرو، انہوں نے اسلام قبول فرمایا، نکاح ہو گیا، یہاں بھی یہ سوال ہے کہ جب اسلام نکاح کے لئے قبول کیا گیا ہے تو معتبر کیوں ہے؟ بات یہ ہے کہ حضرت ابو طلحہ اسلام لانے ہی والے تھے کہ اسی اثناء میں یہ صورت پیش آگئی کہ پیغام نکاح بھیجا اور انہوں نے اسلام پیش فرما دیا تو یہاں اسلام، اسلام ہی کی خاطر ہوا ہے نکاح کی خاطر نہیں ہوا، رہا مہاجر قیس کا معاملہ تو وہاں ہجرت ہی نکاح کے لئے کی گئی ہے لیکن چونکہ ہجرت کی صحت نیت کی صحت پر موقوف نہ تھی اسلئے ان کا یہ عمل صحیح رہا، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ مراتب قرب جو انہیں ہجرت کی وجہ سے حاصل ہوتے وہ نہ ہوں گے۔

علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کا جواب

اس سلسلہ میں ایک جواب علامہ کشمیری نے بھی ارشاد فرمایا ہے فرماتے ہیں "من كانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ فہجرتہ الی اللہ ورسولہ"

کا مداراں پر ہے کہ قیامت کے دن اعمال کی جو جزائیں دی جائیں گی آیا وہ ان اعمال سے متغیر ہوں گی، یا بعینہ وہی اعمال جزاء میں دئے جائیں گے۔ حضرت علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کی اپنی تحقیق یہ ہے کہ اس عالم میں وہی عمل دیا جائیگا جو اس نے کیا ہوگا، البتہ ان کی شکل عالم آخرت کے مناسب بدلی ہوئی ہوگی اور یہ کوئی اچھے کی بات نہیں، ہر عمل بلکہ ہر شخص کی ایک شکل اس عالم ناسوتی میں ہے اور دوسری شکل عالم مثال میں ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اس عالم میں ایک شخص نہایت خوب رو حسین و جمیل ہوتا ہے مگر عالم مثال میں اسکی نہایت بھونڈی شکل دیکھی جاتی ہے بلکہ بلحاظ اپنے کردار کے وہاں وہ انسان نہیں رہتا، گدھا، کتا، سور مرنی ہوتا ہے، سنا گیا ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب "جمعہ ادا کرنے کے لئے جامع مسجد دہلی تشریف لاتے تو چہرہ پر نقاب پڑی رہتی تھی، ایک مرتبہ ایک متوسل نے باصرار سبب دریافت کیا تو آپ نے وہ

نقاب اسکے چہرہ پر ڈال دی حیران رہ گیا، کیونکہ بھری مسجد میں اسکو سوائے معدودے چند اصحاب کے سب ہی حیوانی شکل میں نظر آئے، میں کہتا ہوں اس ناسوتی عالم میں بھی اشکال کی تبدیلی مشاہد ہے، یوپی کارہنے والا کشمیر یا صوبہ سرحد یا کابل میں کچھ عرصہ اقامت پذیر ہو کر اپنے وطن مالوف میں مراجعت کرے تو دیکھنے والے اسکی توانائی، چہرہ کی سرخی، رنگت کا نکھار اور جسامت کے لحاظ سے اس کو ایک نیا انسان سمجھتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو اس کو پہچانتے بھی نہیں، پھر عالم آخرت کا معاملہ تو سب سے زالا ہے، قرآن عزیز میں **وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا** کا عنوان اس دعویٰ کی روشن دلیل ہے یعنی انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ موجود پائیں گے، عملوا کو حاضر پائیں گے یعنی جو کیا تھا بعینہ وہی سامنے آئے گا، دوسرے لوگ اگرچہ اس میں طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں لیکن علامہ کشمیری انہیں اختیار نہیں فرماتے، ایک روایت میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب مردے اٹھیں گے تو ایک مردہ اٹھ کر دیکھے گا کہ قبر پر حسین و جمیل خوش پوشاک اور عطر بیز عورت کھڑی ہے، روایت میں ہے کہ نہ کبھی ایسا لباس دیکھا ہوگا اور نہ کبھی ایسی صورت کا تصور ہی کیا ہوگا وہ شخص دیکھ کر ٹھٹک جائے گا، وہ آگے بڑھ کر کہے گی کہ آپ حیران نہ ہوں میں آپ کی نماز ہوں، آپ میرے اوپر سوار ہو کر چلین کیونکہ دنیا میں، میں آپ پر سوار رہا کرتی تھی آپ نے خداوند قدوس کے احکام کو پوری طرح ادا فرمایا، آج خداوند قدوس نے مجھے آپ کی سواری کے لئے بھیجا ہے، ایک دوسرا شخص قبر سے اٹھے گا تو دیکھے گا کہ نہایت بد صورت بد وضع، بد بودار کپڑے پہنے ہوئے ایک ہیتناک شکل کی عورت کھڑی ہے، یہ شخص دیکھ کر بھاگنا چاہے گا، وہ کہے گی جاتا کہاں ہے؟ میں تیری سواری کروں گی، کل تو میرے اوپر سوار تھا میری بے حرمتی کرتا تھا، آج مجھے خداوند قدوس نے تیری سواری کا موقع دیا ہے اسی مناسبت سے مجھے حضرت گنگوہیؒ کا واقعہ یاد آیا کہ ایک شخص نے جو بڑے ذاکر و شاعر اور خشوع و خضوع سے نماز ادا کرنے کے عادی تھے، حضرت سے پوچھا کہ میں نے رات خواب میں ایک خوبصورت خوش پوشاک عورت دیکھی لیکن وہ اندھی تھی، حضرت نے برجستہ فرمایا کہ نماز آنکھیں بند کر کے پڑھتے ہو گے، آنکھیں کھول کر نماز ادا کیا کرو، کمال اسی میں ہے کہ آنکھیں کھلی بھی رہیں اور پوری کائنات سے بے تعلق بھی، غرض ان احادیث کی روشنی میں حضرت علامہ کشمیریؒ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ بعینہ وہی اعمال سامنے آئیں گے اور **فہجرتہ الی اللہ ورسولہ** اسی معنی کے پیش نظر ہے۔

دذنوں جملوں کا فرق | اس حدیث میں انما الاعمال بالنیات اور انما لامری ما نوی دو جملے ہیں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ دوسرا جملہ پہلے کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے بعض حضرات کی رائے ہے کہ انما الاعمال بالنیات میں عمل کا نیت سے تعلق بتلایا گیا ہے اور انما لامری ما نوی میں عامل کی حالت پر تنبیہ کی گئی ہے کہ عامل کو وہی چیز دی جائے گی جو اس کے ارادہ میں ہوگی بعض حضرات کی رائے ہے کہ

اعلامہ قرطبی کی رائے ہے اور اس کے بعد بعض حضرات سے قرطبی کے علاوہ دیگر علماء مراد ہیں، فتح الباری جلد اول۔ ۲ یہ ابن دقیق العید کا خیال ہے۔ فتح الباری جلد اول: ۱۱

انصافاً مری مانوی میں اس طرف اشارہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ہی نیت کا ثواب ملے گا دوسرے کی نیت کام نہ دے گی بعض حضرات کی رائے میں انصافاً مری مانوی کا مقصد یہ ہے کہ ایک کام میں جس قدر نیتیں ہوں گی اسی قدر ثواب ملے گا اگر ایک عمل میں دس نیت خیر شامل ہو جائیں گی تو دس نیتوں کا ثواب الگ الگ ملے گا مثلاً نماز کے لئے مسجد میں جانے سے مختلف نیتیں متعلق ہو سکتی ہیں نماز پڑھنا، اہل محلہ کے احوال دریافت کرنا، کسی مریض کی عیادت کرنا، کسی ضرورت مند کے لئے انتظام کرنا، نماز کے بعد ترجمہ سننا، فرشتوں کی دعائیں حاصل کرنا، وغیرہ وغیرہ، تو ایک ہی عمل کے ساتھ مختلف خیر کی نیتیں متعلق ہو سکتی ہیں اس معنی کے اعتبار سے انصافاً اعمال بالنیات علت فاعلی اور انصافاً مری مانوی علت غائی کے درجہ میں ہے۔

علامہ سندھی کا ارشاد | علامہ سندھی کی بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انصافاً اعمال بالنیات ایک جملہ تجربیہ ہے جس کو بطور اصول مسلمہ پیش کر رہے ہیں جس طرح ہمارے یہاں اردو میں کسی انسان کی بری حالت دیکھ کر کہتے ہیں کہ اسکے کئے کا پھل ہے یا کسی کی اولاد کو عالم و فاضل ہوتا دیکھ کر کہتے ہیں کہ باپ کی نیت کا اثر ہے، اسی طرح یہ جملہ بھی یہاں اصول مسلمہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے، حضرت علامہ کشمیری نے اس کی تائید کے لئے لکل شیء زینة وزینة القرآن الرحمن اور لکل امة امین و امین هذه الامة ابو عبیدة بن الجراح پیش فرمایا تھا کہ ان دونوں جگہوں پر پہلا جملہ اصول مسلمہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے اسی طرح انصافاً اعمال بالنیات ایک مسلم اصول ہے اور انصافاً مری مانوی اس کا نتیجہ ہے یعنی اعمال کا خیر و شر ہونا اور ان پر ثواب و عقاب کا ترتیب، اسی طرح ایک ہی عمل کا کبھی خیر ہونا اور کبھی شر بن جانا، یا ایک ہی عمل کا بلحاظ ثمرات و نتائج متعدد اعمال قرار پانا یہ سب کچھ نیت کے تابع ہے اور اسمیں عامل کے قصد کا بڑا دخل ہے چنانچہ عمل ہجرت میں جو کہ ابتداء اسلام میں فرض تھا دو مختلف رنگ اسی نیت کی بدولت پیدا ہو گئے پس اسی پر اعمال مباحہ کو قیاس کر لیجئے۔ واللہ اعلم

(۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ

عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّ الْحَارِثَ بْنَ هِشَامٍ سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ فَقَالَ

يَا رَسُولَ اللَّهِ كَيْفَ يَأْتِيكَ الْوَحْيُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَحْيَانًا يَأْتِينِي مِثْلَ صَلْصَلَةِ

الْجَرَسِ وَهُوَ أَشَدُّ عَلَيَّ فَيَفْصِمُ عَنِّي وَقَدْ وَعَيْتُ عَنْهُ مَا قَالَ وَأَحْيَانًا يَتَمَثَّلُ لِي الْمَلَكُ

رَجُلًا فَيَكَلِّمُنِي فَأَعْيَى مَا يَقُولُ قَالَتْ عَائِشَةُ وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الْوَحْيُ فِي الْيَوْمِ

الشَّدِيدِ الْبَرْدِ فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفْصَدُ عَرَقًا.

(آئندہ: ۳۲۱۵)

ترجمہ | عبداللہ بن یوسف نے ہم سے بیان کیا کہ امام مالک نے ہشام بن عروہ سے یہ روایت بیان کی کہ انہوں نے عروہ سے بطریق ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بیان کیا کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا، فرمایا یا رسول اللہ! آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کبھی تو میرے پاس گھنٹی کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ انداز وحی میرے اوپر سب سے زیادہ شاق گزرتا ہے اور جب یہ کیفیت ختم ہوتی ہے تو میں اسے محفوظ کر چکا ہوتا ہوں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ فرشتہ انسان کی شکل میں مجھ سے گفتگو کرتا ہے تو میں اسے کلمات محفوظ کر لیتا ہوں، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ میں نے آپ کو سخت سردی کے دن اس حال میں دیکھا کہ آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور جب یہ کیفیت ختم ہوتی تھی تو آپ کی پیشانی مبارک سے پسینہ اس طرح جاری ہوتا تھا کہ جیسے فصد لگائی گئی ہو۔

تشریح | ان حضور ﷺ سے یہ سوال کیا گیا تھا کہ آپ کے پاس وحی کس طرح آتی ہے، اور اس کی کیا کیفیت ہے؟ آپ نے جواب میں دو صورتیں ارشاد فرمائیں کہ کبھی گھنٹی کی آواز کی طرح وحی آتی ہے اور کبھی فرشتہ انسان کی صورت میں آجاتا ہے اور پہلی صورت میں بڑی مشقت پیش آتی ہے لیکن اس کے باوجود ادھر سلسلہ ختم ہوا اور ادھر پورے مضامین والفاظ محفوظ ہو گئے، دوسری صورت میں وہ کلام کرتا رہتا ہے اور میں یاد کرتا رہتا ہوں لیکن کہا جاتا ہے کہ وحی کے اور بھی طریقے ہیں، الہام و منام کی صورت میں بھی وحی آتی ہے، بعض روایات میں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بھی آیا ہے، پھر انسان کی صورت میں کبھی تو حضرت دجیہ کلبی کی صورت میں آنے کا ذکر ہے اور کبھی دوسرے انسان کی، نیز کبھی فرشتہ اپنی اصلی صورت میں بھی ظاہر ہوا ہے، اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں ان متعدد طریقوں میں صرف دو ہی صورتوں پر کیوں اکتفاء فرمایا؟ یا تو یوں کہا جائے کہ مذکورہ دو صورتوں کے علاوہ باقی صورتیں خاص خاص احوال سے متعلق ہیں اور سوال عمومی احوال سے کیا گیا ہے اور یا یہ کہا جائے کہ یہ سب صورتیں انہی دو صورتوں کے تحت آگئی ہیں، اس لئے کہ ان دو صورتوں میں ہر صورت یقظہ و منام دونوں کو عام ہے اور صلصلة الجرس میں تقسیم رکھیں تو الہام کی صورت بھی آسکتی ہے کہ ایک طرف تو آواز آرہی ہے اور دوسری طرف الہام کے ذریعہ معانی مفہوم ہو رہے ہیں، نیز فرشتے کی تمثیل کو بھی اگر عام رکھا جائے تو اس میں بھی سب صورتیں داخل ہیں خواہ وہ حضرت دجیہ کلبی کی صورت میں ہو یا کسی اور کی، رہا فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا تو اول تو یہ صورت بہت ہی کم پیش آئی ہے صرف دو مرتبہ حضرت جبرئیل کو اصلی صورت میں دیکھا ہے اور واقعہ معراج کو بھی شامل کر لیں تو تین مرتبہ لیکن معراج کا واقعہ تو عالم بالا سے متعلق ہے اور یہاں اس عالم میں آنے والی وحی کی کیفیت سے سوال ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام کو آپ نے زمین اور آسمان کے درمیان کرسی بچھائے دیکھا اس وقت حضرت جبرئیل مشرق سے مغرب تک تمام فضا کو گھیرے ہوئے تھے، آپ پر ہیبت طاری ہو گئی اور آپ زَمَلُونِي زَمَلُونِي فرماتے ہوئے گر گئے، اس واقعہ میں وحی کا ذکر نہیں

ہے اسی طرح آپ نے فرمائش کی تھی اور حضرت جبرئیل پہاڑی پر تشریف لائے تھے اس میں بھی وحی کا تذکرہ نہیں آتا اور یہاں ان صورتوں کا ذکر ہے جن میں آنحضور علیہ السلام پر اس عالم میں رہتے ہوئے وحی آئی۔

ایک نحوی اشکال | **یتمثل لی الملك رجلا** یہ جملہ بخاری شریف کے ان مقامات میں ہے جو ترکیب نحوی کے اعتبار سے مشکل شمار کئے گئے ہیں، ترجمہ یہ ہے کہ فرشتہ انسان کی صورت میں آتا ہے بعض حضرات کے نزدیک رجلاً تمیز ہے اور بعض نے اس کو حال قرار دیا ہے، لیکن یہ دونوں صورتیں محل نظر ہیں، تمیز کہنے کی صورت میں تو یہ اشکال ہے کہ تمیز کو رفع ابہام کے لئے لایا جاتا ہے جیسے عندی رطل میں یہ ابہام باقی ہے کہ وہ رطل کیا ہے اس کے رفع کے لئے زیت بڑھا کر عندی رطل زیتا کہا گیا، اور یہاں کوئی ایسا ابہام نہیں جسے رجلاً کے ذریعہ رفع کیا گیا ہو، نہ ملک میں ابہام ہے نہ تمثیل میں اور نہ یہ ہی کہنا صحیح ہے کہ تمثیل کی اس نسبت میں ابہام ہے جو ملک کی طرف کی گئی ہے کیونکہ ”فرشتہ شکل میں آتا ہے“ کے الفاظ میں کوئی ابہام نہیں ہے اسی طرح حال کہنا بھی درست نہیں ہے کیونکہ حال ذوالحال کے لئے بمنزلہ خبر کے ہوتا ہے اس لئے زیر بحث عبارت میں تقدیر الملك رجل ہوگی حالانکہ یہ حمل صحیح نہیں ہے کیونکہ ملک رجل نہیں ہے، دوسرا اشکال یہ ہے کہ حال صرف تغیر بتلانے کے لئے آتا ہے اس لئے ایسی چیزیں ہی حال ہو سکتی ہیں جو خود بھی متغیر ہوں اور یہاں رجل کی رجولیت متغیر نہیں ہے پھر حال فاعل یا مفعول کی ہیئت بتلاتا ہے اور یہاں رجلاً کسی کی ہیئت بھی نہیں بتلاتا اس لئے رجلاً نہ تمیز ہو سکتا ہے اور نہ حال، اسلئے اچھا یہ ہے کہ اسے منصوب بنزع خافض کہا جائے تقدیر یوں ہوگی یتمثل لی الملك صورة رجل جو مضاف تھا حذف کر دیا گیا اور مجرد مضاف الیہ کو محذوف مضاف کا اعراب دیدیا گیا، اب اسپر کوئی اشکال نہیں ہے۔

صلصلة الجرس | **صلصلة لفظ** اس آواز کو کہتے ہیں جو دو لوہوں کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے لیکن بعد میں ہر جھنکار کو **صلصلة** کہنے لگے، اور جرس وہ گھنگر ویا ٹال ہے جس کو علامت کے لئے جانور کے گلے میں ڈال دیتے ہیں، تاکہ چلتے وقت حرکت سے آواز پیدا ہوتی رہے، اسی وجہ سے غزوات میں جانور کے گلے میں ٹال یا گھنٹی ڈالنا ممنوع ہے کہ اس سے دشمن متنبہ ہو جاتا ہے اور اس کو جرس شیطان قرار دیا ہے، ابوداؤد میں مزمار الشیطان کے الفاظ ذکر کئے گئے ہیں اور ابن حبان نے اس روایت کی تصحیح کی ہے، اسی طرح مسلم میں لا تصحب الملائكة رفقة فیہا جرس (ملائکہ ان مسافروں کے ساتھ نہیں رہتے جن کے پاس گھنٹی ہوتی ہے) کے الفاظ ہیں، علامہ ابن حجر علیہ الرحمہ نے اس سلسلہ میں یہ فرمایا کہ گھنٹی کی دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت آواز کی قوت کی ہے اور دوسری تلذذ کی، جہاں اس سے احادیث میں نہیں وارد ہوئی ہے وہاں تلذذ مراد ہے اور جہاں یہ تشبیہ دی گئی ہے وہاں قوت مراد ہے لیکن اس کی ضرورت نہیں بلکہ مزمار الشیطان وغیرہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ شیخون مارنے کے لئے خفیہ طریقہ پر سفر ضروری ہے اور اگر ایسے

مواقع پر جانوروں کے گلے میں گھنٹی ڈالنے کی بھی اجازت دیدیں تو یہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ صلصلة الحجر کیا چیز ہے؟ یہ خداوند قدوس کے کلام کی آواز بھی ہو سکتی ہے، فرشتہ کی آواز بھی ہو سکتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ فرشتہ کے بازو اور ہوا کے تصادم سے تعبیر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ عالم غیب کی کوئی چیز ہو جسے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو بیدار اور ہوشیار کرنے کیلئے وحی کی آمد سے قبل پیدا کیا جاتا ہو، جس طرح آپ کسی کو فون کرنا چاہیں تو پہلے مخصوص اور متعارف طریقہ پر اسے متوجہ کرتے ہیں اور گھنٹی بجاتے ہیں، ایک صورت یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود پیغمبر علیہ السلام کی حالت کا بیان ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ وحی ایک عالم غیب کی چیز ہے جو غیبوت یعنی وارفتگی کو چاہتی ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ جس حاسہ سے غیبی تعلق پیدا کرنا ہے اسے دنیا کی تمام چیزوں سے بالکل پاک کر لیا جائے چنانچہ یہاں ہوتا بھی ایسا ہی تھا کہ وحی چونکہ خداوند قدوس کی جانب سے پوری عظمت و جلال کے ساتھ آرہی ہے، جس میں انتہا درجہ کا وزن بھی ہے، اسلئے پیغمبر علیہ السلام کے سامعہ کو ایک خاص طرح کی جھنکار پیدا کر کے تمام دنیوی تعلقات سے الگ کر لیا جاتا تھا اور عالم وارفتگی میں جو چیز القاء کی جاتی تھی وہ کیفیت کے ختم کے بعد قلب اطہر میں محفوظ ہو جاتی تھی۔

علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کا ارشاد | اس سلسلہ میں علامہ کشمیری علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے کہ صلصلة، خداوند قدوس کی آواز سے عبارت ہے، فرماتے ہیں کہ باری تعالیٰ کی آواز احادیث کی روشنی میں تین جگہ معلوم ہوتی ہے، عرش اعظم پر جبکہ باری تعالیٰ اسکو صادر کرتے ہیں، دوسرے جبکہ فرشتہ وحی اسے لیتا ہے، اور تیسرے جبکہ فرشتہ آنحضرت ﷺ کے پاس آتا ہے، یعنی اس آواز کا مبدأ عرش اعظم ہے اور منتہا آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی، نیز یہ تصور بھی درست نہیں کہ یہ آواز ان ہی تین جگہوں پر منحصر ہے، بلکہ یہ ایک سلسلہ کی حیثیت میں ہے جو یہاں سے وہاں تک ہے اور جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ فرشتوں کے پروں کی آواز ہے ان کا دائرہ علم صرف اسی حد تک محدود ہے، وہ اس سے آگے ادراک نہ کر سکے، حالانکہ طبرانی میں نو اس ابن سمعان کے طریق سے موجود ہے۔

اذا تكلم الله بالوحي اخذت السماء رجفة شديدة من خوف الله فاذا سمع اهل السماء بذلك صعقوا وخرروا سجدا فيكون اولهم يرفع راسه جبرئيل فيكلمه الله من وحيه بما اراد فينتهي به على الملكة كلما مرّ بسماءٍ سألها اهلها ماذا قال ربنا؟ قال الحق فينتهي به حيث امر

جب باری تعالیٰ وحی کا تکلم فرماتے ہیں تو باری تعالیٰ کے خوف سے آسمان میں شدید زلزلہ آجاتا ہے چنانچہ جب آسمان والے اسے سنتے ہیں تو بیہوش ہو جاتے ہیں اور سجدہ میں گر جاتے ہیں پھر سب سے پہلے جبرئیل سر اٹھاتے ہیں اور باری تعالیٰ اپنی وحی سے جو چاہتے ہیں انہیں عطا فرماتے ہیں وہ اسے ملائکہ تک پہنچاتے ہیں جب کسی آسمان سے

گزرتے ہیں تو آسمان والے پوچھتے ہیں کہ ہمارے معبود نے کیا فرمایا؟ جبرئیل فرماتے ہیں کہ حق فرمایا پھر اسے جبرئیل وہیں پہنچا دیتے ہیں جہاں حکم ہوتا ہے۔

حدیث شریف سے معلوم ہو رہا ہے کہ باری تعالیٰ تکلم فرماتے ہیں جسے ملائکہ بھی سنتے ہیں اور پھر جبرئیل علیہ السلام اسکو لیکر چلتے ہیں، اب یہ بحث باقی رہ جاتی ہے کہ آواز جسے جبرئیل لارہے ہیں بعینہ وہی آواز ہے جو بارگاہ رب العالمین سے صادر ہوئی تھی یا کوئی ایسی ہی صوت ہے جیسا کہ اس دور میں آواز ریکارڈ کر لی جاتی ہے تو حدیث اس بارے میں خاموش ہے اسلئے اس سے زیادہ بحث ضرورت سے زیادہ ہوگی، امام بخاری علیہ الرحمہ بھی صوت باری اور اس کے سماع کے قائل ہیں لیکن جس طرح باری تعالیٰ اور تمام اوصاف میں مخلوقات سے بری اور بالاتر ہے اسی طرح اس صوت میں بھی مخلوقات سے بالاتر ہے۔

کوئی چیز اس کی مثل نہیں، اور وہی ہر بات کا

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيعُ

سننے والا دیکھنے والا ہے

الْبَصِيرُ (پ ۳۷۲۵)

لیکن اسکی کیفیت کیا ہے اس سلسلہ میں بحث کرنا احادیث کے خاموش ہونے کی وجہ سے اپنے مجال تاب

دواں سے باہر ہے۔

ہو اشدہ علی فرمایا کہ یہ کیفیت صلصلہ میرے اوپر بہت زیادہ شاق گزرتی ہے، شارحین شدت وحی کی وجہ نے اسکا یہ مفہوم لیا ہے کہ صلصلہ کے الفاظ بنانے میں اور پھر ان کے معانی سمجھنے میں دقت ہوتی ہے، کیونکہ یہ تو ایک مسلسل آواز ہے جس میں تقطیعات نہیں؛ لیکن ایسا کہنا درست نہیں کیونکہ الفاظ بنانے اور سمجھانے کے لئے نہ تو بدن میں لرزے کی ضرورت ہے اور نہ ثقل کی نوبت آسکتی ہے اور نہ یہ بدن کے پسینہ پسینہ ہو جانے پر موقوف ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ الفاظ بنانے اور مفہوم اخذ کرنے کے لئے تو پیغمبر علیہ السلام کو کچھ بھی کرنا نہیں پڑتا بلکہ فصم یعنی ختم کے بعد وہ خود بہ خود محفوظ ہو جاتے ہیں، اصل یہ ہے کہ شدت اور خفت کا مدار وسائط کی قلت و کثرت پر ہے عالم غیب کی جو چیز بھی عالم شہود میں واسطہ درواسطہ ہو کر پہنچے گی تو اسمیں اس عالم کی مناسبت سے خفت ضرور آجائے گی، اس کے برعکس جہاں وسائط بالکل نہ ہوں یا ہوں مگر کم، اس میں تو شدت اور ثقل لابدی ہے، آفتاب کی حرارت بہت سے پردوں سے گزرنے کے بعد اس قابل ہوئی کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں، لیکن براہ راست آتشیں شیشہ کے ذریعہ اس کی حرارت سے ہر مقابل چیز جلانی جاسکتی ہے، یہ آگ جس سے ہم اور آپ پکانے کا کام لیتے ہیں جہنم کی آگ ہے جو ستر مرتبہ پانی سے دھو کر اس عالم میں لائی گئی ہے مگر کس قدر تیز ہے کہ ذرا استعمال میں غفلت ہوئی اور اسنے جلا کر بھسم کیا، یہ تو ایک ادنی مخلوق کا حال ہے تو صفات خداوندی کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، غرض عالم غیب کی تمام چیزیں ہم تک بالواسطہ پہنچی ہیں لیکن اس صلصلۃ الجرس کی صوت میں کوئی واسطہ نہیں ہے، تصور کیجئے کہ

خداوند کریم کی صوت بغیر کسی واسطہ کے اس عالم میں پہنچے تو اس کے اخذ میں کس قدر مشقت ہونی چاہئے اور اگر اس سلسلہ کو فرشتہ کی آواز مانا جائے تو مشقت کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کا بید، بیدہ بشری ہے اور جبرئیل کا بید، بیدہ ملکی، اور ظاہر ہے کہ متکلم کی قوت کلام میں بھی قوت پیدا کر دیتی ہے اس لئے جبرئیل علیہ السلام کے کلام میں بھی قوت ہونی چاہئے، ہاں اگر جبرئیل انسانی صورت اختیار کر کے وحی لاتے ہیں تو اسکی تلقین میں تو آسانی ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ اپنی اصلی صورت میں وحی لائیں اور پیغمبر علیہ السلام کو بیدہ بشری چھوڑ کر بیدہ ملکی اختیار کرنا پڑے اور روح کو اوپر کی جانب تسخیر کی نوبت آئے تو اس صعود و تسخیر میں وقت ناگزیر ہے پھر جو کلام آپ پر نازل کیا جا رہا ہے اسکے بارے میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (پ ۲۹ ع ۱۳)

ہم تم پر ایک بھاری کلام ڈالنے کو ہیں

دور جانے کی ضرورت نہیں فہم سے قریب کرنے کے لئے ان عامل حضرات کو دیکھئے جو جنات کی حضرات کے اعمال کرتے ہیں، جب انہیں جن حاضر کرنا مقصود ہوتا ہے تو وہ خلوت میں بیٹھ جاتے ہیں اور عمل شروع کر دیتے ہیں، اب ان کی حالت غیر ہونا شروع ہو جاتی ہے حتیٰ کہ زبان قابو میں رہتی ہے نہ بدن، اور جب جن حاضر ہو جاتا ہے تو وہ بالکل مبہوت ہو جاتے ہیں، آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں اور بدن سے پھیپھڑوں کی رو جاری ہو جاتی ہے پھر جب جن واپس ہوتا ہے تو کافی دیر کے بعد ان کی حالت درست ہوتی ہے، جب دنیوی امور میں یہ امر مشاہد ہے اور انسان کی برداشت سے باہر بھی ہے تو پھر اس ملک علام کے کلام میں کس قدر وزن ہونا چاہئے، ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ کلام کی عظمت ہی نگاہوں سے پوشیدہ ہے، ورنہ قرآن کریم کی تلاوت ہی دشوار ہو جائے، کلام خداوندی کا وزن خدا معلوم، کلام رسول اکرم ﷺ کے وزن کے متعلق مجھے حضرت مولانا فضل رحمان صاحب گنج مراد آبادی علیہ الرحمۃ کا واقعہ یاد آتا ہے، حضرت اپنے وقت کے اونچے اور ممتاز اولیاء میں تھے ایک مرتبہ پنجاب کے ایک اہل حدیث جو اپنے وقت کے زبر دست عالم اور بخاری شریف کے حافظ سمجھے جاتے تھے، حضرت کی خدمت میں حدیث کی اجازت حاصل کرنے کی غرض سے حاضر ہوئے، ان کے ساتھ کچھ تلامذہ تھے اور بغل میں بخاری شریف تھی، حضرت نے فرمایا پڑھئے، عالم صاحب نے بخاری کھولی اور بڑے زور سے بسم اللہ کے بعد پڑھنا شروع کیا باب کیف كان بدء الوحي الى رسول الله ﷺ وقول الله عز وجل انا اوحينا اليك كما اوحينا الى نوح والنبيين من بعده، یہاں پہنچ کر وہ خاموش ہو گئے، حضرت فرماتے ہیں کہ پڑھئے لیکن ان کی زبان نہیں کھلتی اور نہ کتاب کے حروف ہی نظر آتے ہیں، جب بہت دیر گزر گئی تو حضرت نے فرمایا: جائیے، جب آپ پڑھ بھی نہیں سکتے تو اجازت کس چیز کی دوں، اجازت حاصل کرنے کا یہ طریق چلا آ رہا ہے کہ اجازت خواہ جس چیز کی اجازت چاہتا ہے اس کا کچھ حصہ صاحب اجازت کے سامنے پڑھے، بالآخر وہ عالم اٹھ کر چلے گئے، تلامذہ کو بڑی حیرت تھی کہ آج حضرت الاستاذ عبارت بھی نہ پڑھ سکے دریافت کرنے پر جواب دیا کہ جب میں حدیث پر پہنچا تو زبان جواب دے چکی تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا، حضرت

مولانا سے حقیقت حال کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام کے وزن کی ایک جھلک دکھلا دی تھی جس کا یہ اثر ہوا کہ زبان و نگاہ نے جواب دے دیا، اسلئے باری تعالیٰ کا بڑا فضل و احسان ہے کہ ہماری نگاہوں سے وزن کو اوجھل کر رکھا ہے ورنہ ہم تلاوت پر قادر ہی نہ ہو سکتے، جب پیغمبر علیہ السلام کے کلام میں اس قدر وزن ہے کہ اسے ایک عالم ادا نہیں کر سکتا تو خدا کے کلام میں کس قدر وزن ہوگا، ارشاد ہے:

لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ
لَرَأَيْنَاهُ خَاشِعًا مُتَصَدِّعًا
مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (پ ۶۷۲۸)

اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل
کرتے تو تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے
خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا

دیکھئے ایک مرتبہ نزول وحی کے وقت رقبہ مبارک ایک صحابی کی فخذ پر پڑ گیا تو ان کو اپنے فخذ کی ہڈی ٹوٹنے کا اندیشہ لاحق ہو گیا، کوئی سواری وحی کا بار نہیں اٹھا سکتی تھی فوراً بیٹھ جاتی تھی سوائے ناقہ قصویٰ کے کہ وہ چلتے چلتے رکتا تھا گرتا نہ تھا، خوب ہے۔

لائق افسر نبود ہر سرے ہر سرے
بار مسیحا نکلشد ہر خرے

پیغمبر علیہ السلام باوجود یکہ آپ کی قوت جنت کے چالیس مردوں کے برابر ہے اور ترمذی میں ہے کہ جنت کے ہر مرد کو دنیا کے سو مردوں کی قوت ملی ہے لیکن اس کے باوجود بھی آپ بمشکل برداشت کر پاتے تھے، حضرت عائشہؓ اپنا مشاہدہ نقل فرماتی ہیں کہ سخت سردی کے موسم میں آپ پسینہ پسینہ ہو جاتے، ایک صحابی کے اشتیاق پر حضرت عمر نے نزول وحی کے وقت روئے مبارک سے نقاب ہٹا کر دکھلایا تو رنگ سرخ تھا پیشانی سے پسینہ کی رو جاری تھی اور از خود رنگی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو معاملہ کی خبر تک نہ ہوئی۔

تمثل ملک | شارحین نے یہ سوالات پیدا کئے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام جو مشرق سے مغرب تک فضا کو گھیرے ہوئے تھے اور جن کے چھ سو بازو تھے وہ کس طرح دجیہ کلبی یا کسی اور بشر کی شکل میں آسکتے ہیں، اسلئے حضرت جبرئیلؑ تو اپنی جگہ رہتے ہیں اور روح جبرئیلؑ یہاں آتی ہے پھر دوسرا سوال یہ کہ روح کے آجانے کے بعد قالب جبرئیلؑ زندہ رہتا ہے یا مردہ ہو جاتا ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں، کہ جبرئیلؑ اپنی جگہ سے نہیں ہٹتے بلکہ یہ کوئی شیء حرکت کرتی ہیں، بعض شارحین نے کہا کہ جبرئیلؑ کے زوائد فنا کر دئے جاتے ہیں، بعض کہتے ہیں کہ الگ کر دیئے جاتے ہیں، لیکن یہ سب باتیں لغو اور مہمل ہیں جب خداوند قدوس نے فرشتوں کو یہ قوت دی ہے کہ وہ چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں، اور مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں، تو حضرت جبرئیلؑ امین کے متعلق کیا استحالہ ہے، فرشتہ تو کہتے ہی ایسی مخلوق کو ہیں جو نور سے پیدا کی گئی ہے اور مختلف صورتوں میں ظاہر ہو سکتی ہے، جبرئیلؑ کو اگر خداوند قدوس حکم فرمائیں تو وہ بشری قالب میں آسکتے ہیں، وہی جبرئیلؑ آسمان پر تھے، وہی جبرئیلؑ فضاء کو محیط تھے، وہی جبرئیلؑ دجیہ کلبی کی شکل میں آئے تھے،

وہی جبرئیل انسانی شکلوں میں ظاہر ہوتے تھے اس میں نہ کچھ استحالہ ہے اور نہ کسی قسم کا اشکال اس پر وارد ہوتا ہے۔

ترجمہ سے حدیث کا ربط | ترجمہ کے دورخ تھے، ایک ظاہری اور ایک حقیقی، ظاہری تو یہ کہ وحی کی ابتداء کیسے ہوئی چنانچہ اس حدیث میں نزول وحی کا عام طریقہ بتلادیا گیا کہ صلصلة الجرس کی طرح یا فرشتہ کی وساطت سے وحی آتی ہے، فرشتہ کے آنے کی دو صورتیں ہیں بصورت بشر آئے یا بصورت ملک! بہر کیف جب ایک عمومی طریق معلوم ہو گیا تو اس سے ابتداء وحی کے بارے میں ایک روشنی حاصل ہو گئی کہ وہ بھی اس طرح نازل کی گئی ہوگی، دوسرا حقیقی مقصد تھا عظمت وحی کا بیان، اس اعتبار سے یہ روایت بالکل واضح ہے کہ جب پیغمبر علیہ السلام کا بدن وحی کے وقت نچڑجاتا تھا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ وحی کے وقت کسب و تربد و جھہ آپ بے چین ہو جاتے اور چہرہ متغیر ہو جاتا پھر یہ کیفیت ایک دو بار نہیں پیش آئی بلکہ جب بھی وحی آتی ہے یہی کیفیت ہو جاتی ہے ایسا نہیں کہ دو چار مرتبہ وحی آنے سے آپ عادی ہو گئے ہوں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی ایک با عظمت چیز ہے، خود ساختہ نہیں، اگر یہ خود ساختہ ہوتی تو ایک انسان دن میں دس دس بار اسے برداشت نہ کرتا، یہاں تو آنحضرت ﷺ کی تہائی سے زیادہ عمر اسی کیفیت کو برداشت کرتے گزری، اور جب بھی وحی آئی یہی کیفیت طاری ہوئی، حضرت آدم علیہ السلام پر عمر بھر میں وحی دس بار آئی، حضرت نوح علیہ السلام پر پچاس بار وحی آئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام پر صرف اڑتالیس بار وحی آئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر صرف دس بار وحی آئی اور آنحضرت ﷺ پر چوبیس ہزار مرتبہ وحی آئی، اس لئے آنحضرت ﷺ نے چوبیس ہزار مرتبہ یہ مشقت برداشت فرمائی، اس سے جہاں عظمت وحی کا پتہ چلتا ہے وہیں اس سے آپ کی صداقت و عصمت بھی معلوم ہوتی ہے۔

(۳) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ أَخْبَرَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنْ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ أُمِّ الْمُؤْمِنِينَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا أَنَّهَا قَالَتْ أَوَّلُ مَا بُدِيَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مِنَ الْوَحْيِ الرَّؤْيَا الصَّالِحَةُ فِي النَّوْمِ فَكَانَ لَا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ ثُمَّ حُبِّبَ إِلَيْهِ الْخَلَاءَ وَكَانَ يَخْلُو بِغَارِ جِرَاءَ فَيَتَحَنَّنُ فِيهِ وَهُوَ التَّعَبُّدُ اللَّيَالِي ذَوَاتِ الْعَدَدِ قَبْلَ أَنْ يَنْزِعَ إِلَى أَهْلِهِ وَيَتَزَوَّدَ لِذَلِكَ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى خَدِيجَةَ فَيَتَزَوَّدُ لِمِثْلِهَا حَتَّى جَاءَهُ الْحَقُّ وَهُوَ فِي غَارِ جِرَاءَ فَجَاءَهُ الْمَلَكُ فَقَالَ اقْرَأْ فَقَالَ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي قَالَ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي قَالَ فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّانِيَةَ حَتَّى بَلَغَ مِنِّي الْجُهْدَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ اقْرَأْ فَقُلْتُ مَا أَنَا بِقَارِي فَأَخَذَنِي فَغَطَّنِي الثَّلَاثَةَ ثُمَّ أَرْسَلَنِي فَقَالَ "اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ" فَرَجَعَ بِهَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَرْجِفُ فَوَادَهُ فَدَخَلَ عَلَيَّ خَدِيجَةَ

بِنْتُ خُوَيْلِدٍ فَقَالَ زَمَلُونِي زَمَلُونِي فَرَمَلُونِي حَتَّى ذَهَبَ عَنْهُ الرَّوْعُ فَقَالَ لِخَدِيجَةَ
وَأَخْبَرَهَا الْخَبَرَ لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي فَقَالَتْ خَدِيجَةُ كَلَّا وَاللَّهِ مَا يُخْزِيكَ اللَّهُ أَبَدًا
إِنَّكَ لَتَصِلُ الرَّحِمَ وَتَحْمِلُ الْكَلَّ وَتَكْسِبُ الْمَعْدُومَ وَتَقْرِي الضَّيْفَ وَتُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ
الْحَقِّ فَانْطَلَقَتْ بِهِ خَدِيجَةُ حَتَّى آتَتْ بِهِ وَرَقَةَ بْنَ نَوْفَلِ بْنِ أَسَدِ بْنِ عَبْدِ الْعُزَّى ابْنَ عَمِّ
خَدِيجَةَ وَكَانَ أَمْرًا تَنْصُرَ فِي الْجَاهِلِيَّةِ وَكَانَ يَكْتُبُ الْكِتَابَ الْعِبْرَانِيَّ فَيَكْتُبُ مِنَ
الْإِنْجِيلِ بِالْعِبْرَانِيَّةِ مَا شَاءَ اللَّهُ أَنْ يَكْتُبَ وَكَانَ شَيْخًا كَبِيرًا قَدْ عَمِيَ فَقَالَتْ لَهُ خَدِيجَةُ يَا
ابْنَ عَمِّ اسْمِعْ مِنْ ابْنِ أَخِيكَ فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ يَا ابْنَ أَخِي مَاذَا تَرَى فَأَخْبَرَهُ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ خَبَرَ مَا رَأَى فَقَالَ لَهُ وَرَقَةُ هَذَا النَّامُوسُ الَّذِي نَزَلَ اللَّهُ عَلَى مُوسَى يَا لَيْتَنِي فِيهَا
جَزَعًا يَا لَيْتَنِي أَكُونُ حَيًّا إِذْ يُخْرِجُكَ قَوْمُكَ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَوْ مُخْرِجِي هُمْ قَالَ
نَعَمْ لَمْ يَأْتِ رَجُلٌ قَطُّ بِمِثْلِ مَا جِئْتَ بِهِ إِلَّا عُودِي وَإِنْ يُدْرِكُنِي يَوْمَكَ أَنْصُرَكَ نَصْرًا
مُؤَزَّرًا لَمْ يَنْشَبْ وَرَقَةُ أَنْ تُوفِّي وَفَتَرَ الْوَحْيُ

(آئندہ: ۳۳۹۲، ۳۹۵۳، ۳۹۵۵، ۳۹۵۶، ۳۹۵۷، ۳۹۵۸، ۳۹۵۹)

(۴) قَالَ ابْنُ شِهَابٍ وَأَخْبَرَنِي أَبُو سَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ أَنَّ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللَّهِ
الْأَنْصَارِيَّ قَالَ وَهُوَ يُحَدِّثُ عَنْ فِتْرَةِ الْوَحْيِ فَقَالَ فِي حَدِيثِهِ بَيْنَا أَنَا أَمْشِي إِذْ سَمِعْتُ
صَوْتًا مِنَ السَّمَاءِ فَرَفَعْتُ بَصْرِي فَإِذَا الْمَلِكُ الَّذِي جَاءَ نَبِيَّ بِحِرَاءَ جَالِسٌ عَلَى كُرْسِيِّ
بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَرُعِبْتُ مِنْهُ فَرَجَعْتُ فَقُلْتُ زَمَلُونِي زَمَلُونِي فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى يَا
أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ فَحَمِيَ الْوَحْيُ وَتَتَابَعَ
تَابَعَهُ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ وَأَبُو صَالِحٍ وَتَابَعَهُ هِلَالُ بْنُ رَدَادٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ وَقَالَ يُوسُفُ
وَمَعْمَرٌ بَوَادِرُهُ. (آئندہ: ۳۲۳۸، ۳۹۲۲، ۳۹۲۳، ۳۹۲۴، ۳۹۲۵، ۳۹۲۶، ۳۹۲۷، ۳۹۲۸، ۳۹۲۹، ۳۹۳۰)

ترجمہ | ہم سے سگی بن بکیر نے حدیث بیان کی کہ ہم سے لیث نے عقیل سے اور انہوں نے ابن شہاب زہری سے
بروایت عروہ بن زبیر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ روایت نقل کی کہ انہوں نے یہ فرمایا کہ پہلی وہ
چیز جس سے آنحضور ﷺ پر وحی کی ابتداء ہوئی رویائے صالحہ تھے جنہیں آپ خواب میں دیکھتے تھے چنانچہ آپ جو
خواب بھی دیکھتے وہ سپید صبح کی طرح سامنے آتا، پھر خلوت گزینی آپ کے نزدیک محبوب کر دی گئی اور آپ عارحراء
میں خلوت گزینی فرماتے اور اپنے اہل کی طرف اشتیاق سے پہلے کئی کئی رات تک اس میں عبادت فرماتے تھے، اور اس

ایہی نقل کیا ہے کہ ”رویائے صالحہ“ کی مدت چھ ماہ تھی۔ ۱۳

کیلئے سامان خورد و نوش ساتھ لیجاتے پھر حضرت خدیجہ کے پاس واپس تشریف لاتے اور اتنی ہی راتوں کے لئے پھر سامان مہیا فرماتے یہاں تک کہ حق آ گیا جبکہ آپ غار حراء میں تھے چنانچہ فرشتہ پہنچا اور اس نے کہا اقرأ (پڑھئے) آپ نے فرمایا کہ میں نے فرشتہ سے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں اپنے فرمایا کہ فرشتہ نے مجھے پکڑا اور دبا یا یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہاء کو پہنچ گیا پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اقرأ (پڑھئے) میں نے کہا: میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، پھر اس نے مجھے پکڑا اور دوسری مرتبہ دبوچا یہاں تک کہ اس کا دبوچنا میری طاقت کی انتہاء کو پہنچ گیا پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا اقرأ پڑھئے میں نے اس سے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں پھر اس نے مجھے پکڑا اور تیسری مرتبہ دبوچا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہا اقرأ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ اپنے پروردگار کے نام سے پڑھئے جس نے انسان کو جنمے ہوئے خون سے پیدا کیا پڑھئے اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے، یہ آیات لیکر رسول اکرم ﷺ واپس ہوئے اور آپ کا دل کانپ رہا تھا چنانچہ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس تشریف لائے اور فرمایا مجھے کسبل اڑھا دو، مجھے کسبل اڑھا دو، لوگوں نے آپ کو کسبل اڑھا دیا یہاں تک کہ آپ کا خوف ختم ہو گیا، پھر آپ نے یہ کیفیت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامنے بیان فرمائی اور پورے واقعہ کی اطلاع دی اور فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ ہو گیا تھا، حضرت خدیجہ نے فرمایا ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا! خدا کی قسم خداوند قدوس کبھی آپ کو رسوا نہیں کریگا بلاشبہ آپ صلہ رحمی فرماتے ہیں، اور ناتوانوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، آپ گنہگاروں کو کماتے ہیں اور آپ مہمان نوازی کرتے ہیں، اور آپ لوگوں کی ان حوادث پر مدد کرتے ہیں جو حق ہوتے ہیں، پھر حضرت خدیجہ الکبریٰ آپ کو ساتھ لیکر چلیں اور ورقہ بن نوفل کے پاس پہنچیں جو انس بن عبد العزیٰ کے بیٹے اور خدیجہ الکبریٰ کے چچا زاد بھائی تھے اور یہ ورقہ ایسے آدمی تھے جو جاہلیت کے زمانہ میں دین نصرانیت اختیار کر چکے تھے اور عبرانی خط کے کاتب تھے اور وہ انجیل میں سے عبرانی زبان میں جو خداوند قدوس کو منظور تھا لکھا کرتے تھے، وہ بہت عمر رسیدہ آدمی تھے جن کی بصارت بھی جاتی رہی تھی، ان سے حضرت خدیجہ نے فرمایا اے میرے چچا کے بیٹے! اپنے بھتیجے کی بات سنو، چنانچہ ورقہ نے آپ سے کہا میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو، پھر رسول اکرم ﷺ نے ان کو وہ تمام واقعات سنا دیے جس کا مشاہدہ فرمایا تھا ورقہ نے کہا کہ یہ تو وہی رازداں ہیں جو خداوند قدوس کی جانب سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتے تھے، کاش کہ میں تمہاری پیغمبری کے زمانہ میں نوجوان و طاقتور ہوتا، کاش کہ میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔ رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ وہ (میری قوم کے) لوگ مجھ کو نکال دیں گے؟ ورقہ نے کہا ہاں! کبھی کوئی شخص اس قسم کی دعوت لیکر نہیں آیا جس طرح کی تم لائے ہو مگر یہ کہ لوگوں نے اس کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ کیا اور اگر

حق آ گیا، مراد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آگئی۔ ۱۲۔ اقسطانی جلد اول ۲۲ یعنی صاحب سر اور صاحب وحی حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں، یہاں ناموس سے مراد یہی ہیں اس لئے کہ اہل کتاب ان کو ناموس کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔

میں ان دنوں تک زندہ رہا تو آپ کی مضبوط مدد کروں گا پھر تھوڑے ہی زمانہ کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا اور وحی بھی موقوف ہو گئی، ابن شہاب نے کہا کہ مجھے ابو سلمہ بن عبد الرحمن نے خبر دی کہ حضرت جابر بن عبد اللہ الانصاری رضی اللہ عنہ وحی کے موقوف ہو جانے کے ایام کی حدیث بیان فرما رہے تھے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ حدیث بیان فرماتے سنا کہ میں ایک مرتبہ جا رہا تھا کہ اچانک میں نے آسمان سے ایک آواز سنی میں نے اپنی نگاہ اٹھا کر دیکھا تو اچانک وہی فرشتہ جو میرے پاس حراء میں آیا تھا آسمان وزمین کے درمیان کرسی بچھائے بیٹھا ہے، میں اس سے خوفزدہ ہو کر واپس ہوا اور میں نے کہا کہ مجھے کبل اڑھا دو، مجھے کبل اڑھا دو پھر باری تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ وَرَبُّكَ فَكْبَرٌ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ (اے کملی والے کھڑے ہو جائیے اور لوگوں کو خوف دلائیے اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے اور اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے اور بتوں سے علیحدہ رہئے جیسا کہ اب تک علیحدہ رہے ہو) اس کے بعد وحی پے در پے آنے لگی امام بخاری نے فرمایا کہ عبید اللہ بن یوسف اور ابوصالح نے یحییٰ بن بکیر کی متابعت کی ہے اور عقیل کی متابعت ہلال بن رداد نے زہری سے کی ہے اور یونس و معمر کی روایت میں یوحنا فوادہ کی جگہ یوحنا بوا درہ آیا ہے۔

حل لغات | رؤیا، جو چیز خواب میں نظر آئے اور اس پر بھی اطلاق ہو سکتا ہے جو بیداری میں نظر آئے جیسے وَمَا جَعَلْنَا الرُّؤْيَا الَّتِي آرَيْنِكَ فِي رُؤْيَاكَ مِثْلَ النُّوْمِ فِي النُّوْمِ کی قید لگا دی ہے الصالحة: عمدہ خواب جو آپ کی نبوت کے لئے تمہید و پیش خیمہ کا درجہ رکھتے تھے اور ایک روایت میں صالحة کی جگہ صادقة آیا ہے یعنی وہ خواب حقیقت اور واقعہ کے مطابق ہوتے تھے خواہ اس میں کسی شئی کو مشکل کر کے دکھلایا ہو یا اس میں فرشتوں کی رویت ہو یا حق جل مجدہ کی تجلی ہو، حراء: مکہ سے تین میل کے فاصلہ پر منیٰ کی جانب ایک پہاڑی ہے یہ لفظ مدود بھی ہے اور مقصور بھی، مذکر بھی ہے، مؤنث بھی، منصرف بھی ہے، غیر منصرف بھی، اگر الف مدودہ ہو تو اسے حراء غیر منصرف پڑھیں گے، دوسری صورت غیر منصرف پڑھنے کی یہ بھی ہے کہ اسے بقعة کے معنی میں لیکر مؤنث قرار دیں اور پھر علیست و تانیث کی بنا پر اسے غیر منصرف پڑھیں، اور اگر مکان کے معنی میں لیں تو منصرف رہے گا۔ فیت حنث فیہ: حنث کا ترجمہ زہری نے تعبد سے کیا ہے کیونکہ تعبد کا لفظ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نہیں فرمایا بلکہ زہری ہی نے پڑھا ہے یہ امام زہری نے حاصل معنی بیان کئے ہیں ورنہ حنث کا مادہ حنث ہے جس کے معنی نافرمانی یا قسم توڑنے کے ہیں پس حنث کے معنی ازالہ حنث کے ہیں، تعبد اس کے لوازمات میں سے ہے، یہ باب تفعّل سے ہے، اس کے دو خاصے ہیں دخول فی الشئی اور خروج عن الشئی لیکن پہلے معنی میں کثیر الاستعمال ہے اس لئے دخول فی التعبد کئے جائیں گے۔ ذوات العدد: گنتی کی راتوں میں یہ لفظ قلت و کثرت دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اظہار قلت کے لئے تو اس قسم کے الفاظ وہاں بولتے ہیں جہاں بار کم کرنا مقصود ہو جیسے دراهم معدودہ اور ایاماً

معدودات یعنی ایک سال میں ایک ماہ کے روزے کچھ زیادہ نہیں بلکہ گنتی کے چند دن ہیں اور کثرت کیلئے بایں معنی استعمال ہو سکتا ہے کہ گنتی کی ضرورت ہی وہاں پیش آتی ہے جہاں اعداد گنے بغیر قبضہ میں نہ آسکتے ہوں، یہاں بھی کثرت ہی کے معنی زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ بعض دوسری روایات میں خلوت گزینی کی مدت ایک ماہ ذکر کی گئی ہے، ینزع الی اہلہ: مسلم کی روایت میں یرجع کے الفاظ ہیں، نزع الی الاہل اسی وقت بولتے ہیں جب اشتیاق پیدا ہو جائے۔ ملک: یہ اصل میں مالک تھا اسکا مصدر الوکة ہے جو سفارت و پیغام رسانی کے معنی میں آتا ہے مالک کو بقاعدہ قلب ملاک بنایا گیا ہے پھر ہمزہ کی حرکت ماقبل کو دیکر تخفیف کی غرض سے حذف کر دیا گیا ملک ہو گیا اس کی جمع ملائکہ آتی ہے، جو دراصل ملاک کی جمع ہے جیسے شمال کی جمع شمائل آتی ہے۔ جہد: اگر فتح الجیم ہے تو معنی طاقت ہیں اور اگر بضم الجیم ہے تو معنی مشقت ہیں اور یہ دونوں لفظ فاعل بھی ہو سکتے ہیں اور مفعول بھی اسی طرح بلغ منی الجہد کی چار صورتیں ہو جائیں گی بلغ منی الجہد یا الجہد مبلغہ میری مشقت یا طاقت انتہاء کو پہنچ گئی یعنی اب میں اس سے زیادہ تحمل کی طاقت نہ رکھتا تھا اور بلغ منی الجہد یا الجہد ای بلغ الغط منی یہاں تک کہ دو چنا میری مشقت یا طاقت کی انتہاء کو پہنچ گیا اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جبرئیل مجھ سے مشقت یا طاقت کو پہنچ گئے لیکن اس معنی کے اعتبار سے اشکال یہ ہے کہ جبرئیل کی قوت ملکی ہے اور آنحضرت ﷺ کی بشری، نیز یہ کہ خلوت گزینی کے باعث آپ ﷺ کمزور ہو رہے ہیں اس لئے آپ کی طاقت جبرئیل علیہ السلام کی قوت کو کس طرح مغلوب کر سکتی ہے؟ شارحین نے جواب بھی دے دیا کہ جبرئیل بشری صورت میں تشریف لائے تھے اس لئے ایسا ہونا مستبعد نہیں ہے کہ جبرئیل کی قوت بھی اس وقت بشری ہو گئی ہو لیکن یہ محض تکلف ہی تکلف ہے اس لئے بے تکلف وہی پہلے معنی ہیں کہ وہ غط مجھ سے میری انتہاء کو پہنچ گیا یعنی میری قوت ختم ہو گئی۔ تحمل الكل: یہ کلال سے ہے تھکا ماندہ اور عاجز، تکسب المعدوم کسب متعدی بیک مفعول ہے یعنی دنیا دولت کماتی ہے اور آپ گناہ لوگوں کو کماتے ہیں اور اگر یہ متعدی بدو مفعول ہو تو یہ معنی ہوں گے تکسب المعدوم المال آپ فقیر و نادار لوگوں کو اموال عطا کرتے ہیں۔ ضیف: کل من انضاف الیک فهو ضیف جو بھی تمہارے یہاں آجائے وہ ضیف ہے نوائب: نائبة کی جمع ہے نوبت بہ نوبت آئیوالے حوادث، یہ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ کسی انسان نے دوسرے پر ظلم کیا اور دوسرے یہ کہ کوئی بلائے آسمانی نازل ہو گئی جیسے طوفان برق وغیرہ، آپ ایسے لوگوں کی مدد فرماتے ہیں۔ جدع: اس جانور کو کہتے ہیں جو ایک سال سے نکل کر دوسرے سال میں لگے، مراد یہ کہ کاش خداوند کریم مجھے قوت عطا فرمادے گو یہ ناممکن ہے او منخرجی ہم: کیا وہ لوگ مجھ کو نکالیں گے یہاں او منخرجی میں ہمزہ استفہام بھی ہے اور واو عاطفہ بھی، واو چاہتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی جملہ ہو جس پر اس کا عطف کیا جاسکے اور ہمزہ یہ چاہتا ہے کہ وہ جملہ میں سب سے پہلے آئے پھر واو معطوف کا جز ہے اور ظاہر بات ہے کہ معطوف کا کوئی جزء معطوف سے مقدم نہیں ہو سکتا اور نہ

درمیان میں کوئی اجنبی چیز لائی جاسکتی ہے جس سے معطوف کے بعض اجزا مقدم ہو جائیں اس لئے ایسی صورتوں میں مشہور اور سہل طریقہ یہ ہے کہ ہمزہ اور واؤ کے درمیان ایک مناسب مقام جملہ محذوف نکال لیا جائے تاکہ ہمزہ کی صدارت بھی باقی رہے اور واؤ کا تقاضا بھی پورا ہو جائے یہاں اسکی تقدیر امعادی ہم و مخرجی ہم ہو سکتی ہے۔

شرح حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ پر وحی سُننے کا آغاز اسی طرح ہوا کہ آپ کو سچے خواب دکھلائے جاتے تھے اور جو چیز آپ خواب میں دیکھتے وہ ٹھیک اسی طرح سامنے آجاتی تھی یعنی نبوت کے لئے پیغمبر علیہ السلام کی تربیت کی ابتداء سچے خوابوں کے ذریعہ کی گئی، یہ خواب اضغاث احوال نہ ہوتے تھے کہ جن کے متعلق مسانحن بتساویل الاضغاث بعالمین کہا جاسکے بلکہ یہ خواب نور کے تڑکے کی طرح صاف اور سچے ہوتے تھے، نور کے تڑکے سے تشبیہ دینے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ نور، ظلمتِ شب کے لئے اعلان رحیل ہوتا ہے اور رات کی وہ تاریکی جس نے عالم کو اپنے دامن سے ڈھانپ لیا تھا دور ہو جاتی ہے اسی طرح یہاں مختلف قسم کی ظلمتیں جو افقِ عالم پر چھا گئی تھیں آپ کی ذات پاک سے دور ہونے والی تھیں، نیز یہ کہ نور سحر دل کے لئے سرور کا باعث بھی ہوتا ہے اسی طرح یہ خواب بھی آپ کے لئے سامانِ سرور ہوتے تھے۔ یعنی وہ انوارِ نبوت جو آپ کو دئے جا چکے تھے جیسا کہ كُنْتُ نَبِيًّا وَاَدْمُ بَيْنَ الْمَاءِ وَالطِّينِ سے ظاہر ہے، وہ اب ظہور پذیر ہونے والے تھے گویا خواب کے ذریعہ آپ کو اپنی طرف کھنچا جا رہا ہے کیونکہ اگر کوئی اونچا مقام کسی تدریجی ارتقاء کے بغیر ہی عنایت کر دیا جائے تو اسکا نبھانا اور سنبھالنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے اور خواب کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں عالم مثال سے مناسبت رہتی ہے، اگرچہ مادہ نہیں ہوتا مگر اشیاء کی شکلیں موجود ہوتی ہیں اور اس صورت کے ساتھ ساتھ طول و عرض بھی بالکل آئینہ کی طرح کہ اس کے اندر نظر آنے والی صورتوں میں مادہ نہیں ہوتا لیکن طول و عرض ہوتا ہے، جب خواب کے ذریعہ عالم بالا سے مناسبت تمام ہو گئی تو خداوند قدوس نے تربیت کی دوسری شکل یہ فرمائی کہ آپ بیداری کے وقت بھی اہل و عیال اور متعلقین سے الگ ہو کر خلوت میں آگئے، اسلئے تعبیر یہ نہیں ہے کہ آپ نے ایسا اختیار فرمایا بلکہ جب اليه الخلاء کہ خلوت گزینی کو محبوب کر دیا گیا، فرمایا چنانچہ اس مقدس خلوت گزینی کے لئے آپ نے غار حراء کا انتخاب فرمایا جہاں آپ

انہی کا خواب وحی ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھ کر حضرت اسماعیل کو قربان کر دینا چاہا تھا کیونکہ اگر یہ خواب وحی کے حکم میں نہ ہوتا تو صرف خواب کی وجہ سے حضرت اسماعیل کو قربان کر دینا درست نہ ہوتا لیکن یہاں کی نوعیت اس سے ذرا مختلف ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تک اس عالم میں باقاعدہ نبی نہیں بنائے گئے تھے اور حضرت عائشہ روایئے صالحہ کو وحی قرار دے رہی ہیں اس لئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ روایئے صالحہ پیش خیمہ نبوت ہیں خود آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجزائے نبوت میں سے قرار دیا ہے پھر اس ذات پاک کے روایئے سے پیدا ہی نبوت کیلئے کیا گیا ہے کیوں نہ وحی کے نام سے موسوم کئے جائیں، نیز آں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کنت نبیا و آدم بین الماء والطین اسلئے آپ کے روایئے صالحہ کو نبوت سے پہلے بھی وحی کہا جاسکتا ہے ۱۱

کے جد امجد عبدالمطلب نے خلوت گزینی کی تھی اور جہاں اس سے قبل انبیاء کرام نے خلوت گزینی کی ہے، یہاں خلوت گزینی میں تین عبادتیں جمع ہو جاتی ہیں، اول تو خلوت گزینی ہی عبادت ہے پھر اس غار میں رکھ کر آپ جن مشاغل میں مصروف رہے وہ بھی عبادت ہی تھے تیسرے یہ کہ غار حراء کا ایک حصہ بیت اللہ کے طرف جھکا ہوا ہے جس پر بیٹھ کر نظر بیت اللہ پر پڑتی ہے اور روایت سے ثابت ہے کہ بیت اللہ کو دیکھنا بھی عبادت ہے اس لئے تین عبادتیں جمع ہو گئیں نیز یہ کہ اس جگہ کسی انسان کی رسائی نہیں ہے جس سے یہ بدگمانی کی جاسکے کہ آپ جس چیز کو پیش فرما رہے ہیں وہ اکتسابی ہے اور انہوں نے فلاں جگہ بیٹھ کر کسی سے حاصل فرمایا ہے، ہاں اگر تربیت اسی طرح کرائی جاتی کہ آپ کہیں باہر تشریف لے جاتے اور پھر واپس آ کر نبوت کا اعلان فرماتے تو اہل مکہ برجستہ یہ کہہ دیتے کہ کسی نے سکھا دیا ہے، اسی بدگمانی سے بچانے کے لئے آپ کو مکہ سے قریب ہی خلوت گزینی کرائی گئی ہے۔

آپ غار حراء میں کئی کئی دن خلوت فرماتے، مدت کا تعین دشوار ہے البتہ محمد ابن اسحاق نے ماہ رمضان کے متعلق خلوت گزینی کی روایت کی ہے اور سیر کی بعض روایات تو ایک ایک چلے کی مدت تک کا پتہ دیتی ہیں اور سیر میں کمزور روایات بھی لیتے ہیں البتہ محدثین احکام کے بارے میں بڑی تنگی کرتے ہیں، ہر ہر لفظ کے متعلق چھان بین کرتے ہیں لیکن سیر والے ایسا نہیں کرتے، اس لئے چالیس دن کی روایت بھی قابل قبول ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ تشریف لے جاتے اور جب زاختم ہو جاتا تو پھر تشریف لے آتے اور سامان مہیا فرما کر پھر تشریف لے جاتے، اس طرح سلسلہ رویا تو ربیع الاول سے رمضان تک قائم رہا اور سلسلہ خلوت رمضان میں، اس سے مشائخ نے چلہ کشی کا اصول مستنبط کیا ہے، مشائخ طریقت کے یہاں ترقی مدارج کے سلسلہ میں خلوت گزینی کا طریقہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، خلوت گاہ اتنی تنگ ہونی چاہئے کہ اس میں پیر نہ پھیل سکیں، نیز خلوت گاہ تاریک بھی ہو کہ روشنی سے خیالات منتشر ہو جاتے ہیں آپ کی خلوت کا بھی یہی طریق تھا کہ تنگ و تاریک جگہ تھی آپ سامان لیجاتے اور خلوت گزینی فرماتے اور جب سامان ختم ہو جاتا تو واپس تشریف لاتے اور سامان لیجاتے، کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ضروری سامان لیکر خود حضرت خدیجہؓ پہنچ گئیں، ایک بار حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اطلاع دی کہ خدیجہؓ آرہی ہیں ان کو رب العالمین کا سلام کہنا اور جنت میں موتیوں کے گھر کی بشارت سنا دینا۔

اعطائے نبوت | آپ ﷺ کی اس آمد و رفت اور خلوت کا سلسلہ جاری تھا کہ جس چیز کے متعلق پہلے سے ملاء اعلیٰ کے اشارے ہو رہے تھے، اب صراحت کے ساتھ سامنے آ گئی، پہلے کبھی درخت جھک جاتا تھا، کبھی پتھر سلام کرتا تھا اور اب بات کھل کر سامنے آ گئی کہ فرشتہ آ پہنچا اور فرشتے نے آتے ہی کہا اقرأ (پڑھئے) آپ

اصحاب مشکوٰۃ نے باب جامع المناقب میں اس حدیث کی تخریج فرمائی ہے اور بخاری و مسلم کا حوالہ دیا ہے، صاحب لمعات نے فرمایا کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آن حضور علیہ السلام نبوت کے بعد بھی غار حراء میں خلوت فرماتے تھے، کیونکہ حضرت جبرائیل اعطاء نبوت سے قبل آپ کے پاس تشریف نہیں لائے۔

۱۲ اس علی الفور کا مفہوم فقال اقرأ کی فاء سے نکل رہا ہے، کیونکہ فاء تعقیب مع الوصل کیلئے آتی ہے۔ ۱۲۔

نے فرمایا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو پڑھنا جانتے ہیں، فرشتے نے دبوچا اور خوب دبوچا یہاں تک کہ آپ کی قوت جواب دینے لگی پھر چھوڑ دیا اور کہا کہ پڑھئے آپ نے پھر وہی جواب دیا کہ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو پڑھ سکتے ہوں، اس درمیانی وقفہ کے بعد جو سانس لینے کے لئے تھا جبرئیل علیہ السلام نے پھر دبوچا، جبرئیل دبوچتے جاتے ہیں اور مقصد کیلئے استعداد پیدا کرنے کی کوشش کرتے جاتے ہیں لیکن جواب وہی ملتا ہے تو انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی استعداد پیدا نہیں ہو سکی ہے پھر دبوچتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پڑھئے لیکن جواب وہی ملتا ہے اور تیسری مرتبہ کے بعد جب جبرئیل علیہ السلام نے کہا پڑھئے اقرأ باسم ربك الخ تو آپ نے پڑھنا شروع فرمایا۔

لیکن اس دبوچنے کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو جانتے ہیں کہ جب کوئی بچہ اول اول حاضر مکتب کیا جاتا ہے تو استاد بڑی شفقت سے اس کو پڑھنے کا عادی بناتا ہے، کسی بھی مکتب کا یہ دستور یا طریق نہیں ہے کہ معلم کو درس گاہ میں قدم رکھتے ہی ترچھی نگاہ سے دیکھا جائے۔ اور یہاں کا معاملہ ہی دگرگوں ہے، ایک ایسے انسان کے ساتھ جو رب العالمین کا محبوب ہے یہ معاملہ کیا جا رہا ہے کہ دبوچ رہے ہیں اور اس قدر کہ قوت جواب دے رہی ہے نیز یہ بھی کہ آپ اقرأ کا جواب ما انا بقاری سے دے رہے ہیں، یہ جواب جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ سامنے نوشتہ ہو کہ میں اسے نہیں پڑھ سکتا، میں پڑھا ہوا نہیں ہوں لیکن جب ایک شخص کچھ کلمات ادا کرنا چاہتا ہے، اور آپ فصیح العرب والعجم ہیں، اور آپ کو کلمات ادا کرنے میں چنداں دشواری بھی نہیں ہے لیکن نہیں ادا فرماتے، آخر یہ سب کیوں؟ بات اصل یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آتے ہی ایسا ہی عمل شروع فرمایا جو نبوت کے بعد آپ کے سامنے آنے والا تھا، آپ کو آلام و مصائب سے کھیلنا ہے اس لئے پہلے ہی دن بتلا دیا۔

یہ شہادت گہم الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

تین بار دبا کر تین مصیبتوں کی طرف اشارہ فرما دیا کہ سب سے پہلا دباؤ جو آپ پر ڈالا جائے گا وہ یہ ہے کہ پورے مکہ والے آپ کے دشمن ہو جائیں گے چنانچہ اس دشمنی میں ایک ایسا بھی وقت آیا کہ پیغمبر علیہ السلام کو اپنے تمام رفقاء کے ساتھ شعب ابی طالب میں بند کر دیا گیا اور ہر قسم کے تعلقات منقطع کر دئے گئے اور یہ مقاطعہ کا سلسلہ مسلسل تین سال تک جاری رہا، مکہ والوں کی دشمنی کا یہ عالم تھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور ابو جہل ہے کہ موٹی چادر گلے میں ڈال کر کھینچ رہا ہے اور اس قدر دبا رہا ہے کہ آنکھیں تک ابل رہی ہیں۔

دوسرے دباؤ میں اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کی دعوت کو ختم اور دفن کرنے کے لئے ناپاک کوششیں کی جائیں گی چنانچہ اہل مکہ نے باہم مشورے کئے کہ انہیں کسی مکان میں بند کر دو، کسی نے کہا جلا وطن کر دو، نہ ان کی دعوت اہل مکہ تک پہنچ سکے گی نہ ان کے لئے جاذب توجہ ہوگی، لیکن شیطان جو ایک شیخ نجدی کی صورت میں شریک مجلس تھا ان تمام مشوروں کو مسترد کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سب صورتیں نامناسب ہیں، اچھی صورت یہ ہے کہ تمام قبائل کے

سردار جمع ہو جائیں اور آپ کے دروازے پر تلوار لئے کھڑے رہیں اور جب آپ لگائیں تو تمام تلواریں بیک وقت آپ پر پڑیں، اگر ایسا ہو گیا تو بنو ہاشم ہر قبیلہ سے جنگ کرنے سے رہے اور نہ اتنے آدمیوں سے قصاص ہی لیا جاسکتا ہے اس لئے معاملہ دیت پر آجائے گا اور دیت دینا تمہارے لئے آسان ہے، رات کو ایسا ہی کیا گیا، تمام قبیلوں کے سردار جمع ہو کر ناپاک ارادے سے در اقدس پر پہنچ گئے، آپ کو بذریعہ وحی ان ناپاک ارادوں کی خبر پہنچ گئی، چنانچہ آپ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنی آرام گاہ پر لیٹنے کا حکم فرمایا اور خود ایک مٹھی مٹی لے کر وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ (پ ۲۲) کا ورد فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے اور وہ مٹی ان کے سروں پر ڈالتے ہوئے نکل گئے، جس کا یہ اثر ہوا کہ وہ ہمہ بینی کے ادعاء کے باوصف کچھ بھی نہ دیکھ سکے۔ جب آپ کے تشریف لے جانے کے بعد دیکھا تو اپنے سروں پر مٹی ہی دیکھی۔

تیسرے دباؤ میں اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کو ترک وطن اور ترک حرم پر مجبور کر دیا جائیگا جو آپ کے نزدیک محبوب ترین چیز ہے، پھر ان لوگوں نے صرف ترک وطن ہی پر اکتفاء نہیں بلکہ اس کے بعد فوجوں کو لے کر حملہ کیا اور ایک بار نہیں بار بار کیا، یہ تین قسم کے حادثات تھے جن کی طرف تین بار دباؤ ڈال کر اشارہ کیا گیا، اس وقت آپ ممکن ہے یہ باتیں سمجھ نہ سکے ہوں لیکن مشکلات کی ایک جھلک ضرور پیش کر دی گئی لیکن ان تمام مشکلات کی جانب اشارے کیساتھ جب حضرت جبرئیل علیہ السلام دباؤ ڈال کر اقرار فرماتے ہیں تو آپ کا ما انا بقاری فرمانا کیسے درست ہے؟ اس کا ایک جواب تو سیر کی کتابوں میں موجود ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے دباؤ کے ٹکڑے پر نوشتہ پیش کیا گیا تھا اور اس صورت میں آپ کا ما انا بقاری فرمانا بالکل درست ہے کہ میں حرف شناس نہیں ہوں، اگر یہ روایت صحیح تسلیم کر لیں تو بات حل ہو جاتی ہے لیکن قسمت سے یہ روایت کمزور ہے اس لئے مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جبرئیل کے اقرار کہنے کا مطلب یہ نہ تھا کہ آپ از خود قراءت کریں بلکہ آپ کے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح میں کلمات ادا کرتا ہوں اسی طرح تم بھی ادا کرتے رہو، بالکل اسی طرح جیسے بچہ سے ”پڑھو“ کہا جاتا ہے اس کا مطلب بھی از خود قراءت کرنا نہیں ہوتا بلکہ مفہوم یہ ہوتا ہے کہ جیسے میں کہوں اسی طرح تم بھی کہتے رہو، لیکن چونکہ یہ صیغہ امر ہے اور فعل متعدی ہے اس لئے نبی کریم ﷺ نے یہ سمجھا کہ مجھ ہی سے کچھ پڑھوانا چاہتے ہیں، حالانکہ مقصد تلقین تھا تکلیف نہ تھا، آپ نے مقصد تکلیف سمجھا، اور پھر اپنی حقیقت پر نظر کی، اور چونکہ اس مقام عبدیت میں مستغرق تھے اس لئے ما انا بقاری فرمایا۔

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری کی رائے | اس سلسلہ میں ایک توجیہ مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی کہ خداوند قدوس کا

مولانا مرتضیٰ حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے دور کے ممتاز مناظرین میں شمار کئے جاتے تھے، علم مناظرہ پر مطبع قاسمی دیوبند سے مولانا کی متعدد تصانیف اشاعت پذیر ہوئی تھیں، ایک عرصہ تک دارالعلوم دیوبند میں خدمتِ درس و تدریس انجام دیتے رہے اور دارالعلوم دیوبند میں ناظم تعلیمات بھی رہے، الاستاذ مولانا السید نضر الدین صاحب قدس سرہ نے بھی مولانا مرحوم سے بعض کتابیں پڑھی ہیں۔

وہ کلام آنحضرت ﷺ کے سامنے پیش کیا گیا ہے جس کے متعلق آیا ہے، لَوْ أَنْزَلْنَا هَذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (پ ۶۷۸) اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اسے مخاطب تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔

کلام وزن دار اور حد درجہ بھاری ہے اور جبریل اسی شان عظمت کے ساتھ اسے لیکر پہنچے ہیں تو آپ اسے کس طرح برداشت فرمائیں، اسکی مثال ایسی ہی ہے کہ جب بچہ کے سامنے قاعدہ رکھا جاتا ہے تو وہ پہلی سطر ختم کر کے سوچتا ہے کہ میں نے علوم تمام کر لئے، لیکن اب استاد دوسرا سبق شروع کراتا ہے تو بچہ محسوس کرتا ہے کہ ابھی منزل نہیں آئی ہے لیکن اس دوسرے موضوع کے اختتام پر وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب تو کام تمام ہی ہو گیا لیکن استاد پھر تیسرے مرحلہ کی ابتداء کر دیتا ہے اور بچہ پھر اپنے تصورات پر چلتا ہے، غرض قرآن کریم ختم کر لیتا ہے تو اسے ایقان ہو جاتا ہے کہ اب اس منزل سے پرے کوئی منزل نہیں ہے لیکن جب اسے کسی مکتب یا مدرسہ میں دوسرے علوم کی تحصیل کے لئے بھیجا جاتا ہے تو اسے پھر ایک مرتبہ گرد و پیش پر گہری نظر ڈالنے کی نوبت آتی ہے، نئے مضامین سامنے آتے ہیں حالانکہ حروف وہی اٹھائیں ہیں جو اسے ابتدائی سبق میں بتلائے گئے تھے، انہیں مختصر سے حروف میں معانی کا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے جس سے عہدہ برآ ہونا مشکل نظر آ رہا ہے، حروف بھی وہی ہیں اور حروف کی ترتیب میں بھی کوئی اجنبیت نہیں مگر معانی ہیں کہ سیلاب کی طرح کہیں نہیں رکتے اور اسی پر انحصار نہیں کہ علوم حروف کی ترتیب کے ساتھ پیدا ہو رہے ہیں بلکہ اگر کسی عامل سے ملاقات ہو گئی تو اس نے انہیں مفردات حروف کے متعلق وہ اسرار و رموز بیان کئے جو تصور سے بالاتر تھے کہ دیکھو ان حروف کے یہ خواص ہیں اور اس حرف کی زکوٰۃ دینے کا یہ طریق ہے اور ان میں ان چیزوں سے پرہیز ہے اور زکوٰۃ کے بعد تمہارے اندر اس قدر قوت آ جائیگی کہ زمین کے اوپر ”آ“ کے شکل کی ایک لکیر کھینچ دینا تو زمین پھٹ جائیگی، اور دوسری لکیر کھینچ دو گے تو اسی وقت پھر آملے گی اور اگر اسکے بعد کسی اہل نظر سے نظر مل گئی تو اس نے ان ہی حروف کے ذریعہ ان حقائق کا علم عطا کیا کہ جسے اہل نظر ہی سمجھ سکتے ہیں، غرض ایک مبداء ہے لیکن علوم و معارف کا ایک گہرا سمندر ہے کہ جس سے سب کچھ سمیٹ لینے کے باوجود بھی اپنی تنگ دامانی کا گلہ کرنا پڑتا ہے، یہ سب کچھ باتیں اس سادہ لوح بچہ کے متعلق ہیں جسے اسل وادی میں قدم رکھنے سے پہلے مشکلات کا علم نہ تھا، جو ہر مرحلہ پر منزل کا گمان کر کے اپنے لئے سامان تسلی فراہم کر لیتا تھا، لیکن اگر کسی انسان کے سامنے یہ سب مشکلات پہلے ہی آجائیں تو اسکی مشکل کار کا تصور بھی ہمارے اور آپ کے بس کی بات نہیں، آنحضرت ﷺ کو بھی اسی موقف میں تصور کیجئے کہ جبریل آپ کو اس وادی پر خار کی دعوت دے رہے ہیں اور تمام مشکلات آپ کے سامنے ہیں، اور نہ صرف یہ کہ مشکلات سامنے ہیں بلکہ آپ مقام عبدیت میں اس درجہ مستغرق ہیں کہ ان مشکلات کے تحمل کا خیال بھی آپ کے لئے دشوار ہے، جب جبریل نے یہ حوصلہ شکن جواب سنا تو آپ کو مقام عبدیت سے ابھارنا شروع کیا اور ایسے مقام تک لے آئے کہ آپ کو

اپنے متعلق ان مشکلات کے تحمل کا یقین آگیا اور سمجھ گئے کہ اس بار امانت کے لئے میرا ہی انتخاب کیا گیا ہے۔
آسمان بار امانت تو انت کشید
قرعہ فال بنام من دیوانہ زدند

حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کا ارشاد

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب علیہ الرحمہ نے فرمایا کہ دراصل جبرئیل علیہ السلام ایک خاص طریق عمل سے اپنی روح کا اثر آپ پر قائم کرنا چاہتے تھے، اسلئے کہ جبرئیل علیہ السلام ان تمام ہی کمالات کے حامل تھے جو اس سے پہلے انبیاء کرام کو عطاء کئے گئے تھے، چنانچہ جبرئیل علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ یہ تمام کمالات روحانی آپ کی ذات اطہر میں منتقل کردئے جائیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت جبرئیلؑ کا یہ عمل توجہ کی ایک قسم ہے، جبرئیل علیہ السلام بحکم خداوندی توجہ ڈال رہے ہیں، جب ایک صاحب کمال دوسرے انسان کو اپنے کمال سے فائدہ پہونچانا چاہتا ہے تو خود کو اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے اور اسکی چار صورتیں ہیں۔

(۱) انعکاسی: اسکا حاصل صرف اسقدر ہے کہ شیخ مریدوں کے حلقہ میں پہنچ کر اپنے ذکر و شغل اور انفاس قدسیہ سے ان کے اندر ایک روح پھونک دے، جب تک شیخ مجلس میں موجود ہے اسکے ذکر کے اثرات حاضرین پر بقدر استعداد پڑ رہے ہیں، دل و دماغ سے دنیا فراموش ہوگئی ہے، لیکن جہاں شیخ نے مجلس کو چھوڑا وہ کیفیت ختم ہوگئی، اسکی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص خوشبو لگا کر مجلس میں آبیٹھا تو اسکے عطر سے مجلس مہک اٹھے گی؛ لیکن جہاں یہ شخص مجلس سے اٹھا اور خوشبو ختم ہوگئی یہ توجہ کی بہت کمزور قسم ہے لیکن فائدہ سے خالی نہیں ہے۔

(۲) القائی: اسکا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ شیخ اپنے قلب کی نورانیت سے دوسرے طالب حق کے اندر ایک نورانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، پھر اس کیفیت کا باقی رکھنا مرید کا اپنا کام ہے، اگر ذکر و شغل جاری رکھتا ہے تو یہ کیفیت باقی رہ جائے گی ورنہ ختم ہو جائیگی، اسکی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ ایک شخص اپنا چراغ لیکر اس میں عمدہ تیل ڈال کر دوسرے ایسے انسان کے پاس پہنچتا ہے جو اپنا چراغ پہلے سے روشن کئے ہوئے ہے اور کہتا ہے کہ میرا چراغ بھی روشن کر دیجئے، وہ چراغ تو روشن کر دیتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ چراغ جلتا ہی رہے، بلکہ جہاں ہوا تیز ہوئی یا بارش کی دو چار بوندیں پڑیں اور چراغ گل ہو گیا، اسی طرح مرید طلب صادق لیکر شیخ کے پاس جاتا ہے کہ میرا دل روشن کر دیجئے، شیخ دل روشن کردے گا لیکن اگر شیطان درمیان میں آگیا اور دھوکہ دیدیا تو انوار فوراً ختم ہو جائیں گے، غالباً حضرت مجدد کا دور تھا کہ ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے، راستہ میں دیکھا کہ تین سادھو گردن جھکائے مراقبہ کر رہے ہیں، چلتے چلتے انہیں خیال پیدا ہوا کہ ذرا بیٹھ کر تو دیکھیں اب بیٹھے تو فوراً بھاگنا شروع کر دیا، سادھوؤں نے قہقہہ لگایا کہ اب کہاں جاتا ہے پھنس چکا ہے، اب یہ بزرگ جہاں بھی جاتے ہیں کام نہیں چلتا، اپنے شیخ کے پاس پہنچے تو فرمایا میں کچھ نہیں کر سکتا، ہاں تمہیں ایک صاحب بریلی میں ملیں گے، چار پائی بنتے ہیں ان سے رجوع کرو، چنانچہ یہ بزرگ بریلی پہونچے، دیکھا تو واقعہ وہاں

ایک بزرگ چار پائی بن رہے ہیں، انہوں نے دور ہی سے دیکھ کر ڈانٹنا شروع کیا کہ اب آیا ہے ایمان لانا اور بان کو زور زور سے باٹنا شروع فرمایا اور کہا کہ جاؤ اب ٹھیک ہو گئے ہو، تو القائی توجہ میں انوار تو پیدا ہو جاتے ہیں لیکن یہ دیر پانہیں ہوتے بلکہ ذرا سی غفلت میں منزل دور ہو جاتی ہے۔

رفتہ کہ خار از پاکشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ را ہم دور شد

(۳) اصلاحی: یہ توجہ کی تیسری قسم ہے، اسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ شیخ اپنی نورانیت کا ایک وافر حصہ مرید کیلئے خاص کر دیتا ہے لیکن اس میں تدریجی ترقی ہوتی ہے، پہلے اخلاق درست کراتے ہیں اور پھر آہستہ آہستہ ترقی دیتے ہیں، یہ صورت پچھلی دونوں صورتوں سے قوی ہے، مثال کے طور پر نہر کے پانی سے ایک حوض کو بھر دیا گیا اور پھر اس سے نالیاں کاٹ دی گئیں کہ ان نالیوں کے ذریعہ پانی حاصل کیا جائے لیکن جس قدر نالی کا دہانہ ہوگا اسی قدر پانی آسکے گا، معمولی خس و خاشاک تو پانی کے زور سے بہہ جائیگا لیکن اگر کوئی ایسی صورت پیش آگئی کہ نالی کا دہانہ ہی بند ہو گیا تو پانی آنا بند ہو جائے گا اسی طرح شیخ نے اپنے انوار کا جو ایک وافر حصہ مرید کو عنایت کیا ہے اس میں ترقی ہوتی رہے گی اور معمولی قسم کے نقصان اس پر اثر انداز نہ ہوں گے، لیکن اگر کوئی بڑی ہی بات پیش آجائیگی تو نقصان ہوگا۔

(۴) اتحادی: چوتھی صورت توجہ اتحادی کی ہے، اسکا حاصل یہ ہوتا ہے کہ شیخ اپنی روح کو مستفیض کی روح سے متصل کر دیتا ہے اور ان کمالات کا افاضہ کرتا ہے جو شیخ کی روح کے اندر موجود ہوتے ہیں، یہ صورت سب سے زیادہ قوی ہے، اسکی مثال میں ہم نے خواجہ باقی باللہ کا واقعہ سنا ہے، یہ حضرت مجدد الف ثانی کے شیخ ہیں، دلی سے باہر رہتے تھے، ایک دن چند مہمان آگئے اور اتفاق کہ شیخ اس وقت تہی دست تھے اتنا بھی پاس نہ تھا کہ ضروری مدارات کر سکیں، شیخ بہت پریشان ہوئے، کبھی حجرے کے اندر جاتے ہیں اور کبھی فرط اضطراب میں باہر تشریف لے آتے ہیں، قریب ہی ایک نانبائی کی دکان تھی، نانبائی پہلے سے شیخ کا معتقد تھا اس نے دیکھ کر پہچان لیا کہ شیخ مہمانوں کی خاطر داری نہ ہونے کے باعث پریشان ہو رہے ہیں، اسنے فوراً عمدہ خوان حاضر کیا، مہمانوں نے کھانا کھا لیا، شیخ علیہ الرحمہ کو اس کی یہ خدمت بھاگنی، فرمایا: مانگ کیا مانگتا ہے؟ عرض کیا حضرت کی دعاؤں سے اللہ کا عطاء کردہ سب کچھ موجود ہے حضرت خواجہ نے دوبارہ اصرار کیا تو نانبائی نے کہا کہ حضرت بس اپنا جیسا بنا دیجئے، خواجہ نے ارشاد فرمایا کہ اور کچھ مانگا ہوتا لیکن نانبائی نے بھی اسی خواہش و طلب پر اصرار کیا، شیخ اسے حجرے میں لے گئے اور اسے اپنے سینہ سے ملا کر اپنی روح کو جو حامل کمالات تھی اس کی روح کے ساتھ متحد کر کے اسے ان کمالات کا حامل بنا دیا، مگر چونکہ یہ انتقال فعی تھا نانبائی برداشت نہ کر سکا اور تیسرے دن واصل بحق ہو گیا، غرض تھوڑی دیر کے بعد جب نکلے تو نانبائی شیخ کی شبیہ بن چکا تھا حتی کہ صورت میں بھی کوئی فرق نہ تھا، فرق تھا تو صرف اس قدر کہ شیخ ہوشمند تھے نانبائی مست، انجام کار یہ نانبائی تین دن بعد واصل بحق ہو گیا لیکن چونکہ یہ چیز نانبائی کے

اصرار پر دفعۃً دی تھی اسلئے نانبائی اسے برداشت نہ کر سکا، اس عالم فانی میں کمالات عطاء کرنیکا قانون بتدریج ہے، یکبارگی ترقی کسی کو اس نہیں آتی، بلکہ اس کا انجام اس دار فانی میں فنا ہے، یہاں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ بھی جبرئیلؑ توجہ اتحادی کا معاملہ فرما رہے ہیں، چاہتے ہیں کہ اپنی روح کے تمام کمالات آپ کے اندر سمودیں لیکن اگر قانون تدریج سے صرف نظر کرتے ہیں تو فنا کا اندیشہ ہے اسلئے یہ صورت اختیار کی گئی کہ ایک بار دبایا، پھر وقفہ دیا اور پھر دوبارہ دبایا اور سہ بارہ دبوچا اور استعداد پیدا ہونے پر آیات تلاوت فرمادیں اور اس مرتبہ دبانے سے جبرئیلؑ کی روح کے تمام کمالات آپ کے اندر سما گئے، مقصد یہ تھا جس چیز کی صلاحیت پہلے سے موجود تھی اس کو بیدار اور رونما کر دیا جائے، صلاحیت بیدار کرنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، کبھی اسکے لئے برسوں کی محنت درکار ہوتی ہے، اور کبھی صرف دل شکستگی کے باعث وہ چیز میسر آ جاتی ہے، حضرت سید حسن صاحب رسول نما دتی کے ایک بزرگ گزرے ہیں، ان کو رسول نما اسلئے کہتے تھے کہ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کر دیتے تھے، ایک دن ان کی اہلیہ نے کہا کہ آپ زمانہ بھر کو زیارت کراتے ہیں، کبھی ہمیں نہیں کراتے؟ فرمایا اچھا نہادھو کر دلہن بن جاؤ، اچھے کپڑے پہنو، گوٹا لگا ہو اسرخ دو پٹہ اوڑھو، اور خوشبو لگاؤ، انہیں زیارت کا شوق تھا، ہدایات پر عمل کر لیا اور دلہن بن کر بیٹھ گئیں، اب سید حسن رسول نما صاحب نے کہا کہ دیکھو تو اس بڑھیا کو بڑھاپے میں جوانی کی سوجھ رہی ہے، حضرت کا اتنا فرمانا تھا کہ گریہ طاری ہو گیا، اور اسی حالت میں زیارت ہو گئی جو اشتیاق پہلے سے موجود تھا، اب دل شکستگی کے باعث کامل ہو گیا۔

حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ کا ارشاد | حضرت شیخ الہند علیہ الرحمہ نے ارشاد فرمایا کہ آنحضور ﷺ کو مقصد زندگی بتلانے کیلئے حضرت جبرئیلؑ کو بھیجا گیا تھا چنانچہ جبرئیلؑ نے آکر آپ کو مقصد کی نشان دہی کرنی چاہی، لیکن اس وقت آپ پر عبدیت کا غلبہ تھا اور انسان عبدیت میں جس قدر بھی ترقی کریگا اسی قدر بیچارگی کا غلبہ ہوتا جائیگا اور اس حال میں جب اسے کمال کی دعوت دی جائے گی تو وہ کہے گا کہ میرے اندر اس کی اہلیت نہیں ہے اور یہ کہنا اس کے لئے ایک طبعی چیز ہے، کیونکہ وہ اپنی حقیقت سے واقف نہیں۔ آپ بھی اسی مقام پر ہیں، اور آپ کو اس وقت کمالات کی جانب متوجہ کرنے کی ضرورت ہے اور کسی جانب متوجہ کرنے کی یہی صورت ہوتی ہے کہ پہلے تمام دوسری توجہات کو سمیٹ کر ایک طرف لگا دیں اور اس مقصد کے حصول کے لئے دباؤ ڈالا جاتا ہے، خیالات پر پابندی لگانے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ ذہنی دباؤ ڈالا جائے، اسلئے سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ جبرئیلؑ نے دفعۃً آچونکایا کہ پڑھئے لیکن آپ نے مقام عبدیت کو نہیں چھوڑا تو اسکے لئے دوبارہ اور سہ بارہ دبایا گیا اور جب دیکھا کہ توجہ کامل ہو گئی ہے تو آیات تلاوت فرمادیں، اگر یہی قوت جو جبرئیلؑ نے کئی بار میں پہنچائی، یکبارگی پہنچادی جاتی تو اس کا تحمل مشکل تھا اس لئے اسکے لئے راہ تدریج کو اختیار فرمایا گیا اور اس قوت کا یہ بھی مطلع نظر ہے کہ

آنحضرت ﷺ نے جو اپنے متعلق گمان کر رکھا ہے وہ ختم ہو جائے اور آپ یہ سمجھ لیں کہ میرے اندر سینکڑوں قوتیں مضمحل ہیں جیسے کسی حسین نے گمبھی آئینہ نہ دیکھا ہو اور اسے اپنے متعلق حسن و جمال کا احساس نہ ہو، لیکن دفعۃً اس کے سامنے آئینہ پیش کر دیا جائے اور وہ اس میں اپنی صورت اور خدو خال کو دیکھ لے تو اسے وہ صورت کتنی بھائیگی، حالانکہ آئینہ نے کوئی نئی چیز نہیں پیدا کی، حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے بھی یہ تمثیل بیان فرمائی تھی کہ یہاں جبرئیل آئینہ بردار ہیں اور معلم حقیقی حضرت حق جل مجدہ ہیں، جبرئیل علیہ السلام نے اپنے آئینہ میں خود آنحضرت علیہ السلام کے کمالات کو دکھلایا ہے؛ چنانچہ جب آپ نے اپنے کمالات کو دیکھ لیا تو آپ کو اپنے بارے میں ان مشقتوں کے تحمل کا یقین آ گیا، غرض جبرئیل نے نئی چیز کوئی نہیں پیدا کی بلکہ جو چیز کسی بنا پر ننگا ہوں سے اوجھل ہو گئی تھی اسے دکھلادیا ہے، حضرت امیر شاہ خاں رحمۃ اللہ علیہ کا یہ شعر کتنا بر محل ہے۔

آئینہ میں ہرگز اے مجھ تماشا شانی

ترسم کہ خوری زخمی از تیر نگاہ خود

یعنی تم آئینہ نہ دیکھنا اور نہ مجھے ڈر ہے کہ تمہاری تصویر تمہیں مجروح نہ کر دے۔ غالب نے خوب کہا ہے۔

تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

دشنہ غمزہ جاں ستاں، ناوک ناز بے پناہ

مولانا جلال الدین نے مثنوی میں ایک تمثیل بیان فرمائی ہے کہ ایک شیر کا بچہ بکریوں میں پرورش پاتا تھا اور بکریوں کی طرح گھاس وغیرہ بھی چرتا تھا، حسب اتفاق نہر میں پانی پینے کے لئے جواتر اتوا سے اپنی تصویر نظر آ گئی اور غرانے لگا، کہ ان بکریوں کی رفاقت تو میری جرات مند طبیعت کیلئے ننگ و عار ہے، چنانچہ ان بکریوں کو پھاڑنا شروع کر دیا، گویا اس واقعہ سے قبل اسے اپنی حقیقت کا علم ہی نہ تھا جس کی بنا پر وہ زندگی کی اس پست سطح پر قانع تھا، لیکن جب اسے اپنی بلند حوصلگی کا سراغ مل گیا تو اس نے اس معیار زندگی کو چھوڑ دیا، بالکل اسی طرح جب تک کہ آپ کو اپنی بلند ہمتی عالی حوصلگی اور سیادت کونین کی اطلاع نہ تھی آپ کے لئے ایسا تصور دشوار تھا، لیکن جب اصل حقیقت کی اطلاع ہوئی تو اس بار امانت کو اٹھانے کی آمادگی ظاہر فرمادی، جس سے کونین نے اعتذار کیا تھا۔

میں نے اس بار امانت کو اٹھا رکھا ہے

جس نے کونین کو دیوانہ بنا رکھا ہے

پھر تیسری بار آپ نے بھی پڑھنا شروع فرما دیا، جبرئیل نے فرمایا: اَفْرَاءَ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، تم کہتے ہو کہ میں نہیں پڑھ سکتا لیکن جس نے تمہیں پیدا کیا، اور ابتداء سے اب تک تربیت کر کے اس مقام تک پہنچایا، کیا اس کو یہ قدرت نہیں کہ امی کو قراءت کی قوت بخش دے، اسی معبود کا نام لیکر پڑھنا شروع فرما دیجئے، آپ اپنی ذات پر نظر نہ کیجئے بلکہ اس خالق اکبر کی قوت و ربوبیت کو دیکھئے، وہ کس طرح انسان کو پیدا فرماتا ہے، جو تخلیق کے اس ناقابل تصور طریق پر قادر ہے یعنی خون کے بے حقیقت پھٹکی سے انسان کو پیدا کرتا ہے، وہ یقیناً آپ سے عمل قراءت کرانے پر بھی قادر ہے

اسلئے ”اقرا“ آپ پرھے تو سہی ”وربك الاكرم“ اسکی عنایات آپ پر بہت زیادہ ہیں، اسی نے آپ کو یہ ناقابل یقین کمال عنایت کیا ہے، اور دیکھو ہم نے قلم جیسی چیز کو اپنی معلومات پھیلانے کا ذریعہ بنایا ہے، کہ اس سے عجیب عجیب چیزیں سامنے آتی ہیں، تو جو ذات ایک جامد شئی کو نطق و بیان عطا کر سکتی ہے وہ یقیناً ایک برگزیدہ انسان کو کتاب قراءت بھی بخش سکتی ہے، یہ آیات آپ کو پڑھا دی گئیں اور اس معاملہ کے اختتام کے بعد آپ گھر واپس ہوئے تو دل کانپ رہا تھا حضرت خدیجہؓ کے پاس پہنچ کر فرمایا مجھے کبل اڑھا دو چنانچہ آپ کو کبل اڑھا دیا گیا اور جب سکون ہو گیا تو آپ نے حضرت خدیجہؓ کو پورے واقعات سنائے۔

حدیث شریف میں ”لَقَدْ خَشِيتُ عَلَى نَفْسِي“ (مجھے تو اپنی جان کا خطرہ ہو گیا تھا) فرمایا گیا ہے، بعض حضرات نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ یقین نہیں آیا کہ خداوند قدوس نے مجھے رسالت و نبوت کے لئے منتخب فرمایا ہے بلکہ آپ کو یہ خیال تھا کہ کہیں میں دیوانہ تو نہیں ہو گیا ہوں، جس طرح اس عالم میں جن بھوت وغیرہ انسان پر اپنے اثرات ڈال کر دماغی توازن کو خراب کر دیتے ہیں چنانچہ اسی معنی کے پیش نظر ان حضرات نے اس صحیح روایت کا انکار کر دیا ہے، کیونکہ جب کوئی شخص پیغمبر بنایا جاتا ہے تو اسے پیغمبری کا یقین ہوتا ہے اور یہ الفاظ بتلا رہے ہیں کہ آپ کو یقین نہیں اسلئے کہ اس احساس خطرہ سے اشتباہ کا گمان ہوتا ہے لیکن ایسا گمان بہت غلط ہے کہ ایک بالکل صحیح روایت کا صرف اس بنا پر انکار کر دیا جائے کہ آپ کی فہم کی رسائی حقیقت کلام تک نہیں ہو سکی ہے، دراصل اسی خشیت کے دو معنی ہو سکتے ہیں، یا اسے ماضی ہی کے معنی میں رکھیں یا مستقبل کے، اگر ماضی کے معنی میں ہے تو آپ اس واقعہ کی حکایت فرما رہے ہیں جو جبرئیل کے دبانے سے پیش آیا تھا، مفہوم یہ ہے کہ جبرئیل نے اس شدت سے مجھے دبایا کہ زندگی کا خطرہ ہو گیا، اسلئے کہ میری قوت برداشت نے جواب دینا شروع کر دیا تھا، اور اگر اُسے مستقبل کے معنی میں لیں تو مفہوم یہ ہوگا کہ نبوت بڑی باوزن چیز ہے، دیکھا ہی چاہئے کہ سنبھل جائے، مجھے تو اپنے متعلق خطرہ محسوس ہو رہا ہے، نبوت میں اشتباہ اسکا مفہوم نہیں ہے لیکن انسان اپنی طبیعت کے اعتبار سے کمزور ہے خلق الانسان ضعيفاً انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے اور جب یکبارگی کوئی سنگین معاملہ پیش آجائے تو انسان کی گھبراہٹ نہ پوچھے، آنحضرت ﷺ بھی اپنے متعلق یہی فرما رہے ہیں کہ میں انسان ہوں، اور کام بڑا مشقت آزما ہے، اسلئے کہ یہ سراسر اصلاحی کام ہے جو ایسی قوم کے

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے وقت جبین مبارک سے پسینہ کی رو جاری ہے اور اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دل کانپ رہا تھا، اور آپ نے فرمایا کہ مجھے کبل اڑھا دو، بظاہر تو دونوں باتوں میں تضاد ہے لیکن ذرا سا فرق یہ ہے کہ دونوں حالتیں الگ الگ ہیں، پسینہ کی رو نزول وحی کے وقت جاری ہوتی تھی، آنکھیں ابل آتی تھیں لیکن یہ کیفیت نزول وحی کے بعد کی ہے جو مستبعد نہیں ہے، خارج میں اس کی مثال ایسی ہو سکتی ہے کہ جیسے کسی کو بخار چڑھتا ہے بدن کے اوپر حرارت ہوتی ہے لیکن سردی کا احساس برابر ہوتا رہتا ہے اور کبل وغیرہ اوڑھنے کی نوبت آجاتی ہے۔ ۱۲

درمیان انجام دینا ہے جن میں علم کی روشنی آج تک نہیں پہنچی، اور بت پرستی کے سوا جسکا کوئی شغل نہیں ہے، اسلئے انہیں اچھے کاموں کی دعوت عظیم خطرات کا پیش خیمہ ہے، خود آنحضرت علیہ السلام سے ایک روایت ہے: اِذَا يَصْلُغُوا رَاسِيْ سَوَقْتِ وَهِيَ مِرَّاسِرْ كَجَلِّ دِيْنَ كَعِ۔

دعوت اصلاح و خیر تو اس شخص کو دیجائے جو کم از کم سننے کے لئے تیار ہو، لیکن یہ لوگ تو سننے کے بھی روادار نہیں ہیں، اسلئے آپ ان ناخوشگوار حالات کے لئے خداوند کریم سے مدد کے طالب ہیں اور یہ انسان کی فطرت ہے، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نبوت عطاء کی گئی اور فرمایا گیا کہ فرعون کے پاس جاؤ، عرض کیا کہ میری زبان میں لکنت ہے، اسلئے میرے بھائی ہارون کو بھی نبوت عطاء فرمادیجئے، ورنہ ممکن ہے میری زبان بدنیوتوں کے لئے ہدف طعن بن جائے اور فرمایا۔ اِنِّيْ اَخَافُ اَنْ يُّقْتُلُوْنِ مَجْهِيْ خَوْفٍ هُوَ كَهْوِ مَجْهِيْ قَتْلِ نَهْ كَرْدِيْ اَوْ رَجَبِ مَوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ نَهْ هَرِّ طَرَحٍ سَهْ اَطْمِيْنَانِ كَرَالِيَاتِبِ وَهَاهُنَا سَهْ رَوَانَهْ هُوْنَهْ، اَوْ رَهْ رَهْ بَهْ سَانِپْ كَا مَعْجَزَهْ لَهْ لِيَا، اَرْشَادَهْ هِيْ:

وَمَا تِلْكَ بِيْمِيْنِكَ يَا مُوسٰى
موسیٰ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟

فرمایا میرا عصا ہے اس سے میں سہارا لیتا ہوں، پتے جھاڑتا ہوں اور میرے دوسرے کام بھی اس سے متعلق ہیں، لیکن جب دیکھا کہ لاٹھی سانپ بن گئی ہے تو او جس فی نفسہ خيفة موسىٰ (موسیٰ نے اپنی طبیعت میں خوف محسوس کیا) خداوند قدوس نے حکم فرمایا کہ موسیٰ! اپنا عصا اٹھا لو، اصلی حالت پر آجائے گا، لیکن چونکہ دل میں خوف ہے اسلئے ہاتھ سے نہیں اٹھاتے، بلکہ ہاتھ پر کپڑا پیٹ کر اٹھاتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نبوت کا بھی اذعان و یقین ہے، اور احکام خداوندی کی صداقت پر بھی ایمان ہے، لیکن انسانی کمزوری کا کوئی مداوا نہیں ہے، اور پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کیلئے تو یہ حادثہ اپنی نوعیت کا پہلا حادثہ تھا اسلئے آپ کو خیال ہوا کہ ابھی تو ایک ہی مرحلہ پیش آیا ہے اور معاملہ ختم رسالت کا ہے کس طرح کام چل سکے گا۔

عافل مرو کہ تا در بیت الحرام عشق
صد منزل است و منزل اول قیامت است

اور یہ بھی ممکن ہے کہ بات کچھ بھی نہ ہو، اور پیغمبر علیہ السلام نے سیاستاً ایسا فرمادیا ہو، مقصد یہ تھا کہ صورتحال کو حضرت خدیجہؓ کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ وہ ہمدردی شروع کر دیں، ورنہ اگر خدا نہ کردہ ان کے سامنے صورتحال رکھی اور انہوں نے کہدیا، یہ کیا دیوانگی ہے، تو صورتحال قابو سے باہر ہو جائیگی، جب کسی دوسرے کے سامنے دعوت پیش کریں گے تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ گھروالے تو دیوانہ بتلاتے ہیں اور ہمیں دعوت دے رہے ہو اسلئے آپ نے حضرت خدیجہؓ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے ایسا طریقہ کار استعمال فرمایا جس کی بنا پر انہوں نے پرزور الفاظ میں یہ فرمایا کہ آپ یہ کیا خیال فرما رہے ہیں، ذات رب العالمین کی قسم ایسا نہیں ہو سکتا، ایسے شخص کو خداوند کریم رسوا نہیں کر سکتا۔

پھر حضرت خدیجہؓ نے صرف اپنی تصدیق پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ اضطرابی کیفیت میں ادھر ادھر جاتی ہیں ورقہ کے پاس پہنچتی ہیں اور تصدیق کرا لیتی ہیں اسکے بعد آپ کو بھی ساتھ لیجاتی ہیں، ورقہ سے تصدیق کرانے کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ انہیں آنحضرتؐ کی بات پر یقین نہیں ہے بلکہ دوسروں کی زبان سے ایک مضبوط شہادت مہیا کر رہی ہیں کہ یہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر کتب سابقہ میں ہے، اور خداوند قدوس کا بھی یہی منشا ہے کہ اعلان نبوت خود آپ کی زبان سے ہو جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اپنی نبوت کا اعلان فرمایا تھا، بلکہ اس فضیلت کا اعلان حضرت خدیجہؓ اور ورقہ کی زبانی کرایا گیا یعنی جس طرح آپ کی صداقت و امانت ضرب المثل ہے اسی طرح نبوت بھی ضرب المثل ہو جائے چنانچہ پہلے تو خود حضرت خدیجہؓ نے پر زور تائید فرمائی کہ آپ جن اوصاف عالیہ کے حامل ہیں ان کے ہوتے ہوئے کبھی آپ کو رسوائی نہیں ہو سکتی، آپ آشنا و بیگانہ کے امتیاز کے بغیر احسانات فرماتے ہیں، در ماندہ لوگوں کو اٹھاتے ہیں، فقراء کو مال تقسیم کرتے ہیں، مصائب میں لوگوں کا ساتھ دیتے ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، آپ سے یہ فرما کر خدیجہؓ ورقہ کے پاس تشریف لے گئیں کہ جبرئیل کون ہیں؟ ورقہ نے کہا کہ وہ قدوس ہیں لیکن تمہیں کیا معلوم؟ فرمایا مجھ سے میرے شوہر نے

اور ورقہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تیسری پشت میں جاتے ہیں، سلسلہ نسب یہ ہے ورقہ بن نوفل بن اسد اور خدیجہ بنت خویلد بن اسد۔ ورقہ نے ایام جاہلیت میں دین نصرانیت قبول کر لیا تھا صورت واقعہ یہ تھی کہ ورقہ اور زید بن عمرو بن نفیل، یہ دونوں دین حق کی تلاش میں تھے، اس دور میں شام راہوں کا مرکز تھا اسلئے دین حق کا ہر متلاشی وہاں پہنچتا تھا چنانچہ زید وہاں کے ایک یہودی عالم راہب کے پاس پہنچے اور کہا کہ مجھے دین حق کی تلاش ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اپنے دین میں داخل کر لو۔ راہب نے کہا کہ اس دین میں آکر کیا کرو گے، کیا غضب میں حصہ دار بننا چاہتے ہو، زید نے کہا کہ غضب سے بچکر تو میں یہاں تک آیا ہوں، راہب نے کہا اگر دین حق اختیار کرنا چاہتے ہو تو دین ابراہیمی کو اختیار کر لو، زید وہاں سے چلکر ایک اور نصرانی کے پاس پہنچے اس سے گفتگو ہوئی تو اس نے کہا اس دین میں داخل ہو گے تو لعنت کا حصہ لو گے، زید نے کہا کہ لعنت ہی سے بچنے کے لئے میں حاضر ہوا ہوں، پھر زید نے اس سے کہا کہ آپ مجھے دین حق کے متعلق کچھ بتائیں، نصرانی نے کہا کہ ابراہیم کا دین دین حنیف ہے، چنانچہ جب زید کو ہر جانب سے مایوسی ہو گئی تو ایک میدان میں نکلے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا کہ اے معبود! میں ملت ابراہیمی کو اختیار کرتا ہوں تو گواہ رہنا۔

ورقہ بھی گھر سے نکلے اور ایک نصرانی عالم کے پاس پہنچے جس کے پاس صحیح انجیل موجود تھی اور اس کے ہاتھ پر انہوں نے دین نصرانی قبول کر لیا پھر اسی عالم سے ورقہ نے عبرانی زبان میں مہارت حاصل کی، چنانچہ وہ انجیل کو عربی اور کبھی عبرانی میں لکھتے تھے اور ترجمہ کر کے لوگوں کو سناتے بھی تھے۔ مشہور تو یہ ہے کہ انجیل سریانی اور تورات عبرانی میں ہے، لیکن علامہ کشمیریؒ کی تحقیق یہ ہے کہ دونوں عبرانی میں ہیں، سریانی میں کوئی کتاب نہیں، اور دھوکہ اس عبارت سے ہوا و کان بکتب الكتاب العبرانی فبکتب من الانجیل بالعبرانیہ ورقہ کتاب عبرانی کو لکھتے تھے چنانچہ وہ کتاب انجیل میں سے عبرانی میں لکھا کرتے تھے۔ اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ سریانی زبان دینے عبرانی میں لکھتے تھے۔ حالانکہ مفہوم یہ ہے کہ ورقہ کو اتنا ملکہ تھا کہ انجیل کو عربی اور عبرانی دونوں زبانوں میں لکھ سکتے تھے، چنانچہ بعض روایات میں عبرانی کی جگہ عربی ہے، حافظ لکھتے ہیں کہ سریانی سوریا سے ہے جسے ہم شام کہتے ہیں، اور عبرانی عبور سے ہے جب نمرود نے ابراہیم علیہ السلام کو پریشان کیا تو آپ نے اپنا وطن چھوڑ دیا، نمرود کو اطلاع ملی تو اس نے دوش بھیجی ابراہیم علیہ السلام جہاں بھی ملیں انہیں گرفتار کر لیا جائے اور علامت یہ بتلائی کہ جو کھدانی زبان بولتا ہو اسے گرفتار کر لینا لیکن نمرود عبور کرتے ہی حکم خداوندی زبان بدل گئی اسلئے اس زبان کو عبرانی کہنے لگے۔ ۱۲

کہنا ہے اور پھر واقعہ سنایا اس پر ورقہ نے کہا، اگر تم سچ کہتی ہو تو میں شہادت دیتا ہوں کہ یہ وہی پیغمبر ہیں جن پر ایمان لانے کی ہدایت توراہ و انجیل میں کی گئی ہے، جب ورقہ سے پوچھ لیا تو آپ کو ساتھ لیکر پھر ورقہ کے پاس گئیں، پہلی ہی بار اسلئے ساتھ نہیں لیا تھا کہ کہیں ورقہ نے انکار ہی کر دیا تو دل میں شکستگی ہوگی، اب آنحضور ﷺ کو ساتھ لیکر گئیں، کہ آپ کے بھتیجے آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ بھتیجا اسلئے کہا کہ عرب میں ہر بڑے کوچہ چاہتے تھے یا اسلئے کہ اوپر جا کر آنحضور ﷺ کا سلسلہ نسب ورقہ سے مل جاتا ہے، ورقہ نے پورا واقعہ سنا اور پھر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح فرمایا کہ یہ وہی رازداں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لایا کرتے تھے اور فرمایا۔

ابشر ثم ابشر
آپ بار بار خوش خبری حاصل فرمائیں۔

اور سیرت کی کتابوں میں یہ بھی منقول ہے کہ ورقہ نے یہ بھی کہا، میں اس کی شہادت دیتا ہوں کہ خداوند کریم نے آپ کو منصب نبوت عطا فرمایا ہے، ورقہ نے نبوت کی تصدیق کی لیکن چونکہ ان کا انتقال اظہار نبوت سے قبل ہی ہو گیا تھا، اسلئے انہیں مؤمنین میں تو داخل کیا گیا ہے لیکن صحابہ میں شمار نہیں کیا گیا۔

ورقہ نے آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق فرماتے ہوئے کہا کہ یہ رازداں وہی ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی لاتے تھے، حالانکہ ورقہ کو نصرانی ہونے کی

حیثیت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لینا مناسب تھا یعنی نزل اللہ علی موسیٰ کی جگہ نزل اللہ علی عیسیٰ کہنا چاہئے تھا، اسی اشکال سے بچنے کے لئے بعض حضرات نے اسکی تصریح کی ہے کہ ورقہ نے نزل اللہ علی عیسیٰ فرمایا تھا، پھر تطبیق اس طرح پردی گئی ہے کہ جب خدیجہ الکبریٰؓ نے تشریف لے گئی تھیں تو نزل اللہ علی عیسیٰ فرمایا تھا لیکن جب آنحضور ﷺ کو ساتھ لیکر گئیں، تو نزل اللہ علی موسیٰ فرمایا، اس کی وجہ یہ ہے کہ تنہائی میں تو ورقہ نے اپنے خیال اور عقیدہ کی رعایت کی اور آنحضور ﷺ کے سامنے اس چیز کو پیش فرمایا جو آپ کی شریعت سے میل رکھتا تھا، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت جامع اور مکمل مانی گئی ہے ان کی شریعت میں جلال و جمال

اعون الباری میں ہے کہ اس حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ورقہ نے نبوت کا اقرار کر لیا لیکن چونکہ وہ دعوت سے قبل ہی داخل حق ہو گئے اسلئے ان کا حال بحیرہ راہب جیسا ہوگا اور ان کو صحابی کہنے میں اشکال ہے۔ لیکن ابن اسحاق نے زیادات مغازی میں بھی نقل کیا ہے کہ تم ”خوشخبری حاصل کرو خوشخبری“ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم وہی شخص ہو جنکی آنکی اطلاع خوشخبری حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نے دی تھی، اور تمہارے پاس وہی رازداں آتا ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آتا تھا، اس روایت کا آخری حصہ یہ ہے کہ جب ورقہ کا انتقال ہو گیا تو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ورقہ کو جنت میں سفید لباس پہنے دیکھا ہے۔ کیونکہ وہ مجھ پر ایمان لایا تھا اور میری تصدیق کی تھی، بیہقی نے بھی دلائل میں اس کی تخریج کی ہے اور اسے منقطع کہا ہے۔ بلقینی اور عراقی نے اسی روایت کو سامنے رکھ کر کہا ہے کہ ایسی صورت میں ورقہ تمام مسلمان مردوں میں سب سے پہلے مسلمان ہیں، اور ابن مندہ نے تو ورقہ کا شمار بھی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کیا ہے۔ ۱۲

دونوں قسم کے احکام موجود ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں صرف جمال ہی جمال ہے ان کی شریعت میں جہاد نہیں، انکی تعلیمات میں منقول ہے کہ اگر کوئی تمہارے ایک رخسار پر مارے تو دوسرا رخسار بھی جھکا دو تا کہ وہ اس پر بھی مار سکے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک جلالی پیغمبر تھے، جب غصہ کی کیفیت ہوتی تو بدن کے بال کھڑے ہو کر کمر سے باہر نکل آتے تھے، جلال کا یہ عالم تھا کہ ٹوپی میں آگ لگ جاتی تھی، قبض روح کے وقت عزرائیلؑ سے ذرا بے قاعدگی ہو گئی تو اتنی زور سے تھپڑ رسید کیا کہ ان کی آنکھ جاتی رہی۔ غرض کہ یہاں جلال و جمال اور احکام و مواہید سب کچھ ہیں آنحضور ﷺ کی وحی بھی اسی شان کی ہے، اسلئے جب آپ کے سامنے ورقہ نے تصدیق فرمائی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اسم گرامی منتخب کیا، دوسری وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی نبوت پر سب کا اتفاق ہے اور حضرت عیسیٰ کی نبوت کے یہود منکر ہیں نیز یہ کہ بعض حضرات انجیل کو توراہ کا تتمہ کہتے ہیں گوانجیل کے بعض احکام توراہ کے لئے ناسخ بھی ہیں، اسلئے ورقہ نے ایسی چیز کو پیش فرمایا جس پر تمام بنی اسرائیل کا اتفاق رہا ہے، پھر ورقہ نے اطمینان خاطر کے لئے یہ کہا کہ کاش میں آپ کے ایام نبوت میں طاقتور ہوتا اور اس وقت تک زندہ رہتا جبکہ آپ کی قوم آپ کو نکالے گی تاکہ میں پوری قوت کے ساتھ آپ کی مدد کر سکتا، اس پر آنحضور ﷺ نے بہت حیرت کا اظہار فرمایا کہ کیا ایسا ہونے والا ہے؟ کیا یہی اہل مکہ مجھے یہاں سے نکلنے پر مجبور کریں گے؟ آپ کے تعجب کی وجہ یہ تھی کہ اول تو آپ خود ہی پوری قوم کے معتمد اور صاحب امانت تھے لوگوں کے معاملات کا فیصلہ بھی فرماتے تھے، پھر یہ کہ آپ کے جد امجد حضرت عبدالمطلب کا پورے مکہ پر ایک گہرا اور مخصوص اثر تھا، اور نہ صرف عبدالمطلب بلکہ پورا خاندان اہل مکہ کی نظر میں محترم تھا، ہر اہم معاملہ میں اسکی طرف رجوع ہوتا تھا اور اسکی اصل وجہ یہ تھی کہ حضرت عبدالمطلب نے خواب میں دیکھا کہ یہاں میرا مزہم ہے جو ابھی مٹی کے دامن میں چھپا ہوا ہے لیکن اس کے کھودنے کا شرف تم ہی کو حاصل ہوگا انہوں نے دریافت کیا کہ یہ پتہ کیسے ہوگا کہ کونواں فلاں مقام پر تھا، بتلایا گیا کہ جہاں صبح کو کوا چوچ مارتا ہوا ملے بس کونواں اسی جگہ ہے۔ آپ نے نشان کے مطابق کونواں کھودنا شروع کیا تو مکہ کے دوسرے لوگ آڑے آگئے، اور یہ کہا کہ ہم کھودنے نہیں دیں گے، کیا آپ ہمارے مقابلے پر ایک اور فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہیں، اس وقت تو عبدالمطلب رک گئے لیکن اس مخالفت سے عزم اور مصمم ہو گیا، چنانچہ نکاح کے ذریعہ بڑے خاندانوں سے رشتے قائم کئے اور جب اس رشتہ داری اور اولاد سے ایک ناقابل شکست قوت جمع ہو گئی تو کھدائی کا کام شروع کرایا۔ اس وقت کسی نے مزاحمت نہیں کی، اس تمام عزت و قوت اور اہل مکہ کے اعتماد کے باعث آپ نے ورقہ کی بات پر حیرت و استعجاب کا اظہار فرمایا تھا، جس کا جواب ورقہ نے دیدیا کہ آپ جس قسم کی دعوت لیکراٹھے ہیں اس طریقہ کی دعوت والے ہر انسان کا یہی انجام ہوا ہے، لیکن اگر یہ

انجام میری زندگی ہی میں تاریخ نے دکھلایا تو میں یقیناً مدد کروں گا، مگر تھوڑے ہی دنوں کے بعد ورقہ کا انتقال ہو گیا اور ادھر وحی کا سلسلہ موقوف ہو گیا، مسند احمد میں بروایت شععی تصریح موجود ہے کہ سلسلہ وحی تین سال تک موقوف رہا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسکی مدت صرف چھ ماہ ہے لیکن ہمارا اعتقاد مسند احمد کی روایت پر ہے، اس فترتہ میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تو نہیں آئے لیکن کہتے ہیں کہ حضرت اسرافیلؑ ساتھ رہے، یعنی جب پریشانی زیادہ ہوتی تو حضرت اسرافیلؑ کی زبان سے کوئی کلمہ کان میں ڈال دیا جاتا، ان ایام میں پیغمبرؐ اس قدر پریشان رہتے کہ کبھی تو پہاڑ سے گرنے کا بھی ارادہ فرمالتے، لیکن جب ایسا ارادہ فرماتے تو آواز آتی کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ انک لنبی حقا اس آواز کے اثر سے پیغمبرؐ کو سکون ہو جاتا اور ارادہ ختم فرمادیتے اور اس پریشانی کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب اول پیغمبر علیہ السلام پر وحی کا نزول ہوا تو آپ کو شدید پریشانی رہی، اور آپ اس کا تحمل بھی بمشکل کر پائے، اس وحی سے آشنا کرنے کیلئے مزید تشویق کی ضرورت تھی، اور شوق و رغبت کیلئے تربیت درکار تھی تاکہ آپ اس کی اصل قیمت سے باخبر ہو جائیں، اسلئے یہ اضطرابی کیفیات آپ پر طاری کیجاتی تھیں، اضطراب و محبت کا انجام ہی دیوانگی ہے، اگر انسان کو کسی سے محبت ہو جائے تو پہلے مطلوب کی تلاش میں آبادیوں کا طواف کرتا ہے اور جب آبادی سے مایوسی ہو جاتی ہے تو ویرانوں کا رخ کرتا ہے اور جب ویرانے بھی سکون بخش نہیں ہو سکتے تو انسان کو موت زندگی سے زیادہ مرغوب ہو جاتی ہے، گویا جب اس عالم کے خشک وتر میں اس کی تلاش بے سود رہی ہے تو کسی دوسرے عالم میں اسے تلاش کرنا بہتر ہوگا اور پیغمبر چونکہ محمود العاقبہ ہوتا ہے، اسلئے یہ تصور بھی گناہ ہے، کہ وہ پہاڑ سے گرنے کے باعث انجام کار کے اعتبار سے ناکام ہو جائے پیغمبر علیہ السلام کی یہ کیفیت نہایت شدید تھی، اور اس کی اصل یہ ہے کہ سلوک و تصوف کے مراحل میں ایک مرحلہ قبض کا آتا ہے اور تقریباً ہر سالک کو اس سے گزرنا پڑتا ہے جس سے نکلنے کے لئے ہر شخص کی اپنی کوشش کارگر نہیں ہو جاتی، بلکہ اس کے لئے شیخ کامل کی توجہات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہ قاعدہ ہے کہ قبض جس درجہ کا ہوتا ہے اسی درجہ کا بسط بھی ہوتا ہے، اس منزل قبض پر کبھی سالک واصل بحق بھی ہو جاتا ہے، آنحضرت ﷺ تین سال تک اسی منزل پر رہے اور آپ کی جلالت شان کے مناسب ہی قبض ہونا چاہئے اسی لئے جب بسط ہوا تو اس درجہ کا ہوا کہ تتابع الوحي وحی پے درپے آنے لگی، آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ میں جا رہا تھا کہ اچانک آسمان سے ایک آواز میرے کانوں میں آئی تو لرزہ طاری ہو گیا اس مرتبہ بھی آپ خوف زدہ ہوئے اور گھر واپس ہو کر فرمایا مجھے کبل اڑھا دو، اسکے بعد جبرئیل علیہ السلام وحی لائے۔

سیرۃ ابن اسحاق میں ورقہ کے متعلق آتا ہے کہ ان ورقہ کان یمر ببلال وهو بعد ب درقہ حضرت بلال کے پاس سے اس حال میں گذرتے تھے کہ ان پر عتاب نازل کیا جاتا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ورقہ زمانہ دعوت تک حیات رہے، لیکن وہ روایت سیرۃ ابن اسحاق کی ہے، اور یہ جامع صحیح کی، اسلئے اس صحیح روایت کو ترجیح دی جائیگی، ہاں اگر سیرۃ کی روایت کو صحیح تسلیم کر لیں تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہاں راوی لم ینشب کے الفاظ اپنے علم کے مطابق استعمال کر رہا ہے، یعنی اس کو ورقہ کے متعلق اس کے علاوہ اور کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ ۱۲۔

تشریح آیات

ارشاد ہے **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ** اے بالاپوش کھڑے ہو جائیے اور خداوند قدوس نے آپ کو جس کام کیلئے پیدا کیا ہے اس میں لگ جائیے، تین سال کے بعد یہ پہلا حکم ملا ہے اسوقت آپ مکمل اوڑھے ہوئے تھے **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ** فرمایا گیا، مدثر دثار سے ہے، بالائی کپڑے کو کہتے ہیں، یہ شعار کا مقابل ہے اور شعار اس کپڑے کو کہتے ہیں جو شعر بدن سے ملا ہوا ہو، انذار کسی کام کے برے انجام سے ڈرانے کا نام ہے، نبی کے دو کام ہوتے ہیں، ایک تبشیر اور ایک انذار، نبی مومنین کیلئے تبشیر کا کام انجام دیتا ہے اور کافروں کے لئے انذار کا، یہاں چونکہ تمام کافر ہی کافر ہیں اسلئے صرف صیغہ انذار کا استعمال فرمایا گیا، کہ آپ انہیں ان کے افعال بد سے ڈرائیے، **وَرَبِّكَ فَكَبِّرْ** اور اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے، یعنی یہ لوگ جو بتوں کی تعظیم و تکریم میں لگے ہوئے ہیں ان کے سامنے اپنے حقیقی پروردگار کی عظمت اور بڑائی بیان کیجئے، یہاں سے افتتاح صلوٰۃ میں تکبیر کا مسئلہ چلتا ہے، جسکا حاصل یہ ہے کہ اس عظیم عبادت کا آغاز خداوندی عظمت اور کبریائی کے ساتھ ہو، خواہ الفاظ اللہ اکبر کے ہوں، یا کچھ اور، مسئلہ اپنی جگہ پر رہا، نماز کا افتتاح ہمارے یہاں بھی اللہ اکبر سے واجب ہے **وَيَسَابِكُ فَطَهِّرْ** اور اپنے کپڑے پاک رکھیے، پھر جب کپڑے اور جگہ کی طہارت ضروری ہے تو مصلیٰ کے بدن کی طہارت بدرجہ اولیٰ ضروری ہوگی، حافظ نے فتح الباری میں بحوالہ مسند عبد بن حمید نقل کیا ہے کہ آیت کا نزول اس واقعہ سے متعلق ہے جس میں آپ کی پشت مبارک پر سلا جزور ڈال دیا گیا تھا اور کپڑے آلودہ ہو گئے تھے، اصل واقعہ خود صحیح میں آنے والا ہے کہ نبی اکرم ﷺ خانہ کعبہ میں نماز ادا فرما رہے تھے، ابو جہل اور دوسرے شریر لوگ موجود تھے، بٹے کیا گیا کہ آج فلاں خاندان میں اونٹ ذبح ہوا ہے، اسکا سلا یعنی بچہ دان لا کر آپ کی پشت مبارک پر رکھ دیا جائے، چنانچہ اشقی القوم اٹھا اور جب آپ سجدہ میں گئے تو آپ کی پشت پر رکھ دیا، حضرت فاطمہ بیٹی تھیں آئیں اور اس کو ہٹا دیا، اس وقت حکم آیا **وَيَسَابِكُ فَطَهِّرْ** اسوقت ترجمہ ہوگا کہ اپنے کپڑوں کو پاک کیجئے، **وَالرُّجُزَ فَاهْجُرْ** رجز دراصل عذاب کو کہتے ہیں لیکن بتوں کو بھی اسلئے رجز کہتے ہیں کہ وہ سبب عذاب ہوتے ہیں اسلئے **الرُّجُزَ فَاهْجُرْ** کے معنی معاذ اللہ یہ تو ہونہیں سکتے کہ بت پرستی کو چھوڑ دیجئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بت پرستی کو چھوڑے رکھیے، دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہجر قول باطل کو کہتے ہیں اسوقت ترجمہ یہ ہوگا کہ بت پرستی کا ابطال کیجئے، ایک معنی یہ ہیں کہ رجز سے مراد مکان رجز ہے یعنی ایسی جگہ نماز پڑھئے جہاں گندگی بالکل نہ ہو، اسطرح آیت میں طہارت ثياب و مکان دونوں کا تذکرہ آ گیا۔

متابعت کا فائدہ | تابعہ عبد اللہ بن یوسف۔ امام بخاری کی عادت ہے کہ جب متابعت پیش کرتے چلتے ہیں اور خصوصاً ان جگہوں پر جہاں تفرّد یا خفا کے باعث کوئی تردد پیدا ہو رہا ہو، مثلاً یہاں خشیت علی نفسی کے الفاظ نے بعض حضرات کو انکار حدیث تک پر آمادہ کر دیا ہے، امام بخاری یہاں متابع پیش فرما رہے ہیں، ابتداء سند سے جو متابعت ہوگی وہ تامہ کہلائے گی اور اس سے اوپر کہیں ہو وہ ناقصہ ہوگی، متابعت کی دو قسمیں ہیں

تامہ اور دوسری ناقصہ، تامہ یہ ہے کہ راوی نے جس شیخ سے روایت حاصل کی دوسرے نے بھی اسی سے روایت حاصل کی ہو اور پھر سلسلہ ایک ہو۔ اور ناقصہ یہ ہے کہ استاذ الاستاذ یا اور اوپر کے درجہ میں یہ بات پیش آئی ہو، یہاں تسابحہ کی ضمیر یحییٰ کی طرف لوٹ رہی ہے اسلئے یہاں متابعت تامہ ہوگئی کہ یحییٰ اور عبدالرحمن بن یوسف نے لیث سے روایت کی تخریج کی، یہ متابعت تامہ ہے۔

تابعہ ہلال عن الزہری۔ عن الزہری کا لفظ بتلا رہا ہے کہ زہری کے شاگرد کی متابعت ہو رہی ہے۔ اور ان کے شاگرد یہاں عقیل ہیں، اس لئے معنی یہ ہوئے کہ جس طرح عقیل نے زہری سے روایت کی ہے، اسی طرح ہلال بن رداد نے بھی زہری ہی سے روایت کی ہے، یہ متابعت ناقصہ ہے و قال یونس و معمر بوادرہ ان الفاظ کو بڑھا کر امام بخاری یہ بتانا چاہتے ہیں کہ متابعت میں الفاظ کا ایک ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ مضمون ایک ہونا چاہئے، ایک روایت میں یرجف فوادہ آیا ہے اور دوسری میں ترجف بوادرہ اس سے مضمون میں کوئی فرق نہیں آتا، متابعت کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ صحابی ایک ہو اگر صحابی ایک نہ رہے گا تو اس روایت کو شاہد کہیں گے متابع نہ کہیں گے۔

سب سے پہلی وحی | صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور محدثین رحمہم اللہ نے آپس میں اختلاف کیا ہے کہ اقرا وحی یا یسآیہا المدثر ہے یا پہلی وحی ہے یا یسآیہا المدثر، چنانچہ حضرت جابرؓ نے سورہ مدثر کو سب سے اول قرار دیا ہے لیکن تطبیق بہت آسان ہے کہ اقرا فترت سے قبل سب سے پہلی وحی ہے اور فترت کے بعد سب سے پہلی وحی یسآیہا المدثر ہے اور اگر کوئی یہی دعویٰ کرے کہ سب سے پہلی سورت ہی مدثر ہے تو کہا جاسکتا ہے یہ بھی صحیح ہے کیونکہ اقرا کی صرف پانچ آیتیں نازل ہوئی تھیں پوری سورت سب سے پہلے مدثر ہی نازل ہوئی ہے۔

حدیث و ترجمہ کا ارتباط | ترجمہ کے دورخ تھے ایک ظاہری اور ایک حقیقی، ظاہری تو یہ ہے کہ وحی کا آغاز کہاں سے ہوا۔ چنانچہ اس روایت سے معلوم ہو گیا کہ پہلے رویاء صالحہ دکھلائے جاتے تھے، اور پھر خلوت گزینی کی محبت دل میں بٹھادی گئی، اور آپ غار حرا میں خلوت گزینی فرمانے لگے یہ سب کے سب وحی کے مبادی تھے اور سچ یہ ہے کہ اسی روایت میں بڑی تفصیل کے ساتھ ابتداء وحی کے احوال ذکر کئے گئے ہیں۔

دوسرا مقصد حقیقی عظمت وحی اور اسکی عصمت کا اثبات ہے چنانچہ اس روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ وحی اس قدر باعظمت چیز ہے کہ جس کا تحمل پیغمبر علیہ السلام سے بھی بمشکل ہو پاتا تھا، ابتداء میں جو حالات پیش آئے انہیں تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ نیا نیا معاملہ ہے اور پیغمبر علیہ السلام کو ابھی اس کا تجربہ نہیں ہے لیکن یہاں تو ایسا نہیں ہے کہ صرف پہلی بار وہ کیفیت طاری ہوئی ہو، بلکہ نزول وحی کے ہر موقع پر ایسی ہی صورت حال پیش آئی نیز یہ کہ اگر وحی اس قدر عظیم الشان چیز نہ ہوتی تو موقوف ہونے پر پیغمبر علیہ السلام اسقدر مضطرب اور بے تاب نہ ہوتے، پیغمبر علیہ السلام کے اضطراب کی وجہ ہی یہ تھی کہ وہ کلام باری تھا جو اپنی عظمت اور لذت کے اعتبار سے پیغمبر علیہ السلام کے لئے وفور اشتیاق کا باعث بنا

رہا، لذت کا تقاضا ہے کہ ایک مرتبہ جو دولت حاصل ہوئی ہے وہ ہمیشہ قائم رہے اور عظمت کا تقاضا ہے کہ جب خداوند کریم نے کسی بندہ کو نوازا ہے تو وہ خود اپنی طاقت سے زیادہ ہی نظر آئے، لیکن جب بخشنے والے نے بخشا ہے تو اسے لیا جائے گا جو عنایت کر رہا ہے وہی تحمل کی توانائی بھی پیدا فرما دیگا۔

(۵) حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ أَخْبَرَنَا أَبُو عَوَّانَةَ قَالَ حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ أَبِي عَائِشَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: لَا تُحْرِكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُعَالِجُ مِنَ التَّنْزِيلِ شِدَّةً وَكَانَ مِمَّا يُحْرِكُ شَفْتَيْهِ فَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا فَمَا أُحْرِكُهُمَا لَكَ كَمَا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُحْرِكُهُمَا وَقَالَ سَعِيدُ أَنَا أُحْرِكُهُمَا كَمَا رَأَيْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا يُحْرِكُهُمَا فَحَرَّكَ شَفْتَيْهِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى لَا تُحْرِكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ قَالَ جَمْعُهُ لَكَ صَدْرَكَ وَتَقْرَأَهُ فَإِذَا قَرَأَهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ، قَالَ فَاسْتَمِعَ لَهُ وَأَنْصِتْ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (قيامہ: ۱۶، ۱۹) ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا أَنْ تَقْرَأَهُ فَكَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَعْدَ ذَلِكَ إِذَا آتَاهُ جِبْرِيلُ اسْتَمَعَ فَإِذَا انْطَلَقَ جِبْرِيلُ قَرَأَهُ النَّبِيُّ ﷺ كَمَا قَرَأَهُ.

(آئندہ: ۴۹۲۷، ۴۹۲۸، ۴۹۲۹، ۵۰۴۴، ۷۵۲۴)

ترجمہ | موسیٰ بن اسمعیل نے حدیث بیان کی، فرمایا کہ ہمیں ابو عوانہ نے خبر دی کہ ان سے موسیٰ بن ابی عائشہ نے حدیث بیان کی کہ ان سے سعید بن جبیر نے حضرت ابن عباسؓ سے باری تعالیٰ کے قول لَا تُحْرِكُ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ کے بارے میں یہ حدیث بیان فرمائی کہ رسول اکرم ﷺ وحی کے نزول سے سخت مشقت برداشت فرماتے تھے اور آپ اکثر لبہائے مبارک کو ہلایا کرتے تھے، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ میں تمہیں اسی طرح ہونٹ ہلا کر دکھلاتا ہوں جیسا کہ رسول اکرم ﷺ ہلایا کرتے تھے اور سعید نے فرمایا کہ میں بھی ان کو ہلا کر دکھلاتا ہوں جیسا کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ کو ہلاتے دیکھا ہے پھر انہوں نے اپنے دونوں ہونٹوں کو حرکت دی، چنانچہ باری تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی کہ اے محمد! آپ جلدی کرنے کے لئے قرآن کریم کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے، اسکو جمع کرنا اور پڑھو ادینا ہمارا کام ہے۔ فرمایا آپ کے سینے میں اسے جمع کر دینا اور جب آپ چاہیں اس وقت تلاوت کرادینا پھر جب ہم اس کو پڑھیں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے، فرمایا بغور سماعت فرمائیے اور خاموش رہیے، پھر اس کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے، ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اس کے بعد جب بھی جبریل آتے آپ بغور سماعت فرماتے اور جب جبریل تشریف لیجاتے تو آپ اسی طرح قرأت فرماتے جس طرح جبریل نے پڑھا تھا۔

تشریح حدیث | حضرت سعید بن جبیر رئیس المفسرین حضرت ابن عباسؓ سے آیت لا تحرك به لسانك کی تفسیر نقل فرما رہے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ آپ جلدی کے خیال سے زبان اور ہونٹوں کو زیادہ حرکت نہ دیں، صورت یہ تھی کہ جب آیات قرآنی کا نزول ہوتا تھا تو ثقل کے اثر سے آپ پر غیر معمولی تعب و مشقت طاری ہو جاتی جس کے کئی سبب ہو سکتے تھے، اول تو کلام ہی انتہائی باوزن ہے، صفت رب العالمین ہے خود قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

ہم تم پر بھاری کلام ڈالنے کو ہیں

سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا

دوسری وجہ یہ کہ آپ کی کوشش یہ تھی کہ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ ساتھ پڑھتے رہیں کہیں ایسا نہ ہو جائے کہ جبرئیل تیزی سے آگے نکل جائیں اور میں پچھلے ہی کلام کے خیال میں رہوں اور اس کا کچھ حصہ رہ جائے، نیز یہ کہ محبوب محبت کو اپنی صفت عطا فرما رہا ہے، محبت اس سلسلہ میں جس قدر بھی اشتیاق اور فوری شوق کا مظاہرہ کرے کم ہے، اس کا تقاضا ہے کہ ادھر تکلم شروع ہو اور ادھر ادا ہونا شروع ہو جائے اسلئے آپ جبرئیل کے ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے ہیں اور سمجھنے کی کوشش بھی فرماتے ہیں لیکن جبرئیل علیہ السلام کی ساتھ ساتھ پڑھنا آسان نہیں ہے جبرئیل کا آگہ قراءت ملکی ہے۔ اور آپ کا بشری اور ظاہر ہے کہ بشری قوت ملکی قوت کے برابر نہیں آسکتی، ساتھ ہی ایک دقت یہ بھی ہے کہ آپ معانی پر بھی غور فرما رہے ہیں، اس لئے تین طرح کی مشقتیں ہو گئیں ایک تو یہ کہ آپ سن رہے ہیں، زبان مبارک کو جلدی حرکت دے رہے ہیں، اور پھر معانی بھی محفوظ فرما رہے ہیں، اسلئے ان تین کاموں کے بیک وقت انجام دینے سے مشقت کا پیش آنا ایک لازمی بات تھی گویا آپ فرط اشتیاق میں اور حفاظت کلام کے باعث یہ مشقتیں برداشت فرماتے تھے۔

ایک اشکال اور اس کا حل | آیت شریفہ میں حرکت کے ساتھ زبان کا ذکر آیا ہے اور حدیث شریفہ میں زبان کا ذکر نہیں ہے بلکہ یہ ہونٹ کے متعلق فرمایا گیا ہے اور مناسب یہ تھا کہ آیت کی مناسبت سے حدیث میں بھی زبان ہی کا ذکر فرمایا جاتا لیکن یہاں راوی نے اختصار کیا ہے، کتاب التفسیر میں جریر نے موسیٰ بن ابی عائشہ سے ہونٹوں کے ساتھ زبان کا بھی ذکر فرمایا ہے، الفاظ یہ ہیں:

جب جبرئیل علیہ السلام وحی لیکر آتے تو رسول اکرم

كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا نَزَلَ

ﷺ بار بار اپنی زبان اور لہجائے مبارک کو حرکت

جِبْرِئِيلُ بِالْوَحْيِ فَكَانَ مِمَّا يَحْرُكُ

دیتے تھے۔

بِلِسَانِهِ وَشَفْتَيْهِ

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو رئیس المفسرین اس لئے کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے سینہ مبارک سے ملا کر یہ دعا فرمائی تھی، اللہم علمہ علم الکتاب اے اللہ ابن عباس کو علم کتاب عطا فرما دے، اسی بناء پر کتاب اللہ کی تفسیر کے سلسلہ میں جو روایات حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بطریق صحیح ثابت ہیں انہیں دوسرے حضرات کی روایات پر ترجیح دی جاتی ہے۔ ۱۲

نیز بیان کا ایک یہ بھی اصول ہے کہ کلام میں ایسے جزء کا ذکر کر دیا جائے جس سے غیر مذکور جزء کی طرف ذہن آسانی منتقل ہو جائے جیسا کہ رب المشارق فرمایا گیا، اس کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ وہ معبود عالم مغارب کا رب نہیں ہے بلکہ صرف مشارق فرما کر تمام جہات عالم کی طرف اشارہ کر دیا گیا، جیسا کہ قرآن کریم میں سَرَّابِئِلَ تَفِيكُمْ الْحَرُّ (النحل آیت ۸۱) تمہارے لئے وہ پیرا ہن بنائے جو گرمی سے تمہاری حفاظت کرتے ہیں، فرمایا گیا ہے اس کا بھی یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ وہ لباس سردی سے حفاظت نہیں کرتا، بلکہ ایک ایسی چیز کا ذکر کر دیا جس سے دوسری طرف بھی اشارہ ہو گیا، لیکن ہمیں ان تاویلات کی اس لئے ضرورت نہیں ہے کہ کتاب التفسیر میں صریح روایت موجود ہے، وکان مما یحروک شفتیہ، اور آپ بار بار لبہائے مبارک کو حرکت دیا کرتے تھے، یہ اکثر کا ترجمہ مما کے لفظ سے نکل رہا ہے جو من اور ما سے مرکب ہے اور جب ما، من کے بعد متصل آجائے تو اس کے معنی ربما کے ہوتے ہیں جیسا کہ حماسہ کا شعر ہے۔

وَأَنَا لَمِمَّا نَضْرِبُ الْكَبْشَ ضَرْبَةً
عَلَى رَأْسِهِ يَلْقَى اللِّسَانَ مِنَ الْفَمِ

ہم بسا اوقات سردار کے سر پر تلوار مارتے ہیں، حضرت سمرہ بن جندب سے حدیث روایا میں مذکور ہے: کان مما یقول لا صحابہ من رأی منکم رؤیا، آپ بسا اوقات (نماز فجر کے بعد) صحابہ کرام سے فرماتے تم میں سے کس نے خواب دیکھا، براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

اذا صلینا خلف النبی صلی
اللہ علیہ وسلم احببنا ان
نکون مما عن یمینہ
جب ہم بنی اکرم ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے تو ہماری
خواہش ہوتی کہ ہم اکثر ان لوگوں میں ہوں جو آپ
کی دائیں جانب کھڑے ہیں۔

ان تمام جگہوں میں مما ربما کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، اس لئے یہاں بھی مما کو کثرت ہی کے معنی میں لینے بالخصوص جبکہ قرینہ بھی کثرت ہی کا ہے، قال ابن عباس رضی اللہ عنہما انا احمر کھما لك کما کان رسول اللہ ﷺ یحمر کھما ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہارے سامنے اسی طرح ہونٹوں کو حرکت دیتا ہوں جس طرح رسول اکرم ﷺ حرکت دیا کرتے تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما یہ نہیں فرماتے کہ جس طرح میں نے رسول اکرم ﷺ کو لبہائے مبارک ہلاتے دیکھا ہے، جبکہ سعید حضرت ابن عباس کے ہونٹوں کو حرکت دینے کے سلسلہ میں اپنا مشاہدہ نقل فرما رہے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن عباس نے خود آنحضرت ﷺ کو تحریک شفتین فرماتے نہیں دیکھا ہے، کیونکہ سورہ قیامہ بالاتفاق کی ہے، اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہجرت سے صرف تین سال قبل پیدا ہوئے ہیں اس لئے بظاہر یہ حضرت ابن عباس کی ولادت سے قبل کا واقعہ ہے، وہ آیت کے

اس خواہش کی اصل وجہ یہ تھی کہ جب آپ کی توجہ نماز کے اختتام پر ہو تو ابتداء ہم سے ہو۔

نزول کے وقت آنحضور ﷺ کو نہیں دیکھ سکتے، اور حافظ فرماتے ہیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا ”باسب بدء الوحي“ میں لانا بھی یہی بتلاتا ہے کہ یہ آیات ابتداء وحی کی ہیں اسلئے حضرت ابن عباسؓ یہ نہیں فرماتے کہ میں نے رسول ﷺ کو دیکھا ہے اور سعید بن جبیر اپنا مشاہدہ نقل فرماتے ہیں کیونکہ انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو تحریک شفتین فرماتے دیکھا تھا۔

لیکن شعسی کے طریق سے طبری نے یہ نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو ہونٹ ہلاتے دیکھا ہے، اس صورت میں ضروری نہیں کہ یہ ابتدائی واقعہ ہو بلکہ کسی بھی وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما حاضر ہوئے اور آنحضور ﷺ کی زبان سے اس آیت کی تفسیر سنی، اور اس وقت آپ نے لبہائے مبارک کو حرکت دیکر دکھلایا، پھر ابن عباسؓ نے سعید سے یہ روایت بیان فرماتے وقت اپنے ہونٹوں کو حرکت دی، اور سعید رحمہ اللہ نے اپنے شاگردوں کے سامنے نقل کرتے وقت اپنے ہونٹوں کو ہلایا، اسی وجہ سے اس حدیث کا نام ”مسلسل تحریک الشفتین“ ہو گیا۔

فانزل اللہ تعالیٰ لاتحرك به لسانك لتعجل به ان علينا جمعه وقرانه قال جمعه لك صدرك وتقرءه فاذا قرانه فاتبع قرانه، یعنی آپ چاہتے کہ یہ وحی جبرئیل علیہ السلام کے جانے سے قبل ہی آپ کو محفوظ ہو جائے، اسی لئے آپ جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ تحریک شفتین فرماتے ہیں جس سے آپ کو غیر معمولی تعب پیش آتا ہے، لیکن آپ کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ ہم آپ کو اطمینان دلاتے ہیں کہ یہ ساری ذمہ داری ہم نے اپنے اوپر لے لی ہے، جب ہمارا نمائندہ آپ کے سامنے پڑھے تو آپ خاموشی سے سنتے رہیں اسکی حفاظت ہمارے ذمہ ہے، اور نہ صرف حفاظت بلکہ ہم آپ کی زبان سے ادا بھی کرادیں گے اور مطالب و معانی، وجوہ و علل سب کچھ بیان کرادیں گے۔ آپ کا تو عمل صرف فاتبع قرانه ہونا چاہئے، آپ کو استماع و انصات کرنا چاہئے، استماع تو کانوں کا فعل ہے اور انصات کے متعلق حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آنکھوں سے ہوتا ہے یعنی جب استاد پڑھائے یا مقرر تقریر کرے تو سامعین کو چاہئے کہ مقرر کے چہرے پر نظر جمائے رکھیں، اسلئے کہ لب و لہجہ کو مقصد کی ادائیگی اور مفہوم کی تفہیم میں بڑا دخل ہے اور لب و لہجہ کو وہی شخص دیکھ سکتا ہے جس کی نگاہ استاذ کی طرف اٹھی ہوئی ہو۔ عظمت قرآن کا بھی یہی تقاضا ہے کہ نزول کے وقت ہم تن گوش ہو جائے، یہی ادب اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا وَأَنْصِتُوا میں ملحوظ ہے،

۱۔ حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ کی یہ بات محل نظر ہے، خصوصاً جبکہ ہمارے پاس اس کی کوئی دلیل بھی نہیں بلکہ بدء الوحي میں لانے کی اور بھی وجہ ہو سکتی ہے، جیسا کہ عنقریب معلوم ہو جائیگا۔ ۱۲۔ آیت کریمہ کے الفاظ تو قرانا ہیں یعنی جب ہم پڑھیں، لیکن یہاں جبرائیل بطور نرجمان پڑھا رہے ہیں، معلم حقیقی باری تعالیٰ ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فاخلع نعلیک کی آواز درخت کے اندر سے آئی تھی حالانکہ وہاں بولنے والے درحقیقت باری تعالیٰ تھے۔ اسی طرح یہاں قرانا فرمایا کہ جب ہم پڑھیں، اور یہ پڑھنا جبرائیل علیہ السلام کی وساطت سے ہے۔ ۲۱۔

ادھر معلم کی شان یہ ہے کہ جب ہم پڑھانے والے ہیں تو محفوظ نہ رہنے یا سمجھ میں نہ آنے کا واہمہ بھی نہ گزرنا چاہئے، جب انسانوں میں وہ معلم نہایت کامیاب شمار ہوتا ہے جو اپنے خیالات کو سامع کے ذہن پر طاری کر دے تو خداوند قدوس کی بڑی قدرت ہے، یہاں اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ کی تفسیر میں ان تقرآہ فرمایا اور پھر ثم ان علينا بیانہ کی تفسیر میں بھی ان تقرآہ فرمایا گیا، اب اگر یہ راوی کا سہو نہیں ہے تو معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ قراءت دو ہیں، ایک بنفسہ اور ایک عند غیرہ، پہلی کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کے سینہ میں جمع کر دیں گے اور آپ پڑھ لیں گے اور جب دوبارہ ان علينا بیسانہ کے تحت اسے لائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ آپ دوسروں کے سامنے بھی اسے پڑھ دیں گے، اس پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ معانی و مطالب اور علل و حکم سب بیان فرمادیں گے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے کتاب التفسیر میں ثم ان علينا بیانہ کے ذیل میں ان تقرآہ کی جگہ ان تبینہ منقول ہے۔

ترجمہ سے ربط | ظاہر ترجمہ سے حدیث شریف کا یہ ربط ہے کہ اس میں حضرت ابن عباسؓ نے بتلایا کہ ابتداء وحی میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کیا عادت تھی، خواہ یہ ہدایت اولیں مراتب کی نہ ہو، بلکہ بعد ہی کی ہو لیکن اس آیت کے نزول سے قبل جب آپ کا یہ عمل تھا تو معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی ابتداء وحی میں یہ عمل ہوگا، مناسبت بہت گہری معلوم ہوتی ہے۔

اور دوسرا مقصد وحی کی عظمت و عصمت تھا، اس مقصد سے بھی یہ روایت ترجمہ سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہے، فرماتے ہیں کہ اگر اس وحی کا کسی انسان کو ذمہ دار بنایا جاتا تو نسیان کا بھی احتمال تھا اور غلطی کا بھی، لیکن انسان کو ذمہ دار ہی نہیں بنایا بلکہ حفظ، قراءت اور بیان معانی و مطالب کی ذمہ داری خود رب العالمین نے لی ہے بس اسی ذمہ داری سے وحی کی جلالت شان کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ خود رب دو عالم اس کی ذمہ داری لے رہا ہے، اسی بنا پر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ دین کے معاملہ میں وحی کے علاوہ کوئی دوسری چیز قابل اعتماد و لائق احتجاج نہیں ہو سکتی۔

آیت کریمہ کا ما قبل و ما بعد سے ربط | آیت کریمہ لا تحرك به لسانك لتعجل به میں یہ بات اشکال کا باعث ہے کہ یہ ما قبل و ما بعد سے مربوط نہیں ہے اس آیت کریمہ سے قبل قیامت کبریٰ کے احوال بیان ہو رہے ہیں۔

پوچھتا ہے کہ قیامت کا دن کب آئیگا سو جس وقت آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی اور چاند بے نور ہو جائے گا اور سورج اور چاند ایک حالت کے ہو جائیں گے، اس روز انسان کہے گا کہ اب کدھر بھاگوں، ہرگز نہیں، کہیں پناہ کی جگہ نہیں، اس دن صرف آپ ہی کے رب کے پاس ٹھکانا ہے

يَسْأَلُ أَيَّانَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَإِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ
وَحَسَفَ الْقَمَرُ وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ
يَقُولُ الْإِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ أَيْنَ الْمَفْرُكُ
لَا وَرَدَ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ الْمُسْتَقَرُّ
يُنَبِّئُ الْإِنْسَانَ يَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَأَخَّرَ بَل

الانسان على نفسه بصيرة ولو
اللقى معاذيرة (پ ۲۹ ر ۱۷)

اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا کیا ہوا جتلا دیگا بلکہ
انسان خود اپنی حالت پر خوب مطلع ہوگا گواپنے حیلے پیش لاوے
اور پھر اس کے بعد آیت لا تحرك به لسانك لتعجل به، کولایا گیا اور اس کے بعد پھر قیامت کے احوال
شروع فرمادیے جس میں آخر کی آیات میں قیامت صغریٰ کے احوال بھی لے لئے۔

كَلَّا بَلْ تُجِبُّونَ الْعَاجِلَةَ
وَتَذُرُونَ الْآخِرَةَ وَجُوهٌ يَوْمَئِذٍ
نَاصِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاطِرَةٌ وَوُجُوهٌ
يَوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ تَظُنُّ أَنْ يُفْعَلَ بِهَا
فَاقِرَةٌ كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ
وَقِيلَ مَنْ سَاقٍ وَظَنَّ أَنَّهُ
الْفِرَاقُ وَالتَّتَفَتِ الْمَسَاقُ
بِالْمَسَاقِ إِلَىٰ رَبِّكَ يَوْمَئِذٍ
الْمَسَاقُ . (پ ۲۹ ع ۱۷)

اے منکرو! ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور
آخرت کو چھوڑے بیٹھے ہو، بہت سے چہرے تو اس روز
بارونق ہوں گے اور اپنے پروردگار کی طرف دیکھتے ہوں گے
اور بہت سے چہرے اس روز بد رونق ہوں گے خیال کر رہے
ہوں گے کہ ان کے ساتھ کمر توڑنے والا معاملہ کیا جائیگا ہرگز ایسا
نہیں جب جان ہنسی تک پہنچ جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ کوئی
جھاڑنے والا بھی ہے، اور وہ یقین کر لیتا ہے کہ یہ مفارقت کا
وقت ہے اور ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ جاتی ہے اس
روز تیرے رب کی طرف جانا ہوتا ہے۔

ان دونوں آیات سے درمیان کی آیت ”لا تحرك به لسانك“ بظاہر مرتبط معلوم نہیں ہوتی، اور محققین کا
کہنا بھی یہی ہے کہ خداوند قدوس کے کلام میں ربط تلاش کرنا درست نہیں، گو انسان کے کلام میں تسلسل اور ہم آہنگی
ضروری ہے اسلئے کہ انسان کی عقل کا اندازہ ہی کلام کی باہمی مناسبت سے ہوتا ہے ورنہ بے ربط کلام تو دیوانہ کی بڑکھلاتا
ہے، لیکن کلام خداوندی کے بارے میں محققین یورپ اور اپنے اکابر کا فیصلہ بھی یہی ہے کہ اس میں حقیقی مناسبت کو تلاش
کرنا انسان کے بس کی بات نہیں ہاں اسکے کلام میں حکمتیں ضرور ہوتی ہیں مگر انسان کی حیلہ جو اور تلون آشنا طبیعت
اس وقت تک سکون پذیر اور مطمئن نہیں ہوتی جب تک اسے کلام میں یک رنگی اور ہم آہنگی کا یقین نہ ہو، پھر ارباب اصول
کے بیان کردہ اصول تطبیق پر اکتفا و انحصار نہیں بلکہ ان سے بھی مختلف، کچھ اسباب تلاش کئے جاسکتے ہیں اور یہ بھی ممکن
ہے کہ ہماری تلاش وہاں تک نہ پہنچ سکے لیکن انسان کی حیلہ ساز طبیعت اس اعتراف کم نہیں پر قانع نہیں ہوتی اس لئے
مناسبت کا تلاش کرنا بھی ایک اہم بات ہوگی۔

ان وجوہ کے پیش نظر ضروری ہے کہ اپنے مذاق کے مناسب کوئی مناسبت تلاش کی جائے جسکی ایک صورت نو
یہ ہو سکتی ہے کہ درمیان میں آیت لا تحرك به لسانك کے لانے کا اصل منشاء یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کو تحریک شفقتین

ایضاح صغریٰ انسان کی موت سے تعبیر ہے اذا مات الانسان قامت قیامتہ ۱۲

سے روکا جا رہا ہے، جس طرح استاذ کسی مضمون کا افادہ کرتے وقت کسی شاگرد کو بے توجہ یا کسی دوسرے کام میں مشغول دیکھے تو اسے متوجہ کرنے کیلئے استاذ کہتا ہے کہ کیا کر رہے ہو؟ اور درمیانی تنبیہ کے بعد پھر اپنا کلام شروع کر دیتا ہے بالکل اسی طرح نزول وحی کے وقت جب آپ کو حرکت شفتین کرتے دیکھا گیا تو تنبیہ کر دی گئی کہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں، یاد کرانے کی ذمہ داری تو ہم پر ہے، آپ اپنے کو مشقتوں میں کس لئے ڈال رہے ہیں، اب یہ لہہائے مبارک کو ہلانا خواہ یاد کرنے کی غرض سے ہو، یا لذت کی وجہ سے، بہر کیف درمیان میں ہونٹوں کا حرکت دینا درست نہ تھا اسلئے منع فرما دیا گیا کہ جب ہم پڑھا رہے ہیں تو آپ دوسرے خیال میں نہ پڑیں اور پھر اس درمیانی تنبیہ کے بعد اسی موضوع کو شروع فرما دیا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اس سورۃ میں قیامت کا ذکر تھا جسکے متعلق مشرکین بار بار تقاضا کرتے تھے کہ اگر قیامت آنے والی ہے تو آپ وقت بتلائیں، اسی بار بار کے تقاضے سے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی طبعی رجحان یہی تھا کہ اگر کچھ معلومات ہو جائیں تو ان بہانہ باز مشرکین کی زبان بند کر دی جائے لیکن حکمت خداوندی اس کی مقتضی تھی کہ علم نہ دیا جائے۔

لَا تَأْتِيكُمْ إِلَّا بَغْتَةً (پ ۱۳۷۹)

وہ تم پر اچانک آپڑے گی،

بظاہر ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کسی وقت بھی غافل نہ رہے بلکہ ہمہ وقت قیام قیامت سے خائف رہے لیکن جب قیامت کا ذکر آیا اور پوری تفصیل کے ساتھ آیا تو پیغمبر علیہ السلام کے طبعی رجحان نے کروٹ لی کہ اس تفصیل کے موقع پر شاید کچھ بتلا دیا جائے اسلئے پیغمبر علیہ السلام نے کچھ فرمانا چاہا تو فوراً پیش بندی کر دی گئی کہ دیکھئے جناب اس بارے میں لب کشائی کی اجازت نہیں دی جاسکتی، آپ کا کام تو صرف اس قدر ہے کہ جو ہم کہیں اسے سن لیجئے، رہا مشرکین کا معاملہ تو آپ کیوں اس کے درپے ہوتے ہیں کہ ان کی زبان بند ہو جائے، ان کی زبان کسی طور بند نہیں ہو سکتی اگر یہ بات حل ہو جائے گی تو اور کوئی دقیقہ نکال لیں گے، مثلاً یہی کہہ دیں گے کہ دکھلا بھی دیجئے اس لئے آپ اس سلسلہ میں خاموش رہیں، یہ سب ہمارے ذمہ ہے کہ ہم ہی تمام منتشر اجزائے عالم کو جمع کر دیں گے، اور مراتب اعمال کے اعتبار سے جزاء و سزا دیں گے آپ کا کام صرف اس قدر ہے کہ ہم جو کچھ بھی کہیں اس کی اتباع کریں پھر اسکی تفصیلات لانا و بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے لیکن اس صورت میں آیت گو ماقبل و ما بعد سے مرتبط ہو گئی مگر ترجمہ الباب سے اسکا کوئی ربط نہیں رہا ایسی صورت میں یعنی جبکہ سیاق کلام اور شان نزول میں بظاہر تعارض نظر آئے، علامہ کشمیری کے نزدیک سیاق کلام کی رعایت کی جائے گی اور حدیث سے مستنبط ہونے والے شان نزول کو اس کے مطابق بنانے کی کوشش کی جائے گی یعنی سیاق کلام کو مقصد اول اور شان نزول کو مقصد ثانوی قرار دیا جائے گا، مثلاً آیت کریمہ الطلاق مرتان فامسناک بمعروف او تسریح باحسان، فان طلقها فلا تحل له من بعد حتی تنکح زوجا غیرہ میں ابوداؤد کی

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تسریح باحسان تیسری طلاق ہے، ارشاد ہے:

ان رجلا سال عن الطلاق الثالث
فقال هو تسريح باحسان
ایک شخص نے تیسری طلاق کے بارے میں سوال کیا
فرمایا کہ یہ تسریح باحسان سے عبارت ہے۔

اب اگر تسریح باحسان کو تیسری طلاق مان لیا جائے تو پھر فان طلقها کو کیا کہیں گے یہ چوتھی طلاق تو ہو نہیں سکتی، اس لئے اسکے حل کی صورت یہ ہے کہ تسریح باحسان کی دو صورتیں کر دی جائیں، ایک تو یہ کہ دوسری طلاق سے رجوع نہیں کیا، یہ مراد اول ہے اور اسکی دوسری صورت یہ ہے کہ طلاق دیدی جائے، یہ مراد ثانوی ہے اور تسریح باحسان کے بعد جو فان طلقها آرہا ہے یہ اسی تسریح باحسان کی مراد ثانوی کی توضیح ہے، اب ابوداؤد کی حدیث سے تعارض نہیں رہا بلکہ تسریح باحسان ہی کی مراد ثانوی کو طلاق ثالث کہا گیا ہے، اسی طرح یہاں بھی مراد اول تو یہ ہے کہ آپ کو درمیان میں قیامت کے متعلق سوال کرنے سے روکا جا رہا ہے کہ آپ ایسا نہ کریں خداوند قدوس خود قیامت کی تفصیل کا ذمہ دار ہے لیکن ابن عباس کی تحریک شفتین کی توجیہ بھی اپنی جگہ مراد ثانوی کے درجہ میں ہے۔

مولانا عبدالرحمن صاحب امر وہوی علیہ الرحمہ کی رائے | حضرت مولانا عبدالرحمن علیہ الرحمہ اپنے دور میں تفسیر کے امام تھے میں نے ایک دن اس

آیت کی متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ پہلے سے ذکر آ رہا ہے

يَبْنَؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍ مَّا قَدَّمَ
وَ اٰخِرًا (پ ۲۹ ع ۱۷)
اس روز انسان کو اس کا سب اگلا پچھلا
کیا ہو اجتلا دیا جائیگا۔

مَا قَدَّمَ وہ چیزیں جو پیچھے ہٹانے کی تھیں اور انکو آگے بڑھا دیا گیا اور مَا اٰخِرًا جو چیزیں آگے بڑھانے کی تھیں اور ان کو پیچھے ہٹا دیا گیا اس لئے فرمایا گیا کہ قیامت میں انسان سے جو بھی مواخذہ ہوگا وہ ما قدم و ما اخر سے ہی متعلق ہوگا، خداوند قدوس نے عبادات اعتقادات اور حلال و حرام وغیرہ سب کے بارے میں ما قدم اور ما اخر کی تعلیم دی ہے اگر کوئی شخص خداوند قدوس کی تعلیم کے خلاف کرتا ہے خواہ وہ بھی اطاعت ہی ہو مگر قابل مواخذہ ہے دیکھئے اگر سجدہ رکوع سے قبل کر لیا تو گو یہ عبادت ہی ہے مگر خلاف ترتیب سے نماز برباد ہوگئی، اور فرض جوں کا توں سر پر قائم رہا، فرائض میں کوتاہی اور نوافل میں مواظبت کیوں قابل اعتراض قرار پائی، محض اس بنا پر کہ ما تقدم یعنی فرائض کو ما اخر بنا دیا، اور ما اخر یعنی نوافل کو ما قدم کر دیا، اگر میدان جہاد میں قتل و رزم آرائی کی ضرورت ہے اور کسی نے نماز تمام خشوع و خضوع شروع کر دی، گو یہ بھی عبادت ہے لیکن کہا جائے گا۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محراب مسجد پر
کہنا داں گر گئے سجدہ میں جب وقت قیام آیا

اسلئے ما قدم کو ما اخر، اور ہر ما اخر کو ما قدم کرنے کی صورت میں مواخذہ ہو سکتا ہے، اور یہ تو ان

صورتوں میں ہے جہاں دونوں ہی طاعت ہوں اور جہاں معاصی کا معاملہ ہو تو وہاں مطلوب چیز کو چھوڑ کر غیر مطلوب کا اختیار کرنا یقیناً قابل گرفت ہے، جب یہ بات ذہن نشیں ہوگئی تو اب سمجھئے کہ نزول قرآن کے وقت ما قدم کیا ہے ہمہ تن گوش ہو کر سننا اور خاموش رہنا اور ما اخر ہے اپنی قراءت کا اجراء، بلاشبہ یہ بھی ایک عمل خیر ہے لیکن تعلیم کے ساتھ یہ عمل مناسب نہ تھا، لہذا ارشاد ہوا لا تحرک (الایۃ) پھر اس درمیانی تنبیہ کے بعد اصل مقصد کی طرف عود فرمایا۔

كَأَبَلٍ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُونَ
الْآخِرَةَ (پ ۲۹ ع ۱۷)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو
اور آخرت کو چھوڑ بیٹھے ہو۔

یعنی کہ جیسا کہ آپ عجلت اختیار فرما رہے ہیں حالانکہ یہ بات بعد میں کر لینے کی ہے اس صورت میں آیت کریمہ سیاق و سباق اور ترجمہ الباب سے اچھی طرح مرتبط رہتی ہے۔

(۶) حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ أَخْبَرَنَا يُونُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ ح وَحَدَّثَنَا
بِشْرُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ أَخْبَرَنَا يُونُسُ وَمَعْمَرٌ نَخْوَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ
أَخْبَرَنِي عُبَيْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا قَالَ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ
ﷺ أَجْوَدَ النَّاسِ وَكَانَ أَجْوَدَ مَا يَكُونُ فِي رَمَضَانَ حِينَ يَلْقَاهُ جِبْرِيلُ وَكَانَ يَلْقَاهُ فِي
كُلِّ لَيْلَةٍ مِنْ رَمَضَانَ فَيُدَارِسُهُ الْقُرْآنَ فَلَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَجْوَدَ بِالْخَيْرِ مِنَ الرِّيحِ
الْمُرْسَلَةِ.

(آئندہ: ۱۹۰۲، ۳۲۲۰، ۳۵۵۲، ۲۹۹۷)

ترجمہ ہم سے عبدان نے یہ حدیث بیان کی کہ ہمیں عبد اللہ نے حضرت امام زہری سے بہ طریق یونس سے بتلایا ہے
ح اور بشر بن محمد نے حدیث بیان کی فرمایا کہ عبد اللہ نے حضرت امام زہری سے بطریق یونس و معمر یہ بیان
کیا کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے عبید اللہ بن عبد اللہ نے حضرت ابن عباسؓ سے یہ روایت سنائی کہ رسول اللہ ﷺ تمام
لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، اور آپ کی سخاوت رمضان میں اس وقت انتہا کو پہنچ جاتی تھی جب جبرئیل علیہ السلام
آپ سے ملاقات فرماتے تھے اور جبرئیل علیہ السلام رمضان شریف کی ہر رات میں آپ سے ملاقات فرماتے تھے اور
قرآن کریم کا دور کرتے تھے پس رسول اللہ ﷺ خیر کے معاملہ میں چلتی ہواؤں سے زیادہ تیز ہو جاتے تھے۔

تحویل کا مقصد یہ پہلا موقع ہے جہاں امام بخاری علیہ الرحمہ نے تحویل فرمائی ہے، اگر ایک حدیث کی مختلف
سندیں ہوں تو ہر سند کو بیان کرنے میں خواہ مخواہ طول ہو جاتا ہے اسلئے طوالت سے بچنے کے
لئے محدثین یہ صورت اختیار کرتے ہیں کہ ایک سند کو پہلے مشترک شیخ تک پہنچا دیتے ہیں اور لوٹ آتے ہیں اور پھر
دوسری اور تیسری سند کو بھی شیخ تک پہنچا دیتے ہیں اور فصل کیلئے دونوں سندوں کے درمیان ح لے آتے ہیں تاکہ دیکھنے
والے کو متعدد سندوں پر ایک ہی سند کا اشتباہ نہ ہو، گو دونوں سندوں کو ایک ساتھ جمع بھی کیا جاسکتا ہے مثلاً اسی سند میں،

حدثنا عبدان وبشر بن محمد قالا اخبرنا عبد الله قال اخبرنا يونس ومعمرو کہا جاسکتا ہے لیکن ایسا کرنے میں طول ہو جاتا ہے کیونکہ آگے اس تفصیل کے بغیر چارہ کار نہیں کہ قال عبدان اخبرنا يونس وقال بشر بن محمد اخبرنا يونس ومعمرو، اس لئے اختصار صرف اسی تحویل کے طریق میں ہے، امام مسلم بکثرت اور امام بخاری گا ہے گا ہے اس طریق تحویل کو ذکر فرماتے ہیں۔

یہاں عبدان کے بعد جو عبد اللہ ہیں وہ عبد اللہ بن مبارک ہیں اور عبدان جہاں بھی عبد اللہ سے روایت کرتے ہیں اس سے عبد اللہ بن مبارک ہی مراد ہوتے ہیں، پہلی سند میں عبد اللہ کے شیخ یونس ہیں، اور دوسری سند میں شیخ یونس و معمردونوں ہیں لیکن معمرو سے جو روایت پہنچی ہے اس کے الفاظ بعینہ یہ نہیں ہیں اس لئے معمرو نے نحو فرمایا ہے نحو اور مثل میں یہی فرق ہے کہ مثلہ میں الفاظ بھی دونوں کے ایک ہی ہوتے ہیں اور نحوہ میں صرف معنی کی موافقت ہوتی ہے، الفاظ بدلے ہوئے ہوتے ہیں۔

جو دو سخا کا فرق سخاوت مال کی تقسیم کا نام ہے اور جود کے معنی اعطاء ما ینبغی لمن ینبغی کے ہیں جو اپنے اندر بہت عموم رکھتا ہے یعنی یہ مال پر موقوف نہیں ہے بلکہ جو شے بھی جس کے لئے مناسب ہو اسے دیدی جائے، بے امتیاز اشیاء کی تقسیم کا نام جود نہیں ہے بلکہ فقیروں کو اموال تقسیم کرنا، تشنگان علوم کیلئے افاضہ علم کرنا، گم کردہ راہوں کیلئے ہدایت کرنا اور ہر کام اپنے محل میں کرنے کا نام جود ہے، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اچوتھے، آپ ہر شخص کو وہ چیز عطا فرماتے جو اس کے مناسب حال ہوتی، اسی لئے آپ کو انھی الناس نہیں کہا گیا کہ یہ صرف مال پر منحصر ہے اور آپ صاحب مال نہ تھے، آخری بیماری میں بھوک کے شدت کے باعث کروٹیں بدل رہے تھے، روشنی کیلئے چراغ میں تیل بھی نہ تھا، کہا جاسکتا ہے کہ جود ایک ملکہ ہے اور سخاوت اس کا اثر ہے اور پیغمبر علیہ السلام اپنے ملکات کے اعتبار سے تمام اہل کمال پر تفوق رکھتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ عوارض کی بنا پر بعض ملکات کا پورا پورا ظہور نہیں ہو سکا، اموال کی زیادہ تقسیم پر اسکا انحصار نہیں ہے بلکہ مدار غناء نفس ہے کہ اگر کوئی چیز مل گئی تو اسے ذخیرہ بنا کر نہیں رکھ لیا بلکہ فوراً مستحق کو عنایت فرما دیا، اور پیغمبر علیہ السلام کی یہ شان حد درجہ نمایاں ہے، بحرین سے ایک لاکھ درہم آئے، پیغمبر علیہ السلام کے حکم سے وہ رقم مسجد کے ایک کونہ میں ڈال دی گئی، اور نماز کے فوراً بعد آپ نے اسے تقسیم کرنا شروع کر دیا کسی نے عرض کیا حضور! آپ نے قرض کے لئے کچھ نہیں رکھا، فرمایا تم نے پہلے سے کیوں نہیں یاد دلایا، ایک مرتبہ عصر کی نماز ادا فرماتے ہی لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے حجرۃ السعادة میں تشریف لے گئے، سونے کا ایک ٹکڑا نکال کر لائے، لوگ اس سے متعجب تھے فرمایا کہ ایک شئی جو قابل تقسیم تھی گھر میں رہ گئی تھی، اور پیغمبر کے گھر میں ایسی چیز کار ہنا مناسب نہیں، ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے پر تشریف لے گئے، دیکھا کہ پھولدار گدا بچھا ہوا ہے، یہ دیکھ کر فوراً واپس تشریف لے آئے، حضرت عائشہ گھبرا گئیں دریافت کیا تو فرمایا کہ ”مالی وللدنیا“ ہمارا دنیا سے کیا

تعلق؟ عرض کیا: حضرت آپ ہی کے آرام کے لئے بنایا گیا تھا لیکن مباسی و لیل دنیا کہہ کر فوراً ہی تقسیم کرادیا، ایک عورت بڑے ہی اشتیاق کیساتھ ایک تہہ لیکر حاضر خدمت ہوئی، پیغمبر علیہ السلام نے انتہائی رغبت کے ساتھ قبول فرمایا اور استعمال فرما کر باہر تشریف لائے لیکن ایک صحابی نے اسے دیکھ کر چھوٹا اور کہا بہت اچھا ہے مجھے مل جائے، آپ فوراً مکان میں تشریف لے گئے اور پرانا تہہ پہنا اور اسے تہہ کر کے انہیں عنایت فرمادیا، لوگوں نے انہیں ملامت بھی کی کہ تم نے یہ درست نہیں کیا، تم نے خیال نہیں کیا کہ ایک عورت انتہائی رغبت کے ساتھ استعمال کے لئے لائی، اور آپ نے بھی بڑی قدر کے ساتھ اسے قبول فرمایا، لیکن تم نے فوراً ہی مانگ لیا، صحابی نے جواب دیا کہ میں نے اسلئے مانگا ہے کہ آپ کے بدن مبارک سے اسکا اتصال ہو چکا ہے اور میں اپنے کفن میں ایسے کپڑے کو رکھنا چاہتا ہوں جسے جسدا طہر سے نسبت ہو۔ غزوہ حنین کے موقع پر بہت سے اعرابیوں نے آگھیرا کہ کچھ عنایت فرمائیے، ہم آپ کا مال نہیں مانگتے، آپ کے باپ کا مال نہیں مانگتے، اللہ کا مانگتے ہیں، آپ نے ان کی اس گستاخانہ طرز گفتگو کا برا نہیں مانا اور برابر ان کی حاجت روائی فرماتے رہے، حتیٰ کہ آپ اژدحام کی وجہ سے پیچھے ہٹتے ہٹتے کیکر کے درخت میں الجھ گئے اور آپ کی چادر پھنس گئی، اور اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ اگر اس وادی کے خاردار درختوں کی مقدار میں میرے پاس مویشی ہوتے تو سب تقسیم کر دیتا۔ پھر مجھے بخیل یا بزدل نہ پاتے، آپ کی یہ شان تھی کہ بغیر سوال بھی اگر کسی کی ضرورت واضح ہو گئی تو اسے یا تو خود ہی پورا فرمادیتے تھے، اور اگر یہ نہ ہو سکتا تو اس کیلئے قرض لیتے اور اگر یہ بھی نہ ہو سکتا تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ترغیب دیتے کیا خوب شعر ہے

ما قال لا قط الا في تشهده
لو لا التشهد كانت لاءه نعم (فرزدق)

اسلئے آپ کا اجود ہونا مسلم ہے، اور یہ اسلئے کہ سب سے بڑا جود خداوند قدوس کا ہے جس کے متعلق پیغمبر نے فرمایا ہے تخلقوا باخلاق اللہ اور اس فضیلت تخلق باخلاق اللہ کو پیغمبر علیہ السلام ہی سب سے زیادہ حاصل بھی کر سکتے ہیں کیونکہ آپ باری تعالیٰ کے شیون و احوال سے سب سے زیادہ واقف ہیں، اور آپ کے بعد دوسرے انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ السلام ہیں اور پھر ان لوگوں کا مرتبہ ہے جو ان صفات کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

خداوند کریم کا جود کیا ہے؟ | سب کو معلوم ہے کہ دنیا کی تمام نعمتیں رب دو عالم کی عنایت کردہ ہیں، ارشاد ہے:

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ (پ ۱۳ ع ۱۳) تمہارے پاس جو نعمت ہے وہ اللہ

ہی کی طرف سے ہے اور پوری کائنات میں حضرت انسان پر کی گئی نعمتوں کا تو کچھ شمار ہی نہیں، وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا (پ ۱۳ ع ۱۷) اور اللہ کی نعمتیں اگر شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لاسکتے۔

انسان کی تربیت کے لئے جو تدریجی سامان مہیا فرمایا، اور ہر موقع پر مناسب حال سروسامان، نشوونما کا جو انتظام کیا وہ اس رب السموات والارضین کی ربوبیت کا کرشمہ ہے، اور ان تمام نعمتوں میں بھی ایسی عظیم الشان نعمت

سے نوازا جس کا مقابلہ دوسری نعمتیں نہیں کر سکتیں، اور وہ نعمت ہے خداوند کریم کا کلام جسکو رسول اکرم ﷺ کی معرفت تفہیم و تلاوت کے بھی قابل بنا دیا گیا ہے، ارشادِ باری ہے۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَكِّرٍ (پ ۸۷۷) اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کر دیا ہے، کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

یعنی خداوند قدوس کا کلام، کلامِ نفسی ہے جسے نہ ہم سمجھ سکتے ہیں اور نہ اس کی تلاوت کر سکتے ہیں، انتہاء یہ ہے کہ اس کا سننا بھی ہمارے بس کی بات نہیں، یہ عظیم المرتبت احسان بھی اسکی صفت جو وہی کے ماتحت ہے اسی کا جو وہ ہے کہ ہمیں خیر الامم بنایا اور دینِ مصطفوی سے نوازا، ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو علمی معجزات دئے گئے قرآن عزیز جو ہزار ہا معجزات پر مشتمل ہے، اسکی ہر تین آیات ایک مستقل معجزہ ہیں جس کی شان لا تنقصی عجائبہ الی یوم القیمة ثابت ہے، پھر اس نعمتِ عظیمہ کا آغاز روایات کی روشنی میں رمضان شریف میں ہوا ہے، یعنی بیت العزۃ سے سماء دنیا تک، قرآن اسی ماہ میں یک بارگی نازل ہوا ہے، اور پھر وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا، اور اس دنیا میں بھی اسی ماہ میں نزول شروع ہو گیا تھا چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ رمضان کی چوبیس اور دوسری بعض روایات میں ستائیس کو نزول قرآن کا یوم آغاز بتلایا گیا ہے، لیکن یہ روایات امام بخاری کی شرائط پر نہیں، اسلئے انہیں نہیں لاتے مگر صرف اشارہ سے کام لے رہے ہیں اسی وجہ سے رمضان المبارک اور کلامِ خداوندی میں ایک مخصوص مناسبت ہے ارشاد ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (پ ۷۷) ماہ رمضان ہے جس میں قرآن بھیجا گیا ہے۔

اور اس نعمت کے علاوہ اور بھی نعمتیں اس ماہ مبارک میں ظہور پذیر ہوئی ہیں، گو خداوند قدوس کا جو تو ہمہ وقت نمایاں رہتا ہے لیکن رمضان شریف میں اسکی کیفیت فزوں تر ہو جاتی ہے اس ماہ کی خصوصیت اور امتیاز کا اعلان اس طرح فرمایا گیا ہے کہ جنت کے دروازے کھلے ہیں اور جہنم کے بند، اے طالبِ خیر متوجہ ہو جا اور اے طالبِ شر باز آ جا۔

یعنی اے خیر تلاش کرنے والے اسبابِ شر ختم کر دئے گئے ہیں، رحمتِ خداوندی بارش کی طرح برس رہی ہے، اس ماہ میں شرکی تلاش اس لئے بے سود ہے کہ جہنم کے دروازے بند ہیں، اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ رمضان شریف کی ہر شب میں ہزار ہا انسان جہنم سے نجات پا کر جنت میں داخل کئے جاتے ہیں، پھر رمضان کی عبادت کو بڑی فضیلت بخشی گئی ہے، ایک نفل پڑھیں گے تو ستر نفلوں کا ثواب ہوگا، زہری فرماتے ہیں کہ رمضان کی ایک تسبیح غیر رمضان کی ستر تسبیحوں سے افضل ہے، اور اس ماہ مبارک کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ ایک مخصوص انعام روزہ کی شکل میں عنایت کیا گیا ہے یعنی یہ ایک ایسی عبادت ہے کہ جس کے اختیار کرنے سے بندہ خداوند قدوس سے قریب ہو جاتا ہے اخلاقِ خداوندی

حضرت علامہ کشمیری نے فرمایا کہ کلامِ خداوندی کا عطیہ فرشتوں کے پاس بھی نہیں ہے، وہ بھی اس فضیلت کے حصول کیلئے انسانوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوتے ہیں، تلاوت کی مجالس میں حاضری دیتے ہیں، حاضرین مسجد کے لئے دعائیں کرتے ہیں اور انسانوں کی آمین کیساتھ آمین کہتے ہیں۔ ۱۲

کی شان پیدا ہو جاتی ہے کہ کھانے پینے سے اور جماع سے دور ہو جاتا ہے، اس کی شان یہ بتلائی گئی ہے۔

الصوم لی وانا اجزی بہ او
اجزی بہ
روزہ میرے لئے ہے میں ہی اسکی جزا دوں گا یا اسکی
جزا میں ہی ہوں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

من قام رمضان ایماناً
واحساساً غفر له ما تقدم من
ذنبه
جو شخص رمضان میں ایمان یعنی یقین کیساتھ حسبہ اللہ
عبادت کرے تو اس کے سابق گناہ معاف کر دئے
جاتے ہیں۔

پھر اسی ماہ رمضان المبارک میں لیلة القدر عطاء کی گئی جو الف شہر سے بہتر ہے گویا ماہ شعبان کی پندرہویں شب
کے متعلق بھی فضائل بیان کئے گئے ہیں لیکن ان کا خلاصہ یہ ہے کہ ماہ شعبان سے رحمت خداوندی کا سلسلہ شروع
ہو جاتا ہے اور رمضان المبارک میں اس پر شباب آ جاتا ہے، اور رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں شباب اپنے کمال تک
پہنچ جاتا ہے، غرض خداوند قدوس نے اپنی شان جو دو کرم کے مطابق انسان کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے، اور اس
ماہ رمضان میں تو انعامات کا ایک بیکراں سلسلہ جاری فرما دیا ہے، جسکے شکر کیلئے انسان جتنا بھی عذر تقصیر کر سکے کم ہے۔

پیغمبر علیہ السلام کا جو وہ | جب خداوند قدوس کے جو دکا یہ عالم ہے تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بھی جو دو کرم
ہونا ایک لازمی چیز ہے، اسلئے کہ پیغمبر علیہ السلام خداوند قدوس کے اخلاق سے بہت زیادہ
واقف ہیں، خدا کی مرضیات کو خوب سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کونسا عمل کس وقت میں مزید تقرب و سعادت کا
باعث ہے، اسی لئے آپ سے ہر ہر موقع کے لئے دعائیں منقول ہیں، نیز یہ کہ پیغمبر علیہ السلام اخلاق خداوندی کو اپنی
زندگی پر طاری فرمانے کی سعی بھی فرماتے ہیں، چنانچہ یہ حدیث بتلاتی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام تمام لوگوں میں سب سے
زیادہ صاحب جو دو عطا تھے، اور جس طرح رب دو عالم رمضان میں احسانات و رحمت کی بارش برساتا ہے اسی طرح اس
ماہ مبارک میں پیغمبر علیہ السلام جو دو کرم زیادہ فرماتے تھے اور خصوصاً رمضان المبارک کی وہ پر نور راتیں جن میں جبرئیل
علیہ السلام آ کر آنحضور ﷺ کے ساتھ دو فرماتے تھے، اسکی وجہ یہ تھی کہ پیغمبر علیہ السلام جس قدر دو فرمائیں گے اسی
قدر علمی و عملی ترقیات ہوں گی اور کمالات میں جس قدر ارتقائی کیفیات جلوہ گر ہوں گی اسی قدر صفت جو دو بھی بڑھتی رہے
گی، اس لئے کہ آپ نے آپ نے کمالات کو کبھی اپنی ذات تک محدود نہیں فرمایا بلکہ ہمیشہ دوسروں کو بہرہ اندوز ہونے کا
موقعہ دیا، پیغمبر علیہ السلام کے جو دو بتلانے کیلئے چوتھی بات ریح مرسلا سے تشبیہ دے کر فرمایا کہ پیغمبر علیہ السلام کا جو دو
ان ہواؤں سے بھی زیادہ ہوتا جو لوگوں کی نفع رسانی کے لئے چھوڑی جاتی ہیں کیونکہ زندگی کا مدار ہی ہواؤں پر ہے لیکن
یہ ہوائیں سرتاسر خیر نہیں ہیں، اگر ایک وقفہ کیلئے بند ہو جائیں تو عرصہ حیات تنگ ہو جائے، ذرا ان میں تیزی آ جائے تو

شدید نقصانات پیش آجائیں، اور ان ہی ہواؤں کی صورت میں تو کبھی عذاب بھی آیا ہے لیکن پیغمبر علیہ السلام کے جود کا یہ معاملہ نہیں ہے، وہاں تو سرتاسر خیر ہی خیر ہے، آپ رحمۃ للعالمین ہیں، خود کوئی اپنے حق میں عذاب لازم کر لے تو دوسری بات ہے، لیکن پیغمبر علیہ السلام اسے پسند نہیں فرماتے۔

روایات میں آتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام سب سے زیادہ بہادر تھے، بڑے بڑے بہادر میدان جنگ میں آپ کے پیچھے پناہ لیتے تھے لیکن آپ نے پوری زندگی میں کسی کو قتل نہیں فرمایا، اسلئے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ خداوند قدوس کا غصہ اس شخص پر سب سے زیادہ ہے جو کسی نبی کو قتل کر دے اور دوسرے اس پر جو کسی نبی کے ہاتھ سے مارا جائے، اسلئے آپ نے کبھی کسی کا فر کو بھی قتل نہیں فرمایا، صرف ایک بار ایسی نوبت آئی کہ ایک شخص نے گھوڑا پال رکھا تھا کہ اس پر سوار ہو کر پیغمبر علیہ السلام کو قتل کروں گا، چنانچہ وہ مقابلہ پر آیا، پیغمبر علیہ السلام اپنا ہاتھ اٹھانا نہ چاہتے تھے، لیکن اس نے پیش قدمی کی تو پیغمبر علیہ السلام نے اپنا نیزہ اسکی طرف بڑھا دیا، اسکے معمولی خراش آگئی اور اس نے بے تحاشا بھاگنا شروع کیا، لوگوں نے کہا معمولی خراش ہی تو آئی ہے، بھاگتا کیوں ہے؟ اس نے جواب دیا، اگر یہ اشارہ بھی کر دیتے تو مر جاتا، پیغمبر علیہ السلام قتل کرنا نہ چاہتے تھے لیکن اس نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا، اور خود کردہ راعلا بے نیست۔

مدینہ تشریف لے جا رہے ہیں، دو قبروں سے گزر رہا، معذبین کی آواز سنی، اور تدارک کے بغیر شان رحمت کو گزرنا گوارا نہ ہوا، دو شاخیں منگوائیں یا ایک شاخ کے دو ٹکڑے فرمائے اور انہیں قبروں پر رکھ دیا اور فرمایا جب تک یہ خشک نہ ہوں گی عذاب میں تخفیف رہے گی، اس شان جود و کرم کے تحت پیغمبر علیہ السلام کے جود کو ان ہواؤں سے تشبیہ دی گئی ہے جو خیر کے لئے چھوڑی جاتی ہیں، روایت کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے جود کے چار درجے تھے، ایک تو آپ عام طور پر بھی تمام لوگوں میں سب سے زیادہ سخی تھے، اور رمضان میں یہ جود و کرم اور بڑھ جاتا تھا، اور پھر رمضان کی راتیں اور بھی حین یلقاہ جبرئیل اس شان جود و کرم میں زیادتی پیدا کر دیتی تھیں۔

حدیث اور ترجمہ کا ربط | حدیث ظاہر ترجمہ سے واضح طریقہ پر مرتب ہے، اسلئے کہ پچھلی سخی بن بکیر کی حدیث میں نزول وحی کا مکان بتلایا گیا تھا کہ وحی کا آغاز غار حراء میں ہوا تھا، یہاں آغاز وحی کا وقت بتلا رہے ہیں، یعنی جس طرح مکان وحی کے لئے غار حراء کو منتخب فرمایا گیا تھا کہ وہاں اس سے قبل بھی انبیائے کرام چلے کشتی کر چکے ہیں، اسی طرح نزول وحی کیلئے زمانہ اور وقت بھی وہی منتخب کیا گیا جس میں اس سے قبل بھی خداوند کریم کی نعمتیں نازل ہو چکی ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے یکم رمضان کو نازل ہوئے، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر توراہ چھ رمضان کو نازل کی گئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل تیرہ رمضان کو نازل ہوئی اور قرآن کریم چوبیس اور بعض حضرات کے نزدیک ستائیس رمضان کو نازل کیا گیا ہمارے نزدیک ستائیس رمضان کا قول راجح ہے

اتنا تو یقین کے ہاتھ کہا جاسکتا ہے کہ نزول رمضان شریف میں ہوا ہے قرآن کریم فرماتا ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (پ ۷۷ ع ۷)

ماہ رمضان ہے جس میں قرآن بھیجا گیا۔

لیکن اس انزال کے دو معنی لئے گئے ہیں، ایک بیت العزہ سے سماء دنیا پر نزول، دوسرا سماء دنیا سے پیغمبر علیہ السلام پر نزول، اور اس دوسرے معنی پر یہ قرینہ بھی ہے کہ اس میں جبرئیل علیہ السلام ہر سال دور فرماتے تھے جو سالانہ یادگار کی حیثیت رکھتا ہے، اور جب یہ سالانہ یادگار اور سال گرہ کا دن ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کا آغاز بھی اسی ماہ مبارک سے متعلق ہے، نیز دوسرے مقصد کے اعتبار سے جو عصمت و عظمت وحی کے عنوان سے قائم کیا گیا تھا یہ ربط ہے کہ کسی معمولی چیز کے لئے زمان و مکان متعین نہیں کیا جاتا بلکہ اس قسم کا اہتمام اہم ہی چیز کے لئے کیا جاتا ہے، اور یہ یہاں وحی کے لئے ایک مخصوص زمان و مکان کا تعین کیا گیا جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وحی کوئی معمولی چیز نہیں، پھر اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام ہر رمضان میں دور کراتے تھے، اور یہ دور اس لئے تھا کہ خداوند قدوس کا وعدہ ہے:

سَنُقَرِّئُكَ فَلَا تَنْسَى (پ ۳۰ ع ۱۲)

ہم آپ کو پڑھایا کریں گے پھر آپ نہیں بھولیں گے

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (پ ۱۲ ع ۱۴)

ہم نے قرآن نازل کیا ہے اور ہم اسکے محافظ ہیں۔

اسی حفاظت کے لئے خداوند قدوس نے اسکی تلاوت کی ترغیب دی، ایک ایک حرف پر دس نیکیوں کا ثواب عطا فرمایا، اور پھر اس پر اکتفاء نہیں، بلکہ رسول اللہ ﷺ سے مدارستہ کیلئے ہر سال جبرئیل علیہ السلام کو بھیجا، یہ مدارستہ کا طریق وہی طریق ہے جسے ہم دور کہتے ہیں، اسی سے ہدایت کا بھی طریق معلوم ہوتا ہے کیونکہ جبرئیل علیہ السلام اب پھر نازل شدہ قرآن کو دفعۃً لا رہے ہیں، اور یہ نزول دوسری بار ہو رہا ہے، چنانچہ بعض سورتوں کے متعلق آتا ہے کہ ان کا نزول دو مرتبہ ہوا، اور اگر علامہ سیوطی کی اس روایت کو لیں جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ رمضان شریف میں جبرئیل نازل شدہ اور غیر نازل شدہ قرآن لا کر دور کراتے تھے، اور رمضان شریف کے بعد غیر نازل شدہ حصہ آپ کے دل سے نکال لیا جاتا تھا تو غیر نازل شدہ حصہ میں تو ہدایت ظاہر ہے، اور نازل شدہ حصہ میں بھی ہدایت باری معنی ہے کہ نزول اب دفعۃً ہو رہا ہے اس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ترجمہ کے ظاہری اور حقیقی مقصد کے اعتبار سے یہ روایت پوری طرح منطبق ہے۔

(۷) حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ أَخْبَرَنِي

عُبَيْدُ اللَّهِ ابْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ أَبَا سُفْيَانَ بْنَ

حَرْبٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ مِرْقَلَ أَرْسَلَ إِلَيْهِ فِي رَكْبٍ مِّنْ قُرَيْشٍ وَكَانُوا تِجَارًا بِالشَّامِ فِي الْمُدَّةِ

الَّتِي كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَادَّ فِيهَا أَبَا سُفْيَانَ وَكُفَّارَ قُرَيْشٍ فَاتَّوَهُ وَهُمْ بِإِيلِيَاءِ فَدَعَاهُمْ فِي مَجْلِسِهِ وَحَوْلَهُ عُظَمَاءُ الرُّومِ ثُمَّ دَعَا تَرْجُمَانَهُ فَقَالَ أَيُّكُمْ أَقْرَبُ نَسَبًا بِهَذَا الرَّجُلِ الَّذِي يَزْعَمُ أَنَّهُ نَبِيٌّ قَالَ أَبُو سُفْيَانَ فَقُلْتُ أَنَا أَقْرَبُهُمْ نَسَبًا فَقَالَ أَذْنُوهُ مِنِّي وَقَرَّبُوا أَصْحَابَهُ فَاجْعَلُوهُمْ عِنْدَ ظَهْرِهِ ثُمَّ قَالَ لِتَرْجُمَانِهِ قُلْ لَهُمْ إِنِّي سَأَلْتُ هَذَا عَنِ هَذَا الرَّجُلِ فَإِنْ كَذَبَنِي فَكَذِّبُوهُ فَوَاللَّهِ لَوْ لَا الْحَيَاءُ مِنْ أَنْ يَأْتِرُوا عَلَيَّ كَذِبًا لَكَذَبْتُ عَلَيْهِ ثُمَّ كَانَ أَوَّلَ مَا سَأَلَنِي عَنْهُ أَنْ قَالَ كَيْفَ نَسَبُهُ فِيكُمْ قُلْتُ هُوَ فِينَا ذُو نَسَبٍ قَالَ فَهَلْ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ مِنْكُمْ أَحَدٌ قَطُّ قَبْلَهُ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ لَا قَالَ فَأَشْرَافَ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضَعَفَاءُ هُمْ قُلْتُ بَلْ ضَعَفَاءُ هُمْ قَالَ أَيْزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ قُلْتُ بَلْ يَزِيدُونَ قَالَ فَهَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ مِنْهُمْ سَخِطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ كُنْتُمْ تَتَّهَمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ قُلْتُ لَا قَالَ فَهَلْ يَغْدِرُ قُلْتُ لَا وَنَحْنُ مِنْهُ فِي مُدَّةٍ لَا نَدْرِي مَا هُوَ فَاعِلٌ فِيهَا قَالَ وَلَمْ تُمَكِّنِي كَلِمَةً أُدْخِلُ فِيهَا شَيْئًا غَيْرَ هَذِهِ الْكَلِمَةِ قَالَ فَهَلْ قَاتَلْتُمُوهُ قُلْتُ نَعَمْ قَالَ فَكَيْفَ كَانَ قِتَالِكُمْ إِيَّاهُ قُلْتُ الْحَرْبُ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُ سِجَالٌ يَنَالُ مِنَّا وَنَنَالُ مِنْهُ قَالَ مَاذَا يَأْمُرُكُمْ قُلْتُ يَقُولُ اعْبُدُوا اللَّهَ وَحْدَهُ لَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَاتْرُكُوا مَا يَقُولُ آبَاؤُكُمْ وَيَا مُرْنَا بِالصَّلَاةِ وَالصَّدَقِ وَالْعَفَافِ وَالصَّلَاةِ فَقَالَ لِلتَّرْجُمَانِ قُلْ لَهُ سَأَلْتُكَ عَنْ نَسَبِهِ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ فِيكُمْ ذُو نَسَبٍ وَكَذَلِكَ الرَّسُلُ تُبْعَثُ فِي نَسَبِ قَوْمِهَا وَسَأَلْتُكَ هَلْ قَالَ أَحَدٌ مِنْكُمْ هَذَا الْقَوْلَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا قُلْتُ لَوْ كَانَ أَحَدٌ قَالَ هَذَا الْقَوْلَ قَبْلَهُ لَقُلْتُ رَجُلٌ يَتَأَسَّى بِقَوْلِ قَبْلِهِ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقُلْتُ فَلَوْ كَانَ مِنْ آبَائِهِ مِنْ مَلِكٍ قُلْتُ رَجُلٌ يَطْلُبُ مُلْكَ أَبِيهِ وَسَأَلْتُكَ هَلْ كُنْتُمْ تَتَّهَمُونَهُ بِالْكَذِبِ قَبْلَ أَنْ يَقُولَ مَا قَالَ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا فَقَدْ أَعْرِفُ أَنَّهُ لَمْ يَكُنْ لِيَذَرَ الْكَذِبَ عَلَى النَّاسِ وَيَكْذِبَ عَلَى اللَّهِ وَسَأَلْتُكَ أَشْرَافَ النَّاسِ اتَّبَعُوهُ أَمْ ضَعَفَاءُ هُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّ ضَعَفَاءَ هُمْ اتَّبَعُوهُ وَهُمْ أَتْبَاعُ الرَّسُلِ وَسَأَلْتُكَ أَيْزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ فَذَكَرْتَ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ وَكَذَلِكَ أَمْرُ الْإِيمَانِ حَتَّى يَتِمَّ وَسَأَلْتُكَ أَيْرْتَدُّ أَحَدٌ سَخِطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا وَكَذَلِكَ الْإِيمَانُ حِينَ تَخَالِطُ بِشَاشَتِهِ الْقُلُوبَ وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَغْدِرُ فَذَكَرْتَ أَنْ لَا وَكَذَلِكَ الرَّسُلُ لَا تَغْدِرُ وَسَأَلْتُكَ بِمَا يَأْمُرُكُمْ فَذَكَرْتَ أَنَّهُ

يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَعْبُدُوا اللَّهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا وَيَنْهَاكُمْ عَنْ عِبَادَةِ الْأَوْثَانِ وَيَأْمُرُكُمْ
بِالصَّلَاةِ وَالصَّدَقِ وَالْعَقَابِ فَإِنْ كَانَ مَا تَقُولُ حَقًّا فَسَيَمْلِكُ مَوْضِعَ قَدَمِي هَاتَيْنِ وَقَدْ
كُنْتُ أَعْلَمُ أَنَّهُ خَارِجٌ وَلَمْ أَكُنْ أَظُنُّ أَنَّهُ مِنْكُمْ فَلَوَّائِي أَعْلَمُ إِلَيَّ أَخْلَصُ إِلَيْهِ لَتَجَسَّمْتُ
لِقَاءَهُ وَلَوْ كُنْتُ عِنْدَهُ لَفَسَلْتُ عَنْ قَدَمَيْهِ ثُمَّ دَعَا بِكِتَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ الَّذِي بَعَثَ بِهِ
مَعَ دِحْيَةَ الْكَلْبِيِّ إِلَى عَظِيمِ بَصْرِي فَدَفَعَهُ عَظِيمُ بَصْرِي إِلَى هِرَقْلَ فَقَرَأَهُ فَاذْفَاهُ بِسْمِ
اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ مِنْ مُحَمَّدٍ عَبْدِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ إِلَى هِرَقْلَ عَظِيمِ الرُّومِ سَلَامٌ عَلَيَّ مِنْ
اتَّبَعَ الْهُدَى أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أَدْعُوكَ بِدِعَايَةِ الْإِسْلَامِ أَسْلِمَ تَسْلِمَ يُوتِكَ اللَّهُ أَجْرَكَ مَرَّتَيْنِ
فَإِنْ تَوَلَّيْتَ فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْيَرِيسِيِّنَ وَيَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ
أَنْ لَا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا رِبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ
تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (آل عمران: ۶۴) قَالَ أَبُو سَفْيَانَ فَلَمَّا قَالَ مَا قَالَ وَفَرَغَ
مِنْ قِرَاءَةِ الْكِتَابِ كَثُرَ عِنْدَهُ الصَّخَبُ فَارْتَفَعَتِ الْأَصْوَاتُ وَأُخْرِجْنَا فَقُلْتُ لِأَصْحَابِي
حِينَ أُخْرِجْنَا لَقَدْ أَمَرَ أَمْرًا بِنِ أَبِي كَبْشَةَ إِنَّهُ يَخَافُهُ مَلِكُ بَنِي الْأَصْفَرِ فَمَا زِلْتُ مُوقِنًا أَنَّهُ
سَيُظْهِرُ حَتَّى أَدْخَلَ اللَّهُ عَلَيَّ الْإِسْلَامَ وَكَانَ ابْنُ النَّاطُورِ صَاحِبَ إِبِلِيَاءَ وَهِرَقْلُ سُقْفَ عَلِي
نَصَارِي الشَّامِ يُحَدِّثُ أَنَّ هِرَقْلَ حِينَ قَدِمَ إِبِلِيَاءَ أَصْبَحَ يَوْمًا حَيْثُ النَّفْسُ فَقَالَ بَعْضُ
بَطَارِقَتِهِ قَدْ اسْتَنْكَرْنَا هَيَاتَكَ قَالَ ابْنُ النَّاطُورِ وَكَانَ هِرَقْلُ حَزَاءً يَنْظُرُ فِي النُّجُومِ فَقَالَ لَهُمْ
حِينَ سَأَلُوهُ إِنِّي رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ حِينَ نَظَرْتُ فِي النُّجُومِ مَلِكَ الْخِتَانِ قَدْ ظَهَرَ فَمَنْ يَخْتَنُ مِنْ
هَذِهِ الْأُمَّةِ قَالُوا لَيْسَ يَخْتَنُ إِلَّا الْيَهُودُ فَلَا يَهْمُنُكَ شَأْنُهُمْ وَارْتَبْتُ إِلَيَّ مَدَائِنَ مُلْكِكَ
فَلْيَقْتُلُوا مَنْ فِيهِمْ مِنَ الْيَهُودِ فَبَيَّنَّا لَهُمْ عَلَى أَمْرِهِمْ أَنِّي هِرَقْلُ بَرَجُلٍ أَرْسَلَ بِهِ مَلِكُ غَسَّانَ
يُخْبِرُ عَنْ خَبَرِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَلَمَّا اسْتَخْبِرَهُ هِرَقْلُ قَالَ أَذْهَبُوا فَانظُرُوا أَمْخَتَنَ هُوَامَ
لَا فَنَظَرُوا إِلَيْهِ فَحَدَّثُوهُ أَنَّهُ مُخْتَنٌ وَسَأَلَهُ عَنِ الْعَرَبِ فَقَالَ هُمْ يَخْتَنُونَ فَقَالَ هِرَقْلُ
هَذَا مَلِكُ هَذِهِ الْأُمَّةِ قَدْ ظَهَرَ ثُمَّ كَتَبَ هِرَقْلُ إِلَى صَاحِبِ لَهُ بِرُومِيَّةَ وَكَانَ نَظِيرَهُ فِي
الْعِلْمِ وَسَارَ هِرَقْلُ إِلَى حِمصَ فَلَمَّ يَرِمُ حِمصَ حَتَّى آتَاهُ كِتَابٌ مِنْ صَاحِبِهِ يُوَالِقُ رَأَى
هِرَقْلَ عَلَيَّ خُرُوجَ النَّبِيِّ ﷺ وَأَنَّهُ نَبِيٌّ فَأَذِنَ هِرَقْلُ لِعُظَمَاءِ الرُّومِ فِي دَسْكَرَةِ لَهُ
بِحِمصَ ثُمَّ أَمَرَ بِأَبْوَابِهَا فَعُلِّقَتْ ثُمَّ أُطْلِعَ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ الرُّومِ هَلْ لَكُمْ فِي الْفَلَاحِ

وَالرُّشْدِوَانِ يَثْبُتُ مُلْكُكُمْ فَبَيَّعُوا هَذَا النَّبِيَّ فَحَاصُوا حَيْصَةَ حُمْرِ الْوَحْشِ إِلَى الْبُؤَابِ
فَرَجَدُوا هَاقِدًا غُلِقَتْ فَلَمَّا رَأَى هِرْقُلُ نَفَرَتَهُمْ وَأَيْسَ مِنَ الْإِيْمَانِ قَالَ رُدُّوهُمْ عَلَيَّ وَقَالَ النَّبِيُّ
قُلْتُ مَقَالَتِي إِنَّمَا اخْتَبَرْتُ بِهَا شِدَّةَ تَكْمٍ عَلَيَّ دِينِكُمْ فَقَدْ رَأَيْتُ فَسَجَدُوا لَهُ وَرَضُوا عَنْهُ فَكَانَ
ذَلِكَ آخِرَ شَأْنِ هِرْقُلٍ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ رَوَاهُ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ وَيُونُسُ وَمَعْمَرُ عَنِ الزُّهْرِيِّ.

(آئندہ: ۵۱، ۲۶۸۱، ۲۸۰۴، ۲۹۴۱، ۲۹۴۸، ۳۱۷۲، ۳۵۵۳، ۵۹۸۰، ۶۲۶۰، ۷۱۹۶، ۷۵۴۱)

ترجمہ | ابو الیمان حکم بن نافع نے ہم سے حدیث بیان کی، فرمایا کہ ہمیں شعبہ نے زہری سے روایت سنائی کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے عبداللہ بن عتبہ بن مسعود نے خبر دی کہ انہیں عبداللہ بن عباس نے بتایا کہ انہیں سفیان بن حرب نے خبر دی کہ ہرقل نے انہیں اس وقت بلایا جبکہ وہ قریش کے ایک قافلہ کے ساتھ شام میں بغرض تجارت آئے ہوئے تھے، یہ وہ زمانہ ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ اور ابوسفیان کے درمیان صلح ایک مدت کیلئے طے ہو گئی تھی، چنانچہ یہ لوگ ہرقل کے دربار میں حاضر ہوئے اس وقت ہرقل اور اس کے مقربین ایلیماء میں تھے، ہرقل نے ان لوگوں کو اپنی مجلس میں بلایا، اور اسکے ارد گرد روم کے باعظمت لوگ جمع تھے پھر ہرقل نے ان لوگوں کو اپنے قریب بلایا اور اپنے ترجمان کو بھی بلایا، ترجمان نے کہا تم میں سے کون اس شخص سے نسب کے اعتبار سے زیادہ قریب ہے جو پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے، ابوسفیان نے کہا کہ میں ان لوگوں میں سب سے زیادہ قریب ہوں، ہرقل نے کہا کہ اسے مجھ سے قریب کر دو، اور اسکی پشت پر نزدیک ہی اسکے دوسرے ساتھیوں کو بٹھا دو، پھر اس نے اپنے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ میں اس (ابوسفیان) سے اس شخص (نبی ﷺ) کے بارے میں کچھ باتیں پوچھ رہا ہوں، اسلئے اگر یہ کسی بارے میں غلط بیانی کرے تو اس کی تکذیب کر دینا، ابوسفیان نے کہا، خدا کی قسم اگر مجھے یہ شرم نہ ہوتی کہ یہ لوگ میری جانب سے جھوٹ نقل کریں گے تو میں آپ کی طرف سے غلط بیانی کر دیتا، غرض سب سے پہلی بات جو ہرقل نے مجھ سے پوچھی یہ تھی کہ تم لوگوں میں ان کا نسب کیسا ہے؟ میں نے کہا وہ ہمارے یہاں بڑے نسب والے ہیں، ہرقل نے پوچھا کہ کیا یہ دعویٰ تم لوگوں میں سے کبھی کسی اور نے بھی کیا ہے؟ میں نے کہا نہیں! ہرقل نے پوچھا کیا ان کے آباؤ اجداد میں کبھی کوئی بادشاہ ہوا ہے؟ میں نے کہا نہیں! ہرقل نے پوچھا کہ آیا اونچے طبقے کے لوگ ان کا اتباع کر رہے ہیں، یا کمزور لوگ؟ میں نے کہا کمزور لوگ! ہرقل نے کہا کہ ان کے ماننے والوں کی تعداد ترقی پذیر ہے یا رو بہ تنزل؟ میں نے کہا ترقی پذیر! ہرقل نے کہا کہ ان کے مقبوعین میں سے کوئی شخص دین میں داخل ہونے کے بعد اس دین سے ناراض ہو کر پھر جاتا ہے؟ میں نے کہا نہیں! ہرقل نے کہا کہ کیا اس دعوائے نبوت سے قبل تم نے ان پر جھوٹ کی تہمت لگائی ہے؟ میں نے کہا نہیں! ہرقل نے کہا کہ کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں؟ میں نے کہا نہیں! اور ان ایام میں ایک مدت کے لئے

۱۲۶ دس سال کے لئے صلح حدیبیہ ہوئی تھی۔

ہمارا اور ان کا ایک عہد ہوا ہے، نہ معلوم اس میں ان کا کیا طرز عمل رہتا ہے، ابوسفیان نے کہا کہ اس بات کے علاوہ مجھے اور کوئی غلط بات درمیان میں لگا دینے کا موقع نہ مل سکا، ہرقل نے پوچھا کیا کبھی تم نے ان سے لڑائی لڑی ہے؟ میں نے کہا ہاں لڑی ہے، ہرقل نے پوچھا کہ پھر اس جنگ کا نتیجہ کیا رہا ہے؟ میں نے کہا کہ لڑائی کی مثال ڈول کی سی ہے، کبھی وہ ہم کو نقصان پہنچا دیتے ہیں، اور کبھی ہم انہیں نقصان پہنچا دیتے ہیں، ہرقل نے پوچھا وہ تمہیں کن چیزوں کا حکم دیتے ہیں؟ میں نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے آباؤ اجداد کی باتوں کو چھوڑ دو، اور ہمیں نماز پڑھنے، سچ بولنے، پاک دامن رہنے اور صلہ رحمی کرنے کا حکم دیتے ہیں، پھر اس نے اپنے ترجمان سے کہا کہ اس شخص (ابوسفیان) سے کہہ دو کہ میں نے تم سے ان کے نسب کے بارے میں دریافت کیا تھا تم نے جواب دیا کہ وہ بڑے نسب والے ہیں اسی طرح انبیاء کرام قوم کے اونچے نسب میں مبعوث کئے جاتے ہیں، میں نے تم سے پوچھا کہ آیا یہ بات تم میں سے اس سے پہلے کسی اور نے بھی کہی ہے، تم نے بتلایا کہ نہیں، اس سے میں نے سمجھا کہ اگر اس سے پہلے کسی اور نے یہ دعویٰ کیا ہوتا تو میں یہ کہہ دیتا کہ یہ ایسا شخص ہے جو پرانی کہی ہوئی بات کی پیروی کر رہا ہے، اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا اسکے آباؤ اجداد میں کوئی بادشاہ گزرا ہے تم نے بتلایا کہ نہیں اس سے میں نے یہ سمجھا کہ اگر اس سے پہلے کوئی بادشاہ ہوتا تو میں کہہ دیتا کہ یہ ایسا شخص ہے جو اپنے باپ کی حکومت حاصل کرنا چاہتا ہے، میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا دعویٰ نبوت سے قبل تم نے ان پر جھوٹ کی تہمت لگائی، تم نے کہا کہ نہیں، اس سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایسا نہیں جو انسانوں پر تو جھوٹ چھوڑے رکھیں اور خدا پر جھوٹ بولیں، میں نے تم سے پوچھا تھا کہ بڑے لوگ ان کی پیروی کر رہے ہیں یا کمزور، تم نے کہا کہ کمزور لوگ ان کی پیروی کر رہے ہیں، اور ایسے ہی لوگ انبیاء کرام کے تابعدار ہوا کرتے ہیں، اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ان کی تعداد ترقی پذیر ہے یا رو بہ تنزل ہے تم نے بتلایا کہ ترقی پذیر ہے، اور اسی طرح ایمان کا معاملہ ہے یہاں تک کہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے، اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ ان کے متبعین میں کوئی شخص دین میں اک بار داخل ہونے کے بعد پھر اسے برا سمجھ کر پھر جاتا ہے تو تم نے بتلایا کہ نہیں اور یہی ایمان کا حال ہوتا ہے جبکہ اسکی بشارت دلوں میں گھل مل جاتی ہے اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں، تو تم نے بتلایا کہ نہیں، اور ایسے ہی انبیاء کرام عہد شکنی نہیں فرماتے ہیں، اور میں نے تم سے پوچھا کہ وہ کن چیزوں کا حکم کرتے ہیں، تم نے بتلایا کہ وہ حکم کرتے ہیں کہ صرف اللہ کی عبادت کرو کسی دوسرے کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ، اور بت پرستی کو چھوڑ دو اور یہ کہ وہ نماز، سچائی، پاکدامنی کا حکم کرتے ہیں، پس اگر تمہاری یہ باتیں سچ ہیں تو عنقریب یہ زمین بھی ان کے زیر نگیں آ جائیگی جو میرے پیروں کے نیچے ہے، اور یہ تو مجھے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ یہ نبی پیدا ہونے والے ہیں مگر یہ گمان مجھے نہیں تھا کہ وہ تم میں سے ہیں، اور اگر مجھے یقین ہو جائے کہ میں ان کی خدمت میں پہنچ سکوں گا تو میں ان سے ملنے کے لئے حتی الامکان کوشش کروں، اور اگر میں حاضر خدمت ہوتا تو ان کے پیر دھوتا۔

اس کے بعد ہرقل نے آنحضرت ﷺ کا وہ نامہ مبارک منگوا یا جس کو آپ نے دحیہ رکلہ کی معرفت عظیم بصری حادثہ ابن ابی شمر غسانی کے پاس ارسال فرمایا تھا، اسے وہ نامہ مبارک ہرقل کو دیدیا، ہرقل نے اس خط کو پڑھا اس میں لکھا تھا۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جانب سے جو اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہے، ہرقل کو یہ پیغام پہنچے جو روم کا سب سے بڑا سردار ہے، اس شخص کے لئے سلامتی ہے جو راہ ہدایت کی پیروی کرے، حمد و صلوة کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت کی طرف بلاتا ہوں، اگر تو اسلام لے آئیگا تو محفوظ رہیگا، اور تجھے دوہرا اجر ملیگا، اور اگر تو نے پشت پھیر دی تو تیرے اوپر اس اعراض کے ساتھ پوری رعایا، اور کاشتکاروں کا بھی گناہ ہوگا، اور اے اہل کتاب ایک ایسی بات پر لبیک کہو جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے، کہ ہم خداوند قدوس کے علاوہ کسی اور کی عبادت نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم انسانوں میں سے خدا کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائیں، پھر اگر وہ اس دعوت کو حید کو نہ مانے تو تم ان سے کہہ دو کہ تم اس بات پر گواہ رہو کہ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔“

ابوسفیان کا بیان ہے کہ جب ہرقل نے یہ باتیں کہیں اور نامہ مبارک کی قراءت سے فارغ ہو گیا تو اس وقت اس کے پاس بہت شور و شغب ہوا، آوازیں بلند ہوئیں، اور ہمیں باہر نکال دیا گیا اور جب ہم نکال دئے گئے تو میں نے اپنے رفقاء سے کہا کہ ابن ابی کبشہ کا معاملہ بہت بڑھ گیا ہے، اس سے شہنشاہ روم بھی خائف ہے، ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے اس دن یقین تھا کہ آپ غالب ہو کر رہیں گے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے اسلام میرے دل میں ڈال دیا، اور ابن ناطور جو ایلیاء کا حاکم اور ہرقل کا مصاحب تھا، شام میں نصاریٰ کا سردار تھا وہ بیان کرتا ہے کہ ہرقل جب ایلیاء آیا تو ایک دن صبح کے وقت بد مزاج اور پریشان خاطر اٹھا، چنانچہ اسکے بعض مصاحبین نے کہا کہ آج ہم آپ کی ہیئت و شکل متغیر دیکھ رہے ہیں، ابن ناطور کا بیان ہے کہ ہرقل کا ہن بھی تھا، ستاروں کو دیکھتا تھا، چنانچہ ان کے پوچھنے پر ہرقل نے کہا کہ رات جب میں نے ستاروں میں نظر کی تو دیکھا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب ہو چکا ہے، اس دور میں لوگوں میں کون ختنہ کرتے ہیں، اس کے مصاحبین نے کہا کہ یہودیوں کے علاوہ اور کوئی ختنہ نہیں کرتا آپ کو ان کا معاملہ پریشانی میں نہ ڈالے، آپ اپنے علاقہ کے تمام شہروں کو یہ لکھ دیجئے کہ وہاں کے بسنے والے تمام یہودیوں کو مار ڈالا جائے، ابھی وہ لوگ اسی پس پیش میں تھے کہ ہرقل کے پاس ایک آدمی لایا گیا جسکو غسان کے شہنشاہ نے بھیجا تھا اور جو رسول اکرم ﷺ کے احوال بیان کیا کرتا تھا جب ہرقل اس شخص سے احوال دریافت کر چکا تو کہا اسے لیجاؤ اور یہ دیکھو کہ اس کی ختنہ ہوئی ہے یا نہیں، چنانچہ ان لوگوں نے دیکھ کر بتلایا کہ ختنہ ہو چکی ہے پھر اس سے عرب کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے بتلایا کہ وہ ختنہ کراتے ہیں پھر ہرقل نے کہا کہ یہ شخص اس جماعت کا بادشاہ ہے جو ظاہر ہو چکا اس۔ کہ بعد ہرقل نے اٹلی میں اپنے ایک دوست ضغاطر کو لکھا جو علم میں ہرقل ہی کا ہم پلہ تھا، اور ہرقل حمص چلا گیا، ابھی حمص چھوڑا بھی نہ

تھا کہ اس کے دوست کے پاس سے جواب پہنچا، جو رسول اللہ ﷺ کے بارے میں ہرقل کی رائے کے موافق تھا کہ آپ نبی ہیں، پھر ہرقل نے حمص میں روم کے رؤسا کو اپنے محل میں بلایا اور حکم دیا کہ اس کے تمام دروازے مقفل کر دئے جائیں، اسکے بعد محل کے بالائی حصہ سے سر نکال کر یہ خطاب کیا۔

اے روم والو! اگر تم اپنے لئے بھلائی اور ہدایت چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ تمہاری سلطنت قائم رہے تو اس نبی کے ہاتھ پر بیعت کر لو، یہ کہنا تھا کہ وہ لوگ گورخروں کی طرح دروازوں پر لپکے، لیکن انہوں نے دیکھا کہ دروازے بند ہیں پھر جب ہرقل نے ان کی اس نفرت کو دیکھا، اور اسے ان کے ایمان سے مایوسی ہو گئی تو کہا کہ انہیں میرے پاس واپس بلاؤ، اور ان سے یہ کہا کہ ابھی میں نے جو بات تمہارے سامنے پیش کی تھی اس سے تمہاری دینی عصبيت اور سخت گیری کا امتحان مقصود تھا چنانچہ میں نے اس کا اندازہ کر لیا، اس پر ان سب نے ہرقل کو سجدہ کیا اور اس سے خوش ہو گئے بس یہ ہرقل کا آخری حال ہے اس کو صالح بن کیسان نے اور یونس و معمر نے زہری سے روایت کیا ہے۔

تشریح حدیث | ابوسفیان کا بیان ہے کہ ہرقل نے اپنا قاصد بھیج کر ہم کو اپنے دربار میں طلب کیا، اس وقت ہم قریش کی ایک شترسوار جماعت کے اندر موجود تھے جو بغرض تجارت شام میں آئی ہوئی تھی، یہ وہ زمانہ ہے جس میں نبی اکرم ﷺ نے ابوسفیان اور قریش سے دس سال کے لئے صلح فرمائی تھی، واقعہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ ذوالقعدہ ۶ھ میں عمرہ کے ارادہ سے مدینہ سے نکلے لیکن ابوسفیان اور کفار مکہ نے مزاحمت کی اور جنگ کیلئے تیار ہو گئے، آپ کا مقصد چونکہ عمرہ تھا اسلئے جنگ کو مناسب نہ سمجھا، گویا بہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اس موقع پر بھی جہاد کے لئے تیار تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو حقیقت حال کی وضاحت کے لئے مکہ بھیجا گیا لیکن یہ بات مشہور ہو گئی کہ عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا گیا، اس خبر کو سن کر رسول اکرم ﷺ نے بیعت رضوان کر لی، یہ بیعت علی الموت لی گئی تھی، اس اثناء میں یہ اطلاع مل گئی کہ شہادت عثمان کی اطلاع غلط تھی لیکن آپ نے بیعت کو برقرار رکھا اور چونکہ عثمان موجود نہ تھے اس لئے آپ نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر حضرت عثمان کی جانب سے فرمایا، ہذہ ید عثمان یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔

اس طرح پر حضرت عثمان بھی بیعت میں شریک کر لئے گئے جنگ کا معاملہ تو ختم ہو گیا، البتہ سرداران قریش تحقیق حال کے لئے لشکر اسلام میں آئے، نتیجہ میں بات صلح پر ٹھہر گئی، یہ دس سال کی مدت کے لئے تھی، اس صلح کے ایام میں رسول اکرم ﷺ کو تبلیغی فرامین روانہ کرنے کا موقع ملا اس سے قبل جنگ کے جاری رہنے کی بنا پر اس قسم کے مواقع میسر نہ آتے تھے، اب یہ صلح ہو گئی اسی دو سال تک تو کفار قریش نے معاملہ کو نبھایا لیکن بالآخر انہوں نے خفیہ طریقہ پر اپنے حلفاء کی امداد کی اور حلفاء اسلام پر حملہ کر دیا، بنو بکر اور بنو ادکل کفار قریش کے ساتھ تھے، اور بنو خزاعہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ، بنو بکر نے بنو خزاعہ پر حملہ کر دیا، اور کفار قریش نے اسلحہ اور فوج کے ساتھ ان کی امداد کی، اس

اقدام کے بعد ان لوگوں کو احساس بھی ہوا کہ ہماری جانب سے نقض عہد ہوا ہے چنانچہ ابوسفیان تجدید عہد کے لئے پھر پہنچے لیکن بارگاہ نبوت میں اطلاع ہو چکی تھی آپ نے تجدید سے انکار فرما دیا کہ اب صلح ختم ہو چکی ہے، ابوسفیان اور بنو خزاعہ کے پہنچنے سے قبل آپ وضو فرما رہے تھے، اس اثناء میں آپ نے فرمایا،

لَنْ نَنْصُرَنَّكُمْ
ہم ضرور تمہاری مدد کریں گے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا، کس سے باتیں فرما رہے ہیں؟ ارشاد ہوا ہمارے حلفاء پر حملہ کر دیا گیا ہے، پھر اس نقض عہد کے بعد دس ہزار کی جمعیت لے کر مکہ پر حملہ کر دیا گیا، یہ لشکر اس دو سال کی مدت صلح میں تیار ہوا تھا، کیونکہ ان ایام میں لوگوں کو آزادی سے حاضری کا موقع ملا، اور اسلام ان کے قلوب میں جاگزیں ہوتا چلا گیا، اور پھر اس کے بعد فتح مکہ کا واقعہ پیش آیا، جو اپنی جگہ انشاء اللہ تفصیل سے آئیگا، حدیث میں جس زمانہ کا ذکر ہے وہ صلح کا زمانہ ہے، جبکہ آنحضرت ﷺ نے ۶ھ میں صلح فرمائی تھی، اس وقت آپ نے تبلیغی فرامین ارسال فرمائے قیصر روم کے نام بھی فرمان بھیجا، صورت حال یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں دنیا میں دو ہی بڑی سلطنتیں تھیں ایک قیصرہ کی اور دوسری اکاسرہ کی، قیصرہ روم شام اور مصر کے حاکم تھے اور ایران میں سب سے بڑی دوسری سلطنت اکاسرہ کی تھی، دنیا کی اور تمام سلطنتیں ان کے سامنے بے حقیقت اور ان کی باج گزار تھیں، ہر قل مذہب نصرانی تھا، اور کسریٰ مجوسی، ان دونوں میں عرصہ سے جنگ چل رہی تھی اور اس میں برابر کسریٰ کی فتوحات بڑھتی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ ہر قل کے اکثر صوبے قبضہ سے نکل گئے تھے، ہر قل نے نذر مانی کہ اگر خداوند قدوس کسریٰ کے مقابل فتح نصیب فرمائے اور مقبوضہ صوبہ واپس مل جائے تو وہ اس کی خوشی میں بیت المقدس حاضر ہو کر شکرانہ ادا کریگا، اس وقت حمص مغربی روم کا پایہ تخت تھا، ہر قل اسی میں رہتا تھا اسی وجہ سے حمص بارونق اور بڑا شہر تھا، اور دوسرا پایہ تخت قسطنطنیہ تھا، نذر کے وقت ہر قل حمص میں تھا، اتفاق سے کسریٰ کے مقابل کامیابی ہو گئی، اور نذر پوری کر نیکی غرض سے ہر قل بیت المقدس کے لئے اس شان سے روانہ ہوا کہ تمام فوج اور صوبوں کے گورنر ہر کاب تھے، راستہ میں پایہ تخت سے لیکر بیت المقدس تک برابر فرش بچھائے جاتے تھے دو طرفہ پھولوں کی بکھیر ہوتی تھی، خوشی کا مقام تھا لیکن جب یہ وہاں پہنچا تو اس نے خواب میں دیکھا کہ میری سلطنت پر ملک الحنان کا غلبہ ہو چکا ہے، بہت پریشان ہوا، اتفاق سے اسی زمانہ میں حاکم بصری غسانی کا فرستادہ ایک خط لیکر ہر قل کے پاس پہنچا، اس خط میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ عرب میں ایک شخص مدعی نبوت پیدا ہوا ہے، لیکن اس کی قوم کے لوگ اس کی بات نہیں مانتے جس کی وجہ سے عرب باہمی خانہ جنگی کا شکار ہیں، ہر قل نے غسانی کے فرستادہ شخص کے بارے میں تفتیش احوال کے بعد اپنے خدام سے کہا کہ تنہائی میں لیجا کر دیکھو یہ محنون تو نہیں، خدام ہر قل نے دیکھنے کے بعد یہ بتلایا

مدینہ اور دمشق کے درمیان ایک شہر ہے، اس وقت اس کا حاکم حارث بن ابی شمر غسانی تھا، ابن السکن نے کتاب الصحابہ میں ذکر کیا ہے کہ حاکم بصرہ نے یہ گرامی نامہ عدی بن حاتم کی معرفت بھیجا تھا عدی اس وقت نصرانی تھا حارث کا انتقال فتح مکہ کے سال ہوا ہے ۱۲

کہ یہ مختون ہے، اس کے بعد اس شخص سے عرب کے متعلق دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ عرب ختنہ کراتے ہیں، اس اطلاع سے ہرقل اور بھی پریشان ہوا کیونکہ اسے آسمانی کتابوں کے ذریعہ یہ بات معلوم ہو چکی تھی، کہ عرب میں ایک نبی پیدا ہونے والے ہیں جو تمام انبیاء کرام علیہم السلام کے سردار ہوں گے، اور ہرقل نے جس قسم کی علامتیں دیکھی تھیں ظہور کے اعتبار سے ان کا وقت انہیں اطلاعات کا وقت تھا، اور خود نبی کریم ﷺ کا نامہ مبارک بھی وحیہ کلبی کی معرفت پہنچ چکا تھا ہرقل نے بیت المقدس سے اپنے ایک دوست ضغاطر کو تحقیق حال کی غرض سے ایک تحریر بھیجی، یہ ضغاطر علم و فضل میں ہرقل کا ہم پایہ تھا اور دو حیثیتوں سے مشورہ کے لائق تھا، ایک تو یہ کہ وہ علم دین کے باعث پوپ سمجھا جاتا تھا اور دوسرے اپنے خطہ کا حکمراں بھی تھا اور جب بیت المقدس سے روانہ ہو کر ہرقل حمص پہنچ گیا تو ضغاطر کی جانب سے اس کا جواب آیا جس میں رسول اکرم ﷺ کے ظہور کے بارے میں ہرقل کی اس رائے کی پوری پوری تائید کی گئی تھی جو ہرقل نے ستاروں میں نظر کرنے کے بعد قائم کی تھی، اور متعدد طرح سے اس سے قبل بھی جس کی تائید ہو چکی تھی۔

اس مکتوب کے بعد ہرقل نے اجتماع بلایا، اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ اراکین سلطنت سے مشورہ کیا جائے اور سوچ سمجھ کر اگلا قدم اٹھایا جائے، اور خصوصاً اس لئے بھی کہ نفی یا اثبات میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نامہ مبارک کا جواب بھی دینا ہے چنانچہ ہرقل نے اراکین سلطنت کو ایک شاہی محل میں دعوت دی جس کے چاروں طرف حفاظتی مکانات بھی تھے، اور پھر اپنی حفاظت کے لئے مخصوص انتظام کر لیا یعنی تمام اراکین کو نیچے جمع کر دیا اور خود بالا خانہ پر پہنچ گیا، اور محل کے تمام دروازے مقفل کر دئے تاکہ کوئی شخص باہر نہ نکل سکے اور یہ کہ اگر کوئی نقصان بھی ہو نچانا چاہیں تو نہ پہنچا سکیں، اب اس انتظام کے بعد اوپر سے جھانک کر کہتا ہے کہ میں تمہارے سامنے ایک بات کہنا چاہتا ہوں تم غور کرو، مجھے یقین ہے کہ تم ملک کے وفادار ہو اور مجھے تمہاری ہوشیاری اور دانشمندی کے پیش نظر پورا پورا یقین ہے کہ تم خیر و فلاح کے طالب ہو گے، اب ان دو باتوں کے پیش نظر میں تمہارے سامنے ایک حقیقت کا اظہار کر رہا ہوں کہ میں نے اس مدعی نبوت انسان کے متعلق جس کی ایک تحریر دعوت نامہ کے طور پر موصول ہوئی ہے پوری پوری چھان بین کی اور میں اپنی تحقیقات کی روشنی میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ شخص واقعہ نبی ہے، اور اسکی اطاعت میں دنیا و آخرت دونوں کی بھلائی ہے لیکن اراکین نے اس تقریر کا کوئی معقول جواب دینے کے بجائے انتہائی وحشت کا مظاہرہ کیا، کرسیاں چھوڑ کر بھاگنے لگے، ان کا ارادہ تھا کہ اگر موقعہ میسر آجائے تو ہرقل کی خبر لیں، وہ پہلے سے انتظام کر چکا تھا، نہ ہرقل ہی کو پکڑ سکتے ہیں اور نہ باہر ہی نکل سکتے ہیں جب ہرقل نے ماحول کو سازگار نہ دیکھا اور سمجھ لیا کہ اب اگر میں نے اسلام کا اظہار کیا تو حکومت و وجاہت تو بجائے خود اپنی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے، ضغاطر کا معاملہ پیش نظر تھا کہ اس نے دربار میں اسلامی لباس میں ملبوس ہو کر اپنے اسلام کا اظہار کیا تو وہیں درباریوں نے اسے قتل کر ڈالا تو بات بدلی اور کہا کہ میری بات نہیں سمجھے، میں تو دیکھنا چاہتا تھا، کہ تمہیں اپنے ملک، حکومت اور مذہب کے ساتھ کس قدر تعلق ہے

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کوئی تمہیں دعوت دے اور تم اپنی حکومت و مذہب سے روگردانی پر آمادہ ہو جاؤ، مجھے امتحان مقصود تھا چنانچہ تم امتحان میں پورے اترے، ہر قل کے کہنے سے وہ لوگ پھر جھانسنے میں آگئے اور دستور کے مطابق پھر ہر قل کے سامنے پیشانی زمین پر لگادی، اسی واقعہ کو حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔

فرماتے ہیں کہ ہر قل کے پاس جب نبی کریم ﷺ کا دعوتی فرمان پہنچا تو فکر ہوئی کہ اس معاملہ کی تحقیقات کی جائے، کہ آیا واقعہ یہ شخص نبی ہے جس کی بات قابل قبول بلکہ واجب التسلیم ہے یا کوئی معمولی درجہ کا آدمی ہے جو دنیا کو دھوکہ دیکر اپنا الوسیدھا کرنا چاہتا ہے، اس تفتیش کیلئے ہر قل نے یہ فرمان جاری کیا کہ پورے ملک شام میں اگر کوئی عربی ملے تو اسے دربار میں حاضر کر دیا جائے، تفتیش جاری تھی کہ ہر قل کے قاصد غرہ پہنچے معلوم ہوا کہ یہاں مکہ کے تاجروں کا قافلہ ٹھہرا ہوا ہے، حضرت ابوسفیانؓ کا بیان ہے کہ یہ زمانہ صلح کا زمانہ تھا، اس لئے کہ صلح سے قبل تو عرب لڑائیوں اور خانہ جنگیوں کے باعث تجارت چھوڑے ہوئے تھے، اور انہیں خود بھی اس ناقابل برداشت مالی نقصان کا احساس تھا، اب صلح کے بعد اطمینان نصیب ہوا تو فوراً ہی تیس آدمیوں کا ایک قافلہ تجارت کیلئے تیار ہوا جس کے متعلق حضرت ابوسفیانؓ کا بیان ہے کہ مکہ کا کوئی گھرا ایسا نہ تھا جس نے ان کے ساتھ تجارت کا کوئی مال نہ دیا ہو چنانچہ یہ لوگ بغرض تجارت شام میں داخل ہوئے اور غرہ میں اقامت اختیار کی۔

ہر قل کے قاصد نے پیغام پہنچایا کہ تمہیں شاہی دربار میں طلب کیا گیا ہے یہ لوگ اسوقت حاضر ہوئے جب قیصر ایلیاء^۱ میں تھا، اطلاع کی گئی کہ عرب کے کچھ لوگ آگئے ہیں، قیصر نے دربار شاہی منعقد کیا، اور خود شان و شوکت کے ساتھ بیٹھ گیا، اور اس کے ارد گرد روم کے بڑے بڑے لوگوں کے لئے کرسیاں بچھادی گئیں، تاکہ دیکھنے والا مرعوب ہو، اور جو بات پوچھی جائے اس کا صحیح صحیح جواب دے اور یہ حکم دیا کہ ان لوگوں کو میرے قریب کر دو، ثم دعا ترجمانہ پھر ترجمان کو بلایا، گویا ترجمان اسوقت موجود نہ تھا، اور یا پھر یہ صورت رہی ہوگی کہ خدام گردن جھکائے کھڑے رہتے ہوں گے، اور اس وقت ترجمان کو بیٹھنے اور گفتگو کرنے کی اجازت دی گئی، اور ترجمان کی معرفت یہ کہا کہ تم لوگوں میں کون شخص اس مدعی نبوت انسان سے نسب میں زیادہ قریب ہے، اس قرابت نسبی کے دریافت کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ایسا شخص نسبی احوال سے واقف ہوگا، دوسرے یہ کہ قرابت نسبی کے باعث وہ آپ کے متعلق کوئی خاندانی کمزوری غلط طریقہ پر آپ کی طرف منسوب نہ کرے گا، کیونکہ اس کمزوری کا اثر صرف ایک شخص پر نہیں پڑتا بلکہ پورے خاندان پر پڑتا ہے بعض سیر کی کتابوں میں مذکور ہے کہ جب ہر قل کے سامنے ابوسفیانؓ کو بلایا گیا تو انہوں نے پیغمبر علیہ السلام کے متعلق کہا کہ ”ساحر کذاب“ اس پر ہر قل نے کہا کہ میں نے تمہیں گالیاں سننے کے لئے دعوت نہیں دی بلکہ میری

۱۔ ایلیاء یا تو بیت المقدس کا نام ہے، ایل خدا کو کہتے ہیں اور یا نسبت ہے اور یا پھر بیت المقدس سے تین میل کے فاصلہ پر ایک قریہ کا نام ہے ۱۲

باتوں کا صحیح صحیح جواب دو، چنانچہ ابوسفیان نے کہا: میں سب سے زیادہ قریب ہوں، اسلئے کہ ابوسفیان اور آنحضرت ﷺ کا سلسلہ نسب چوتھی پشت میں جا کر مل جاتا ہے، نسب نامہ یہ ہے۔

محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف
ابوسفیان بن حرب بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف

اس قرابت نسبی کے باعث ابوسفیان کو سب سے آگے بلایا گیا اور ان کے دیگر رفقاء کو ان کے پیچھے بٹھا دیا گیا اور یہ کہہ دیا گیا کہ اگر یہ ابوسفیان ذرا بھی غلط بیانی کریں تو تم فوراً تکذیب کر دینا، اس تکذیب کے حکم کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ دربار میں بلا اجازت بولنا حرام ہے، اس لئے ایک عام اجازت دی جا رہی ہے کہ دیکھو جہاں کمی زیادتی کریں فوراً ٹوک دینا، نیز رفقاء کو پس پشت بٹھانے کی حکمت بھی یہ ہے کہ اگر برابر یا آمنے سامنے بٹھایا جائے تو ممکن ہے کہ ابوسفیان غلط بیانی کریں اور دوسرے لوگ نظریں ملنے کی بنا پر چشم پوشی کر جائیں، اسلئے انہیں حصول مقصد کی خاطر آگے اور رفقاء کو پس پشت بٹھا دیا گیا۔

فو اللہ لو لا الحیاء من ان یاتروا علی کذباً لکذبت علیہ، ابوسفیان کہتے ہیں کہ اگر مجھے یہ حیاء ہوتی کہ یہ لوگ مجلس سے اٹھنے کے بعد میرے اس کذب کو لوگوں میں بیان کریں گے تو میں خوب جھوٹ بولتا، یعنی قوم پر اتنا تو اعتماد ہے کہ یہاں میری تکذیب کرنے والا کوئی نہیں ہے لیکن یہ جھوٹ اس مجلس پر ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ قوم میں اس کی تشہیر کی جائے گی جس سے قوم اعتماد اٹھالیگی، جو سیادت کے لئے سخت نقصان دہ ہے، دوسرا خدشہ یہ ہے کہ گو بات اس وقت ہر قل کو نہیں پہنچے گی لیکن ہماری تجارت کا مرکز تو شام ہے جہاں بار بار آنا جانا رہتا ہے، اسلئے ممکن ہے کہ جب عرب میں اس جھوٹ کا چرچا ہو تو ہر قل کو بھی اس کی اطلاع ہو جائے اور وہ اپنے قلمرو میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دے، یا داخل ہونے کے بعد گرفتار کر کے سخت قسم کی سزا دے۔

ثم کان اول ما سألنی عنہ ان قال کیف نسبہ فیکم؟ ان تمام چیزوں کے بعد ہر قل نے جو سب سے پہلا سوال کیا وہ آپ کے نسب کے بارے میں تھا اس جملہ میں ان قال، کان کا اسم ہے، اور اول خبر ہے جو منصوب ہے، اسکے جواب میں ابوسفیان نے کہا کہ بڑا اونچا خاندان ہے، ذو نسب میں تنوین تعظیم الکل لئے ہے۔

پھر ہر قل نے دوسرے سوالات کئے، کیا ان سے پہلے خاندان میں کسی نے دعویٰ نبوت کیا ہے؟ جواب دیا کہ نہیں، اچھا ان کے رفقاء اونچے درجے کے لوگ ہیں یا نیچے طبقے کے؟ جواب دیا کہ ان کے ساتھ آنے والے اشخاص تو بے وزن اور بے قیمت ہیں، ابوسفیان نے یہ بات عمومی اعتبار سے کہی تھی ورنہ اس وقت قہرین میں حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہم جیسے جلیل القدر اصحاب بھی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے۔

سوال کیا کہ ان لوگوں کی تعداد بڑھ رہی ہے یا گھٹ رہی ہے؟ ابوسفیان نے کہا کہ بڑھ رہی ہے سوال کیا کہ کوئی شخص دین میں داخل ہونے کے بعد دین سے بیزار ہو کر مرتد تو نہیں ہوا؟ ابوسفیان کو یہاں بھی جواب نفی میں دینا پڑا کیونکہ ہرقل نے اپنے کلام میں سخطة لدینہ کی قید لگا دی ہے، اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اسلام لانے کے بعد اپنی کسی ذاتی خواہش کی بنا پر دین کی طرف لوٹتا ہے، جیسے عبداللہ بن جحش کو روم میں پکڑ لیا گیا اور رومی عورتیں ان کے سامنے پیش کی گئیں، انہوں نے عورتوں کے لالچ میں دین چھوڑ دیا، یا اسی طرح اگر کسی کو زبردستی مرتد بنا لیا گیا تو وہ بھی اس سے نکل گیا، یا کوئی اندیشہ قصاص سے اسلام سے مرتد ہو گیا تو وہ بھی اس سے خارج ہے، جیسا کہ ابن حنظل جسکو فتح مکہ میں رسول اکرم ﷺ نے کعبہ کے پردے پکڑے ہوئے قتل کرایا ہے مسلمان ہو گیا تھا پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے صدقہ وصول کرنے کے لئے بھیجا، ایک انصاری اور ان کا غلام رفیق سفر تھے اس نے غلام سے کہا کہ تم فلاں جانور کا گوشت پکاؤ، یہ کہہ کر سو گیا جب بیدار ہوا تو کھانا تیار نہ تھا چنانچہ اس نے غلام کو قتل کر دیا، اور قصاص سے ڈر کر بھاگ نکلا ان تمام صورتوں سے احتراز کے لئے ہرقل نے سخطة لدینہ کی قید بڑھادی ہے جس نے ابوسفیان کو نفی میں جواب دینے پر مجبور کر دیا۔

قال فهل كنتم تتهمونه بالكذب قبل ان يقول ما قال پوچھتا ہے کہ اس دعویٰ نبوت سے قبل کبھی تمہیں ان پر جھوٹ کی تہمت لگانے کی بھی نوبت آئی، یہ استفسار بھی ہرقل کی دانشمندی کی دلیل ہے، یہ نہیں پوچھا کہ انہوں نے اس سے قبل کبھی جھوٹ بولا ہے یا نہیں؟ بلکہ عنوان یہ ہے کہ تمہیں ان پر جھوٹ کی تہمت لگانے کی بھی نوبت آئی ہے، اسکا یہ فائدہ بھی ہے کہ اگر تہمت کذب کی نفی کی جائے تو کذب کی نفی بدرجہ اولیٰ ہو جائیگی۔

هل يغدر: پوچھتا ہے کیا وہ عہد شکنی کرتے ہیں جواب وہی ہے لیکن آگے ابوسفیان کہتے ہیں کہ اب ہم وہاں سے غائب ہیں اور غیبت صلح کے سلسلہ میں ہوئی ہے نہ معلوم وہ اب اس سلسلہ میں کیا کرنے والے ہوں گے بات کہہ گئے لیکن کہتے ہیں کہ اس کلمہ کے علاوہ اور کوئی کلمہ مجھے ایسا نہ مل سکا جس سے پیغمبر علیہ السلام کی شخصیت کے بارے میں کسی قسم کا خیال کیا جاسکے اور یہ اس لئے کہ اس کلمہ کا تعلق مستقبل سے ہے جس پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی، انہیں لفظوں سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ ابوسفیان دیدہ و دانستہ یہ صورت اختیار کر رہے ہیں حالانکہ انہیں آنحضرت ﷺ کی بے داغ اور بے لوث زندگی پر اعتماد کرتے ہوئے اسوقت بھی آپ کی وفا شعاری کا پورا یقین ہے۔

قال فهل قاتلتموه: کیا تم نے ان سے کبھی جنگ کی ہے؟ ہرقل جانتا ہے کہ پیغمبر کسی صورت بھی جنگ کا آغاز نہیں کرتا، ہاں اگر قوم خود ہی آمادہ پیکار ہو جائے تو انہیں دفاعی اقدام ناگزیر ہو جاتا ہے ابوسفیان نے جواب دیا کہ

اعلامہ یعنی فرماتے ہیں کہ سخطة فتح السین ہے بضم السین پڑھنا درست نہیں، اگر کوہ حذف کر دیں تو فتح السین کے ساتھ بضم السین پڑھنا

درست ہے اور ضمہ سین کی صورت میں خام پر ضمہ سکون دونوں درست ہیں ۱۲

ہاں جنگ ہوئی ہے پوچھتا ہے نتیجہ کیا رہا؟ جواب دیتے ہیں کہ: الحرب بیننا و بینہم سجال لڑائی کا طریق ہمارے اور ان کے درمیان ڈولوں کی کھنچائی کا سا ہے، پانسہ بدلتا رہتا ہے، نہ وہ ہمیشہ کامیاب رہے، اور نہ ہم، اسوقت تک تین معرکے ہو چکے ہیں بدر، احد، خندق، بدر میں مسلمان کامیاب رہے، کفار ناکام، احد میں بظاہر کفار کامیاب رہے جس کی وجہ سے ابوسفیان نے اعلان کیا تھا یوم بیوم بدل والحرب سجال لیکن درحقیقت فتح مسلمانوں کی رہی اور خندق میں معمولی سی چھیڑ چھاڑ ہوئی اور کفار ناکام رہے، تشبیہ کا مفہوم یہ ہے کہ کنویں پر ڈول پڑا ہے، ایک فریق نے حوض بھرنا شروع کیا تو دوسرا موقع کا منتظر ہے کہ کب ڈول خالی ہو اور میں اپنا کام کروں اور جب ڈول دوسرے کے ہاتھ میں چلا جائیگا تو اسے موقعہ کا انتظار کرنا ہوگا دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جس طرح کنویں پر چرخی لگی ہوتی ہے اور اس پر رسی لپٹی ہوتی ہے اور اس کے دونوں جانب ڈول باندھ دیئے جاتے ہیں پانی والا ڈول اوپر کھینچا جاتا ہے اور خالی ڈول نیچے جاتا رہتا ہے، تو جس طرح یہ ڈول اوپر نیچے ہوتے رہتے ہیں اسی طرح جنگ کا بھی معاملہ ہے جسے ایک صورت پر قرار نہیں ہے۔

قال ماذا یامرکم: یعنی احوال و اوصاف تو معلوم ہو گئے لیکن ان کی تعلیمات کیا ہیں؟ ابوسفیان نے تعلیمات کے بارے میں بتلایا کہ ”خدا کو واحد مانو، اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، آباؤ و اجداد کی بتلائی ہوئی باتوں کو چھوڑ دو“ ابوسفیان ان باتوں کے ذریعہ حکومت کو ابھارنا چاہتے تھے کیونکہ یہ نصاریٰ کی حکومت ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ابن اللہ مانتی ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اس کی گہیں گنجائش نہیں بلکہ آپ ہر طرح خداوند قدوس کو وحدانیت سے متصف بتلا رہے ہیں، آگے کہتے ہیں کہ وہ ہمیں نماز کا حکم دیتے ہیں سچائی کا حکم دیتے ہیں، خواہ اس سلسلہ میں نقصان برداشت کرنا پڑے، دوسری روایت میں اس جگہ صدقہ کا بھی ذکر ہے جسکی تائید ایک تیسری روایت کے لفظ زکوٰۃ سے ہو رہی ہے، بخاری کی ایک روایت میں صدقہ اور زکوٰۃ دونوں جمع ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اختصار کیا گیا ہے۔

عفاف: حرام چیزوں سے بچنے کا نام ہے۔

فقال للترجمان: سوالات ختم ہو گئے تو ہرقل نے ترجمان سے کہا کہ ان لوگوں سے کہو، میں نے تم سے مدعی نبوت انسان کے نسب کے بارے میں دریافت کیا، تم نے انہیں عالی خاندان بتلایا، میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ انبیاء ہمیشہ

الحرب سجال کی ترکیب پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ حرب مفرد ہے، اور سجال جمع ہے، اسلئے سجال کا حرب کے لئے خبر ہونا نحوی اعتبار سے درست نہیں حافظ نے فرمایا کہ حرب اسم جنس ہے، اسلئے سجال کا اس کی خبر واقع ہونا درست ہو جائیگا اسلئے کہ سجال اسم جمع ہے لیکن علامہ عینی اس رائے سے متفق نہیں فرماتے ہیں کہ سجال اسم جمع نہیں بلکہ جمع ہے اور اسکا مفرد سجال ہے اور اچھا یہ ہے کہ اسے مصدر قرار دیں جس کو مبالغہ کے لئے خبر کی جگہ استعمال کیا گیا ہے اور معنی یہ ہیں کہ لڑائی کا طریق مساجلت کا طریق ہے اور اسی لئے آگے اس کی تشریح کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔

اونچے خاندان میں مبعوث ہوتے ہیں، تاکہ اونچی ناک والوں کو ان کی اطاعت میں تنگ و عار محسوس نہ ہو، اسلئے کہ تجربہ میں یہی آیا ہے کہ اونچے خاندان کے لوگ ہر کس و ناکس کی اتباع میں غیرت محسوس کرتے ہیں۔

ہر قل نے کہا کہ میں نے تم سے دریافت کیا تھا کہ کیا اس سے قبل تمہارے یہاں کسی نے یہ دعویٰ کیا تھا، میرے اس سوال کا مقصد یہ تھا کہ اگر یہ دعویٰ نبوت کسی اور نے کیا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ شخص سابق عزت و وقار کا خواہاں ہے یہاں قلت دو جگہ ہے، پہلی جگہ مراد قلت فی نفسی ہے، اردو سرائی قول قول لسانی ہے، یہ سوال عزت باطنی سے تھا اس سے اگلا سوال دنیوی جاہ و جلال سے متعلق ہے، یعنی کیا ان سے قبل ان کے خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ کسی خاندان میں حکومت و سلطنت آجاتی ہے، تو عرصہ دراز تک اہل خاندان مختلف ترکیبوں سے اس کے حصول کی فکر میں لگ جاتے ہیں لیکن تمہارے جوابات سے معلوم ہوا کہ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔

ہر قل کہتا ہے کہ میں نے تم سے دعویٰ نبوت سے قبل تہمت کذب کے بارے میں دریافت کیا، تم نے اس سے بھی انکار کر دیا، اسلئے میں یقین رکھتا ہوں کہ جس شخص نے تمام عمر کسی قسم کا جھوٹ نہ بولا ہو وہ دفعۃً کس طرح اس قدر طومار باندھ سکتا ہے، جس نے بندوں کے بارے میں بھی احتیاط سے کام لیا ہو وہ کس طرح خداوند قدوس کے معاملہ میں اتنی بے باکی پر اتر سکتا ہے، اصل بات یہ ہے کہ رسالت کے ادعاء کا مفہوم یہ ہے کہ اسے خداوند قدوس نے اپنا پیغام دیکر بھیجا ہے، اور پیغام رسانندہ پیغام بر سے نتیجہ اور انجام کے متعلق سوال کیا کرتا ہے، اسلئے ہر مدعی نبوت کو اس دعوت کے ایام سے گزرنے کے بعد خداوند قدوس کے سامنے اپنی مساعی اور ان کے نتائج بھی رکھنے ہیں، ہر قل کے کہنے کا بھی یہی مفہوم ہے کہ آپ نبی ہیں اور نبی کو جواب دہی اور باز پرس کا یقین ہوتا ہے اسلئے جب اس انسان نے انسانوں کے بارے میں بھی غلط بیانی نہیں کی تو پھر وہ کس طرح خداوند قدوس کے معاملہ میں دجل و فریب سے کام لے سکتا ہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ ہر قل نے یہ بات ایسے لوگوں کے سامنے پیش کی ہے جو آخرت کے قائل نہیں، اور ہر قل کے اس جواب کا وزن آخرت کے اقرار پر موقوف ہے، دراصل ہر قل کے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود اہل کتاب ہے اور اسے آپ کے احوال اور کتب سابقہ کی تائید سے آپ کی رسالت کا اطمینان ہے اسلئے ہر قل اپنے دل میں بات کہہ رہا ہے نیز یہ اپنی قوم کو سمجھانے کا بھی ایک مؤثر انداز ہے، کیونکہ ہر قل کو تو نجوم اور دوسرے ذرائع کی بنا پر ایقان حاصل ہے لیکن اگر ایمان کا اظہار کرتا ہے تو حکومت اور جان کا خطرہ ہے اسلئے عظماء روم کو سمجھانے کے لئے اس قسم کے سوال کر رہا ہے، تاکہ وہ لوگ بھی آپ کی صداقت اور اس دعویٰ نبوت کی سچائی سے متاثر ہو سکیں، اور ہر قل کیلئے اظہار ایمان کی راہ ہموار ہو جائے نیز یہ کہ اتنا تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ برائی کا نتیجہ برا ہوتا ہے اسلئے اگر وہ نبی نہیں، بلکہ اس دعویٰ نبوت سے وہ اپنے لئے کسی منصب کے خواہش مند ہیں تو ہر شخص کو یقین رکھنا چاہئے کہ ایسا شخص فلاح یاب نہیں ہو سکتا، حالانکہ آپ کے اثرات روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں۔

آگے پوچھتا ہے کہ کمزور لوگ ساتھ دے رہے ہیں یا قوت ور؟ جواب دیا کہ کمزور! ہر قل کہتا ہے کہ یہ بھی نبوت کی علامت ہے، ہر نبی کے تبعین کمزور ہی ہوا کرتے ہیں کیونکہ اونچے طبقے کے لوگ نئی بات پر فوراً کان نہیں لگاتے، بلکہ وہ اور چوکنے ہو جاتے ہیں اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ جب معاشرہ بگڑتا ہے تو رعایا میں اکثر بڑے لوگ عشرت کے نشہ میں چور رہتے ہیں اور ان کے زیر سایہ بسنے والے غریب لوگ سہے رہتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ موقعہ کے بھی منتظر رہتے ہیں کہ جب کوئی سہارا دیکھا اور اس کے ساتھ ہو گئے، تاکہ اپنی قوت مجتمع کر کے ان عیش پرست انسانوں کے ظلم سے بچ سکیں اور بڑے لوگوں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی نئی بات سنتے ہیں تو اسے کان پر رکھ کر اڑا دیتے ہیں، آخر جب فرعون کو موسیٰ علیہ السلام کی دعوت پہنچی تو کہہ دیا کہ یہ ہمارا پروردہ ہے اور ہمارے ہی حضور نبوت کے دعوے کرتا ہے۔

اسکے بعد ہر قل نے تعداد کے بارے میں پوچھا کہ ان کے تبعین کی تعداد کا کیا حال ہے، بتلایا کہ ترقی پذیر ہے، ہر قل نے پوچھا کہ دین سے بیزار ہو کر تو کوئی شخص ایمان سے نہیں پھر جاتا؟ انہوں نے انکار کیا، اس پر ہر قل نے کہا کہ جب ایمان رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے تو اسکا نکلنا بہت دشوار ہوتا ہے، اکابر کی تصریح ہے کہ مرتد وہی ہوگا جس کے دل میں ایمان نہ اتر اہو، اسکے بعد ہر قل نے تعلیمات کے بارے میں دریافت کیا معلوم ہوا کہ آپ ﷺ تو حید کی دعوت دیتے ہیں، سچائی اور پاکدامنی اور صلہ رحمی کا حکم فرماتے ہیں اسلئے کہتا ہے کہ اگر یہ بات سچ ہے تو میں کہتا ہوں کہ وہ وقت دور نہیں جب ان کی حکومت یہاں تک پہنچ جائیگی، کہتا ہے کہ مجھے اسکا تو یقین ہے کہ وہ پیدا ہونے والے ہیں لیکن اسکا گمان بھی نہ تھا کہ وہ ایسی جاہل اور غیر متبذد قوم کے درمیان مبعوث ہوں گے، ممکن ہے کہ ہر قل کا خیال ہو کہ وہ بڑی جماعت میں مبعوث ہوں گے، جیسا کہ کفار مکہ کہا کرتے تھے۔

لَوْلَا نُزُولُ هَذَا الْقُرْآنِ عَلَى رَجُلٍ مِّنَ

یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے

الْقُرَيْتَيْنِ عَظِيمِ (پ ۹۷۲۵)

آدمی پر کیوں نہیں نازل کیا گیا۔

اور ممکن ہے کہ ہر قل کا یہ خیال ہو کہ آپ بنو اسرائیل میں پیدا ہوں گے، اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ انجیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے خطاب فرماتے ہوئے تصریح موجود ہے کہ وہ تمہارے بھائیوں میں مبعوث ہونگے اور بنو اسرائیل کے بھائی بنو اسمعیل ہیں، اسلئے یا تو ہر قل اس فرمان کو بھول رہا ہے، اور یا پھر اس لئے کہ ہر قل اس بات کو سن کر گھبرا گیا ہے، روایت میں تصریح موجود ہے کہ ہر قل یہ سن کر پسینہ پسینہ ہو گیا چہرہ پر خوف کے آثار نمایاں ہو گئے لیکن گرد و پیش کی مخالفت کے باعث اظہار سے معذور رہا، آگے کہتا ہے کہ اگر مجھے یقین ہو جائے کہ میں ان کی خدمت میں پہنچ سکوں گا (کیونکہ حکومت کی ذمہ داری ہے، اور یہاں سے کہیں جانا معزول ہو جانے یا دوسری نقصان دہ صورتوں میں ظاہر ہو سکتا ہے) تو میں ضرور کوشش کرتا، اور اگر میں حاضر ہوتا تو آپ ﷺ کے پیر دھوتا۔

ان تحقیقات اور اپنے خیالات کے اظہار کے بعد ہر قل نے وہ دعوت نامہ منکایا جو عظیم بصری کی معرفت ہر قل

کے پاس پہنچا تھا۔ عظیم، ہرقل کا ماتحت تھا قانون ہے کہ سلاطین کے دربار میں رسائی درجہ بدرجہ ہوا کرتی ہے، اور واسطہ کے بغیر وہ کسی چیز کو قبول نہیں کرتے اور نہ کسی کی تحریر ہاتھ ہی میں لیتے ہیں، اسلئے آنحضرت ﷺ کا دعوت نامہ عظیم بصری کے پاس محفوظ تھا، جب ہرقل کو معلوم ہوا کہ ایک مدعی نبوت کا دعوت نامہ آیا ہے تو اس مدعی کے احوال کی تفتیش کی ضرورت ہے کہ اگر واقعی مدعی قابل التفات ہے تو اس کے نامہ مبارک کو اہمیت دی جائے ورنہ دعوت نامہ کو پڑھنا بھی زحمت ہے، اب تفتیش کا مرحلہ طے ہو گیا تو عظیم بصری کے نام سے وہ دعوت نامہ منگایا، ابتداء میں بسم اللہ الرحمن الرحیم بن محمد رسول اللہ الی ہرقل عظیم الروم۔ مرقوم تھا یہ سکر ہرقل کا بھتیجا بہت غضبناک ہوا اور کہا کہ اسے چاک کر دینا چاہئے کیونکہ کاتب نے آداب سلطانی کی رعایت نہیں کی، اپنا نام پہلے لکھا ہے اور شہنشاہ روم کا بعد میں نیز یہ بھی کہ آپ کو صرف عظیم الروم لکھا ہے حالانکہ آپ مالک الروم اور سلطان الروم ہیں۔

اس پر ہرقل نے بھتیجے کو ڈانٹ دیا کہ ہاں درست ہے میں مالک نہیں ہوں مالک درحقیقت خداوند قدوس ہے مجھے تو رومی لوگ بادشاہ سمجھ کر عظیم جانتے ہیں، رہا اپنے نام سے افتتاح کرنا تو اگر واقعہ وہ نبی ہیں تو انہیں اپنے نام کو مقدم رکھنے کا حق حاصل ہے، معاملہ ختم ہو گیا اور نامہ مبارک پڑھا جانے لگا، سلام علی من اتبع الهدی اسی شخص کے لئے سلامتی ہے جو ہدایت کی پیروی کرے، اس جملہ کے دو پہلو ہیں ہرقل اپنے بارے میں ایک بار سوچنے پر مجبور ہو سکتا ہے کہ ہرقل بزعم خویش آسمانی مذہب کا تتبع ہونے کے باعث ہدایت پر ہے آنحضرت ﷺ والسلام ایک ذو معنی جملہ کا استعمال فرما رہے ہیں، کہ اگر تو واقعہ ہدایت پر ہے تو اسکا مستحق ہے ورنہ نہیں گویا اس میں اسلامی اصول کی پابندی بھی ہے اور ملاطفت بھی۔

اما بعد فانی ادعوك بدعاية الاسلام: حمد و صلوة کے بعد میں تجھے اس دعوت پر بلا رہا ہوں جو اسلامی دعوت ہے ہمارا یہ مقصد نہیں کہ خواہ مخواہ کسی سے الجھیں، اور اس کے اقتدار یا عزت پر ڈاکہ ڈالیں بلکہ ہم ایسے طریق کی

۱۔ ہرقل کے متعلق ان الفاظ سے کہ وہ رومیوں کا بڑا سردار ہے یہ بات نکل رہی ہے کہ اگر کافر کسی لقب سے معروف و مشہور ہو تو مسلمانوں کے لئے اس لقب کا استعمال کرنا ناجائز نہیں اسلئے کہ ہرقل اسلامی ائین کے مطابق قابل تعظیم نہ تھا آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے ساتھ ہی ساتھ اس کی حکومت ختم ہو چکی تھی لیکن چونکہ وہ رومیوں کی نظر میں باعظمت تھا اسلئے آں حضور علیہ السلام نے اسے ان القاب سے یاد فرمایا اسلام یہ نہیں کہتا کہ دشمنوں کے ساتھ دشمنی کا برتاؤ کیا جائے بلکہ دشمنوں کے ساتھ انتہائی ملاطفت کا سلیقہ سیکھاتا ہے اسلئے کسی باعظمت انسان سے مراسلت اور گفتگو کے وقت اونچے القاب کا استعمال کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں، بلکہ اس حدیث کی روشنی میں درست ہے اس کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ دشمن اگر دوستی نہ بھی کریگا تو کم از کم دشمنی میں تخفیف ہو جائیگی، حضرت علامہ کشمیری فرماتے تھے کہ جب دیوبند میں گورنر سسٹن آیا تو اہل مدرسہ نے اپنی مصلحتوں کے ماتحت اس کے استقبال کی تیاری کی اور مجھے بحیثیت صدر اڈریس لکھنے کے لئے کہا گیا حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ میں پریشان تھا آخر اس ظلم پسند انسان کے متعلق کیا لکھوں؟ یہ وہی شخص ہے جس نے کانپور کی مسجد میں گولیاں چلوائی تھیں لیکن چونکہ اس وقت دوسری حیثیت سے آرہا ہے اہل مدرسہ بھی استقبال پر مجبور ہیں، حضرت علامہ کشمیری نے فرمایا کہ اس وقت میری نظر حدیث ہرقل پر گئی اور میں نے گورنر سسٹن کیلئے عظیم کا لقب استعمال کیا اور اس حدیث شریف کے باعث قلب بھی مطمئن رہا۔ ۱۲

طرف بلا رہے ہیں، جو مساوات کا داعی امن و سلامتی کا ضامن اور دارین میں فلاح کا ہادی ہے، آپ نے اسلام تسلیم کے الفاظ استعمال فرمائے تھے جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے دنیا و آخرت دونوں کو عام تھے اور ہر قہر اس پر ذرا بھی غور و فکر کرتا تو اس کے قلب پریشاں کے لئے ان الفاظ میں اطمینان و سکون کا پیغام موجود تھا، آپ سلامتی کا یقین دلا رہے ہیں لیکن اسکی نگاہ یہاں تک نہ پہنچی، نیز یہ چند کلمات دعوت کے تمام اسالیب پر حاوی ہیں، دعوت کے اسلوب امر، ترغیب، زجر اور ترہیب ہیں کلمہ اسلام کو امر کے لئے، تسلیم کو ترغیب کیلئے اور فان تولیت کو زجر کیلئے اور فان علیک کو ترہیب کیلئے استعمال فرمایا گیا ہے، جو آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اوتیت جو امع الکلم کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

یؤتک اللہ اجرک مرتین: تمہیں دوہرا اجر دیا جائیگا اس لئے کہ تم کتابی ہو، اور کتابی اگر دعوت قبول کر لے تو اسکے لئے اجر بھی دوگنا ہے، ایک کتابی ہونے کی حیثیت سے کہ وہ پہلے نبی کی تصدیق کر رہا تھا، اور اب آنحضرت ﷺ کی تصدیق کی تو اجر دوگنا ہو گیا یا اس مرتین کا مفہوم مرۃ بعد مرۃ بھی نکل سکتا ہے، یعنی یہ نہ سمجھنا کہ اسلام لانے کے بعد بس ایک ہی اجر مل سکے گا بلکہ خداوند قدوس تمہیں بار بار ثواب دیتا رہے گا اسلئے کہ تمہارا اسلام صرف تمہاری ذات تک محدود نہ رہے گا بلکہ اس سے رعایا میں اسلام پھیلتا چلا جائے گا ان کی مشکلات ختم ہوں گی اور جس قدر بھی رعایا اسلام قبول کرتی جائے گی تمہارے اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

فان تولیت فان علیک اثم الیریسین: اور اگر تم نے پشت پھیری تو یاد رکھو کہ اس اعراض کے گناہ کے ساتھ ساتھ تمہارے اوپر اس کا شتکار رعایا کا بھی عذاب ہوگا، جو تمہارے ایمان نہ لانے کے باعث رک جائے گی۔ یہاں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فان کفرت نہیں فرمایا، کیونکہ کفر کا لفظ استعمال کرنا ایک قسم کی برائی سے یاد کرنا ہے اور اس سے تالیف قلب کی شان ختم ہو جاتی ہے، نیز دعوت کی روح بھی معدوم ہو جاتی ہے، دعوت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سامع اس کی جانب بڑھے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اچھے الفاظ میں سامع کے سامنے مقاصد رکھے جائیں لیکن اگر پہلے ہی سے سخت کلامی اختیار کر لی جائے تو کبھی دعوت مقبول نہیں ہو سکتی۔

یویس: فلاح اور کاشتکار کو کہتے ہیں، وہ کاشتکار جو خود کاشت کرے یا ملازمین سے کرائے، اسلئے یہ لفظ کاشتکار اور زمیندار دونوں کو عام ہے کیونکہ حکومت میں ان کی اکثریت تھی، اسلئے ان کو آگے رکھا اور بطور کنایہ پوری رعایا مراد لی گئی، یہاں فرمایا اگر تم ایمان نہ لائے تو اعراض کے گناہ کیساتھ تمہارے اوپر اس رعایا کا بھی گناہ ہوگا، حالانکہ قرآن کریم فرماتا ہے۔

لا تَزِدْ وَازِرَةً وَزَرَ اٰخِرٰی (پ ۱۵ ع ۲) کوئی شخص کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

لیکن تمہیں ذرا تو وسیع سے کام لینا ہوگا جس طرح کہ کار خیر میں خود کرنے اور دوسرے کے لئے اسباب مہیا کرنے دونوں صورتوں میں ثواب رکھا گیا ہے اسی طرح برائی کا خود کرنا بھی برا ہے اور دوسرے کے لئے برائی کے

اسب مہیا کرنا بھی، ہر قل ایمان نہ لا کر ایمان لے آسکنے والی رعایا کے حق میں بڑی حد تک خارج ہو رہا ہے اسلئے اسے
رہایا کا بھی گناہ ہوگا۔

یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یریس سے اہل ریف مراد ہیں دیہات اور شہر میں رہنے والوں میں بڑا فرق ہوتا ہے،
طرز معاشرت اور ذہنی رجحانات میں بعد ہوتا ہے، شہری لوگ حکومت کے تابع ہو کر نصرانی تھے، لیکن اطراف کے لوگوں
کا مذہب مجوسیت تھا، جو اس سلطنت کا سابق مذہب تھا اب اس جملہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نصرانی ہوں اور
میرا حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر پورا یقین ہے اسلئے میں مؤمن ہوں، تمہارا یہ سوچنا اسی طرح غلط ہے جس طرح یریسین
کا مجوسیت پر ہونیکے باعث اپنے کو ہدایت پر سمجھنا غلط ہے، اور جس طرح تو یہ سوچتا ہے کہ دین عیسوی کے بعد مجوسیت پر
رہنے والوں کو گناہ ہو رہا ہے اسی طرح رسالت محمدیہ کے بعد دین عیسوی پر رہنا بھی باعث مواخذہ ہے اسلئے تمہیں اگر
ہدایت پر رہنا ہے تو دین محمدی کو قبول کر لو اگر تم نے ایسا کر لیا تو تمہیں دو ہر ا ثواب ملے گا۔

حضرت علامہ کشمیری علیہ الرحمہ نے ارشاد فرمایا کہ اس جملہ کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اسکی قوم اریس
کہلاتی تھی، یہ اروس مصر کی طرف منسوب تھے، پہلے یہ قوم اریسی کہلاتی تھی جو ذرا تغیر کے بعد یریس ہو گیا ہر قل بھی اس
قوم سے تھا نصاری کے اس فرقہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے پاس دین نصرانیت کافی حد تک محفوظ تھا اور پولس (جس
نے دین عیسوی میں بہت سی مختصرات کا اضافہ کیا تھا) کے اثرات ابھی اس فرقہ تک نہیں پہنچ سکے تھے آپ نے فرمایا،
ہر قل تو یریس کی بنا پر یہ نہ سمجھنا کہ تو فلاح یاب ہے، بلکہ میرے بعد تو تمام خیر و فلاح میری ہی اتباع پر منحصر ہے،
اب تم خواہ دین عیسوی پر پوری طرح کار بند رہو لیکن اب اسکی مدت ختم ہو چکی ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَا نَحْنُ نَحْمَدُ اللَّهَ مَا كُنَّا نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِينُهُ وَنُؤْتِي الْمَالَ نَحْمَدُهُ
جانب بلا رہے ہیں جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے، اور وہ یہ کہ وہ معبود عالم ایک ہی ہے اور اسکے ساتھ کسی
دوسرے کو شریک ماننا کفر ہے یعنی ہمارا اور تمہارا توحید پر اتفاق ہے، اس پر یہ اشکال وارد ہوتا ہے کہ نصاری کی طرف
اعتقاد توحید کی نسبت درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ان کا اعتقاد تو خداوند قدوس کے بارے میں اقانیم ثلاثہ کا ہے، پھر وہ
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا مانتے ہے جو توحید و صمدیت کے سراسر خلاف ہے لیکن مخالف کو ہمنا بنانے کیلئے ضروری
ہوتا ہے کہ کچھ دور اس کے ساتھ چلا جائے اور اظہار ہمدردی کے طور پر اس کو اپنا شریک بتلایا جائے، اسی اصول دعوت
کے پیش نظر رسول اکرم ﷺ نے نصاری کے دعویٰ توحید کے ساتھ اپنی دعوت کا اشتراک ظاہر فرمایا، اسلئے کہ وہ بھی
زبان و بیان کی حد تک وحدانیت کے قائل تھے۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَعُولُوا أَشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ: اگر وہ پشت پھریں تو آپ فرمادیں کہ تم لوگ اس بات پر گواہ
رہو کہ ہم مسلمان ہیں، اسمیں حکمت یہ ہے کہ آپ یہ جملہ اپنی طرف سے نہیں فرما رہے ہیں بلکہ خداوند قدوس کی طرف

سے یہ اعلان ہو رہا ہے، اپنی طرف سے فرماتے تو تو لیتم ہوتا۔

فلما قال مقال: جب ہرقل نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تو مجلس میں بہت شور و شغب برپا ہوا، ابوسفیان کا بیان ہے کہ حقیقت حال کا تو مجھے علم نہیں لیکن خلفشار کی صورت حال سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مجمع ان خیالات سے متفق نہیں ہے بلکہ غیظ و غضب میں ہے اسلئے حکومت نے مصلحت کے پیش نظر ہمیں وہاں سے نکال دیا، کیونکہ رعایا کی غضبناکی کا سبب ہم ہی لوگ بنے تھے نہ ہم صحیح بات کہتے اور نہ حکومت کا رجحان ادھر ہوتا لیکن تحقیق کے لئے ہمیں بلایا گیا تھا، جب تحقیق ہو گئی تو چور دروازے سے ہمیں نکال دیا گیا جب باہر نکل آئے تو ابوسفیان نے رفقاء سے کہا لقد امر ابن ابی کبشہ کہ ابن ابی کبشہ کا معاملہ بہت بڑھ گیا، عرب کا طریق تھا کہ جب کسی شخص کو خال الذکر کرنا چاہتے تو ایسے شخص کی طرف اسکی نسبت کر دیتے تھے جو گنہگار ہو لیکن یہاں اصل یہ ہے کہ ابوکبشہ نامی ایک انسان عرب میں گزرا ہے جس کی تاریخ یہ ہے کہ اس نے آبائی دین کو چھوڑ کر شعری ستارے کی پرستش شروع کی تھی چونکہ ابوکبشہ نے ایک نیا دین اختیار کیا تھا اسلئے ہر نیا دین اختیار کرنیوالوں کو ابن ابی کبشہ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

اصل تو یہ تھا لیکن دوسرے حضرات نے اور بھی تاویلات کی ہیں کسی نے کہا ہے کہ ابوکبشہ حضرت حارث ابن عبدالعزیٰ حضرت حلیمہ سعدیہ کے خاوند کو کہا جاتا تھا، اسلئے آپ کو رضاعی نسبت سے ابن ابی کبشہ کہا، کسی نے کہا کہ اصل میں آپ کی والدہ ماجدہ کے دادا کی کنیت ابوکبشہ تھی اسلئے آپ کو ابن ابی کبشہ کہا گیا، لیکن ان تمام چیزوں میں اصل اور مشترک یہ ہے کہ ابوسفیان اس وقت آپ کو خال الذکر کرنا چاہتا تھا اسلئے جدامجد عبدالمطلب کے بجائے ابوکبشہ کی طرف آپ کی نسبت کر دی۔

انہ یخافہ ملک بنی الاصفہر: ان کا معاملہ تو بڑی شدت اختیار کر گیا شہنشاہ روم بایں سطوت و جلال لرز رہا ہے ”بنی الاصفہر“ کہا جاتا ہے کہ روم نے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پوتا تھا حبشہ کی ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی، روم سفید نسل تھا اور حبشہ کی لڑکی سیاہ قام تھی ان دونوں کے اختلاط سے جو لڑکا پیدا ہوا وہ زرد تھا اسلئے اس کا نام اصفہر تجویز کیا گیا ایک یہ بھی روایت ہے کہ روم کے اس لڑکے کو حضرت سارہ نے سونے کے زیورات پہنا دیئے تھے اسلئے اسکا نام اصفہر رکھا گیا، اور پھر اسکی اولاد بنو الاصفہر کے نام سے موسوم ہوئی۔

فما زلت موقنا انہ سیظہر: ابوسفیان کہتے ہیں کہ مجھے یقین ہو گیا کہ آپ غالب ہو کر رہیں گے لیکن میرا قلب اسلام قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن خداوند قدوس نے میرے قلب میں داخل فرما ہی دیا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوسفیان پہلے مخلصین میں نہ تھے ان کے اسلام کا واقعہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے بعد دو سال تک انہوں نے نبھایا لیکن پھر نقض عہد کر بیٹھے، اس پر پشیمانی بھی تھی، ادھر مدینہ سے اطلاعات کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا، اس سے پشیمانی اور بڑھ گئی، آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام دس ہزار کی فوج لیکر فتح مکہ کیلئے تشریف لے گئے، ابوسفیان، حکیم بن

حزام اور بدیل بن ورقہ اسی پریشانی میں مکہ سے نکلے کہ شاید آبادی سے نکل کر مدینہ کی کچھ حالت معلوم ہو باہر نکل کر ٹیلے پر چڑھے تو دیکھا کہ جنگل آگ سے بھرا پڑا ہے اور یہ اسلئے کہ پیغمبر علیہ السلام نے حکم دیا کہ ہر شخص اپنا چولہا الگ بنائے تاکہ فوج کی تعداد ہی دور سے دیکھنے والے کو مرعوب کر دے، ادھر سے ابوسفیان جاسوسی کے لئے نکلے، اور ادھر سے حضرت عباسؓ، حضرت عباسؓ نے ابوسفیان کو پہچان لیا اور آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر کر دیا، چاروں چار حاضر ہوئے اور اسلام قبول کر لیا لیکن مصلحت کے پیش نظر انہیں مکہ نہیں بھیجا گیا حضرت عباسؓ نے انہیں اپنے یہاں روکے رکھا، اگلے دن ایک تنگ گھائی سے لشکر اسلام ان کے سامنے سے گزارا گیا، پھر انہوں نے اہل مکہ کیلئے امن چاہا تو آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا امن داخل دار ابی سفیان فہو آمن جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے وہ بھی مامون ہے، اس واقعہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اول اول مولفہ قلوب میں تھے بعد میں مخلصین میں آئے۔

کان ابن الناطور: یہ حضرت امام زہری علیہ الرحمہ کا دوسرا بیان ہے جو ابن ناطور کے بیان سے ماخوذ ہے، پہلا بیان عبید اللہ کے طریق سے تھا، عبد الملک کے دور حکومت میں امام زہریؒ خود ابن ناطور سے ملے ہیں اور اس سے یہ واقعہ سنا ہے۔

صاحب ایلیاء و ہرقل: جو ایلیاء کا حاکم اور ہرقل کا مصاحب تھا، اس جملہ سے شوافع نے لفظ مشترک کے کئی معنی میں ایک ہی جگہ استعمال کرنے پر استدلال کیا ہے، کہتے ہیں کہ یہاں صاحب گورنر اور مصاحب دونوں کے معنی میں ہے لیکن یہ درست نہیں ہے، معنی ایک ہی ہیں، صرف نسبت کا فرق ہے اگر لفظ صاحب کی نسبت کسی ملک یا شہر کی طرف کر دی جائے تو اس کے معنی حاکم ہو جائیں گے اور اگر کسی انسان کی طرف اس کی نسبت کر دی جائے تو معنی ساتھی اور رفیق کے ہوں گے، اردو میں اس کا ترجمہ ایلیاء والا اور ہرقل والا کریں گے، نیز حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں حضرت امام شافعیؒ سے کوئی تصریح منقول نہیں ہے بلکہ شوافع نے بعض مسائل سے استنباط کیا ہے اور اگر ہم حدیث شریف میں لفظ صاحب کو مشترک مان کر دونوں معنی میں بیک وقت مستعمل قرار بھی دیں تو حدیث اس بارے میں اسلئے حجت نہیں ہو سکتی کہ ان الفاظ کا ثبوت زبان نبوت سے مشکل ہے بلکہ یہ بیان امام زہری کا ہے اور روایت بالمعنی کا بھی عام رواج ہے۔

یحدث: ابن ناطور جو شام کے نصاریٰ کا بڑا عالم اور وہاں کا گورنر بھی تھا، گویا مذہبی اعتبار سے ممتاز مقام رکھتا تھا کہتا ہے کہ ہرقل ایلیاء آیا تو ایک صبح کو مغموم اور پریشان خاطر ہو کر اٹھا چہر اتر اہوا تھا، خواص سلطنت نے عرض کیا کہ

لعموی نے اسے ناطور بالظالمعجم پڑھا ہے، اس وقت معنی باغبان ہیں، اور ناطور بالطاء البہملہ کے معنی بھی بعض اہل لغت یہی لکھتے ہیں، لیکن ابن درید وغیرہ نے اس لفظ کے عربی ہونے سے انکار کیا ہے۔

حضور! نصیب اعداء آج تو چہرہ پر حزن و ملال کے آثار نمایاں ہیں، اب اسکے بعد ابن ناطور کی جانب سے جملہ معترضہ کا اضافہ ہے کہ "کان ہرقل حزاء ینظر فی النجوم" ہرقل کا ہن تھا نجوم میں نظر کرتا تھا، اگر "ینظر فی النجوم" "حزاء" کی صفت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کہانت کی تین قسمیں ہیں، ایک کہانت فطری ہوتی ہے، ایک نجوم کے ذریعہ سے اور ایک شیاطین کے ذریعہ سے، یہاں بتلایا گیا ہے کہ اس کی کہانت نجوم کے ذریعہ سے تھی شیاطین سے متعلق نہ تھی، اور اگر اسے صفت قرار نہ دیں بلکہ خبر ثانی کہیں تو معنی یہ ہوں گے کہ ہرقل فطری طور پر بھی کاہن تھا اور نجوم کا بھی ماہر تھا۔

چنانچہ خواص سلطنت کے اس سوال پر ہرقل نے کہا کہ میں نے جب رات ستاروں میں نظر کی تو معلوم ہوا کہ میری سلطنت پر ملک ائختان کا غلبہ ہو چکا ہے۔ نجمین کا عقیدہ تھا کہ برج عقرب میں قران السعدین کے وقت آپ کا ظہور ہوگا، برج عقرب مائی ہے جب اس میں چاند اور سورج دونوں مل جاتے ہیں تو یہ وقت نجمین کے نزدیک بہت سعید ہوتا ہے، یہ قران ہر بیس سال کے بعد ہوتا ہے آپ کی ولادت بھی قران السعدین کے وقت ہوئی اور نبوت بھی اسی وقت عطا کی گئی نیز فتح مکہ کے وقت بھی سعدین برج عقرب میں جمع تھے۔

تو بطور عقیدہ اس قران السعدین کے ذریعہ یا کسی اور طریقہ سے ہرقل نے یہ سمجھا کہ ملک ائختان غالب آچکا ہے، اسلئے اساطین سلطنت سے کہا کہ تم یہ معلوم کرو کہ ختنہ کس قوم میں ہوتی ہے چونکہ سلطان روم بہت متفکر تھا اور اعیان دولت کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ شہنشاہ کے خیالات کو ایسے مواقع پر بدل دیں اسلئے صورت یہ اختیار کی گئی کہ یہ رسم تو یہودیوں میں پائی جاتی ہے آپ کو ان کی وجہ سے کوئی تفکر نہ ہونا چاہئے کیونکہ یہ یہودی آپ کے زیر سایہ رہتے ہیں ان کے بس میں کچھ بھی نہیں ہے آپ اپنے قلمروں میں فرمان جاری کر دیجئے کہ جو یہودی بھی ملے اسے ختم کر دیا جائے چنانچہ یہودیوں کی بیٹھے بٹھائے موت آگئی، انہیں اہل عرب کے متعلق اس رواج کا علم نہ تھا اور ممکن ہے کہ علم بھی ہو کیونکہ غسانی لوگوں میں ختان کا طریق برابر جاری تھا جو عربی النسل تھے لیکن چونکہ ان کی قلمرو خود مستقل تھی اسلئے ان پر فرمان قتل کا نفاذ بہت مشکل تھا۔

ابھی یہودیوں کے سلسلہ میں اس قتل کا معاہدہ چل رہا تھا کہ حاکم غسان حارث بن شمر نے ایک آدمی کے ساتھ ہرقل کے پاس ایک مکتوب بھیجا کہ عرب میں ایک نبی پیدا ہوئے ہیں لیکن قوم ان کی بات نہیں مانتی جب یہ غسانی شخص ہرقل کے پاس پہنچا تو ہرقل نے کہا کہ اسے الگ لیجا کر دیکھو کہ یہ مختون تو نہیں ہے، دیکھا گیا تو وہ مختون تھا اسکے بعد اس سے عرب کے عام رواج کے متعلق دریافت کیا گیا تو اس نے بتلایا کہ عرب میں ائختان کا عام رواج ہے، ہرقل نے اپنے مصاحبین سے کہا کہ بس یہی میرے خواب کی تعبیر ہے اور یہ مدعی نبوت انسان تھوڑے ہی عرصہ میں میری قلمرو تک پہنچ جائے گا پھر ہرقل نے ضغاطر کو جو اٹلی میں رہتا تھا اور ہرقل کا کلاس فیلو تھا لکھا تو ضغاطر نے بھی جواب میں ہرقل

کی رائے کی پوری پوری تائید کی کہ آپ ﷺ نبی ہیں۔

محمد بن اسحق نے سیرۃ میں لکھا ہے کہ ضغاطر کے نام یہ مکتوب دحیہ کلبی کی معرفت خفیہ طریق سے بھیجا گیا تھا اور یہ ہدایت کر دی تھی کہ ضغاطر کو تنہائی میں یہ خط دینا؛ چنانچہ ضغاطر کو ہدایت کے مطابق تنہائی میں وہ خط دیا گیا، ضغاطر نے نامہ مبارک کو آنکھوں سے لگایا بوسہ دیا اور نصرانی لباس اتار کر اسلامی لباس پہن لیا، اور ہرقل کے خط کا جواب لکھا کہ میں ایمان لا چکا ہوں اور یہ وہی نبی ہیں جن کا ہمیں ایک مدت سے انتظار تھا پھر اس نے دربار میں اسلام کا اظہار کیا، اول تو درباری لوگ اسلامی لباس ہی سے کھٹکے اور پھر ضغاطر نے کلمہ توحید پڑھا تو وہ بہت برا فروختہ ہوئے اور ضغاطر کو قتل کر دیا، حضرت دحیہ کلبی نے یہ منظر دیکھا تھا ہرقل سے آکر بیان کیا ہرقل نے سوچا کہ جب ان کو رباطن انسانوں نے ضغاطر ہی کی نہیں سنی تو میری کیا سنیں گے اسلئے اظہار کرنا تو حالت کی نزاکت سے پہلو تہی ہے، چنانچہ اس نے تدبیر کی اور تمام اہل دربار کو ایک بڑے ہال میں جمع کیا اور تمام دروازے بند کرادیئے تاکہ کوئی دوسری بات پیدا نہ ہو سکے، اسکے بعد ہرقل نے سلیقہ کے ساتھ ان لوگوں کو دعوت دی جسکو سن کو وہ بھڑک گئے اور کرسیاں چھوڑ کر دروازوں کی طرف بھاگنے لگے بالآخر ہرقل کو بات بدلنا پڑی۔

فكان ذلك اخر شان هو قل: امام بخاری علیہ الرحمہ جب کوئی بات ختم فرماتے ہیں تو اس کے آخر میں کچھ ایسے کلمات لے آتے ہیں کہ خاتمہ کرنے والا آخری حالت پر نظر کرے تاکہ ہر شخص اپنی آخرت کا خیال رکھے، وقت گزر جاتا ہے، عمریں تمام ہو جاتی ہے لیکن انسان کے اچھے یا برے اعمال جو کاتب اسرار لکھتا رہتا ہے نہیں مٹتے، اور خدا کے یہاں اچھائی یا برائی کا معاملہ نیت پر ہوتا ہے یہاں ہرقل کا معاملہ بھی ایسا ہی رہا وہ ایمان نہ لاسکا نامہ مبارک کا واقعہ ۷۷ کا ہے اور ۸ھ میں غزوہ موتہ کے موقع پر ایک لاکھ کی فوج کے ساتھ ہرقل نے مقابلہ کیا ہے غزوہ تبوک میں بھی اطلاعات ملیں کہ ہرقل نے بڑی فوج جمع کر رکھی ہے ان چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے ہرقل کو کوئی تعلق نہ تھا پھر تبوک سے واپسی پر آپ نے سلاطین عالم کے نام دعوت نامے جاری فرمائے ہرقل کے نام بھی دعوت نامہ بھیجا اس نے جواب دیا کہ میں تو مسلمان ہوں، لیکن مسند احمد میں بروایت صحیح موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جھوٹا ہے، ابھی نصرانیت پر ہی قائم ہے، رسول پاک ﷺ کی اس صراحت کے بعد ہرقل کے بارے میں کسی اچھی رائے قائم کرنے کا موقع ہی نہیں رہتا۔

حدیث و ترجمہ کا انطباق | ابتدائے باب میں بتلایا گیا تھا کہ وحی کے تین متعلقات ہیں، موٹی، موٹی، موٹی، موٹی اور واسطہ، وحی اور واسطہ کا ذکر آچکا، اب موٹی ایہ کے احوال کا ذکر بھی ضروری تھا کہ ان کی شان کیا تھی، ان کے اعمال کس قسم کے تھے، اور ان کی تعلیمات کا کیا خلاصہ ہے، ان چیزوں کیلئے امام بخاری علیہ الرحمہ نے اس حدیث ہرقل کا انتخاب فرمایا جس میں رسول اکرم ﷺ کے احوال کے ساتھ آپ کی صداقت و صحت پر دوز بردست

نا قابل انکار شہادتیں موجود ہیں ایک ابوسفیان کا بیان جو اس وقت پیغمبر علیہ السلام کا سخت دشمن تھا، دوسرے مسلم عالم اہل کتاب یعنی ہرقل کا بیان جس نے اپنے ماتحت لوگوں کے سامنے پیغمبر علیہ السلام کی پیغمبری کی پوری پوری تصدیق کی، کہتا ہے کہ مجھے معلوم تھا کہ اس زمانہ میں خاتم الانبیاء پیدا ہونے والے ہیں لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ وہ تم جیسی غیر متمدن اور جاہل قوم کے درمیان پیدا ہوں گے۔

ابوسفیان نے آپ ﷺ کے متعلق جو بیان دیا ہے وہ آپ کے تمام فضائل پر مشتمل ہے، انسان میں دو قسم کی فضیلتیں ہوتی ہیں ایک قولی، دوسرے عملی، قولی فضیلت تو یہ ہے کہ انسان کے بیان پر اسکے بڑے سے بڑے دشمن کو بھی حرف گیری کا موقعہ ہاتھ نہ لگے اور عملی فضیلت کے تین پہلو ہیں، ایک خداوند قدوس کی ذات سے متعلق ہے اور دوسرے خدا کی مخلوق سے اور تیسرے انسان کی اپنی ذات سے، خداوند قدوس کے ساتھ بندے کے معاملات نماز سے ظاہر ہیں کہ بندہ کس طرح اپنی عاجزی اور نیاز مندی کا اعتراف و اظہار کرتا ہے، بندوں کے ساتھ معاملات کی خوبی میں صلہ رحمی کا ذکر ہے کیونکہ صلہ رحمی وہی شخص کر سکتا ہے جس کی طبیعت میں لینت، رحم، شفقت، ایثار و ہمدردی کا بے پناہ جذبہ موجود ہو، تیسری بات اپنی ذات سے متعلق ہے اسکے لئے ”عفاف“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، پاکدامن وہی شخص ہو سکتا ہے جو اپنے آپ کو ہر قسم کے محرمات سے روکے رکھے، ان ہی تین معاملات میں مثالی کردار پیش کرنا انسانی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی ہے، آنحضرت ﷺ کے متعلق ابوسفیان سے شہادت دلائی جا رہی ہے جو اسلام دشمنی کے بارے میں بہت سخت ہیں ان تمام خوبیوں کے اعتراف کے باوجود بھی ان کے دل میں اسلام لانے کا داعیہ پیدا نہیں ہوتا اور جو اس وقت بھی یہی فرما رہے ہیں کہ خداوند قدوس نے میرے دل میں ڈال ہی دیا غرض یہ کہ ان چیزوں میں موجی الیہ کے احوال کی ایک جھلک ہے۔

دشمنوں سے یہ شہادت دلوائی جا رہی ہے کہ ہمیں ان کے متعلق جھوٹ کا خدشہ بھی نہیں گزرتا یہ بھی کہلایا گیا ہے کہ بے سروسامانی کے باوجود کہ ہم ہر طرح جنگی آلات سے لیس تھے مسلمانوں کو ناکامی نہ ہوئی بلکہ ان کی امداد بھی خدوند کریم کی جانب سے کی گئی، اگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام معاذ اللہ اپنے دعوے میں سچے نہ ہوتے تو اول تو بے سروسامانی کے باعث جنگ کے لئے آمادہ ہونا دشوار تھا اور اگر جنگ چھڑ ہی گئی تھی تو کامیابی دشوار تھی نیز یہ کہ جن معرکوں میں شکست ہوئی تھی ان کے بعد پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دل شکستہ ہو کر بیٹھ جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا، آپ کی عزیمت و استقلال میں استحکام آتا رہا کیونکہ خدا کے وعدے پر یقین تھا۔

کان امر اللہ مفعولا (پ ۲۷۵) اور اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہی ہو کر رہتا ہے

اسی یقین پر پتھر کھائے، کانٹوں پر گھسیٹے گئے طرح طرح کی تکالیف برداشت فرمائیں۔

او ذیت فی اللہ سالم یوذیہ مجھے اللہ کے راستے میں وہ تکالیف دی گئیں جو کسی کو

نہیں دی گئیں مجھے اللہ کے راستے میں اتنا ڈرایا گیا
جتنا کسی کو نہیں ڈرایا گیا۔

احدو اخفت فی اللہ عالم
یخف فیہ احد

غرض امام بخاری علیہ الرحمہ نے ان ملکات فاضلہ کا ذکر اور ان کے لئے شہادتیں مہیا کر کے یہ بات ثابت کر دی، ان فضیلتوں کے باعث آپ ہی نبوت کے مستحق تھے، ہر قلم نے بھی دلیل ملی کے طور پر ان حوالوں کو سن کر یہ اندازہ لگایا کہ اس قدر بلند اور نادرہ روزگار شخصیت نہ اس سے قبل پیدا ہوئی اور نہ مستقبل میں ہو سکتی ہے اسلئے یہی آخری نبی ہونے کے مستحق ہیں، ہم لوگ معجزات سے نبوت کا اندازہ لگاتے ہیں حالانکہ معجزہ مدار علیہ نہیں بلکہ معجزات کا مدار نبوت پر ہے پیغمبر علیہ السلام کے ان احوال و ملکات سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر کس و ناکس کو وحی نہیں دی جاتی بلکہ اسکے لئے اونچی شخصیات کا انتخاب کیا جاتا ہے اور خداوند قدوس کی توفیق باندازہ ہمت متعلق ہوتی ہے۔

توفیق باندازہ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں وہ قطرہ ہے جو گوہر نہ ہوا تھا

الی هنا تم کتاب الوحی ویتلوہ کتاب الایمان ان شاء اللہ تعالیٰ



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

[۲] ﴿ کِتَابُ الْاِیْمَانِ ﴾

آغاز کتاب میں وحی کے ذکر اور اس کی عظمت و صداقت کے اثبات سے جب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ تمام بندے خداوند قدوس سے متعلق ہیں تو اب دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اس تعلق کا اظہار بھی کیا جائے یعنی یہ اعتراف کیا جائے کہ ہم خداوند قدوس کے پرستار اور فرماں بردار ہیں، اسی مقصد کے لئے امام بخاریؒ وحی کے بعد ایمان کے بارے میں ابواب قائم فرما رہے ہیں۔

ایمان امن سے ماخوذ ہے جس کے معنی سکون و اطمینان کے ہیں، ایمان دل کی تمام پریشانیوں کا علاج ہے کیونکہ ایمان لانے والے کو مومن بہ کی صداقت و صحت پر کامل اعتماد اور پورا بھروسہ ہوتا ہے اور تصدیق بھی اسی یقین کامل کے نتیجہ میں حاصل ہوتی ہے، ایمان کو تصدیق کے معنی میں اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ انسان نے جسکی بھی تصدیق کر دی گویا اسے اپنی تکذیب سے مامون کر دیا، مومن کو بھی مومن اسی لئے کہتے ہیں کہ لوگ اپنی جان و مال کے بارے میں اس سے مامون ہوتے ہیں، آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

المومن من أمنه الناس علی . مومن وہ ہے کہ جس سے لوگ اپنی جان

دمائهم واموالهم (مشکوٰۃ) . و مال کے بارے میں مامون رہیں

اگر اس لفظ ایمان کا تعلق ذات خداوندی سے ہے تو اسکے معنی تعظیم و تمجید کے ہوں گے اور اس وقت صلہ میں با کا استعمال کیا جائے گا جیسے آمنت باللہ، اور اگر اس کا تعلق اخبار سے ہو تو اسکے معنی تسلیم و اقرار کے ہوں گے اور اس وقت صلہ میں لام کا استعمال کیا جائے گا جیسے۔

مانت بمؤمن لنا (پ ۱۲ ع ۱۲) . آپ ہماری بات نہ مانیں گے،

نیز لغوی اعتبار سے فعل ایمان لازم بھی ہے اور متعدی بھی، اسلئے کہ جب ہمزہ افعال، فعل متعدی پر داخل ہوتا ہے تو اسے متعدی بدو مفعول بنا دیتا ہے یا لازم، اگر آمنت کو متعدی بدو مفعول کہیں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ میں نے فلاں کو اپنی تکذیب سے مامون کر دیا اور اگر اسے لازم قرار دیں تو معنی یہ ہوں گے کہ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں اس پر مجھے پورا اعتماد ہے، متعدی ہونے کی صورت میں ایمان کے معنی تصدیق اور لازم ہونے کی صورت میں معنی وثوق ہوں گے۔

ایمان اصطلاح شریعت میں

لیکن چونکہ ایمان ایک حقیقت شرعی ہے جہاں ہر شے کی تصدیق مقصود نہیں اسلئے ہر شے کی تصدیق کا نام ایمان نہیں رکھا جائیگا چنانچہ السماء فوقنا

والارض تحتنا کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ فقہائے امت اور متکلمین اسلام کے بیان کے مطابق ایمان اصطلاح شریعت میں ان مخصوص امور کی تصدیق کا نام ہے جو بارگاہ نبوت سے بدرجہ ضرورت ثابت ہیں، بعض اکابر امت نے اس کے ساتھ ایک اور بھی قید کا اضافہ کیا ہے کہ تصدیق شرعی، مغیبات سے متعلق ہوتی ہے۔
قرآن کریم کا ارشاد ہے:-

یومنون بالغیب (پ ۱ع ۱) وہ چھپی ہوئی چیزوں پر یقین لاتے ہیں۔

جمہور فقہاء و متکلمین کی ارشاد فرمودہ تعریف میں دو لفظ محتاج بیان ہیں ایک تصدیق اور دوسرے ضرورت، تصدیق اصطلاح حکماء میں اذعان کا نام ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ تصدیق علم و ادراک ہی کا دوسرا نام ہے یا لواحق علم میں سے ہے، محقق بات یہ ہے کہ تصدیق لواحق علم میں سے ہے، بالفاظ دیگر تصدیق محض علم کا نام نہیں ہے بو اختیاری غیر اختیاری دونوں کو عام ہے بلکہ تصدیق ایک ارادی چیز ہے اور حضرت علامہ کشمیریؒ کے الفاظ میں جان لینے کا نام ایمان نہیں ہے بلکہ ایمان مان لینے کو کہتے ہیں ورنہ ابولہب، ابوطالب اور فرعون بھی مومنین کے زمرہ میں داخل ہو جائیں گے کیونکہ علم کی حد تک ان تمام حضرات کو انبیاء علیہم السلام کی صداقت کا یقین تھا حالانکہ ان کے کفر پر امت کا اتفاق ہے، اس ماننے اور جاننے کے فرق کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے میرزا ہد، بحر العلوم اور دوسرے اکابر علماء کے اقوال پر نظر ڈال لینی چاہئے، یہ حضرات تصدیق کو لواحق علم میں سے قرار دیتے ہیں کیونکہ علم انکشاف کا نام ہے اور انکشاف کا تعلق محکوم، محکوم علیہ اور نسبت سے ہوتا ہے لیکن تصدیق صرف اسی انکشاف کا نام نہیں ہے بلکہ خارجی دلائل اس انکشاف کو تصدیق تک لیجاتے ہیں چنانچہ علماء محققین کے نزدیک تصدیق عین علم نہیں ہے اور یہ اس لئے بھی کہ مؤمن ہونے کے لئے محض جان لینا بھی کافی نہیں ہوتا، قرآن کریم میں متعدد مقامات پر ارشاد ہے۔

جحدوا بہا واستیقنتھا

انفسہم (پ ۱۹ع ۱۶)

یعرفونہ کما یعرفون ابناءہم (پ ۷ع ۸)

فلما جاءہم ما عرفوا کفروا بہ

فلعنة اللہ علی الکافرین (پ ۱۱ع ۱۱)

ان تمام آیات میں یہ بات مشترک ہے کہ یہ لوگ پیغمبر علیہ السلام کی صداقت پر یقین کامل کے باوجود مومن نہیں ہوئے، قرآن کریم میں نہ صرف یہ کہ ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے بلکہ ان پر لعنت بھی بھیجی گئی ہے بہر کیف اس

موقعہ پر یقین صداقت بھی ہے اور انکار صداقت بھی، اس لئے فقہاء نے یہ قید بھی لگائی ہے کہ یقین کے ساتھ اقرار لسانی اور تصدیق و تسلیم قلبی بھی ضروری ہے، متکلمین نے بھی اس تسلیم و اقرار کو برقرار رکھا لیکن جزو قرار دینے کے بجائے شرط قرار دیا، یہ شرط اسلئے بھی ضروری ہے کہ دنیوی معاملات تمام ہی اظہار ایمان پر موقوف ہیں، ہاں اگر اظہار اسلام سے کوئی معقول عذر مانع ہو تو دوسری بات ہے لیکن طلب، قدرت اور موقعہ کے میسر ہونے کے باوصف بھی اگر گریز ہے تو یہ ضد اور کفر کی واضح دلیل ہے اور قرآن کریم نے اسی کو جحود سے تعبیر کیا ہے۔

انہیں منکرین صداقت کے یقین و تصدیق کو ایمان سے خارج کرنے کیلئے صدر الشریعہ نے ایک اور راہ نکالی کہ تصدیق شرعی دراصل اس تصدیق اصطلاحی سے مختلف ہے اور یہ اسلئے کہ حکماء کی اصطلاح میں تصدیق کا اطلاق اضطراری اور اختیاری دونوں پر آتا ہے لیکن یہاں کا معاملہ کچھ اور ہے کیونکہ ایمان تمام اعمال میں اصل اور دار و مدار ہے اسی پر ثواب بھی دیا جائیگا اور ثواب کے متعلقات کا اختیاری ہونا ضروری ہے کیونکہ اضطراری امور پر ثواب کے کوئی معنی نہیں، مستحق مدح اور لائق انعام و اکرام وہی شخص ہو سکتا ہے جو ہر طرح کی قدرت کے باوجود صرف اچھے اعمال اختیار کرے۔

اس ارشاد کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان لوگوں کی تصدیق آنحضور ﷺ کے معجزات کے باعث اضطراری تھی، نیز سابق کتابوں کی بیان کردہ علامتیں ایک ایک کر کے صادق آرہی تھیں جس سے اضطراری طور پر تصدیق کی نوبت آ جاتی تھی، غرض صدر الشریعہ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو تصدیق ایمان کی حقیقت ہے اس کے ساتھ انکار ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ایک صاحب عقل ایک بار کسی چیز کے اقرار کے بعد اسکا انکار نہیں کرتا، کیونکہ یہ سفاہت کی علامت ہے، علامہ تفتازانی نے ایک اور راہ نکالی کہ وہ معرفت حقہ یقینیہ جو ان منکرین صداقت کو حاصل تھی از قبیل تصورات ہے، اسے علامہ کے نزدیک تصدیق کہنا درست نہیں ہے کیونکہ تصدیق علامہ علیہ الرحمہ کے نزدیک اس یقین کا نام ہے جس کے ساتھ تسلیم و اقرار بھی شامل ہو، گویا صدر الشریعہ نے جس تصدیق کو اضطراری کہا تھا علامہ نے اسکے تصدیق ہونے ہی سے انکار کر دیا۔

علامہ تفتازانی کے ارشاد کے مطابق تصدیق اصطلاحی اور ایمان میں مساوات کی نسبت ہو جاتی ہے جبکہ صدر الشریعہ کے ارشاد میں تصدیق کو ایمان سے عام قرار دیا گیا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں میں سب سے زیادہ واضح اور پسندیدہ بات یہ ہے کہ ایمان مان لینے کا نام ہے صرف جاننے سے کام نہیں چلتا، بالفاظ دیگر ایمان از قبیل ادراکات نہیں بلکہ از قبیل ارادات ہے۔

ایمان کی تعریف میں دوسرا محتاج بیان لفظ ضرورت تھا، ضرورت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا دین ہونا تو اتر سے ثابت ہو خواہ وہ بات اپنی جگہ بدیہی ہو یا نظری اور پھر وہ بات اس درجہ مشہور ہوگی ہو کہ عوام و خواص کی ایک قابل ذکر تعداد نے اسے جان لیا ہو جیسے توحید، نبوت، ختم رسالت، حشر و نشر، عذاب قبر وغیرہ، یہ تمام چیزیں اپنی جگہ نظری ہیں لیکن

انکا منجملہ دین ہونا نظری نہیں ہے، ضرورت کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اسے ہر شخص جانتا ہو خواہ اس نے تحصیل علم کے سلسلہ میں کتنی ہی لا پرواہی سے کام لیا ہو اور نہ ضرورت کا یہ مطلب ہے کہ اسپر عمل کرنا ضروری ہو کیونکہ دین میں ایسی بھی چیزیں ہیں جن کی اباحت یا استحباب کا اعتقاد ضروری ہے حالانکہ ان پر عمل کرنا ضروری نہیں، اس کی مثال میں مسواک کو پیش کیا جاسکتا ہے اسلئے ضرورت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کا منجملہ دین ہونا تو اتر سے ثابت ہو خواہ فی نفسہ وہ حکم نظری ہو اور خواہ اس پر عمل کرنا بھی ضروری نہ ہو۔

ایمان کے بارے میں مختلف مذاہب | آگے چل کر اس ایمان کے بارے میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا مطلق تصدیق کافی ہے یا اس کے ساتھ اور بھی کوئی قید ہے، اس اختلاف

کے نتیجہ میں متعدد مذاہب پیدا ہو گئے ہیں، پہلا اختلاف تو ایمان کی ترکیب و بساطت کے بارے میں ہے، بسیط ماننے والوں کی دو جماعتیں ہیں، ایک جماعت کہتی ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق ہے، اعمال اور اقرار ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں، اس کی تفصیل میں پھر اختلاف ہو گیا ہے، امام اعظم اور فقہاء علیہم الرحمہ کہتے ہیں کہ ایمان صرف تصدیق کا نام ہے لیکن اعمال ایمان کی ترقی کیلئے نہایت ضروری ہیں اور مرجیہ کہتے ہیں کہ اعمال بالکل غیر ضروری ہیں، ایمان لانے کے بعد نماز ادا کرنا اور کھانا کھانا دونوں برابر ہیں، بسیط ماننے والوں میں دوسری جماعت مرجیہ کرامیہ کی ہے جو صرف اقرار کو ایمان کی حقیقت بتلاتے ہیں تصدیق اور اعمال اس کا جز نہیں ہے صرف شرط یہ ہے کہ اقرار لسانی کے ساتھ دل میں انکار نہ ہونا چاہئے۔

مرکب ماننے والوں کا مطلب یہ ہے کہ ایمان، تصدیق اقرار اور اعمال جو ارح کے مجموعہ کا نام ہے ان حضرات میں باہم اختلاف ہے کہ آیا ان تمام اجزاء کی جزئیت ایک ہی شان کی ہے یا اس میں تفاوت ہے، اہل حق کے نزدیک تصدیق اصل اصول ہے اگر تصدیق نہ رہے گی تو ایمان جاتا رہے گا، رہا اقرار تو وہ اجراء احکام کے لئے ضروری ہے اور اسی طرح اقرار عند الطلب بھی ضروری ہو جاتا ہے، اور اعمال اہل سنت کے نزدیک اجزاء مکملہ ہیں، معتزلہ اور خوارج اعمال کو تصدیق کی طرح ایمان کا جز مانتے ہیں ان کے یہاں مرتکب کبیرہ منکر تصدیق کی طرح ایمان سے خارج ہے۔

آگے چل کر تفصیل خروج میں معتزلہ اور خوارج میں بھی اختلاف ہو گیا ہے کہ خوارج مرتکب کبیرہ کو ایمان سے خارج مانتے ہیں، بایں معنی کہ ایسا شخص کافر ہے اور معتزلہ منزلة بین المنزلتین کے قائل ہیں یعنی مرتکب کبیرہ ان کے نزدیک نہ مومن ہے نہ کافر، مومن اس لئے نہیں کہ اس نے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے جو ایمان کے منافی ہے اور کافر اسلئے نہیں کہا جاسکتا کہ ابھی تصدیق باقی ہے مگر اس اختلاف کے باوجود نتیجہ میں دونوں فریق متفق ہیں کہ ایسا شخص مخلد فی النار ہوگا لیکن اہل سنت کا اتفاق ہے کہ اعمال حقیقت ایمان میں داخل نہیں اسی لئے جو اہل سنت اعمال کو داخل مانتے ہیں انکا یہ مطلب ہے کہ اعمال کمال ایمان کیلئے ضروری ہیں انکا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ اعمال حقیقت ایمان

میں داخل ہیں اور تصدیق کی طرح ایمان کا جز ہیں اسی طرح جو اہل سنت داخل نہیں مانتے ان کا مفہوم یہ ہے کہ اعمال حقیقت ایمانی میں تو داخل نہیں مگر ایمان کی ترقی اور نمو کے لئے ضروری ہیں، یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ امام اعظم علیہ الرحمہ کو صرف اسلئے مرجیہ میں شمار کرتے ہیں کہ انہوں نے اعمال کو جزو ایمان نہیں قرار دیا وہ سخت غلط فہمی کا شکار ہیں اسلئے کہ صرف عنوان والفاظ کے اتحاد و اشتراک سے معانی کا اتحاد لازم نہیں ہے۔

احناف کو مرجیہ کہنے میں بہت سے لوگوں نے تعدی سے کام لیا ہے کچھ لوگوں نے تو اسکا انتساب حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف کیا کہ انہوں نے غنیۃ الطالبین میں احناف کو مرجیہ لکھا ہے لیکن یہ تحقیق ثابت ہے کہ یہ سب دسیسہ کاری ہے، اس کتاب کے تین نسخے دیکھنے میں آئے، پہلے نسخہ میں تو سرے سے اس کا ذکر ہی نہیں اور جب دوبارہ طبع ہوئی تو ناشرین اہلحدیث نے اسے حاشیہ پر لکھ دیا اور جب تیسری بار طبع ہوئی تو اسے اصل متن میں داخل کر دیا گیا لیکن یہ سب غلط ہے۔

عبدالکریم شہرستانی نے کتاب ملل و نحل میں بہ تصریح لکھا ہے کہ مرجیہ کی دو قسمیں ہیں، ایک مرجیہ اہل بدعت، اور دوسرے مرجیہ اہلسنت، مرجیہ اہل بدعت نے اعمال کو بالکل لغو اور مہمل قرار دیا ہے یعنی اگر ایمان حاصل ہے تو پھر کوئی گناہ بھی اسے مضحک نہیں کر سکتا اور دوسرے مرجیہ اہل سنت ہیں جو اعمال کو ایمان کا جز تو نہیں کہتے لیکن اعمال سے کسی درجہ میں بے التفاتی بھی ان کے یہاں روا نہیں سمجھی جاتی، بلکہ وہ پوری سختی کے ساتھ اعمال پر کار بند رہتے ہیں اور بے عمل کو فاسق کہتے ہیں، شہرستانی نے لکھا ہے کہ احناف کو دوسری قسم میں داخل کیا گیا ہے، لیکن اگر ان تمام حقائق و تصریحات کے علی الرغم بھی احناف کو مرجیہ کہنا روا ہے، تو محض اشتراک لفظی کے ناطے سے محدثین اور ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کو معتزلہ اور خوارج کی صف میں لے آنا ہوگا جو کسی بھی طرح درست نہیں۔

اہل سنت کے درمیان اس اختلاف کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہمیں ایک مرتبہ محدثین اور ائمہ کے ماحول اور عصر پر نظر ڈال لینا چاہئے، حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ ان اہل حق کا مقابلہ ہر دور میں فرق باطلہ سے رہا ہے، اور ان حضرات نے ہمیشہ زمانہ کی مصلحتوں کی رعایت کرتے ہوئے ان کا رد کیا ہے چنانچہ امام اعظم کے دور میں معتزلہ کا اثر تھا، انتہاء یہ ہے کہ حکومت کا مسلک بھی اعتزال تھا، امام اعظم نے تقاضائے عصر کے اعتبار سے معتزلہ کی پوری مخالفت کی، معتزلہ نے اعمال کو جزو ایمان بتلایا تو امام نے انہیں ایمان سے خارج کر دیا اور جب امام شافعی علیہ الرحمہ کا دور آیا تو مرجیہ اور کرامیہ سے مقابلہ تھا اسلئے امام شافعی نے فرمایا کہ تم اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتلاتے ہو میں کہتا ہوں کہ اعمال داخل ایمان اور نہایت ضروری ہیں اور اگر اعمال نہ ہوں تو ایمان خطرہ میں آجاتا ہے۔

غرض یہ کہ حقیقت تمام اہل سنت کے نزدیک ایک ہے اور تعبیرات کا یہ اختلاف، اختلاف اعصار کا نتیجہ ہے، درحقیقت ایمان دو طرح کا ہے ایک کامل، اور دوسرا ناقص، ایمان کامل کے نتیجہ میں جنت میں دخول اولی متوقع ہے اس

کے لئے تصدیق اعمال اور اقرار سب ہی کی ضرورت ہے، اور ایک وہ ایمان ہے جو خلود فی النار سے منجی ہے اسکے لئے صرف تصدیق بھی کافی ہے، تصدیق کتنی بھی دھندلی ہو لیکن ایک وقت ایسا آئیگا کہ وہ تصدیق کرنے والے کو جنت میں لے جائیگی کیونکہ ایمان جنت کی چیز ہے اسی لئے مومن جب جہنم میں جائے گا تو اس کا ایمان نکال کر باہر رکھ دیا جائیگا جیسا کہ قیدی کا لباس اتار کر رکھ لیتے ہیں اور پھر رہائی کے وقت اسے واپس کر دیا جاتا ہے گویا وہ ایمان جو جنت میں لیجانے کا باعث ہے جو کسی بھی وقت جنت میں لیجا سکتا ہے اور خلود فی النار سے منجی ہے صرف تصدیق سے عبارت ہے، ارشاد ہے۔

مامن عبد قال لا اله الا الله
ثم مات على ذلك الادخل
الجنة (مشکوٰۃ کتاب الایمان وقال متفق علیہ)

اللہ کا کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جس نے
لا اله الا اللہ کی شہادت دی اور پھر اسی کلمہ
پر انتقال ہو گیا مگر یہ کہ وہ جنت میں داخل ہوگا۔

حضرت ابو ذرؓ نے سوال کیا وان زنی وان سرق یعنی خواہ وہ زنا اور چوری کا بھی ارتکاب کرے، اور جب حضرت ابو ذرؓ نے بار بار سوال کیا تو تیسری بار آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا وان زنی وان سرق علی رغم انف ابی ذر خواہ زنا اور چوری کرے ابو ذر کی ناک خاک آلودہ ہو۔

معلوم ہوا کہ نجات عن الخلو کیلئے صرف تصدیق بھی کافی ہے ہاں اگر اول دخول کی طلب ہے تو اس کیلئے اعمال کی بھی ضرورت ہے کیونکہ نجات عن الخلو کے لئے تو تصدیق کا دھندلا سا نقش بھی کافی ہے، جب قیامت میں آنحضور ﷺ کو سفارش کی اجازت دی جائے گی تو ارشاد ہوگا کہ جس کے قلب میں جو کے برابر ایمان ہو اسے نکال لو، جس کے دل میں گیبوں کے برابر ایمان ہو اسے نکال لو تاہم جس کے دل میں ذرہ برابر ایمان ہو اسے نکال لو، چنانچہ ان تمام لوگوں کو دوزخ سے نکالنے کے بعد اعلان ہو جائے گا کہ اب ان لوگوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو جنت میں آنے کا مستحق ہو، اس کے بعد حق جل مجدہ ارشاد فرمائیں گے کہ اب ہمارا نمبر ہے اور خداوند قدوس ان لوگوں کو نکالیں گے جن کے پاس تصدیق تو تھی مگر عمل کی روشنی بالکل نہ تھی، یہ لوگ اپنے پاس تصدیق کا اتنا دھندلا نقش رکھتے تھے کہ جس کو حضرت پیغمبر علیہ السلام کی نگاہ بھی نہ دیکھ سکی، اس سے اندازہ ہوا کہ ایمان کا ایک وہ بھی درجہ ہے جو صرف منجی عن النار ہے، بس یہی وہ مرتبہ ہے جس کے متعلق امام اعظمؒ فرماتے ہیں کہ یہ کمی و زیادتی قبول نہیں کرتا، اس لئے کہ اگر اس سے ذرا نیچے اتر تو کفر آجاتا ہے اور زیادتی قبول نہ کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ صحت ایمان کیلئے یہ دعویٰ بھی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس سے اوپر کے درجات پر موقوف ہے اور ان اوپر کے درجات کے بغیر دخول جنت ناممکن ہے۔

گویا اب اجزاء میں مکملہ اور مقومہ، اور عرفی و شرعی کی تقسیم ہے اور اسکے بعد امام رازیؒ کا یہ اعتراض بھی درست نہیں کہ ایمان کو چند چیزوں کا مجموعہ قرار دیتے ہو تو پھر غیر عامل کو کافر قرار دینا ہوگا کیونکہ جز کے فقدان سے کل کا

فقدان لازم آجاتا ہے، لیکن یہاں اجزاء کو مقومہ اور مکملہ پر تقسیم کر دیا گیا ہے اور اس طرح یہ اعتراض اٹھ جاتا ہے کیونکہ اجزاء مقومہ کا فقدان تو واقعی فقدان کل کو مستلزم ہے لیکن اجزاء مکملہ کے فقدان سے کچھ نہیں ہوتا۔

دوسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم یہ قانون تسلیم ہی نہیں کرتے کہ جز کے انعدام سے کل معدوم ہو جاتا ہے، زائد سے زائد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تمامیت میں نقصان آجاتا ہے یا صورت میں تغیر آجاتا ہے مثلاً اگر انسان کے بعض اعضاء کاٹ دیئے جائیں یا درخت کی شاخیں تراش دی جائیں تو انسان یا درخت بالکل معدوم نہیں ہوتے بلکہ صرف نقص آجاتا ہے اس اعتراض کے رفع کے لئے سب لوگوں نے توجیہ کی ہے جن کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے ان اجزاء کو مقومہ نہیں بلکہ مکملہ بتلایا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ اہل سنت کے سلف و خلف کے درمیان کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے، ان سب کے نزدیک ایمان صرف تصدیق کا نام ہے اور باقی سب کچھ الفاظ و تعبیر کا فرق ہے، اعمال کا معاملہ یہ ہے کہ اہل سنت کے ایک فریق نے اپنے عصر و زمانہ کی رعایت اور اپنے مقابل فرقہ باطلہ کی جواب دہی کے سبب ان کو ایمان سے خارج بتایا، اور جب حالات بدل گئے یعنی باطل فرقوں نے اپنے محاذ تبدیل کر لئے تو اہل سنت کو بھی ان کے مقابلہ کے لئے اپنی تعبیرات میں تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، انہوں نے اعمال کو ایمان میں داخل مانا لیکن کبیرہ کے مرتکب کو ایمان سے خارج نہیں قرار دیا، دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہل سنت میں جن لوگوں نے اعمال کو ایمان کا جز کہا ہے انہوں نے ایمان سے ایمان کامل مراد لیا ہے، اور جن لوگوں نے اعمال کو ایمان کا جز نہیں قرار دیا انہوں نے ایمان سے، ایمان کی حقیقت مراد لی ہے۔

[۱] بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ بِنِي الْإِسْلَامِ عَلَى خَمْسٍ

وَهُوَ قَوْلٌ وَفِعْلٌ وَيَزِيدُ وَيَنْقُصُ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى لِيَزِدُوا إِيمَانًا مَعَ إِيمَانِهِمْ (فتح: ۴)
 وَزِدْنَاهُمْ هُدًى (كهف: ۱۳) وَيَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى (مریم: ۷۶) وَالَّذِينَ
 اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَاتَّهَمَ تَقْوَاهُمْ (محمد: ۱۷) وَيَزِدَادَ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا (مدرثر: ۳۱) وَقَوْلُهُ عَزَّ
 وَجَلَّ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَذِهِ إِيمَانًا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فزَادَتْهُمْ إِيمَانًا (توبہ: ۱۲۳) وَقَوْلُهُ فَآخَشَوْهُمْ
 فزَادَهُمْ إِيمَانًا (آل عمران: ۱۷۳) وَقَوْلُهُ مَا زَادَهُمْ إِلَّا إِيمَانًا وَتَسْلِيمًا (احزاب: ۲۲)
 وَالْحُبُّ فِي اللَّهِ وَالْبُغْضُ فِي اللَّهِ مِنَ الْإِيمَانِ وَكَتَبَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيزِ إِلَى عَبْدِ بْنِ
 عَدِيٍّ إِنَّ لِلْإِيمَانِ فَرَائِضَ وَشَرَائِعَ وَحُدُودًا وَسُنَنًا فَمَنْ اسْتَكْمَلَهَا اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ
 وَمَنْ لَمْ يَسْتَكْمِلْهَا لَمْ يَسْتَكْمِلِ الْإِيمَانَ، فَإِنْ أَعِشَ فَسَأَبِّئْهَا لَكُمْ حَتَّى تَعْمَلُوا بِهَا وَإِنْ

أُمَّتٌ فَمَا أَنَا عَلَىٰ صُحْبَتِكُمْ بِحَرِيصٍ، وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ وَلَكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي (بقرہ: ۲۶۰) وَقَالَ مَعَاذَ اجْلِسِ بِنَانُومِنْ سَاعَةً وَقَالَ ابْنُ مَسْعُودٍ الْيَقِينُ الْإِيمَانُ كُلُّهُ، وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ حَقِيقَةَ التَّقْوَىٰ حَتَّىٰ يَدَعَ مَا حَاكَ فِي الصَّدْرِ وَقَالَ مُجَاهِدٌ شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا، (شوری: ۱۳) أَوْصَيْنَاكَ يَا مُحَمَّدُ وَإِيَّاهُ دِينًا وَاحِدًا وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ شِرْعَةٌ وَمِنْهَا جَاءَ (مائدہ: ۴۸) سَبِيلًا وَسُنَّةٌ دُعَاؤُكُمْ إِيْمَانُكُمْ .

ترجمہ | باب، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اور وہ قول و فعل دونوں پر مشتمل ہے اور وہ زیادتی کمی کو قبول کرتا ہے، خداوند قدوس کا ارشاد ہے، لیزدادوا ایماناً مع ایمانہم (پ ۲۶ ع ۹) تاکہ ان کے پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو جائے اور وزدنہم ہدی (پ ۱۵ ع ۱۴) اور ہم نے انکی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی، اور ویزید اللہ الذین اہتدوا ہدی (پ ۱۶ ع ۸) اور اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کو ہدایت بڑھاتا ہے، اور والذین اہتدوا زادہم ہدی واثہم تقوہم (پ ۲۶ ع ۵) اور جو لوگ راہ پر ہیں اللہ تعالیٰ انکو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انکو انکے تقوے کی توفیق دیتا ہے، اور ویزداد الذین امنوا ایماناً (پ ۲۹ ع ۲۵) اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے، اور ایکم زادتہ ہذہ ایماناً فاما الذین امنوا فزادتہم ایماناً (پ ۱۱ ع ۵) اس صورت نے تم میں سے کس کے ایمان میں ترقی دی سو جو لوگ ایماندار ہیں اس سورت نے انکے ایمان میں ترقی دی ہے، اور فاخشوہم فزادہم ایماناً (پ ۳ ع ۹) سو تم کو ان سے اندیشہ کرنا چاہئے تو اس لئے ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیا، اور وما زادہم الا ایماناً و تسلیماً (پ ۲۱ ع ۱۹) اور اس سے ان کے ایمان و اطاعت میں اور ترقی ہوگئی، اور اللہ کے لئے محبت اور اس کے لئے بغض رکھنا بھی داخل ایمان ہے، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے حضرت عدی بن عدی کو لکھا کہ ایمان کے لئے فرائض، شرائع، حدود اور سنن ہیں پس جس شخص نے ان تمام چیزوں کو پورا کر لیا اسنے ایمان کو پورا کر لیا اور جس نے ان تمام چیزوں کو پورا نہیں کیا اس نے ایمان کو کامل نہیں کیا پس اگر میں زندہ رہا تو ان چیزوں کو تمہارے لئے بیان کر دوں گا تاکہ تم ان پر عمل کر سکو اور اگر میں مر گیا تو میں تمہاری صحبت کے لئے حریص نہیں ہوں اور حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

وَلَكِنْ لِيَطْمَئِنَّ قَلْبِي (پ ۳ ع ۳) لیکن اس لئے کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے۔

اور حضرت معاذ بن جبل نے فرمایا کہ ہمارے پاس بیٹھ جاؤ کچھ دیر ایمان تازہ کریں اور حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ یقین کل کا کل ایمان ہے، حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ بندہ اس وقت تک تقویٰ کی حقیقت نہیں پاسکتا جب تک ان باتوں کو نہ چھوڑ دے جو دل میں کھکتی ہیں مجاہد نے شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا کی تفسیر میں فرمایا کہ اے محمد ہم نے آپ کو اور نوح کو ایک ہی دین کی وصیت کی تھی، حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ وَلِكُلِّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ

شُرْعَةً وَمِنْهَا جَاءَ مِیْن شُرْعَةٍ كَ مَعْنَى سَبِيلٍ اَوْر مِنْهَا جَاءَ كَ مَعْنَى سُنَّتِ كَ هِیْنَ۔

مقصد ترجمہ | امام بخاری علیہ الرحمہ نے ابتداء ترجمہ میں تین جملے ارشاد فرمائے ہیں، اور ان میں ہر پہلا جملہ دوسرے کے لئے بمنزلہ علت کے ہے، یا ہر دوسرا جملہ پہلے کے لئے بمنزلہ نتیجہ کے ہے، پہلا جملہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے اور اگر ان کی تقسیم و تحلیل کی جائے تو ان میں دو طرح کی چیزیں نکلیں گی ایک اقوال اور دوسرے افعال، نتیجہ کے طور پر یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایمان قول و فعل کا نام ہے، اور یہ بھی کہا سکتا ہے کہ ایمان قول و فعل سے مرکب ہے، اور جب اسلام مرکب ہو تو نتیجہ میں یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس میں زیادتی و کمی کی قابلیت ہے کیونکہ جو چیز مختلف اجزاء سے مرکب ہوتی ہے اس میں یقینی طور پر کمی زیادتی کی صلاحیت ہوتی ہے، گویا اب یہاں مستقل طور پر دو مسئلے ہو گئے ایک مسئلہ ایمان کی ترکیب و بساطت کا ہے، اور دوسرا مسئلہ قبولیت زیادت و نقصان سے متعلق ہے۔

اعمال کی جزئیت کا مسئلہ | اور اگر ایمان صرف تصدیق کا نام رکھا جائے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جمیع ما جاء به الرسول کے لئے سر تسلیم خم کر دے تو ایمان ایک بسیط اور غیر ذی اجزاء شئی ہوگا اور اگر اس طور پر ایمان کو بسیط تسلیم کر لیا جائے تو زیادت و نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، گویا اعمال کا ایمان سے گہرا ربط ہے اور اسی وجہ سے متعدد مقامات پر اعمال پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے کیونکہ کبھی متعلقات شے کو شے کا حکم دے دیا جاتا ہے بلکہ ایسا اطلاق کلام عرب میں شائع ذائع ہے۔

اس کے مقابل دوسری رائے یہ ہے کہ ایمان مرکب ہے، ذی اجزاء ہے اور قابل زیادت و نقصان ہے، رہی یہ بات کہ وہ اجزاء کیا ہیں تو اقرار اس درجہ میں تو سب کے یہاں مسلم ہے کہ جب تک وہ شخص یہ اقرار نہ کرے کہ میں خدا کو ایک مانتا ہوں اور اس کے تمام اوامر و نواہی کو واجباً تسلیم سمجھتا ہوں اس وقت تک اسے دنیا مومن نہیں کہہ سکتی، فیما بینہ و بین اللہ جو بھی معاملہ ہو لیکن دنیا میں تمام اسلامی معاملات و احکام کا مدار اسی اقرار پر ہے، گویا اقرار بعض حالات میں ساقط بھی ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا، اَلَا مَنْ اٰكْرَهٗ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ (پ ۱۴ ع ۲۰) مگر جس شخص پر زبردستی کی جائے بشرطیکہ اس کا قلب ایمان پر مطمئن ہو۔

اب رہے اعمال تو جس طرح اقرار حالات کی ترجمانی کرتا ہے اسی طرح یہ اعمال جو ارح بھی دراصل اسی ایمان کی تعین و تائید کرتے ہیں اور ایمان کو مرکب ماننے والے یہ حضرات اعمال کو ایمان کا جزو بتلاتے ہیں، امام بخاری علیہ الرحمہ کی رائے بھی یہی ہے اسی لئے امام نے ترجمہ کا عنوان بنی الاسلام علی خمس رکھا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ دل سے تصدیق کرنے والے ایسے انسان کو آپ مومن کہیں گے یا نہیں جو موقعہ میسر نہ آسکے یا تساہل و غفلت برتنے کے باعث کوئی عمل خیر نہ کر سکا، ہم بھی جانتے ہیں کہ آپ اسے مومن فاسق کہتے ہیں

کیونکہ ایمان کے لئے تو صرف رضینا باللہ زباً وبالاسلام دینا وبمحمد نبیاً، کہنا کافی ہے، گویا آپ کے یہاں بھی جزئیت اس درجہ کی نہیں جس کے فقدان سے ایمان کا فقدان لازم ہو بلکہ ایمان کو قوی بنانے کیلئے جس طرح اقرار ضروری ہے اسی طرح اعمال کی بھی ضرورت ہے کیونکہ ان سے ایمان میں نمو پیدا ہوتا ہے، ہر عمل کا ایک نور اور ہر اطاعت کی ایک روشنی ہے، جس قدر طاعات بڑھیں گی اس قدر انوار بڑھیں گے اور ایمان میں رونق و شادابی آتی چلی جائے گی کیونکہ اگر طاعات نہیں بلکہ معاصی ہیں تو ہر معصیت کی ایک ظلمت ہوتی ہیں اور ہر معصیت قلب پر ایک نقطہ سیاہ پیدا کرتی ہے اور اس نور کی جگہ جو ایمان کا نتیجہ تھا داغ پیدا ہو جاتا ہے، اگر اس داغ کو توبہ کے ذریعہ فوراً دھو دیا جائے تو قلب صاف ہو جائیگا ورنہ دوسری معصیت کا داعیہ پیدا ہوگا اور پھر تیسری معصیت کی ترغیب ہوگی غرض ہر معصیت پر ایک سیاہ داغ قائم ہوتا جائے گا تاہم یہ سیاہی تمام قلب کا احاطہ کر لیتی ہے، قرآن کریم نے اس کی تعبیر اس طرح کی ہے:

کلا بل ران علی قلوبہم ما کانوا

ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے دلوں پر انکے

اعمال (بد) کا رنگ بیٹھ گیا ہے۔

یکسبون (پ ۳۰ ع ۸)

اور جس طرح معاصی کی یہ ظلمت بڑھتی رہتی ہے اسی طرح طاعات کی روشنی نمو پذیر ہوتی ہے اور پھر یہ روشنی دوسری طاعات کیلئے محرک ہوتی ہے یہاں تک کہ تمام قلب نور سے معمور ہو جاتا ہے اور اسکے بعد دوسروں کو متاثر کرنے کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس پوری گزارش سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ علماء کے درمیان اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں ہے صرف تعبیر کا فرق ہے، اب دوسرا مسئلہ اعمال کے جزو ایمان ہونے کا ہے، علامہ عینی رحمہ اللہ اور دوسرے علماء نے اعمال کے ایمان کی حقیقت سے خارج ہونے پر مختلف وجوہ سے استدلال کیا ہے۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ قرآن کریم میں جہاں بھی ایمان و اعمال کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ایمان پر اعمال کو بصیغہ عطف ذکر فرمایا ہے اور یہ مسلم ہے کہ معطوف اور معطوف علیہ میں مغائرت ہوتی ہے مثلاً،

اِنَّ الدِّينَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّٰلِحٰتِ (پ ۱۶ ع ۳) بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے۔

اگر یہ اعمال صالحہ ایمان کا جزو ہوتے تو ان کا الگ ذکر کرنا محض تکرار ہو جاتا اسلئے بصیغہ عطف اعمال کا ذکر تغایر کی دلیل ہے، جواب دینے والوں نے اس کے جوابات دیئے ہیں مثلاً یہ کہ اعمال کا ذکر زیادتی اہتمام کے لئے ہے یعنی چونکہ ایمان کے کئی جز ہیں اور ایسا ممکن ہے کہ کسی جز سے ذہول ہو جائے اس لئے تصریح کر کے توجہ دلائی جا رہی ہے کہ اجزاء ایمان میں اعمال کو خاص امتیاز حاصل ہے اور یہ اپنی اہمیت کے اعتبار سے خاص توجہ کے طالب ہیں جیسے کہ ملائکہ کے ذکر کے بعد مزید اہتمام کی غرض سے جبرئیل و میکائیل کا ذکر کرتے ہیں اس کا مفہوم یہ نہیں کہ جبرئیل و میکائیل زمرہ ملائکہ سے خارج ہیں ہاں صرف اتنی بات ہے کہ جبرئیل و میکائیل خصوصی امتیاز کے مالک ہیں اسی طرح

حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَأُفَّاكِهِمْ وَنَخْلٍ وَرُمَّانٍ فِي صَلَاةِ وَسْطَىٰ أَوْ نَخْلٍ وَرُمَّانٍ كَالْعِلَّةِ ذَكَرَ
بھی مزید اہتمام کی غرض سے ہے۔

لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے مزید اہتمام اس چیز کا ہوتا ہے جو خصوصیات میں ذکر شدہ چیز سے زیادہ اہم ہو
جیسا کہ اوپر کی مثالوں سے ظاہر ہے اور یہاں ایمان اعمال سے زیادہ اہم ہے کیونکہ ایمان ہی اصل ہے نیز یہ کہ ہمارا
استدلال صرف عطف و معطوف پر ہی منحصر نہیں بلکہ ہمارے استدلال کی جان قرآن کریم کا سیاق و سباق ہے جس سے
اس کی جزیت متبادر نہیں ہوتی اسی طرح بہت سی آیتوں میں باری تعالیٰ نے بندوں کو بلفظ امنوا خطاب فرمایا ہے اور اس
کے بعد اعمال صالحہ کا حکم دیا ہے، نماز روزے اور وضو وغیرہ کی آیات اس کی مثال میں پیش کی جاسکتی ہیں، اس سے بھی
یہی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان کے مفہوم سے خارج ہیں ورنہ امنوا کہنے کے بعد اعمال کے مستقل تذکرے کی کوئی
ضرورت نہیں۔

(۲) قرآن کریم میں اعمال کو ایمان کے ساتھ بطور شرط ذکر کیا گیا ہے۔ آیت کریمہ ملاحظہ ہو
مَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ
سوجو شخص نیک کام کرتا ہوگا اور وہ ایمان والا
فَلَا كُفْرَانَ لِسَعِيهِ (پ ۷۷ ع ۷)
بھی ہوگا سوا کسی محنت اکارت جانیوالی نہیں۔

ایک دوسری آیت میں حرف شرط کے ساتھ ملاحظہ ہو:
وَأَصْلِحُوا ذَاتَ بَيْنِكُمْ وَأَطِيعُوا اللَّهَ
اور اپنے باہمی تعلقات کی اصلاح کرو اور اللہ اور
وَرَسُولَهُ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ
اسکے رسول کی اطاعت کرو اگر تم ایمان والے ہو۔

اس شرطیت کے انداز میں ذکر کرنے سے معلوم ہو رہا ہے کہ اعمال ایمان سے خارج ہیں کیونکہ شرط اصل شے
سے خارج ہوا کرتی ہے، اب اگر عطف و معطوف کے سلسلہ میں یہ تاویل کر بھی لیں کہ زیادتی اہتمام کی غرض سے ایسا ہوا
تو اس شرط اور قید کے ساتھ تعبیر کے بارے میں تو کوئی تاویل بھی نہیں چلتی،

(۳) اگر اعمال صالحہ کو جزو ایمان قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ معاصی ایمان کی ضد قرار دئے جائینگے اور مسلم
ہے کہ کوئی شے اپنی ضد کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی ان دو باتوں کے تسلیم کر لینے کے بعد کسی بھی معصیت کا اجتماع ایمان
کے ساتھ غلط ہوگا حالانکہ آیات کریمہ میں ایمان کے ساتھ معاصی کا اجتماع پایا جاتا ہے، ارشاد ہے:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا
جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے
إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ (پ ۷۷ ع ۱۵)
ایمان کو ظلم کے ساتھ نہیں ملاتے،

اگر یہ صحیح ہے کہ ایمان معصیت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تو آیت لم يلبسوا ایمانہم بظلم میں کس طرح
درست کہا جائے، ظاہر ہے کہ آیت کی روشنی میں یہ اجتماع درست ہے، ایک اور جگہ ارشاد ہے:

اور اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں
تو انکے درمیان صلح کرادو۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا
فَأَصْلِحْهُمَا (پ ۳۶ ع ۳)

قتال مومن اتنا بڑا گناہ ہے کہ اسے قتالہ کفر سے تعبیر کیا گیا ہے گو یہ وہ کفر نہیں ہے جو حیط اعمال اور خلود فی النار کا سبب ہو مگر لفظ کفر کے ساتھ تعبیر بھی نہایت اہمیت کا پتہ دیتی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس جرم کے ارتکاب کے وقت بھی مومن ہی سے خطاب کیا گیا ہے، حالانکہ یہ ایک شریف لقب ہے اور اپنے اطلاق کیلئے شرافت کا طالب ہے، الغرض اگر اعمال صالحہ جزو ایمان ہوتے تو ان کی ضد یعنی معاصی کا ایمان کے ساتھ مجتمع ہونا درست نہ ہوتا حالانکہ آیات کریمہ سے اس اطلاق و اجتماع کی صحت معلوم ہو رہی ہے اور اسی اجتماع معاصی کے نتیجے میں قرآن کریم میں متعدد مقامات پر مومنین کو توبہ کا حکم فرمایا گیا ہے، ارشاد ہے:

اے ایمان والو! تم اللہ کے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ

آگے سچی توبہ کرو

تَوْبَةً نَّصُوحًا (پ ۲۸ ع ۲)

مسلمانو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو۔

تَوْبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهُ الْمُؤْمِنُونَ (پ ۱۸ ع ۱۰)

یہ توبہ کا ایمان کے ساتھ ذکر فرمانا بتلا رہا ہے کہ ایمان معصیت کیساتھ جمع ہو سکتا ہے، اسلئے کہ معصیت کے بغیر توبہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس سے معلوم ہوا کہ معاصی ضد ایمان نہیں ہیں اور نہ اعمال صالحہ جزو ایمان ہیں۔ (۴) اس سلسلے میں ایک نہایت اہم بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں دعوت ایمان بہ لفظ امنوا دی گئی ہے اور اہل عرب اس لفظ کو صرف تصدیق ہی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور اب تک یہ ثابت نہیں ہے کہ اس تصدیق کے علاوہ بھی کسی اور معنی میں استعمال کیا گیا ہو اور یہ ناممکن ہے کہ ایمان جیسا کثیر الاستعمال لفظ کسی دوسرے معنی میں منقول یا مستعمل ہو اور اہل لغت اس کا ذکر نہ کریں۔

(۵) اس اثبات کے لئے کہ ایمان کی حقیقت میں اعمال داخل نہیں یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ جب

جبریل علیہ السلام نے آکر رسول اکرم ﷺ سے ایمان کے بارے میں سوالات کئے تو آنحضرت ﷺ نے صرف تصدیق و اعتقاد سے متعلق امور کا ذکر فرمایا، ارشاد ہے:

ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر، اسکے ملائکہ پر اسکے

الایمان ان تو من باللہ وملئکتہ

دیدار پر اور اسکے رسولوں پر اور مرنے کے

وبلقائه ورسوله وتومن بالبعث

بعد اٹھائے جانے کے عقیدے پر ایمان لاؤ۔

بعد الموت (بخاری کتاب الایمان)

حدیث شریف میں ہے کہ اس ارشاد کے بعد رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ جبریل امین تھے لوگوں کو دین

کی تعلیم دینے کے لئے آئے تھے، اب اگر ایمان کے مفہوم میں تصدیق کے علاوہ اور بھی اجزاء شامل ہیں تو اس کا مفہوم

یہ ہے کہ معاذ اللہ حقیقت ایمان کے بیان میں آپ سے کچھ کوتاہی ہوگئی کیونکہ آپ نے صرف اعتقادات کا ذکر فرمایا اور اعمال کو قطعاً ترک فرمادیا، دوسری بات یہ کہ اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو حضرت جبریل علیہ السلام کی تشریف آوری کا مقصد پورا نہیں ہوتا کیونکہ وہ دین کی تعلیم کی غرض سے تشریف لائے تھے اور یہاں دین کی بات پوری طرح سامنے نہ آنے کے وجہ سے اسکی تکمیل ہی نہ ہو سکی، حالانکہ یہ ناممکن ہے اور اس کا تصور بھی درست نہیں۔

(۶) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ کوئی صحابی ایک سیاہ فام جاریہ کو لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ مجھ پر ایک رقبہ مومنہ کا اعتناق واجب ہے، اگر آپ اس جاریہ کو مومن سمجھتے ہوں تو آزاد فرمادیں، آنحضرت ﷺ نے اس جاریہ سے دریافت فرمایا کیا تو لا الہ الا اللہ کی شہادت دیتی ہے؟ جاریہ نے کہا جی ہاں! آپ نے دریافت فرمایا کیا تو گواہی دیتی ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں؟ جاریہ نے اثبات میں جواب دیا، آپ نے فرمایا کیا تو حشر و نشر پر ایمان رکھتی ہے اس نے اس ارشاد کا جواب بھی اثبات میں دیا، ان سوالات کے بعد آنحضرت ﷺ نے صحابی سے ارشاد فرمایا کہ اسے آزاد کر دو، یہ مومنہ ہے، اس حدیث میں جاریہ کے مومنہ اور غیر مومنہ ہونے کے سلسلہ میں جن چیزوں کے بارے میں سوال کیا گیا ہے وہ سب اعتقادات سے متعلق ہیں، اگر ایمان کے لئے اعمال بھی ضروری ہوتے تو ضرور اس جاریہ سے ان کے بارے میں سوال فرمایا جاتا، معلوم ہوا کہ اعمال کی شان جزئیت کی نہیں ہے۔

(۷) قرآن کریم میں ایمان کے قلبی امور میں سے ہونے پر تصریح فرمائی گئی ہے یعنی یہ بتلایا گیا ہے کہ قلب

محل ایمان ہے، ارشاد ہے:

ان لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان مثبت کر دیا ہے اور ان کو اپنے فیض سے تقویت دی ہے۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ
وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِنْهُ (پ ۲۸ ع ۳)

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (پ ۲۶ ع ۱۳) ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ محل ایمان قلب ہے، ایک اور آیت میں بات بالکل واضح کر دی گئی۔

اپنے منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور دل ان کے یقین نہیں لائے۔

قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ (پ ۶ ع ۱۰)

اس آیت میں بھی صاف طریقہ پر ایمان کا تعلق دل سے بتلایا گیا ہے دوسرے یہ کہ اس آیت میں ایمان کافر سے تقابل ڈالا گیا ہے اور سب جانتے ہیں کہ کفر انکار قلب کا نام ہے، اسلئے اسکے مقابل کا محل بھی قلب ہی ہونا چاہئے اور جب محل ایمان قلب ہے تو ظاہر ہے کہ ایمان کی حقیقت صرف تصدیق ہی ہو سکتی ہے، اعمال اس میں کسی

صورت داخل نہیں ہو سکتے۔

یہاں یہ اشکال وارد کیا گیا ہے کہ صرف اس بات کے اثبات سے کہ محل ایمان قلب ہے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ تصدیق ہی حقیقت ایمان ہو سکتی ہے اس لئے کہ قلب تو محل معرفت بھی ہے اور اس دلیل کی رو سے ایمان معرفت کا نام بھی رکھا جاسکتا ہے جیسا کہ یہ مسلک جہم بن صفوان کا ہے۔

لیکن یہ اعتراض دو وجہوں سے ناقابل تسلیم ہے ایک تو یہ کہ اہل عرب ایمان کو تصدیق ہی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اس لئے قرآن کریم میں جہاں بھی یہ لفظ آمنوا خطاب کیا گیا ہے اس سے مراد تصدیق ہی ہو سکتی ہے اسی وجہ سے اس لفظ کو کسی دوسرے معنی میں استعمال کرنے کے لئے دلیل یا قرینہ کا ہونا ضروری ہے اور بغیر قرینہ و دلیل اسے کسی دوسرے معنی میں استعمال کرنا لغت عرب میں تصرف ہے جو بہر صورت غلط ہے اور اس طرح کتب لغت سے بھی اعتماد اٹھ جاتا ہے اور ہر لفظ کو خاطر خواہ معنی میں استعمال کرنے کی راہ کھلتی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب، فرعون، ابوطالب، ابولہب وغیر ہم بھی انبیاء کرام علیہم السلام کی صداقت کا عرفان اور ان کی نبوت کی معرفت رکھتے تھے، ان لوگوں کو معرفت تامہ حاصل تھی، ابوطالب نے تو اشعار میں آپ کی صداقت و امانت کا اعتراف بھی کیا ہے۔

و دعوتنی وز عمت انک صادق و صدقت فیہ و کنت ثم امینا

و عرفت دینک لا محالة انه من خیر اذیان البریة دینا

لولا الملامة او حذار مسبة لوجدتني سمعا بذاک مینا

ان اشعار میں پوری دیانت کیساتھ اعتراف ہے، اسی امید پر رسول اکرم ﷺ نے مرض الموت میں ابو

طالب سے فرمایا:

یا عم قل کلمة احاج لک
بھا عند اللہ
چچا جان! کوئی ایسی بات زبان سے ادا کر دیجئے
جسے میں خدا کے حضور بطور حجت پیش کر سکوں۔

اسی وقت سرہانے بیٹھ ہوئے کفار نے فوراً پیش بندی کی اور کہا:
اترغب عن ملة عبد المطلب
کیا عبد المطلب کی ملت سے اعراض کر رہے ہیں۔

اس پر ابوطالب نے جواب دیا:

اخترت النار علی العار
میں نے عار پر نار (آگ) کو ترجیح دی۔

ابو جہل حضرت عمرؓ کا ماموں ہے، اتفاق سے ایک دن ملاقات ہو گئی، حضرت عمرؓ نے پوچھا: ماموں! اس مدعی نبوت انسان کے بارے میں کیا خیال ہے، یہ شاعر ہے، ساحر ہے، کاہن ہے، آخر کیا ہے؟ ابو جہل نے ہر بات کی تردید

کی اور کہا نہ یہ جادو گر ہے نہ اس فن سے واقف ہے نہ اس کا کلام ہی شاعرانہ ہے، شاعری اور کہانت سے تو میں خود واقف ہوں، حضرت عمرؓ نے فرمایا ماموں، پھر قبول کرنے میں کیا تردد ہے، ابو جہل جو اب دیتا ہے کہ ساری خوبیاں بنو ہاشم ہی میں کیوں سمٹ کر چلی جائیں، غرض کفار جب آپس میں گفتگو کرتے تو آپ کے ساحر یا شاعر ہونے کی تردید کرتے اور کہتے تھے کہ یہ کلام سماوی ہے۔

ایک بار حج کے ایام میں ابو جہل نے لوگوں کو جمع کیا اور پوچھا کہ حج کے لئے لوگ باہر سے مکہ آئیں گے تو آپ کے بارے میں ضرور پوچھیں گے تم کیا جواب دو گے؟ کفار مکہ میں سے کسی نے کہا شاعر کہیں گے، کسی نے کہا ساحر کہیں گے کسی نے کہا ہن کہا اور کسی نے دیوانہ (نعوذ باللہ من ذلک) ابو جہل نے کہا یہ باتیں چلنے والی نہیں لیکن غور و فکر کے بعد بھی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو یہی طے ہوا کہ شاعر کہنا۔

اس معرفت اور نجی مجالس میں اعتراف کے باعث ان لوگوں کے کفر کو کفر عناد کہا گیا ہے، کفر لغوی اعتبار سے تو ایمان کا مقابل نہیں، بلکہ شکر کا مقابل ہے، لیکن شرعی معنی کے اعتبار سے کفر کی چار قسمیں کی گئی ہے، کفر انکار، کفر جود، کفر عناد، کفر نفاق، کفر انکار کا مطلب یہ ہے کہ انسان دل اور زبان دونوں سے انکار کرے اور واقعہ دوسرے کو برحق سمجھتا ہو، کفر جود یہ ہے کہ اسے معرفت حق حاصل ہو لیکن زبان سے اس کا اقرار نہ کرے جیسے ابلیس کا کفر ہے، تیسرا درجہ کفر عناد ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ معرفت قلب بھی حاصل ہے اور اقرار بھی ہے لیکن شریعت میں داخل ہونے سے انکار ہے اس زمرے میں وہ تمام لوگ داخل ہیں جن کے بارے میں،

وہ لوگ رسول کو اس طرح پہچانتے ہیں جیسا
اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔
پھر جب وہ چیز آئینی جسکو وہ پہچانتے ہیں
تو اس کا انکار کر بیٹھے۔

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ
ابْنَاءَهُمْ (پ ۱۷۲)
فَلَمَّا جَاءَهُمْ مَا عَرَفُوا
كَفَرُوا بِهِ (پ ۱۱۷)

کا نزول ہوا ہے اور آخری درجہ کفر نفاق ہے کہ زبان سے اقرار کرے اور دل میں کفر ہی کفر ہو۔

الحاصل پیش کردہ آیات و احادیث کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اعمال ایمان کا جزو نہیں، اب زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آیات قرآنی تو واقعہ یہی بتلا رہی ہیں کہ اعمال ایمان کا جزو نہیں لیکن جگہ جگہ احادیث میں اعمال پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے جس سے اعمال کی جزئیت معلوم ہو رہی ہے لیکن اتنی بات ہے کہ اعمال پر اطلاق ایمان کے یہی معنی معین نہیں ہیں کہ اعمال جزو ایمان ہیں بلکہ اسکے اور بھی معنی ہو سکتے ہیں اور خصوصاً جبکہ آیات قرآنیہ اعمال کے ایمان سے خارج ہونے کا پتہ دیتی ہیں، اسلئے احادیث میں تاویل ناگزیر ہے اور تاویل ہی نہیں بلکہ احادیث کو آیات کی شرح کہا جاسکتا ہے بلکہ قرآن کریم کی جن باتوں میں توضیح کی ضرورت ہوتی ہے، احادیث شریفہ میں انہیں

بیان کر دیا جاتا ہے مثلاً زیر بحث مسئلہ میں جب آیات کریمہ سے یہ معلوم ہوا کہ اعمال ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں تو امکان تھا کہ کج باطن حضرات اس سے اپنی بے عملی کے لئے استدلال کریں، اس بے عملی کے سدباب کے لئے احادیث میں اعمال کی اہمیت کو واضح کر دیا گیا اور انہیں ایمان بتلا دیا گیا، اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ وہ جزء ایمان ہیں بلکہ اطلاق میں توسع ہے، ایمان سے اعمال کا بہت قریب کا تعلق ہے ایمان میں انشراح، انبساط، قوت اور قرب وغیرہ سب اعمال سے متعلق ہیں اور متعلق شے پر شے کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔

رسول اکرم ﷺ مسجد میں تشریف فرما ہیں کہ ضمام بن ثعلبہ اونٹ پر سوار ہو کر آئے، احادیث میں آتا ہے کہ ضمام نے مسجد میں اونٹ بٹھا دیا، حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

فاناخه فی المسجد ثم عقله
پس انہوں نے مسجد میں اونٹ بٹھا دیا
پھر باندھ دیا۔
(ابوداؤد جلد اول ص ۶۹)

اسکا یہ مطلب نہیں کہ ضمام اونٹ لے کر مسجد میں آگئے بلکہ مسجد سے باہر چہار دیواری میں جو مسجد ہی سے متعلق تھی اونٹ بٹھا دیا جیسا کہ دوسری روایت میں آتا ہے:

فاناخ بعيره عند باب المسجد ثم عقله
پس انہوں نے اونٹ کو مسجد کے دوازے پر بٹھا دیا
پھر اس کو باندھ دیا پھر مسجد میں داخل ہوئے۔
ثم دخل المسجد (ایضاً ۷۰)

ان الفاظ سے بات بالکل واضح ہو جاتی ہے لیکن چونکہ روایت کے پہلے الفاظ میں مسجد ہی کا لفظ آیا تھا اس لئے امام مالک رحمہ اللہ نے اسی سے استدلال کر کے فرمایا کہ اونٹ کی بیگنی اور بول پاک ہے پھر جب اطلاق میں توسع ہے تو اعمال پر ایمان کا اطلاق کرنے سے جزئیت کا تعین نہیں ہو جاتا بلکہ اعمال پر ایمان کا اطلاق از قبیل اطلاق المبدء علی الاثر ہے اور یہاں ایمان مبدأ ہے اور عمل اثر مبدأ کی حیثیت میں ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام اعظم علیہ الرحمہ کا قرآن کریم کو اصل قرار دے کر احادیث شریفہ کو اس پر منطبق کرنا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ صرف احادیث میں اعمال پر ایمان کا اطلاق دیکھ کر ان کی جزئیت کا قول کیا جائے۔

ایمان میں کمی زیادتی کا بیان
امام بخاری علیہ الرحمہ نے جس انداز سے مسئلہ شروع فرمایا ہے اس سے نتیجہ میں یہ بات ثابت ہو رہی ہے کہ ایمان تین چیزوں سے مرکب ہے اعتقاد قلبی، قول

لسانی، اور افعال جوارح، کیونکہ جملہ وهو قول وفعل میں قول وفعل میں دونوں میں تعمیم ہو سکتی ہے یا تو قول لسانی، اور قول قلبی دونوں پر عام کر دیا جائے گو عرف عام میں قول کا لفظ صرف قول لسانی ہی پر بولا جاتا ہے، لیکن اس کو بایں معنی قول قلبی پر بھی عام کیا جاسکتا ہے کہ دل میں تصدیق کا پیدا ہو جانا ایمان نہیں ہے بلکہ پیدا کرنا ایمان ہے اور جب قول دل اور زبان دونوں پر عام ہو گیا تو فعل سے مراد فعل جوارح ہو ہی جائے گا ورنہ اگر قول کو صرف قول لسانی پر محدود کر دے

جائے تو لفظ فعل میں تعمیم کردی جائیگی جو فعل قلبی اور فعل جوارح پر عام ہو جائیگا۔

اور بعض حضرات نے کہا کہ تصدیق و اعتقاد کا مسئلہ تو اہل فن کے نزدیک مسلم تھا، اختلاف صرف زبان و جوارح کے سلسلہ میں تھا اسلئے امام بخاری نے ادھر ہی توجہ مبذول فرمائی اور جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ ایمان میں تین چیزیں داخل ہیں تو اسکے نتیجہ میں ایمان میں کمی زیادتی ممکن ہوگئی، یہ کمی اور بیشی بہ ظاہر امام بخاری کی قائم کردہ ترتیب کے مطابق ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اجزاء کے اعتبار سے ہے یعنی چونکہ ایمان ایک ذی اجزاء چیز ہے اور تین چیزوں سے مرکب ہے اس لئے اس میں ضرور کمی زیادتی کی قابلیت ہونی چاہئے اور امام بخاری کے دعوے کے مطابق سلف کا بھی مذہب یہی ہے کیونکہ امام بخاری نے تمام اساتذہ سے یزید و یسحق ہی نقل کیا ہے اور اگر اس سلسلہ میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے تو وہ امام ابوحنیفہ کا ہے کیونکہ صرف امام اعظم ہی کی طرف لایزید و لایسحق کی نسبت کی گئی ہے اور جمہور یزید و یسحق کے قائل ہیں گویا امام بساطت ایمان کے قائل ہیں اور جمہور ترکیب کے، اس لئے بظاہر یہ تردید امام اعظم رحمہ اللہ ہی کی معلوم ہوتی ہے۔

لیکن ان قائلین تردید نے اس پر غور نہیں کیا کہ امام اعظم رحمہ اللہ کا لایزید و لایسحق جمہور کے یزید و یسحق سے متعارض بھی ہے یا نہیں اگر یہ حضرات اس حقیقت کو سمجھ لیتے تو امام اعظم کو ہدف بنانے کی نوبت نہ آتی لیکن کیا کیا جائے کہ ہوتا ہی ایسا آیا ہے۔

اسلئے اصل تو یہ ہے کہ اول تو امام اعظم سے لایزید و لایسحق کا ثبوت ہی دشوار ہے کیونکہ جن تصانیف پر اعتماد کر کے اس قول کی نسبت امام اعظم کی طرف کی گئی ہے تحقیق کی روشنی میں امام کی جانب ان کا انتساب محل نظر ہے، مثلاً فقہ اکبر، امام اعظم کی طرف منسوب ہے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ امام کے تلمیذ ابو مطیح البخاری کی تصنیف ہے جو فقہاء کی نظر میں بلند مرتبت سہی لیکن محدثین کی نگاہ میں کمزور ہیں، اسی طرح العالم والمتعلم، اور الوصیۃ، امام اعظم کی طرف منسوب ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ امام رحمہ اللہ تک ان کی نسبت کی صحت میں کلام ہے۔

اور حضرت علامہ کشمیری کی تحقیق کے مطابق امام اعظم کے مذہب کا رخ ہی یہ نہیں ہے کہ جسکو امام بخاری سمجھ

رہے ہیں، نیز ابراہیم بن یوسف تلمیذ امام ابو یوسف اور احمد بن عمران کا قول طبقات الحنفیہ میں موجود ہے کہ وہ ایمان میں کمی بیشی کے قائل تھے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ حافظ ابو عمرو بن عبد البر مالکی نے شرح مؤطا میں امام حماد علیہ الرحمہ کی طرف اسکی نسبت کی ہے جو امام اعظم کے استاد ہیں اور حافظ ابو عمرو نقل میں ثقہ بھی ہیں اس لئے اس نسبت کو تسلیم کرنا بھی ناگزیر ہے لیکن اس سلسلہ میں امام طحاوی کی کتاب ”عقیدۃ الطحاوی“ سب سے زیادہ بہتر کتاب ہے انہوں نے آغاز کتاب ہی میں فرمایا ہے کہ وہ اس کتاب میں امام اعظم کے عقائد لکھیں گے، امام طحاوی نے اس کتاب میں تحریر فرمایا ہے کہ اصل ایمان میں سب برابر ہیں، ایمان میں کمی و زیادتی کے اعتبار سے کوئی تفاوت نہیں، تفاوت صرف تقویٰ، اتباع

سنت اجتناب عن المعاصی وغیرہ میں ہو سکتا ہے بہر کیف صرف حافظ ابو عمرو پر اعتماد کرتے ہوئے ہم تسلیم کئے لیتے ہیں کہ امام اعظم ایمان میں زیادت و نقصان کا انکار کر سکتے ہیں لیکن انصاف یہ ہے کہ اس قول کے معنی کی تحقیق کی جائے، تحقیق سے ثابت ہے کہ امام کے عدم زیادت و نقصان اور جمہور کے قول زیادت و نقصان میں کوئی تعارض نہیں ہے، اور اختلاف دراصل نقطہ نظر میں ہے، یزید و یسقص کا مدار اعمال پر ہے یعنی اعمال کو ایمان کا جزو قرار دیا اور چونکہ اعمال میں کمی بیشی ہوتی ہے اسلئے اعمال کی وساطت سے ایمان میں کمی بیشی کا امکان ہو گیا۔

لیکن جمہور اس بارے میں متفق ہیں کہ وہ شخص جس کے پاس کوئی عمل نہ ہو صرف تصدیق و اقرار ہو تو ایسا شخص فاسق ہے کافر نہیں اور اس پر اتفاق ہے کہ یہ شخص ضرور کبھی نہ کبھی جنت میں جائے گا، بخاری ہی کی روایت ہے کہ ایک شخص کے نامہ اعمال کا جب وزن ہونے لگا تو وہ منتہائے نظر تک سیاہ تھا ایک بھی عمل خیر نہ تھا اور یہ شخص اپنی جگہ مغفرت سے بالکل مایوس ہے، اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو نے زندگی میں کوئی عمل خیر کیا ہے؟ عرض کرتا ہے کہ عمر معاصی میں گزری ہے، میرے پاس کوئی عمل خیر نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ہمارے یہاں ظلم نہیں ہے، اور پھر ایک طرف گناہوں کے دفاتر رکھے جائیں گے اور دوسری طرف میزان میں کاغذ رکھا جائیگا جس پر صرف کلمہ طیبہ لکھا ہوگا اس کاغذ کے پرزے کو رکھتے ہی وہ جانب نیچے ہو جائے گی اور وہ دفاتر اوپر اٹھ جائیں گے اور اس بٹاقہ کا وزن تو صرف عالم الغیب والشہادۃ ہی جان سکتے ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایمان کے دو درجے ہیں ایک درجہ وہ ہے جو انسان کو جہنم میں داخل ہونے سے مانع رہے اور ایک درجہ وہ ہے جو جنت میں جانیکا سبب بنے، وہ ایمان کہ جسکی بنا پر صرف جنت مل سکتی ہے تصدیق قلبی سے عبارت ہے اور جو دخول نار سے مانع رہے اسکے لئے اعمال کی بھی ضرورت ہے جس کے پاس طاعات کا ذخیرہ ہوگا وہ جہنم سے محفوظ رہے گا اور جس کے پاس اعمال نہیں ہیں، اسے خداوند قدوس معاف بھی فرما سکتے ہیں اور سزا بھی دے سکتے ہیں۔

محدث کی نظر اس ایمان پر ہوتی ہے جو انسان کے لئے دخول نار سے مانع ہو اور ہمیشہ کے لئے اسکو جنت کا مستحق بنادے اور فقیہ و متکلم کی نظر اس ایمان پر ہوتی ہے جو انسان کے لئے صرف جنت کا استحقاق پیدا کر دے خواہ وہ ابتداء ہو یا سزا کے بعد۔

اسلئے ان دونوں کا نقطہ نگاہ اور موضوع بحث ہی الگ الگ ہے گو دونوں اس پر بھی متفق ہیں کہ صرف تصدیق بھی انسان کے دخول جنت کیلئے کافی ہے خواہ اسکے ساتھ کتنے بھی معاصی ہوں، اب اگر یہ پوچھا جائے کہ وہ ایمان جس پر مدار نجات ہے گھٹتا بڑھتا ہے یا نہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال کے جواب میں کمی بیشی کے قائلین بھی یہی کہیں گے کہ وہ ایمان جو مدار نجات ہے کمی بیشی قبول نہیں کرتا، ایمان کا وہ درجہ جو انسان کو کفر سے بچا کر جنت کا مستحق بنادے وہ

تصدیق کا آخری درجہ ہے جس میں اگر ذرا اور ضعف آجائے تو کفر آجاتا ہے جس کے بارے میں سابق صفحات میں یہ گزر چکا ہے کہ وہ تصدیق کا اس قدر دھندلا نقش ہے جسے پیغمبر علیہ السلام کی نگاہ بھی نہ دیکھ سکی یہ درجہ ایمان کی کمی کو واقعہ قبول نہیں کرتا لیکن زیادتی کے قبول کرنے میں بظاہر کوئی قباحت نہیں معلوم ہوتی، لیکن ذرا غور کرنے کے بعد یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قبول زیادت کا یہ مطلب ہے کہ جب تک اس زیادتی کو شامل نہ کریں گے نجات نہ ہو سکے گی، گویا مدار نجات صرف وہ دھندلا نقش ہے جس کو خداوند قدوس جانتے ہیں، مغفرت کیلئے جو ارح پر اعمال کی روشنی اور چمک درکار ہے لایزید و لاینقص کی یہ شرح کتاب عقیدۃ الطحاوی کی شرح قونوی میں منقول ہے جو ایک حنفی المذہب کی تالیف ہے۔

اب ان دو باتوں کا نقطہ نظر الگ الگ ہو گیا جمہور جس سلسلہ میں یزید و ینقص کہہ رہے ہیں امام رحمہ اللہ اسکے منکر نہیں اور امام نے جو حقیقت بیان فرمائی ہے وہ جمہور کے نزدیک بھی مسلم ہے یعنی اس پر سب کا اتفاق ہے کہ تارک اعمال فاسق ہے کافر نہیں اور جب کافر نہیں ہے تو ضرور کسی نہ کسی وقت جنت میں داخل ہو جائے گا، اس تفصیل کے بعد یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ پہلے مقابلہ ڈالنا اور پھر کسی بھی ایک کو نشانہ بنالینا نہایت بے سمجھی کی بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایمان، نقطہ نظر میں اختلاف کے باعث مرکب بھی ہے اور بسیط بھی لیکن مرکب ماننا محدث کا وظیفہ ہے اور بسیط کہنا فقیہ و متکلم کا۔

اب اگر کوئی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کو صرف اس لایزید و لاینقص کی بنا پر مرجیہ کہنے لگے تو اگر اتحاد لفظی کے باعث امام رحمہ اللہ کو مرجیہ کہا جاسکتا ہے تو تمام محدثین، حنابلہ، موالک اور خود امام بخاری رحمہم اللہ کو معتزلہ اور خوارج کی صف میں لے آنا ہوگا کیونکہ اتحاد لفظی کا وہ رشتہ یہاں بھی پایا جاتا ہے اور اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ محدثین اور معتزلہ کے درمیان تو بہت بڑا فرق ہے تو ہمیں عرض کرنے دیجئے کہ فرق امام اعظم اور مرجیہ کے درمیان بھی ہے۔

اور اس فرق باطلہ سے لفظی اتحاد اور اہل حق کے درمیان اس اختلاف تعبیر کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے ہر امام کے دور پر تاریخی نظر ڈال لینی چاہئے، کیونکہ ہر امام نے اپنے عصر کی رعایت سے وہی بات کہی ہے جو اس دور کی گمراہیوں کا علاج بن سکے اور یہی مناظرہ کا اصول ہے کہ مقابل سے کسی بھی جزو میں اتحاد و اتفاق نہ کیا جائے، اسی وجہ سے اکابر کے اقوال میں اختلاف ملتا ہے جو حقیقت سب کے نزدیک ایک ہے لیکن ہم نے حقیقت کو نظر انداز کر دیا اور ذواکد میں الجھ گئے جیسا کہ جبریہ و قدریہ ہیں، قدریہ کہتے ہیں کہ تقدیر کچھ نہیں ہے بلکہ انسان اپنے افعال کا خود خالق ہے، دوسرا فریق کہتا ہے کہ انسان مجبور محض ہے، سب کچھ باری تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، دونوں کے پاس قرآن و حدیث کی روشنی میں کچھ دلائل ہیں لیکن صحابہ کرام کا عمل پیغمبر علیہ السلام کی تعلیمات کی روشنی میں یہ ہے کہ جبر و قدر دونوں

کو اپنے اپنے درجہ میں مانا جائے، خداوند قدوس خالق افعال ہیں اور بندہ کا سب سے، اور کسب کے لئے اختیار ضروری ہے، کچھ اختیار دے کر بندے کو جبر محض سے نکال لیا، اور دوسری طرف یہ کہہ کر کہ بندہ کسی چیز کا خالق نہیں ہے اسے بالکل ہی مختار نہیں قرار دیا، خداوند قدوس نے انسان کو اختیار عطا فرمایا ہے انسان اس اختیار کے استعمال میں مجبور ہے، الانسان مجبور فی اختیاره و مختار فی افعاله خداوند قدوس نے ہمارے اندر ارادہ رکھ دیا ہے ہم مجبور ہیں کہ جب کوئی کام کریں تو اس کے بارے میں سوچیں اسباب کی فراہمی کے لئے تگ و دو کریں گویا ہم مختار بھی ہیں اور مضطر بھی،

و افعالنا منا علی اختیارنا و لکنها نحو القدر یؤل

اب ایک جانب قدریہ ہیں اور دوسری جانب جبریہ، اور اہل سنت بین بین ہیں، لیکن اہل سنت میں کوئی ان جبریہ سے قریب ہے اور کوئی قدریہ سے، بس اسی قرب و بعد کی مناسبت سے اہل سنت کو ان فرقہ باطلہ کے ساتھ شمار کیا جاسکتا ہے۔

بالکل اسی طرح ایمان کا معاملہ ہے ایک طرف معتزلہ و خوارج ہیں اور دوسری جانب مرجیہ و کرامیہ، اہل سنت درمیان میں ہیں لیکن ان میں کوئی مرجیہ سے قریب ہے اور کوئی معتزلہ سے، حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ ہی مثال پیش فرمایا کرتے تھے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے ترجمہ کا رخ امام اعظم کی جانب نہیں ہے بلکہ اب امام براہ راست مرجیہ سے مخاطب ہیں اور پوری کتاب میں دو ہی فرقوں کا معاملہ ہے ایک معتزلہ اور دوسرے مرجیہ۔

اس تالیف میں مرجیہ سے امام کا معاملہ بہت زیادہ ہے کیونکہ مرجیہ میں بے دینی ہے اور خوارج میں بے دینی نہیں ہے، بلکہ دین کے معاملہ میں تشدد ہے۔ لیکن یہ تشدد حماقت کے درجہ تک ہے اسلئے پہلے امام بخاری مرجیہ کی کان کچھی کرنا چاہتے ہیں، البتہ کہیں کہیں امام بخاری اہل حق کے بھی خلاف کہیں گے لیکن اسے مقصود بنا کر نہیں کہتے بلکہ ضمن میں کہتے جاتے ہیں، سمجھنے والا سمجھ لیتا ہے کہ یہاں امام رحمہ اللہ کیا چاہتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی شخص ان تمام تفصیلات سے قطع نظر کر کے یہی کہتا ہے کہ امام نے یہاں امام اعظم ہی کا رخ کیا ہے تو سب سے پہلا سوال جو امام بخاری سے کیا جائیگا یہ ہے کہ معاملہ ایمانیات کا ہے اور آپ اس سلسلہ میں امام اعظم سے الجھ رہے ہیں، اور آپ نے جو ترجمہ قائم فرمایا ہے، وہ بنی الاسلام علی خمس ہے گویا دعویٰ ایمان کی کمی بیشی کا ہے اور دلائل بیان کرنے شروع کئے تو اسلام میں کمی اور زیادتی کا اثبات کیا ہے۔ کہیں تقوے کی کمی بیشی بیان کی، کہیں محبت کا ذکر کیا، ہم بھی اسلام کے اندر اعمال کو داخل مانتے ہیں، تقوے اور محبت کی کمی بیشی سے ہمیں بھی انکار نہیں لیکن ایمان کی کمی بیشی جس کا آپ نے دعویٰ کیا ہے اب تک بے دلیل ہے اور محتاج ثبوت، ایمان و اسلام کا مسئلہ ان شاء اللہ تعالیٰ اگلے ابواب میں مفصل آرہا ہے۔

امام بخاری نے جن چیزوں سے ایمان کے اندر کمی زیادتی کے بارے میں استدلال کیا ہے، ان میں سب

سے پہلی آیت لیزد ادوا ایمان مع ایمانہم ہے اس سے معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی ہو سکتی ہے، رہا کمی کا معاملہ جو چیز زیادتی کو قبول کر سکتی ہے وہ کمی کی بھی قابلیت رکھتی ہے، مع ایمانہم کی روشنی میں یہ ماننا پڑے گا کہ ایمان پہلے موجود تھا اور اس میں یہ بعد میں آئیوالی زیادتی شامل نہ تھی نیز اس مع ایمانہم سے یہ بھی ثابت ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کو ایمان تمامہ حاصل تھا اس لئے کہ اگر ان تمام چیزوں کو جزئیت کے درجہ میں مانا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان اس سے قبل کامل نہ تھا، اب اس جز کے اضافہ کے بعد ایمان کامل ہوا ہے، اسلئے جزئیت کے درجہ میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان دلائل سے امام بخاری کا مدعا صرف مرجیہ کے مقابل ثابت ہو رہا ہے کہ ایمان موجود تھا اور اب اس میں ایک اور چیز کی زیادتی ہو گئی۔

دوسری آیت زدنا ہم ہدی بھی اسی شان کی ہے ہدایت یا عین ایمان ہے یا وہ ایمان میں داخل ہے یا ایمان ہدایت میں داخل ہے، دونوں لازم و ملزوم ہیں کیونکہ ہدایت سے مراد وصول الی المطلوب ہے، زیادتی ہدایت کے سلسلہ میں دوسری آیت ملاحظہ ہو:

يَزِيدُ اللَّهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى (۸۷:۱۶) اللہ تعالیٰ ہدایت والوں کو ہدایت بڑھاتا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کسب اور اپنی کوشش سے ہدایت حاصل کرتے ہیں خداوند قدوس کی عادت ہے کہ ایسے لوگوں کو انعام کے طور پر اور ہدایت کی توفیق ارزانی فرماتا ہے جس طرح کفر کے اعمال مزید کفر کے لئے داعیہ پیدا کرتے ہیں اسی طرح ایمان کے اعمال ایمان میں زیادتی کا سبب بن جاتے ہیں، ارشاد ہے:

ويزداد الذين امنوا ايمانا (پ ۱۵:۲۱) اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے

اس طرح کی آیات سے زیادتی کا مسئلہ تو صاف ہو گیا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ یہ زیادتی کن معنی کے اعتبار سے ہے یعنی یہ زیادتی کیف کے اعتبار سے ہے یا کم کے، یا یہ زیادتی اجمال و تفصیل کے اعتبار سے ہے۔

اگر یہ آیات تکمیل شریعت سے قبل کی ہیں تو اس کے بے تکلف معنی یہ ہیں کہ ضروری احکام یکبارگی نازل نہیں فرمائے گئے تھے بلکہ حسب ضرورت و مصلحت ان کا نزول ہوتا رہا، گویا وہ مومن جس کا ایمان اعمال کے درجہ میں صرف امنوا سے متعلق تھا جب اس کے سامنے اقيموا الصلوة کا حکم آیا تو اس کا ایمان زائد ہو گیا پھر روزے کا حکم آیا تو ایمان کی تفصیل میں اور زیادتی ہو گئی تصدیق ہی ہے لیکن متعلقات کی کثرت ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے جس زیادتی کے بیان کا ارادہ کیا ہے وہ مومن بہ کی زیادتی ہے، یہ جواب امام اعظم سے منقول ہے دین میں آپ کے مدعا کے موافق کمی بیشی جب ثابت ہوتی کہ الیوم اکملت لکم دینکم کے بعد یہ صورت پیش آئی ہوتی لیکن تکمیل کے بعد یہ زیادتی کریں تو یہ ابتداء ہے اور کمی کریں تو کفر ہے۔

رہا کیف کا معاملہ تو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ عام لوگوں کا ایمان صحابہ، جبرئیل و میکائیل اور انبیاء کرام جیسا

نہیں ہے اس کا انکار نہ جمہور کر سکتے ہیں، اور نہ امام اعظمؒ نے کیا ہے۔

ایکم ذاتہ ہذہ ایمانا یعنی جب کوئی نئی آیت یا سورت نازل ہوتی ہے تو منافقین بہ طور طعن کہتے ہیں ایکم ذاتہ ہذہ ایمانا بتلاؤ کہ تم میں سے کون ایسا ہے کہ اسکے ایمان میں اس آیت نے ترقی پیدا کی ہو اس سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ایمان ان حضرات کی نظر میں قابل زیادت و نقصان ہے، یہ قول اگر چہ منافقین کا ہے لیکن خداوند قدوس سے نقل فرمایا ہے اور جواب میں ارشاد ہے:

سو جو لوگ ایماندار ہیں اس آیت نے

أَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فزَادَتْهُمْ

ان کے ایمان میں ترقی دی ہے

إِيمَانًا بِ (اع ۵)

یعنی جب ان منافقین کے پاس ایمان ہی نہیں تو زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ نزول آیات سے انکا کفر بڑھتا ہے کیونکہ یہ احکام خداوندی کے ساتھ استہزاء و مذاق کرتے ہیں، ان کے لئے زادتہم رجساً الی رجسہم ہے لیکن جن لوگوں کے قلوب میں ایمان ہے ان لوگوں کا ایمان اور جذبہ عمل ہر آیت کے بعد بڑھتا ہے، گویا ایمان امام بخاریؒ کے نزدیک اس آیت کی روشنی میں قابل زیادت ہے اور جو چیز قابل زیادت ہوتی ہے وہ قابل نقصان بھی ہونی چاہئے۔

لیکن اس سے امام بخاری کا مقصد مرجیہ کے مقابل ثابت ہو سکتا ہے ورنہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اجمالاً وہ "ما جاء به الرسول" کی تصدیق کر چکے ہیں، اب جو نئے احکام آتے جاتے ہیں تصدیق ان سے متعلق ہوتی جاتی ہے اس طرح ایمان ترقی کر رہا ہے اور مومن بہ کے عدد بڑھ رہے ہیں یہ وہ چیز ہے جو امام اعظمؒ کے نزدیک بھی مسلم ہے۔

یہاں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ فاخشوہم سے پہلے چار آیات مصنفؒ نے ایک ہی قول کے تحت ذکر کی تھیں اور اس آیت اور دوسری آیت کو مستقل عنوان قولہ سے لارہے ہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں طعنہ کا جواب ہے اور یہ نقل بہ طور حکایت ہے اس کی شان اور آیات سے مختلف ہے، اسی طرح اگلی آیت فاخشوہم دوسرے کا قول ہے، نیز تیسری آیت فزادتهم ایمانا خداوند قدوس کی جانب سے مسلمانوں کے معاملہ کے حکایت ہے۔

وما زداهم الا ایمانا وتسلیمًا، غزوہ خندق میں مسلمانوں پر چاروں طرف سے یورش تھی بارہ ہزار اور بقول بعض چوبیس ہزار کی تعداد میں پورے ساز و سامان کیساتھ محاصرہ کیا گیا تھا اس وقت مدینہ میں مسلمان مشکل سے چار ہزار ہوں گے اور ان چار ہزار میں وہ بھی شامل ہیں جنہوں نے بہانے نکال کر عملی کمزوری دکھائی خواہ منشا نفاق ہو یا واقعہ یہ کمزوری ہی ہو، اس لئے مقابلہ پر صرف دو ہزار کی جمعیت تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان کے اندر خوف ہوتا لیکن ایمان و تسلیم میں اضافہ ہوا۔

فاخشوہم بدر صغریٰ کے موقع پر کفار کی طرف سے آنے والوں نے اطلاع دی کہ اس طرف سے لوٹنے کی تیاری ہو رہی ہے یعنی ابوسفیان جو واپس ہو گیا تھا اسکو راستے ہی میں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور اس نے ارادہ کر لیا ہے

کہ واپس چل کر بقیۃ السیف مسلمانوں کو ٹھکانے لگا دے، اس اطلاع سے کمزوری پیدا نہیں ہوئی بلکہ فرما دہم ایماناً ان کے ایمان و یقین میں اور اضافہ ہو گیا اور مسلمان ان کی مدافعت کے لئے تیار ہو گئے جیسا کہ ایمان کا تقاضا تھا کہ دشمن ایمان پر ڈاکہ ڈالے تو تمہارا فرض ہے کہ ہر حال میں شکست دینے کیلئے مستعد ہو جاؤ۔

ان تمام آیات سے معلوم ہوا کہ ایمان میں زیادتی ہوتی ہے اور جو چیز زیادتی قبول کرتی ہے وہ نقصان کو بھی قبول کرتی ہے یعنی جب یوں کہا جائے کہ فلاں کا ایمان زائد ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ دوسرے کا ایمان اسکے مقابل کمزور ہے لیکن اس کمزوری کی یہ تعبیر نہیں کر سکتے ہیں کہ جن چیزوں پر ایمان ضروری ہے انہیں بعض پر ایمان ہے بعض پر نہیں اسلئے کہ یہ کفر ہے، اگر جمیع ماجاء بہ الرسول میں سے ایک چیز بھی نکل جائیگی تو کفر ہو جائے گا، الیوم اکملت لکم دینکم کے بعد نہ کمی کا امکان ہے نہ زیادتی کا، اسلئے اب کمی بیشی طاعت کے اعتبار سے ہوگی۔

ایک شخص بڑی پختگی کے ساتھ اوامر و نواہی پر کار بند ہے اور اسکے پاس اخلاص بھی ہے، ایسے شخص کا ایمان اس انسان سے قوی ہے جو اتنی سختی سے کار بند نہیں، اور اسکے اخلاص میں کمی ہے، ایک کے ایمان کا نور دوسرے کے مقابل بہت زائد ہے اسلئے کیف کے اعتبار سے کمی زیادتی ہو سکتی ہے، خاصان خدا کا ایمان عامۃ الناس سے کہیں زائد ہوتا ہے۔

اب کیف کی کمی زیادتی میں تمام حضرات متحد ہو گئے، اسی کا اشارہ سلف کے قول الایمان یزید بالطاعة وینقص بالمعصية سے ہوتا ہے جس کو حافظ ابوالقاسم لاکائی نے نقل کیا ہے اور اس سلسلہ میں صحابہ کرام اور دوسرے اسلاف کے اسماء گنائے ہیں۔

اب معنی یہ ہوئے کہ تصدیق معنوی میں اضافہ ہو رہا ہے یعنی فرمانبرداری سے ایمان بڑھتا ہے اور معاصی سے کمزور ہوتا ہے، جزئیت کا علاقہ نہیں، جزئیت و تحلیل کی بحثیں خالص منطقی انداز کی ہیں جو اس مقولے سے بعد کی ہیں، اس مقولے سے جزئیت کا اثبات زبردستی کی بات ہے، نیز امام بخاری نے یزید وینقص کو طاعت و معصیت سے الگ ذکر فرمایا ہے جس سے بات بالکل ہی بدل گئی۔

امام بخاری کے انداز بیان سے جزئیت ہی متبادر ہے لیکن مقولہ سلف سے صرف تصدیق باطنی میں کمی زیادتی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس مقولہ سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان میں موثر ہیں، جزئیت بالکل نہیں معلوم ہوتی لیکن امام بخاری کے طاعت و معصیت کو حذف کر دینے سے معنی بالکل بدل گئے۔

حالانکہ مقولہ سلف کے معنی بالکل واضح تھے کہ طاعت سے نور اور معصیت سے ظلمت پیدا ہوتی ہے ایمان کی ترکیب و بساطت کا اس سے کوئی علاقہ ہی نہیں۔

والحسب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان، امام بخاری مرجحہ کی تردید کیلئے ایک اور جملے کا اضافہ فرما رہے ہیں کہ تم اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتاتے ہو کہ نہ طاعت سے ترقی ہوتی ہے نہ معصیت سے ضرر

ہوتا ہے جس طرح عمل کرنے والا جنت میں جائے گا اس طرح عمل نہ کرنے والا بھی۔ امام بخاری فرماتے ہیں کہ اعمال کا معاملہ تو نہایت اہم ہے، حب اور بغض بھی اس بارے میں موثر ہے، محبت ہو تو اللہ کے لئے ہو کوئی لالچ نہ ہونا چاہئے، اسی طرح کسی شخص کیساتھ بغض کا منشا بھی خداوند قدوس کی رضا ہونی چاہئے۔

امام بخاری نے اس مقولہ سے استدلال کیا ہے اور ان کے نزدیک یہ من تبعیض کیلئے ہے اور احناف کے نزدیک یہ ابتدا سے اور اتصالیہ ہے یعنی یہ ایمان سے متصل ہے جیسے۔

انت منی بمنزلہ ہارون من
موسیٰ
میرے لئے تم وہی ہو جو حضرت موسیٰ کیلئے
ہارون تھے،

کتب عمر بن عبد العزیز الی عدی بن عدی الخ حضرت عمر بن عبد العزیز نے حضرت عدی گورز کو ہدایت نامہ بھیجا کہ ایمان کے اندر فرائض، شرائع، حدود، سنن ہیں۔ فرائض جو چیزیں فرض کی گئی ہیں اس سے مراد یا تو عقائد و اعمال ہیں، اس وقت شرائع سے مراد نوافل یجائز کی یا فرائض سے مراد مفروضہ چیزیں اور شرائع سے مراد اعتقادات۔

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ ایمان کے اندر ان تمام چیزوں کو داخل مان رہے ہیں، اس سے بھی مرجیہ ہی کی تردید ہو سکتی ہے کیونکہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے الفاظ یہ ہیں: ان لایمان فرائض اور ان لایمان فرائض، ان الایمان فرائض سے مختلف ہے، امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ اس مقولہ میں صاف بیان کیا گیا ہے کہ ایمان کے لئے یہ چیزیں ضروری ہیں اور ان کے نقصان سے ایمان میں نقصان آتا ہے۔ استکملہا کا مفہوم یہ ہے کہ فرائض، شرائع، حدود وغیرہ سب پر پورے طریقہ پر عامل رہا تو تکمیل ہو جائے گی گویا یہ اجزاء مقوم نہیں مکمل ہیں کیونکہ یہ نہیں فرمایا کہ اگر اعمال نہ ہوں گے تو ایمان جاتا رہے گا بلکہ فرما رہے ہیں کہ کمال ایمانی ان کے کمال پر موقوف ہے اور جس قدر شدت کیساتھ ان پر عامل ہوگا اسی قدر ایمان میں کمال آئے گا۔ راغب اصفہانی نے تمام اور کمال میں فرق کیا ہے کہ تمام ذات اور کمال صفات کے موقع پر استعمال ہوتا ہے اور یہاں کمال کا استعمال کیا گیا ہے، معلوم ہوا کہ یہ چیزیں داخل ذات نہیں، اسلئے جو چیز اس مقولہ سے ثابت ہو رہی ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔

اس سے صرف مرجیہ کی تردید ہو رہی ہے کہ تم ایمان میں اعمال کو کوئی مقام نہیں دیتے حالانکہ اسکی تاکید و تائید میں قرآن کریم، احادیث شریفہ اور اکابر کے اقوال سب ہی کچھ موجود ہیں۔

اسی سلسلہ میں امام بخاری نے حضرت عمر بن عبد العزیز کا یہ مکتوب نقل فرمایا، حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کو خلفائے راشدین کی خلافت کا تمہ قرار دیا گیا ہے گوانکی مدت خلافت بہت ہی کم ہے صرف دو سال چند ماہ ہے

۹۹ھ میں خلیفہ ہوئے اور ۱۰۰ھ میں وفات ہو گئی لیکن انہوں نے اس قلیل مدت میں دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیا تھا، بنو امیہ کے دور خلافت میں جو مظالم ہو رہے تھے ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ختم کر دیا، مشہور ہے کہ ان کے دور خلافت میں بھیڑیا اور بکریاں ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے اور بھیڑیا بکری پر حملہ نہیں کر سکتا تھا، علامہ ابن الجوزی نے اس کی تصریح کی ہے اور لکھا ہے کہ ایک دن چرواہے نے شور کیا اس سے اسکی وجہ دریافت کی گئی تو اس نے کہا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ وقت کا انتقال ہو گیا، اس لئے کہ بھیڑئے نے بکری پر حملہ کر دیا چنانچہ تحقیق کی گئی تو جو وقت بھیڑیے کے بکری پر حملہ کا تھا وہی وقت خلیفہ عادل کے وصال کا تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خواب میں آنحضرت ﷺ سے اس قدر قریب دیکھا گیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی اس قدر قریب نہ تھے، دیکھنے والے کو حیرت ہوئی، بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ انہیں یہ قربت کس طرح حاصل ہوئی، فرمایا کہ انہوں نے ایسے وقت میں انصاف سے کام لیا جب ظلم کا تسلط تھا اور صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے دور میں انصاف باقی تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بنو امیہ کی وہ جائیدادیں ضبط کر لیں جو انہوں نے ناجائز طریقہ پر حاصل کر لی تھیں اور وہ اعلیٰ سامان جو انہوں نے حاصل کر لئے تھے بیت المال میں داخل کر دئے گئے، ایک بار حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ تم نے جو یہ قیمتی ہار زیب گلو کر رکھا ہے اسے بیت المال میں داخل کر دو، اہلیہ نے کہا کہ آپ کو اس سے کیا تعلق؟ یہ تو مجھ کو میرے باپ عبدالملک بن مروان نے دیا ہے، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ اگر ہار نہیں داخل کر سکتی ہو تو میرے ساتھ رہنا دشوار ہے، وہ ڈر گئیں اور اپنا وہ قیمتی ہار بیت المال میں داخل کر دیا۔

اس دور خلافت کے متعلق ان کی اہلیہ کا بیان ہے کہ اس عرصہ میں انہیں غسل کی ضرورت نہیں ہوئی کیونکہ دن بھر تو قضا یا کا فیصلہ فرماتے تھے، اور رات کو سر بسجود ہو کر خداوند قدوس کے سامنے گریہ و زاری کرتے کہ اے خدائے قادر و قیوم! جو ذمہ داری تو نے مجھ پر ڈالی ہے اسکو پورا کرنے کی بھی توفیق ارزاں فرما دے، بنو امیہ نے انہیں زہر دیا ہے کیونکہ انہوں نے ان حضرات کو صراط مستقیم کی دعوت دی تھی، آگے ارشاد فرماتے ہیں۔

فان اعش فسابینہا لکم اگر میں زندہ رہا تو تمام تفصیلات پیش کروں گا تا کہ تم عمل کر سکو اور اگر میں مر گیا تو مجھے زندگی کی ہوس نہیں ہے، یہاں اشکال یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اس قول سے کہ ”مجھے زندگی کی ہوس نہیں ہے“ موت کی تمنا معلوم ہو رہی ہے جو مذموم و ممنوع ہے صحیح حدیث میں ہے کہ تم میں کوئی بھی موت کی تمنا نہ کرے اگر وہ نیکو کار ہے تو امید ہے کہ اسکے اعمال صالحہ بڑھیں گے اور اگر بدکار ہے تو ممکن ہے اسے توبہ کی توفیق ہو جائے۔

اتنی پریشان حالی کے ایام میں بھی کہ جب زندگی وہاں جان بن رہی ہو صرف اس دعا کی اجازت ہے کہ اے اللہ اگر میرے لئے زندگی بہتر ہے تو عافیت سے زندہ رکھ، ورنہ مجھے ایمان کیساتھ اٹھالے، تمنائے موت اسلئے مذموم

ہے کہ یہ دنیا مزرعہ آخرت ہے، آخرت کے معاملہ میں جس قدر بھی ترقیات ہو سکتی ہیں وہ سب اسی عالم کے اعمال پر موقوف ہیں آنکھیں بند ہو جائیں تو ترقیات ختم ہو جاتی ہیں روایت میں آتا ہے:

اذامات الانسان انقطع عنه عمله
 جب انسان مرجاتا ہے تو تین چیزوں کے علاوہ
 الا عن ثلاثة اشياء (ابوداؤد جلد ۲ ص ۴۴)

اسکے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔

دراصل حضرت عمر بن عبدالعزیز پر عبدیت کا غلبہ ہے اور جب انسان پر عبدیت کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کے سامنے اپنے کمالات نہیں رہتے بلکہ نظر اپنے نقائص پر آ جاتی ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز جانتے ہیں انما العبرة بالخواتیم اور خاتمہ کے متعلق کوئی شخص کچھ نہیں کہہ سکتا اس وقت اچھے اچھے برے ہو جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ برے عمل والے حسن خاتمہ کے باعث آخرت میں فلاح یاب ہو جاتے ہیں، خداوند قدوس بے نیاز ہے، ارشاد ہے، لا یسئل عما یفعل۔

اسی وجہ سے اہل حق ہمیشہ ترساں ولرزاں رہتے ہیں اور انکی دعاء یہی ہوتی ہے کہ اے اللہ ہمیں اس حالت میں اٹھالے کہ ہم کار خیر کر رہے ہوں، زندگی میں کوئی ایسا فتنہ نہ ہو جائے جو گمراہ کن ہو، رسول اکرم ﷺ سید الاولین والآخرین ہیں لیکن آپ اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

لا یدخل احداً الجنة عمله قالوا
 ولا انت یا رسول اللہ قال ولا
 انا الا ان یتغمدنی اللہ برحمته
 (بخاری ص ۹۵۷ جلد ۲)

کس شخص کو اسکا عمل جنت میں داخل نہیں کر سکتا
 صحابہ نے عرض کیا اور نہ آپ یا رسول اللہ
 آپ نے فرمایا اور نہ میں الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے
 دامن رحمت میں چھپالیں۔

خوف آخرت ہی کے سلسلہ میں صحابہ کرام کے اقوال ہیں کاش ہم درخت ہوتے، کاش ہم پتھر ہوتے، قانون ہے کہ جس قدر علم بڑھتا ہے اسی قدر خوف بڑھتا ہے، جب صحابہ کرام اور خود خاتم المرسلین ﷺ کا یہ حال ہے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز کی گفتگو وجہ اشکال نہیں ہو سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ آخرت کی ترقی کیلئے اس دنیا میں یعنی دارالعمل میں قیام کی شرط صرف ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے اپنی روح کو مرتاض نہیں کیا لیکن وہ حضرات جنہوں نے اپنی روح کو عبادت و ریاضت کے ذریعہ لطیف بنا لیا ہے انکی ترقیات جاری رہتی ہیں بلکہ قبر میں ان کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے کیونکہ اس عالم کی کثافت سے بھی رفتار میں سستی آ جاتی ہے۔

اہل اللہ قبر میں رہتے ہوئے بھی اپنے عبادت و ریاضت کے تمام مشاغل جاری رکھتے ہیں ان معاملات کو کشف قبور والے بخوبی جانتے ہیں، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی ایک تصنیف میں اس قسم کے بہت سے

واقعات نقل فرمائے ہیں۔

پھر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی شان تو بہت بلند ہے، حضرت انسؓ نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے پیچھے نماز پڑھی اور فرمایا کہ اس جوان کی نماز رسول اکرم ﷺ کی نماز سے بہت قریب ہے، اسی بنا پر وفات کے بعد بھی ان کی ترقیات کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے، اہل اللہ کو بعد وفات قبروں میں نماز پڑھتے اور تلاوت قرآن کریم کرتے دیکھا گیا ہے۔

قال ابراہیم رب انی کیف تحی الموتی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے احیاء موتی کو دیکھنے کی خواہش ظاہر فرمائی اور چونکہ کیف میں کبھی سوال ذات سے ہوتا ہے، اور کبھی صفات سے اسلئے ناواقف حضرات کو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو معاذ اللہ احیاء موتی کے بارے میں تردد ہے، خداوند قدوس نے حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے جواب دلا کہ اس تردد کو رفع فرمادیا حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا، بسلی یعنی ایسا نہیں ہے بلکہ مجھے پورا یقین ہے مگر میں طلب بچھانا چاہتا ہوں، علم الیقین سے عین الیقین تک عروج کرنا میرا مقصد ہے۔

امام بخاریؒ کا مقصد بھی اسی سے متعلق ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ارشاد سے معلوم ہو رہا ہے کہ ایمان کے مختلف درجات ہیں، وہی اطمینان علم الیقین کے درجہ میں ہے اور وہی اطمینان مشاہدہ کے بعد عین الیقین ہو جاتا ہے اور اگر اپنی ذات پر تجربہ ہو جائے تو اسی کو حق الیقین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، نیز یہاں ایمان کے لئے اطمینان کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ اطمینان بھی ایمان کا ایک درجہ ہے لیکن چونکہ اطمینان کا لفظ ہے جس کا منجملہ مراتب ایمان ہونا بھی ثابت نہیں ہے، اسلئے امام بخاریؒ نے اس آیت کو دوسری آیات قرآن کے ساتھ ذکر نہیں فرمایا، بلکہ الگ کر دیا۔

حضرت علامہ کشمیریؒ نے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت ہمارے مقصد کے لئے زیادہ مدد ہے اور یہ اسلئے کہ حضرت ابراہیمؑ کے ایمان کے کمال میں کوئی شبہ نہیں اور جب یہ تسلیم ہے تو ایمان میں زیادتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، معلوم ہوا کسی خارجی چیز میں، زیادتی کے بارے میں عرض کر رہے ہیں۔

وقال معاذ اجلس بنا نو من ساعة، حضرت معاذؓ نے شاگردوں سے فرمایا ”ہمارے پاس بیٹھ جاؤ ایمان تازہ کر لیں“ حضرت معاذؓ مذکورہ ایمانی کو ایمان قرار دے رہے ہیں، معلوم ہوا کہ مرجیہ جو اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتاتے ہیں درست نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ صالحین کا ذکر بھی ایمان ہے اور ہر وہ چیز جس کا ایمان سے تعلق ہو ایمان کو تازہ کرتی ہے۔

وقال ابن مسعود الیقین الایمان کله، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ یقین کل کا کل ایمان ہی تو ہے، یہاں امام بخاریؒ کا استدلال لفظ کل سے متعلق ہے اور لفظ کل سے تاکید اسی شے کی لائی جاتی ہے جو ذی اجزاء ہو اور کم

از کم اس کے دو جز ہوں اور اگر ترقی کر کے کہیں تو طبرانی کی روایت میں اس کی بعد الصبر نصف ایمان، صبر نصف ایمان ہے۔

معلوم ہوا کہ ایمان میں تنصیف ہے، دوسرا استدلال اس طرح بھی ہو سکتا ہے کہ یقین کے مراتب مختلف ہوتے ہیں اس وجہ سے ایمان کے مراتب بھی مختلف ہوں گے کیونکہ ایمان یقین ہی کا نام ہے معلوم ہوا کہ اعمال سے یقین میں اضافہ ہوتا ہے اسلئے اعمال کو ایمان سے بے تعلق کہنا درست نہیں۔

قال ابن عمر لا يبلغ العبد حقيقة التقوى حتى يدع ما حاك في الصدر - حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ انسان اس وقت تک حقیقت تقویٰ کو نہیں پاسکتا جب تک ان چیزوں کو نہ چھوڑ دے جو دل میں کھٹکتی ہوں اس سے معلوم ہوا کہ تقوے کے درجات ہیں، تقوے کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے کنارہ کش ہو جائے جو دل میں کھٹکتی ہوں یعنی جن کے متعلق اسے شرح صدر نہ ہو، دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ مافیہ باس کو مالا باس بہ کی خاطر چھوڑ دے، اسی طرح شرک سے بچنا بھی تقویٰ ہے لیکن یہ تقویٰ کا ادنیٰ درجہ ہے بہر کیف درجات میں تفاوت ہے۔

اس سے بھی مرجیہ ہی کی تردید ہو رہی ہے کہ تم اعمال کو ایمان کے سلسلے میں قطعاً موثر نہیں مانتے، حالانکہ یہاں چھوٹے چھوٹے اعمال کو تقویٰ سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔

مرجیہ کی تردید اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ تقویٰ یا عین ایمان ہے یا متعلقات ایمان میں سے ہے اگر تقویٰ عین ایمان ہے تو معلوم ہوا کہ ایمان کے مراتب ہیں کیونکہ تقویٰ کے مراتب ہیں، اور اگر تقویٰ متعلقات ایمان میں سے ہے تو معلوم ہوا کہ تقویٰ ایمان میں مطلوب ہے جس طرح اور اعمال مطلوب ہیں۔

وقال مجاهد شرع لكم من الدين الخ اس آیت کی تفسیر میں مجاہد فرماتے ہیں خدا نے تم کو وہ دین دیا ہے کہ جس کی وصیت حضرت نوح کو کی گئی تھی، یعنی اصول ایک ہیں جیسے توحید، پیغمبروں پر ایمان، آخرت کا یقین وغیرہ، گو فروع میں بہت زیادہ اختلاف ہے، گویا جس طرح حضرت نوح علیہ السلام کا دین مجموعہ اصول و فروع ہے جو اعمال پر بھی مشتمل ہے، اسی طرح آنحضرت ﷺ کے دین میں بھی اعمال داخل ہیں تو ایمان میں کمی بیشی بھی ہو جائے گی جس کے نتیجہ میں قوت وضعف بھی آجائے گا اسلاف کے اس حوالہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے بلکہ ماجہ کی ایک روایت ہے کہ مرنے والوں کا اتباع کرو۔

فان الحی لا یومن علیہ اسلئے کہ زندہ (کے مستقبل پر) طمینان نہیں ہو سکتا، یعنی زندہ کی آئندہ زندگی کے بارے میں کوئی بھروسہ نہیں ہے کہ وہ کیا کرنے والا ہے اسی لئے قرآن کریم میں ہدایت یافتہ لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

اولئک الذین ہداهم اللہ
فبہداهم اقتدہ (پ ۷۷ ع ۱۶)

یہ حضرات ایسے تھے کہ جنکو اللہ تعالیٰ نے ہدایت
کی تھی سو آپ بھی ان ہی کے طریق پر چلئے۔

امام بخاری کا استدلال بایں طور بھی ہو سکتا ہے کہ جس طرح خداوند قدوس اختلاف جزئیات کے باوجود دین
کو ایک ٹھہرا رہے ہیں، اسی طرح ایمان اختلاف اجزاء کے باوجود ایک ہی حقیقت ہے۔

وقال ابن عباس شرعة ومنهاجا سببلا وسنة، ہر ایک پیغمبر کے لئے ایک شرعہ اور ایک منہاج مقرر کیا
ہے، منہاج بڑے راستہ کو کہتے ہیں شرعہ اس سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے راستوں کو، حضرت ابن عباس کے قول
سببلا وسنة میں جو شرعہ و منہاج کی تفسیر میں واقع ہوا ہے لف و نشر غیر مرتب ہے۔

پہلی آیت میں اصول کے متعلق فرمایا گیا تھا، اور اس آیت میں فروع کے متعلق فرمایا جا رہا ہے اور فروع
میں ہر زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تغیر ہوتا رہتا ہے اس اختلاف کے باوجود بھی دین ایک ہے اسی طرح مختلف اجزاء پر
مشتمل ہونے کے باوجود دین ایک ہے۔

اس شرعہ و منہاج کے ایک یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ امت کے اندر مختلف حیثیت کے افراد ہیں اور ہر حیثیت
کیلئے راہ الگ الگ ہیں، مرد و عورت کیلئے احکام الگ الگ ہیں، بیمار و تندرست کے احکام میں فرق ہے حالانکہ مقصد
ایک ہے، یعنی قرب خداوندی۔

دعاء کم ایمانکم، اس سے بھی مرجحہ کی تردید ہو رہی ہے کہ دعاء جس کے معنی طلب اور پکار کے ہیں قول
و فعل دونوں پر مشتمل ہے کیونکہ دعا زبان اور ہاتھ دونوں کا کام ہے اور اس قول میں دعاء و ایمان میں اتحاد بتلایا گیا ہے۔
لیکن یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال بے محل سا معلوم ہو رہا ہے کیونکہ قرآن میں یہ آیت کفار کے متعلق
ہے ارشاد ہے،

قُلْ مَا يَعْبُؤْكُمْ رَبِّي لَوْلَا
دُعَاءُكُمْ (پ ۱۹ ع ۴)

آپ کہہ دیجئے میرا رب تمہاری ذرا بھی پرواہ نہ
کرے گا اگر تم اس کو نہ پکارو۔

یعنی ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ تمہیں تکذیب کی سزا دی جائے لیکن اتنی بات ہے کہ جب تم پر مصیبت آتی ہے تو تم
پکارتے ہو اور خداوند قدوس تمہاری پکار کی لاج رکھ لیتا ہے یا مطلب یہ کہ تمہاری جماعت میں مسلمان ہیں جو پکارتے
ہیں اسلئے تمہاری پرواہ کر لی جاتی ہے یعنی جبکہ یہ مسلمان ہیں اس وقت تک تم بھی محفوظ ہو اور اگر یہ مسلمان یہاں سے
نکال دیئے گئے تو عذاب کا سلسلہ شروع ہو جائیگا، اسی لئے حضرت ابن عباس نے دعاء کم کی تفسیر ایمانکم سے کی
ہے۔ نیز یہ کہ جب ظاہری پکار کا یہ اثر ہے کہ لاج رکھ لی جاتی ہے تو اگر حقیقی دعا ہو تو وہ یقیناً ایمان ہوگی، اس طرح تنبیہ
کی جارہی ہے کہ اگر غضب سے بچنا چاہتے ہو تو اس کے لئے اخلاص نیت کے ساتھ دعا درکار ہے، حضرت ابن عباس

نے دعا کا ترجمہ ایمان سے فرمایا ہے، کیونکہ:

دعاء عبادت کی اصل ہے

الدعاء مع العبادة

فرمایا گیا ہے، گویا ایمانیات میں دعا کا بہت اونچا مقام ہے اسی لئے اسے ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے، بہر حال ان تمام آیات، احادیث اور آثار سے یہ ثابت ہو گیا کہ ایمان ترقی بھی کرتا ہے اور گھٹتا بھی ہے اور اس کی زیادتی کا مدار اعمال پر ہے اسلئے مرجیہ و کرامیہ کا اعمال کو ایمان کے سلسلہ میں بے تعلق اور غیر موثر کہنا درست نہیں۔

(۸) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى قَالَ أَنَا حَنْظَلَةُ بْنُ أَبِي سُفْيَانَ عَنْ عِكْرَمَةَ بِنِ

خَالِدٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بِنِي الْأِسْلَامِ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةٌ أَنْ لَا

إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَإِقَامُ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءُ الزَّكَاةِ وَالْحَجُّ وَصَوْمُ رَمَضَانَ

ترجمہ | عبید اللہ بن موسی نے حدیث بیان کی فرمایا کہ انہیں حنظلہ بن ابی سفیان نے حضرت ابن عمرؓ سے بواسطہ عکرمہ بن ابی خالد یہ بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور نماز کو قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، حج کرنا، اور رمضان کے روزے رکھنا۔

تشریح حدیث | ترجمہ کا مقصد اصلی تھا بنی الاسلام علی خمس اسی کیلئے حدیث مرفوع پیش کی ہے، باقی رہا قول و فعل اور یزید و یمنقص یہ بطور نتیجہ ترجمہ میں ذکر ہوا ہے، چنانچہ ان چیزوں کے لئے آیات اور اقوال کو بطور استشہاد پیش کر دیا، کوئی حدیث مرفوع پیش نہیں کی، اب ترجمہ کے مقصد اصلی کے لئے حضرت ابن عمرؓ کے روایت لا رہے ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے گویا اسلام کو ایسے مکان اور ایسی عمارت سے تشبیہ دی جا رہی ہے جسکے قیام کے لئے ستونوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ ستون جب تک قائم رہتے ہیں، مکان اور عمارت قائم رہتے ہیں ورنہ انہدام کی صورت پیش آ جاتی ہے اور اگر کسی ایک ستون کو نقصان پہنچتا ہے، تو گو عمارت باقی رہتی ہے لیکن اس میں کمزوری آ جاتی ہے اور آئندہ کے لئے یہ خطرہ لاحق ہو جاتا ہے کہ اگر اصلاح نہ کی گئی تو کسی وقت اور بھی نقصان پیدا ہو سکتا ہے۔

اسلام کو ایسی ہی عمارت سے تشبیہ دی جا رہی ہے جس میں یہ پانچ ستون ہیں شہادۃ ان لا الہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ، الحدیث ان پانچ دعاموں میں باہمی فرق بھی ہے ایک دعامہ تو تمام بنیادوں کی بنیاد ہے اور اسی پر قصر کی بقا و فنا کا دار و مدار ہے اور بقیہ دعائم اس کے معاون ہیں جس طرح دعاموں کی ضرورت خیمہ قائم کرنے کیلئے پڑتی ہے تو ایک دعامہ وسط میں قائم کیا جاتا ہے، جو اس خیمہ کو اٹھائے رکھتا ہے، باقی چاروں دعائم

رسیوں سے کھونٹوں میں باندھے جاتے ہیں اگر ادھر ادھر کی رسیاں ڈھیلی پر جائیں تو وہ خیمہ گر نہیں جائے گا بلکہ سمت جائیگا اور وسعت باقی نہ رہے گی نیز یہ کہ اگر دعائم چاروں طرف سے گر جائیں تو گو خیمہ کو وسعت بالکل باقی نہ رہیگی لیکن خیمہ ابھرا ہوا ضرور نظر آتا رہے گا لیکن اگر بیچ کا دعائم گر جائے تو خیمہ زمین پر آ رہے گا، بالکل یہی حیثیت ان امور خمسہ کی ہے ان میں شہادت کی حیثیت قطب کی ہے جس پر خیمہ اسلام قائم ہے باقی نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج بمنزلہ اوتاد ہیں جن سے رسیاں باندھ دی جاتی ہیں۔

شہادت توحید و رسالت باقی ہے تو خواہ اوتاد باقی نہ رہیں، اسلام باقی رہیگا اور اگر معاذ اللہ اس شہادت توحید و رسالت میں تزلزل آ گیا تو خواہ اوتاد باقی رہیں خیمہ باقی نہ رہے گا۔

یہاں شبہ کیا جاتا ہے کہ اس طرح مبنی اور مبنی علیہ ایک ہو گئے، کیونکہ اسلام ان امور خمسہ پر موقوف ہے اور یہ امور اسلام پر اور اسلام اور ان امور خمسہ میں کوئی فرق نہیں ہے حالانکہ قاعدہ کی رو سے مبنی اور مبنی علیہ میں تفاوت اور تغائر ہونا چاہئے۔

اسکا جواب شارحین نے بالاتفاق یہی دیا ہے کہ چیز گو ایک ہی ہے لیکن حیثیت مختلف ہے اور یہ بھی مسلم ہے کہ حیثیت کے بدل جانے سے حکم بدل جاتا ہے، مجموعی حیثیت سے یہ امور مبنی ہیں اور انفرادی طور پر مبنی علیہ، جس طرح کہ خیمہ مجموعہ کا نام ہے اس میں قطب اوتاد اور چھت سب ہی شامل ہیں اور جب یہ پوچھا جائے گا کہ خیمہ کس چیز پر قائم ہے تو کہا جائیگا کہ قطب اور اوتاد پر اسی طرح یہاں بھی مجموعہ کا نام مبنی ہے اور انفرادی حیثیت سے یہی چیزیں مبنی علیہ۔

تشبیہ کا مقصد یہ ہے کہ جس طرح انسان مکان اور محل میں بیٹھ کر پوری طرح محفوظ ہو جاتا ہے نہ اسے باہر سے حملہ کرنے والے دشمنوں کا خوف رہتا ہے، نہ سردی گرمی کا خطرہ رہتا ہے اور نہ یہی خدشہ رہتا ہے کہ اندرونی طور پر کوئی حملہ آور ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح قصر اسلام ہے کہ اس میں داخل ہونے کے بعد انسان کو نہ اندرونی دشمن کا خوف رہتا ہے اور نہ بیرونی دشمن سے خطرہ رہتا ہے انسان کا اندرونی دشمن نفس ہے، ارشاد فرمایا گیا،

ان النفس لامارة بالسوء (پ ۱۳ ع ۱) نفس تو بری ہی بات بتلاتا ہے۔

لیکن اسلام کے احکام پر پوری طرح کار بند ہے تو انشاء اللہ نفس کچھ نہیں کر سکتا الا مارحم ربی کا استثناء ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے اور انسان کا بیرونی دشمن شیطان ہے لیکن سچے اور مخلص مسلمان کا وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا، الا عبادك منهم المخلصین کا استثناء اسی لیے کیا گیا ہے اسی طرح سردی اور گرمی کے خوف کا مفہوم یہ ہے کہ جہنم کے دو طبقے ہیں طبقہ نار اور طبقہ زمہریر، مگر قصر اسلام میں پوری طرح آجانے کے بعد اس کا خطرہ بھی نہیں رہتا۔

امام بخاری کا مقصد | امام بخاری نے اس باب میں یہ ثابت فرمایا ہے کہ ایمان کی بیشی کو قبول کرتا ہے اس حدیث سے یہ مدعا اس طرح ثابت ہے کہ یہاں اسلام میں پانچ چیزوں کو بنیاد بتایا گیا

ہے اور یہ پانچوں چیزیں ہر شخص میں نہیں پائی جاتیں، کوئی نماز نہیں پڑھتا، کوئی زکوٰۃ نہیں دیتا کوئی حج کے معاملہ میں کوتاہی کرتا ہے کسی سے روزے کے معاملہ میں تساہل ہو جاتا ہے بس اسی اعتبار سے مراتب ایمان میں تفاوت آجاتا ہے، کسی کا اسلام ناقص ہے اور کسی کا تام، تام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی یہ علامتیں اسمیں پورے طور پر موجود ہوں، یا مثلاً اسی نماز کے نہ ہو سکنے کے باعث عورت کا دین ناقص ہے، عورتوں کو ناقصات العقل والدین فرمایا گیا، کیونکہ عورت ایک ماہ میں چند ایام بغیر نماز کے گزارتی ہے اسی طرح عورت رمضان میں چند روزے وقت پر نہیں رکھ پاتی اور اسی پابندی اعمال سے دین میں تمامیت اور نقصان کا پتہ چلتا ہے، پابندی اعمال سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے دل میں لگن ہے اور اذعان و تصدیق اسے حاصل ہے اور اگر پابندی اعمال نہیں ہے تو یہ نقصان دین کی علامت ہے، قرآن کریم میں نماز میں سستی کرنے والوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔

واذا قاموا الى الصلوة قاموا
كسالى يراءون الناس ولا
يذكرون الله الا قليلاً
اور جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بہت
ہی کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں، صرف
آدمیوں کو دکھلاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی
نہیں کرتے مگر بہت ہی مختصر۔
(پ ۱۸۷)

غرض اسی اعمال کی کمی بیشی سے امام بخاریؒ نے ایمان کی کمی بیشی پر استدلال کیا ہے۔

حل لغات نماز کے لئے اقام الصلوة فرمایا ہے، اقامت کھڑا کرنا اور سیدھا کرنا، مراد یہ ہے کہ نماز کے لئے جو قانون بتایا گیا ہے اور وقت و شرائط کے بارے میں جو کچھ تعلیم کیا گیا ہے ان سب چیزوں کی رعایت کے ساتھ نماز کا ادا کرنا اقامت ہے اور لفظ اقامت استعمال کرنے کی وجہ بھی یہی ہے کہ اس کا مفہوم بہت وسیع ہے ورنہ صلوا بھی فرمایا جاسکتا تھا۔

اسی طرح زکوٰۃ کے سلسلہ میں زکوٰۃ نہیں فرمایا بلکہ اتوا الزکوٰۃ فرمایا ہے، اس لفظ ایتاء سے معلوم ہو رہا ہے کہ شریعت میں اس کے لئے مستقل قانون ہے جس کے بغیر اس فریضہ سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں، مثلاً یہ کہ شریعت نے چالیسواں حصہ مقرر کیا ہے اور اس کے لئے مصارف بھی مقرر کردئے ہیں اور ہر چیز کی زکوٰۃ کا قانون بھی الگ رکھا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان قوانین کی پابندی کے بغیر زکوٰۃ دیتا ہے تو ایتاء زکوٰۃ پر اس کا عمل نہیں ہے کیونکہ ایتاء زکوٰۃ کے معنی یہ ہیں کہ شریعت کے قائم کردہ اصول کے تحت ادائیگی ہو، اسی لفظ ایتاء سے معلوم ہو رہا ہے کہ زکوٰۃ کے لئے تملیک ضروری ہے محض زکوٰۃ نکال کر مال سے الگ رکھ دینا یا نکالنے کی نیت کر لینا کافی نہیں ہے۔

والحج وصوم رمضان: حج زمان مخصوص میں مکان مخصوص کی زیارت کا نام ہے، اور صوم لغتاً رکنے کو

کہتے ہیں، اصطلاح شرع میں نیت کے ساتھ مخصوص چیزوں سے رکنے کا نام صوم ہے۔

الفاظ حدیث میں تقدیم و تاخیر کی وجہ | بخاری شریف کی اس روایت میں جو حضرت ابن عمرؓ سے بہ طریق
حظله ذکر کی گئی ہے حج کو صوم رمضان پر مقدم کیا گیا ہے، دوسرا
طریق مسلم شریف میں ذکر کیا گیا ہے جہاں صوم رمضان حج پر مقدم ہے، یہی روایت حضرت سعد بن عبیدہ نے
حضرت ابن عمرؓ سے ذکر کی ہے اور اسمیں صوم رمضان کو حج پر مقدم ذکر کیا ہے اور انہیں حظله سے مسلم نے بھی صوم کو
حج پر مقدم ذکر کیا ہے، اب گویا حظله سے دونوں طریقے منقول ہیں، اور سعد بن عبادہ کی روایت سے دوسرے بیان
کی تائید ہو رہی ہے۔

مسلم شریف کی روایت میں ہے کہ جب حضرت ابن عمرؓ نے صوم رمضان والحج فرمایا تو راوی نے
حضرت ابن عمرؓ سے عرض کیا الحج و صوم رمضان یعنی اس سے پہلے آپ نے حج کو صوم رمضان پر مقدم ذکر
فرمایا تھا، اس پر حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا ہکذا سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اب اشکال یہ ہے کہ جب دونوں طریقے اصول محدثین کے اعتبار سے صحیح ہیں تو حضرت ابن عمرؓ نے اس
کی تردید کیوں فرمائی اور اگر تردید صحیح ہے تو حظله کی روایت میں دونوں طریقے کیوں منقول ہیں، اس سے معلوم ہوتا
ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے دونوں طرح سنا ہے کسی موقع پر آپ نے حج کو مقدم ذکر فرمایا اور کسی
موقع پر صوم رمضان کو، ورنہ ایک روایت کو نقل بالمعنی کہنا ہو گا چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے بخاری شریف کی اس روایت کو
نقل بالمعنی کہا ہے اور مسلم شریف کی روایت کو اصل قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں سماع کی تصریح ہے اور بخاری کی
روایت میں یہ نہیں ہے گویا جب اس روایت میں تصریح ہے اور حظله کی ایک روایت بھی اس کی موافقت میں ہے تو
نقل بالمعنی کہنے میں کوئی حرج نہیں، حافظ ابن حجرؒ کا یہ جواب قاعدے کے مطابق صحیح ہے اور اسکے تسلیم کرنے میں
وہی شخص پس پیش کریگا جو محدثین کے طریقے سے ناواقف ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ حافظ کا یہ جواب امام بخاریؒ کی
شان کے خلاف ہے، کیونکہ اگر امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہ محقق ہوتا کہ حضرت ابن عمرؓ کی یہ روایت اصل
نہیں ہے تو امام اس کو بنیاد نہ قرار دیتے۔

بنیاد قرار دینے کا یہ مطلب ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے جامع صحیح میں ابواب حج کو ابواب صیام سے
پہلے ذکر فرمایا ہے، اس ترتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک یہی روایت اصل ہے اسلئے کسی
اور اچھی توجیہ کی ضرورت ہے۔

درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی معتمد استاد کسی چیز کو نقل کر رہا ہو تو شاگرد کو اعتراض کا حق نہیں ہوتا
اور نہ استاد پر گرفت ہی درست ہوتی ہے، چنانچہ جب شاگرد نے حضرت ابن عمرؓ سے کہا کہ آپ پہلے الحج و صوم
رمضان فرما چکے ہیں اور اب صوم رمضان والحج فرما رہے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھول رہے ہیں، اس

پر حضرت ابن عمرؓ نے تشبیہ فرمادی کہ تمہیں یہ کہنے کا حق نہیں ہے ہکذا سمعت یعنی میں نے ایسے بھی سنا ہے گویا تشبیہ کہ ساتھ وجہ تشبیہ بھی بیان فرمادی ہکذا سمعت کا یہ مطلب لینا کہ میں نے ایسا ہی سنا ہے درست نہیں ہے بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضرت حزام بن حکیمؓ سورہ فرقان کی تلاوت اس طریقہ کے خلاف کر رہے تھے جو حضرت عمرؓ کے علم میں تھا، جب حضرت عمرؓ نے سنا تو غضب ناک ہوئے اور چاہا کہ اسی حالت میں چادر گھسیٹتے ہوئے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے جائیں لیکن نماز سے فارغ ہونے کا انتظار فرمایا، فراغت کے بعد چادر سے گردن اٹھتے ہوئے خدمت اقدس میں لے گئے، اور عرض کیا کہ یہ قرآن کریم غلط پڑھتے ہیں، آپ نے فرمایا انہیں چھوڑ دو اور پھر حضرت حکیم بن حزام سے قرآن کریم سنا، حضرت حکیم بن حزام نے اسی طریقہ پر تلاوت فرمائی آپ نے فرمایا ہکذا انزلت، پھر آپ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا تم پڑھو حضرت عمرؓ نے اس طرح تلاوت کی جو ان کے علم میں تھی آپ نے سکر فرمایا ہکذا انزلت، اس کے یہ معنی نہیں کہ اسی طرح نازل ہوئی ہے دوسرے طریق پر پڑھنا درست نہیں، بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس طرح بھی نازل ہوئی ہے اور اس طرح بھی۔

اسی طرح حدیث میں حضرت ابن عمرؓ کے ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ میں نے اسی طرح سنا ہے، فرق یہ ہے کہ ایک جگہ شاگرد کو تشبیہ کی غرض سے ہکذا سمعت کی تصریح آگئی ہے اور دوسری ترتیب کے سلسلہ میں اس کی نوبت نہ آسکی، اب ان دونوں طریقوں کے لئے معقول وجہ ہونی چاہیے جو عنقریب ذکر ہوگی۔

عبادات کی دو قسمیں ہیں، وجودی اور ترکی، پھر وجودی کی دو قسمیں ہیں، فعلی اور قولی اور پھر فعلی کی دو قسمیں ہیں بدنی اور مالی، حدیث شریف میں ذکر کی گئی تمام عبادتیں صوم کے علاوہ وجودی ہیں اسلئے پہلے تمام وجودی عبادتوں کو ایک جگہ ذکر فرمایا اور ان میں حج کو سب سے مؤخر ذکر کیا کیونکہ باقی تمام عبادتوں کا خود ہی ادا کرنا ضروری ہے اور حج میں نیابت بھی چل جاتی ہے اور صوم کو سب سے آخر میں اسلئے ذکر کیا کہ وہ ترکی عبادت ہے۔

اور اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے کہ بلحاظ زمانہ صوم کی فرضیت مقدم ہے، صوم رمضان کی فرضیت ۲ھ کی ہے اور حج کی فرضیت ۶ھ کی ہے تو اس اعتبار سے صوم کی تقدیم النسب معلوم ہوتی ہے نیز صوم کی تقدیم اسلئے بھی مناسب ہے کہ صوم کا مکلف ہر بالغ ہے اور حج کا مکلف ہر بالغ نہیں، نیز یہ کہ حج عمر میں صرف ایک بار واجب ہوتا ہے اور روزہ برابر ساتھ لگا ہوا ہے، غرض ہر چیز کے لئے مناسب وجہ موجود ہے، اور اگر ہم عبادت کے مقصد پر غور کریں تو معلوم ہوگا کہ عبادت کا مقصد خداوند قدوس کا قرب ہے اور اسکے لئے بدنی و مالی دونوں قسم کی عبادتیں درکار ہیں کیونکہ بدنی عبادت تو واضح سکھلاتی ہے اور مالی عبادت جز قلب سے مال کی محبت کو دور کرتی ہے، پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان عبادت کے ذریعہ غرور و تکبر نکال دے اور حاکم کی حکومت ہر طرح تسلیم کر لے، اس کے بعد دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے اس کا بھی یقین ہو جائے کہ مال میرا نہیں ہے، بلکہ اسکا مالک خدا ہے جب صلوة و زکوٰۃ کے

ذریعہ یہ منزلیں طے ہو گئیں تو وہ عمل بتلایا گیا جو دونوں سے مرکب ہے یعنی حج، اس سلسلہ میں بدن اور مال دونوں کی قربانی دینی پڑتی ہے، بدن کے تمام آرام ترک کرنے پڑتے ہیں اور ایک مکان مخصوص سے تعلق ہونے کی بنا پر مصارف بھی آجاتے ہیں۔

جب یہ منزل بھی طے ہو گئی تو اس عبادت کی تعلیم دی گئی، جس سے بندہ خداوند قدوس سے قریب ہو سکے یعنی روزہ، حج میں کم از کم کھانے پینے کی ممانعت نہ تھی لیکن روزے میں اس کی بھی اجازت نہیں دی گئی اور دوسری عبادات میں یہ شان نہیں ہے نماز میں بھی گو کھانے کو موقوف کر دیا جاتا ہے لیکن اس کا وقت اتنا کم ہے کہ مشقت نہیں ہوتی، روزے میں وقت زیادہ لگتا ہے، اسلئے یہ درجہ آخری معلوم ہوتا ہے کہ نفس کو اس درجہ مرتاض کر لیا جائے کہ وہ مال اور جان کو کوئی حیثیت نہ دے، اس اعتبار سے بھی صوم کوچ سے موخر ہونا چاہئے کیونکہ بندہ اس میں تخلقوا باخلاق اللہ کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے۔

اور اس اعتبار سے صوم رمضان کوچ سے مقدم یا حج کو صوم رمضان سے موخر کرنا انبہ ہے کہ حج خاص وہ چیز ہے جس میں بندہ اپنی محبت کا پورا ثبوت دیتا ہے، دیوانگی وارنگی جو عاشق کے احوال میں سے ہے حاجی کے افعال سے پوری طرح نمایاں ہوتی ہے۔

ان افعال کی ابتداء وہاں سے ہوئی تھی جہاں پہلے بدن کو مرتاض کیا تھا، دن میں پانچ مرتبہ ریاضت کی، جس میں کھانا پینا ممنوع تھا، اور دنیا کی تمام چیزوں سے کامل انقطاع بھی۔ یہی انقطاع تمام روحانی ترقیات کی اصل ہے کیونکہ روحانی ارتقاء کے لئے ضروری ہے کہ انسان ان تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو جائے جو قرب خداوندی اور اخلاق خداوندی کے اختیار سے مانع ہیں اور یہ دو طرح کی شہوتیں ہیں شہوت بطن، شہوت فرج، دنیا کے تمام کاروبار ان ہی کے گرد گھومتے ہیں اس ترک اکل و شرب اور ترک جماع سے روزہ عبارت ہے جس کے صلے میں۔

الصيام لی وانا اجزی بہ وفی رواية
روزہ میرے لئے ہے اور میں خود اس کا بدلہ دوں گا
أجزی بہ (بخاری کتاب الصوم ص ۲۵۴) اور دوسری روایت میں ہے کہ میں خود اسکی جزا ہوں۔

فرمایا گیا ہے جب یہ مرتبہ بھی حاصل ہو گیا تو اب تخلیہ کا حکم دیا گیا تاکہ تخلیہ میں جمال کا پر تو ڈالا جائے اور جب خیالات ہمہ تن محبوب کی طرف ہو گئے تو دیار محبوب کی حاضری کا حکم ملا اور اس کیلئے درمیان میں کچھ وقفہ بھی دیا گیا روزہ میں تو کھانا پینا ترک کر دیا تھا، جب اسکی عادت ہو گئی تو احرام کے بعد اور بھی دوسری حلال چیزیں حرام کر دی گئیں، روزہ میں تو رات کے وقت ان چیزوں کو حلال کر دیا جاتا تھا لیکن اس میں مسلسل طور پر اور بھی دوسری مباح و جائز چیزوں کو یکسر حرام قرار دے دیا گیا، یہاں اگر سہواً بھی لغزش ہو جائے تو فد یہ آ جاتا ہے اور شان بالکل

دیوانوں کی ہے ارد گرد گھومتا ہے، دیواروں کو چومتا ہے، پردے پکڑ کر روتا ہے ان تمام چیزوں کے بعد پھر قربانی کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کی جزا ہے۔

اس طرح پاک ہو کر نکلتا ہے جیسے آج ہی پیدا ہوا ہے۔

خرج کیوم ولدته امہ

حقوق اللہ سے متعلق تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور ابوداؤد کی ایک روایت کے مطابق حقوق العباد بھی، لیکن یہ روایت متمسک نہیں ہے، اگرچہ یہ خدا کی رحمت سے بعید نہیں، حقوق العباد کی معافی اور ادائیگی کا یہ مفہوم ہو سکتا ہے کہ خداوند قدوس ان کو اپنے ذمہ لے لے۔

اس اعتبار سے حج کو تمام چیزوں سے موخر ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، غرض ہر ترتیب کے لئے ایک

مناسب وجہ موجود ہے۔

[۳] بَابُ أُمُورِ الْإِيمَانِ وَقَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ لَيْسَ الْبِرُّ أَنْ تُولُؤُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ

الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ إِلَى قَوْلِهِ الْمُتَّقُونَ. قَدْ أَفْلَحَ

الْمُؤْمِنُونَ ۗ الْآيَةُ.

ترجمہ | باب، امور ایمان کے بیان میں اور خداوند قدوس کا یہ ارشاد کہ کچھ سارا کمال اسی میں نہیں (آ گیا) کہ تم اپنا منہ مشرق کو کر لو، یا مغرب کو، لیکن اصلی کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ (کی ذات و صفات) پر یقین رکھے اور اسی طرح قیامت کے دن (آنے پر بھی) اور فرشتوں (کے وجود) پر بھی اور سب کتب سماویہ پر اور پیغمبروں پر اور (وہ شخص) مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں (اپنے حاجت مند) رشتہ داروں کو اور (نادار) یتیموں کو اور دوسرے محتاج لوگوں کو اور (بے خرچ) مسافروں کو اور لا چاری میں سوال کر نیوالوں کو (اور قیدی اور غلاموں) کی گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو اور جو اشخاص (ان عقائد و اعمال کے ساتھ یہ اخلاق بھی رکھتے ہوں) کہ اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب (کسی جائز امر کا) عہد کر لیں اور وہ لوگ مستقل (مزاج) رہنے والے ہوں تنگ دستی اور بیماری میں اور (معرکہ) قتال میں (بس) یہی لوگ ہیں جو سچے (کمال کے ساتھ موصوف ہیں) اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں، بالتحقیق ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز میں خشوع کرنے والے ہیں۔ الآیۃ

مقصد ترجمہ | امام بخاری باب سابق میں بنیادی چیزیں بیان فرما چکے ہیں، اب فروع بیان کرنا چاہتے ہیں گویا اسلام میں کچھ چیزیں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور کچھ کو فروع کی حیثیت دی گئی ہے، اس باب میں فروع کا بیان مقصود ہے اسی لئے امور کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

دوسرے یہ کہ اس ترجمہ میں ایک شبہ کا رفع بھی ہو سکتا ہے، سابق ترجمہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ اسلام صرف ان پانچ چیزوں کا نام ہے، باقی چیزیں داخل اسلام نہیں، اور جب اسلام ہی سے خارج ہیں تو ایمان سے بدرجہ اولیٰ خارج ہوگی، حالانکہ تمام اوامر و نواہی اسلام کا جز ہیں، اور ان ہی پر عمل کرنے سے ایمان میں نور آتا ہے، اس شبہ کے رفع کے لئے امام بخاری نے توجہ دی کہ یہی پانچ چیزیں نہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی چیزیں اسلام میں داخل ہیں، تیسری بات یہ ہے کہ امام کا مقصد اجمال کے درجہ میں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ ایمان کے ابواب میں مرجیہ کی تردید کر رہے ہیں، اس لئے اب بالکل واضح طریقہ پر یہ بتلا رہے ہیں کہ ایمان چند امور کے مجموعہ کا نام ہے۔

امور الایمان: میں اضافت بیانہ بھی ہو سکتی ہے اس وقت معنی ہوں گے الامور التی ہی الایمان یعنی وہ امور جو عین ایمان ہیں اور اضافت لامیہ بھی ہو سکتی ہے اور اس وقت معنی ہونگے الامور التی ہی لایمان مکملات وہ امور جو ایمان کے لئے مکمل ہیں، ایمان کی روشنی بڑھاتے ہیں اور یہ اضافت بمعنی فی بھی ہو سکتی ہیں یعنی الامور الداخلة فی الایمان .

ترجمہ کا آیت ذیل سے ربط | امام بخاری نے اپنے مقصد کے اثبات کیلئے دو آیتیں پیش فرمائی ہیں، پہلی آیت میں تو امور ایمان گنائے گئے ہیں اور دوسری آیت میں مومن کی چند صفات کا بیان ہے۔

پہلی آیت کے متعلق حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے عبدالرزاق سے بروایت مجاہد حضرت ابو ذر سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے ایمان کے بارے میں سوال فرمایا، آپ نے آیت تلاوت فرمادی:

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّنَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ.

لیکن حضرت ابو ذر کی یہ روایت علی شرط البخاری نہ تھی اسلئے امام بخاری نے روایت کو چھوڑ دیا اور اس سلسلہ کی آیت ذکر فرمادی، آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان میں بہت سی چیزیں داخل ہیں، اور سب بدرجہ خود مکمل ہیں، عام اس سے کہ آپ اسے جزمانیں یا نہ مانیں لیکن جب قرآن کریم نے ان اعمال کی ضرورت کا اثبات کیا ہے تو مرجیہ کی تردید ہوگی۔

بخاری نے اس آیت کے سلسلے میں تصریح فرمائی ہے کہ اصل میں یہ آیت اہل کتاب کے معاملہ کو رد کرتی

ہے، نصاریٰ کا قبلہ مشرق تھا اور یہود کا مغرب، مدینہ طیبہ میں ہجرت کے بعد استقبال بیت المقدس سولہ ماہ رہا اور پھر جب تحویل کردی گئی تو اعتراضات شروع ہوئے کہ یہ کیا تماشہ ہے کبھی رخ ادھر کرنے لگتے ہیں اور کبھی ادھر، ان کا کوئی مذہب ہی نہیں معلوم ہوتا ورنہ اس پر پختگی سے عمل کرتے، کبھی یہ اعتراض کرتے کہ انہیں پیغمبری کا دعویٰ ہے اگر یہ سچ ہے تو پیغمبروں نے نماز بیت المقدس کی طرف پڑھی ہے، آپ نے کعبہ کو اختیار کر لیا، کبھی کہتے کہ ملت ابراہیمی کے دعویٰ دار ہیں اور عمل اس کی مخالفت میں ہے، بہر کیف یہ مختلف قسم کی آوازیں اٹھ رہی تھیں خداوند قدوس نے آیت نازل فرمادی لیس البران تولوا وجوہکم الایہ یعنی کیا تم نے یہ سمجھا ہے کہ ادھر ادھر رخ کر لینا ہو کا کام ہے ہو تو اطاعت کا نام ہے، جس طرف حاکم نے حکم دیا اسی طرف بے تردد رخ کر لیا، کیا تم نے خدا کو مشرق و مغرب کی حدود میں پابند سمجھا ہے، پھر آیت میں ان تمام باتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جو انسانی کمالات کا خلاصہ ہیں۔

مجموعی اعتبار سے انسانی کمالات کے تین شعبے ہیں پہلا کمال یہ ہے کہ انسان کے عقائد بالکل صحیح ہوں دوسرا کمال یہ ہے کہ انسان کی معاشرتی زندگی بے داغ ہو، تیسرا کمال یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تہذیب نفس کی کوشش میں نگار ہے، آیت کریمہ میں تینوں چیزیں موجود ہیں پہلی چیز یعنی اعتقادات کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا گیا:

مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَآمَنَ بِمَا
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّنَ (پ ۶۷۲)

جو شخص اللہ پر اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر اور پیغمبروں پر یقین رکھے۔

آگے حسن معاشرت کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ
وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ
وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ (پ ۶۷۲)

اور مال دیتا ہوا اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں۔

یعنی خدا کی محبت میں مال کو ان لوگوں پر صرف کرو جن میں اقرباء اور غرباء ہیں جو اپنی ناداری، مسکنت اور یتیمی کے باعث مستحق امداد ہیں ان آیات میں آزاد کرانے کی راہیں نکالنے کی تاکید کی گئی ہے یعنی غلاموں کو مکاتب بناؤ اگر وہ غلام ہیں تو انہیں خرید کر آزاد کرو۔

آگے تہذیب نفس کا معاملہ ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک فرائض کی ادائیگی سے متعلق ہے جس سے تہذیب نفس ہوتی ہے، اور دوسرے حسن اخلاق ہے، فرائض کی ادائیگی کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

اقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ (پ ۶۷۲) نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو۔ اور پھر حسن اخلاق کے سلسلہ میں ارشاد ہے:

والموفون بعہدہم اذا عاہدوا
والصبرین فی الباساء والضراء
وحین الباس (پ ۶۷۲)

اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں
جب عہد کر لیں اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں
تنگدستی، بیماری اور قتال میں،

کیونکہ خلاف عہد کرنا نفاق کی علامت ہے، ارشاد فرمایا گیا:

اذا حدث کذب و اذا وعد
اخلف (بخاری جلد ۱ ص ۱۰)

جب بات کرے جھوٹ بولے اور جب وعدہ
کرے وعدہ خلافی کرے۔

باساء شدت فقر، ضراء شدت مرض، حین الباس جنگ کی تیزی، گویا ان چیزوں میں صبر بھی اخلاق
کی بلندی اور کردار کی مضبوطی کی دلیل ہے۔

دوسری آیت میں مومن کی چند صفات بیان کی گئی ہیں، پوری آیت ملاحظہ ہو۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي
صَلَاتِهِمْ خاشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ
عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ وَالَّذِينَ هُمْ
لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِأُزْوَاجِهِمْ
حَافِظُونَ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا
مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ
فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ
الْعَادُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمْتِنِهِمْ
وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ
عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ بِحَافِظُونَ أُولَٰئِكَ
هُمُ الْوَارِثُونَ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ
هُمُ فِيهَا خَالِدُونَ (پارہ ۱۸ ص ۱۷)

با تحقیق ان مسلمانوں نے فلاح پائی جو اپنی نماز
میں خشوع کر نیوالے ہیں اور جو لغو باتوں سے
برکنار رہنے والے ہیں اور جو اپنا تزکیہ کرنے
والے ہیں اور جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت
کر نیوالے ہیں لیکن اپنی بیویوں سے یا اپنی
لوٹڈیوں سے کیونکہ ان پر کوئی الزام نہیں
ہاں جو اس کے علاوہ طلب گار ہو، ایسے لوگ
حد سے نکلنے والے ہیں اور جو لوگ اپنی امانتوں اور
عہدوں کا خیال رکھتے ہیں اور جو اپنی نمازوں
کی پابندی رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ وارث
ہونے والے ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے
وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔

مومنین کی یہ صفات کا صفہ ہوں یا مادحہ، لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ مومن کا مومن ہونا کن باتوں سے
ظاہر ہوتا ہے، بہر کیف دونوں باتوں سے معلوم ہوا کہ ایمان میں اور بھی بہت سی چیزیں داخل ہیں اور مرجیہ کا یہ کہنا
کہ تصدیق کے بعد کسی عمل خیر کی ضرورت نہیں رہتی، غلط ہے۔

آیتوں کی ترتیب میں امام بخاری نے اس آیت کو مقدم رکھا ہے جس میں ایمان کو پورے سے تعبیر کیا گیا ہے

حالانکہ دوسری آیت اس سلسلے میں زیادہ صاف تھی کیونکہ اسمیں مومن کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور پہلی آیت میں اس توجیہ کی ضرورت بہر حال پڑتی ہے کہ ایمان اور بسر ایک ہی چیز ہیں لیکن امام بخاریؒ کے پاس اسکی معقول وجہ ہے کہ جب حضرت ابو ذرؓ نے پیغمبر ﷺ سے سوال کیا تو آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی تھی، بس اسی لئے امام بخاریؒ نے اس کو مقدم کیا۔

یہاں دونوں آیتوں کے درمیان امام بخاریؒ نے کچھ فاصلہ قائم نہیں فرمایا، گو بخاری کے بعض نسخوں میں واو عاطفہ اور بعض میں وقول اللہ کا اضافہ بھی ملتا ہے لیکن اگر ان نسخوں کو نہ لیں، تو حافظ ابن حجرؒ نے اس فصل کے نہ رکھنے کی ایک وجہ بیان فرمائی ہے کہتے ہیں کہ قد افلح المومنون متقون کی تفسیر میں بھی واقع ہو سکتا ہے (فتح الباری ص ۲۹ ج ۱) لیکن بات دل کو لگتی نہیں ہے اول تو آیتیں الگ الگ ہیں اور جب اصل کی روایت میں وقول اللہ موجود ہے تو پھر ان تاویلات کی چنداں ضرورت نہیں اور نہ ان نسخوں سے صرف نظر مناسب ہے۔

(۹) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْجُعْفِيُّ قَالَ ثَنَا أَبُو عَامِرٍ الْعَقَدِيُّ قَالَ ثَنَا سُلَيْمَانُ

بْنُ بِلَالٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ أَبِي صَالِحٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ
الْإِيمَانُ بِضْعٌ وَ سِتُونَ شُعْبَةً وَ الْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِنَ الْإِيمَانِ .

ترجمہ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کچھ اوپر ساٹھ شعبے ہیں اور حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔

تشریح حدیث حدیث شریف کے بیان کا مقصد مرجیہ کی تردید ہے جو اعمال کو ایمان سے بے تعلق بتلاتے ہیں، تردید اس طرح ہے کہ جس قدر اعمال حدیث شریف میں بعنوان شعبہ مذکور ہیں وہ سب ایمان سے متعلق ہیں، معنی یہ ہیں کہ جس طرح درخت کی رونق اس کی شاخوں پتوں اور پھلوں سے ہوتی ہے اسی طرح ایمان کی رونق اسکا ثمرہ ور ہونا ہے اور یہ اعمال کے تعلق پر موقوف ہے اور جب یہ تمام ثمرات اعمال کی وجہ سے ایمان سے متعلق ہوتے ہیں تو نتیجہ واضح ہے کہ بد عمل انسان کے ایمان میں ضرور نقصان ہوگا اور جس طرح درخت کی رونق پتے گر جانے، شاخیں سوکھ جانے اور پھول جھڑ جانے سے جاتی رہتی ہے، اسی طرح ایمان بھی اعمال سوء کے اختیار کرنے سے خطرہ میں آجاتا ہے، اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ بد عملی ایمان پر اثر انداز نہیں ہوتی اور یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ جس طرح اصل سے درخت کی یہ شاخیں نکلی ہیں اسی طرح ایمان کے باب میں اصل تصدیق ہے، اور باقی چیزیں اسکی فرع ہیں، اور جب تصدیق انسان کے دل میں مضبوط ہوتی ہے تو ایمان اعمال کی شکل میں تمام جوارح پر مسلط ہو جاتا ہے اور جب جوارح سے اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں تو دوسرے لوگ اس سے سبق حاصل کرتے ہیں، اسی لئے ارشاد فرمایا گیا ہے:

الم تر كيف ضرب الله مثلاً كلمة
طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت
وفرعها في السماء (پ ۱۳ع ۱۶)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی
کلمہ طیبہ کی کہ وہ مشابہ ہے، ایک پاکیزہ درخت کے جسکی
جڑیں خوب جمی ہوں اور شاخیں اونچائی میں جارہی ہوں۔

اس آیت سے احناف کا مسلک صاف طریقہ پر ثابت ہو رہا ہے کہ ایمان کے ساتھ اعمال فرع کی طرح
قائم ہیں، کلمہ جس قدر مضبوط ہوگا اسی قدر اسکی شاخیں بلند ہوں گی۔

اليه يصعد الكلم الطيب والعمل
الصالح يرفعه (پ ۲۲ع ۱۳)

اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے اور اچھا کام اسکو
پہنچاتا ہے

کلمہ کو نیچے سے اوپر اٹھانے کی طاقت اعمال صالحہ پیدا کرتے ہیں جس قدر عمل بڑھتے ہیں اسی قدر صعود
بڑھتا ہے، گویا احناف کے یہاں تعلق جزو کل کا نہیں، بلکہ تعلق فرع و اصل کا ہے، اور شواہد نے تعلق جزو کل کا رکھا
ہے یعنی جس طرح شاخیں درخت کا جز ہوتی ہیں اسی طرح اعمال صالحہ بھی ایمان کا جز ہیں۔

بضع وستون کا مطلب

بعض روایات میں بضع وستون کی جگہ بضع وسبعون ہے اور ایک
روایت میں اربع وستون ہے، اور بھی بعض روایات ہیں جن میں

ضعیف وقوی سب ہی شامل ہیں، امام بخاری کا مقصد بظاہر بیان تکثیر ہے تعداد نہیں ہے اور کبھی کبھی عدد کو تکثیر کے
لئے بھی لاتے ہیں اور یہاں بضع کا مبہم لفظ استعمال کرنا بھی اسی طرف مشیر ہے۔

اہل لغت نے بضع کے مختلف معانی بیان کئے ہیں کسی نے اسکا اطلاق تین اور نو کے درمیانی اعداد پر کیا
ہے اور کسی نے ایک سے دس تک، کسی نے کہا کہ اس کا اطلاق چار سے نو تک کے درمیانی اعداد پر کیا جاتا ہے، بہر
کیف معین نہیں بلکہ ابہام بدستور باقی ہے اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تکثیر مقصود ہے اور علامہ طیبی رحمہ اللہ کا
مختار بھی یہی ہے۔

بعض حضرات نے اسے تحدید پر حمل کیا ہے انہیں اس سلسلہ میں کئی دقتیں پیش آئی ہیں، پہلی بات تو یہ کہ
بعض احادیث میں ستون ہے اور بعض میں سبعون اس تعارض کے رفع کے لئے انکو کہنا پڑا کہ ہو سکتا ہے جب
پہلی بار فرمایا ہو تو ستون ہی ہو، لیکن جب دوبارہ فرمایا ہو تو شعبوں میں کچھ اضافہ ہو گیا ہو، یا یہ کہا جائے کہ جب دو
عدد ہیں تو زائد کو لیا جائے گا، کیونکہ زائد میں ناقص بھی شامل ہوتا ہے اور اقل میں اکثر کی نفی نہیں ہوتی۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ناقص کو لیا جائے گا کیونکہ یہ متیقن ہے، متیقن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ
سبعون کی روایت مسلم میں عبد اللہ بن دینار کے طریق سے ہے اسی طرح صحیح ابو عوانہ میں بھی یہ روایت موجود ہے
لیکن دونوں جگہ بہ طریق شک ہے سنن میں یہ روایت سبعون بلا شک آئی ہے اور مسلم میں شک اور بلا شک دونوں

طریق سے مذکور ہے اسی بنا پر بعض سبعون والی روایت کو زیادہ ثقہ قرار دیتے ہوئے ستون پر ترجیح دے رہے ہیں اور بعض ستون کو اس بنا پر ترجیح دے رہے ہیں کہ یہ عدد متیقن ہے اور سبعون مشکوک، پھر سبعون کہنے والے ایک بات پر قائم نہیں، علامہ عینی (یعنی جلد اول ص ۱۴۹) فرماتے ہیں کہ عدد کی تین قسمیں ہے: زائد، تام، ناقص، زائد عدد وہ ہے جسکے اجزاء کا مجموعہ اسکے کل سے بڑھ جائے، جیسے بارہ اسکے اجزاء ترکیبی نصف، ربع، ثلث، سدس، نصف السدس ہیں، ان کا مجموعہ ہوتا ہے سولہ، جو بارہ سے زائد ہے، ناقص کی مثال ہے چار، اس کے اجزاء دو ہیں، نصف اور ربع، ان کا مجموعہ تین ہوتا ہے جو چار سے کم ہے اور تام کی مثال ہے چھ، اس کے تین جز ہیں، نصف، سدس، ثلث، ان کا مجموعہ بھی چھ ہی ہوتا ہے، گویا عدد تام چھ ہو گیا اور جب مبالغہ کیا تو آحاد کو عشرات بنا دیا، اب چھ کے ساٹھ ہو گئے اور پھر ابہام و تکثیر کیلئے بضع کا اضافہ کر دیا گیا۔

اسی طرح علامہ عینی رحمہ اللہ نے سبعون کی بھی وجہ تحریر فرمائی ہے اور وہ یہ کہ سات کا عدد ایسا عدد ہے جس میں فرد، زوج، فرد اول، فرد مرکب، زوج اول، زوج مرکب، منطق اور اصم سبھی طرح کی تقسیمات چل سکتی ہیں، اس لئے سات کے عدد کو اختیار فرمایا اور مبالغہ کیلئے آحاد کو عشرات کر دیا گیا، ستر ہو گئے اور اب بضع کی زیادتی کا مفہوم چھ کو اصل ماننے کی صورت میں چھ اور سات کو اصل ماننے کی صورت میں سات ہو گا۔

نیز یہ کہ جن حضرات نے ان اعداد کو حصر کے لئے بتلایا ہے انہوں نے ایمان کے شعبوں کو گنایا بھی ہے، حدیث شریف میں ہے۔

افضلها قول لا اله الا الله وادناها امامطة
ان شعبوں میں سب سے اعلیٰ لا اله الا الله کہنا ہے
اور سب سے ادنیٰ راستہ سے تکلیف دہ چیز کا ہٹانا،
الا ذی عن الطریق (مسلم جلد ۱ ص ۴۷)

اس سے ادنیٰ اور اعلیٰ کی تعیین تو ہو گئی لیکن درمیان کے مراتب رہ گئے اس کے لئے علامہ عینی اور حافظ ابن حجر نے ابن حبان بستی کی کتاب وصف الایمان و شعبہ سے نقل کیا ہے کہ ابن حبان نے طاعات کو شمار کرنا شروع کیا تو ان کی تعداد حدیث کی بیان کردہ تعداد سے بہت بڑھ گئی، پھر احادیث پر اس اعتبار سے نظر ڈالی کہ صرف ان اعمال کو گنا جن پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے تو تعداد کم رہی، پھر قرآن کریم کے ان اعمال کو گنا جن پر ایمان کا اطلاق کیا گیا تو تعداد کم رہی، پھر قرآن کریم اور حدیث کے اعمال کو ملا دیا اور مکررات کو حذف کر دیا تو انکی تعداد کچھ اوپر ستر ہی نکلی۔

ابن حبان کی طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بساب امور الایمان کے تحت اس آیت کو پیش فرما کر اشارہ فرمایا ہے جس میں چند اعمال پر ایمان کا اطلاق کیا گیا ہے، پھر حدیث بھی اسی شان کی ہے اس سے معلوم

ہوا کہ امور ایمانیہ کے شمار کا اسلم طریقہ یہ ہے کہ پہلے قرآن کریم پر نظر ڈالی جائے کہ قرآن کریم نے کن امور کو مجملہ ایمان کہا ہے اسی طرح پیغمبر کی سنت کا تتبع کیا جائے اور بس انہیں امور کو امور ایمان کہا جائے جن کو قرآن کریم و سنت نے ایمان یا اسلام بتلایا ہے، علامہ کشمیریؒ بھی اسی طریق عمل کو اچھا شمار کرتے تھے۔

تشریح حدیث | حدیث شریف میں حیا کو ایمان کا ایک شعبہ قرار دیا گیا ہے اور جملہ الحیاء شعبہ من الایمان میں شعبہ کی تنوین تعظیم کے لئے ہے، حیا طبیعت کے انکسار و انفعال کا نام ہے جو کسی ایسے خیال یا فعل کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے جسے عرفاً یا شرعاً مذموم سمجھا جاتا ہو، ایسا کام نہ کرنا چاہئے کہ جس سے شرعاً سبکی ہو اسی کا نام حیا شرعی ہے، جو انسان کو خدا کی اطاعت اور حقوق کی ادائیگی پر آمادہ کرتی ہے، برے کاموں سے روکتی ہے اسی لئے کہتے ہیں۔

حیاء خیر ہی خیر ہے

الحیاء خیر کله

اور الحیاء خیر لایاتی الابخیر حیاء صرف خیر کی چیز ہے جو خیر ہی کو لاتی ہے

یہ حیاء دراصل فطری شے ہے اور ایمان کا سرچشمہ ہے جو اخلاق حسنہ ایمان کیلئے مبادی کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں حیاء بھی ہے، جب انسان اپنے وجود اور اپنی صفات کمال پر غور کرتا ہے جن پر انسان کی حیات کا دار و مدار ہے اور جن پر انسانی زندگی گھومتی ہے تو انسان کو خدا پر ایمان لانا پڑتا ہے۔

ان احساناتِ عمیمہ، ظاہری و باطنی کا کوئی شمار نہیں جو خداوند قدوس نے انسان پر فرمائے ہیں اگر انسان ان انعامات کے عرفان و ایقان کے باوصف بھی اللہ کی ذات پر ایمان نہیں لاتا تو یہ اسکی سب سے بڑی بے حیائی ہے، گویا ان احساناتِ عمیمہ پر ایمان لانا بھی حیاء کا نتیجہ ہے یعنی حیاء پہلے ایمان کا مبداء بنتی ہے اور ایمان لانے کے بعد پھر اسے تقویت پہنچاتی ہے کیونکہ انعامات کا پیہم شکر یہ ادا کرنا بھی حیاء ہی کا نتیجہ ہے اس بنا پر الحیاء شعبہ عظیمہ کہنا درست ہے۔

[۴] بَابُ الْمُسْلِمِ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ

(۱۰) حَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِي إِيَاسٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي السَّفَرِ وَإِسْمَاعِيلَ عَنِ الشَّعْبِيِّ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ الْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَقَالَ أَبُو مَعَاوِيَةَ حَدَّثَنَا دَاوُدُ عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو عَنِ النَّبِيِّ ﷺ وَقَالَ عَبْدُ الْأَعْلَى عَنْ دَاوُدَ عَنْ عَامِرٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ . (آئندہ: ۶۲۸۴)

ترجمہ | باب، مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، حضرت عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مہاجر وہ ہے جس نے ان کاموں کو چھوڑ دیا جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، ابو عبد اللہ نے کہا اور ابو معاویہ نے کہا کہ داؤد نے عامر شععی سے حدیث بیان کی اور عامر نے کہا کہ میں نے عبد اللہ بن عمرو سے رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد سنا اور عبد الاعلیٰ نے رسول اکرم ﷺ کا یہ ارشاد سنا داؤد عن عامر عن عبد اللہ بیان کیا۔

اب ان امور ایمانیہ میں امام بخاریؒ مختلف قسم کے ابواب پیش فرما رہے ہیں الفاظ ترجمہ میں امام کا تفنن اور پیش فرمانے کا طریقہ بھی عجیب و غریب ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، ایسا نہیں فرماتے کہ فرائض کے درجہ کے اعمال کو ابتداء میں بیان فرمادیں اور پھر درجہ بہ درجہ تنزل کے ساتھ دوسرے اعمال کا ذکر کریں، اسی طرح ان اعمال کو کبھی من الاسلام اور کبھی من الایمان فرماتے ہیں، نیز یہ کہ خبر کو کہیں مقدم ذکر کرتے ہیں اور کہیں موخر۔

ان تمام چیزوں کو محض اتفاقی بھی کہا جاسکتا ہے اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ امام کا تفنن ہے کیونکہ ایک ہی تعبیر کے تکرار سے سامعہ اکتا جاتا ہے اور جب تعبیرات بدلتی رہتی ہیں تو طبیعت کا نشاط بڑھتا رہتا ہے، اسلئے اس تعبیر کے فرق کو تفنن پر حمل کرنا بہتر ہے پھر صرف تفنن ہی پر بس نہیں بلکہ ہر موقع پر اسکے لئے مناسب وجہ بھی تلاش کی جاسکتی ہے۔ یہاں ترجمہ کے الفاظ ہیں

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، یہ الفاظ امام رحمہ اللہ کی ذیل میں تخریج کردہ حدیث کا جز ہیں اور چونکہ پیغمبر علیہ السلام نے اس صفت کے ساتھ المسلم کا لفظ استعمال کیا ہے اسلئے امام بخاریؒ نے بھی یہی عنوان اختیار فرمایا، اس طرح الفاظ حدیث کا اتباع ہو جاتا ہے کہ جہاں حدیث میں اسلام کا لفظ ہے وہاں لفظ اسلام، اور جہاں لفظ ایمان ہے وہاں لفظ ایمان استعمال کیا جائے۔

عام طور پر اہل علم اس کے معنی یہ بیان کرتے ہیں کہ پورا مسلمان وہی ہے جسکے زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں گویا المسلم کی تقدیر المسلم الکامل نکلی، لیکن علامہ کشمیریؒ اس توجیہ کو اچھا نہ سمجھتے تھے کہ اس طرح بات ہلکی پڑ جاتی ہے، بلکہ اصول بلاغت میں یہ مسلم ہے کہ جب کسی چیز کو اونچا دکھلانا چاہتے ہیں تو اس پر جنس کا اطلاق اس طرح کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ جنس اسی فرد میں منحصر ہے، اب معنی یہ نکلے کہ مسلمان کہلانے کا حق اسی کو ہے جس کے ہاتھ اور زبان مسلمانوں کی ایذاء میں استعمال نہ ہوں، گویا اطلاق میں مسلم کا لفظ اسی صفت کے ساتھ متصف انسان پر خاص کر دیا گیا، اس لئے وہ لوگ جو اس صفت کے ساتھ متصف نہیں ہیں اس شریف

لقب کے مستحق نہیں، قاعدہ ہے کہ فرد اکمل کے مقابلہ پر فرد ناقص کو معدوم قرار دیا جاتا ہے جیسے، الرجل زید، زید ہی صحیح معنی میں رجل ہے یعنی زید میں رجل کی صفات اس درجہ میں موجود ہیں کہ اس کے مقابل دوسرے کو رجل کہنا ہی درست نہیں۔

عرب کہتے ہیں السمال الابل کیونکہ ان کے نزدیک ابل ہی اکرم الاموال ہے یا جیسے الکرم فی العرب یعنی صفت کرم میں عرب کو خاص امتیاز حاصل ہے، اسی طرح مسلم بھی یہاں اسی شخص کو کہیں گے جو اس صفت سے متصف ہو۔

تشریح حدیث | پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سلسلے میں جس قدر تراجم ہوں گے ان کا بیشتر رخ مرجیہ کی تردید کی طرف ہوگا، کیونکہ انہوں نے ایمان میں نہ معصیت کو مضر سمجھا نہ اطاعت کو ضروری، اسلئے ہر وہ چیز جس کی مسلمان کو ضرورت ہو یا ہر وہ عمل جس سے ایمان میں کمزوری آئے اس کو مرجیہ کی تردید کے سلسلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

حدیث شریف کا مقصد یہ ہے کہ جب تم مسلمان ہو تو تمہارے اندر اسلام کی کوئی شان تو نمایاں ہونی چاہئے، کم از کم مسلمان ہونے کی حیثیت سے سلامت روی اور سلامت جوئی تو ہونی ہی چاہئے جو لفظ اسلام کا ماخذ اشتقاق ہے اور اگر یہ بھی نہیں ہے تو پھر اسلام ہی کیا کیونکہ اسلام کا ماخذ سلم ہے اور اسکے معنی صلح جوئی، خیر خواہی اور مصالحت کے ہیں پھر جس شخص میں اذعاء اسلام کے باوصف یہ شان موجود نہ ہو اسے یہ دعویٰ زیب نہیں دیتا۔ اور اگر صلح کل نہیں ہے تو کم از کم ان لوگوں سے تو خیر خواہی اور خیر اندیشی کا علاقہ ہو جن کے ساتھ رشتہ اخوت اسلام قائم ہے اور اگر یہ بھی نہیں ہے تو اسلام کا لقب تمہارے لئے ننگ و عار ہے جب اشتقاقی معنی بھی موجود نہیں ہیں تو پھر آگے کیا امید ہو سکتی ہے۔

من سلم المسلمون کی قید سے یہ معنی نکالنا درست نہیں کہ غیر مسلم سے رواداری جائز نہیں بلکہ مسلمان سب کا خیر اندیش ہوتا ہے وہ لب یا خاندانی برادری کو تلاش نہیں کرتا، اگر کسی کے ساتھ مذہبی یا نسبی رشتہ نہیں ہے تو انسانی علاقہ ان مراعات کے لئے کافی ہے، ایک دوسری روایت میں من امنہ الناس (جس سے سب لوگ محفوظ رہیں) کے الفاظ آتے ہیں۔

غرض اسلام ہی کا تقاضا ہے کہ بلا وجہ کسی غیر مسلم پر دست درازی نہ کریں، کافر ذمی تو المسلمون ہی میں آگیا کیونکہ ارشاد فرمایا گیا۔

دماء ہم کد مائنا
انگی جانیں ہماری جانوں کی طرح ہیں،

رہا کفار کا معاملہ تو حرب و ضرب کے موقع پر تو کسی قسم کا خیال مقصد کے خلاف ہے اس لئے وہاں تو ضرر

رسانی کی تا بمقدور کوشش ہوگی اور اگر کافر حربی سے صلح ہے تو وہاں بھی اس کی اجازت نہ ہوگی اس سلسلہ میں ہمارے سامنے پیغمبر علیہ السلام کا عمل ہے لیکن اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو کم از کم مسلمانوں کے ساتھ تو خیر خواہی کا تعلق ہونا چاہئے۔

اس موقع پر یہ شبہ بھی درست نہیں ہے کہ صرف دوسروں کے لئے خیر اندیش ہونا مسلمان ہونے کیلئے کافی ہے اور اس صفت کے بعد دوسرے اسلامی شعار کا ہونا ضروری نہیں یعنی نہ نماز کا ہونا ضروری ہے اور نہ دوسرے ہی فرائض کی ضرورت ہے، درست اسلئے نہیں کہ اس حدیث میں تو صرف لفظ مسلم کی لاج بیان کی گئی ہے کہ اگر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو تو تمہیں اس لقب کا پاس و لحاظ رکھنا چاہئے گویا اسلامی احکام قبول کرنے کے بعد اس کے ساتھ ایک اور نشان بتلایا گیا ہے یہ اسی طرح ہے جیسے شریعت میں منافق کی پہچان بتلائی گئی ہے۔

اذا حدث کذب و اذا عاهد غدر

جب بات کرے جھوٹ بولے اور جب وعدہ

کرے تو وعدہ خلافی کرے۔

(بخاری، باب علامۃ المنافق ص ۱۰)

مسلم کی یہ پہچان اسلئے بتلائی گئی کہ جاہلیت میں کوئی شخص کسی کی طرف سے مطمئن نہ ہوتا تھا جب ایک دوسرے کا سامنا ہوتا تو خدشہ ہوتا کہ دیکھتے کیا ہوتا ہے اسی لئے باقاعدہ حلف لئے جاتے تھے دشمنی عام تھی جس کا اثر قتل نفس، ہتک محارم اور اموال کی چوری کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا، اسلام نے اس مسموم فضا میں سانس لینے کے لئے السلام علیکم کا خطاب عام کیا جس کا مطلب ہے کہ میں آپ کے حق میں خیر اندیش اور طالب امن ہوں، اور پھر دوسرے انسان پر اس کا جواب بھی و علیکم السلام کی صورت میں واجب قرار دیا یعنی میں بھی آپ کے لئے طالب امن ہوں، اور اسی بنا پر یہ پہچان بھی مقرر کر دی کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔

اس پہچان کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ مسلمان وہ ہے جسے لوگوں کا اسلام اس پر آمادہ نہ کرے کہ وہ دست زنی یا زبان درازی کرے، اب اگر کوئی مسلمان کسی انسان کے متعلق کسی دوسری حیثیت سے کوئی بات کہتا ہے یا کسی اور مقصد سے دست اندازی کرتا ہے تو وہ اس حکم میں داخل نہیں ہے اسلئے کہ اس کا منشاء غضب اس وقت اسلام نہیں ہے مثلاً ہم کسی کو فاسد العقیدہ جانتے ہیں اور یہ کہ اسکی تعلیم اور صحبت درست نہیں ہے، پاس بیٹھنے والوں پر اس کے اثرات خراب پڑتے ہیں اور لوگ اس کے گرویدہ بھی ہیں، اب اگر ہم اپنے لوگوں کو سنبھالنے اور اسکی غلط صحبت سے بچانے کے لئے اسکے معائب اور اسکی مضر صحبت کا تذکرہ کریں عملی گندگی ظاہر کریں تو اسکو غیبت اور زبان درازی نہیں کہیں گے۔

اسی طرح کسی مقصد حسن کے پیش نظر اگر کسی مسلم کو سزا دی جائے مثلاً کوڑے لگائے جائیں یا رجم کیا جائے تو اگرچہ بظاہر یہ ایلام ہے لیکن مقصد ایلام نہیں ہے بلکہ فساد فی الارض اور فواحش کا انسداد منظور ہے، اس لئے اسکو

ممنوع نہیں قرار دیا جائے گا۔

زبان اور ہاتھ کی تخصیص کی وجہ

حدیث شریف میں ایذا رسانی کے سلسلہ میں دو چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے

ایک لسان اور ایک ہد کیونکہ ایذا کا تعلق اکثر انہیں دو سے ہوتا ہے ورنہ

اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیر کے ذریعہ ایذا رسانی میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ مطلق ایذا رسانی جرم ہے، پھر ان دونوں میں بھی ہد سے لسان کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ ضرر کا تعلق ہد کا مقابلہ پر زبان سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اول تو اس میں کچھ کرنا نہیں پڑتا صرف زبان ہلانی پڑتی ہے اور ضرر زیادہ پہنچ جاتا ہے، صرف ایک ہی کلمہ کے ذریعہ پورے عالم کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے اور ہاتھ سے صرف اسی شخص کو نقصان پہنچایا جاسکتا ہے جو حاضر ہو اور زبان کے ذریعہ حاضر غائب گذشتہ اور آئندہ سب ہی کو ضرر پہنچایا جاسکتا ہے۔

نیز یہ کہ لسان کا لفظ قول سے بھی عام ہے اس میں سب و شتم، غیبت اور بہتان طرازی کے ساتھ منہ چڑانا بھی داخل ہے، جبکہ قول صرف زبان ہی کے کلمات کو شامل ہے، اسی طرح اور دوسرے اعضاء بدن کو چھوڑ کر ہد کا ذکر فرمایا اسلئے کہ یہ لفظ مطلق قوت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور اس اعتبار سے یہ ہر جا بر قوت کو شامل ہے۔

دوسرا جملہ ہے المهاجر من ہجر ما نہی اللہ عنہ ما جر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے، مطلب یہ ہے کہ ہجرت صرف ترک وطن کا نام نہیں ہے یا یہ کہ ترک وطن اپنے اندر ذاتی خوبی نہیں رکھتا، بلکہ ترک وطن اسلئے ہے کہ ہم اس کے بغیر خداوند قدوس کے احکام کی پابندی نہیں کر سکتے اور جس وطن میں احکام الہی کی تعمیل نہ ہو سکے اسے خیر باد کہنا ہی بہتر ہے۔

گویا ہجرت کی دو قسمیں ہیں ظاہری، باطنی، ظاہری ہجرت ترک وطن ہے اور حقیقی ہجرت منہیات سے احتراز ہے اور اگر تارک وطن بھی منہیات کو نہ چھوڑے تو یہ بہت بری بات ہے بایں معنی اس جملہ میں مهاجر کو تنبیہ بھی ہو سکتی ہے کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ ہجرت کے بعد کسی عمل خیر کی ضرورت نہیں کیونکہ قرآن کریم میں مهاجرین کی مدح و ستائش کی گئی ہے۔

اسکا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد ہجرت منسوخ ہو گئی اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

لا ہجرة بعد الفتح ولكن جهاد و
نية (بخاری کتاب الجہاد ص ۲۹۰)

فتح مکہ کے بعد ہجرت نہیں ہے لیکن جہاد اور
نیت باقی ہے۔

اور پھر اس کے بعد متاخر الاسلام مسلمانوں کو افسوس ہوا کہ ہم پہلے کیوں نہ مسلمان ہوئے، یہ فضیلت بھی حاصل ہو جاتی تو اسکی تلافی کے لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے
جن سے اللہ نے منع کیا ہے۔

المہاجر من ہجر ما نہی اللہ
عنه (ابوداؤد ص ۳۲۳)

بایں معنی یہ تسلی ہے کہ اصل مہاجر وہ ہے جو گناہوں کو چھوڑ دے، اصل ہجرت شیطان کے مقابل ہے، ایک شخص نے ہجرت کے بارے میں آپ سے دریافت کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

و یحک ان شان الہجرة شدید
تیرا بھلا ہو ہجرت کا معاملہ نہایت اہم ہے،

یہ خیال نہ کرو کہ میں ہجرت ہی کروں بلکہ جہاں بھی رہو عمل خیر کرتے رہو، سات سمندر پار رہو اور نیک اعمال کرو تو وہی اجر ملے گا، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

فاعمل من وراء البحار فان اللہ
لن یتروک من عملک شیئاً

پس تم سمندر کے اس پار بھی عمل کرو تو اللہ
تمہارے کسی عمل کو ضائع نہ کرے گا

لن یتروک من عملک شیئاً

غرض ہجرت مقصود اصلی نہیں ہے بلکہ مقصد خداوند قدوس کی اطاعت ہے، اگر انسان اپنی جگہ رہتے ہوئے اطاعت نہ کر سکے تو اس پر ایسی جگہ جانا لازم ہو جاتا ہے جہاں اطاعت خداوندی بجالا سکے گویا انسان اگر اپنی جگہ رہ کر بھی منہیات سے بچ سکے تو اس کو ہجرت کا مقصد حاصل ہے اگرچہ ہجرت نہیں کی۔

تعلیق کا مقصد یہاں امام بخاری نے دو تعلیقات ذکر فرمائی ہیں، پہلی تعلیق کے دو مقصد ہیں ایک مقصد تو یہ ہے کہ عامر اور شععی دونوں ایک ہی راوی سے عبارت ہیں عامر نام ہے اور شععی لقب ہے،

روایت کے اختلاف سے بادی النظر میں یہ شبہ ہوتا تھا کہ روایت دو شخصوں سے منقول ہے ایک عامر سے اور دوسرے شععی سے امام بخاری نے داؤد بن ابی ہند کے طریق سے یہ واضح کر دیا کہ عامر وہی شخص ہیں جو پہلی روایت میں آچکے ہیں۔

دوسرا مقصد یہ ہے کہ ابن مندہ کی روایت سے معلوم ہوتا تھا کہ شععی نے براہ راست عبد اللہ بن عمرو بن العاص سے نہیں سنا، کیونکہ انہوں نے درمیان میں ایک رجل مبہم کا واسطہ ذکر کیا ہے بخاری کی روایت سے بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شععی نے حضرت عبد اللہ بن عمرو سے براہ راست سنا ہے کیونکہ حرف عن استعمال کیا گیا ہے جو اتصال اور انقطاع کیلئے مستعمل ہو سکتا ہے اسلئے ابو معاویہ کے طریق سے اس شبہ کا ازالہ کر دیا گیا کیونکہ ہمیں سمعت کی تصریح موجود ہے۔

دوسری تعلیق کا مقصد یہ ہے کہ عبد الاعلیٰ کے اس طریق میں جس میں عبد اللہ کو غیر منسوب ذکر کیا ہے اس سے بھی عبد اللہ بن عمرو بن العاص ہی مراد ہیں اس وضاحت کی ضرورت اسلئے پڑی کہ طبقہ صحابہ میں جب عبد اللہ مطلق ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد حضرت عبد اللہ بن مسعود ہوتے ہیں جس طرح طبقہ تابعین میں مطلق عبد اللہ

سے حضرت عبداللہ بن مبارک ہوتے ہیں، امام بخاری نے اس پر تنبیہ فرمانے کے لئے اس دوسری تعلق کا ذکر کیا ہے۔

[۵] بَابُ أَيِّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ

(۱۱) حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ يَحْيَى بْنِ سَعِيدِ الْأَمْوِيِّ الْقُرَشِيُّ قَالَ ثَنَا أَبِي قَالَ ثَنَا أَبُو بُرْدَةَ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي بُرْدَةَ عَنْ أَبِي بُرْدَةَ عَنْ أَبِي مُوسَى قَالَ قَالُوا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَيُّ الْإِسْلَامِ أَفْضَلُ قَالَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ.

ترجمہ | باب، کونسا اسلام افضل ہے۔ حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا: یا رسول اللہ! کونسا اسلام افضل ہے، آپ نے فرمایا جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں۔
تشریح | حدیث شریف کے الفاظ ہیں المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده جسکا ترجمہ یہ ہے کہ مسلمان وہی سمجھا جائے گا جسکی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں، اسکا مفہوم یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی کے ہاتھ سے مسلمان محفوظ نہیں ہیں تو وہ مسلمان نہیں ہے، اس شبہ کے رفع کے لئے امام بخاری نے یہ دوسرا باب منعقد فرمایا کہ اسلام کے اندر درجات ہیں اور یہ درجات ایک دوسرے سے افضل و مفضل کا علاقہ رکھتے ہیں، اسلئے وہ مسلم جو تمام اسلامی چیزوں کے ساتھ اس نشان کا بھی حامل ہوا افضل ہے۔

اور چونکہ مصنف کے نزدیک اسلام اور ایمان ایک ہی ہیں اسلئے جب اسلام میں افضل و مفضل مراتب قائم ہوں گے تو ایمان میں بھی ان درجات کا ثبوت ہو جائے گا اور امام کا مقصد بھی یہی ہے کہ مرجیہ کی تردید کے لئے ایمان میں اعمال کی تاثیر کا اثبات کیا جائے۔

یہاں ای کی اضافت اسلام کی طرف ہو رہی ہے جو مفرد ہے، حالانکہ ای کی اضافت مفرد کی طرف درست نہیں اسلئے شرح نے تقدیر نکالی ہے ای ذوی الاسلام افضل اور اس تقدیر کیلئے قرینہ یہ ہے کہ جواب میں بھی صاحب اسلام کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کی تائید دوسری روایت کے الفاظ ای المسلمین افضل سے ہو رہی ہے، اسی گزارش سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن شرح نے تقدیر ای خصال الاسلام افضل نکالی ہے وہ درست نہیں۔ کیونکہ جواب میں وصف کا ذکر نہیں موصوف کا ہے۔

اس اعتراض کا جواب کہ سوال میں صفت کا ذکر ہے اور جواب میں موصوف کا، کرمانی نے یہ دیا ہے کہ جواب کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ ساتھ ہی علت بھی مذکور ہو جائے جیسے

پسئلونک ماذا ینفقون (پ ۱۰ ع ۱۰) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کیا کریں
کا جواب:

قل ما انفقتم من خیر فلیلو الدین

آپ فرمادیتے تھے کہ جو کچھ مال تم کو صرف کرنا ہو

والاقربین (پ ۱۰ ع ۱۰)

سواں باپ کا حق ہے اور قرابت داروں کا۔

سے دیا گیا ہے، اسی طرح یہاں جواب میں خصلت کے ساتھ صاحب خصلت کا بھی ذکر ہے یعنی سلامتی اسلام کے
خصال میں سب سے افضل ہے اور اس کی وجہ سے صاحب خصلت بھی افضل ہو جاتا ہے لیکن سوال و جواب میں بغیر
کسی تاویل کے مطابقت کیلئے ای ذوی الاسلام افضل کی تقدیر سب سے افضل ہے۔

[۶] بَابُ إِطْعَامِ الطَّعَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ

(۱۲) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ حَدَّثَنَا أَلَيْثُ عَنْ يَزِيدَ عَنْ أَبِي الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ

عَمْرٍو وَرَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمَا أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ فَقَالَ تُطْعِمُ الطَّعَامَ

(آئندہ: ۶۲۳۶، ۲۸)

وَتَقْرَأُ السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ.

ترجمہ | باب، کھانا کھلانا اسلام میں داخل ہے، حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ کسی شخص نے رسول
اکرم ﷺ سے سوال کیا، کونسا اسلام خیر ہے؟ آپ نے فرمایا کہ تم کھانا کھلاؤ اور سب کو سلام کرو، عام
اس سے کہ تم اسے پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو۔

تشریح | ترجمہ کے مطابق عمل مقدم ہے اور من الاسلام موخر، بہ ظاہر تو تفنن عبارت ہے لیکن حقیقت الفاظ ہی سے
واضح ہے، اوپر ذکر تھا کہ مسلمان کی شان یہ ہے کہ سب کا خیر اندیش ہو اور یہ کہ کسی کو اس سے نقصان نہ
پہنچے، اب یہاں ایصال نفع کا ذکر ہے پہلے زبان اور ہاتھ کے ضرر کا ذکر تھا اور یہاں ان دونوں اعضاء سے نفع رسائی
کا ذکر ہے اطعام الطعام یہ کا فعل ہے اور قراءۃ السلام لسان کا۔

ایک مسلمان کی شان یہی ہونی چاہئے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کی حاجت سے، الیٰ اور خیر خواہی کیلئے اپنے
آپ کو وقف کر دے، یہاں صیغہ مضارع تطعم کے استعمال میں اسی طرف اشارہ ہے کہ اس فعل کی عادت ہونی
چاہئے جو بھی حاجت مند ہو اسے کھانا کھلاؤ، اسی تعیم کے لئے مفعول بہ کو حذف کر دیا گیا ہے، نیز یہ کہ اس میں یہ بھی
مذکور نہیں ہے کہ پیٹ بھر کر کھلائے یا اعلیٰ درجہ کا کھلائے بلکہ جس قدر بھی وسعت ہو اور جتنی بھی توفیق ہو جائے،
عرب کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ مہمان کی حیثیت کا جائزہ لے کر میزبانی کیا کرتے تھے تطعم الطعام کے الفاظ
ایسے ہیں جو کھلانے پلانے اور چکھانے وغیرہ سب پر صادق آسکتے ہیں، اگر کچھ بھی میسر نہیں ہے تو پانی پلا دو، قرآن

کریم میں اس لفظ کو پانی کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔

ومن لم يطعمه فانه مني الامن

اغترف غرفة بیده (پ ۲ ع ۱۷)

اور جو اس کو زبان پر بھی نہ رکھے وہ میرے
ساتھیوں میں ہے مگر یہ کہ ایک آدھ چلو پئے۔

یہاں پانی ہی سے روکنا مقصود تھا کہ یہ لفظ بہت ہی جامع ہے، نیز یہ کہ حدیث میں نہ قریب و بعید کی کوئی
قید ہے اور نہ اپنے اور پرانے کی کوئی تخصیص ہے بلکہ، کل من الضاف الی بیتک فهو ضیفک جو بھی تمہارے
گھر چلا آئے وہ تمہارا مہمان ہے۔

حضرت عائشہؓ کا عمل تھا کہ اگر سائل، سائل کی شکل میں ہوتا تو اسے کچھ دے دیتیں اور اگر وہ مہمان کی
شکل میں ہوتا تو اسے بٹھا کر کھانا کھلاتی تھیں۔

دوسری بات زبان سے نفع رسائی کی ہے، اس کے لئے تقرراً السلام فرمایا کہ زبان سے سب و شتم کی
اجازت نہیں ہے یہاں بھی تسلم نہیں فرمایا کیونکہ اس سے سلام کا طریقہ نہیں معلوم ہوتا اور اس تعبیر سے معلوم
ہو رہا ہے کہ اسلام کا طریقہ لفظ سلام ہے جس سے پہلی ہی ملاقات میں دوسرے کو مطمئن کیا جاسکتا ہے نیز تسلم
میں دوسری کمی یہ ہے کہ اس سے سلام علی وجہ الکتابت کی رہنمائی نہیں ہوتی، اسلام کے اس عمل کی
خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تعارف کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ جو بھی بلے اسی کو سلام کرو، سلام کا معرفت کے ساتھ
خاص ہونا قیامت کی علامت بتلایا گیا ہے۔

الفاظ حدیث پر ایک اصولی اشکال اور اس کا حل | اس موقع پر ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ احادیث
شریفہ میں مختلف چیزوں سے سوالات وارد ہوئے

ہیں کہیں ای الاسلام افضل ہے کہیں ای الاسلام خیر، اور کہیں احب کالفظ استعمال کر رہے ہیں اور ان کے
جواب میں بھی مختلف چیزیں وارد ہوئی ہیں ان چیزوں میں بھی تقدم و تاخر کے سلسلہ میں اختلاف ہے جس چیز کو ایک
جگہ مقدم ذکر کیا گیا ہے وہ دوسری جگہ موخر کر دی گئی، ایک ہی عمل کہیں سوال کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے اور کہیں
اس عمل کو بغیر ہی سوال کے ابتداءً ذکر کر دیا گیا ہے، یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر ایک عمل افضل ہے تو ہر جگہ اسی کا ذکر ہونا
چاہئے، یہ بہ ظاہر درست نہیں معلوم ہوتا کہ ایک ہی عمل کو کہیں افضل قرار دیں اور دوسرے موقع پر اس عمل کو مفضول
کہہ دیں اور اس کے بجائے کسی اور عمل کو افضل بتلائیں۔

اس اشکال کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ جوابات کا یہ اختلاف سوال کرنے
والوں کے حالات کے اختلاف کا نتیجہ ہے کیونکہ سائل کی حالت دیکھ کر جواب دیا گیا ہے مثلاً ایک شخص نے سوال کیا
کو نسا عمل بہتر ہے اور اسکی یہ حالت ہے کہ نماز کا پابند ہے روزے رکھتا ہے اور دوسرے تمام اعمال پر سختی سے کار بند

ہے لیکن طبیعت میں ذرا بخل ہے تو اس شخص کو ایک ایسا عمل بتلایا جائیگا جو اس کی کا علاج کر سکے مثلاً کھانا کھلانا، ایک اور شخص ہے جو مہمان نواز ہے رحم دل ہے لیکن نماز کے معاملہ میں کوتاہ ہے تو کہا جائے گا۔

نماز کا وقت پر ادا کرنا،

الصلوة لوقتہا

پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام روحانی معلم ہیں جس عمل کی کمی دیکھتے ہیں اسکی ترغیب دلاتے ہیں!

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو ابیات کا یہ اختلاف زمانہ کے اختلاف سے پیدا ہوا ہے، مثلاً ہجرت کے بعد کسی نے سوال کیا کہ کونسا عمل بہتر ہے تو فرمائیں گے مہاجرین کی خدمت، دوسرے وقت جہاد کا موقع ہے تو اس وقت سب سے بہتر عمل جہاد کو بتلایا جائے گا۔

تیسرا جواب امام طحاویؒ نے ارشاد فرمایا ہے کہ کسی ایک روایت کے پیش نظر یہ فیصلہ نہ کیا جائے کہ اس عمل کو دیگر تمام اعمال پر کلی فضیلت حاصل ہے اسی طرح مفضول اعمال کا معاملہ ہے کہ انہیں بھی کلی طور پر مفضول نہ سمجھا جائے بلکہ نسب یہ ہے کہ تمام روایات پر نظر کی جائے اور ان میں جن جن اعمال کو افضل قرار دیا گیا ہے ان سب کو ایک ہی فہرست میں لے آیا جائے، اسی طرح دوسرے اور تیسرے نمبر کے تمام اعمال کو ایک نوع کی صورت دیدی جائے، اسی طرح افضل اور مفضول اعمال ایک فرد میں منحصر نہ ہوں گے بلکہ ان کی ایک نوع ہو جائیگی اور کہا جائیگا من افضل الاعمال هذا ومن افضل الاعمال هذا گو اس کے باوجود بھی نوع کے افراد میں مراتب تسلیم کرنے ہوں گے کہ نوع اول ہی میں یہ عمل دوسرے فلاں عمل سے افضل ہے۔

اس موقع پر ایک طالب علم نے سوال کیا حضرت! پیغمبر علیہ السلام کے تمام ارشادات پوری امت کے لئے اصول زندگی کا حکم رکھتے ہیں اسلئے اس بارگاہ میں کسی انفرادی حیثیت یا کسی خاص شخص کے احوال کی رعایت کا سوال درست نہیں معلوم ہوتا اور بالخصوص جبکہ سوال مجمع میں ہو تو ایسی صورت میں انفرادی حیثیت کے بجائے اجتماعیت کا زیادہ اہتمام ہونا چاہئے؟

حضرت الاستاذؒ نے ارشاد فرمایا کہ درست ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ جس مجمع میں سوال ہو رہا ہے اس پورے مجمع میں اس عمل کی کوتاہی ہو مثلاً

جس مجمع میں

مسلمان وہ ہے کہ جس کے زبان اور ہاتھ

المسلم من سلم المسلمون من

سے مسلمان محفوظ رہیں۔

لسانہ ویدہ

فرمایا ہے وہ پورا مجمع باہمی اختلاف رکھتا ہو اور ان لوگوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور پشت پناہ بنانے کی ضرورت ہو، اگر یہ صورت درست ہو سکتی ہے تو اس میں اجتماعیت کی پوری رعایت موجود ہے اور یہ بھی کہ پیغمبر علیہ السلام کے ان ارشادات ہی سے ایک اصول زندگی یہ نکل رہا ہے کہ اگر تمہیں خداوند قدوس اصلاح عوام کی توفیق دے تو ہر شخص کے لئے ایک ہی عمل تجویز نہ کرو بلکہ ایسا عمل بتلاؤ جس کی اس شخص میں کمی ہو، کیونکہ ہر مریض کے لئے ایک ہی نسخہ کارگر نہیں ہوتا، جب ان ارشادات سے ایک اصول زندگی نکل رہا ہے تو یہ کہنا کہ ان میں صرف انفرادیت کی شان ہے درست نہیں۔

لیکن اس جواب پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ جب نوع اول کی فہرست کے تمام اعمال افضل کہلائے تو اب یہ ممکن نہیں ہے کہ یہی اعمال نوع دوم میں بھی مذکور ہوں یا اسی طرح جو اعمال نوع دوم میں آگئے ہیں اب ان کا شمار بھی نوع اول میں نہیں کیا جاسکتا حالانکہ ہم ایسا دیکھ رہے ہیں کہیں جہاد کو نوع اول میں رکھا گیا ہے کہیں اس کا ذکر نوع دوم میں کیا گیا ہے اور کہیں اسکو تیسرا درجہ دیا گیا ہے۔

اس اشکال کے بعد بظاہر امام طحاویؒ کا جواب کمزور ہو جاتا ہے لیکن امام طحاویؒ کی جلالت شان کے پیش نظر ہم اس میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یعنی ایک ایسی نوع کا اضافہ کر دیا جائے جو ذہن چھتین ہو اس نوع میں ان اعمال کو داخل کیا جائے جو اپنے اندر مختلف حیثیت رکھتے ہیں کبھی ان کا شمار نوع اول میں ہوگا اور کبھی نوع ثانی و ثالث میں۔ اب ایک فہرست ان اعمال کی ہوگی جو صرف نوع اول میں رکھے جائیں گے، دوسری فہرست میں صرف نوع ثانی کے افراد ہوں گے اور ایک تیسری فہرست میں اس طرح کے افراد ہوں گے جو ایک حیثیت سے نوع اول کے اور دوسری حیثیت سے نوع ثانی کے افراد ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کلی طور پر فضیلت مجموعہ شریعت کو حاصل ہے، اب جو فضیلت ایک فرد کو دوسرے فرد کے مقابل ہے وہ صرف جزئی ہے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ جوابات کا یہ اختلاف سوالات کے اختلاف کی وجہ سے ہے کہیں ای الاسلام افضل کہا گیا ہے کہیں ای الاسلام خیر کہا گیا ہے اور کہیں ای الاسلام احب کے الفاظ ہیں ان تمام الفاظ میں باہم اختلاف ہے جس کی وجہ سے جواب میں اختلاف ہو گیا ان الفاظ کے معانی میں اختلاف کے لئے ہمیں ذرا تفصیل کی ضرورت ہوگی ہمیں دیکھنا چاہئے کہ اس سلسلہ میں حدیث شریف اور ارشادات نبوی سے کچھ روشنی ملتی ہے یا نہیں۔

فضیلت اعمال کے سلسلے میں جامع اصول | فضیلت اعمال کے سلسلے میں ہمارے لئے شریعت نے جامع اصول بیان کیا ہے ارشاد نبوی ہے:

افضل الاعمال احمزھا
اجرکم علی قدر نصبکم
او
سب سے افضل وہ عمل ہے جس میں دشواری ہو۔
تمہارا اجر تمہاری مشقتوں کے اعتبار سے ہے۔

ان ارشادات کی روشنی میں ہم اعمال کی فضیلت معلوم کر سکتے ہیں بعض اعمال ایسے ہیں جنہیں سب ہی اچھا سمجھتے ہیں اور ان کے کرنے میں بھی کوئی مشقت نہیں جیسے خوش اخلاقی سے گفتگو یا راستہ میں سے کانٹے صاف کر دینا کہ کہیں کسی غفلت شعار انسان یا نابینا کو تکلیف نہ ہو، یہ اعمال ایسے ہیں کہ ان کے کرنے میں زیادہ دشواری نہیں اور ان کو سب ہی کے نزدیک اچھا بھی سمجھا جاتا ہے اور ایک وہ اعمال ہیں جن کے کرنے میں انسان کو تکلف ہوتا ہے اور کچھ نہ کچھ مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے۔

شریعت نے ہمیں ایک اصول بتا دیا کہ عمل میں جس قدر مشقت ہوگی اسی قدر ثواب دیا جائے گا یہ اصول جب ہمارے سامنے آ گیا تو اب اعمال کی فضیلت کا پتہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان باللہ، جہاد اور نماز کے اندر مشقت ہے اور بہت مشقت ہے، ایک کافر کیلئے ایمان قبول کر لینا جان دینے سے زیادہ دشوار ہے، مثال کے لئے کفار مکہ کو دیکھ لیجئے، ایمان باللہ کے سوا اور کچھ تو ان سے مطلوب نہ تھا لیکن انہوں نے اس خیال سے کہ آبائی دین پامال نہ ہو طرح طرح کی قربانیاں دیں، جنگ ہوئی اور متعدد بار ہوئی، اعزاء قتل کر دیئے گئے خود ان لوگوں کو شہر بدر کر دیا گیا، انتہا یہ ہے کہ وہ قتل بھی کئے گئے لیکن مذہب بدلنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔

بالآخر جب تمام قوتیں صرف ہو گئیں اور یہ حضرات کامیابی سے مایوس ہو گئے تو ہتھیار ڈال دیئے اور جس طرح کفر پر مضبوطی سے قائم تھے اسی طرح اسلام میں بھی جاں نثاری کا ثبوت پیش کیا، ارشاد ہے:

خيارهم في الجاهلية خيارهم في الاسلام اذا فقهوا (بخاری ص ۳۹۶)
ان میں جو لوگ دور جاہلیت میں منتخب تھے وہ اسلام میں بھی منتخب ہیں اگر تفقہ فی الدین حاصل کر لیں۔

چونکہ ایمان باللہ سب سے مشکل کام ہے اس لئے سب سے پہلے اسی کا ذکر کیا اسکے بعد دوسرا نمبر جہاد کا ہے، جب اسلام قبول کر لیا تو اب ہر طرح اسکی اشاعت کی کوشش ہونی چاہئے، دشمن کتنی بھی کوشش کریں مگر انہیں پسپا کرنا چاہئے، دشمن ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، اول نہار میں اسلام اور آخر نہار میں کفر اختیار کرتے ہیں تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہو کہ اگر ان اساطین ملک و ملت کو اسلام سے عناد ہوتا تو اسے قبول ہی کیوں کرتے، یہ جو قبولیت کے بعد گریز کر رہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ضرور اس دین کا باطن ظاہر سے مختلف ہے، غرض جب کفار کی جانب سے ہر طرح کی کوشش کی گئی تو بالآخر مدافعت کی اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ تم پر حملہ آور ہوں تو دنیاں شکن جواب دو، جس کا مقصد افساد فی الارض یا انسانیت کا خون نہیں ہے بلکہ انسانیت کو صراطِ مستقیم کی ہدایت مقصود ہے۔

جہاد کی مشقت بھی معمولی نہیں ہے انسان سر سے کفن باندھ کر نکلتا ہے کہ اب کسی سے ملاقات نہ ہو سکے گی جب انسان زندگی سے ہاتھ دھونے کی قسم کھا لیتا ہے تب یہ اقدام کرتا ہے لیکن ان تمام تر مشقتوں کے باوجود اسکی مشقت ایمان باللہ سے کم ہے۔

اسکے بعد تیسرے نمبر پر روایات میں حج کا ذکر ہے، حج میں بھی انسان کو ہر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے، جان مال اور ترک وطن سب ہی چیزوں کے بارے میں قربانی دینی پڑتی ہے گویا انسان کو جتنی چیزیں بھی مرغوب ہیں سب سے یک قلم منہ موڑنا پڑتا ہے، انسانوں کا ایک سمندر ہے لیکن حاجی کو اس پورے مجمع کے درمیان رہتے ہوئے سب سے

الگ رہنا پڑتا ہے اسی مشقت کے باعث جب عورتوں نے جہاد کی خواہش ظاہر کی تو آپ نے فرمایا:
جہاد کن الحج (بخاری)
 تمہارا جہاد حج ہے۔

یہ معاملہ فضیلت اعمال کا تھا جس میں مشقت اور تعب کا اعتبار ہے،

اسکے بعد دوسرا معاملہ احبیت اعمال کا ہے، احبیت کے متعلق اصول یہ ہے کہ وہ عمل اللہ کے نزدیک محبوب ہوگا جس سے خدا اور بندے کے درمیان کا علاقہ مضبوط ہو، خدا اور بندے کے درمیان آقائی اور غلامی کا علاقہ ہے، غلام وہی اچھا ہوتا ہے جس کا سر آقا کے سامنے ہمیشہ جھکا رہے اور جو آقا کے ہر حکم کو بے چوں و چرا تسلیم کرے، اس حیثیت سے اعمال پر نظر ڈالتے ہیں تو نماز سب سے احب معلوم ہوتی ہے، جب بندہ یہ سوچتا ہے کہ مجھے دربار احکم الحاکمین میں جانا ہے تو پہلے وضو کرتا ہے، مقصد یہ ہے کہ میں اس گندگی کے ساتھ حاضری کے لائق نہیں ہوں اسلئے حاضری سے پہلے ظاہر و باطن کو صاف کر لینا چاہئے اور پھر اس صفائی کے بعد ہاتھ باندھ کر سر جھکا کر کھڑا ہو جاتا ہے، جسم کا عضو عضو سراپا تواضع ہے، زبان نحوثا ہے، اس تواضع کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ سر بھی پیروں پر رکھ دیتا ہے اور جب ایک سجدہ قبول فرمایا جاتا ہے تو شکر یہ میں فوراً دوسرا سجدہ کرتا ہے۔

غرض نماز عبد و معبود کے درمیان گہرا رشتہ قائم کرتی ہے، ادھر سے بندہ،

تمام تعریفیں اللہ کو لائق ہیں جو ہر عالم کے مربی ہیں،

الحمد لله رب العالمین

کہتا ہے تو ادھر سے رب العالمین،

میرے بندے نے میری تعریف کی۔

حمدنی عبدی

فرماتا ہے۔ پھر بندہ

جو بڑے مہربان نہایت رحم والے ہیں۔

الرحمن الرحیم

کہتا ہے تو خداوند قدوس

میرے بندے نے میری شاکہ،

اننی علی عبدی

فرماتا ہے پھر بندہ

جو روز جزا کے مالک ہیں،

مالك يوم الدين

کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ

میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی

مجدنی عبدی

فرماتا ہے اور جب بندہ

ایاک نعبد و ایاک نستعین

ہم آپ کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد چاہتے ہیں

کہتا ہے تو خداوند قدوس کی رحمت پکاراٹھتی ہے

یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان ہے اور میرے

ہذا بینی و بین عبدی و لعبدی

بندے کے لئے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا،

ماسأل

اور جب بندہ اعتراف نیاز مندی کے ساتھ التجا کرتا ہے کہ ہر معاملہ میں ہمیں سیدھے راستہ پر چلا تو ارشاد ہوتا ہے:

ہذا لعبدی و لعبدی ماسأل

یہ میرے بندے کے لئے ہے اور اس کے لئے وہ ہے جس کا اس نے سوال کیا۔

اس کے بعد اہمیت کا دوسرا مرتبہ اس عمل میں ہے جس کا فائدہ عیال اللہ یعنی مخلوق خدا کو پہنچے یعنی جس طرح عیال دار کو عیال کی پرواہ ہوتی ہے اور یہ شخص ان حضرات کا شکر گزار ہوتا ہے جو ان پر احسان کرتے ہیں اسی طرح یہ شخص ان حضرات سے دشمنی مول لیتا ہے جو عیال کے مخالف ہوں، یہ مخلوق اللہ کی عیال ہے جو ان کے حقوق ادا کرے گا وہ اللہ کے یہاں محبوب قرار دیا جائیگا اور جو مخلوق پر ظلم کرے گا وہ عند اللہ مغضوب اور معتبوب ہوگا، عام اس سے کہ وہ مخلوق انسان ہو، حیوان ہو، جن ہو اور خصوصاً وہ مخلوق جس کی تربیت کی ذمہ داری بھی کسی پر ڈالی گئی ہو، غرض مخلوق کے حقوق کی ادائیگی اور رعایت بھی اہمیت کا باعث ہے۔

تیسرا لفظ ای الاسلام خیر ہے وہ عمل خیر ہوگا جو تمام لوگوں کی نظر میں اچھا ہو، یہاں خیر و شر کا تقابل ہے، اس لئے خیریت ان اعمال سے ہوگی جن میں شر بالکل نہ ہو اور یہ کہ شر جس قدر بھی سرایت کرتا جائیگا اسی قدر خیریت کم ہوتی چلی جائیگی اور شر کی وہ قوتیں جو انسان کو تباہی و بربادی کی طرف لے جاتی ہیں صرف دو ہی ہیں بخل اور تکبر، یہ دونوں قوتیں انسان کو دنیا میں عزت اور آخرت میں جنت سے محروم کر دیتی ہیں، کبر کے بارے میں ارشاد نبوی ہے:

حدیث ملاحظہ ہو، عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ ﷺ من صلی صلوۃ لم یقرأ فیہا بام القرآن فہی خداج ثلثا غیر تمام، فقیل لابی ہریرۃ انا نکون وراء الامام قال اقرأ بها فی نفسك فانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول قال اللہ تعالیٰ قسمت الصلوۃ بینی و بین عبدی نصفین و لعبدی ما سأل، فاذا قال العبد الحمد لله رب العالمین قال اللہ تعالیٰ حمدنی عبدی، واذا قال الرحمن الرحیم قال اللہ تعالیٰ اثنی علی عبدی فاذا قال مالک يوم الدين قال مجدنی عبدی واذا قال ایاک نعبد و ایاک نستعین قال هذا بینی و بین عبدی و لعبدی ما سأل فاذا قال اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیہم غیر المغضوب علیہم ولا الضالین قال هذا لعبدی و لعبدی ما سأل (رواه مسلم) (مشکوٰۃ باب القراءة فی الصلوۃ)

لا یدخل الجنة من كان فی قلبه
مثقال ذرة من کبر (رواه مسلم)
وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس کے دل
میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا۔

اس لئے خیریت کے لئے کبر کا نہ ہونا ضروری ہے، کبر کے علاج کیلئے اسلام نے سلام کے تاکید کی کہ ہر مسلم کو سلام کرو، تمہیں یہ سوچنے کی گنجائش نہیں ہے کہ ہم بڑے آدمی ہیں، دوسرے آدمیوں کو چاہئے کہ ہمیں سلام کریں اسلام نے سنت جاری کی کہ تم ہر اس شخص کو سلام کرو جو ملے خواہ وہ جانا پہچانا ہو یا انجان ہو، غرض اسلام نے سلام کے ذریعہ کبر کا علاج کر دیا کہ اللہ کو کسی کا کبر پسند نہیں ہے۔

دوسری مذموم صفت بخل ہے، جس شخص میں یہ صفت ہوگی وہ کبھی دوسروں کے حقوق ادا نہیں کر سکتا، مثلاً بیوی کے مہر، اولاد کے نفقات، سائلین کے حقوق، مہمانوں کی مہمانداری، مسافروں کی اعانت وغیرہ، مزید یہ کہ ان مستحقین کے خلاف الزام لگائے گا تا کہ وہ مطالبہ بھی نہ کر سکیں۔

اس بخل کے مختلف درجات ہیں، ایک تو یہ کہ انسان دوسرے کی حق تلفی کرے دوسرے یہ کہ اپنے حقوق کی ادائیگی میں بخل کرے اور تیسرا درجہ یہ کہ کسی دوسرے انسان کو حق ادا کرتے دیکھ کر بھی تکلیف محسوس کرے، اس آخری درجہ کو شح کہا جاتا ہے، بخل کے متعلق حضرت صدیق اکبرؓ نے:

ای داء ادواء من البخل
کوئی بیماری بخل سے زیادہ مہلک ہے،

فرمایا تھا، پورا واقعہ یہ ہے آنحضور ﷺ کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اعلان فرمایا:

من كان له عند النبي صلى الله
عليه وسلم دين او عده فليأتني
نبی اکرم ﷺ پر کسی کا دین ہو یا آپ کا
اس سے وعدہ ہو وہ میرے پاس آئے۔

چنانچہ اس اعلان کے بعد حضرت جابرؓ حضرت ابو بکرؓ کے پاس تشریف لے گئے اور کہا کہ آں حضورؐ نے بحرین کا مال آنے پر مجھ سے اس قدر دینے کا وعدہ فرمایا تھا، حضرت ابو بکرؓ نے وعدہ فرمایا، بحرین سے مال آ گیا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس پہنچ گئے، اس وقت آپ نے کسی وجہ سے نہیں دیا، چند روز کے بعد حضرت جابرؓ نے پھر یاد دلایا تو وہی جواب ملا پھر تیسری بار کہا اور جب بارگاہ خلافت سے وہی جواب ملا تو حضرت جابرؓ نے کہا:

قد اتيتك فلم تعطني ثم اتيتك فلم
تعطني ثم اتيتك فلم تعطني فاما
ان تعطيني واما ان تبخل عني
میں آپ کے پاس آیا مگر آپ نے کچھ نہ دیا پھر دوبارہ
آیا پھر آپ نے نہ دیا پھر بارہ آیا پھر کچھ نہ دیا،
پس یا تو آپ مجھے دیدیجئے اور یا پھر بخل ہی کر لیجئے،

۱- بخاری باب قصة عمان و بحرین ص ۲۴۹ ۲- بخاری باب قصة عمان و البحرین من کتاب المغازی۔

۳- بخاری باب قصة عمان و بحرین من کتاب المغازی۔

حضرت ابو بکر صدیقؓ سے یہ بخل کا لفظ برداشت نہ ہو سکا اور فرمایا:

اقلت تبخل عني وای داء ادوء
من البخل قالها ثلثاً (بخاری)

کیا تم یہ کہتے ہو کہ تم مجھ سے بخل کرتے ہو اور کوئی بیماری
بخل سے زیادہ مہلک ہے یہ آپ نے تین مرتبہ کہا،

اور پھر لپ بھر کر درہم اٹھائے اور فرمایا انکو گن لو چنانچہ وہ پانچ سو تھے اور کہا:

خذ مثلها مرتین
اس جتنے اور دو مرتبہ لے لو۔

اس صفت بخل کے علاج کے لئے حدیث شریف میں اطعام طعام کا ذکر کیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ حدیث شریف میں جوابات کا یہ اختلاف، الفاظ سوال کے اختلاف کا

نتیجہ ہے، رہا ان روایات کا معاملہ جن میں افضلیت کے سلسلہ میں احبیت یا احبیت کے سلسلہ میں افضلیت کے
اعمال کا ذکر ہے تو اگر اس کو راوی کا سہونہ کہیں تو ان اعمال کو ذوق چہتین کہہ لیں گے۔

امام بخاریؒ کا مقصد اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ ہم احادیث کی روشنی میں یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ ایمان میں

افضلیت احبیت اور خیریت اعمال کی راہ سے آتی ہے، اسلئے مرجیہ کا یہ کہنا کہ اعمال کا ایمان سے کوئی ربط نہیں، نہ
ان سے ایمان میں ترقی ہوتی ہے اور نہ انکے ترک سے ایمان کو نقصان پہنچتا ہے بالکل غلط ہے۔

[۷] بَابُ مِنَ الْاِيْمَانِ اَنْ يُحِبَّ لَا خِيَةَ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ

(۱۳) حَدَّثَنَا مُسَدُّ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ وَعَنْ

حُسَيْنِ الْمُعَلِّمِ قَالَ حَدَّثَنَا قَتَادَةُ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى

يُحِبَّ لَا خِيَةَ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ.

ترجمہ | باب، یہ ایمان میں داخل ہے کہ اپنے بھائی کے لئے اسی چیز کو پسند کرے جسے اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

مسدد نے حدیث بیان کی فرمایا کہ یحییٰ نے شعبہ سے حدیث بیان کی انہوں نے حضرت انسؓ سے بروایت

قتادہ نبی کریم ﷺ سے بیان فرمایا اور حسین معلم سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ حضرت قتادہ نے حدیث بیان کی

کہ حضرت انسؓ نے نبی اکرم ﷺ سے بیان کیا کہ آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں

ہو سکے گا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے اس چیز کو پسند نہ کرے جس کو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔

تبدیلی عنوان کی وجہ | امام بخاریؒ اب عنوان بدل رہے ہیں اس سے پہلے عنوانات میں اسلام کا لفظ استعمال

کیا گیا تھا کیونکہ اطعام طعام وغیرہ ظاہری افعال ہیں جن کا تعلق اسلام ہی سے ہو سکتا

ہے پھر اسلام کے واسطے سے تعلق ایمان سے ہوگا لیکن محبت فعل قلبی ہے اسلئے اس کی تعبیر میں ایمان ہی کا لفظ اچھا ہے اور پھر حدیث میں جس ترتیب سے دونوں لفظ واقع ہوئے ہیں اسکا تقاضا بھی یہی تھا کہ پہلے باب کا تعلق اسلام سے ہو اور دوسرے میں ایمان کی تصریح ہو، کیوں کہ پہلی حدیث میں ای الاسلام خیر کا جواب دیا گیا ہے اور یہاں لا یومن احدکم فرمایا گیا ہے، امام بخاری نے دونوں چیزوں کی رعایت رکھی، گو امام کے اس طرز کو تفسیر سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن جب ایک بالکل واضح وجہ موجود ہے تو اسی کو اختیار کرنا مناسب ہے۔

اختلاف اسناد | یہاں دو سندیں مذکور ہیں ایک تویحی عن شعبۃ عن قتادہ عن انس اور دوسرے عن حسین المعلم قال ثنا قتادہ عن انس دونوں سندوں میں شعبہ اور حسین معلم قتادہ سے راوی ہیں فرق یہ ہے کہ شعبہ نے قتادہ سے بصیغہ عن روایت کیا ہے جس میں انقطاع و اتصال دونوں کا احتمال ہے اور حسین معلم نے صیغہ تحدیث استعمال کیا ہے اسی لئے حضرت مصنف نے دونوں کو جمع نہیں کیا بلکہ الگ الگ ذکر فرمایا ہے لیکن شعبہ چونکہ مدلس نہیں ہیں اسلئے ان کا عن قتادہ کہنا بھی حدیثا قتادہ کے مرادف ہے بلکہ شعبہ کا نام آنے کے بعد قتادہ کا معنعن بھی مقبول ہو جاتا ہے کیونکہ قتادہ مدلس ہیں اس لئے ان کی معنعن روایت بغیر کسی توثیق کے قابل قبول نہیں ہوتی، اور شعبہ کا نام اس توثیق کے لئے کافی ہے۔

تشریح حدیث | ارشاد ہے کہ جب تک مسلمان اپنے بھائیوں کے لئے ان چیزوں کا خواہش مند نہ ہو جو اپنے لئے چاہتا ہے اس وقت تک اسکا ایمان کمزور ہے، عام اس سے کہ وہ چیز دنیا سے متعلق ہو یا آخرت سے مثلاً آپ اقتدار کے خواہاں ہیں تو حسب حال دوسروں کے لئے بھی اسکے خواہاں رہیں یا مثلاً آپ کو رزق حلال کی تلاش ہے یا آپ رزق حلال کھاتے ہیں تو آپکی یہ تمنا ہونی چاہئے کہ دوسرے بھی اس سے محروم نہ رہیں، اب اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بعض حضرات پیغمبر علیہ السلام اور دوسرے صالحین سے بعض خاص چیزوں کی دعاء منقول ہے قرآن کریم میں بعض صالحین کی دعاء منقول ہے۔

واجعلنا للمتقین اماماً (پ ۱۹ ع ۴) اور ہم کو متقیوں کا امام بنا دے۔

اس آیت میں امامت کی دعا کی گئی ہے، ظاہر ہے کہ امامت ایک خاص چیز ہے اگر اسمیں خصوص نہ رہے سب امام ہو جائیں تو ماموم کون رہے، قرآن کریم میں یہ دعا ان صالحین کی طرف سے نقل کی گئی ہے جنکی متعدد صفات ذکر کی گئی ہیں پھر یہ کیسے درست ہے، اسی طرح رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میرے لئے وسیلہ اور مقام محمود کی دعاء کیا کرو، مجھے امید ہے کہ میں ہی اس کا مستحق ہوں گا بلکہ بعض پیغمبروں کی دعاء میں تو دوسرے کی شرکت کا صراحت سے انکار ہے حضرت سلیمان سے منقول ہے:

رب ھب لی ملکا لا ینبغی لاحد اے اللہ! مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے

من بعدی (پ ۲۳ ع ۱۲۶)

بعد کسی دوسرے کیلئے مناسب نہ ہو۔

اس میں صراحت ہے کہ مجھے اس شان کی حکومت دے کہ میرے بعد کسی کو وہ چیز حاصل نہ ہو سکے، اسی دعا کے احترام میں پیغمبر علیہ السلام نے اس جن کو چھوڑ دیا تھا جس نے نماز کو خراب کرنا چاہا تھا اور آپ نے اس کو پکڑ لیا تھا، ارادہ بھی کیا کہ اسے ستون سے باندھ دیں تاکہ صبح کو مدینہ کے لڑکے مذاق کر سکیں لیکن پھر اس خیال سے چھوڑ دیا کہ لوگ کہیں گے سلیمان علیہ السلام کی دعاء قبول نہیں ہوئی!

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا منشا یہ نہیں کہ ہر چیز میں سب کو شریک رکھنے کی تمنا کرے خواہ وہ چہرے خصوصیات ہی میں سے کیوں نہ ہو، کیونکہ اگر ساری دنیا امام بن جائے تو ماموم کون رہے، سب حاکم بن جائیں تو محکوم کون رہے، اسلئے ان چیزوں میں تو شرکت اور تعدد کی گنجائش ہی نہیں ہے اور انبیا کرام علیہم السلام کی دعاؤں میں معاذ اللہ اقتدار کی طلب نہیں ہے مثلاً سلیمان علیہ السلام کی ایسی حکومت جو حیوانات اور جنات سب پر یکساں ہو حضرت سلیمان علیہ السلام کا اعجاز تھا، اور وہ اس اعجاز کو عالم کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے کہ اگر چہ پیغمبروں کے لئے اللہ نے سلطنت پسند نہیں فرمائی اور نہ انہیں سلطنت دی گئی لیکن اگر کسی کو نواز گیا ہے تو اسکی یہ شان ہے کہ دوسروں کے لئے اسکا تصور بھی انسانی طاقت سے ماوراء معلوم ہوتا ہے، اسی طرح مقام محمود کا اصل مقصد اولین و آخرین کی اس مشکل کو حل کرنا ہے جس سے تمام پیغمبروں نے جواب دے دیا تھا، خداوند قدوس نے پہلے ہی سے طے کر لیا ہے کہ یہ مقام محمود آپ کے لئے ہے لیکن شریک ثواب کرنے کے لئے ہمیں بھی دعاء کا حکم دیا گیا ہے۔

غرض حدیث کا منشا یہ نہیں کہ اسمیں خصوصیات کا بھی خیال نہ کیا جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ جس طرح امور خیر کی تمنا اپنے لئے کی جائے اسی طرح دوسروں کیلئے بھی ہونی چاہئے، ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ترک حسد سے کناہیہ ہے عموماً خیر کے معاملہ میں حسد پایا جاتا ہے، حاسد کی تمنا ہوتی ہے کہ محسود علیہ سے یہ چیز چھین جائے کیونکہ انسان یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کے ابناء جنس میں کوئی شخص اس سے بڑا ہو جائے، حدیث شریف میں فرما دیا گیا کہ مومن کا کام حسد نہیں بلکہ مومن چاہتا ہے کہ خیر میں زائد سے زائد افراد شریک ہو جائیں اور یہی چیز ایمان کے تقاضوں کے مناسب بھی ہے۔

بعض نے کہا ہے کہ اخ سے مراد مسلم ہے لیکن یہ رائے کمزور ہے اگرچہ لفظ اخیہ کا تبادر، اخ مسلم ہے مگر شریعت نے ذمی کو بھی دنیوی احکام میں مسلم کے برابر قرار دیا ہے فرماتے ہیں دماء ہم کد مائنا و اموالہم کامو الننا اسلئے اہل ذمہ سے بھی حسد کا معاملہ جائز نہ ہوگا۔

اسی طرح پڑوسی بھی اس کے اندر آ جاتا ہے بلکہ بعض روایات میں ان یحب لجارہ کے الفاظ آتے ہیں

اور لفظ جار میں تعظیم ہے خواہ وہ مسلم ہو یا یہودی و مجوسی۔

امام اعظمؒ کے پڑوس میں ایک مجوسی رہتا تھا، گانے بجانے کا مشغلہ تھا جب امام اعظمؒ آخر شب میں تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو وہ گانے بجانے لگتا ان اشعار میں ایک مصرعہ

اضاعونی وای فتی اضاعوا انہوں نے مجھے گنوا یا اور انہوں نے کیسے جوان کو گنوا یا ہے،

بھی تھا۔ امام رحمہ اللہ نے کبھی اسکو منع نہیں فرمایا، کسی موقع پر اس مجوسی کو حکومت نے گرفتار کر لیا، امام رحمہ اللہ تشریف لے گئے اور اسے رہا کر لائے اور فرمایا کہ اور لوگ ہوں گے تمہیں ضائع کرنے والے، ہم نے تو تمہیں ضائع نہیں ہونے دیا۔

یہاں بھی اور تمام احادیث کی طرح لا یومن کے یہی معنی ہیں کہ وہ شخص جس میں یہ اوصاف ہوں ان افراد سے بہتر ہے جو ان اوصاف سے خالی ہیں، نیز یہ بھی کہ ایمان کے لئے صرف اس وصف کا پیدا ہونا جانا کافی نہیں ہے بلکہ اور تمام شرائط ایمان کے ساتھ یہ وصف پایا جائے تو ایمان ایمان بنتا ہے، امام بخاریؒ کا مقصد بھی یہی ہے کہ مرجیہ نے اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتلایا تھا حالانکہ احادیث کی روشنی میں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اگر اعمال میں ذرا بھی کمی ہو جائے تو ایمان میں کمزوری آجاتی ہے۔

[۸] بَابُ حُبِّ الرَّسُولِ ﷺ مِنَ الْإِيمَانِ

(۱۳) حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ ثَنَا شُعَيْبٌ قَالَ ثَنَا أَبُو الزُّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ .

(۱۴) حَدَّثَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ ثَنَا ابْنُ عُثَيْبٍ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيزِ بْنِ صُهَيْبٍ عَنْ أَنَسِ بْنِ النَّبِيِّ ﷺ ح وَحَدَّثَنَا آدَمُ بْنُ أَبِي إِيَاسٍ قَالَ ثَنَا شُعَيْبٌ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسِ بْنِ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ .

ترجمہ | باب، رسول اکرم ﷺ کی محبت ایمان میں داخل ہے۔ ابو الیمان نے حدیث بیان کی، فرمایا کہ ہم سے شعیب نے حدیث بیان کی، فرمایا کہ ہم سے ابو الزناد نے حضرت ابو ہریرہ سے بروایت اعرج یہ بیان فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے جس کی ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے نزدیک میں اس کے آباء اور اس کے اولاد سے زیادہ محبوب نہ

ہو جاؤں۔ یعقوب بن ابراہیم نے حدیث بیان کی فرمایا کہ ہم سے ابن علیہ نے حضرت انسؓ سے بروایت عبدالعزیز بن صہیب رسول اکرم ﷺ سے یہ بیان کیا اور آدم بن ابی ایاس نے حدیث بیان کی فرمایا کہ ہم سے شعبہ نے حضرت انسؓ سے بروایت قتادہ یہ بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے آباء اسکی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

سابق سے ربط | باب سابق میں من الایمان ان یحب لانیہ ما یحب لنفسہ کو من الایمان فرمایا کیونکہ یہ فرع ہے حب رسول ﷺ کی کیونکہ جس کو رسول سے محبت ہوگی وہی اس قسم کے احکام کی تعمیل کر سکے گا تو منشاء یہ ہوا کہ یہ محبت لانیہ، حب رسول کے ماتحت ہونی چاہئے تب ہی تو من الایمان قرار پائے گی؛ لہذا اسکے بعد حب الرسول من الایمان کا باب قائم کیا۔

پہلے باب میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ ایمان کا تقاضا ہے کہ انسان جس چیز کو اپنے لئے پسند کرتا ہے ترجمہ کا مفہوم | اسے دوسرے کیلئے بھی پسند کرے، جب دوسرے بھائیوں کیساتھ بھی معاملہ اس طرح ہے تو ظاہر ہے کہ حب رسول کا معاملہ تو نہایت ہی اہم ہے۔ گویا پہلا باب اس باب کے لئے دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہاں امام بخاریؒ نے من الایمان ان یحب الرسول نہیں فرمایا جیسا کہ باب سابق میں من الایمان ان یحب لانیہ فرمایا ہے، حالانکہ حدیث میں لایو من احدکم کو حب رسول سے پہلے ذکر کیا گیا ہے، اس تقدیم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ من الایمان ان یحب الرسول کہا جائے لیکن اسے یا تو امام بخاریؒ کا تفسیر کہا جائے یا پھر یہ کہ امام نے تادیباً آپ کا اسم گرامی پہلے ذکر کیا اور پھر من الایمان کہا کیونکہ یہ تو بالکل ہی ظاہر ہے کہ ایمانیات کے سلسلہ میں آپکی محبت اصل الاصول ہے۔

ترجمہ کے تحت امام بخاریؒ نے دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں جن میں والد کو ولد پر مقدم اور بعض طرق میں ولد کو مقدم ذکر کیا ہے، جسکی معقول وجہ ہو سکتی ہے، والد کو ولد پر اسلئے مقدم ذکر کیا ہے کہ وہ اصل ہونیکلی بنا پر قابل تعظیم ہے اور تعظیم کا تقاضا ہے کہ اسے ذکر میں مقدم کیا جائے اور ولد کی تقدیم کی وجہ ہو سکتی ہے کہ معاملہ محبت و شفقت کا ہے اور رحمت جس قدر والد کو ولد سے ہو سکتی ہے ولد کو والد سے نہیں ہوتی اور یہاں مقصد بھی یہی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام سے محبت کا تعلق تمام محبوب اشیاء سے زائد ہونا چاہئے جو ولد کی تقدیم سے حاصل ہوتا ہے، والد کی تقدیم کی ایک نہایت اہم وجہ یہ ہے کہ ہم سے پیغمبر علیہ السلام کی نسبت والد ہی کی ہے، ترمذی کی روایت ہے:

انما انا لکم بمنزلة الوالد | میں تمہارے لئے باپ کے مرتبہ میں ہوں،

پھر جس طرح ولد مذکور اور مونث دونوں کو شامل ہے کسی کو اولاد ذکور سے زیادہ تعلق ہوتا ہے اور کسی کو اناث سے

اس طرح والد کا لفظ بھی بطور فاعل ذی کذا مذکور و مونث دونوں کو شامل ہے کیونکہ اسکے معنی اس وقت ذوالولد ہونگے جیسے لابن و تاسم کے معنی ذوالبن اور ذوتسمر کے ہیں، اس تعمیم کی بنا پر حاصل یہی نکلا کہ پیغمبر کی محبت ان اعزاء کی محبت سے زیادہ ہونی چاہئے جنکی محبت میں انسان اندھا ہو جاتا ہے اور جو انسان کے نزدیک پوری دنیا سے عزیز رہتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ دونوں روایتوں میں والد اور ولد کی محبت کا ذکر آیا ہے، اپنے نفس کا نہیں آیا حالانکہ انسان کو اپنے نفس سے زیادہ تعلق ہوتا ہے لیکن دوسری روایت میں والناس اجمعین لے کا اضافہ ہے جس میں انسان کی اپنی ذات اور نفس بھی شامل ہے۔

دوسری روایت میں دوسندیں ہیں گویا امام بخاری نے یہ روایت دو استادوں سے لی ہے پہلی سند میں امام کے استاد یعقوب اور دوسرے میں آدم ہیں درمیان میں تحویل کی صورت اس لئے نہیں اختیار کی جاسکی کہ سندیں حضرت انسؓ پر ملتی ہیں پھر عبدالعزیز بن صہیب عن انس اور قتادہ عن انس میں کیا فرق ہے کہ امام نے متن حدیث قتادہ سے نقل کیا اور عبدالعزیز سے نقل نہیں کیا، بات یہ ہے کہ عبدالعزیز کے طریق سے جو متن منقول ہے اسکو ابوالیمان کی پیش کردہ پہلی حدیث کیساتھ معنی تو شرکت ہے لیکن الفاظ بدلے ہوئے ہیں، ابوالیمان کی روایت میں تو من والبدہ وولدہ ہے اور عبدالعزیز کی روایت میں من اہلہ و مالہ کے الفاظ ہیں اور قتادہ کی روایت میں پورا پورا تطابق ہے بلکہ تطابق کے بعد والناس اجمعین کا اضافہ بھی ہے۔

تشریح حدیث | حدیث شریف میں ارشاد ہے قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسکے دل میں والد اور ولد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

جب ہم اس بات پر نظر کرتے ہیں کہ والد اور ولد کی محبت طبعی اور غیر اختیاری ہے اور پیغمبر کیساتھ جو تعلق ہوگا خواہ آپ کی سنت کی نصرت کا ہو، یا احکام کی اطاعت کا ہو، یا شریعت سے دوسرے کے حملوں کی مدافعت کا، وہ سب اختیاری ہوگا اسلئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ کی اختیاری محبت والد اور ولد کی غیر اختیاری محبت پر کس طرح غالب آسکتی ہے، یہ ایسا موقع تھا کہ جس پر سننے والے کو تردد ہو سکتا تھا اور بہت ممکن تھا کہ انکار کی نوبت آجائے اسلئے اہمیت جتانے کیلئے قسم کھا کر بیان کرتے ہیں یا یوں کہہ لیجئے کہ معاملہ جس قدر اہم ہوتا ہے بیان کر نیوالے کو اسقدر بیان میں قوت پیدا کرنی پڑتی ہے کیونکہ اگر اہم معاملہ کو معمولی طور پر بیان کیا جائے تو اسکی اہمیت ختم ہو جاتی ہے، اسی اہمیت کے پیش نظر رسول اکرم ﷺ اپنے بیان میں قسم کے ذریعہ زور پیدا فرما رہے ہیں کہ قسم ہے اس ذات کی جسکے قبضہ میں میری جان ہے۔

آپ کا بغیر کسی تاکید کے بھی بیان فرمادینا سامعین کے لئے پوری پوری تسلی اور تسکین کا باعث ہے کیونکہ یہ کسی عام انسان کا کلام نہیں ہے جس کے بارے میں کچھ تردد کی گنجائش ہو لیکن جب تاکید و قسم بھی ہو تو وزن اور بڑھ جائے گا، قسم بھی اپنی جان کی کھار ہے ہیں یعنی تم جانتے ہو کہ میرا نفس کتنا پاکیزہ اور صاف ستھرا ہے اور کس قدر اوصاف حمیدہ کا حامل ہے، کس قدر افعال جمیلہ کا محرک ہے، میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے، قسم کے الفاظ میں ید کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ ”ید“ سے قوت مراد لینا خداوند قدوس کو معطل کر دینے کے مرادف ہے، یہ تاویلات حضرات متاخرین نے مجبوری کے درجہ میں کی ہیں، جب یہ دیکھا کہ فلاسفہ کے اصول کو ہاتھ میں لے کر فرق باطلہ نے اسلام کے شفاف اصولوں پر اعتراضات کئے ہیں تو یہ ضرورت ہوئی کہ مسائل کو اسی رنگ میں سمجھایا جائے، گویا مقصد منہ بند کرنا تھا ورنہ بات اپنی جگہ صاف ہے کہ خدا کیلئے ید ہے لیکن اس کی نوعیت مخلوقات کے ید سے مختلف ہے، جب مخلوقات ہی آپس میں بے انتہا مختلف ہیں انسان و حیوانات میں فرق ہے، چرند و اور پرند کی وضع میں فرق ہے تو خالق کو مخلوقات پر قیاس کرنا یقیناً درست نہیں، خداوند قدوس کے متعلق یہ کہنا بھی انتہائی حماقت ہے کہ اس کے ہاتھ سونے اور چاندی کے ہیں، روافض کا یہ کہنا بھی کفر ہے کہ وہ آدھا ٹھوس اور آدھا کھوکھل ہے، اسی لئے سمع بصر، اور دوسری وہ تمام چیزیں جسکو خداوند قدوس نے اپنی طرف منسوب کیا ہے تشابہات میں سے ہیں لیس کمثلہ شئی وهو السميع البصیر، غرض یہاں رسول اکرم ﷺ پوری تاکید کے ساتھ بیان فرما رہے ہیں کہ تمہارا ایمان میری گہری محبت پر موقوف ہے دیکھنا یہ ہے کہ اس محبت سے کونسی محبت مراد ہے اس میں اکابر کے اقوال مختلف ہیں، بعض بزرگوں کی تحقیق ہے کہ اس سے مراد محبت طبعی ہے کیونکہ حدیث میں والد اور ولد سے مقابلہ ڈالا گیا ہے جن کی محبت طبعی ہوتی ہے، اس مقابلہ سے معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام کی محبت بھی طبعی ہونی چاہئے اور آیت کریمہ میں بھی مقابلہ پر انہیں چیزوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کی طرف انسان کا میلان طبعی ہوتا ہے، آیت کریمہ ملاحظہ ہو:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے
وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ	بھائی اور تمہاری بیبیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال
وَأَمْوَالٌ نَّاقَرْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ	جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی
تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسْكِنٌ	نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جسکو تم
تَرْضَوْنَهَا حَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ	پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اس کے رسول
وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ	سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے پیارے

فَتَرَبُّصُوا . (پ ۸۷۰) ہوں تو تم منتظر رہو۔

اس آیت میں آباء، ابناء، اخوان، ازواج، تجارت اور اموال وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے، اور اگرچہ ان چیزوں کی محبت بذات خود منع نہیں ہے لیکن یہ محبت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت پر غالب آجائے اور احکام شرعیہ کی تعمیل میں سدا راہ بن جائے تو اس کو ممنوع قرار دیا جائے گا، مگر قابل غور بات یہ ہے کہ آیت میں ان چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جن سے انسان کو طبعی تعلق ہوتا ہے، اسلئے حدیث اور آیت شریفہ سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں جس محبت کا مکلف بنایا گیا ہے وہ طبعی ہی ہے اور صحابہؓ کے احوال و واقعات بھی کچھ اسی قسم کے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں پیغمبر علیہ السلام سے طبعی تعلق تھا۔

غزوہ خیبر سے واپسی پر پیغمبر علیہ السلام اور حضرت صفیہؓ جن کا عقد راستہ ہی میں ہوا تھا ایک اونٹنی پر سوار ہیں ٹھوکر لگی اور آپ اونٹنی پر سے گر گئے اور حضرت صفیہؓ بھی، حضرت ابو طلحہؓ نے جو اونٹنی پر سوار تھے جب یہ دیکھا کہ پیغمبر علیہ السلام گر گئے ہیں تو بلا توقف اپنے آپکو اونٹنی سے گرا دیا یعنی نہ اونٹ بٹھانے کا انتظار کیا اور نہ احتیاط کے ساتھ کودنے کی کوشش کی بلکہ پیغمبر علیہ السلام کو اس حال میں دیکھ کر اضطراری طور پر اپنے آپ کو نیچے پھینک دیا، حاضر خدمت ہوئے اور پوچھا حضورؐ کہیں چوٹ تو نہیں لگی؟ آپ نے فرمایا صفیہؓ کو سنبھالو، حضرت ابو طلحہؓ کا بیان ہے کہ میں منہ پر کپڑا ڈال کر آگے بڑھا اور قریب پہنچ کر وہ نقاب حضرت صفیہؓ کے چہرے پر ڈال دیا اور سوار کرایا، اس والہانہ انداز سے صحابہ کرامؓ کی محبت کی نوعیت معلوم کی جاسکتی ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کا بیان ہے کہ احد کے موقع پر میرے والد حضرت عبد اللہ نے مجھے وصیت کی کہ تم مجھے نفس پیغمبر علیہ السلام کے علاوہ سب سے عزیز ہو اور میں سمجھ رہا ہوں کہ کل صبح سب سے پہلے میں شہید ہوں گا میرے اوپر قرض ہے میں وصیت کرتا ہوں کہ اس کی ادائیگی کی فکر کرنا، یہاں بھی بصراحت موجود ہے کہ تم مجھے سب سے زیادہ عزیز ہو غیر نفس رسول اللہ۔

حضرت عمرؓ نے عرض کیا، حضور! آپ کی محبت میرے دل میں والد اور ولد سے بہت زیادہ ہے مگر میں اپنے نفس کی محبت اور بھی زیادہ پارہا ہوں، آپ نے فرمایا عمر ابھی کی باقی ہے، پھر حضرت عمرؓ نے غور کیا اور کہا کہ اب آپ کی محبت میرے دل میں اپنے سے بھی زیادہ ہے، یہ سن کر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا الان یا عمر!

حضرت عبد اللہ بن زید بن عبد ربہ باغ یا کھیت میں پانی دے رہے تھے کہ بیٹے نے پیغمبر علیہ السلام کے وصال کی اطلاع دی فوراً آنکھیں بند فرمائیں اور بارگاہ رب العالمین میں عرض کیا کہ اے خدا! میں نے جن آنکھوں سے پیغمبر علیہ السلام کا جمال دیکھا ہے اب پیغمبر علیہ السلام کے بعد میں انہیں کسی دوسری چیز کے لئے استعمال کرنا

نہیں چاہتا، مجھ سے میری بصارت لے لے چنانچہ ان کی بینائی جاتی رہی۔

حضرت اویس قرنی کے متعلق مشہور ہے کہ جب انہیں یہ اطلاع پہنچی کہ پیغمبر علیہ السلام کا دندان مبارک شہید ہو گیا ہے تو انہوں نے اپنے تمام دانت توڑ لئے کیونکہ معین دندان مبارک معلوم نہ ہو سکا تھا۔ ان تمام واقعات سے معلوم ہو رہا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام سے صحابہ کرامؓ کو جو تعلق تھا وہ محبت طبعی کے درجہ میں تھا بلکہ حب طبعی سے بھی کوئی اور اونچا درجہ ہو تو وہ یہی ہو سکتا ہے۔

لیکن بعض دوسرے حضرات کا فیصلہ اس کے خلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ محبت کے مختلف درجات ہیں: حب عقلی، حب ایمانی (حب شرعی) پھر حب ایمانی میں ایک درجہ حب عشقی کا ہے، حب طبعی ظاہر ہے کہ قطعاً غیر اختیاری چیز ہے اور کسی شخص کو بھی غیر اختیاری شے کا مکلف نہیں بنایا جاسکتا، تکلیف ہمیشہ اختیاری امور پر دی جاتی ہے اسلئے حب طبعی مراد نہیں لی جاسکتی، ہاں حب عقلی کی گنجائش ہے، حب عقلی کا مفہوم یہ ہے کہ خواہ حکم طبعی طور پر گراں گزرے لیکن عقل کا تقاضا ہے کہ تمام چیزوں پر اسی کو ترجیح دی جائے جیسا کہ مریض کو دوا سے طبعاً نفرت ہوتی ہے لیکن بروئے عقل وہ دوا کے استعمال پر مجبور ہے، ایک طرف باپ بیٹے کی محبت کا تقاضا ہے جس کی وجہ سے انسان بسا اوقات خلاف شرع کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، اور دوسری طرف شریعت کا فیصلہ ہے کہ اس میں تمہارا نقصان، تمہاری شریعت کا نقصان ہے، اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان طبعی رجحان کی طرف مائل ہوتا ہے یا عقل کے مانع آنے سے رک جاتا ہے اگر عقل کے روکنے سے باز آ جاتا ہے تو مومن ہے ورنہ ایمان میں نقصان ہے۔

اور ایک حب ایمانی ہے، یہ دونوں سے اوپر کی چیز ہے کہ اطاعت اور فرماں برداری تا حد امکان عمل ہونی چاہئے، اس میں نہ نفع کی تمنا ہے اور نہ نقصان کی پرواہ، حب عقلی میں نفع و نقصان پر نظر ہوتی ہے، حب ایمانی میں ایسا نہیں ہے پھر جب یہ ایمان کا تقاضا ہے کہ نفع و نقصان کی پرواہ کئے بغیر فرامین پر عمل کیا جائے تو جس قدر اعمال میں ترقی ہوتی رہے گی اس قدر ایمان میں ترقی ہوتی رہے گی حتیٰ کہ حب ایمانی حب عشقی میں تبدیل ہو جائے گی جیسا کہ عاشق کی نگاہ میں محبوب کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا اسی طرح اس مقام پر آ کر انسان کی نظر میں بھی کچھ نہیں رہتا، اختیار محبوب کے ہاتھ میں ہے جس چیز سے روک دیا گیا رک گئے اور جس چیز کا حکم دیدیا گیا عمل پیرا ہو گئے، کیونکہ اس موقع پر آ کر انسان کو اپنے وجود کا بھی احساس نہیں رہتا اس مقام پر پہنچ کر محبوب اگر یہ بھی کہہ دے کہ تم دور ہو جاؤ تو اس کو بھی اختیار کر لیتا ہے گو عشق کے ساتھ یہ دوری بہت مشکل معلوم ہوتی ہے لیکن عشق کا ایک یہ بھی عالم ہے۔

ارید وصالہ ویرید ہجری

افاترك ما ارید لما یرید

کیونکہ اس مقام پر انسان کی اپنی خواہشیں فنا ہو چکی ہوتی ہیں صحابہ کرامؓ میں بھی اس کی مثال موجود ہے آپ نے حضرت وحشیؓ سے فرمایا کہ میرے سامنے نہ پڑا کرو چنانچہ حضرت وحشیؓ کبھی سامنے نہیں آئے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ محبت غیر اختیاری طبعی تو ہو نہیں سکتی کیونکہ انسان غیر اختیاری شے کا مکلف نہیں ہوتا۔ اب وہ محبت عقلی ہوگی یا ایمانی اس لئے محبت کا آغاز حب عقلی سے ہوتا ہے۔

کیونکہ ایمان کا تقاضا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی اطاعت میں نفع اور معصیت میں ضرر ہے اور جب یہ حب عقلی ترقی کرتی ہے تو حب ایمانی بن جاتی ہے اور اس وقت نفع و نقصان پر نظر نہیں رہتی بلکہ انسان اس مقام پر صرف حکم دیکھتا ہے اور جب یہ حب ایمانی ترقی کر کے حب عشقی کے درجہ میں پہنچ جاتی ہے تو محبوب کے علاوہ سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

آیت شریفہ قل ان کان آباءکم و ابناءکم و اخوانکم الا یہ سے حب طبعی معلوم ہوتی ہے اور واقعہ اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں جیسا کہ یہ بعض اکابر کا فیصلہ ہے، لیکن یہ معنی معین نہیں ہیں بلکہ دوسرے معنی بھی ہو سکتے ہیں، آیت میں چند مالوفات کا ذکر کیا گیا ہے کہ تم ان کی طرف راغب نہ ہو جانا اس لئے ان معنی کی بھی گنجائش ہے۔ اگر آیت کی تفسیر اس طرح کی جائے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ حب رسول کے سلسلہ میں مومن سے حب طبعی سے بھی کوئی اونچا درجہ مطلوب ہے، جس رسول پر سب کچھ قربان کیا ہے، اس کا تقاضا ہے کہ جب تک ہماری رگوں میں خون دوڑ رہا ہے، اس پر آنچ نہ آئے، تلوار پڑے تو ہم پر پڑے، تیر آئے تو نشانہ ہم بنیں، جبکہ ماں باپ کی محبت بھی طبعی ہوتی ہے، لیکن جب جان پر بن آتی ہے تو بسا اوقات انسان جاں سپاری میں کوتاہی کر جاتا ہے، حضرت جابرؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت ابودجانہؓ اور آپؐ کی آڑ میں شہید ہو جانے والے دوسرے انصار کا عمل یہی بتلا رہا ہے کہ ان کی محبت حب عشقی کے درجہ میں تھی جس کے مقابل حب ایمانی بھی ہیچ ہے۔

مؤمنین میں رسول کے ساتھ محبت کے مختلف درجات ہوتے ہیں ہمسی کی محبت حب عقلی کے درجہ کی ہوتی ہے اور کسی کی حب ایمانی اور عشقی کے مرتبہ کی، حضرت عمرؓ کے مرتبہ کو بڑھانا تھا اس لئے آنحضرت ﷺ نے حضرت عمرؓ کے پیش کردہ خطرہ اور خدشہ کو صاف کر دیا۔

درجات کا اختلاف اس طرح معلوم کیا جاسکتا ہے کہ نابینا کو ترک جماعت کی اجازت ہے، حضرت عتبانؓ کو اجازت عنایت فرمادی صرف اس لئے کہ وہ ضعیف البصر تھے اور جب حضرت عبداللہ بن ام مکتوم نے اجازت طلب کی تو فرمایا اهل تسمع الاذان کیا اذان کی آواز آتی ہے؟ عرض کیا ہاں آتی ہے۔ آپ نے فرمایا، پھر نہ آنے کی کیا بات ہے۔

حضرت عبداللہ کا مقام یہ ہے کہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ فرماتے:

مرحبا بمن نعاتبنی

مرحبا، اس ذات کے لئے جس کے بارے میں

میرے رب نے مجھے عتاب کیا۔

رہی

اس ارشاد میں عبس و تولى ان جاءہ الاعمی کی طرف اشارہ ہے۔

بہر کیف محبت طبعی ہو یا ایمانی، دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی محبت سب سے زیادہ کیوں ہونی چاہئے، محبت کے معنی ہیں میلانِ نفس، اور میلان ہمیشہ پسندیدہ چیز کی جانب ہوا کرتا ہے، ظاہر ہے کہ عالم اسباب میں میلان اور جھکاؤ کے چند ہی اسباب ہو سکتے ہیں، پہلے ان اسباب محبت کو دیکھا جائے اور پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ اسباب آپ کے اندر کامل ہیں یا دوسروں میں۔

اگر وہ اسباب آپ کے اندر کامل و اکمل ہوں تو قاعدے کی رو سے آپ کی محبت بھی سب سے زائد ہونی چاہئے، وہ اسباب محبت چار ہیں۔ جمال، کمال، قرابت، احسان۔

جمال یعنی خوبصورتی، یہ ظاہری بھی ہوتی ہے اور باطنی بھی، اس باطنی خوبصورتی ہی کی دوسری تعبیر کمال ہے، یہ چاروں اسباب جالب محبت ہیں، ظاہری خوبصورتی یہ ہے کہ انسان خوب رو ہو، اعضاء میں تناسب اور اعتدال ہو، کوئی بات ایسی نہ ہو کہ اس سے جمال میں نقصان معلوم ہوتا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کو محبوبیت خداوندی کا درجہ حاصل ہے۔ پھر چونکہ آپ کو محبوبیت کے لئے اس ذات نے منتخب کیا ہے جو خالق جمال اور محبت جمال ہے اسلئے وہ تمام چیزیں جن سے جمال متعلق ہو سکتا ہے آپ کے اندر بدرجہ کمال موجود ہونی چاہئیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ کے جمال کے سلسلہ میں بیان فرماتی ہیں کہ اندھیری رات میں اگر سوئی کے اندر ڈورا ڈالنے کی ضرورت ہوتی تو سوئی کو آپ کے جسد اطہر سے قریب کیا اور ڈورا ڈال لیا یعنی آپ کے جمال سے تاریکی دور ہو جاتی تھی، اسی طرح فرماتی ہیں کہ اگر کوئی چیز گرم ہو جاتی تھی اور اندھیرے کے باعث ہاتھ نہ آتی تھی تو پیغمبر کے دست مبارک کی روشنی میں اسے ڈھونڈ لیا جاتا تھا۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ چودھویں رات میں کبھی چہرے پر نظر ڈالتا ہوں اور کبھی چاند پر اور قسم کھا کر بیان فرماتے ہیں کہ جو جمال پیغمبر علیہ السلام کے چہرہ انور میں نظر آیا چاند میں نہ تھا، اپنے جمال کے سلسلہ میں خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے:-

میرے بھائی یوسف مجھ سے زیادہ صبح

اخى يوسف اصبح وانا

ہیں اور میں ان سے زیادہ صبح ہوں۔

املح منه

صباحت بہت اچھی چیز ہے، اگر نظر پڑ جائے تو جم جاتی ہے لیکن اگر ملاحظت نہ ہو تو حسن میں کچھ پھیکا پن معلوم ہوتا ہے، محبوبیت کے لئے صباحت سے زیادہ ملاحظت درکار ہے اور ظاہر ہے کہ خوبصورت انسان سب کے نزدیک محبوب ہوتا ہے، یہ حسن پرستی صرف انسان ہی میں نہیں بلکہ اس وصف میں حیوانات بھی انسان کے سہیم و شریک ہیں، ایک پرند ہے تدر، جسے چکور کہتے ہیں چاند پر عاشق ہوتا ہے، ادھر چاند نکلا اور ادھر اس نے رقص شروع کیا اور

چونکہ چاند تک رسائی ممکن نہیں ہے اسلئے چاندنی میں لوٹا رہتا ہے۔

اسی طرح بلبل پھول پر جان دیتی ہے اور صرف حیوانات ہی نہیں بلکہ یہ حسن پرستی کا مادہ درختوں میں بھی پایا جاتا ہے، بعض درخت ایسے ہیں کہ حسیں آدمی کو لپٹ جاتے ہیں۔

اس حسن پرستی کے سلسلہ میں انسان کو تو نہ پوچھئے، حجۃ الوداع کا واقعہ ہے حضرت فضل بن عباس بڑے حسین تھے، حجۃ الوداع میں آنحضرت ﷺ کی سواری پر ردیف ہیں۔ قبیلہ خثعم کی ایک عورت آئی اور باپ کے متعلق سوال کیا کہ وہ اس قدر ضعیف العمر ہیں کہ سواری پر نہیں بیٹھ سکتے، ان پر حج فرض ہو چکا ہے کیا میں انکی طرف سے حج ادا کرادوں یا کر دوں۔

مسئلہ اپنی جگہ آئے گا یہاں تو یہ بتلانا ہے کہ ادھر فضل بن عباس ہیں اور دوسری طرف قبیلہ خثعم کی وہ حسین عورت، دونوں کی نظر ایک دوسرے پر جم گئی اور یہ صرف حسن کی کشش کا نتیجہ ہے جو قطعاً اختیاری چیز ہے، آپ نے حضرت فضل کا منہ پھیر دیا۔ گو آپ کی موجودگی میں کوئی خطرہ نہ تھا، لیکن صرف اسلئے ایسا کیا کہ حسن میں کشش ہوتی ہے، مبادا کوئی اثر ہو جائے۔ قرآن کریم میں بھی حسن کے اعجاب اور کشش کے لئے شہادت موجود ہے۔ ارشاد ہے۔

لا یحل لك النساء من بعد ولا

ان تبدل بہن من ازواج ولو

اعجبك حسنهن الا ما ملکت

یمینک . (پ ۳۴۲)

انکے علاوہ اور عورتیں آپ کے لئے حلال

نہیں اور نہ یہ درست ہے کہ آپ ان بی بیوں کی

جگہ دوسری بدلیں اگرچہ آپ کو ان کا حسن اچھا

معلوم ہو مگر جو آپکی مملوکہ ہو۔

آیت کریمہ میں رسول اکرم ﷺ کے متعلق ارشاد ہے کہ خواہ آپ کو ان کا حسن تعجب میں ڈال دے، معلوم ہوا کہ حسن میں غیر معمولی کشش ہوتی ہے، پھر اگر حسن میں کشش اور اس کا تقاضا محبت ہے تو پیغمبر علیہ السلام کی ذات گرامی میں سب سے زیادہ کشش ہونی چاہیے۔ کیونکہ آپکی ذات گرامی میں جمال کے سلسلہ کی ہر چیز بدرجہ اتم موجود ہے۔

دوسرا سبب محبت، کمال یعنی جمال باطنی ہے، ظاہر ہے کہ جب کسی شخص میں اعلیٰ درجہ کے اخلاق جمع ہوتے ہیں تو وہ اپنے اخلاق سے دوسروں کو مسخر کر لیتا ہے، بڑے بڑے سرکش اس کی خوش اخلاقی سے پانی ہو جاتے ہیں، پیغمبر علیہ السلام کو حسن ظاہری کے ساتھ حسن باطنی بھی کامل طور پر عطا کیا گیا تھا اور جس شخص میں کمال ہوتا ہے وہ سب کے نزدیک محبوب ہوتا ہے۔

ایسی متعدد مثالیں موجود ہیں کہ صورت و شکل کی خامی کے باوجود صرف کمال کی وجہ سے انہیں محبوب سمجھا گیا

بلکہ بسا اوقات انہیں سلاطین پر بھی ترجیح دی گئی آپ کی ذاتِ اقدس میں تمام انسانی کمالات بدرجہ اتم موجود تھے، آپ نے فرمایا ہے۔

اناسید ولد آدم ولا فخر
میں اولادِ آدم کا سردار ہوں اور کوئی فخر نہیں
آپ کی شانِ سیادت سب سے نمایاں ہے اسی لئے انبیاء کرام علیہم السلام سے عہد لیا گیا تھا کہ جب آپ ظاہر ہوں تو ان کا اتباع کرنا، ارشاد ہے:

واذا خذ اللہ میثاق النبیین
اور جب عہد لیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے کہ جو کچھ میں
لما اتیتکم من کتاب و حکمة
تم کو کتاب اور علم دوں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر
ثم جاءکم رسول مصدق لما
آوے جو مصدق ہو اس کا جو تمہارے پاس ہے
معکم لتؤمنن بہ ولتنصرنہ (پ ۳۷ ع ۱)
تو تم اس رسول پر اعتقاد بھی لانا اور اس کی طرفداری بھی کرنا۔
اور کمالات میں اصل کمال، کمال علمی ہے اور کمال عملی بھی اسی کمال علمی کا نتیجہ ہے، پیغمبر کا ارشاد ہے اوتیت
علم الاولین والاخرین یعنی جتنے علوم سابق میں تھے وہ سب میرے پاس ہیں اور جو میرے مخصوص علوم ہیں وہ کسی کے
پاس نہیں، اسی کمال علمی کے باعث حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت دی گئی تھی اس کمال علمی کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام
سے ہوا تھا اور آنحضور ﷺ پر ایوم اکملت لکم دینکم کے اعلان کے ساتھ اس کا اتمام کر دیا گیا۔
پھر اگر کمال میں تسخیر کی قوت ہے اور با کمال انسان کے لئے دنیا ختم ہو جاتی ہے تو پیغمبر علیہ السلام کا کمال
تو بہت بلند ہے، پیغمبر علیہ السلام کے کمالات کو اگر دنیا کے تمام کمالات کے ساتھ وزن کیا جائے تو دنیا کے یہ تمام کمالات
اس قدر ہیچ نظر آئیں کہ بیان کے لئے بھی کوئی نسبت نہ مل سکے۔
اسی طرح محبت کے تیسرے سبب یعنی قرابت کو لے لیجئے، پیغمبر علیہ السلام اس اعتبار سے بھی بہت زیادہ لائق
تعظیم و محبت ہیں، ارشادِ باری ہے:

النبی اولی بالمؤمنین من
انفسہم (پ ۲۱ ع ۷)
نبی مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے
بلجہی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔

اس سے زائد اور کیا قرب ہوگا کہ آپ روحانی باپ ہیں، ارشاد ہے:

وازواجہ امہاتہم (پ ۲۱ ع ۷)
اور آپ کی بی بیایاں انکی مائیں ہیں۔

جب ازواجِ مطہرات امہات ہیں تو آپ باپ ہوں گے؛ چنانچہ شاذ قراءت میں وهو ابوہم بھی موجود
ہے۔ جسمانی باپ تخلیق کا واسطہ ہوتا ہے لیکن کمالاتِ رُخویوں کے پیدا کرنے میں جسمانی باپ کا کوئی دخل نہیں ہوتا،
یہ آپ ہی کی تعلیمات کا ثمرہ ہیں جو بالواسطہ حاصل ہوئی ہیں اس لئے روحانیت کے سلسلے میں ابوت کا مقام صرف آپ

کو حاصل ہے۔

اور روحانی نسبت بھی مختلف طرح کی ہوتی ہے، استاد کی، شیخ طریقت اور ہادی کی، ان سب نسبتوں میں روحانی ابوت موجود ہے، ایک استاد کا بھی احترام اسی لئے ہے کہ وہ روحانی باپ ہے، علوم اسی کے واسطے سے ملتے ہیں، باپ اگر جاہل ہو تو اس کا یہ مقام نہیں ہے۔ پھر استاد کے بعد شیخ طریقت کا درجہ ہے جس کی توجہات نے روحانیت بخشی اور ان علوم میں جان پڑ گئی جن کا استاد نے افاضہ کیا تھا، اسلئے شیخ کا درجہ استاد سے بھی بڑھا ہوا ہے، جب جسمانی باپ کو بیٹے کے منقولہ اموال میں تصرف کا حق ہے بلکہ وہ بیٹے کے انکار کے علی الرغم بھی تصرف کر سکتا ہے جب جسمانی باپ کے یہ حقوق ہیں تو وہ ذات گرامی جس نے انسانیت سے ہم کنار کیا، روحانیت کی تعلیم دی، یقیناً ان حقوق کی بہت زیادہ مستحق ہے۔

چوتھا سبب محبت احسان ہے، انسان اپنے محسن کا فرماں بردار ہوتا ہے۔ الا نسان عبد الاحسان انسان احسان کا بندہ ہے۔ مشہور اور مسلم مقولہ ہے، عمرہ حدیبیہ کے موقع پر جب صلح کی گفتگو ہو رہی تھی، مغیرہ بن شعبہ تلوار سوتے کھڑے تھے، گفتگو کرنے والا ادھر ادھر نظر ڈال کر کہتا ہے کہ یہ لوگ جو پیغمبر کے ارد گرد جمع ہو گئے ہیں ان کے یہی خواہ، نہیں، ہاں کچھ اغراض وابستہ ہیں، ذرا مصیبت آئی اور یہ بھاگے۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ سکر جلال آ گیا اور بہت گرم اور سخت الفاظ استعمال کئے، وہ شخص پوچھتا ہے یہ کون ہیں؟ کہا جاتا ہے ابو بکر ہیں، جواب میں کہتا ہے کہ ابو بکر آپ کے مجھ پر احسانات ہیں ورنہ میں جواب دیتا یعنی صرف احسان کی وجہ سے زبان روک لی اور صرف انسان ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ حیوانات بھی احسان کی وجہ سے جھکنے لگتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے کیا احسانات ہیں، ظاہر ہے کہ تمام مخلوقات پر آپ کا سب سے پہلا اور سب سے عظیم احسان یہ ہے کہ سب کا وجود آپ ہی کے وجود کا فیض ہے اور تمام احسانات تو بعد کے ہیں سب سے پہلی چیز تو وجود ہے جو آپ کی وساطت سے ملا ہے، باقی تمام انعامات بھی آپ کی وساطت سے ملتے ہیں۔

انما انا قاسم واللہ يعطی میں تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔
یعنی تمام انعامات کی تقسیم میرے واسطے سے ہوتی ہے حتیٰ کہ نبوت کی تقسیم بھی آپ ہی کی وساطت سے ہوئی،
حدیث شریف میں ارشاد ہے:

انی عبد اللہ لخاتم النبیین وان ادم لمنجدل
فی طینتہ (مسند احمد جلد ۲ ص ۱۲۷)

میں عبد اللہ خاتم النبیین ہوں حالانکہ آدم
ابھی مٹی ہی میں تھے۔

پھر احسانات کی کوئی انتہا نہیں ہے کیونکہ آپ نے ہدایت امت کے سلسلہ میں سخت جانکاہیوں کا سامنا کیا

جس وقت آپ مبعوث ہوئے اس وقت کی عمومی حالت نہایت ابتر تھی، آیت کریمہ ملاحظہ ہو۔

کنتم علی شفا حفرة من النار
اور تم دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے
فانقذکم منها .
سو اس سے اللہ نے تمہاری جان بچائی۔

ایک جگہ ارشاد ہے کہ میری اور تمہاری مثال ایسی ہے کہ تم جہنم کے کنارے پر ہو اور میں تمہیں بچانے کی فکر میں ہوں، اخذ بحجز کم کے الفاظ آتے ہیں، یہ لفظ بتا رہا ہے کہ قربانیاں دے کر بچایا ہے، اسی لئے تو ہر قل نے کہا تھا کہ اگرچہ ہمیں معلوم تھا کہ پیغمبر آنے والے ہیں، لیکن اس کا گمان بھی نہ تھا کہ وہ تم میں آئیں گے۔

حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے جب رستم فارس کے سامنے پچاس ہزار کی جمعیت میں بیان دیا ہے وہ بھی اس سلسلہ میں دیکھنے کی چیز ہے، فرماتے ہیں کہ ہم سب سے زیادہ ذلیل تھے، ہم مردار کھاتے تھے، غربت کی وجہ سے مردہ جانور اور درختوں کی چھالوں کو کھاتے تھے، ہم نے پتھروں کو معبود بنا لیا تھا لیکن اللہ نے ہمارے اندر اپنا پیغمبر پیدا کیا جس کے حسب، نسب اور اخلاق و کردار سے ہم پورے طور پر باخبر تھے، ہم نے پہلے اسے پرکھا اور پھر اس پر ایمان لے آئے اس نے ہمیں یہ بتلایا کہ اگر ہم اس کے کہنے پر عمل کریں گے تو ہمیں دنیا اور آخرت کی سرداری حاصل ہوگی۔ اور ہوا بھی ایسا ہی کہ دنیا اور آخرت دونوں بنا لیں، دنیا کی تمام سلطنتوں کو باج گزار بنا لیا، ایک غیر مہذب قوم کو دنیا کا مودب اور معلم بنا دیا، یہ تھی دنیوی حکومت کی شان، رہا اخروی معاملہ تو خداوند قدوس کا قرب سب سے بڑی نعمت ہے جو اس امت کو حاصل ہے۔ سب سے پہلے یہ امت پل صراط سے گزرے گی، سب سے پہلے داخل جنت ہوگی اور جنت کی ایک سو بیس صفوں میں اسی صفیں اسی امت کی ہوں گی۔

یہ ایسی خصوصیات ہیں کہ جن میں کوئی امت شریک نہیں ہے، پھر اگر احسان میں کشش ہے اور الانسان عبد الاحسان صحیح ہے تو یقیناً پیغمبر علیہ السلام کی ذات میں سب سے زیادہ کشش موجود ہے اور آپ تمام لوگوں میں سب سے زیادہ محبت کے لائق ہیں۔

اس توضیح کی روشنی میں یہ بات صاف ہوگئی کہ تعلق اور محبت کے لئے اس عالم آب و گل میں جس قدر بھی وجہیں ہو سکتی ہیں وہ سب آپ کی ذات والاصفات میں بدرجہ کمال موجود ہیں، اسلئے آپ کے ساتھ محبت کا وہ علاقہ ہونا چاہئے جو کسی اور انسان یا مخلوق کے ساتھ نہ ہو۔

[۹] بَابُ حَلَاوَةِ الْإِيمَانِ

(۱۶) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ الثَّقَفِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا أَيُّوبُ عَنْ أَبِي

قِلَابَةَ عَنْ أَنَسٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ

الإِيمَانُ أَنْ يَكُونَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ وَأَنْ يَكْفُرَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْفُرُهُ أَنْ يُقَذَّفَ فِي النَّارِ.

(آئندہ: ۲۱، ۲۲، ۲۳، ۲۴، ۲۵)

ترجمہ | باب، ایمان کی چاشنی کے بیان میں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ تین خصلتیں جس میں ہوں گی وہ ایمان کی چاشنی پالیگا، ایک تو یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں اور جس شخص سے بھی محبت رکھے محض اللہ کے لئے رکھے اور دوبارہ کفر اختیار کرنے سے اس طرح بیزار ہو جیسے آگ میں گرائے جانے سے بیزاری ہوتی ہے۔

مقصد ترجمہ | یہاں امام بخاری رحمہ اللہ مرجیہ کہ عقیدے پر ایک ضرب کاری لگانا چاہتے ہیں کہ تم نے اعمال کو عام اس سے کہ وہ فرائض ہوں یا نوافل ایمان سے بالکل بے تعلق بتایا ہے حالانکہ احادیث شریفہ یہ بتا رہی ہیں کہ ایمان میں حلاوت اور اعمال مطلوب ہیں اور جس شخص میں یہ تین چیزیں پائی جائیں گی وہ حلاوت اور شیرینی پالے گا اور ان امور میں جس قدر کمی آتی جائے گی اسی قدر مراتب میں کمی ہو جائے گی۔

سابق میں امام نے یہ کہا تھا کہ ایمان تصدیق قلبی کا نام ہے اور دیگر امور وہ ہیں کہ جن کا ایمان سے تعلق ہے جتنے جتنے تفصیل بھی پیش فرماتے آرہے ہیں کہ فلاں عمل اسلام سے متعلق ہے اور فلاں عمل ایمان میں داخل ہے اور جب یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں تو ہر ایک کے متعلقات دوسرے کے متعلقات ہیں، تفصیل کے اندر امام نے یہ بھی بتلایا کہ اسلام میں یہ بھی داخل ہے کہ کوئی مسلمان دوسرے کو اپنے ہاتھ سے نقصان نہ پہنچائے، اسی سلسلے میں اطعام طعام اور قراءت سلام کا ذکر کیا۔ اس کے بعد بتلایا کہ انسان کے اندر خیر اندیشی کا جذبہ جب ہی پیدا ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے بھائیوں کو وہی درجہ دے جو اپنے آپ کو دیتا ہے اور یہ تمام باتیں اسی شخص میں پائی جاسکتی ہیں جسے پیغمبر علیہ السلام سے انتہائی محبت ہوگی کیونکہ یہ پیغمبر کی تعلیم ہے اور ان کو وہی اپنا سکتا ہے جسے آپ کی ذات اقدس سب سے زیادہ عزیز ہو اور جب کوئی ترقی کر کے اس درجہ پر پہنچ جائے گا اس کے ایمان میں مٹھاس اور لذت پیدا ہو جائے گی وہ خداوند قدوس کی اطاعت اور فرماں برداری کے لئے بے چین رہے گا اور جب طاعات میں لذت محسوس ہونے لگے گی تو معاصی سے نفرت ہو جائیگی گویا معاصی سے نفرت اس ایمان کی شیرینی کا نتیجہ ہے۔

ایمان کے لئے شیرینی اور حلاوت کا لفظ استعمال فرما کر گویا ایمان کو شہد سے تشبیہ دے رہے ہیں یعنی جیسا کہ شہد میں مٹھاس ہوتا ہے اور وہ عموماً پسند کیا جاتا ہے جو خود آنحضرت ﷺ کو بھی پسند تھا اس کے کھانے میں بھی لطف آتا ہے اور وہ اندرونی امراض کا علاج بھی ہوتا ہے فیہ شفاء للناس (اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے) فرمایا گیا ہے اسی طرح ایمان میں لذت بھی ہے اور شفاء بھی اور جب ایمان میں حلاوت ثابت ہوگی تو ظاہر ہے کہ مٹھاس کسی کو کم معلوم ہوتا ہے کسی کو زیادہ، صفر اوی مزاج والے کو مٹھاس کا احساس کم ہوتا ہے بلکہ اسے میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے اسی

طرح اگر کسی کو ایمان میں حلاوت کا احساس نہیں ہوتا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ معاصی کا صفراء اس کے مزاج پر غالب آچکا ہے۔

بس اسی لذت کی کمی زیادتی سے امام بخاریؒ نے ایمان کی کمی زیادتی اور ایمان پر اعمال کے اثر انداز ہونے کے سلسلہ میں استدلال کیا ہے جس سے مرجیہ کی کھلی تردید ہو رہی ہے۔

تشریح حدیث | ارشاد ہے کہ جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی وہ حلاوت ایمان پالیگا، بعض اکابر سے سنا ہے کہ بیٹھے کی طرف رغبت درستگی ایمان کی دلیل ہے، بڑے بوڑھوں کا یہ معمول رہا ہے کہ کھانے کے بعد گڑگی ڈلی استعمال کرتے تھے، یہ گڑھا ضم بھی ہے اور جسم میں حرارت بھی پیدا کرتا ہے، حکیم اجمل خاں مرحوم سے کسی نے پوچھا کہ جماع کے بعد کمزوری محسوس کرتا ہوں حکیم صاحب نے اسے گڑگی ڈلی بتلا دی اسی وجہ سے عرب میں کھجور کو پسند کیا گیا ہے، احادیث میں آتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک مرتبہ صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ ایک درخت ایسا ہے کہ جس کے پتے نہیں گرتے اور جو مسلم سے زیادہ مشابہ ہے کیا تم میں سے کوئی شخص بتا سکتا ہے؟ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ حضرات صحابہ کا ذہن جنگل کے درختوں کی طرف گیا اور میرے ذہن میں آ گیا تھا کہ وہ کھجور کا درخت ہے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ آپ ہی ارشاد فرمائیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کھجور ہے۔

حدیث شریف میں تین چیزیں ارشاد فرمائی ہیں، ان تینوں میں پہلا نمبر یہ ہے کہ اللہ اور اس کا رسول تمام ہی چیزوں میں سب سے زیادہ محبوب ہوں، یعنی اللہ اور رسول اللہ کی اتنی محبت ہو کہ عالم میں کسی اور کی اتنی نہ ہو، اللہ کی محبت تو اس لئے کہ وہ منعم حقیقی ہے اور رسول کی محبت اس لئے کہ وہ محسن حقیقی ہیں، انعامات کی تقسیم کے لئے واسطہ ہیں، جب خدا اور رسول کی محبت کا یہ درجہ حاصل ہو گیا تو اب دوسرا درجہ یہ ہے کہ مخلوقات میں جس سے بھی تعلق ہو لوجہ اللہ ہو اور چونکہ محبوب کی پسند اپنی پسند ہوتی ہے اس لئے وہ تمام چیزیں جنہیں رسول اکرم ﷺ نے پسند فرمایا ہے اس کے نزدیک محبوب ہونی چاہئیں اور جب اس درجہ پر پہنچ گیا تو ان چیزوں سے انتہائی نفرت ہونی چاہئے جن سے پیغمبر علیہ السلام نے منع فرمایا ہے مثلاً پیغمبر علیہ السلام نے کفر سے نکال کر اسلام کی راہ دکھائی ہے تو اب کفر سے اس درجہ نفرت ہونی چاہئے جیسے دیدہ و دانستہ آگ میں گرنے سے ہوتی ہے، جب یہ تینوں چیزیں حاصل ہو جائیں گی تو حلاوت ایمان حاصل ہو جائے گی۔

یوں بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ انسان کے تعلقات کی دو قسمیں ہیں، ایک تعلق مع اللہ اور دوسرے تعلق مع المخلوق، مومن کامل وہ ہے جو ان تمام تعلقات کا حق ادا کرے، جب یہ دونوں وصف کامل ہوں جائیں گے ایمان کامل ہو جائے گا، خداوند قدوس سے تعلق کے لئے فرمایا:

یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک

ان یکون اللہ ورسوله احب

ان کے ماسوا سے محبوب ہوں

الیہ مما سواہما .

یعنی تمام مخلوقات سے زیادہ ان کی محبت ہو اور مخلوق سے تعلقات کے لئے فرمایا۔

ان يحب المرء لا يحبه الا الله

یہ کہ محض اللہ کے لئے اس سے محبت ہو۔

یعنی محض اللہ کے لئے تعلق ہونا چاہئے اور جب تعلقات میں للہیت آجائے گی تو دوسرے لوگوں کو ضرر رسانی کے

جذبات یکسر ختم ہو جائیں گے، اللہ کے لئے تعلقات کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ انسان دوستی میں دوسرے انسان کی تمام باتیں برداشت کرے، بلکہ اگر وہ کج رفتار ہے تو اسے سختی سے روک دے یہی خیر اندیشی کی بات ہے اور جو شخص مخلوق الہی سے خیر اندیشی کا تعلق رکھے گا، وہ قرب خداوندی کا مستحق ہوگا، ان چیزوں کے پیدا ہونے کے بعد اسے رحمت خداوندی سے توقع ہونی چاہئے کیونکہ معاملہ خداوند سے بھی اچھا ہے اور مخلوق خدا سے بھی اور اسی پر مراتب قرب میں افزائش کا مدار ہے۔

پھر ایمانیات سے اس قدر گہرے تعلق کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی ضد سے بھی انتہائی تنفر ہونا چاہئے چنانچہ اسے تیسرے نمبر پر لار ہے ہیں کہ اسے کفر اس قدر مبغوض ہو جائے کہ آگ میں گرنا اسکے نزدیک زیادہ سہل ہو جائے۔ ایمان سے جس قدر لگاؤ اور تعلق ہوگا کفر سے اسی قدر نفرت اور اس کا تصور اسی قدر پریشان کن ہوگا معاملہ بین الخوف والرجاء ہے، خدا کی ذات سے مایوسی بھی شیوہ کفر ہے، ارشاد ہے:

لا تائسوا من روح الله انه لا يائس من

اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو بیشک اللہ کی

روح الله الا القوم الكافرون (پ ۱۳۷۴)

رحمت سے وہی لوگ ناامید ہوتے ہیں جو کافر ہیں

اسی طرح اعمال صالحہ پر غرہ بھی خسران کی دلیل ہے۔ ارشاد ہے:

فلا يامن مكر الله الا القوم

سو خدا کی پکڑ سے بجز ان کے کوئی بے فکر

الخاصرون (پ ۳۷۹)

نہیں ہوتا جن کی شامت ہی آگئی ہو۔

مکر سے مراد خفیہ پکڑ ہے، مومن خدا کی فرمانبرداری کرتا ہے اور خدا کی ذات سے عفو و درگزر کی توقع رکھتا ہے، نہ اسے اعمال صالحہ پر غرہ ہوتا ہے کیونکہ وہ کفر سے ہمہ وقت خائف رہتا ہے اور نہ وہ ناامیدی ہی کا شکار ہوتا ہے، غرہ اس لئے نہیں کہ اعمال صرف امید دلا سکتے ہیں، فرمانبرداری کے باوصف اپنے اندرون کی خبر نہیں ہے، اندرون پر دے بہت ہیں، سر، خفی، اخفی، کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی درجہ معصیت کا آجائے صرف ظاہر ہی پر توجہ نہ رہے، صحابہ کرامؓ جب بیٹھتے تھے تو آپس میں اس کا تذکرہ کرتے تھے سب اپنے اعمال کے بارے میں اللہ سے خائف رہتے تھے کہ کہیں اندرون اعمال میں نفاق نہ ہو اس لئے تضرع کے ساتھ خداوند قدوس کی بارگاہ میں دعا کرتے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھ اپنے بارے میں نفاق کا اندیشہ ہے، حضرت حذیفہؓ سے پوچھتے ہیں کہ میرا نام تو منافقین میں نہیں ہے، حضرت حذیفہؓ کو منافقین کے نام بتلا دیئے گئے تھے، حضرت عمرؓ کی جلالت شان سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن اعمال کے باطن سے خائف ہیں۔ حاصل یہ نکلا کہ ایمان خوف و رجاء کے درمیان کا نام ہے اور جس شخص کو یہ مرتبہ نصیب ہوگا وہی حلاوت ایمان حاصل کر سکے گا، اس تشریح سے یہ

ثابت ہو گیا کہ حدیث شریف میں ایسے اصول بتلائے گئے ہیں جن کے اختیار کرنے کے بعد انسان کو طاعات میں لذت حاصل ہونے لگتی ہے اور معاصی سے نفرت بڑھتی ہے اس لئے مرجیہ کا اعمال کو ایمان سے یکسر بے تعلق کہنا بالکل غلط ہے۔

یہاں ایک اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں ان یكون الله ورسوله احب اليه مما سواهما فرمایا گیا ہے جس میں ضمیر ہما میں اللہ اور رسول دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے اور خطیب نے پیغمبر علیہ السلام کی موجودگی میں جو خطبہ دیا تھا اس میں بھی من بعضہما کے اندر اللہ اور رسول دونوں کو جمع کر دیا تھا جس پر پیغمبر علیہ السلام نے یہ کہہ کر تنبیہ فرمائی تھی بشس الخطیب انت (یعنی) تمہیں خطبہ دینا نہیں آتا۔ اشکال یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے جس جمع سے تاکید کیساتھ منع فرمایا تھا، یہاں اسکے برخلاف دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ آخر وجہ فرق کیا ہے؟

اہل علم نے اس اشکال کے مختلف جوابات دیئے ہیں ایک تو یہ کہ ہر چیز اپنے اپنے موقعہ کے اعتبار سے حسن یا قبیح کہلاتی ہے، ایک موقعہ تعلیم کا ہے، اس موقعہ پر معلم کا کمال یہ ہے کہ اپنا مقصد متعلم کے سامنے جامع الفاظ میں پیش کر دے تاکہ متعلم کو سمجھنے میں اور اس کے بعد محفوظ رکھنے میں آسانی ہو، خیر الکلام ما قل و دل اور دوسرا موقعہ خطبہ کا ہے، خطبہ میں تفصیل و تطویل مطلوب ہوتی ہے، خطیب نے خطبہ کے وقت جمع کر دیا تھا جس کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ نے اسے منع فرمایا۔

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ حدیث شریف میں محبت کے اندر جمع کیا گیا ہے جو بالکل درست ہے کیونکہ کسی ایک کو چھوڑ کر دوسرے کی محبت نجات کا سبب نہیں بن سکتی بلکہ دونوں کی محبت جمع ہوگی تو کام چل سکے گا کیونکہ ایمان کا مدار دونوں کی محبت پر ہے اور خطیب نے معصیت کے معاملہ میں دونوں کو جمع کر دیا تھا جس سے معلوم ہو رہا تھا کہ مجموعہ عصیانین نقصان کا باعث ہے، کسی ایک کی معصیت میں نقصان نہیں، حالانکہ یہ واقعہ کے خلاف ہے، کیونکہ خدا کی اطاعت سے انحراف بھی گمراہی ہے اور رسول کی اطاعت سے بھی اس لئے وہاں الگ الگ ہی بیان کرنا چاہئے تھا اسی وجہ سے تنبیہ کی نوبت آئی کہ تمہیں خطبہ دینا نہیں آتا۔

بعض حضرات نے یہ جواب دیا کہ اگر پیغمبر علیہ السلام کی زبان سے جمع ہو تو اس میں کسی قسم کا ایہام نہیں ہے لیکن اگر غیر رسول کی زبان سے جمع ہو تو اس میں یہ ایہام ہو سکتا ہے کہ دونوں کو ایک مقام دے رکھا ہے بس اس ایہام سے بچانے کے لئے آپ نے خطیب کو تنبیہ فرمائی تھی۔

اور بعض حضرات نے کہا ہے کہ خطیب کو تنبیہ کی وجہ اللہ اور رسول کو ایک ضمیر میں جمع کر دینا نہ تھی بلکہ تنبیہ تو اس کے الفاظ کی ادائیگی پر کی گئی تھی دراصل اس نے خطبہ یوں پڑھا تھا من یطع الله ورسوله فقد رشد ومن یعصهما۔ بس یہاں سانس توڑ دیا اور سکتہ کے بعد کہا فقد غوی اب ترجمہ یہ ہو گیا کہ جو اللہ کی اطاعت کرے اور اس کے رسول کی وہ راشد ہے اور جو ان دونوں کی معصیت کرے وہ بھی، اس طرز ادا سے بہت بڑا نقصان پیدا ہو رہا تھا، اس

لئے آپ نے تنبیہ فرمادی امام طحاوی نے مشکل الآثار میں یہی لکھا ہے۔

[۱۰] بَابُ عَلَامَةِ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ

(۱۷) حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ جَبْرِ قَالَ سَمِعْتُ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ آيَةُ الْإِيمَانِ حُبُّ الْأَنْصَارِ وَآيَةُ النِّفَاقِ بُغْضُ الْأَنْصَارِ .
(آئندہ: ۳۷۸۴)

ترجمہ | باب، انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے اور انصار سے بغض، نفاق کی نشانی ہے۔

تشریح حدیث | مطلب یہ ہے کہ یوں تو ہر شخص اپنے ایمان کا مدعی ہے کلمہ لا الہ الا اللہ ہر شخص بڑے جوش و خروش سے پڑھتا ہے لیکن کوئی شناخت ایسی ہونی چاہئے جس سے انسان کے اخلاص کو دیکھا اور پرکھا جاسکے، ایسی علامت کی ضرورت اس دور میں اس لئے بھی زیادہ تھی کہ دوسرے تمام ظاہری اعمال میں منافقین بھی مومنین کے ساتھ لگے رہتے تھے جیسے نماز حج وغیرہ، اس لئے امتیازی علامت کے سمجھا جائے، پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے یعنی انصار سے اس اعتبار سے محبت کہ انہوں نے اس دین کی نصرت کی ہے، ان سے وہی شخص علاقہ محبت رکھ سکتا ہے جسے دین اور صاحب دین سے محبت ہوگی، اسی طرح انصار دین سے بغض بھی وہی رکھ سکتا ہے جسے دین اور صاحب دین سے بغض ہو، سابق حدیث میں ارشاد فرمایا تھا: ان يحب المرء لا يحبه الا لله پھر اس محبت اور اخلاص کا مستحق کون ہو سکتا ہے، ظاہر ہے کہ مستحق وہی ہو سکتا ہے۔ جس نے اللہ کی راہ میں سرفروشانہ خدمات انجام دی ہیں، اسی لئے حصر ادعائی کے طور پر فرماتے ہیں علامۃ الایمان حب الانصار خواہ یہ حصر خبر فی المبتدا ہو یا حصر مبتدائی الخمر، بہر کیف مفہوم یہی ہے کہ چونکہ یہ حضرات دین پیغمبر علیہ السلام کے ناصر ہوئے ہیں اور اس کی اشاعت کے لئے کوشش کی ہے اس لئے ان کی محبت ایمان کا تقاضا ہے۔

انصار مدینہ مکہ کے لوگوں سے ڈرتے تھے، مکہ کے لوگ بڑے باہمت تھے، یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں اللہ نے پاسبان حرم بنایا ہے اور اس کے لئے ہمیں حماست و شجاعت عطا فرمائی ہے اور یہ لوگ مدینہ والوں کو کاشتکار کہا کرتے تھے، جب تمام قبائل نے تبلیغ کو رد کر دیا اور پیغمبر علیہ السلام کی دعوت کے ساتھ روگردانی کی گئی اور پیغمبر علیہ السلام کو ان لوگوں سے مایوسی ہو گئی تو آپ نے موسم حج میں عقبہ والوں کو دعوت دی، ان لوگوں کی سمجھ میں بات آ گئی کیونکہ یہود مدینہ میں آباد تھے اور کہا کرتے تھے کہ اب نبی آخر الزماں آنے والے ہیں، ہم ان سے مل کر ان مشرکین کا قلع قمع کر دیں گے، جب ان لوگوں نے اپنی آنکھوں سے نبی آخر الزماں کو دیکھ لیا تو ایمان ان کے دل میں پیٹھ گیا اور ان

لوگوں نے یہ سوچا کہ ہمیں یہود سے پہلے قبول کر لینا چاہئے، یہ تقریباً چھ آدمی تھے اس سے اگلے سال بارہ سرداران قوم کی تعداد آئی، پیغمبر علیہ السلام نے انہیں بھی دعوت اسلام دی اور انہوں نے بھی بطیب خاطر اسلام قبول کیا، تیسرے سال بہتر آدمی آئے اور چھپ چھپا کر عقبہ میں جمع ہوئے کہ قریش کو خبر نہ ہو اور آپ کو مدینہ آنے کی دعوت دی کہ اگر آپ ہمارے یہاں تشریف لائیں گے تو ہم جان و مال تک کی بازی لگا دیں گے، حضرت عباسؓ اس موقع پر موجود تھے، فرمایا کہ تم انہیں لیجانا چاہتے ہو ذرا سوچ کر قدم اٹھانا، ان کو بلانا پورے عرب کو دعوت محاربت دینا ہے لیکن انصار نے بڑی پختگی سے کہا حتیٰ کہ حضرت عباسؓ کو یقین ہو گیا کہ انصار واقعہً آپ کو دعوت دے رہے ہیں۔

پھر آنحضور ﷺ کے تشریف لیجانے کے بعد ان انصار نے جس جاں نثاری کا ثبوت پیش کیا وہ نہ صرف یہ کہ اپنے وعدے کا ایفاء تھا بلکہ اس سے بھی کچھ سبقت تھی گواہل مکہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ کاشتکار ہمارا کیا مقابلہ کریں گے، لیکن پیغمبر علیہ السلام کی نگاہ کیمیا اثر نے انہیں مقتدائے جہاں بنا دیا، اور ان ہی حضرات کی قربانیوں سے مدینہ میں آ کر اسلام کو فروغ ہوا، اسی لئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

ان الانصار کرشی و عیبسی (مسلم جلد ۲ ص ۳۰۵) انصار میرا معدہ اور جامہ دان ہیں۔

انصار میرا جامہ دان اور معدہ ہیں، معدہ میں غذا پکتی ہے اور ایک جگہ ارشاد ہے۔

الانصار شعار والناس دثار
(مسند احمد جلد ۴ ص ۴۱۹)
انصار کی حیثیت جسم کے اندرونی کپڑے کی ہے
اور لوگوں کی بیرونی کپڑے کی

آپ نے انصار کے بارے میں ایک بار فرمایا۔

لوسلك الناس واديا وسلكت الانصار واديا
اوشعبا لسلكت وادى الانصار اوشعب
الانصار (بخاری کتاب التمنی ص ۱۰۷۶)
اگر لوگ ایک وادی میں چلیں اور انصار
دوسری وادی یا گھاٹی میں چلیں تو میں انصار
کی وادی میں یا گھاٹی میں چلوں گا۔

رہا مہاجرین کا معاملہ وہ الچی جگہ بہت افضل ہیں، ظاہر ہے کہ انہوں نے اسلام کے لئے وطن تک چھوڑ دیا
اموال املاک کو تھوڑا دیا، تمام آرائش و آسائش سے روگردانی کی، خود ہجرت ہی کی اتنی فضیلت ہے کہ دوسری تمام فضیلتیں
اس کے مقابل نہیں آسکتیں، آپ نے ارشاد فرمایا:

لولا الهجرة لكنت امرء من

اگر ہجرت (کی فضیلت) نہ ہوتی تو میں

اپنا شمار انصار میں کراتا۔

الانصار (بخاری جلد ۱ ص ۵۳۳)

اس لئے اتنی قربانیاں دینے والوں کے بارے میں تو کلام ہی نہیں ہو سکتا، پھر یہ بھی کہ مہاجرین بیشتر خانوادہ

نبوی سے ہیں اسلئے انکی محبت میں کوئی خفا ہی نہیں ہو سکتا البتہ انصار کے متعلق غیریت کا خیال کیا جاسکتا تھا، اسلئے آپ نے ارشاد فرمادیا کہ انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ انصار سے بغض اور محبت دونوں کے بارے میں ان کی شان نصرت کا فرما ہے۔

[۱۱] بَاب

(۱۸) حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبُو إِدْرِيسَ عَائِدُ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ عِبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا وَهُوَ أَحَدُ النَّبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ وَحَوْلَهُ عِصَابَةٌ مِنْ أَصْحَابِهِ بَايَعُونِي عَلَى أَنْ لَا تُشْرِكُوا بِاللَّهِ شَيْئًا وَلَا تُسْرِقُوا وَلَا تُزْنُوا وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ وَلَا تَأْتُوا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُونَهُ بَيْنَ أَيْدِيكُمْ وَأَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوا فِي مَعْرُوفٍ فَمَنْ وَفَى مِنْكُمْ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا فَعُوقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهُ وَمَنْ أَصَابَ مِنْ ذَلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللَّهُ فَهُوَ إِلَى اللَّهِ إِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ فَبَايَعَنَا عَلَى ذَلِكَ .

(آئندہ: ۳۸۹۲، ۳۸۹۳، ۳۹۹۹، ۳۸۹۴، ۶۷۸۴، ۶۸۰۱، ۶۸۴۳، ۶۸۵۵، ۷۰۵۵، ۷۱۹۹، ۷۲۱۳، ۷۲۶۸)

ترجمہ | باب، حضرت عبادہ بن صامتؓ نے جو بدر میں شریک تھے اور لیلۃ العقبۃ کے نقیبوں میں سے ایک تھے بتلایا کہ رسول اکرم ﷺ نے صحابہؓ کی ایک جماعت کے درمیان فرمایا تم مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ گے اور چوری نہ کرو گے اور زنا نہ کرو گے اور اپنے اولاد کو قتل نہ کرو گے اور بہتان تراشی نہ کرو گے جسے تم اپنے ہاتھوں اور پیروں کے درمیان گھرو اور نیک کاموں میں نافرمانی نہ کرو گے پھر تم میں سے جو شخص اپنا پیمان پورا کر دے اس کا اجر اللہ پر ہے اور اگر کوئی ان باتوں میں سے کوئی حرکت کر بیٹھے اور پھر اسی دنیا میں اسے سزا بھی مل جائے تو یہ اس کے لئے کفارہ ہو گیا اور اگر کوئی (شرک کے علاوہ) ان چیزوں میں سے کوئی حرکت کر بیٹھے پھر اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی فرمائے تو اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادے خواہ سزا دے، حضرت عبادہؓ نے فرمایا کہ ہم نے ان باتوں پر آپ سے بیعت کی۔

باب کا مقصد | امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں صرف باب لکھا ہے اور کوئی ترجمہ منعقد نہیں فرمایا، بلکہ بعض نسخوں میں تو باب بھی نہیں ہے، اگر اس دوسرے نسخے کو لیں تو ترجمہ تلاش کرنے کی ضرورت ہی نہیں، البتہ اگر اس نسخہ کو لیں جس میں باب موجود ہے تو دیکھنا یہ ہوگا کہ مصنف نے خلاف عادت ترجمہ کیوں منعقد نہیں فرمایا، حالانکہ مقصد ترجمہ ہی سے معلوم ہوتا ہے، یہ پہلا موقع ہے ایسے مواقع پر مختلف چیزیں ذکر کی جاتی ہیں، مثلاً بعض

حضرات یہ کہتے ہیں کہ ارادہ تھا مگر تکمیل سے قبل وفات ہو گئی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ مصنف نے پہلے احادیث لکھیں اور پھر تراجم قائم کئے ہیں، اور چونکہ یہ عنوانات بعد کی چیزیں ہیں اسلئے بہت سے حصے پر قائم ہو گئے لیکن کچھ حصہ ایسا بھی رہ گیا جس پر تراجم قائم کرنے کی نوبت نہ آسکی۔

یہ بات معقول ہوتی اگر ایسے تمام ابواب جن پر تراجم نہیں، آخر میں ہوتے لیکن یہاں معاملہ یہ ہے کہ کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں بلا ترجمہ کے کچھ ابواب مذکور نہ ہوں اسلئے یہ توجیہ درست نہیں معلوم ہوتی۔

بعض حضرات نے کہا کہ خود مؤلف نے تو تراجم رکھے تھے مگر ناقلین سے رہ گئے، اور بعض حضرات نے کہا کہ یہ امام کا سہو ہے کیونکہ یہ کتاب، دور تالیف میں امام نے اس طرح نہیں لکھی تھی جس طرح ہمارے سامنے موجود ہے بلکہ احادیث مختلف اوراق پر لکھی ہوئی تھیں امام ایک ایک ورق اٹھا کر تراجم قائم فرماتے جاتے تھے ایسی صورت میں ممکن ہے کہ ورق الٹ جائے اور کوئی حدیث نظر سے چوک جائے لیکن یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔

ناقلین سے چھوٹنے کا کوئی احتمال نہیں کیونکہ نقل مسلسل ہو رہی ہے، بار بار ہو رہی ہے اور مصنف کی حیات میں ہو رہی ہے، نیز امام پر سہو کا الزام بھی امام کی جلالت شان سے بے خبری کی دلیل ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ایسے ایسے سہو مؤلف کو بہت ہوئے ایک دو جگہ سہو ہو جائے تو خیر کوئی بات نہیں لیکن جگہ جگہ بھولنے والا انسان کس طرح قابل اعتماد ہو سکتا ہے، جو ترجمہ منعقد کرنا بھول سکتا ہے، وہ حدیث بھی بھول سکتا ہے، پھر نقل میں غلطی یا امام سے سہو کا احتمال اس لئے ختم ہو جاتا ہے کہ کتاب کی تالیف کے بعد امام سے نوے ہزار طلبہ نے اس کتاب کو سنا ہے۔ کیا اس نوے ہزار کی غیر معمولی تعداد کی تعلیم کے دوران کبھی نظر ثانی کی نوبت نہیں آئی کہ فروگزاشتوں کی اصلاح ہو جاتی، اسلئے ماننا پڑے گا کہ نہ امام کی وفات کا عذر درست ہے، نہ ناقلین کی طرف غلطی کا انتساب قابل قبول ہے اور نہ امام کی طرف سہو کی نسبت ہی قابل فہم ہے۔

سچ یہ ہے کہ بعض مقامات پر دانستہ امام نے تراجم منعقد نہیں فرمائے ہیں جسکے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ حدیث کا تعلق باب سابق سے ہے لیکن ایک جدید امر کا بھی افادہ ہو رہا ہے اگرچہ وہ مستقل چیز نہیں ہے، ایسی صورت میں انعقاد باب کے بعد ترجمہ منعقد نہ کرنے کا یہ مفہوم ہے کہ ابھی پہلا مضمون بھی ختم نہیں ہوا ہے اور اسی سے ایک اور بات بھی اخذ کی جاسکتی ہے جس پر لفظ باب سے تشبیہ کی جا رہی ہے جیسے استاد پڑھاتے پڑھاتے نئی چیز پر متوجہ

حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے اس موقع پر ارشاد فرمایا کہ جب حضرت علامہ کشمیری دارالعلوم تشریف لائے تو ہدایہ آخرین ان سے متعلق کی گئی، حضرت علامہ کی زبان پر بلا ساختہ عربی کے الفاظ آجاتے تھے حتیٰ کہ جلد تو طلبہ کو مناسبت بھی نہ ہو پاتی تھی ان دنوں علامہ کشمیری درس دیتے دیتے فرمایا کرتے تھے تنبیہ اس عنوان سے فراغت کے بعد فرماتے فرغ اور پھر فروعات کا بیان شروع ہوتا، حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے مثال میں یہ سہو کا لفظ حضرت علامہ رحمہ اللہ کے اس انداز تدریس سے لیا ہے۔ ۱۲

کرنے کے لئے تنبیہ کہہ دیتا ہے امام بخاریؒ بھی باب کو تنبیہ کی جگہ استعمال کرتے ہیں کہ دیکھو یہ نئی چیز ہے اور توجہ رہنی چاہئے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی بعض تراجم کے متعلق یہی فرمایا ہے، اور بعض تراجم کے متعلق فرمایا ہے کہ از قبیلہ ”باب فی الباب“ ہیں، ایسی صورت میں ضروری ہے کہ باب کے تحت ذکر کردہ حدیث سابق باب یا حدیث سے بھی متعلق رہے اور ان دونوں میں کوئی امر فاصل بھی رہے، حافظ ابن حجر رحمہ اللہ اور قسطلانی رحمہ اللہ باتباع حافظ اکثر مقامات پر کالفصل من الباب السابق فرماتے ہیں، یعنی یہ بالکل الگ بھی نہیں اور بالکل متحد بھی نہیں۔ حضرت شیخ الہند فرماتے تھے کہ حافظ کا ہر موقعہ پر کالفصل کہہ دینا صحیح نہیں ہے جہاں ترجمہ کا حدیث سابق سے ارتباط ظاہر ہو وہاں تو یہ درست ہے لیکن اگر تعلق نہ ہو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ امام تضحید الافہان ایسا کر رہے ہیں، شہد تیز کرنا یعنی چند ابواب کو تراجم کیساتھ ذکر کر کے جو اس باب کو بلا ترجمہ لاتے ہیں اس کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ جس طرح میں نے تراجم رکھے ہیں اس طرح تم بھی ان کی روشنی میں طبیعت پر زور ڈال کر ترجمہ لگانے کی کوشش کرو، یہ تضحید اذہان امام بخاری کی شان کے مناسب بھی ہے کیونکہ آگے ترجمہ رکھیں گے کہ معلم کو وقتاً فوقتاً طلبہ کا امتحان لیتے رہنا چاہئے تاکہ طالب علم غفلت نہ برتے اور استاد کو بھی طالب علم کی استعداد کا پتہ رہے اور ظرف و استعداد کی مطابق تعلیم دی جاسکے۔

یہ باب کالفصل من الباب السابق بھی ہو سکتا ہے اور تضحید اذہان کے لئے بھی ہو سکتا ہے، باب سابق سے تعلق تو ظاہر ہے کیونکہ وہاں علامۃ الایمان حب الانصار کہا گیا تھا اور یہاں انصار کی وجہ تسمیہ بتادی، یہاں بعض لوگوں نے یہی کہا ہے کہ سابق ابواب میں ایمان ہی کے متعلقات و اجزاء کا ذکر تھا کہیں اجزاء مکملہ کا اور کہیں اجزاء تزییہ کا، اور اس حدیث میں ایمان کا ذکر ہی نہیں ہے بلکہ انصار کی وجہ تسمیہ مذکور ہے اسلئے اسے باب سابق سے متعلق ہی کہا جاسکتا ہے لیکن قطعی طور سے یہ کہنا کہ اس حدیث میں ایمان کا ذکر نہیں درست نہیں ہے کیونکہ بایعونی سے آخر حدیث تک ایسی چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ایمان کے لئے مضر ہیں، یہ تو پہلے معلوم ہو چکا کہ مرجیہ اعمال کو فعلاً و ترکاً غیر ضروری قرار دیتے ہیں نیز یہ بھی کہ بیشتر ابواب میں امام بخاری کا مطمح نظر مرجیہ کی تردید ہے اور اس روایت میں موجود ہے لانسرفوا یعنی چوری کرنا ایمان کو مضہل کر دیتا ہے اور اس کے بعد قتل اولاد، زنا کاری، بہتان بندی سے روکا، معلوم ہوا کہ یہ سب بری باتیں ہیں اور سب ایک ہی خط پر ہیں ان کا جائز سمجھنا کفر ہے، اس سے صاف طریقہ پر مرجیہ کی تردید ہو رہی ہے کہ منہیات کو ایمان کے لئے مضر نہ سمجھنا رسول اکرم ﷺ کی بیعت کے خلاف ہے، اسی تردید کے لئے یہاں ہر ہر جز ترجمہ بن سکتا ہے مثلاً ترک القتل من الایمان اور الاجتناب عن القتل من الایمان اور من الایمان ترک البہتان وغیرہ، رہا ان ایمانیات کے باوجود ترجمہ منعقد نہ کرنا یہ محض تضحید اذہان کے لئے ہے گویا یہ اس بات پر تنبیہ ہے کہ دیکھو اس حدیث میں ایسی متعدد چیزیں ہیں جن کا چھوڑنا ایمان میں داخل ہے اور جن کے اختیار کرنے سے ایمان کمزور ہوتا ہے ان کو عقیدہ جائز سمجھنا کفر ہے، اب تمہیں اختیار ہے کہ جس جز کے متعلق چاہو ترجمہ رکھ لو۔

کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ امام ترجمہ اس لئے منعقد نہیں کرتے کہ حدیث میں متعدد فوائد ہوتے ہیں امام چاہتے ہیں کہ ترجمہ ذکر کر کے حدیث کو کسی ایک فائدہ پر منحصر نہ کر دیں بلکہ جس قدر بھی فوائد حاصل ہو رہے ہیں ان سب کی گنجائش رہے، امام بخاری کی روش تو معلوم ہی ہے کہ وہ فرق باطلہ کا رد کرنا چاہتے ہیں، ان فرق میں پہلا نمبر مرجیہ کا ہے اور دوسرا نمبر خوارج معتزلہ کا، امام رحمہ اللہ نے ایک ایسی روایت پیش فرمادی جس میں مرجیہ کرامیہ اور خوارج، معتزلہ سب ہی کی تردید ہو سکتی ہے، یعنی اس روایت سے سمجھ میں آتا ہے کہ اعمال، ایمان کے اندر مطلوب ہیں نیز یہ کہ اعمال کی جزئیات اس درجہ کی بھی نہیں ہے جس کا دعویٰ معتزلہ و خوارج نے کیا ہے کیونکہ ارشاد ہے:

جو شخص ان چیزوں میں سے کسی کا مرتکب ہو پھر اللہ تعالیٰ اسکی پردہ پوشی فرمائیں، تو اسکا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادے خواہ سزا دے۔

من اصاب من ذلك شيئا ثم ستره
الله فهو الى الله ان شاء عفا عنه
وان شاء عاقبه .

یعنی گناہ کرنے سے مومن ایمان سے خارج نہیں ہو جاتا بلکہ گناہ کے باوجود بھی مغفرت کا معاملہ خداوند تعالیٰ کی مشیت کے تحت رہتا ہے اور اگر خدا کی رحمت دستگیری فرمائے تو معافی بھی ہو سکتی ہے۔

تشریح حدیث | انصار مدینہ، مدینہ کے باشندے نہ تھے بلکہ انہیں بنو قیلہ کہا جاتا تھا، جب سبا پر تباہی آئی تو ایک کاہنہ نے اطلاع دی کہ عنقریب ایک عذاب آنے والا ہے اور اگر تم اپنی حفاظت چاہتے ہو تو یہاں سے نکل جاؤ چنانچہ قبیلہ سبا کے لوگ اور یہ بنو قیلہ ادھر ادھر منتشر ہو گئے، کچھ لوگ شام میں جا ٹھہرے اور اوس دخرج مدینہ میں اقامت پذیر ہو گئے، اس وقت مدینہ پر یہود کا تسلط تھا، اور ان میں بنو قیقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ سربراہ تھے بنو قیقاع لہاری کا پیشہ کرتے تھے اور یہ ان سب میں بہادر تھے، انکو اپنی تیغ زنی پر اعتماد تھا، جب قبیلہ اوس دخرج نے چاہا کہ انہیں مدینہ میں اقامت کی اجازت دی جائے (اور بعض ضعیف روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نبی آخر الزماں کا مہاجر (ہجرت کی جگہ) مدینہ ہوگا) تو ان معسطل اقوام نے یہ شرط لگادی کہ اس طرح تم یہاں اقامت کر سکتے ہو کہ جب بھی تمہارے یہاں کوئی شادی ہو دلہن کو پہلی رات میں ہمارے یہاں بھیجنا ہوگا، ان لوگوں نے یہ شرط قبول کر لی لیکن واقعہ یہ پیش آیا کہ جب شادی ہوئی تو عورت منہ کھول کر مجمع کے سامنے آگئی مجمع میں اس کے بھائی بھتیجے اور دوسرے اعزاء موجود تھے، ان لوگوں نے عورت کو عار دلائی کہ اس بے حجابی پر تجھے شرم نہیں آتی، عورت نے کہا کہ تمہیں ڈوب مرنا چاہئے کہ مجھے غیر شوہر کے سپرد کرنے پر رضامند ہو۔

بات تیر کی طرح لگی، جذبات مشتعل ہو گئے اور ان کمزور لوگوں نے بھی تیاری شروع کر دی، جنگ ہوئی لیکن اقتدار کسی کی میراث نہیں ہے خداوند قدوس نے یہود کو پسپا کر دیا یہود مغلوب ہو گئے تو اوس دخرج سے کہا کرتے تھے کہ ہمیں تمہاری اس تعدی کے جواب کیلئے نبی آخر الزماں کا انتظار ہے، انکے ظہور کے بعد ہم تمہاری ان حرکات کا جواب

دیں گے، یہود کے اس طعنہ سے اوس و خزرج بھی آنحضرت ﷺ کے لئے چشم براہ تھے، موسم حج میں جب ان حضرات کے کانوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی اطلاع پہنچی اور آپ کی جانب سے ان لوگوں کو دعوت بھی دی گئی تو انہوں نے فوراً اسے قبول کر لیا تاکہ یہود سے پیچھے نہ رہ جائیں، اور پھر ایمان قبول کرنے کے بعد جو زریں خدمات ان لوگوں نے انجام دیں وہ تاریخ کے صفحات میں دنیا کے سب سے بڑے انقلاب کے نام سے محفوظ ہیں، انہیں خدمات کے صلہ میں آنحضرت ﷺ نے ان کا نام بنو قیلہ سے انصار تجویز فرمایا اور اسی لئے علامۃ الایمان حب الانصار ارشاد فرمایا، حضرت عبادہ بن صامت کا بیان ہے کہ جو اپنی دو خصوصیتوں کی بنا پر اسلام میں بہت ممتاز ہیں ایک تو یہ کہ انہیں بدر میں حاضری میسر آئی جو بڑی فضیلت ہے، اہل بدر کی مغفرت کے متعلق قرآن نے بھی اعلان کر دیا ہے، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ حضرت عبادہ ان نقیبوں میں سے ایک ہیں جو لیلۃ العقبہ میں پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر تھے یعنی حج کا زمانہ آیا اور انصار کے کچھ لوگ حج کیلئے مکہ پہنچے تو آنحضرت ﷺ تبلیغ کی غرض سے ان لوگوں کے پاس تشریف لائے، ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارے چند آدمی باہر گئے ہوئے ہیں ہم لوگ ان کے آنے کے بعد مشورہ کر لیں، آپ رات میں تشریف لائیں مشورہ میں طے پایا کہ اس موقع کو غنیمت سمجھو، معلوم ہوتا ہے یہ وہ ہی پیغمبر ہیں کہ جن کے ساتھ مل کر یہود ہمیں استیصال کی دھمکی دیتے ہیں چنانچہ جب رات کو آپ تشریف لے گئے تو ان لوگوں نے دعوت قبول کر لی۔

حضرت عبادہ کی ان خصوصیات سے یہ معلوم ہو گیا کہ بیان معمولی شخص کا نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسے شخص کا ہے جو ہر طرح قابل استناد ہے، فرماتے ہیں کہ لیلۃ العقبہ میں پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ تم مجھ سے ان چیزوں کے ترک پر بیعت کرو، پہلی بات تو یہ ہے کہ تم خدا کے ساتھ شریک نہ ٹھہراؤ گے اس شرک کی نفی میں شرک فی الذات شرک فی الصفات اور شرک فی العبادات سب ہی آجاتے ہیں، اس بات پر بیعت کرو کہ زنا نہ کرو گے، اولاد کو قتل نہ کرو گے، بہتان تراشی نہ کرو گے، بہتان وہ جھوٹ ہے جس کی کوئی اصلیت نہ ہو، صرف ہاتھ پیر کے درمیان ایک چیز بنا دی گئی ہو بین ایدیکم وارجلکم دل سے کنایہ ہے یعنی دل نے ایک بے حقیقت بات گھڑ لی اور بعض حضرات نے بین ایدیکم وارجلکم کے معنی زنا کے لئے ہیں یعنی زنا کے ذریعہ عورت نے اولاد حاصل کی اور شوہر کے ذمہ لگادی، اس طرح ایک منکوحہ کے بطن سے پیدا شدہ انسان کے متعلق حرامی ہونے کا بہتان لگا دینا بھی اس میں داخل ہے۔

آگے فرماتے ہیں کہ یہ تو چند چیزیں بتا دی گئی ہیں اصولی بات یہ ہے کہ لا تعصوا فی معروف کسی بھلی بات میں نافرمانی کی گنجائش نہیں ہے لا طاعة لمخلوق فی معصیۃ اللہ اطاعت ہمیشہ معروف میں ہوگی، معروف ہر وہ چیز ہے جو شریعت کی نگاہ میں جانا پہچانا ہو اور منکروہ ہے جو شریعت میں جانا پہچانا نہ ہو، فمن ولی منکم فاجره علی اللہ اگر کسی نے ان باتوں کو پورا کر دیا تو اس کا ثواب خدا کے ذمہ ہے یعنی خداوند قدوس نے اپنے کرم سے اہل

طاعت کے لئے ایک وعدہ فرمایا ہے اور چونکہ کریم کا وعدہ پورا ہوتا ہے اسلئے اس کی تعبیر علی کے ذریعہ کی گئی ہے یعنی خدا نے اپنے ذمہ لے لیا ہے کہ اگر کوئی پابندی کریگا تو اسے اجر دیں گے اور کوئی شخص اگر امور مذکورہ میں سے کسی کا مرتکب ہو گیا اور پھر اس کو سزا بھی دیدی گئی تو وہ دنیاوی حیثیت سے بدلہ ہو جائے گا اور اگر کسی شخص نے جرم کا ارتکاب کیا مگر خدا تعالیٰ نے پردہ ڈھکا رکھا تو معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادے خواہ سزا دے یعنی یہ خیال نہ کیا جائے کہ جب خدا نے دنیا میں پردہ ڈھکا رکھا ہے تو وہ آخرت میں بھی ایسا ہی کریگا بلکہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ معاف فرمادے خواہ سزا دے، کفار یہی کہا کرتے تھے کہ اگر خدا ہم سے ناراض ہوتا تو ہمارے گناہوں کی سزا دیتا، کوئی کہتا کہ کریم جب کسی کو انعامات سے نوازتا ہے تو کمی نہیں کرتا بلکہ بڑھاتا ہی چلا جاتا ہے اس لئے اکرم الاکرین سے یہ امید نہیں ہو سکتی کہ وہ یہاں تو انعامات کی بارش کرے اور قیامت میں یکسر محروم کر دے، اسی قسم کے باطل خیالات کی تردید کیلئے فرمایا گیا کہ معاملہ اس کے قبضہ میں ہے معاف بھی کر سکتا ہے اور سزا بھی دے سکتا ہے۔

یہاں ایک مسئلہ حدود کے کفارہ ہونے اور نہ ہونے کا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ احناف اور شوافع کا مختلف فیہ مسئلہ ہے، شوافع کا خیال ہے کہ حدود میں کفارہ ہونے کی شان

حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟

ہے یعنی اقامت حد کے بعد جرم، دنیا اور آخرت دونوں میں ڈھک جاتا ہے یعنی ظاہر اور باطناً معاملہ صاف ہو جاتا ہے احناف کہتے ہیں کہ حد کا منشاء یہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں، بلکہ اگر مجرم کو سزا مل گئی تو دنیوی جرم ختم ہو گیا، اب زانی کو ”یا زانی“ کہہ کر پکارنا رو نہیں ہے، رہا آخرت کے مواخذہ کا سوال اس کا ختم ہو جانا یقینی نہیں ہے بلکہ اخروی مواخذہ کو ختم کرنے کے لئے صدق دل سے توبہ کرنا ضروری ہے گویا شوافع کے نزدیک حد ہی توبہ کا قائم مقام ہے اور احناف حد کے بعد بھی توبہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، حضرات شوافع کے پاس استدلال میں ایک تو یہ حدیث ”فہو کفارة له ہے اور دوسری دلیل قتل خطا کے بارے میں ایک آیت:

متواتر دو ماہ کے روزے ہیں بطریق توبہ کے

فصیام شہرین متابعین توبہ

جو اللہ کی طرف سے مقرر ہوئی ہے۔

من اللہ (پ ۵ ع ۱۰)

یعنی روزے رکھنا ہی توبہ ہے گویا صراحت کے ساتھ آیت نے یہ بتلا دیا کہ حدود میں گناہ کی گندگی کو صاف کر دینے کی صلاحیت موجود ہے پھر یہ کہ حدیث شریف میں اس شخص سے تقابل کیا گیا ہے جس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے خواہ معاف کر دے خواہ سزا دے، اس تقابل سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ جس شخص کو سزا دیدی گئی وہ بری ہو گیا، حنفیہ کا مشہور قول در مختار میں ہے کہ حدود جرم کے لئے ہیں ستر کے لئے نہیں ہیں، لوگوں کو بری باتوں سے روکنا مقصود ہے تاکہ مفاسد کا سدباب ہو جائے اور ان اخلاقی جرائم پر پابندی لگ جائے جو بد امنی کا پیش خیمہ ہوا کرتے ہیں اور چونکہ قیام امن حد کا مقصد ہے جس کا تعلق صرف دنیوی امور سے ہے، آخرت کے معاملات سے اس کا کوئی جوڑ نہیں، فرمایا گیا ہے:

ولکم فی القصاص حیوة (پ ۶۷) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے۔
یعنی اگر قصاص جاری رہا اور لوگ عبرت کی نگاہ سے قاتلین کا حال دیکھتے رہے تو اس گناہ سے اجتناب کریں گے تو مقصد ہے نظام کا درستگی سے چلانا اور بد امنی سے روکنا، جب مقصد محض زجر ہے تو اسے قلب کی تطہیر کا ذریعہ نہیں کہہ سکتے صرف اتنا فائدہ ہے کہ اب دنیا میں اسے اس لقب سے نہیں پکار سکتے، ایک شخص کے حد لگائی گئی لوگوں نے اسے ملامت شروع کی تو آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا:

لا تعینوا علیہ الشیطان شیطان کو اسکے خلاف مدد نہ پہنچاؤ۔

یہ معاملہ صرف ظاہر کا ہے، رہا باطن کا معاملہ وہ اللہ کے سپرد ہے، صرف اقامت حد سے وہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، زانی کو سزا ہو جاتی ہے مگر پھر اسی جرم کا ارتکاب کر لیتا ہے، معلوم ہوا کہ حد لگنے سے تطہیر کا ہو جانا ضروری نہیں بلکہ اسکی صورت یہ ہے کہ انسان اپنے فعل پر ندامت کا اظہار کرے اور اس فعل سے الگ ہو کر آئندہ کے لئے الگ رہنے کا عہد کرے، البتہ اگر ایسی صورت ہے کہ توبہ ہی اقامت حد کا پیش خیمہ ہے یعنی گناہ کے بعد ندامت ہوئی اور اس کے نتیجہ میں خود اس نے گناہ کا اعتراف کر کے حد جاری کرائی ہے تو اس کے معاملہ کی صفائی میں تو کوئی اشتباہ ہی نہیں ہے اور اگر ایسا ہوا ہے کہ جرم چھپ کر رہا تھا اور پکڑا گیا حد قائم ہو گئی تو اس کے لئے حد کے ساتھ توبہ اور ندامت کی بھی ضرورت ہے۔

حضرت ماعز سلمیٰ نے اقرار کیا، رسول اکرم ﷺ ٹالتے رہے، بار بار احتمال پیدا فرماتے لیکن حضرت ماعز اپنے اقرار پر پختہ رہے، آپ نے حد جاری فرمادی، اس کے بعد کسی نے حضرت ماعز کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کئے تو آپ نے تنبیہ فرمائی کہ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ انہوں نے جان دیدی، امرأۃ غامدیہ نے زنا کا اقرار کیا جب بات پوری طرح ثابت ہو گئی، تو آپ نے فرمایا کہ حاملہ کو رجم نہیں کیا جاسکتا، ولادت کے بعد آنا، موقعہ تھا، کہ گھر میں بیٹھ جاتیں، کسی اور جگہ چلی جاتیں لیکن ولادت کے بعد پھر خدمت میں حاضر ہوئیں کہ حضور! پاک فرما دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا مرضہ کو رجم نہیں کیا جاسکتا، جب بچہ کھانے لگے تب آنا یہ سکر واپس آگئیں اور کوشش کی کہ بچہ جلد نکلے کھانے لگے اور جب دوبارہ آئیں تو بچہ کے ہاتھ میں نکلے تھا عرض کیا حضور! بچہ نکلے کھانے لگا ہے، بچہ دوسرے کو دیدیا گیا اور رجم کر دیا گیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اسنے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر تمام اہل مدینہ پر تقسیم ہو جائے تو کافی ہو اور رجم کے وقت انہوں نے کہا کہ میں ماعز نہیں ہوں، حضرت ماعز کا واقعہ یہ ہے کہ رجم کے وقت جب تکلیف ہوئی تو بھاگنے لگے تھے ان دونوں موقعوں پر توبہ ہی اقامت حد کا سبب بنی ہے، اسکے کفارہ ہونے میں کوئی اشتباہ نہیں ہے لیکن ایک ایسا شخص جو چھپا کر جرم کر رہا ہو لیکن پکڑا جائے اور بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے اور اس پر حد جاری کی جائے، ایسی صورت میں سوال پیدا ہوگا کہ اس شخص پر جو حد جاری کی گئی ہے وہ کفارہ ہے یا نہیں کیونکہ بعض حضرات جرم کی اہمیت محسوس کرتے ہیں، اور بعض نہیں کرتے، جو لوگ جرم کی اہمیت محسوس نہیں کرتے انکے لئے صرف حد کا قائم

ہو جانا کافی نہ ہوگا بلکہ توبہ اور ندامت کی ضرورت ہے، ایک شخص حاضر ہو کر عرض کرتا ہے حضور مجھے پاک فرما دیجئے، جرم تقبیل اجنبیہ کا ہے سمجھ رہا ہے کہ اجنبیہ کی تقبیل زنا کے برابر ہے، حدیث شریف میں ہے۔

کتب علی بن آدم نصیبه من الزنا مدرک
ذلك لامحالة العينان زناهما النظر و
الاذنان زناهما الاستماع واللسان زنا
الكلام واليد زناها البطش والرجل زناها
الخطى والقلب يهوى ويتمنى ويصدق
ذلك الفرج ويكذبه (مسلم جلد ۲ ص ۳۲۶)

انسان پر زنا کا حصہ مقرر ہو چکا ہے جس کو وہ ضرور
ہی پہنچنے والا ہے، آنکھوں کا زنا دیکھنا ہے اور
کانوں کا زنا سننا ہے، زبان کا زنا گفتگو ہے اور
ہاتھ کا زنا گرفت ہے، پیروں کا زنا چلنا ہے، اور
دل خواہش اور تمنا کرتا ہے اور اس کی
تصدیق اور تکذیب فرج کر دیتی ہے،

یہ شخص گھبرایا ہوا آیا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم ہمارے ساتھ نماز پڑھو، نماز کے بعد آپ نے فرمایا، کہاں ہے وہ شخص؟ عرض کرتا ہے حاضر ہوں، فرماتے ہیں معاف، یہ مثالیں گناہ کے بعد اہمیت محسوس کر کے توبہ کے بعد اقامت حد کی ہیں، ان میں کفارہ دراصل وہی توبہ بن رہی ہے جس نے اقامت حد کا داعیہ پیدا کیا اور اگر کسی نے توبہ نہیں کی بلکہ جرم کے ظہور پر حد لگادی گئی، تو اسکی حد محض انتظامی ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک ہر طرح کی حد مطہر ہے یعنی جس پر حد لگائی جائیگی وہ توبہ کے بغیر گناہوں سے پاک ہو جائیگا، جبکہ حنفیہ اسکو صرف انتظامی حیثیت دیتے ہیں، بس یہی نقطہ اختلاف ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مسخ فطرت انسان نے دابہ سے وطی کر لی تو دابہ کو جلا دیا جائے گا حالانکہ اس میں دابہ کا کوئی قصور نہیں ہے، لیکن یہ ایک انتظامی چیز ہے، اگر دابہ زندہ رہا تو لوگوں کے لئے خواہ مخواہ تذکرہ کا موجب بنے گا اور ممکن ہے کہ یہ تذکرہ لوگوں میں اس خبیث حرکت کا داعیہ پیدا کرے اسلئے اس کو جلا دینا ہی اچھا ہے۔

رہا آخرت کا معاملہ وہ سراسر دل اور توبہ سے متعلق ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ احناف کے پاس اس سلسلہ میں کوئی دلیل ہے یا نہیں، سب سے پہلے ہمیں آیات قرآنی پر نظر ڈالنی ہے آیت ہے

السارق والسارقة فاقطعوا
ایدیہما جزاء بما کسبا نکالا من اللہ
واللہ عزیز حکیم فمن تاب من بعد ظلمہ
واصلح فان اللہ يتوب علیہ ان
اللہ غفور رحیم (پ ۱۰ ع ۶)

چور مرد اور چور عورت پس کاٹو ہاتھ انکے سزا
ہے اسکی کہ کمایا، یہ عذاب ہے اللہ کی طرف سے
اور اللہ غالب و حکیم ہے، پھر جو توبہ کرے اپنے
ظلم کے بعد اور نیک چلن ہو جائے تو بیشک اللہ اسکی
توبہ قبول کرتا ہے بیشک اللہ غفور رحیم ہے۔

آیت کریمہ میں صاف ارشاد ہے نکالا من اللہ ظاہر ہے کہ زجر دنیوی احکام میں ہے اور بعد میں توبہ کا ذکر مستقل طور پر کیا گیا ہے اور فمن تاب من بعد ظلمہ ارشاد فرمایا گیا ہے، اگر صرف اقامت حد ہی معافی کے

لئے کافی ہے تو پھر توبہ کا ذکر کیا معنی رکھتا ہے، دوسری آیت میں ارشاد ہے:

انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ
ویسعون فی الارض فسادا ان
یقتلوا ویصلبوا ووتقطع ایدیہم
وارجلہم من خلاف او یمنفوا
من الارض ذلک لہم خزى فی
الدنیا ولہم فی الاخرۃ عذاب عظیم
الا الذین تابوا من قبل ان تقدروا
علیہم فاعلموا ان اللہ غفور رحیم
(پ ۹۷۶)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں
اور ملک میں فساد پھیلاتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ
قتل کئے جائیں یا سولی دئے جائیں یا ان کے ہاتھ
اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیئے جائیں یا
زمین سے نکال دئے جائیں، انکے لئے دنیا میں سخت
رسوائی ہے اور انکو آخرت میں عذاب عظیم ہوگا ہاں
مگر جو لوگ قبل اسکے کہ تم انکو گرفتار کرو توبہ کر لیں
تو جان لو کہ اللہ تعالیٰ بخش دیں گے مہربانی
فرمائیں گے۔

آیت کریمہ میں صرف سزا کے بعد وعدہ مغفرت نہیں ہے، اب یہ بات کہ معاملہ عنین کا ہے اور انکا
ارتداد روایت سے ثابت ہے، اب اگر یہاں یہ مسئلہ ہو کہ ارتداد کے بعد توبہ کر لی یعنی شرک سے باز آ گیا، تو احناف کی
بات کمزور ہے مگر جواب یہ ہے کہ قرآن کے عنوان سے ظاہر ہے کہ معاملہ مرتدین سے مخصوص نہیں ہے بلکہ آیت باغیوں
اور حکومت کے مخالفین کیلئے بھی ہے، فقہاء نے اسی آیت سے باغیوں اور حکومت کے مخالفین کا حکم مستنبط کیا ہے۔

اگر یحاربون سے ارتداد مراد ہے، تو یسعون سے بغاوت ہے جو قطع طریق کی صورت میں ہو یا حکومت
کے مقابل محاذ بنانے کی صورت میں، بہر کیف اس آیت میں بھی یہی ہے کہ توبہ کے بعد معاملہ صاف ہو جائے گا، اب
انہیں آیات کریمہ کی روشنی میں فعوقب فی الدینا کے معنی لیجئے اگر مومن کو دنیاوی عقاب ہو گیا تو دنیوی کفارہ بھی
ہو گیا یعنی دنیوی امور کے لئے یہ سزا پردہ بن گئی، آگے کا معاملہ کہ مغفرت ہوگی یا نہیں اس میں مذکور نہیں ہے، اس آیت
سے آخرت کی بات نکالنا اپنی رائے کا اتباع ہے جسے پہلے سے معین کر لیا ہے کفر کے معنی دراصل چھپانے کے ہیں کافر
کا شکار کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دانہ کوزمین میں چھپا دیتا ہے، قبر کو بھی کافر کہہ دیتے ہیں کیونکہ وہ مردہ کو چھپا لیتی ہے، مردہ
اس میں رکھے جانے کے بعد ختم نہیں ہو جاتا، رات کو بھی اسی لئے کافر کہتے ہیں کہ وہ تمام موجودات پر پردہ ڈال دیتی
ہے، موجودات کو معدوم نہیں کر دیتی، کافر کو بھی کافر اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ خداوند قدوس کے بیٹھا احسانات پر پردہ
ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، اسلئے فہو کفارة لہ میں احناف کے واسطے لغوی اعتبار سے بھی گنجائش ہے، ضروری نہیں کہ
کفارہ کے معنی مجوہی کئے جائیں پھر حدیث میں حد نہیں بلکہ عوقب فرمایا گیا ہے، عقاب عام ہے وہ حد کی صورت
میں بھی ہو سکتا ہے جو ایک تشریحی چیز ہے اور عقاب تکوینی بھی ہو سکتا ہے، مثلاً یہ کہ جرم کے بعد پینکڑوں، آلام و مصائب

آئے جن سے جرم کی مکافات ہوگئی، روایات میں آتا ہے کہ مومن کو جب تکلیف پہنچتی ہے تو گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اس معنی کے اعتبار سے بھی احناف کو چنداں دشوری نہیں اب اس کے مقابل حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت لا ادری هل الحدود كفارة ام لا (یعنی جلد اس ۱۸۴) پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس کو حاکم نے مستدرک میں بسند صحیح روایت کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے بھی جس کو صحیح مانا ہے، اس میں تصریح ہے کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ حدود کفارہ ہیں یا نہیں؟ حضرت ابو ہریرہؓ کے ہاں میں مشرف باسلام ہوئے ہیں اس لئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ روایت اس وقت کی ہے جب پیغمبر علیہ السلام کو کفارہ کے متعلق علم نہ تھا اور جب علم ہو گیا تو الحدود کفارہ فرمادیا، شوافع نے ایسا ہی کہا ہے لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، حنفیہ نے کہا کہ یہ روایت لیلہ العقبہ کی ہے اور وہ بیعت کا واقعہ کی زندگی کا ہے حافظ نے اس موقع پر کہا ہے کہ یہ واقعہ فتح مکہ کے موقع کا ہے گویا یہ بات حضرت ابو ہریرہؓ کے اسلام کے بعد کی ہے کیونکہ فتح مکہ ۸ھ کی بات ہے نیز یہ بھی مسلم ہے کہ راوی کا تقدم و تاخر روایت پر اثر انداز نہیں ہوتا، ہو سکتا ہے کہ روایت بالواسطہ کی ہو اور پھر بلا واسطہ بھی سن لیا ہو۔

علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ حافظ نے غور نہیں کیا اس میں ”عصابہ“ کا لفظ ہے جس کا اطلاق زیادہ سے زیادہ چالیس پر ہو سکتا ہے یعنی یہ لفظ بتلا رہا ہے کہ حاضرین کی تعداد کم تھی، علاوہ ازیں دوسری روایت میں اس موقع پر رھط کا لفظ ہے جس کا اطلاق دس اور کبھی کبھی بطور ندرت اس سے زائد پر ہوتا ہے، یہ الفاظ جو جماعت کی قلت پر دلالت کر رہے ہیں اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ یہ بیعت عقبہ ہے جو ہجرت سے قبل کی ہے، کیونکہ فتح مکہ کی بیعت میں تو ہزاروں انسانوں کی شرکت ہونی چاہئے کیونکہ اسلام اس وقت ترقی کر چکا تھا۔

حافظ فرماتے ہیں کہ بیعت عقبہ قبل الہجرۃ میں صرف یہ بات ہے کہ اسلام پر بیعت ہے اور اس میں ہے کہ تم میری اس طرح حفاظت کرو گے جیسا کہ باپ بچوں کی اور خاوند بیوی کی کرتا ہے لیکن علامہ عینیؒ نے کہیں سے اسی بیعت عقبہ قبل الہجرت میں بھی یہ الفاظ نکال لئے اور کہا کہ اس وقت آپ نے منکرات کی تفصیل فرمائی اور چونکہ معروف کی تفصیل اس وقت تک نہ آئی تھیں اس لئے معروف کے سلسلہ میں اجمال فرمایا، معلوم ہوا کہ بیعت عقبہ قبل الہجرت ہی مراد ہے۔

اب حافظ نے پلٹی کھائی اور اس طریق کو چھوڑ دیا، کیونکہ مناظرہ کا اصول ہے کہ اگر ایک طریق میں سقم آجائے تو دوسری راہ اختیار کرو، حافظ نے کہا کہ پیغمبر علیہ السلام نے بیعت میں جس چیز کا ذکر فرمایا ہے، یہ وہی ہے جو عورتوں سے بیعت کے وقت فرمائی گئی ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے،

اخذ علينا كما اخذ على النساء ہم سے انہیں چیزوں پر بیعت لی جن پر عورتوں سے لی تھی۔

(مسلم جلد ۲ ص ۷۳)

اور یہ واقعہ اس طرح صلح حدیبیہ کے بعد کا ہے کیونکہ یہ بیعت سورہ ممتحنہ کے نزول کے بعد ہے اور سورہ ممتحنہ کا

نزول صلح حدیبیہ کے بعد ہے اور بیعت آیت

اذا جاءك المؤمنات يبایعنك

(پ ۸۷۲۸)

جب آپ کے پاس مسلمان عورتیں بیعت کیلئے آویں،

کے بعد ہے، رہا حضرت عبادہؓ کی شرکت کا معاملہ تو وہ دونوں جگہ شریک ہیں اور انہوں نے بیعت عقبہ قبل
الہجرۃ کا ذکر اس لئے کیا تا کہ اپنا قدیم الاسلام ہونا ظاہر کر دیں اسلئے کہ قدیم الاسلام ہونا بڑی شرافت ہے، اس موقع
پر عقل حیران ہو جاتی ہے کہ آخر کیا راہ تلاش کی جائے لیکن علامہ علامہ ٹھہرے، جواب دیا کیا ضروری ہے کہ عقاب سے
حدود ہی مراد لیں، ہو سکتا ہے کہ مصائب مراد ہوں، نیز اخذ علینا کما اخذ علی النساء کا یہ ترجمہ کرنا بھی معین
نہیں ہے کہ جس وقت عورتوں سے بیعت لی اسی وقت ہم سے بھی لی بلکہ بیان واقعہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ہم سے قبل الہجرۃ
جن چیزوں پر بیعت لی گئی تھی یہ وہی چیزیں ہیں جن پر سورہ ممتحنہ کے بعد عورتوں سے بیعت لی گئی، رہا نزول آیات سے
قبل ان چیزوں پر بیعت لینا تو یہ کچھ مستبعد بات نہیں ہے، ہو سکتا ہے کہ آپ کے قلب اطہر پر ان چیزوں کا القاء پہلے ہی
کر دیا گیا ہو، ایسی متعدد مثالیں ملیں گی کہ آیت بعد میں نازل ہوئی اور پیغمبر علیہ السلام نے اس کے متعلق پہلے ہی ارشاد
فرمادیا نیز یہ کہ یہ واقعات آپ کی وفات کے بعد بیان ہو رہے ہیں، اسلئے ترتیب واقعات میں ایسا ہو جانا بہت حد تک
ممکن ہے جیسا کہ اب کسی متونی کے متعلق کہا جائے کہ اس نے مردوں سے بھی وہی کہا جو عورتوں سے کہا تھا، اس کا مفہوم
یہ ہرگز نہیں ہے کہ دونوں قول ایک ہی مجلس میں ہوئے ہیں، بہر کیف حضرت عبادہؓ کی یہ روایت شوافع کے مقصد کے
لئے رخص نہیں ہے، اس میں دوسری جانب کا بھی قوی احتمال ہے۔

اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ تکوینی حدود یعنی مصائب کفارہ بن سکتے ہیں تو تشریحی حدود بدرجہ اولیٰ کفارہ بن جائیں
گی لیکن حضرت شیخ الہند نے ارشاد فرمایا کہ تشریحی اور تکوینی حدود میں ایک بڑا فرق ہے کہ تشریحی حدود میں مجرم کو جرم کا
علم ہوتا ہے جبکہ تکوینی حدود میں جرم معلوم نہیں ہوتا بلکہ بندہ خدا کی رضا پر رضا مند ہو کر ان کو برداشت کرتا ہے اسلئے اللہ
تعالیٰ نے ان مصائب کو کفارہ سیات قرار دیا ہے اور اگر ان دلائل کو احناف کی پیش کردہ احادیث کی روشنی میں دیکھیں
تو استدلال کمزور ہو ہی جاتا ہے جبکہ اس سلسلے کی دوسری روایات بھی قطعی طور پر توبہ کو حد سے بالکل الگ بتلا رہی ہیں،
حدیث میں ایک عورت کا قصہ آتا ہے کہ وہ سامان مانگ کر لاتی تھی اور پھر انکار کر دیتی تھی، ایک بار چوری پکڑی گئی،
پیغمبر علیہ السلام کے گھر سے چادر چرائی، یہ عورت قبیلہ بنی مخزوم کی تھی، خاندان والوں کو ندامت ہوئی اور انہوں نے
حضرت اسامہؓ سے سفارش کیلئے کہا، حضرت اسامہؓ نے سفارش کی تو آپ کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور فرمایا۔

کیا تم اللہ کی حدود میں سفارش کر رہے ہو؟

أتشفع فی حد من حدود اللہ

(مسلم جلد ۲ ص ۶۴)

اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

لِقَامَةِ حَدِّ مَنْ حُدَّ مِنَ اللَّهِ خَيْرٌ

مِنَ الدِّينِ وَمَا فِيهَا

حدود اللہ میں سے کسی ایک کا بھی قائم کرنا،

دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے۔

اسکے بعد اس کا ہاتھ کاٹ دیا گیا، حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ اسکے بعد وہ ضرورت لیکر ہمارے پاس آتی تھی میں ضرورت کو پورا کرتی تھی، آگے ہے فحسنت تو بتھا (مسلم جلد ۱ ص ۶۴) پس اسکی توبہ اچھی رہی۔ ہاتھ کٹنے کا ذکر الگ ہے اور توبہ کا الگ، اسلئے احناف کے یہاں حد کے بعد توبہ کی ضرورت رہ جاتی ہے۔

طحاوی میں روایت موجود ہے کہ ایک چور آپ کی خدمت میں حاضر کیا گیا، اسکے پاس سامان نہ تھا، آپ نے اسکو مخاطب کر کے فرمایا ما اخالك سرقت (طحاوی جلد ۲ ص ۹۶) میرے خیال میں تم نے چوری نہیں کی لیکن اس نے عرض کیا بلی یا رسول اللہ (کیوں نہیں؟ یا رسول اللہ) چنانچہ آپ نے قطعید کا حکم دے دیا پھر آپ نے اس سے فرمایا۔

قُلْ اسْتَغْفِرُ اللَّهَ وَاتُوبُ اِلَيْهِ

یہ کہو کہ میں اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور اسکی

طرف رجوع کرتا ہوں

(طحاوی جلد ۲ ص ۹۶)

پھر آپ ﷺ نے خود ہی ارشاد فرمایا اللھم تب علیہ (اے اللہ اس کے توبہ قبول فرما لے) اگر خود ہی توبہ کے قائم مقام ہو جاتی تو آپ اسکو توبہ کا حکم نہ فرماتے اور نہ خود ہی اس کے لئے توبہ کی قبولیت کی دعا فرمانے کی ضرورت ہوتی۔

واللہ اعلم

[۱۲] بَابُ مِنَ الدِّينِ الْفِرَارُ مِنَ الْفِتَنِ

(۱۹) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ

عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي صَعْصَعَةَ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ أَنَّهُ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ

ﷺ يُوْشِكُ أَنْ يَكُونَ خَيْرَ مَالِ الْمُسْلِمِ غَنَمًا يَتَّبِعُ بِهَا شَعَفَ الْجِبَالِ وَمَوَاقِعَ الْقَطْرِ يَفِرُّ

(آئندہ: ۳۳۰۰، ۳۶۰۰، ۶۴۹۵، ۷۰۸۸)

بِدِينِهِ مِنَ الْفِتَنِ .

ترجمہ | باب، فتنوں سے دور بھاگنا دین میں داخل ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ وہ دن قریب ہے جب مسلمان کا سب سے بہتر مال ایسی بکریاں ہوں جنہیں لیکر وہ پہاڑ کی چوٹیوں یا پانی کی گرنے کی جگہوں پر چلا جائے تاکہ فتنوں سے اپنے دین کی حفاظت کر سکے۔

حل لغات | شَعَفٌ بفتح العين والشين جمع ہے، پہاڑ کی چوٹی کو کہتے ہیں اور قطر، قطرة کی جمع ہے بارش کو کہتے ہیں مواقع القطر بارش اترنے کی جگہ یعنی جنگل اور وادیاں۔

مقصد ترجمہ | امام بخاریؒ کا مقصد یہاں بھی مرجیہ کی تردید ہے یعنی مرجیہ کا یہ کہنا کہ ایمان پر کسی معصیت کا اثر نہیں ہوتا درست نہیں ہے، کیونکہ اگر یہ بات درست ہوتی تو فتنوں سے بھاگنے کی ضرورت نہ ہوتی حالانکہ روایت میں بہ صراحت مذکور ہے کہ فتنوں سے بھاگ کر ایسی جگہ پہنچنا بھی دین میں مطلوب ہے جہاں یہ فتنے ایمان پر اثر انداز نہ ہو سکیں، یہ چیز مطلوب ہے اور اس درجہ مطلوب ہے کہ اسے دین کا جزء اور شعبہ قرار دیا جاسکتا ہے، جو شخص دین کی قدر و قیمت جانتا ہوگا وہی اس کی حفاظت کی کوشش کریگا جب وہ دیکھے گا کہ جماعت کے ساتھ رہ کر دین کی حفاظت میں دقتیں پیش آرہی ہیں تو وہ فتنوں سے دین کو بچانے کی خاطر آبادی سے نکل جائیگا۔

فسرار من الفتن ان آزمائش کی چیزوں سے دور ہو جائیگی تعبیر ہے جو انسان پر وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہیں، جن سے انسان کی صداقت و استقامت کا اندازہ ہوتا ہے یعنی ان فتن میں رہتے ہوئے اسے دین کا کتنا خیال ہے، بیماری بھی ایک قسم کا فتنہ ہے اسمیں انسان کی دینی حمیت کا امتحان ہوتا ہے، مسافرت بھی ایک قسم کا ابتلاء ہے اس ابتلاء میں بہت سے لوگ اپنی دینی وضع بھی چھوڑ دیتے ہیں لیکن ایک دیندار انسان تمام پریشانیوں کو انگیز کرتا ہے اور دینی فرائض کی بہر کیف تکمیل کرتا ہے، اسی طرح ایک متدین انسان تکوینی مصائب کو بھی آزمائش اور ابتلاء تصور کرتا ہے، وہ سوچتا ہے کہ اگر اس ابتلاء کے موقع پر بھی میری جانب سے غفلت برتی گئی تو یہ مصیبت بالائے مصیبت ہو جائے گی کیونکہ غفلت ایک خطرناک چیز ہے۔

یہاں مفہوم یہ ہے کہ شہری زندگی و بال جان بنی ہوئی ہے، سمجھتا ہے کہ یہاں رہ کر میں دین کی حفاظت نہیں کر سکتا، ایک طرف ضروریات زندگی ہیں اور دوسری طرف ضروریات دین لیکن یہ انسان ضروریات دین کی خاطر تمام اسباب راحت کو تھج دیتا ہے اور حدیث شریف میں اسکو داخل دین بتلایا جا رہا ہے اسلئے واضح طور پر مرجیہ کی تردید ہوگئی یعنی نہ صرف یہ کہ ایمان میں اعمال مطلوب ہیں بلکہ ان اعمال کی حفاظت بھی مطلوب ہے جس طرح انسان ایمان کی خاطر تمام خواہشات کو ترک کرتا ہے، اسی طرح اعمال کی حفاظت کیلئے بھی ایسا ہی کرنا ہوگا، امام بخاریؒ کے نزدیک دین اور ایمان ایک ہی ہیں۔

بیشک دین اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور جو شخص اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کو طلب کریگا تو وہ اس سے مقبول نہ ہوگا۔

ان الدين عند الله الاسلام
ومن يتبع غير الاسلام دينا
فلن يقبل منه (پ ۳۷ ع ۱۷)

فرار کی اجازت اور اسکا حکم | حدیث میں ارشاد ہے کہ وہ وقت قریب آرہا ہے کہ جب مسلمان کا بہتر مال ایسی بکریاں ہوں گی جنکو لیکر وہ پہاڑ کی چوٹیوں اور جنگل بیابان میں چلا جائے گا یعنی پیغمبر علیہ السلام نے اخبار بالغیب کے طور پر یہ حالت بیان فرمائی کہ اسوقت فتنوں کی بوجھار ہوگی اور انسان کو دین کی

حفاظت دشوار ہو جائیگی اسلئے مفہوم یہ ہے کہ دین کی حفاظت کی خاطر اگر آبادی پر صحراء کو ترجیح دی جائے تو اس کا یہ اقدام صحیح ہے گویا مطلق فرار پسندیدہ نہیں بلکہ اس سے منع کیا گیا ہے۔

جس نے جنگل میں سکونت اختیار کی ظلم کیا۔

من سكن البادية جفا

(مسند احمد جلد ۷ ص ۳۵۷)

بداوت یعنی جنگل میں رہنا پسندیدہ نہیں ہے، عزلت نشینی کے بارے میں اہل علم باہم مختلف ہیں، امام نوویؒ نے حضرت امام شافعیؒ کی طرف یہ منسوب کیا ہے کہ وہ عزلت نشینی پر جماعت میں رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، کیونکہ جماعت میں رہنے کے بہت سے فائدے ہیں، جماعت میں رہ کر انسان دوسرے حضرات سے استفادہ بھی کر سکتا ہے، اسلامی مجامع میں حاضری بھی دے سکتا ہے اور مسلمانوں کی جماعت کو بڑھا کر من کثر سواد قوم فہو منہم کا ثواب بھی حاصل کر سکتا ہے اور بھی دوسرے فوائد ہیں۔

بعض دوسرے علماء کا خیال ہے کہ عزلت گزینی اولیٰ ہے کیوں کہ اس طرح انسان اپنے آپ کو دنیا کے تمام دھندوں سے بچا سکتا ہے لیکن اسکے ساتھ یہ شرط ہے کہ اسے اسلامی احکام اور خداوند قدوس کی عبادت و اطاعت کے بارے میں مسائل کا علم ہو، لیکن علماء کا یہ باہمی اختلاف صرف اس وقت ہے جبکہ احوال و ظروف نے اس پر کچھ پابندیاں نہ لگائی ہوں ورنہ اگر فتنے کے ایام میں ایک شخص کو اتنی قدرت حاصل ہے کہ وہ فتنہ کو فرو کر سکتا ہے تو اس شخص کو اجتماع میں رہ کر فتنہ کو ختم کرنا واجب ہے، اسی طرح بعض حالات میں عزلت نشینی بھی ضروری ہو جاتی ہے، غرض انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کے لئے افضلیت کی تو جیہیں ہو سکتی ہیں اگر اس پر نظر کی جائے کہ انبیاء کرامؑ نے تبدی (بادیہ نشینی) اختیار نہیں کی بلکہ ان کی بعثت کا مقصد معاشرے کی اصلاح تھا جو معاشرے کے درمیان رہ کر ہی حاصل ہو سکتا ہے اس لئے اسوۂ انبیاء کے پیش نظر اجتماعی زندگی بہتر ہے۔

اور اگر اس پر نظر کی جائے کہ انسانوں میں رہ کر انسان کبھی ایسے کام کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے جو اس کی روحانی ترقی کے لئے مضر ہیں، وہ اجتماعیت کے ساتھ نہ ذکر و شغل میں انہماک رکھ سکتا ہے اور نہ اسکی زندگی خلوت و تنہائی کے مشاغل سے معمور ہو سکتی ہے، ان اسباب کی وجہ سے انفرادیت کو ترجیح معلوم ہوتی ہے، مگر فیصلہ کی بات اس حدیث سے نکالی جاسکتی ہے یعنی اگر اجتماعیت کیساتھ دین کی حفاظت دشوار نہیں ہوگئی ہے تو یہی بہتر ہے کہ لوگوں میں رہ کر اپنے دین کی حفاظت کے ساتھ اجتماعیت کے دینی فوائد بھی حاصل کرتا رہے کیونکہ یہ اسوۂ انبیاء سے قریب تر ہے اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ میں آبادی میں اپنے دین کو فتنوں سے محفوظ نہ رکھ سکوں گا تو مقدم اپنا دین ہے۔

جس زمانہ میں حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کا جھگڑا چل رہا تھا، اس زمانہ میں حضرت ابو بکرؓ نے فتنہ سے الگ رہنے کی یہ صورت اختیار کی تھی کہ لوہے کی تلوار توڑ دی اور لکڑی کی تلوار بنوائی، چنانچہ جب لوگوں نے حضرت ابو بکرؓ

سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں اسے فتنہ سمجھ رہا ہوں اور اگر کوئی میرے گھر میں گھس آئیگا تو میں اس کے مقابل بانس نہ اٹھاؤں گا۔

تشریح حدیث | حدیث میں ارشاد ہے کہ مسلمان کا بہتر مال ایسی بکریاں ہوں گی جن کو لئے وہ پہاڑ کی چوٹیوں اور بارش برسنے کی جگہوں پر پھرے گا، یعنی پیغمبر علیہ السلام نے اخبار بالغیب کے طور پر یہ حالت بیان فرمائی کہ وہ وقت قریب ہے جب فتنوں کی بوچھاڑ ہوگی اور وہ انسان جس کو اسلام عزیز ہے اپنے دین کی حفاظت کے لئے ویرانوں کو آبادی پر ترجیح دیگا اور پہاڑ کی چوٹیوں پر پہنچ کر اپنے دین کی حفاظت کریگا کیوں کہ وہاں شہری فتنوں کی رسائی کم ہوگی اور چونکہ یہ دنیا ہے اور یہاں زندگی گزارنے کے لئے انسان کو اسباب معیشت کی ضرورت ہے نیز عبادات و طاعات میں پوری طرح انہماک کے لئے صحت اور قوت بھی درکار ہے تو لامحالہ انسان کو ایسے اسباب کی ضرورت پڑے گی جو اس کی صحت و قوت کے لئے معاون ہوں اس لئے فتنے کے ان ایام میں ان اسباب زندگی کو ترک کر دیگا جنکے حمل و نقل میں دشواری پیش آتی ہے اور صرف ایسی چیزیں اختیار کریگا جو سہل الانقیاد، کثیر المنفعہ، قلیل المونۃ ہوں گی اور ساتھ ہی ساتھ باعث خیر و برکت بھی۔

سو بکری سہل الانقیاد بھی ہے کہ بہ آسانی اس پر قابو پایا جاسکتا ہے یہ بھی اندیشہ نہیں ہے کہ وہ انسان سے مزاحمت کرے بہت مسکین جانور ہے اس کو من دو اب الجنة فرمایا گیا ہے اور کثیر المنفعہ بھی ہے، دودھ دیتی ہے جس میں غذائیت اور شروبیت دونوں چیزیں ہیں، اسکے استعمال سے طبیعت ہلکی رہتی ہے نیز نسل بھی بہت جلد بڑھ سکتی ہے، قلیل المونۃ اسلئے ہے کہ اگر خوراک کا انتظام نہ کر سکو تو اپنا پیٹ آپ ہی بھر لیتی ہے دودھ دوہنے کے لئے بھی کسی برتن کی ضرورت نہیں بلکہ تھن دبا کر بھی پی سکتے ہیں یعنی کثیر المنفعہ ہونیکے باوجود پالنے والے پر بار نہیں ہوتی اسکو اٹھا کر بہ آسانی پہاڑ پر چڑھایا جاسکتا ہے مواقع قطر یعنی جنگلوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بھی دشواری نہیں ہوتی۔

ترجمہ و حدیث کے درمیان انطباق | ذیل میں پیش فرمودہ حدیث میں فرمایا گیا ہے بفر بدینہ من الفتن میں ب مصاحبت کیلئے بھی آتی ہے یعنی یہ شخص دین کو ساتھ لئے پھر رہا ہے یہ ”ب“ سببہ بھی ہو سکتی ہے یعنی فتنوں سے دین کو بچانے کے سبب وہ شخص آبادی کو چھوڑ رہا ہے، ب کو مصاحبت کے لئے ماننے کی صورت میں فرار کا جزو ایمان ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ دین کو تو وہ اپنے ساتھ لئے پھر رہا ہے اور امام بخاری کا مقصد جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ اسے جزو ایمان بتلائیں۔

لیکن امام بخاری کے مذاق کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ دین دو چیزوں سے عبارت ہے ایک حقیقت ایمانیہ یعنی تصدیق قلبی اور دوسرے اعمال، فتنوں کا اثر براہ راست تصدیق پر نہیں پڑتا بلکہ یہ اثر اعمال کے ترک کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اس بنا پر بفر بدینہ میں دین سے مراد اعمال ہیں معلوم ہوا کہ اعمال کی حفاظت دین کا اہم شعبہ ہے،

اب حاصل ترجمہ یہ نکلا۔ من شعب الدین الفرار لاجل الدین من الفتن یعنی لایکون ذلك الفرار لغرض من اغراض الدینا بل یكون متمحضاً لاجل حفظ الدین وهو عبارة عن مجموع الاعمال الوجودية والسلبية والافعال والتروك و الفرار من التروك۔
یہاں من اتصالیہ بھی ہو سکتا ہے یعنی یہ دین سے متصل ہے لیکن امام بخاری کے مذاق کے مطابق اسے تبعیض کے لئے لینا مناسب ہے۔

[۱۳] بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ أَنَا أَعْلَمُكُمْ بِاللَّهِ وَأَنَّ الْمَعْرِفَةَ فَعَلُ الْقَلْبِ لِقَوْلِهِ

وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ (بقرہ: ۲۲۵)

(۲۰) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ الْبَيْكُنْدِيُّ أَخْبَرَنَا عَبْدَةُ عَنْ هِشَامٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهَا قَالَتْ كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَمَرَهُمْ أَمْرَهُمْ مِنَ الْأَعْمَالِ بِمَا يُطِيقُونَ قَالُوا إِنَّا لَنَسْنَا كَهَيْئَتِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ قَدْ غَفَرَ لَكَ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ فَيَغْضَبُ حَتَّى يُعْرِفَ الْغَضَبُ فِي وَجْهِهِ ثُمَّ يَقُولُ إِنَّ اتِّقَاكُمْ وَأَعْلَمَكُمْ بِاللَّهِ أَنَا.

ترجمہ | باب، نبی اکرم ﷺ کا قول کہ میں تم میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کا جاننے والا ہوں اور یہ کہ معرفت دل کا فعل ہے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے بارے میں تم سے مواخذہ کرے گا جن کا تمہارے قلوب نے کسب کیا ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ جب صحابہ کو حکم فرماتے تو ایسے اعمال کا حکم فرماتے تھے جنکو وہ کر سکتے ہوں، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ کی طرح نہیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی گزشتہ اور آئندہ کی تمام لغزشوں کو معاف فرما دیا ہے اس پر آپ غصہ ہوتے تھے کہ غصہ آپ کے چہرہ مبارک سے عیاں ہوتا پھر آپ فرماتے کہ تم میں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ ڈرنے والا اور اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ جاننے والا "میں" ہوں۔

مشکل یہ ہے کہ ترجمہ کتاب الایمان کا ہے اسلئے ترجمہ میں کوئی ایسی چیز ہونی چاہئے جو ایمان سے متعلق ہو اور چونکہ امام بخاری کا مقصد فرق باطلہ مرجیہ کرامیہ، معتزلہ کی تردید کرنا ہے اسلئے حسب سابق کوئی ترجمہ من الایمان کے عنوان سے آنا چاہئے تھا ورنہ بظاہر ترجمہ کتاب العلم کا ہے جو آگے آرہی ہے، اس مشکل کا جواب یہ ہے کہ حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ علم اور علم برابر نہیں ہوتے ایک کا علم دوسرے سے زائد بھی ہوتا ہے

اور کم بھی اسی طرح ایک انسان کو معرفت باللہ دوسرے انسان کی معرفت باللہ سے کم بھی ہوتی ہے اور زائد بھی اور چونکہ علم ایمان ہی کی فرع یا عین ہے اس اعتبار سے کہ ایمان کی حقیقت تصدیق ہے اور جب علم میں کمی زیادتی ہوگی تو چونکہ تصدیق بھی علم ہے اس لئے اس میں بھی کمی زیادتی کی گنجائش ہوگی۔

لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ علم اختیاری و اکتسابی ہو غیر اختیاری علم و معرفت بحث سے خارج ہے، باقی یہ بات کہ ان المعرفة فعل القلب لقول اللہ تعالیٰ ولکن یواخذکم بما کسبت قلوبکم کا ما قبل سے کیا جوڑ ہے، تو اسکو یوں سمجھو کہ صحابہ کرام نے زیادتی اعمال کی خواہش ظاہر کی تھی، اس پر آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ تم کتنی ہی کوشش کرو مگر عمل میں مجھ سے نہ بڑھ سکو گے کیونکہ سب سے بڑا عمل، عمل قلب ہے یعنی معرفت اور علم اور اس میں تم میرے برابر نہیں آ سکتے یہ علامہ عینی کے ارشاد کا خلاصہ ہے۔

علامہ سندھی کا ارشاد | اس سلسلہ میں علامہ سندھی کی بات نہایت بھلی اور دل لگتی ہے، فرماتے ہیں کہ ہر شخص کا ایمان اسکے علم اور معرفت کے بقدر ہوتا ہے، جس قدر بھی خداوند قدوس کی معرفت زائد ہوگی اسی قدر ایمان بھی قوی ہوگا اور جتنی معرفت میں کمزوری ہوگی اسی قدر ایمان میں بھی کمزوری ہوگی، پیغمبر علیہ السلام کی معرفت اور آپ کا علم سب سے قوی تھا اس لئے آپ کا ایمان پیغمبروں اور فرشتوں سے بھی قوی ہوگا، رہا یہ اشکال کہ ایمان تو قول و عمل تھا اور معرفت نہ قول ہے نہ عمل پھر اس کی کمی اور زیادتی سے ایمان کی کمی اور زیادتی کے کیا معنی؟ اس اشکال کو رفع کرنے کے لئے امام بخاری نے فرمایا۔

المعرفة فعل القلب
معرفت، قلب کا فعل ہے۔

اس لحاظ سے امام بخاری کا ابتداء میں قول و فعل فرمانا معرفت کو شامل رہا، اسکے بعد بھی کہا جاسکتا تھا کہ ہم نے تو آج تک جو ارح ہی کا عمل جانا تھا ہم قلب کے فعل کے بارے میں نہیں جانتے، اسکے لئے امام بخاری نے آیت پیش فرمادی۔

ولکن یواخذکم بما کسبت قلوبکم

لیکن دارو گیر فرمادیں گے اس پر جس کا تمہارے دلوں نے ارادہ کیا ہے۔

(پ ۱۲۶)

آیت میں فرمایا گیا ہے کہ فعل قلب پر مواخذہ ہے اس میں بصراحت قلب کی طرف کسب کی نسبت کی گئی ہے جو فعل و عمل کے معنی میں ہے۔

علامہ سندھی کی اس تقریر سے معلوم ہو گیا کہ باب کا کتاب الایمان سے گہرا ربط ہے، اس طرح ذیل میں پیش کردہ تملہ "ان المعرفة فعل القلب" اور اس کے بعد ذکر کی گئی آیت کریمہ پوری طرح ترجمہ کا جز ہیں اور ان سے

ترجمہ کا ارتباط بھی واضح ہے۔

تشریح حدیث

حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی عادت تھی کہ جب صحابہؓ کو کسی چیز کا حکم فرماتے تو اس کا خیال رکھتے کہ وہ چیز ان کی طاقت اور استطاعت سے باہر نہ ہو اور طاقت و استطاعت میں ہونیکا مفہوم یہ ہے کہ اس پر تادم آخر عمل کیا جاسکے گویا اصل چیز وہ ہے جس کو انسان نبھاسکے، اگر انسان طاقت سے زیادہ کوئی بار اٹھالیتا ہے تو اس کا نبھانا دشوار ہو جاتا ہے، اسکا مفہوم یہ نہیں کہ فرائض کے سلسلے میں بھی یہی حکم ہے کہ جتنا بار اٹھ سکے اٹھالیا جائے بلکہ فرائض اپنی جگہ ہیں اور وہ اصل ہی سے انسانی طاقت سے زیادہ نہیں، البتہ نوافل کے بارے میں پیغمبر علیہ السلام کا یہی ارشاد تھا کہ جتنا نبھاسکو اتنا عمل شروع کرو۔

احب الاعمال الی اللہ مادیم علیہ

اللہ کے نزدیک محبوب اعمال وہ ہیں جن میں

دوام ہوا گرچہ وہ کم ہوں۔

وان قل (بخاری جلد ۲ ص ۸۷۱)

صحابہ کرامؓ نے حضرت عائشہؓ سے معلوم کیا کہ آپ کے اعمال کیا ہیں، مقصد یہ تھا کہ جس قسم کے اعمال پیغمبر علیہ السلام کے معلوم ہوں گے اسی طرح کی زندگی اختیار کریں گے، حضرت عائشہؓ نے آپ کے اعمال کا ذکر فرمایا تو صحابہ کرامؓ نے اپنے خیال میں اسکو زیادہ نہ سمجھا اور انہیں خیال ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام تو مغفور الذنب ہیں اسلئے آپ کو زیادہ عمل کی ضرورت نہیں لیکن ہم تو مغفور یا معصوم نہیں ہیں، ہمیں اعمال میں بہت ہی زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ لہذا کسی نے کہا میں ہمیشہ جہاد کرونگا کسی نے کہا میں ہمیشہ بیوی سے قطع تعلق رکھونگا، کسی نے کہا میں مستقل روزے رکھوں گا، جب آپ کو معلوم ہوا تو آپ نے پہلے سوال فرمایا کیا تم نے ایسا کہا ہے، صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم نے اسلئے کہا کہ آپ تو مغفور الذنب ہیں اور ہمارے پاس ایسی کوئی ضمانت نہیں، اسلئے ہمیں اور بھی زیادہ اعمال کی ضرورت ہے، حالانکہ آپ کا یہ معمول تھا کہ اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ بوجھ برداشت فرماتے اور امت کو ایسے کام بتلاتے جو ہلکے ہوں اور جن پر آسانی سے مداومت ہو سکے، صحابہ کرامؓ کو خیال تھا کہ اعلان مغفرت کے باعث آپکو تو اعمال کی چنداں ضرورت نہیں لیکن ہمیں تو تاہم امکان عمل کی کوشش کرنی چاہئے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے روزوں اور ختم قرآن کے باب میں بہت زیادہ بار اٹھالیا تھا جو آخر عمر میں نہ بھسکا۔

جب صحابہ کرامؓ نے یہ عرض کیا تو آپ نے غصہ کے انداز میں فرمایا کہ میں تم میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں یعنی تقویٰ کا تقاضا ہے کہ خشیت خداوندی کے مطابق کام ہونا چاہئے عبادت خشیت کا نتیجہ ہے اور خشیت معرفت کا ثمرہ ہے اور معلوم ہے کہ میری معرفت تمام دنیا سے زائد ہے اسلئے بقدر معرفت خشیت بھی لازم ہے اور جب میں خداوند قدوس سے سب سے زیادہ ڈرتا ہوں تو اسکا یہ تقاضا ہے کہ ہمہ وقت کام میں لگا رہوں یعنی تم یہ کیسے کہتے ہو کہ مجھے عمل کی ضرورت نہیں، مغفرت تو ادنیٰ درجہ ہے اسکے بعد اور بھی

درجات ہیں جن کے حصول کی ضرورت ہے ان اتفاق و اعلمکم باللہ انا، میں خطاب حاضرین ہی سے نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق پورے عالم سے ہے جس میں دوسرے انبیاء کرام اور ملائکہ بھی شامل ہیں۔

مسئلہ عصمت انبیاء اور یہود و نصاریٰ کا مسلک | یہاں غفر لک سے عصمت انبیاء کا مسئلہ کی ابتداء ہو جاتی ہے کیونکہ یہ رسول اکرم ﷺ کے متعلق فرمایا گیا ہے اور

مغفرت کا تقاضہ ہے کہ پہلے ذنب کا صدور ہو اور جب خاتم المرسلین سے ذنب کا امکان ہے جسکی مغفرت کی گئی تو دوسرے انبیاء کرام سے بھی امکان ہے، یہود و نصاریٰ کے نزدیک تو عصمت انبیاء مسلم ہی نہیں ہے بلکہ وہ جس طرح اپنے آپ کو گناہوں سے آلودہ سمجھتے ہیں اسی طرح پیغمبروں کے متعلق بھی ان کا یہی خیال ہے، فرق اتنا ہے کہ پیغمبروں کو معاف کر دیا جاتا ہے اور عام انسانوں کی معافی کی ضمانت نہیں۔

اہلسنت والجماعت کا ارشاد | پیغمبر ان کرام علیہم السلام کی عصمت جمہور اہل سنت کا متفق علیہ مسئلہ ہے اور اجماعی ہونیکے وجہ سے قطعی ہے دلیل کی ضرورت نہیں، تفصیل اسکی یہ ہے کہ اشاعرہ اور ماتریدیہ اس پر متفق ہیں کہ کبیرہ تو پیغمبر سے صادر ہو ہی نہیں سکتا البتہ صغیرہ کے بارے میں کچھ اختلاف ہوا ہے۔

حضرات ماتریدیہ اور اپنے تمام مشائخ رحمہم اللہ اس پر متفق ہیں کہ پیغمبر قبل النبوة بھی ہر قسم کے گناہوں سے محفوظ ہوتا ہے، اب اشکال یہ ہوتا ہے کہ جب پیغمبر علیہ السلام معصوم ہیں تو کس چیز کی مغفرت کا وعدہ فرمایا جا رہا ہے کیونکہ مغفرت تو صدور ذنب کی مقتضی ہے، اسکے مختلف جوابات دئے گئے ہیں۔

ایک جواب تو یہ ہے کہ خداوند قدوس یہ فرما رہے ہیں کہ ہم نے آپکی امت کے اگلے اور پچھلے گناہوں کی معافی کا ذمہ لیا ہے، یہ گناہ پیغمبر علیہ السلام کے نہیں ہیں بلکہ پیغمبر کی امت کے ہیں اور امت سے مراد امت اجابت ہے، آپ کو اپنی امت کی طرف سے بہت فکر رہتا تھا اس لئے اطمینان دلایا گیا کہ آپکی امت کے گناہوں کو معاف کر دیا گیا ہے معافی کی دو صورتیں ہیں بلا سزا معاف کر دیا جائے گا یا بغرض تطہیر کچھ سزا دے کر بقیہ سزا معاف کر کے جنت میں پہنچا دیا جائے یہ جواب قاعدہ میں تو آتا ہے لیکن آیت یا حدیث کا یہ مقصد قرار دینا مستبعد اور بہت مستبعد ہے کیونکہ جب آیت۔

تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی

خطائیں معاف فرمادے۔

لیغفر لک اللہ ما تقدم من

ذنبك وما تاخر (پ ۲۶، ۹۷)

نازل ہوئی تو صحابہ نے عرض کیا۔

ھینالک یا رسول اللہ

یا رسول اللہ آپ کو مبارک ہو

لیکن یہ تو آپ کے لئے ہے ہمارے لئے کیا ہے اسکے بعد دوسرا جملہ مومنین سے متعلق کیا گیا۔
 هو الذی انزل السکینة فی قلوب
 المومنین لیزدادوا ایمانا مع
 ایمانہم (پ ۲۶ ع ۹)

اور آگے ارشاد فرمایا گیا۔

لید خل المومنین والمومنات جنّت

تاجرہ من تحتها الا نہار

تاکہ اللہ تعالیٰ مسلمان مردوں اور عورتوں کو ایسی
 بہشت میں داخل کرے جنکے نیچے نہریں جاری ہوں گی
 اور اگر ایسا ہوتا کہ وہی آیت مومنین کے بارے میں ہوتی تو اگر صحابہ خود نہ سمجھ پائے تھے تو آپ ضرور ارشاد
 فرماتے لیکن نہ صحابہ ہی نے سمجھا اور نہ پیغمبر علیہ السلام ہی نے یہ فرمایا اور چونکہ حدیث بھی آیت سے ماخوذ ہے اسلئے
 اس کے بھی یہ معنی نہیں ہو سکتے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ ہر شخص کا ذنب اس کے درجہ اور مرتبہ کے مناسب ہوتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ سب کے
 ذنوب اور مواخذات برابر ہوں ایک معمولی انسان کوئی کام کر گزرتا ہے تو بسا اوقات حکومت اس جانب توجہ بھی نہیں
 دیتی لیکن اگر کوئی اچھی حیثیت کا آدمی ان چیزوں کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ ہرگز نظر اندازی کے قابل نہیں ہوتا بلکہ اس پر
 سخت عتاب ہوتا ہے ”جن کے رتبے ہیں سو ان کی سوا مشکل ہے“ یہیں سے حسنات الابرار میں
 المقربین چلا ہے یعنی فرمانبرداروں کی نیکیاں مقربین کے درجہ میں پہنچ کر برائیاں بن جاتی ہیں، مقرب پر عتاب ہوتا
 ہے کہ تم ہم سے بہت زیادہ قریب ہوتے ہوئے ایسا کرتے ہو، مانا کہ یہ فعل فی نفسہ مباح ہے اور جائز ہے مگر تمہاری
 شان سے بعید ہے کہ محض اباحت کو اختیار کرو تمہیں اپنے درجہ کے مطابق کام کرنا چاہئے تھا، یہیں سے یہ بات صاف
 ہو جاتی ہے کہ عوام الناس کا ذنب اور ہے، صالحین اور صدیقین کا اور، اور انبیاء کرام کا اور، اسی لئے آیت آگئی کہ تم جن
 چیزوں کو اپنے اعتبار سے ذنب سمجھتے ہو ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہماری طرف سے کوئی گرفت نہ ہوگی گویا اس وقت ذنب
 سے ترک اولیٰ اور افضل مراد ہے۔

بڑے آدمی کوشش یہی کرتے ہیں کہ اولیٰ اور افضل چھوٹے نہ پائے لیکن تعلیم کی غرض سے ایسا بھی کرنا پڑ جاتا
 ہے کیونکہ تعلیم کا ایک شعبہ بیان جواز بھی ہے، بیان جواز کیلئے کبھی خلاف اولیٰ کا بھی ارتکاب کرنا پڑتا ہے، تعلیم کی غرض
 سے ایسا کرنا گواہت اجر و ثواب ہے لیکن پیغمبر علیہ السلام اسے ہلکا کام سمجھتے ہیں اسلئے خداوند قدوس اعلان فرماتا ہے کہ
 ان چیزوں پر گرفت نہ ہوگی، اس تقدیر پر کوئی اشکال باقی نہیں رہتا یعنی یہ لازم نہیں آتا کہ مغفرت سے قبل ذنوب تسلیم
 کئے جائیں جو عصمت کے منافی ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ معصیت، خطا اور ذنب تینوں میں لغوی اعتبار سے فرق ہے، معصیت کے معنی نافرمانی، خطا کے معنی چوک، نادرست اور ذنب کے معنی عار اور معیوب شے کے ہیں انبیاء کرام علیہم السلام کو معاصی سے معصوم قرار دیا گیا ہے، اور حدیث شریف نیز آیت کریمہ میں ذنوب کا ذکر کیا گیا ہے یعنی ذنب کی اہمیت نہیں ہے، ذنب عار کو کہتے ہیں، عار وہ کام ہے جسکے ارتکاب سے مرتکب کو شرم آئے گو کام فی نفسہ درست ہو اور قابل مواخذہ نہ ہو لیکن بڑے مرتبہ کا انسان ایسے کام کے ارتکاب سے بھی شرماتا اور لجاتا ہو، قرآن کریم میں لیغفر لک اللہ ماتقدم من ذنبک وما تاخرو میں ذنب کے وہی معنی لئے جائیں گے جو مناسب مقام ہوں اگر لغت کے اعتبار سے حدیث شریف کی شرح کی جائے تو یہ جواب بھی چل سکتا ہے، اور دراصل یہ جواب قاضی عیاض نے شرح مسلم میں دیا ہے لیکن اشکال یہ ہے کہ قرآن کریم میں بڑے بڑے گناہوں پر بھی ذنب کا اطلاق کیا گیا ہے، ارشاد ہے۔

ان الله يغفر الذنوب جميعا انه هو الغفور الرحيم (پ ۲۲ ع ۳۶)

بالیقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔

خداوند قدوس اپنی شان رحمت دکھاتا ہے کہ ہماری شان تمام گناہوں کو معاف کر دیتی ہے عام اس سے کہ وہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ، لہذا لفظ ذنب سے یہ اشتدلال کہ اس سے صرف وہ چیزیں مراد ہیں جو انسان کے لئے سبکی کا باعث شمار کی گئی ہیں درست ہیں، میرا خیال یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے یہ بات صحیح ہے جبکہ ذنب کا لفظ معصیت کے مقابل استعمال کیا گیا ہو، لیکن جہاں معصیت اور ذنب کا تقابلی نہ ہو وہاں ذنب کے لفظ میں وسعت ہے اس بنا پر ابھی یہ سوال باقی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام سے ذنب کا صدور ممکن ہے یا نہیں۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ ”ان الله قد غفر لك ماتقدم من ذنبك وما تاخرو“ میں غفر کے معنی ستر کے ہیں یعنی پردہ ڈالنا، خداوند قدوس نے پردہ ڈال دیا، اب پردہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ ذنب کا صدور ہو اور اس کو ڈھک دیا جائے اور ایک یہ کہ ذنب کا صدور ہی نہ ہو بلکہ درمیان میں حائل قائم کر دیا گیا ہوتا کہ گناہ وہاں تک پہنچ ہی نہ سکے، اب مغفرت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ گناہ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے معافی دیدی ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ خداوند قدوس نے پیغمبر علیہ السلام اور گناہ کے درمیان ایک حائل قائم کر دیا ہے جس کی وجہ سے ذنب کا صدور ہی نہیں ہوتا لیکن عصمت چونکہ ذاتی نہیں ہے نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا ہے ہاں پیغمبروں کو خداوند قدوس محفوظ رکھتا ہے کوئی اثر ان تک نہیں پہنچتا اور نہ نفس کی کوئی چال ہی ان پر کارگر ہوتی ہے اور نہ شیطان ہی انہیں بہکا پاتا ہے، آپ نے فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ ایک شیطان ہے عرض کیا گیا کہ آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں ہے وَلٰكِنَّہٗ اَسْلَمَ لیکن وہ تابع ہو گیا ہے یَالْكَفٰی اَسْلَمَ لیکن میں بچ جاتا ہوں اسلئے معنی یہ ہوئے کہ خداوند قدوس نے پیغمبروں کی عصمت اس طرح قائم کی

ہے کہ ذنوب اور قلوب انبیاء کے درمیان عصمت کی ایک دیوار حائل کر دی ہے۔

ان قلوب بنی آدم کلھا بین اصبعین
بیشک بنی آدم کے تمام قلوب ایک قلب کی طرح
من اصابع الرحمن کقلب واحد یصرفہ
اللہ کے قبضے میں ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے
کیف یشاء (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)
تصرف کرتا ہے۔

جب یہ بات ہے تو انبیاء علیہم السلام کے قلوب کو خیر کی طرف لوٹایا ہے، شر سے ان کا کوئی واسطہ نہیں ہے لیکن اس پر اشکال یہ ہے کہ آڑ اور حائل تو ماتاخر کے متعلق ہے لیکن جن ذنوب کو ماتقدم کے عنوان سے ذکر کیا ہے وہ تو آہی چکے ہیں اسلئے پھر وہی بات پیدا ہوگئی۔

اس بنا پر ماتقدم کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ دو قسم کے ہیں ایک نبوت سے پہلے اور دوسرے نبوت کے بعد، آیت کریمہ میں جس چیز کو ماتقدم سے ذکر کیا گیا ہے وہ نبوت سے پہلے کی وہ چیزیں ہیں جو بعد النبوة خلاف شان سمجھی گئیں، نبوت کے بعد کوئی گناہ یا ذنب نہیں ہے کیوں کہ نبوت کے بعد تو درمیان میں حائل پیدا کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ذنوب کا صدور ممتنع ہو گیا، قبل النبوة کی باتوں میں مثلاً ایک وہ واقعہ ہے جو بیت اللہ کی تعمیر کے وقت پیش آیا تھا جب آپ دوش مبارک پر نوکیلا پتھر اٹھا رہے تھے اور گمان تھا کہ دوش مبارک زخمی ہو جائے گا اس وقت آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے مشورہ دیا کہ تہد کھول کر کاندھے پر رکھ لو کہیں پتھر کی نوک سے کاندھا زخمی نہ ہو جائے آپ نے حضرت عباسؓ کے اصرار پر تہد کھول کر کاندھے پر رکھ لیا لیکن برہنگی کی وجہ سے بیہوش ہو گئے، عرب میں برہنگی کوئی معیوب شے نہ تھی انتہا یہ ہے کہ لوگ برہنہ ہو کر طواف کیا کرتے تھے اگر یہ چیز معیوب ہوتی تو کم از کم عبادت کی حالت میں تو اسے برداشت نہ کیا جاتا گویا تعری اس دور کے رسم و رواج کے اعتبار سے معیوب نہ تھی لیکن خاتم الانبیاء ہونے کی شان کے لحاظ سے نامناسب ضرور تھی، اس لئے فوراً تنبیہ کر دی گئی، آپ بیہوش ہو گئے ایک قدم نہ چل سکے اور نظر مبارک آسمان کی طرف اٹھ گئی یا مثلاً مکہ میں کوئی تقریب تھی اسمیں گانا بجانا تھا پیغمبر علیہ السلام کو خیال ہوا کہ اس تقریب میں چلیں، دیکھیں کیا ہوتا ہے، آپ تشریف لے گئے لیکن وہاں پہنچتے ہی نیند طاری کر دی گئی تمام تقریبات ختم ہو گئیں اور آپ سوتے ہی رہ گئے یعنی خداوند قدوس کو منظور نہ تھا اسلئے آپ نے شرکت کا ارادہ بھی فرمایا تو آپ پر نیند طاری کر دی گئی، بہر کیف قبل النبوة کچھ ایسی چیزیں بھی ہو سکتی ہیں جو بعد النبوة قابل اعتراض ہوں۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ خداوند قدوس کی جانب سے امر عظیم کی بشارت ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو قیامت کے دن تمام اولین و آخرین کی شفاعت کرنی ہے اور تمام انبیاء کرام آپ ہی کے پاس اپنی امتوں کو بھیج دیں گے کیونکہ تمام پیغمبروں کے سامنے اس وقت کے جلال الہی کے تقاضے سے اپنی اپنی لغزشیں ہوں گی کیونکہ جب حاکم

غضبناک ہوتا ہے تو ہر شخص کو اپنی خطا یاد آ جاتی ہے گو ان چیزوں سے معافی بھی دے دی گئی ہو اس لئے کہ حاکم غضبناک ہے سفارش کرنے والے سے کہہ سکتا ہے کہ میاں جاؤ اپنی خیر مناد اسی کو غنیمت سمجھو کہ تم سے مواخذہ نہ ہو، اب دوسرے کی بھی سفارش لیکر آئے ہو۔ اس وقت انبیاء پر آپ کا تفوق ظاہر کرنے کیلئے اسکی ضرورت تھی کہ آپ کے پاس ایسی شاہی دستاویز ہو جس سے آپ کا دل مضبوط رہے چنانچہ حفاظ کی زبان پر مناروں اور مسجدوں میں یہ اعلان کرادیا کہ لیغفر لك الله ماتقدم من ذنبك وما تاخر یعنی ہم آپ کے ذنوب کی مغفرت کا اعلان کر رہے ہیں، یہ مغفرت اپنے معنی میں نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ پہلے کچھ گناہ تھے جن کی مغفرت کی گئی بلکہ یہ ایسا ہی ہے جیسے اہل بدر کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

لعل الله اطلع على اهل بدر فقال

اللہ تعالیٰ نے اہل بدر سے یہ فرمایا ہے کہ تم

اعملوا ما شئتم فقد غفرت لكم

جو چاہو کرو میں نے تمہاری مغفرت کر دی۔

اس میں اہل بدر کے عمل کی مقبولیت اور پسندیدگی کو ظاہر کیا گیا ہے۔

چھٹا جواب یہ ہے کہ یہاں ذنوب سے وہ امور طبعیہ مراد ہوں جنکو انسان اپنی کسی ضرورت یا تحصیل راحت کی خاطر مختلف اوقات میں، مختلف احوال کے ماتحت اختیار کرتا ہے خود کو مجبور پاتا ہے، مگر غلبہ حال کی بناء پر غار کو بھی محسوس کرتا ہے، مثال کے طور پر یہ سمجھئے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ایک خاص کیفیت کا غلبہ رہتا تھا وہ قضائے حاجت کے لئے بھی بیٹھتے تھے تو حیاء کے ماتحت بدرجہ مجبوری ہی کشفِ عورت کرتے تھے، اور پھر شرم کی وجہ سے زمین میں گڑ جاتے تھے اس طرح کے استفراغ میں جس درجہ کا تکلف اور دشواری پیش آتی ہے وہ ظاہر ہے۔

گویا ایک طرف تو اس کے لئے اختیار کی مجبوری ہوتی ہے اور دوسری جانب خود اس فعل میں خلافِ حیاء کا تصور اس شخص کو اس کے ارتکاب سے روکتا ہے اس صورت میں ایک عبد صالح کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے، ایسے موقع پر اس دشواری کو ختم کرنے کے لئے اس قسم کا اعلان ضروری ہو جاتا ہے تاکہ کام کرنے والا بہ آسانی اپنا کام کر سکے اس کو سمجھنے کے لئے صحابہ کے احوال پر نظر کیجئے۔

صحابہ کرام اپنی ازواج کے پاس جاتے ہوئے بھی شرم و عار محسوس کرتے، صحابہ کرام کہتے ہیں کہ جب تک رسول اکرم ﷺ بقید حیات رہے ہم عورتوں سے بے تکلفی کی باتیں نہ کرتے تھے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپکو وحی کے ذریعہ مطلع کر دیا جائے، جب پیغمبر علیہ السلام کی صحبت کی وجہ سے صحابہ کرام پر حیاء کا اس قدر غلبہ تھا تو خود پیغمبر علیہ السلام کو خداوند قدوس کے استحضار کے باعث کس قدر حیاء ہونی چاہیے۔

اللہ احق ان يستحي منه

اللہ تعالیٰ لوگوں کی بہ نسبت اس کا زیادہ

مستحق ہے کہ اس سے حیاء کی جائے۔

من الناس

اور جب صالحین میں بھی ایسے بزرگ گزرے ہیں جو یہ کہتے تھے کہ اگر ایک لمحہ بھی ایسا گزر جائے جس میں خداوند قدوس کا مشاہدہ نہ ہو تو موت آجائے تو پھر پیغمبر علیہ السلام کے مشاہدہ کا کیا عالم ہوگا اور جب ہمہ وقت اسی خیال کا غلبہ ہو کہ خدائے تعالیٰ دیکھ رہا تو ظاہر ہے کہ لیٹنے میں بھی تکلف ہوگا، قضائے حاجت وغیرہ کے لئے کشف میں بھی تکلف ہوگا اسی طرح کسی چیز پر سہارا لگانا، چارزانو بیٹھنا، پیر پھیلانا بھی تکلف کا باعث ہوگا، اس بناء پر فرمایا گیا ہے کہ آپ کیوں ضیق میں پڑتے ہیں، مواقع ضرورت بقدر ضرورت مستثنیٰ ہوتے ہیں اور آپ جن چیزوں کو ذنوب سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ذنوب نہیں ہیں اور یہ دراصل ضرورت کے تحت ”تعظیم کاریگراں معاف“ کے قبیل سے ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے کارخانہ بنایا اور اس میں مختلف مشینیں لگائیں وہ مشینیں مختلف طرح چلائی جاتی ہیں کوئی کھڑے ہو کر چلائی جا رہی ہے کوئی لیٹ کر اور کوئی بیٹھ کر، مالک کبھی کبھی جا کر کاموں کا جائزہ لینا چاہتا ہے اور جب بھی جاتا ہے ملازمین کام چھوڑ کر دست بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں، مالک دو چار مرتبہ برداشت کر کے اعلان کرتا ہے ”تعظیم کاریگراں معاف“ کیونکہ یہ تو بڑے نقصان کی بات ہے کہ مالک کاموں کا جائزہ لینے جائے اور ملازمین کام چھوڑ دیں۔

عصمت انبیاء کرام کی اہم دلیل | غرض پیغمبران کرام علیہم السلام دانستہ خداوند قدوس کی نافرمانی سے محفوظ ہیں لیکن کبھی کبھی فرمانبرداری ہی کے ارادے سے لغزش بھی ہو جاتی ہے گویا جس

طرح انبیاء کرام سے نسیان ممکن ہے اسی طرح لغزش بھی ممکن ہے اسی طرح لغزش کا دوسرا نام ”اجتہادی خطا“ بھی ہے۔

عصمت انبیاء کے بارے میں تمام دلائل کو چھوڑ کر صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ خدائی حکومت کے

نمائندے ہیں، انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ بندوں کو خداوند قدوس کی مرضیات کا علم کرائیں یہ حضرات

محافظ اور نگران ہیں انہیں کے ذریعہ خداوند قدوس کی مرضیات کا علم ہوتا ہے، ہم جانتے ہیں کہ جب کوئی حکومت کسی

دوسری حکومت سے رشتہ قائم کرتی ہے تو وہ اپنا سفیر نمائندہ بھیجتی ہے اور اس نمائندگی و سفارت کیلئے ایسی شخصیت کا

انتخاب کیا جاتا ہے جو اپنی حکومت کیلئے سب سے زیادہ خیر خواہ ہو دوسری حکومت کے کاموں اور اداروں پر جسکی کڑی نظر

ہو جو معاملہ فہم اور بیدار مغز ہو غرض صرف اسکو لیا جاتا ہے جس کے اعتماد اور وثوق پر مہر تصدیق مثبت ہو چکی ہو۔

ایسے افراد کو اس کام کیلئے نہیں لیتے جن کا معاملہ حکومت کی نظر میں مشتبہ ہو اور ان سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ

ہو، اس اعتبار سے ضروری ہے کہ جن لوگوں کو خداوند قدوس نے نمائندہ بنایا ہے وہ ایسے ہوں جن پر خداوند قدوس کو پورا

اعتماد ہو، جو احکام الہی کی پوری پابندی کر سکیں لیکن دنیوی حکومتوں میں انتخاب کر نیوالے انسان ہوتے ہیں جن کا علم

محدود اور تجربات ناقص ہوتے ہیں اسلئے کبھی اس ظن و تخمین کے بھروسہ پر کیا ہوا انتخاب غلط بھی ہو جاتا ہے لیکن خداوند

قدوس کے انتخاب میں ایسا ممکن نہیں ہے وہ عالم الغیب والشہادۃ ہیں اور انہیں ہر شخص کے اگلے پچھلے کارنامے معلوم

ہیں، اسلئے یہاں انتخاب اسی شخص کا ہوگا جو علم خداوندی میں پوری طرح فرمانبردار ہو ورنہ خلاف ورزی کر نیوالوں کے

انتخاب سے معاذ اللہ انتخاب کر نیوالے پر حرف آتا ہے اسلئے یہ احتمال درست نہیں کہ خداوند قدوس کا نمائندہ احکام کی خلاف ورزی کرے، نیز اسکا بھی امکان نہیں ہے کہ اخلاق عالیہ اور ملکات فاضلہ کا حامل نہ ہو کیونکہ اگر وہ ایسا ہوگا تو دنیا والوں کی نظر میں باوقار اور وقیع نہ ہو سکے گا بلکہ لوگ اسکا کردار دیکھ کر اس کے قول کی تکذیب کر دیں گے۔

قرآن کریم میں بیان کردہ واقعات کی حقیقت | اس گزارش کے بعد کچھ واقعات انبیاء کرام کی طرف ایسے منسوب ہیں جس سے بظاہر ان کی عصمت پر حرف آتا ہے

مگر درحقیقت وہ کوئی چیز نہیں ہے، اسلئے کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا تعلق محض اجتہاد اور فہم سے ہوتا ہے اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا فہیم و عقیل بات سمجھنے میں غلطی کر جاتا ہے اسلئے کہ انسان کی فہم و عقل مخلوق ہیں اور مخلوق سے غلطی کا امکان ہے مگر جہاں تک ان کی ذات کا تعلق ہے ان کے اعمال اور ان کی تعلیمات کا تعلق ہے اس میں وہ خداوند قدوس کی طرف سے پورے طور پر مامون ہیں اور عصمت کے معنی بھی یہی ہیں کہ ان کے متعلق اگر کہیں ذنوب کی نسبت ہے تو وہ حقیقی ذنوب نہیں بلکہ وہ از قبیل زلات ہیں۔

زلست لغزش کو کہتے ہیں جس پر کسی قسم کا الزام عائد نہیں ہوتا اسکی مثال ایسی ہے کہ آپ چلے جا رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ زمین ہموار ہے لیکن سوء اتفاق کہ وہ زمین پھسلواں نکلی پیر پٹ گیا اور گر پڑے، یہ غیر ارادی طور پر پیر کا پھسلنا نہ قابل ملامت ہے اور نہ اس پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے اس کو اجتہادی خطا تو کہہ سکتے ہیں لیکن ذنوب کی فہرست میں داخل نہیں کر سکتے۔

نیز یہ کہ انبیاء کرام کی یہ لغزشیں ان کے مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے لغزشیں ہیں کیوں کہ یہ خداوند قدوس کے سب سے زیادہ مقرب بندے ہیں اور مزاج شناس ہیں، اسلئے ان حضرات سے ذاری غفلت پر بھی سخت گرفت ہو جاتی ہے، اس سخت تشبیہ سے بھی ان کی عظمت ہی کا اظہار مقصود ہوتا ہے کیونکہ معمولی انسان سے تو ان باتوں پر گرفت نہیں کی جاتی، پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ بڑوں کو اپنی لغزشوں کا احساس بھی بہت زیادہ ہوتا ہے مثال کے طور پر یہ سمجھنے کہ شاہجہاں کا دربار منعقد ہے وزیر حاضر ہے اور وہ ذرا سی غفلت کو جرم سمجھ کر لرزہ بر اندام ہو جاتا ہے اور فوراً ہی توبہ اور معذرت کے ذریعہ اس کا تدارک کر لیتا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ وزیر کو وزیر اسی لئے کہتے ہیں کہ حکومت کے کام کا بوجھ اسی کے کاندھے پر ہوتا ہے اور اسی کی تدبیر سے حکومت کو فروغ ہوتا ہے، ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وزیر اپنے کمر بند کو دیکھنے لگا، شہنشاہ کی طرف سے سخت تشبیہ کی گئی، حالانکہ کمر بند دیکھنا کوئی جرم نہیں ہے لیکن جس مقام پر وزیر کھڑا ہے اسکا تقاضا ہے کہ دوسری جانب متوجہ نہ ہو بلکہ پادشاہ کے حکم کا منتظر رہے، اب ہمیں ان واقعات کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا ہے جو انبیاء کرام کے بارے میں قرآن کریم میں مذکور ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام | سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ ہے، حضرت آدم علیہ السلام ابوالبشر اور خداوند قدوس کے خلیفہ ہیں ارشاد ہے۔

انی جاعل فی الارض خلیفة (پ ۱۶۷) ضرور میں بناؤں گا زمین میں ایک نائب۔

حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ قرآن کریم میں مذکور ہے کہ انہوں نے گیہوں کا دانہ کھایا اور ممانعت کے باوجود کھایا حالانکہ انہیں شیطان کے بارے میں پوری طرح مطلع کر دیا گیا تھا کہ دیکھو یہ تمہارا دشمن ہے اور تمہیں نکالنے کی فکر میں ہے، اسے خیال ہے کہ میں اسکی وجہ سے رائدہ درگاہ ہوا ہوں، اسلئے عزت کے ساتھ اسے بھی نہ رہنے دوںگا، جس قدر بھی تدبیریں اس سلسلے میں استعمال کر سکوں گا، کروں گا تا کہ انکو اس منصب سے اتار دوں، ارشاد ہے۔

فقلنا یا آدم ان هذا عدو لك و
لزوجك فلا یخرجنك من الجنة
فتشقی ان لك ان لا تجوع فیها ولا
تعری وانك لا تظمأ فیها ولا تضحی
فوسوس الیه الشیطان قال یا آدم
هل ادلك علی شجرة الخلد وملك
لا یلبی (پ ۱۶۷)

پھر ہم نے کہا اے آدم یہ بلا شہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے سو کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکلا دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ، یہاں جنت میں تو تمہارے لئے یہ ہے کہ تم نہ کبھی بھوکے ہو گے اور نہ ننگے ہو گے اور نہ یہاں پیاسے ہو گے اور نہ دھوپ میں تپو گے پھر انکو شیطان نے بہکا یا کہنے لگا کہ اے آدم کیا میں تمکو ہمیشگی کا درخت بتلا دوں اور ایسی بادشاہی جسمیں کبھی ضعف نہ آوے۔

یہاں حضرت آدم علیہ السلام کو پوری طرح شیطان کے ارادوں سے باخبر کر دیا گیا ہے اور دوسری آیت میں اس درخت کے قریب جانے سے بھی روکا گیا ہے۔

ولا تقربا هذه الشجرة فتكونا
من الظلمین . (پ ۹۸)

اور اس درخت کے پاس مت جاؤ کبھی ان لوگوں کے شمار میں آ جاؤ جن سے نامناسب کام ہو جایا کرتا ہے۔

لیکن اس کے باوجود حضرت آدم علیہ السلام سے کوتاہی ہوئی اور ایسی ہوئی جسے زلت نہیں کہا جاسکتا اور خود خداوند قدوس نے بھی اسے زلت سے تعبیر نہیں کیا، ارشاد ہے۔

فاكلا منها فبدت لهما
سواتهما وطفقا یخصفان
علیہما من ورق الجنة وعصی
ادم ربہ فغوی (پ ۱۶۷)

سو دونوں نے اس درخت سے کھالیا تو ان دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے کھل گئے اور دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا سو غلطی میں پڑ گئے۔

آیت کریمہ میں عصی اور غوی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ ایک بڑی غلطی کا

ارتکاب کیا ہے، لیکن اصل یہ ہے کہ ہمیں انبیاء کرام کی طرف منسوب قصوں کو دیکھنے کیلئے سابق شرائع کا علم ضروری ہے، اسی طرح ان احوال و ظروف کو بھی پیش نظر رکھنا لازم ہے، یہ درست نہ ہوگا کہ بات تو کچھلی شریعتوں کی ہو اور ہم اسکو اپنی شریعت کے معیار پر تو لے لگیں، حضرت آدم علیہ السلام کا یہ معاملہ گو بہ ظاہر حضرت آدم علیہ السلام کی عصمت کے لئے حضرت رساں معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت واقعہ اسکے خلاف ہے، بالکل درست ہے کہ حضرت آدم کو جنت میں رکھا گیا اور انہیں صرف ایک درخت کا استثناء کر کے مکمل آزادی دیدی گئی تھی لیکن سب جانتے ہیں کہ حضرت آدم کی تخلیق انکو دنیا میں اپنا خلیفہ بنانے کے لئے ہوئی تھی، ان کو پیدا کر کے جنت میں ٹھہرانا منظور نہ تھا، دنیا میں بھیجنے سے پہلے جنت میں چند دن کی اقامت کا یہ مقصد ہے کہ حضرت آدم کو ان چیزوں کی مشق کرا دی جائے جن سے دنیا میں آنے کے بعد واسطہ ہوگا، خود حضرت آدم علیہ السلام سے یہ فرمایا گیا کہ دیکھو یہ شیطان تمہیں یہاں سے نکلوانہ دے، اس کہنے سے اتنی بات تو معلوم ہو ہی گئی کہ تمہیں یہاں سے نکالا جاسکتا ہے اور یہ ابھی تمہارے لئے دار الخلد نہیں اور انسان کی طبیعت کے متعلق معلوم ہے۔

الانسان حریص فیما منع انسان منع کی گئی چیز کے بارے میں حریص ہوتا ہے۔

اور چونکہ جنت میں اس ایک درخت کے علاوہ ہر طرح کی آزادی ہے، اسلئے خواہ مخواہ یہ خیال بھی ہونا چاہئے کہ آخر اس ایک درخت سے روکنے کا کیا راز ہے، گو یا خلافت ارض کیلئے جنت سے نکلنا تو ضروری تھا مگر یہ تنبیہ کر دی گئی کہ دیکھو اس نکلوانے کی نسبت شیطان کی طرف نہ ہو جائے۔

ان چند باتوں کے بعد یہ دیکھا جائے کہ شیطان نے کیا راہ اختیار کی ہوگی، یہ حضرات جنت کی سیر میں آزاد تھے، بلا روک ٹوک ہر جگہ جاسکتے تھے، ہو سکتا ہے کہ سیر کرتے کرتے باب جنت تک پہنچے ہوں اور شیطان باہر اپنا دادا کھیلنے کیلئے موقعہ کا منتظر ہو اور دور ہی دور سے کہہ رہا ہو کہ قصور معاف ہو تو میں عرصہ سے آپ ہی کے انتظار میں یہاں کھڑا ہوں، آج زیارت نصیب ہوئی، مقصد پورا ہوا، لو میں جا رہا ہوں پھر کبھی موقعہ ہو تو حاضر ہو کر کچھ عرض کروں گا پھر کبھی اتفاق سے آنا سامنا ہو گیا ہو اور اس نے چا پلوسی کی باتیں شروع کر دی ہوں اور کہا ہو مجھے آپ سے بڑی ندامت ہے اور اسکی وجہ سے میں ہمیشہ پریشان رہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اس کا کسی طرح تدارک کر دوں مگر سمجھ کام نہیں کرتی کہ کس طرح کروں آپکو مجھ پر اعتماد نہیں، آپ تو مجھے اپنا مخالف سمجھتے ہیں، میرے پاس ایک علم ہے اور اس کے اظہار میں آپ ہی کا فائدہ ہے مگر بے اعتمادی نے اس کا دروازہ بند کر دیا ہے خیر پھر کبھی موقعہ ہوگا تو عرض کروں گا اس طرح اپنا ایک اثر چھوڑ کر چمپت ہو گیا ہو اور جب دیکھا کہ دل میں جگہ بنتی جا رہی ہے تو کہا آپکو معلوم نہیں ہے ورنہ سارا راز اسی درخت میں ہے جس کے پاس جانے سے منع کیا گیا ہے اور دیکھو میں تم کو ایک بات بتلا رہا ہوں تم کو خداوند قدوس نے جنت میں رہنے کے لئے پیدا نہیں کیا دنیا میں جاؤ گے تو خدائے تعالیٰ سے بعد ہو جائیگا اور طرح طرح کے مصائب ہوں گے اس کا علاج یہ ہے کہ تم اس درخت کا پھل کھا لو تا کہ ہمیشہ کیلئے قرب خداوندی حاصل ہو جائے اور جنت تمہاری میراث

بن جائے کہتا ہے۔

یا آدم هل ادلك على شجرة الخلد
وملك لا یبلی (پ ۱۶ع ۱۶)

اے آدم کیا میں تم کو ہمیشگی کا درخت بتلا دوں
اور ایسی بادشاہی جس میں کبھی ضعف نہ آئے۔

شیطان کی ان باتوں کا حضرت حواء کے قلب پر اثر ہوا اور انہوں نے حضرت آدم علیہ السلام سے تذکرہ کیا، حضرت آدم علیہ السلام نے اثر نہ لیا اور فرمایا وہ شیطان ہے غلط کہتا ہے جب شیطان نے دیکھا کہ یہ وار خالی گیا تو زوردار قسمیں کھانا شروع کر دیں کہ تم مجھے اپنا بد خواہ نہ سمجھو میں تمہارا انتہائی خیر خواہ ہوں۔ چنانچہ قرآن عزیز میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

قال ما نها كما ربكما عن هذه
الشجرة الا ان تكونا ملكين
او تكونا من الخالدين وقاسمهما
انى لكما لمن الناصحين فذلاهما
بغرور (پ ۹ع ۸)

کہنے لگا کہ تم دونوں کو تمہارے رب نے اس درخت سے
اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں
کہیں فرشتہ ہو جاؤ یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے ہو جاؤ
اور ان دونوں کے روبرو قسم کھالی کہ یقین جائے میں آپ دونوں
کا خیر خواہ ہوں سوان دونوں کو فریب سے نیچے لے آیا۔

شیطان کی ان زوردار قسموں کے بعد وہ بات نگاہوں سے اوجھل ہو گئی، اگر وہ بات سامنے ہوتی تو شیطان کی ستر ہزار قسموں کا بھی اعتبار نہ فرماتے لیکن وہ بات خیال سے اوجھل ہو گئی تو ارتکاب جرم کی نوبت آگئی، ناصحین کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ شیطان نے یہ کہا ہوگا، جب آپ بالکل ابتداء میں آئے تھے اس وقت یہ درخت مضرت تھا، جیسا کہ کسی ضعیف المعده انسان کیلئے ثقیل غذا میں مضرت ہوتی ہے لیکن اب میں حقیقت ظاہر کر رہا ہوں کہ اب آپ کے اندر اس پھل کو کھالینے کی صلاحیت پیدا ہو گئی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ کوئی خداوند قدوس کا نام بھی غلط جگہ استعمال کر سکتا ہے، یہ لوگ خداوند قدوس کا نام آجانیکیے بعد بالکل از خود رفتہ ہو جاتے ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ یاد کرو کہ کسی نے مکان کے قریب "الا اللہ" کا نعرہ لگایا، حضرت ابراہیم علیہ السلام باہر تشریف لائے اور اس سے کہا ایک بار اور وہی صدا سنا دو، اور اس نے کہا کیا دو گے؟ کہا کہ جو کچھ میرے پاس ہے، وہ سب کچھ دیا اس نے دہرا دیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیٹابی اور بڑھی اور پھر اس سے دوبارہ کہنے کیلئے کیا اس نے کہا اب کیا دو گے، فرمایا جان بھی قربان ہے، یہ نعرہ لگانے والے حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے اور امتحان کی غرض سے تشریف لائے تھے، پھر اگر درمیان میں خداوند قدوس کا نام آجانیکیے بعد حضرت آدم باور کر لیں تو کیا حیرت ہے؟

قرآن کریم میں حضرت آدم علیہ السلام کا دامن صاف کرنے کیلئے صاف طریقہ پر فرمایا گیا ہے۔

ولقد عهدنا الی ادم من قبل
فنسی ولم نجد له عزما
اور اس سے پہلے ہم آدم کو ایک حکم دے چکے تھے
سوان سے لغزش ہوگئی اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی۔
یہاں بالکل صاف طور پر فرمایا گیا ہے حضرت آدم علیہ السلام کا عزم نافرمانی کا نہ تھا بلکہ وہ اس سلسلہ
میں معذور سمجھے گئے ہیں اسی کو فرمایا گیا۔

نسی آدم فنسیت ذریتہ (ترمذی جلد ۲ ص ۱۳۳) آدم کو نسیان ہوا سوانکی اولاد کو بھی نسیان ہوا۔

اب رہی یہ بات کہ پھر اس نسیان کو قرآن کریم میں عصیان اور غواہی سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے، تو یہ وہی
بات ہے کہ 'مقرباں را بیش بود حیرانی' اور 'جن کے رتبے ہیں سوانکی سوا مشکل ہے' اسلئے ان بلند مرتبہ حضرات کی
چھوٹی غلطی بڑی شمار کی جاتی ہے، اسلئے ذرا غفلت پر بھی بڑا الزام عائد کر دیا جاتا ہے۔

تصویر کا دوسرا رخ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو دنیا کے لئے پیدا کیا گیا تھا اور دنیا میں کام کرنے کے لئے چند
روز جنت میں بھی رکھا گیا، اور یہ بھی معلوم ہے کہ جنت میں دخول تو بغیر عمل ممکن ہے لیکن وہاں سے خروج بغیر سبب کے
ناممکن ہے چنانچہ حساب و کتاب کے بعد جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے تو جنت کا کچھ حصہ خالی رہ جائیگا پھر جنت کا
تقاضا ہوگا کہ بھرنے کا وعدہ تھا چنانچہ اسکے بعد ایک مخلوق پیدا کی جائیگی اور بغیر عمل جنت میں داخل کر دی جائیگی تاکہ وہ
خالی جگہ پر ہو جائے، معلوم ہوا کہ دخول بغیر عمل ہو سکتا ہے لیکن خروج بغیر سبب صحیح نہیں ہے، اس کے لئے خروج کا سبب
آدم علیہ السلام کی اس لغزش کو بنایا گیا جس کا نتیجہ اور سبب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام اور انکی اولاد کو معلوم ہو جائے
کہ یہ ہماری جنت نافرمانی کی جگہ نہیں ہے، آپ دارالعمل بھیجے جا رہے ہیں، وہاں جا کر ایسے اعمال اختیار کریں
جو نافرمانی کے نہ ہوں تاکہ اعمال صالحہ کے بعد جنت میں جا سکیں جنت میں آرام کے اسباب تو دکھلا ہی دیئے گئے ہیں۔

حضرت آدم کا دوسرا واقعہ | خداوند قدوس نے حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور حضرت آدم سے حواء کو بنایا
اور ان سے توالد و تناسل کا سلسلہ قائم کیا اور اسکی صورت یہ رکھی کہ عورت پر مرد کا
غشیان ہوتا ہے اور حمل قرار پاتا ہے ابتداء حمل میں معمولی اثر ہوتا ہے جو کسی کام میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا لیکن حمل بڑھتا
جاتا ہے اور بوجھ زیادہ ہو جاتا ہے جب یہاں نوبت پہنچتی ہے تو طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہیں، نہ معلوم پیٹ
میں بچہ ہے یا کوئی جانور ہے، طرح طرح کے اوہام عورت کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور عورت کے ساتھ مرد بھی
گھبراتا ہے اور دونوں اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ اگر جیتا جاگتا بچہ پیدا ہوا تو شکر ادا کریں گے لیکن جب بچہ
پیدا ہو جاتا ہے تو غیر اللہ کی طرف جھک جاتے ہیں، قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

هو الذی خلقکم من نفس واحدة
وجعل منها زوجھا لیسکن الیھا
وہ اللہ ایسا ہے جس نے تم کو تن واحد سے پیدا کیا اور
اسی نے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس اپنے جوڑے سے انس

حاصل کرے پھر جب میاں نے بی بی سے قربت کی تو اسکو حمل رہ گیا ہلکا سا سو وہ اسکو لئے چلتی پھرتی رہی پھر جب وہ بوجھل ہو گئی تو دونوں میاں بی بی اللہ سے جو ان کا مالک ہے دعا کرنے لگے کہ اگر آپ نے ہمکو صحیح سالم اولاد دیدی تو ہم خوب شکر گزاری کریں گے سو جب اللہ نے ان دونوں کو صحیح سالم اولاد دیدی تو اللہ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے، سو اللہ پاک ہے ان کے شرک سے۔

فلما تغشها حملت حملاً خفياً
فمرت به فلما اثقلت دعوا
اللہ ربہما لئن اتینا صالحا
لنکونن من الشاکرین فلما
اتہما صالحا جعل لہ شرکاء
فیما اتہما فتعلی اللہ عما
یشرکون (پ ۱۳۶۹)

آیت کا سیاق و سباق یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام و حواء کا ذکر آ رہا ہے اور اسکے بعد فلما تغشها فرمایا گیا اور اس کے بعد جعل لہ شرکاء فرمایا، بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ معاذ اللہ آدم و حواء نے ارتکاب شرک کیا اور اگر اس کے ساتھ ترمذی کی یہ روایت بھی ملا لیں۔

حضرت سمرہ بن جندب سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب حواء کو حمل ہوا تو شیطان آیا اور حضرت حواء کے کوئی بچہ زندہ نہ رہتا تھا شیطان نے کہا کہ بچہ کا نام عبد الحارث رکھنا چنانچہ انہوں نے عبد الحارث نام رکھ دیا پس وہ زندہ رہا اور یہ چیز شیطان کے دوسے اور اسکے حکم سے تھی۔

عن سمرۃ بن جندب عن النبی
ﷺ قال لما حملت حواء طاف
بہا ابلیس وکان لا یعیش لہا ولد
فقال سمیہ عبد الحارث فسمتہ
عبد الحارث فعاش وکان ذلک من
وحي الشیطان وامرہ۔

جب آیت کریمہ کے اس سیاق و سباق کو دیکھنے کے بعد حدیث پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حدیث آیت ہی کی تفسیر میں واقع ہے اور اس طرح معاذ اللہ حضرت آدم علیہ السلام پر شرک کا الزام عائد ہوتا ہے۔ لیکن یہ سراسر نادانی ہے دراصل آیات کی تفسیر میں اصلی معنی کی رعایت رکھنی چاہئے، رہا حدیث کا مضمون وہ اگر آیت کریمہ کے ساتھ بغیر کسی اشکال کے جمع ہو سکتا ہو تو جمع کر لیا جائے ورنہ اسکے لئے دوسرا مجمل تلاش کیا جائے اور خصوصاً جبکہ یہ حدیث خبر واحد ہی ہے۔

اصل یہ ہے کہ خداوند قدوس اپنے بندوں کو تنبیہ فرماتا ہے پہلے فرمایا کہ ہم نے تمہارے وجود کا سامان اس طرح کیا کہ پہلے حضرت آدم کو پیدا کیا پھر ان کی موانست کیلئے حضرت حواء کی پیدائش عمل میں آئی، آدم علیہ السلام اٹھ کر دیکھتے ہیں کہ بائیں جانب ایک خوبصورت عورت بیٹھی ہے، اس احسان کا تقاضا تھا کہ انسان خداوند قدوس کی اس نعمت کا شکر ادا کرے اور ہمہ وقت اس کی اطاعت و فرمانبرداری میں لگا رہے مگر انسان کی حالت یہ ہے کہ اطاعت

و فرمانبرداری کے بجائے دوسروں کا گن گاتا ہے حضرت آدم علیہ السلام سے اس آیت کا جوڑ نہیں ہے بلکہ صنعت
استخدام کے طور پر پہلے حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر ہے، پھر ذریت آدم کا اب اسکے بعد اگر وہ حدیث جمع ہوتی ہے
تو جمع کی جائے ورنہ چھوڑ دی جائے، خبر واحد ہی تو ہے جو قرآن کے مقابل حجت نہیں، اول تو یہ روایت صحیح نہیں ہے
اگرچہ ترمذی نے اسے حسن لکھا ہے اور اگر اس روایت کو لے بھی لیں تو کوئی اشکال پیش نہیں آتا، کیونکہ بیان کردہ قصہ
میں شرک فی الذات شرک فی الصفات اور شرک فی الافعال نہیں ہے بلکہ اسمیں صرف یہ مذکور ہے کہ انہوں
نے عبد الحارث نام رکھا اور یہ بات ثابت نہیں ہے کہ حارث شیطان کا نام تھا بلکہ اسکے لغوی معنی کھیتی کرنیوالے کے ہیں
اور خداوند قدوس اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں۔

أَنْتُمْ تَزْرَعُونَ اَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ (پ ۱۵۷۷) اس کو تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔

اس اعتبار سے اس نام میں کوئی خرابی نہیں نیز یہ کہ اولاد کے زندہ رہنے کی چونکہ ایک تدبیر سمجھ میں آئی، اسلئے
حضرت حواء نے اسکو اختیار کیا اور حضرت آدم علیہ السلام سے اس پر انکار منقول نہیں؛ لہذا تعبیر میں صیغہ تشبیہ کا وارد ہوا،
اسکا شرک ممنوع سے کوئی تعلق نہیں، غایت سے غایت شرک فی التسمیہ کہا جاسکتا ہے۔

اس شرک نہ ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے وہ نام نہیں بدلا، اگر یہ شرک ہوتا تو
نام ضرور بدلا جاتا کیونکہ کسی بھی پیغمبر کا شرک پر قائم رہنا ممکن نہیں ہے نام نہ بدلنے کا ثبوت یہ ہے کہ بدلنا کسی روایت
سے ثابت نہیں، رہا قرآن کریم میں لفظ شرک سے تعبیر کرنا جعل لہ شرک لہ تو دراصل یہ الزام قائم کرنا ہے کہ تم نے اس
خیال سے کہ بچہ زندہ رہے ایک غلط اقدام کیا، دوسرے کا بتایا ہوا نام بغیر ہماری اجازت کے رکھ لیا حالانکہ موت و حیات
ہمارے قبضہ میں ہے اور یہ سب کچھ ہماری حکمت کے ماتحت ہوتا رہتا ہے، گویا تشبیہ کی غرض سے لفظ شرک کے ساتھ تعبیر
کی گئی ہے کہ تم نے ہمارا انتظار کئے بغیر دوسرے کے مشورے سے ”عبد الحارث“ نام رکھ دیا، یہ صورت تو جب ہے کہ
آیت کے ساتھ روایت کو جمع کریں ورنہ روایت سنداً کمزور ہے اور پیغمبر پر الزام شرک آئیگی وجہ سے مجروح بھی، اسلئے
اسے قبول کرنے ہی کی ضرورت نہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام | آدم ثانی حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ بھی قرآن کریم میں مذکور ہے اور جب قیامت
کے دن امتیں حضرت نوح علیہ السلام کے پاس سفارش کے لئے پہنچیں گی تو حضرت
نوح علیہ السلام معذرت میں یہی بات پیش کریں گے، واقعہ یہ ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کو اپنی قوم سے مایوسی
ہو گئی تو انہوں نے قوم کے لئے بددعا کی۔

اے میرے پروردگار! کافروں میں سے زمین

پر ایک باشندہ بھی مت چھوڑ۔

رب لاتذر علی الارض من

الکافرین دیار (پ ۱۰۷۹)

بددعا قبول کر لی گئی اور حضرت نوح علیہ السلام سے یہ کہہ دیا گیا کہ آپ ایک کشتی بنائیں اور اسمیں آپ خود سوار ہو جائیں، اپنے اہل و عیال کو سوار کر لیں اور ان لوگوں کو بھی ساتھ لے لیں جو مسلمان ہو چکے ہیں اور ان جانوروں کا بھی ایک جوڑا ساتھ رکھ لیں جو پانی میں زندہ نہیں رہ سکتے اور انسان کو ان کی ضرورت رہتی ہے، حضرت نوح علیہ السلام نے ان سب کو اپنے ساتھ لیا اور حضرت نوح کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ اب کسی شخص کے بارے میں بچانے کی سفارش نہ کریں بلکہ یہ فیصلہ قطعی ہو چکا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَأَوْحَىٰ إِلَىٰ نُوْحٍ أَنَّهُ لَنْ يُؤْمِنَ مِنْ
مَنْ قَوْمِكَ إِلَّا مَنْ قَدْ آمَنَ فَلَا
تَبْتَيْسُ بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ وَاصْنَعْ
الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَّوْحَيْنَا وَلَا
تَخَاطَبُنِي فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا أَنَّهُمْ
مَغْرَقُونَ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ وَكَلَّمَا
مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأْ مِنْ قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ
قَالَ إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ
مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ
مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ
عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ
أَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُورَ قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا
مَنْ كَلَّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَأَهْلَكَ
إِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ آمَنَ
وَمَا آمَنَ مَعَهُ إِلَّا قَلِيلٌ
(پ ۱۲ ع ۴)

اور نوح کے پاس وحی بھیجی گئی کہ سوا ان کے جو ایمان لا چکے ہیں اور کوئی شخص تمہاری قوم میں سے ایمان نہ لایگا سو جو کچھ یہ لوگ کر رہے ہیں اس پر کچھ غم نہ کرو اور تم ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے کشتی تیار کرو اور مجھ سے کافروں کے بارے میں کچھ گفتگو مت کرنا وہ سب غرق کئے جائیں گے اور وہ کشتی تیار کرنے لگے اور جب کبھی انکی قوم میں سے کسی رئیس گروہ کا گزر ہوتا تو ان سے ہنسی کرتے آپ فرماتے کہ اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم ہم پر ہنستے ہو سو ابھی تمکو معلوم ہوا جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر رسوا کن عذاب آیا چاہتا ہے اور اس پر دائمی عذاب نازل ہوتا ہے یہاں تک کہ حکم آپہنچا اور زمین سے پانی ابلنا شروع ہوا ہم نے فرمایا کہ ہر قسم میں سے ایک ایک نر اور ایک ایک مادہ یعنی دو عدد اسمیں چڑھا لو اور اپنے گھر والوں کو بھی باستثناء اسکے جس پر حکم نافذ ہو چکا ہے اور دوسرے ایمان والوں کو بھی اور بجز قلیل آدمیوں کے انکے ساتھ کوئی ایمان نہ لایا تھا۔

ارشاد ہے کہ ان کے علاوہ اب کوئی ایمان لانیوالا نہیں ہے اور چونکہ امت کا معاملہ ہے جو بمنزلہ اولاد ہوتی ہے اور اولاد ناخلف ہوتی ہے تب بھی باپ کا دل بچوں کی مصیبت پر بھر آتا ہے اس لئے پہلے ہی کہہ دیا گیا کہ تم ”رب لاتذر علی الارض“ کہہ رہے ہو لیکن طوفان کے وقت دعا نہ کرنا، غرض کشتی تو بن گئی لوگ مذاق کر رہے ہیں تنور سے پانی ابلنا شروع ہوا جو عذاب کی علامت تھی، دوسری طرف آسمان کے دہانے کھل گئے حکم ہوا کہ مومنین کو لے کر بیٹھ

جائے، حضرت نوح علیہ السلام سوار ہو گئے اور کشتی چلنے لگی ارشاد ہے۔

وہی تجری بہم فی موج کالجبال
ونادی نوح ابنہ وکان فی معزل
یابسی اربکب معنا ولا تکن مع
الکافرین (پ ۱۲ ع ۴)

اور وہ کشتی انکو لیکر پہاڑ جیسی موجوں میں چلنے لگی
اور نوح نے اپنے بیٹے کو پکارا اور وہ علیحدہ مقام
پر تھا، اے میرے بیٹے! ہمارے ساتھ سوار ہو جا
اور کافروں کے ساتھ مت ہو۔

کشتی چل رہی ہے، سامنے کنعان بن نوح ہے، نوح کی نصیحت کا اس پر قطعاً اثر نہیں ہے، اور حضرت نوح یہ
بھی جانتے ہیں کہ کوئی غیر مسلم کشتی میں نہیں بیٹھ سکتا لیکن اس کے باوجود فرماتے ہیں ہمارے بیٹے ہمارے ساتھ سوار
ہو جاؤ یعنی ایمان لے آؤ تا کہ سواری کا موقع مل سکے لیکن اس نے جواب دیا۔

ساری النی جبل یعضنی من الماء
قال لا عصم الیوم من امر اللہ
الا من رحم وحوال بینہما الموج
فکان من المفرقین (پ ۱۲ ع ۴)

میں ابھی کسی پہاڑ کی پناہ لے لوں گا جو مجھ کو پانی سے
بچالے گا، نوح نے فرمایا کہ اللہ کے قہر سے آج کوئی
بچانے والا نہیں ہے لیکن جس پر وہ رحم کرے اور دونوں
کے بیچ میں ایک موج حائل ہوگئی پس وہ غرق ہو گیا۔
اس کے بعد پانی اتر گیا اور کشتی ٹھہر گئی، اب حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی، ارشاد ہے۔

ونادی نوح ربہ فقال رب ان
ابسی من اہلی وان وعدك الحق
وانت احکم الحاکمین (پ ۱۲ ع ۴)

اور نوح نے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا اے میرے
رب میرا یہ بیٹا میرے گھر والوں میں سے ہے اور آپ کا
وعدہ بالکل سچا ہے اور آپ احکم الحاکمین ہیں۔
حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کا جواب دیا گیا۔

قال یا نوح انه لیس من اہلك
انه عمل غیر صالح فلا تنسنن ما
لیس لك به علم انی اعظک ان
تکون من الجاہلین (پ ۱۲ ع ۴)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے نوح یہ شخص تمہارے
گھر والوں میں نہیں یہ تباہ کار ہے سو مجھ سے ایسی چیز
کی درخواست مت کرو جسکی تم کو خبر نہیں، میں تم
کو نصیحت کرتا ہوں کہ تم نادان نہ بن جاؤ۔

جواب سخت ہے، سنایا جا رہا ہے کہ یہ تمہارے اہل میں داخل نہیں ہے، تمہارے اہل میں وہ لوگ داخل ہیں جن
کے عمل صالح ہیں، تم نے بددعا میں یہی کہا تھا کہ کوئی کافر روئے زمین پر چلتا پھرتا باقی نہ رہے کیونکہ اب ان سے ایمان
کی کوئی امید نہیں ہے تو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ ایک طرف بددعا کرتے ہو اور دوسری طرف اپنے بیٹے کے لئے محفوظ
رہنے کی دعا کرتے ہو، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

ان اهل فلان لیس منی، ان میری قرابت کسی خاص قبیلے سے نہیں، میرے اولیائی الا المتقون۔ رشتہ دار صرف اہل تقویٰ ہیں۔

آگے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے کہ اس چیز کے بارے میں ہم سے سوال مت کرو جس کا تمہیں علم نہیں ہے، یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی طرف سے صفائی پیش کی جا رہی ہے کہ ان کے سوال کی وجہ لاعلمی تھی، لاعلمی یہ کہ من سبق علیہ القول جن لوگوں پر قول سابق ہو چکا ہے۔

میں ابہام تھا، ارشاد یہ تھا کہ ہم تمہارے اہل کو بچائیں گے لیکن جن پر حکم نافذ ہو چکا ہے وہ نہ بچیں گے اور ناجی وغیر ناجی کی تفصیل بتلائی نہیں تھی اسلئے فرمایا تھا کہ آج تو مومن ہی ہو کر پناہ مل سکتی، ورنہ کہیں جائے پناہ نہیں اور اگر نوح علیہ السلام کو معلوم ہوتا کہ یہ بھی ان ہی لوگوں میں داخل ہے تو دعائے کرتے۔

جس طرح آذر جب قیامت میں بری صورت میں سامنے آئے گا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمائیں گے کہ میں تجھ سے کہتا تھا کہ میری بات قبول کر لے مگر تو نے مانا نہ تھا، اس پر آذر کہے گا کہ آج سفارش کر دے، حضرت ابراہیم علیہ السلام دعا کریں گے کہ اے اللہ! تو نے مجھے رسوا نہ کرنے کا وعدہ فرمایا تھا، خداوند قدوس حضرت ابراہیم سے فرمائیں گے ڈار نظر نیچی کرو، نظر نیچی کرتے ہی آذر کو زبجو کی شکل دی جائیگی، جو نجاست میں لت پت ہوگا حضرت ابراہیم جب اس کو اس حال میں دیکھیں گے تو انہیں نفرت ہو جائیگی۔ رسوائی سے اس طرح بچ گئے کہ دیکھنے والے اب آذر کو آذر نہ پہچان سکیں گے، حالانکہ آذر سے بیزاری کے سلسلے میں آیت موجود ہے۔

فلما تبین لہ انہ عدول لہ
تبرأمنہ (پ ۱۱ ع ۳)

پھر جب ان پر بات ظاہر ہو گئی کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو اس سے محض بے تعلق ہو گئے۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام کی دعا لاعلمی اور ناواقفیت پر مبنی تھی، اس لئے اس قصہ سے مسئلہ عصمت انبیاء پر کوئی ضرب نہیں پہنچتی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق بخاری شریف ہی کی روایت میں ہے کہ انہوں نے عمر میں تین بار جھوٹ کا ارتکاب کیا، ارشاد ہے۔

عن ابی ہریرۃ قال لم یکذب
ابراہیم الا ثلاث کذبات ثنتین منہن
فی ذات اللہ قوله انی سقیم وقوله
بل فعلہ کبیرہم (بخاری ج ۱ ص ۲۷۲)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم نے تین بار کے علاوہ کبھی جھوٹ نہیں بولا جن میں دو صرف اللہ کے لئے تھے ایک انکا یہ فرمانا کہ میں بیمار ہوں اور دوسرے یہ کہنا کہ ان کے بڑے نے ایسا کیا ہے۔

اس حدیث میں بصراحت تین کذب بتلائے گئے ہیں، پہلا واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کسی جمع میں شرکت کی دعوت دی گئی تو ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا، ارشاد ہے۔

فنظر نظرة فى النجوم فقال انى
سقیم (پ ۷۲۳ع)

سو ابراہیم نے ستاروں کو ایک نگاہ بھر کر
دیکھا اور کہہ دیا کہ میں بیمار ہوں۔

لوگوں نے انہیں معذور سمجھا اور انہیں یقین اس لئے آ گیا کہ حضرت ابراہیم نے ستاروں کو دیکھنے کے بعد ایسا فرمایا تھا انہوں نے سمجھا کہ علم نجوم کی رو سے ابراہیم ایسا فرما رہے ہیں اور وہ لوگ نجوم پر اعتقاد رکھتے تھے۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ چلے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بتخانہ تشریف لے گئے اور بتوں سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے، تم کھاتے اور بولتے کیوں نہیں؟ جب کوئی جواب نہ ملا اور نہ ایسا ممکن ہی تھا تو حضرت ابراہیم نے توڑ پھوڑ شروع کر دی، اور اس کام سے نمٹ کر تیر بڑے بت کے کاندھے پر رکھ دیا، جب وہ لوگ فارغ ہو کر معبودانِ باطل کے حضور پہنچے، دیکھا معاملہ خراب ہو چکا ہے اور معبودین ٹکڑے ٹکڑے ہوئے پڑے ہیں تو عالم بدحواسی میں بے ساختہ یہ کلمات زبان پر آئے۔

من فعل هذا بالهتنا (پ ۷۱۷ع)

یہ ہمارے بتوں کے ساتھ کس نے کیا ہے

اس پر قوم کے بعض افراد نے جن کے کانوں میں حضرت ابراہیم کے یہ الفاظ

وتالله لا كيدن اصنامكم بعدان

اور خدا کی قسم میں تمہارے ان بتوں کی گت

تولوا مدبرين (پ ۷۱۷ع)

بناؤں گا جب تم چلے جاؤ گے۔

یہ سچ چکے تھے بتوں کا یہ حال دیکھ کر آپس میں کہا، ہونہو یہ حرکت تو ابراہیم علیہ السلام کی معلوم ہوتی ہے، اسکو حاضر کر کے تفتیش کی جائے چنانچہ حضرت ابراہیم حاضر کئے گئے اور پوچھا گیا۔

آنت فعلت هذا بالهتنا ابراهيم

کیا ہمارے بتوں کے ساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے

(پ ۷۱۷ع)

اے ابراہیم۔

تو حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا

بل فعله كبيرهم هذا فاستلوهم

نہیں، بلکہ ان کے اس بڑے نے کی، سو ان سے

ان كانوا ينطقون (پ ۷۱۷ع)

پوچھ لو، اگر یہ بولتے ہوں۔

اشکال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا بھی خلاف واقعہ تھا۔

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باپ نے خفا ہو کر گھر سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور یہ کہا کہ میں تمہیں سنگسار کر دوں گا جسکو قرآن کریم میں ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔

باپ نے کہا کہ تم میرے معبودوں سے پھرے ہوئے ہو، اے ابراہیم! اگر تم باز نہ آئے تو میں ضرور تم کو مارے پتھروں کے سنگسار کروں گا اور ہمیشہ کے لئے مجھ سے برکنار رہو، کہا میرا سلام لو میں تیرے لئے رب سے درخواست مغفرت کروں گا بیشک وہ مجھ پر مہربان ہے۔

قال اراغب انت عن الہتی یا ابراہیم
لئن لم تنتہ لا رجمک و اہجرنی
ملیا قال سلم علیک سا ستغفر
لک ربی انہ کان بی حفیاً
(پ ۶۱۶ع)

باپ سے رخصت ہو کر جب روانہ ہوئے تو ان کی بیوی حضرت سارہ ساتھ تھیں، راہ میں ایک ظالم و جابر حکمران کی حکومت تھی اور اس کا یہ دستور تھا کہ جب کوئی خوبصورت عورت مرد کے ساتھ اسکی قلمرو سے گزرتی تو وہ مرد و عورت دونوں کو گرفتار کر لیتا تھا اور اگر یہ معلو ہوتا کہ ساتھ چلنے والا مرد اسکا شوہر ہے تو اسے قتل کر دیتا اور عورت کو اپنے تصرف میں لاتا اور اگر شوہر نہ ہوتا تو اسے قتل نہ کرتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس کا یہ قانون معلوم تھا، جب اس مقام پر پہنچے اور حکومت کی طرف سے ان کو روک کر حاضری کا حکم دیا گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وہاں پہنچ کر حضرت سارہ کو اپنی بہن ظاہر کیا اور واپس آ کر حضرت سارہ کو بھی صورت حال سے مطلع فرما دیا۔ حدیث شریف میں اس قصے کو ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے۔

اور فرمایا اس اثناء میں جب ایک دن حضرت ابراہیم اور سارہ جا رہے تھے کہ ان کا گزر ایک ظالم بادشاہ سے ہوا اسکو بتلایا گیا کہ یہاں ایک مرد ہے، اس کے ساتھ ایک نہایت خوبصورت عورت ہے اس نے ان کے پاس قاصد بھیج دیا اور سارہ کے بارے میں دریافت کیا اور پوچھا یہ کون ہے، حضرت ابراہیم نے فرمایا میری بہن ہے، پھر حضرت ابراہیم سارہ کے پاس آئے اور فرمایا، سارہ! روئے زمین پر میرے اور تمہارے علاوہ کوئی مومن نہیں ہے اور اس انسان نے مجھ سے سوال کیا تھا تو میں نے یہ بتایا کہ تم میری بہن ہو، پس تم میری تکذیب نہ کرنا۔

وقال بینا ہو ذات یوم وسارۃ اذاتی
علی جبار من الجبابرة فقیل لہ ان
ہہنا رجلا معہ امرأۃ من احسن الناس
فارسل الیہ فسالہ عنہا فقال
من ہذہ، قال اختی فاتی سارۃ فقال
یا سارۃ لیس علی وجہ الارض
مومن غیری وغیرک وان ہذا
سالنی فاخبرتہ انک اختی
فلا تکذبینی (بخاری ج ۱ ص ۴۷۴)

اس واقعہ میں دو باتیں لحاظ کے قابل ہیں ایک تو یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود غلط بتلا کر آئے ہیں اور پھر حضرت سارہ کو بھی اس غلط بیانی کی تلقین فرما رہے ہیں، بہر کیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جانب تین کذب منسوب ہیں، اسی وجہ سے قیامت میں جب امتیں سفارش کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حاضری دیں گی تو فرمائیں گے کہ مجھ اپنی ہی فکر ہے۔

جوابات | ان تمام چیزوں پر کذب کا اطلاق صورت کے اعتبار سے ہے، حقیقت کے لحاظ سے یہ تینوں چیزیں از قبیل معاریض ہیں جن کو توریہ کہا جاتا ہے اور توریہ کا کذب سے کوئی واسطہ نہیں۔

ان فی المعاریض لمنذوحۃ
عن الکذب
بے شک معاریض میں کذب کے لئے کسی درجہ میں گنجائش ہے۔

اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اگر الزام کذب آسکتا ہے تو صرف ان ہی واقعات کی بنا پر آسکتا ہے اور یہ کذب نہیں ہے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دامن کذب سے بالکل پاک و صاف ہے چنانچہ حدیث شریف میں اس کی تشریح اس طرح موجود ہے۔

ثنتین منہن فی ذات اللہ (بخاری ج ۱ ص ۴۷۴) دو ان میں سے اللہ کے واسطے ہیں۔

سب کچھ خداوند قدوس کے لئے کیا ہے، اس میں اپنی ذات کے لئے کچھ نہیں ہے اور ایسا فعل جس میں صرف خداوند قدوس کی ذات مقصود ہو، عبادت شمار ہوتا ہے، پھر یہ کہ اس میں کذب کا شائبہ بھی نہیں ہے اس لئے کہ جسمانی ہی امراض میں سقم کا انحصار نہیں، یہ ان لوگوں کی بیوقوفی تھی جنہوں نے ایسا سمجھا، رہا ستاروں کی طرف دیکھنا یہ ان لوگوں کے دکھلانے کے لئے تھا، اسی کو توریہ بھی کہہ سکتے ہیں، توریہ کے معنی یہ ہیں کہ ایک لفظ کے قریب اور بعید دو معنی ہوں اور استعمال میں قریب معنی چھوڑ کر بعید مراد لئے جائیں، حضرت ابراہیم نے معنی بعید یعنی سقم روحانی کو بطور توریہ استعمال فرمایا۔

بات دراصل یہ تھی کہ ان لوگوں کے یہاں ایک عید کا دن تھا جس میں یہ سب لوگ جمع ہوتے تھے، اور آبادی سے باہر جاتے تھے، ان لوگوں نے حضرت ابراہیم سے کہا کہ آپ بھی ہمارے ہمراہ چلیں، حضرت ابراہیم کو جانا نہیں تھا اس لئے انہوں نے پہلے ستاروں کی طرف نظر اٹھائی اور پھر فرمایا "انسی سقیم" چونکہ یہ لوگ نجوم پرست اور بت پرست تھے اس لئے ایک ایسی صورت اختیار کی کہ وہ لوگ اصرار ہی نہ کر سکیں، ستاروں پر نظر کرنے سے ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ حضرت ابراہیم نجوم کے ذریعہ کچھ معلوم کر نیلے بعد اپنے سقم کا فیصلہ کر رہے ہیں، حالانکہ حضرت ابراہیم نے ایسا نہ کیا تھا بلکہ ان کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ اے خداوند قدوس! یہ لوگ ایک غلط کام کے لئے مجھے مجبور کئے دیتے ہیں، تو ان کم بختوں سے مجھے نجات دے، اس لئے اول تو یہ بات اپنی جگہ غلط نہیں ہے، دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم نے اپنی ذات کے لئے ایسا نہیں کیا بلکہ مقصد یہ تھا کہ ان حضرات کا مجمع کفریہ مجمع ہے اور میری شرکت سے ان کے اس مجمع کو فروغ ہو سکتا ہے، اس بنا پر ان کے مجمع میں شرکت من کثر سواد قوم فہو منہم میں آتی ہے، دیکھنے والا یہی فیصلہ کریگا کہ یہ بھی انکے مجمع میں بہ رضا و رغبت شریک ہیں، اس بنا پر انسی سقیم فرمایا کہ بھائی میں تو بیمار آدمی ہوں، مجھے یجا کر کیوں اپنے مجمع کو بے لطف بناتے ہو۔

افسردہ دل افسردہ کندا نچنے را

در محفل خود را مدہ ہچو منے را

”انسی سقیم“ کے معنی عام طور پر مفسرین نے ساسقم کے لکھے ہیں، یعنی میں عنقریب بیمار ہو جاؤں گا کیونکہ یہ باتیں میرے مزاج کے خلاف ہیں اور خلاف مزاج کسی بات کا پیش آجانا طبیعت میں انحراف پیدا کرتا ہے اور اسی انحراف کو سقیم بھی کہا جاتا ہے لیکن اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

دوسری بات یعنی بل فعلہ کبیرہم کی حقیقت بھی وہی فی ذات اللہ ہے اور اس میں بھی شائبہ کذب نہیں ہے، صورت یہ پیش آئی کہ جب یہ لوگ باہر چلے گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت خانہ کا تالا کھولا اور بتوں کی مرمت کر ڈالی، پھر لطف یہ کہ تبر بڑے بت کے کاندھے پر رکھ دیا اور آگئے، جب یہ لوگ واپس ہوئے تو آپس میں کہنے لگے۔

بعض نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کو جسے ابراہیم کہا جاتا ہے ان بتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا ہے انہوں نے کہا اچھا تو انہیں سب لوگوں کے سامنے حاضر کرو۔

سمعنا فی ید کرہم یقال
لہ ابراہیم قالوا فاتوا بہ علی
اعین الناس لعلہم یشہدون
(پ ۷۷ ع ۵)

کیا ہمارے آہے کے ساتھ تم نے یہ حرکت کی ہے
اے ابراہیم۔

جب ابراہیم آگئے تو ان لوگوں نے پوچھا۔
اانت فعلت ہذا بالہتنا یا ابراہیم
(پ ۷۷ ع ۵)

فرمایا! نہیں، بلکہ ان کے اس بڑے نے کی ہے
سوان سے پوچھ لو، اگر یہ بولتے ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا۔
قال بل فعلہ کبیرہم ہذا فسئلوہم
ان کانوا ینطقون (پ ۷۷ ع ۵)

اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لطیف تو یہ فرمایا ہے کیونکہ آپ یہ فرما رہے ہیں کہ انکے بڑے نے کیا ہے، بظاہر اسکے یہ معنی ہیں کہ اپنے معبودین زخم خوردہ سے پوچھو، اس بڑے بت سے پوچھو، قاعدہ ہے کہ اگر کسی گھر میں مقتول پایا جائے اور کوئی شخص خونچکاں تلوار لے کر مکان کے اندر سے نکلے تو اسی کو مجرم قرار دیں گے پھر کیا وجہ ہے کہ آپ حضرات اس شخص کو مجرم نہیں قرار دیتے جسکے پاس یہ تبر موجود ہے لیکن اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ ہاں میں کہتا ہوں کہ جو ان کا بڑا ہے اس نے کیا ہے، یہ تمہارے زخم خوردہ معبودین اسکی شہادت دیں گے، اگر یہ بول سکتے ہیں تو ان سے پوچھا جائے مجھ سے سوال کرنے کا کیا حق ہے، مطلب یہ ہے کہ میں نے کیا ہے اب تم سے جو کچھ ہو سکے کر لو، جو تمہارے آہے سے خوف نہ کرتا ہو وہ تم سے کیا خوف کرے گا۔

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے زبردست چیلنج ہے یعنی تمہاری جہالت کی انتہا ہو گئی، مجھ سے پوچھنے

آئے ہو، ارے یہ تو تمہارے اعتقاد میں آلہہ ہیں اور آلہہ پر کسی شخص کو قدرت نہیں ہو سکتی ورنہ اس کی الوہیت کیا ہوئی
تمسخر ہوا، اس بنا پر معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ اچھا جاؤ میں نے ہی کیا ہے یہ بڑا بتلادے گا، گویا کافروں پر اتمام حجت کر رہے
ہیں اور صاف فرما رہے ہیں۔

قال افتعبدون من دون اللہ ما لا
ینفعکم شیئا ولا یضرکم اف لکم
ولما تعبدون من دون اللہ اف لاتعقلون
(پ ۱۷۷ ع ۵)

ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ تو کیا خدا کو چھوڑ کر تم ایسی
چیز کی عبادت کرتے ہو جو تم کو نہ کچھ نفع پہنچا سکے اور نہ کچھ نقصان
پہنچا سکے تف ہے تم پر اور ان پر جن کو تم خدا کے ماسوا
پوجتے ہو، کیا تم نہیں سمجھتے۔

تمام بتوں کو توڑ کر صرف ایک باقی رکھنے میں، یہ اشارہ ہے کہ الوہیت کا معاملہ وحدانیت پر مبنی ہے، خدا
صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، خدائی میں کسی دوسرے کی شرکت گوارا نہیں ہو سکتی، چونکہ یہ بت ان سب میں بڑا تھا اس لئے
اس نے اپنے ساتھ کسی کی شرکت گوارا نہیں کی بلکہ تمام ہی بتوں کو ختم کر کے اپنے لئے مسند الوہیت کو خاص کر لیا۔

تیسرا کذب یعنی جس میں اپنی رفیقہ حیات حضرت سارہ کو اپنی بہن ظاہر فرمایا تھا، سواہل عقل کے نزدیک
تو زوجیت اور اختیت میں کوئی منافات نہیں یعنی رشتہ کی بہن بھی ہوں اور زوجہ بھی ہوں، چنانچہ حضرت سارہ حضرت
ابراہیم علیہ السلام کی چچا زاد بہن بھی ہیں یعنی ہاران اکبر کی صاحبزادی ہیں جو کہ آپ کے چچا تھے، اور زوجہ بھی، ایک
تو نسبی رشتہ ہے دوسرا رشتہ اسلامی اخوت کا ہے جس کو خود حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "انک اختی فی اللہ" سے
ظاہر فرمایا ہے، اب یہ بات رہ جاتی ہے کہ تعلق زوجیت کے اظہار سے کیوں گریز فرمایا، حالانکہ بحالت موجودہ تعلق
قوی تھا، سواہل کی وجہ ظاہر ہے کہ اس کے اظہار میں کھلے ہوئے دو نقصان تھے، اول اپنے قتل پر اعانت جیسا کہ سابق
میں اس کی عادت کا ذکر ہو چکا ہے، دوسرے حضرت سارہ کی عصمت اور یہ دونوں ہی ایسے امر ہیں کہ جن کی رعایت
تمام واجبات سے مقدم ہے، اور "ہذہ اختی" کہنے میں دونوں خطرات سے نجات ملتی ہے تو پھر خود فیصلہ کیجئے کہ ان
نازک حالات میں یہ تو یہ مناسب تھا کہ جس میں دونوں مقصد حاصل ہو رہے ہیں یا ان کی زوجیت کا اظہار کہ جس میں
نہ ان کی عصمت محفوظ رہتی ہو اور نہ اپنی جان، درحقیقت یہ تو ان کا نہایت دانش مندانہ عمل تھا جو ان کے پیغمبرانہ کمال کی
دلیل ہے، بہر حال ان تینوں چیزوں پر کذب کا اطلاق الزام کے طور پر نہیں ہے بلکہ اظہار براءت اور نزاہت کے لئے
ہے، یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذامن تقدس کذب سے بالکل پاک صاف ہے، ان کے یہاں جھوٹ کا کیا کام
ہے، لے دے کے ان کی زندگی میں تین چیزیں ایسی نکلتی ہیں جنہیں نظر بہ ظاہر کذب کہا جاسکتا ہے مگر وہ بھی کذب
نہیں، چنانچہ ہماری مذکورہ بالا تفصیل سے یہ امر بخوبی ہویدا ہے تو انشاء کذب ثابت اور احتمال کذب باطل، والحمد للہ۔

ایک آخری الزام | اگر کوئی یہ کہے کہ میاں کذب تو ادنیٰ درجہ کا جرم تھا، چلو اس کی صفائی ہو گئی مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے تو شرک بھی ثابت ہے کہ انہوں نے ستاروں کو اپنا رب قرار دیا، قرآن عزیز میں صاف طور پر موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک ستارہ کو دیکھ کر ”ہذا ربی“ فرمایا اور اسی طرح چاند اور سورج کو بھی ”ہذا ربی“ فرمایا، اور ظاہر ہے کہ شرک سے بدتر اور کونسا جرم ہو سکتا ہے تو جواب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تو ایک لمحہ کے لئے بھی ان کو رب نہیں مانا یہ تو معترض کی کمال ہٹ دھرمی اور بد فہمی ہے کہ قوم کے ساتھ کئے گئے محاسبہ کو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عقیدہ بتلا رہا ہے، اصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمان ”مجارات مع الخصم“ کے قبیل سے ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ”ہذا ربی“ کہہ کر یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اچھا تم اسے میرا رب بتلاتے ہو، چلو تھوڑی دیر میں معلوم ہو جائے گا کہ اسی ربوبیت کی شان ہے یا یہ خود محتاج تربیت ہے، اس کے بعد چاند کے متعلق بھی یہی فرمایا کہ اچھا تم اسے میرا رب مانتے ہو، ذرا دیکھیں اس کی تابناکی کب تک قائم رہتی ہے، اور اسی طرح سورج اور جب قوم نے یہ دیکھ لیا کہ واقعی یہ چیزیں تغیر پذیر ہیں اور تغیر کا انجام معلوم ہے۔

تو اس قطعی دلیل کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان چیزوں کی ربوبیت سے براءت کا اعلان فرما دیا اور اعلان ہی کے ساتھ رب حقیقی کا بھی پتہ دیا کہ معبود حقیقی وہی ذات ہو سکتی ہے جو ان تمام چیزوں کی خالق ہے، اس طرح بات بالکل بے غبار ہو جاتی ہے جس کے بعد شرک کی نسبت ایک اتہام اور بہتان ہے۔

حضرت الاستاذ کا ارشاد | حضرت الاستاذ رحمہ اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات مبارکہ سے الزام شرک دور کرنے کے سلسلہ میں ایک آخری بات ارشاد فرمائی، اور وہ یہ کہ ہمیں سب سے پہلے یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت سے قبل کا ہے یا بعد کا۔

اگر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت سے پہلے کا مانیں جیسا کہ مشہور یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت ایک غار میں ہوئی اور وہیں بارہ برس تک تربیت بھی پائی، تو صورت واقعہ یہ معلوم ہوتی ہے جیسا کہ آیات سے بھی متبادر یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نور بصیرت اور فراست ایمانی سے یہ سمجھ لیا تھا کہ اس عالم کا کوئی ضرور خالق اور مربی ہے، نیز یہ کہ اس خالق کے لئے دو صفات ضروری ہیں، ایک تو یہ کہ وہ سرتاسر نور ہی نور ہو، اور دوسرے یہ کہ عالی مقام ہو، علوم مکان سے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ اس عالم آب و گل کی کوئی چیز رب نہیں ہو سکتی، نیز اتنا بھی ان کے نزدیک معین تھا کہ یہ دونوں صفتیں اس کے لئے لازم ذات ہوں اور اس سے منفک نہ ہو سکتی ہوں۔

اور چونکہ یہ طلب علم کا دور تھا، اور طالب علمانہ دور کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ جس چیز سے بھی کچھ مناسبت معلوم ہوتی ہے یا اپنے مقصد کے ساتھ کچھ لگاؤ محسوس ہوتا ہے طالب علم کچھ دیر کے لئے وہاں ٹھہر جاتا ہے۔

بالکل یہی کیفیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تھی، چونکہ فراست ایمانی سے ربوبیت کے لئے وہ چند صفات اپنے ذہن میں معین کر چکے تھے، اسلئے جب اور جہاں ان صفات کا کوئی حامل نظر آتا، کچھ دیر کے لئے ٹھہر جاتے تاکہ امتحان کے بعد اس کی ربوبیت کے بارے میں فیصلہ کریں چنانچہ سب سے پہلے اس عالم سماوی میں زہرہ پر نظر گئی دیکھا کہ اسکے اندر علو بھی ہے اور نورانیت بھی، ہو سکتا ہے یہی میرا رب ہو، لیکن جب کچھ دیر کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اسکی نورانیت بھی عارضی ہے اور علو بھی ذاتی وصف نہیں ہے تو فرمایا کہ میں ایسی چیز کو رب نہیں مان سکتا۔

کچھ دیر بعد قمر سامنے آیا، علو اور نورانیت کے پیش نظر اسکے امتحان کے لئے بھی رک گئے، اور خیال فرمایا ہو سکتا ہے یہی میرا رب ہو لیکن جب دیکھا کہ یہ اوصاف اس کے لئے بھی ذاتی نہیں ہیں، تو اس سے بھی براءت کا اظہار کر دیا اور پھر جب صبح کے وقت سورج پر نظر پڑی، نورانیت اور علو میں اسے پچھلے دونوں کو اکب سے فزوں تر پایا تو پھر امید بندھی اور کچھ دیر کیلئے پھر ٹھہر گئے، لیکن جب اسے بھی ڈوبتے دیکھا تو فرمایا کہ میں شرک سے بری ہوں میں صرف اس ذات والا صفات کی ربوبیت پر ایمان لاتا ہوں جس نے ان ارض و سماء کو پیدا کیا اور کو اکب کو نور بخشا اور یہ تمام کائنات جس کے نور سے مستنیر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہذا رسی فرمانا ربوبیت کا اقرار نہ تھا بلکہ وہ فراست ایمانی کے ذریعہ قائم کردہ معیار پر جانچنے کے لئے ایک وقفہ تھا، یہی وجہ ہے کہ جب ان چیزوں کو اس معیار پر پورا اترتا ہوا نہ دیکھتے تھے تو براءت کا اظہار فرمادیتے تھے اور اگر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت کے بعد کا قرار دیں تو یہ قوم کے ساتھ کئے گئے محاسبہ کی حکایت ہے اور اسکے دو معنی ہو سکتے ہیں یا تو اس کو استفہام بنغمہ صوت کہیں یعنی کیا اسی کو میرا رب بتلاتے ہو؟ یعنی یہ ہرگز میرا رب نہیں ہے یا اسے مجارات مع الخصم کے قبیل سے قرار دیں، اس صورت میں اسے استفہام انکاری نہ کہیں گے، بلکہ اسکا مفہوم یہ ہوگا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم سے فرما رہے ہیں کہ تمہارے خیالات و معتقدات کے مطابق یہ میرا رب ہے، اچھا دیکھیں، کچھ دیر میں معلوم ہوا جاتا ہے کہ اس میں ربوبیت کی شان ہے یا نہیں چنانچہ جب غروب کا وقت آیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمادیا کہ دیکھو غروب ہونے والی کوئی چیز رب نہیں ہو سکتی، گویا کچھ دور قوم کا ساتھ دیا تاکہ وہ لوگ قریب ہو سکیں اور ٹھنڈے دل سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر غور کر سکیں۔

ان دونوں صورتوں میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ربوبیت کا اقرار نہیں فرما رہے ہیں، بلکہ ان کا دامن نبوت شرک کی آلودگی سے قطعاً پاک و صاف ہے۔

اور اس کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فکری انتقالات کی حکایت ہے گو کہ یہ فکری انتقالات بالکل دفعی اور فوری تھے اور زمانی اعتبار سے ایک چیز سے دوسری چیز تک انتقال میں کوئی فاصلہ بھی نہ تھا

لیکن جب ان فکری انتقالات کو الفاظ و حکایت کے درجہ میں لایا گیا تو لازمی طور پر اس میں زمانی فاصلہ معلوم ہونے لگا، یہ بات بہت عمدہ ہے اور بعض اکابر کی فرمائی ہوئی ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں دو باتیں وجہ اشکال بتلائی گئی ہیں، پہلی حضرت یوسف علیہ السلام اور اہم بات ان کا زلیخا کی طرف میلان ہے جس کو آیت

ولقد همت به وهم بها لولا

اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی

رہا تھا اور انکو بھی اس عورت کا خیال ہو چلا تھا،

اگر انہوں نے اپنے رب کی دلیل کو دیکھا نہ ہوتا۔

ان را برهان ربہ

(پ ۱۳۶۱۲)

میں بیان کیا گیا ہے، معلوم ہے کہ انبیاء کرام بعثت سے قبل بھی معصوم ہوتے ہیں اور بالخصوص کبار سے، تو دل میں ایک ایسا خیال جس کی تعبیر قرآن کریم میں لفظ ہم سے کی گئی ہے، جو سوسہ اور خیال سے اوپر کا درجہ ہے اور ایک نبی کی شان میں اس کا استعمال یقیناً قابل اشکال ہے۔

لیکن اس اشکال کا مبنیٰ بھی وہی تصور نظر یادگمانی ہے جو لوگوں کے دلوں میں یہود و نصاریٰ کی کتابوں سے پیدا

ہو جاتی ہے، قرآن کریم میں اس واقعہ کے لئے جو اسلوب بیان اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل واضح ہے فرمایا گیا۔

اور جس عورت کے گھر میں یوسف رہتے تھے وہ انکو

پھسلانے لگی اور سارے دروازے بند کر دئے اور کہنے لگی

آ جاؤ یوسف نے کہا اللہ بچائے وہ میرا مربی ہے جس نے مجھے

اچھی طرح رکھا ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی۔

وراودته التي هو في بيتها عن نفسه

وغلقت الابواب وقالت هيت لك

قال معاذ الله انه ربى احسن مثنوى

انه لا يفلح الظالمون (پ ۱۳۶۱۲)

صیغہ تو مفاعلت ہی کا ہے لیکن مراد دت کی نسبت عورت کی جانب کی گئی ہے، گو یہ صیغہ اصل وضع کے اعتبار

سے اشتراک عمل کو چاہتا ہے لیکن معلوم ہے کہ صیغہ مفاعلت شرکت سے خالی ہو تو مبالغہ مقصود ہوتا ہے اب مفہوم یہ ہوا

کہ زلیخا نے بہت ہی زیادہ ڈورے ڈالے، حضرت یوسف علیہ السلام نے دامن تقدس کو بچایا اور چونکہ جانتے تھے کہ اس

دیوانگی اور بدحواسی کی حالت میں وجوہ شرعیہ بیان کرنا اس کے لئے بیسود ہے اسلئے ایک اور راہ یہ نکالی کہ میری نظر میں تم

اس شخص کی امانت ہو جو میرا مربی اور محسن ہے لیکن اشکال تو لفظ ہم بھسا پر ہے، مانا کہ مراد دت کی نسبت عورت کی

جانب کی گئی ہے، لیکن ہم جانتے ہیں کہ بہت صاف طریقہ پر حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب ہم کی نسبت ہے،

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعبیر کے مطابق دونوں ہم ایک طرح کے نہیں، یہ نہیں کہہ سکتے کہ

جو فاسد ارادہ زلیخا کا تھا وہی ہم حضرت یوسف علیہ السلام کا بھی تھا اگر معاذ اللہ ایسا ہوتا تو بھاگ دوڑ کی نوبت ہی کیوں

آتی، نیز یہ کہ قرآن کریم نے مختصر تعبیر ”ہما“ کو چھوڑ کر طویل طریقہ ہمت بہ وہم بھا کا اختیار کیا ہے، یہ اطناب

کی صورت بھی بتلا رہی ہے کہ دونوں ہم ایک طرح کے نہیں، ورنہ ایک ہی صیغہ میں جمع کر دیئے جاسکتے تھے، نیز اس کی دوسری تعبیر ہم کل منہما بالاخر بھی ہو سکتی تھی لیکن ان دونوں تعبیروں کو چھوڑ کر دونوں کے ہم کو الگ الگ بیان کرنا بتلا رہا ہے کہ دونوں کا ہم الگ الگ ہے، ایک کا ہم یہ ہے کہ مقصد براری کرے اور دوسرے کا ہم یہ ہے کہ کسی طرح دامن تقدس پر آنچ نہ آنے پائے، تعبیری مساوات میں صنعت مشاکلہ کی رعایت ہے جو بلاغت کا ایک اہم شاہکار ہے، جیسے ”جزاء سینة سینة مثلها“ اور ”ومکروا ومکروا اللہ“ میں ہے تو جس طرح صنعت مشاکلہ میں الفاظ ایک اور معانی مختلف ہوتے ہیں اسی طرح یہاں بھی اتحاد الفاظ کے باوجود معانی میں اختلاف ہے اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یوسف علیہ السلام کی طبیعت پر اثر شروع ہونے لگا تھا اور یہ خطرہ تھا کہ کہیں یہ اثر اپنے درجہ سے متجاوز ہو کر عزم نہ بن جائے، فوراً بھاگ کھڑے ہوئے تب بھی انشاء اللہ کوئی اشکال نہ ہوگا، کیونکہ یہ ایک غیر اختیاری چیز ہے، جبکہ تنہائی میسر ہے، جوانی ہے، اسباب عیش کی فراوانی ہے، طبیعت معتدل ہے، قوی مضبوط ہیں ایسی صورت میں کسی وسوسہ کا غیر اختیاری طور پر پیدا ہو جانا نہ مستبعد ہے اور نہ قابل تعزیر بلکہ اس میں ان کے کمال نزاہت اور عصمت کا بین ثبوت ہے کہ طبعی میلان کو آگے نہ بڑھنے دیا اور اس غیر اختیاری میلان کو ختم کرنے کے لئے راہ فرار اختیار فرمائی۔ یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وسوسہ اور طبعی میلان سے انسان کا ارادہ اور عمل موافقت بھی کرے جیسا کہ سخت گرمی کے روزوں میں ٹھنڈے پانی کو دیکھ کر طبیعت میں میلان پیدا ہوتا ہے لیکن انسان کبھی پینے کا ارادہ نہیں کرتا یا کسی بھوکے انسان کے سامنے اگر خوشبودار کھانا گزرے تو غیر اختیاری طور پر طبیعت اس کی طرف مائل ہوتی ہے لیکن کبھی وہ اسے کھانے کا ارادہ نہیں کرتا، اس لئے یہ ہم طبعی میلان سے بھی عبارت ہو سکتا ہے، رہا ایک غیر اختیاری چیز کو ہم سے تعبیر کرنے کا سبب جو وسوسہ اور خیال سے اوپر کی چیز ہے تو سبب یہ ہے کہ یہ وسوسہ ایک پیغمبر کا ہے گو یہ وسوسہ اس درجہ کا نہیں، لیکن اگر لغزش آدم کو عصی اور غوی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے تو حضرت یوسف علیہ السلام کے وسوسہ کو ہم سے تعبیر کرنے میں کیا استبعاد ہے:

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے تو حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن تقدس برہان رب کی حقیقت

بچانے کے لئے یہ فرمایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا ہم ایک شرط کے ساتھ مشروط ہے اور وہ ہے۔ لولا ان رابرهان ربہ۔ اور چونکہ برہان رب ان کے سامنے تھا اس لئے ارتکاب ہم سے بھی محفوظ رہے اور برہان رب اس خشیت خداوندی سے تعبیر ہے جو انہیں نازک موقعہ پر بھی پاک و صاف طریقہ پر بچالائی بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ برہان رب کا مطلب یہ ہے کہ خداوند قدوس نے حضرت جبرائیل کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی صورت میں سامنے کھڑا کر دیا تھا جو منہ میں انگلی دبائے ہوئے تھے اور بعض نے اس کا ذکر کیا ہے کہ جس مکان میں یہ انتظام ہوا تھا وہاں زلیخانے ایک طاقچہ پر پردہ بھی ڈال رکھا تھا، یوسف علیہ السلام نے فرمایا یہ پردہ کیا ہے زلیخانے

کہا کہ اس پردہ میں میرا بت ہے مجھے شرم آرہی تھی کہ اسکی موجودگی میں اس جرم کا ارتکاب کروں، حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ سے اور زیادہ شرم آنی چاہیے لیکن ان تمام باتوں کا تعلق اسرائیلیات سے ہے، غرض برہان رب جس چیز سے بھی تعبیر ہو حضرت یوسف علیہ السلام اس کی وجہ سے سنبھل گئے اور برائی کا اثر نہ ہوسکا، نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بھی ایک واقعہ پیش آیا تھا کہ آپ تشریف فرما تھے، ایک عورت سامنے سے گزری، آپ مکان میں تشریف لے گئے اور حاجت سے فارغ ہو کر تشریف لائے اور فرمایا کہ ان عورتوں کو شیاطین لئے لئے پھرتے ہیں، اگر کسی پر ان کے سامنے آنے سے کوئی اثر پڑے تو وہی کام کرے جو میں نے کیا فان معہا مثل الذی معہا، معلوم ہوا کہ غیر اختیاری طور پر جو اثر ہو جاتا ہے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا جرم ہے اور اس کو جائز طریقہ پر مٹانا محمود ہے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں دوسرا الزام بن یامین کو سرقہ کا اتہام لگا کر روکنے کا ہے جبکہ فی الحقیقت بن یامین نے ایسا نہ کیا تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا ہاتھ ہے، نیز یہ کہ قرآن کریم میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بھائیوں کی زبانی یہ اظہار کیا گیا ہے۔

اگر اس نے چوری کی ہے تو اسکا ایک بھائی پہلے چوری کر چکا ہے پس یوسف علیہ السلام نے اس بات کو اپنے دل میں رکھا اور انکے سامنے ظاہر نہیں کیا۔

ان یسرق فقد سرق اخ له من
قبل فاسرھا یوسف فی نفسہ
ولم یبدھا لہم (پ ۱۳ ع ۳)

گویا اب دو چیزیں ہو گئیں، ایک تو یہ کہ چھوٹے بھائی کے ساتھ شفقت کے بجائے ایک ایسا رویہ اختیار کیا جس سے پورے خانوادہ نبوی کی عزت پر ایک کاری ضرب لگی، اور دوسرے یہ کہ خود یوسف علیہ السلام کے متعلق ان کے بھائیوں نے سرقہ کا اظہار کیا۔

یہ اشکال بھی دراصل حقیقت سے ناواقفیت کی بنا پر پیش آیا ہے، صورت واقعہ یہ پیش آئی کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہ لوگ بن یامین کو لیکر شاہی مہمان کی حیثیت سے آئے تو ان کا اعزاز کیا گیا، اور جب دسترخوان بچھایا گیا تو ایک ایک خوان پر دو دو آدمی بٹھائے گئے بن یامین تنہا رہ گئے یوسف علیہ السلام چونکہ پہچان چکے تھے، اس لئے فرمایا کہ بھئی تم میرے پاس آ جاؤ، یہ سب لوگ باہر کھارہے ہیں اور بن یامین اندر، حضرت یوسف علیہ السلام نے خلوت میں انہیں بتلادیا کہ تم میرے بھائی ہو اور میں یوسف ہوں اور ابھی کسی پر یہ راز ظاہر نہ ہو جائے، رخصت کا وقت آیا تو بن یامین نے کہا میں ہرگز نہ جاؤں گا، اسقدر طویل مدت کے بعد تو ملاقات میسر آئی ہے، حضرت یوسف علیہ السلام نے ہرچند سمجھایا کہ تم والد صاحب کا سہارا ہو اور انہیں ایک میرا صدمہ ہے اور دوسرا واقعہ انکے لئے بہت زیادہ صدمہ کا باعث ہوگا، بن یامین کسی طرح راضی نہ ہوئے تو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا

کہ تمہیں روکنے کی صرف یہ صورت ہے کہ تم پر سرقہ کا الزام آئے، بن یامین نے آمادگی ظاہر کی، اندر خانہ بات طے ہو گئی، حضرت یوسف علیہ السلام نے غلہ تیار کراتے وقت کسی صورت سے شاہی صاع بن یامین کے بوجھ میں رکھوا دیا جب ذمہ دار شخص نے شاہی صاع گم پایا تو ان لوگوں کو آواز دی، ان لوگوں نے صفائی کی کہ ہم پہلے بھی آچکے ہیں، ہمارا مقصد چوری اور فساد نہیں ہے، خانوادہ نبوت سے ہمارا تعلق ہے، اس نے کہا اگر تمہاری چوری ثابت ہو جائے، ان لوگوں نے اس دور کی اپنی شریعت کے مطابق بتلایا کہ جس کے بوجھ سے صاع نکلے اسے روک لیا جائے، چنانچہ تلاشی لی گئی اور رفتہ رفتہ نبوت بن یامین کے بوجھ کی آئی اور صاع برآمد ہو گیا، ان حضرات نے کہا کہ ہم میں سے کسی ایک کو انکی جگہ روک لیجئے، لیکن ایسا کرنا انکے پیش کردہ اصول شریعت کے بھی خلاف تھا اس لئے شنوائی نہ ہوئی، اس واقعہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ چوری کا الزام حضرت یوسف علیہ السلام نے عائد نہیں کیا بلکہ یہ اعلان محافظ سقایہ کا ہے جس نے سقایہ کو گم دیکھ کر اپنے خیال کے مطابق کہ اس وقت انکے علاوہ وہاں اور کوئی موجود نہ تھا یہی اعلان کیا، ہونہ ہو سقایہ انہیں کے پاس ہے، پھر یہ واقعہ بن یامین کی رضا مندی سے ہوا اور انکے اصرار پر ہوا اور خداوند کریم کی مرضی اور حکم کے مطابق ہوا، ارشاد ہے۔

كذلك كدنا ليوسف الآية (پ ۳۱۳) ہم نے یوسف کی خاطر اس طرح تدبیر فرمائی۔

پھر اعتراض کا کیا موقع رہا، نیز یہ کہ اس کا مقصد حضرت یعقوب علیہ السلام کے بلانے کا راستہ ہموار کرنا تھا، اس بنا پر مقصد بھی حسن تھا پھر یہ کہ اس الزام کے بعد بھی کسی قسم کی تکلیف کا اندیشہ نہیں ہے کیونکہ بن یامین حضرت یوسف کے ساتھ ہیں اور جب اہل حکومت یہ دیکھیں گے کہ یہ شخص یوسف کے ساتھ ہے تو احترام ہی کریں گے، پھر یہ کہ صورت واقعہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے نہیں بنائی گئی بلکہ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق خداوند قدوس کی جانب سے ایسا کیا گیا اور خداوند قدوس کو ہر طرح حق حاصل ہے کہ وہ جسکے ساتھ جو طرز عمل چاہے برت سکتا ہے اس لئے حضرت یوسف علیہ السلام پر یہ الزام عائد نہیں ہوتا کہ انہوں نے بھائی کو روکنے کے لئے خاندان نبوت کی عزت پامال کر دی۔

آگے فقد سرق اخ له کا معاملہ ہے تو اسکی حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے معاملہ میں ایک طرف ان کی پھوپھی ہیں اور ایک طرف حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام یہ چاہتے ہیں تھے کہ یوسف میرے پاس رہیں اور حضرت یوسف کی پھوپھی یہ چاہتی تھیں کہ یوسف میرے پاس رہیں، پھوپھی نے اپنے پاس رکھنے کے لئے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طریق سے حضرت یوسف علیہ السلام کی کمر میں پٹکا باندھ دیا، اور جب حضرت یوسف علیہ السلام چلے آئے اور پٹکے کی تلاش ہوئی تو حضرت یوسف علیہ السلام کی کمر میں وہ پٹکا بندھا ہوا نکلا اور اس ترکیب سے وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے پاس رکھنے میں کامیاب ہو گئیں، خود دیکھا جاسکتا ہے کہ اس معاملہ میں حضرت یوسف علیہ السلام پر سرقہ کا الزام کیسے آسکتا ہے۔

اخوة یوسف کا کردار

حضرت یوسف علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے معاملہ میں انکے بھائیوں کا کردار بہت ناشائستہ نظر آتا ہے کہ باپ کو دھوکا دیا، چھوٹے بھائی کے ساتھ انتہائی بے رحمی کا برتاؤ کیا کہ ایک تاریک کنویں میں ڈال دیا اور باپ سے آکر یہ جھوٹ بول دیا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے، دیکھئے یہ ان کا خون آلودہ کرتہ ہے اور معلوم ہے کہ وعدہ خلافی، امانت میں خیانت اور دروغ گوئی وغیرہ جس کے یہ مرتکب ہوئے بہ نص حدیث نفاق کے اعمال ہیں۔ جواب کے سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ اخوتِ یوسف علیہ السلام پیغمبر نہ تھے اور نہ بعد میں ہوئے اسلئے ان کے عمل سے زیادہ سے زیادہ خاندانِ نبوت پر دھبہ آتا ہے، عصمتِ انبیاء مجروح نہیں ہوئی، صرف بعض حضرات کا یہ قول ہے کہ ان میں ایک حضرت یہوذا کو نبوت ملی، اگر اس بات کو مان لیں تو یہ دیکھیں گے کہ ان حضرات نے یہ راہ کیوں اختیار کی جسکے نتیجہ میں وعدہ خلافی، دروغ بیانی اور ایک پیغمبر کو ایذا رسانی کی نوبت آئی، امام بخاری نے سب سے پہلی روایت

اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔

انما الاعمال بالنیات۔ (بخاری ج ۱ ص ۲)

رکھی ہے اور معلوم ہے کہ

مومن کی نیت اسکے عمل سے بہتر ہوتی ہے۔

نية المؤمن خیر من عمله

اور یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض اعمال مقصد کے اعتبار سے حسن ہوتے ہیں اور صورت کے اعتبار سے قبیح، مثلاً جہاد ہے کہ اسکی ظاہری شکل تو خونریزی اور قتل ہے لیکن مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے اور مقصد کے اعتبار سے یہ اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے، اسی لئے اس کے بارے میں۔

ذروة سنام الاسلام الجهاد (ترمذی ج ۲ ص ۸۶) کوہانِ اسلام کی چوٹی جہاد ہے۔

فرمایا گیا ہے اسی اصول کو سامنے رکھ کر اخوتِ یوسف کے کردار کا جائزہ لینا چاہیے۔

در اصل ان کا باطن عمل یہ تھا کہ ہم باپ کی ہر طرح کی خدمت انجام دیتے ہیں اور اس کے صلہ میں ہمیں باپ کی دولتِ نبوت ملنی چاہیے، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری خدمات کے علی الرغم والد صاحب کار حجان اور میلان یوسف کی طرف ہے اور معلوم ہے کہ پیغمبر کی توجہ جس کی جانب ہوگی اسی کی اصلاح ہو سکے گی، اب پیغمبر کی توجہات حاصل کرنے کا یہ طریقہ ہے کہ ان کے مرکز توجہ کو ہٹا دیا جائے، گویا یہ راستہ کا پتھر ہے اسے قتل کر دینا چاہیے۔

لیکن اس قتل کی رائے پر اتفاق نہیں ہوا، بلکہ یہوذا نے جنکے متعلق نبوت ملنے کا قول ہے اسکی مخالفت کی اور وہ اس انبوه میں کر ہی کیا سکتے تھے، صرف اس رائے میں شریک تھے کہ الگ کر دینا چاہیے تاکہ باپ کی توجہات حاصل کر سکیں، اس لئے یہوذا راہ بتلاتے ہیں کہ قتل نہ کرو، باہر کسی گہرے کنویں میں ڈال دو، جب قافلہ والے ادھر سے گزریں گے تو انہیں نکال کر اپنے ساتھ لیجا بیٹنگے، انکی جان بھی نہ جائیگی اور تمہارا مقصد بھی حاصل ہو جائے گا، اس طرح

یہوذا نے ایسی صورت حال میں جان بچانے کی ترکیب نکالی جبکہ تمام بھائی قتل پر مصرتھے۔

پھر قتل سے بچا کر یہوذا مطمئن نہیں ہو گئے، بلکہ کھانے پینے کے سلسلہ میں برابر امداد بہم پہنچاتے رہے چنانچہ تین روز کے بعد ایک قافلہ ادھر سے گزرا اور پانی لینے کی غرض سے ڈول کنویں میں ڈالا تو یوسف علیہ السلام ڈول کے سہارے باہر آ گئے، اس نے دوسرے قافلہ والوں کو اطلاع دی، یہ بھائی بھی فوراً پہنچ گئے اور قبل اس کے کہ یوسف علیہ السلام کوئی بیان دیں کہنے لگے اچھا۔ یہ ہمارا مفروضہ غلام ہے۔ مطلب یہ تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان بند ہو جائے، کہیں یہ بتلا نہ دیں کہ میں خاندان یعقوبی کا ایک فرد ہوں اور اس کے بعد چند درہم میں انہیں بیچ دیا، اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان حضرات کا مقصد حسن تھا اور جس کو نبوت ملنے والی تھی اس کا کردار بھی درست رہا، چنانچہ جب بن یامین کو روک لیا گیا تب بھی یہوذا نے یہی کہا تھا۔

لن ابرح الارض حتی یاذن لی ابی

او یحکم اللہ لی (پ ۱۳۴)

سو میں تو اس زمین سے نلتا نہیں تا وقتیکہ میرے باپ

مجھ کو اجازت نہ دیں یا اللہ اس مشکل کو سلجھا دے۔

غرض صرف صورت عمل خراب تھی مگر مقصد حسن تھا اسکی مزید تفصیل باب آية المنافق میں آنے والی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام | حضرت موسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے بھی دو دور ہیں، ایک نبوت سے پہلے اور ایک نبوت کے بعد اور معترضین نے دونوں ادوار کے واقعات پر اعتراض کیا ہے، نبوت سے پہلے کے دور میں تو قبلی کے قتل کا واقعہ پیش آیا، صورت واقعہ یہ پیش آئی کہ حضرت موسیٰ کی تربیت چونکہ شاہانہ طریق پر ہوئی تھی اس لئے ان کی سب تعظیم کرتے تھے۔

ایک دن حسب الاتفاق کہیں جا رہے تھے، دیکھا کہ فرعون کے مطبخ کے داروغہ نے ایک بوڑھے اسرائیلی کے سر پر لکڑیوں کا ایک بوجھ رکھ رکھا ہے اور لئے جا رہا ہے، اگر وہ چلتے ہوئے رکتا ہے تو زد و کوب کرتا ہے، حضرت موسیٰ اسرائیلی کے سامنے سے گزرے تو اس نے استغاثہ کیا، حضرت موسیٰ نے داروغہ کو منع کیا، لیکن وہ فرعون کا ہم قوم اور اسکے مطبخ کا داروغہ تھا اسلئے اسنے کچھ پراوہ نہ کی، بلکہ حضرت موسیٰ کے سمجھانے پر الٹا ان پر بگڑنے لگا اور کہا کہ تمہیں اس کا اتنا ہی خیال ہے تو یہ بوجھ تم لے چلو، موسیٰ علیہ السلام نے اسے بڑھتے ہوئے دیکھ کر ایک مکار سید کیا اور اسی سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

یہ ایک اتفاقی واقعہ تھا جس میں نہ اسکے قتل کا ارادہ تھا اور نہ اس میں کسی دھاردار آلہ کا استعمال ہوا، بلکہ اسکے اس تشدد کو دیکھ کر حمیت دینی کا جوش ہوا اور بہ غرض تا دیب اسکے ایک گھونسا رسید کیا، کیا خبر تھی کہ اس اجل رسیدہ کی قضا سر پر کھیل رہی ہے، اور یہ گھونسا اسکی زندگی کو ختم کر دیگا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسکو عمل شیطانی قرار دیتے ہوئے بارگاہ خداوندی میں بہ صد عجز و نیاز اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے معافی طلب کی، اور خداوند قدوس نے معاف فرما دیا،

کون کہہ سکتا ہے کہ مکا قتل کے ارادہ سے مارا تھا، قتل کے ارادہ سے مکا کسی کے نہیں مارا جاتا، گھونسے سے موت کا واقع ہو جانا محض ایک اتفاقی امر تھا جو زیادہ سے زیادہ قتل خطا کے تحت لایا جاسکتا ہے، اسکی مثال بالکل ایسی ہے کہ شکار پر گولی چلائی جائے اور اتفاقاً کسی گزر نیوالے پر پڑ جائے، اس قتل میں یہ شخص عند اللہ مجرم نہیں، پھر مقتول قبطنی کے حربی مباح الدم ہونیکے باعث حق العبد کا سوال بھی نہیں اٹھایا جاسکتا، مگر اس لحاظ سے کہ اس قتل میں قبٹیوں کے لئے اسرائیلیوں پر اور مزید مظالم کا دروازہ کھل سکتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

قال هذا من عمل الشيطان (۵۷:۲۰) کہنے لگے یہ تو شیطان کی حرکت ہوگئی

کہہ کر بارگاہِ خداوندی میں معذرت کی اور انکی معذرت قبول بھی کر لی گئی اور جب خداوند قدوس کی جانب سے معافی دیدی گئی تو اس واقعہ کو درمیان میں لایا ہی نہیں جاسکتا۔

آگے نبوت کا دور ہے جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لیکر دریا سے باہر نکل آئے اور فرعون غرق نبوت کے بعد ہو گیا تو انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہمیں زندگی گزارنے کے لئے ایک دستور العمل اور قانون خداوندی کی ضرورت ہے چنانچہ ارشاد خداوندی کے بموجب حضرت موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے اور حضرت ہارون علیہ السلام کو قوم کی ذمہ داری سپرد فرمادی، حضرت ہارون پیغمبر تھے اور عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ وعدہ یہ تھا کہ تیس دن کے بعد دستور العمل دیدیا جائیگا لیکن وہاں ایک اجتہادی غلطی کی بنا پر دس روز کا اضافہ کر دیا گیا، اجتہادی غلطی یہ کہ حضرت موسیٰ نے منہ میں بو آ جانے کی بنا پر مسواک استعمال کر لی اس پر گرفت ہوگئی کہ ہم سے بغیر پوچھے تم نے ایسا کیوں کیا، چالیس روز کے بعد توراہ دی گئی، راستہ میں معلوم ہوا کہ قوم نے گو سالہ پرستی شروع کر دی ہے اور سامری نے اس طریقہ پر انہیں گمراہ کیا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سخت صدمہ ہوا کہ کم از کم میرا انتظار تو کرنا چاہیے تھا، خیال ہوا کہ جس قوم کو اس قدر محنت کے بعد فرعون سے نجات دلائی تھی اور تربیت کرتے کرتے انکے دل و دماغ کو اس منزل تک پہنچایا تھا کہ وہ خود ہی ایک قانون خداوندی کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے، افسوس کہ اس قوم کے ساتھ کی گئی تمام محنت رائیگاں گئی، اب چونکہ حضرت ہارون کو ذمہ دار بنایا تھا، اس لئے تنبیہ کر رہے ہیں تم نے کیوں کوتاہی کی، جب دیکھا تھا کہ قوم فتنہ میں مبتلا ہوگئی ہے تو فوراً مجھے اطلاع دینی چاہیے تھی۔

پہلے قوم سے باز پرس کی کہ جب مجھے خدا کے یہاں بھیجا تھا تو کسی دوسرے کام سے قبل میرا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اور پھر بھائی سے ذمہ داری کے بارے میں سوال کیا کہ تم سے قیامت میں سوال کیا جائے گا کیا جواب دو گے؟ اور پھر غصہ کی حالت میں سر کے پٹھے پکڑ لئے اور دوسرے ہاتھ سے داڑھی پکڑ کر کھینچی، ظاہر ہے کہ ہاتھ خالی کرنے کی غرض سے توراہ کی تختیاں بعجلت تام زمین پر رکھنی پڑی ہوگی، پھر بھائی نے معذرت کی کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے بلکہ

میں نے تاہم امکان عمل انہیں جگانے کی کوشش کی، لیکن یہ میرے ہی درپے ہو گئے چنانچہ جب صورت حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کی سمجھ میں آئی تو دعا کی۔

اس واقعہ میں تین باتیں قابل اعتراض ہیں، ایک تو یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے توراہ کی تختیاں زمین پر پٹخ دیں، یہ کتاب اللہ کی تو ہیں ہے جیسا کہ قرآن کریم کی تعبیر

القی الا لواح (پ ۸ ع ۹) اور جلدی سے تختیاں ایک طرف رکھیں۔

سے معلوم ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ بڑے بھائی کی بے حرمتی کی اور اس بری طرح کہ داڑھی اور سر کے بال پکڑ کر گھیٹا اور تیسری بات یہ کہ ایک پیغمبر کی توہین کی کیونکہ حضرت ہارون علیہ السلام کی دوسری حیثیت پیغمبری کی ہے۔

کرنیوالوں نے یہ اعتراضات کئے ہیں لیکن اعتراض سے قبل دیکھنا یہ ہے کہ واقعہ اس طرح کیوں پیش آیا اور اس کے لئے محرک کیا ہے؟ اس غصہ کا منشا غیرت ملی اور حمیت دینی کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے، یہ سمجھنا کہ یہ سب کچھ اس بنا پر ہوا کہ بھائی نے حکم عدولی کی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر عمل نہیں کیا، یہ درحقیقت ایسے ہی لوگوں کا خیال ہو سکتا ہے جو پیغمبروں کے معاملات کو اپنے معاملات کے آئینہ میں دیکھنے کے عادی ہوں اور پیغمبرانہ شان اور ان کی عظمت کے سمجھنے سے قاصر ہوں، اب سنئے موسیٰ علیہ السلام نے طور پر جاتے وقت ہارون علیہ السلام کو پوری قوم کی ذمہ داری سپرد فرمائی تھی، اور یہ ہدایت کی تھی کہ دیکھنا قوم بگڑنے نہ پائے، اور اگر ایسی ویسی بات دیکھو تو فوراً مجھے اطلاع دینا، موسیٰ علیہ السلام اس انتظام پر پورے طور سے مطمئن ہو کر طور پر تشریف لے گئے، یہاں چند روز بعد سامری نے ایک کھیل کھیلا کہ فرعون کی قوم کے زیورات بنی اسرائیل سے لیکر انہیں گلایا اور گنو سالہ بنا کر اس کے منہ میں وہ خاک جو جبرئیل کے گھوڑے کے قدم کے نیچے سے اٹھائی تھی ڈال دی، گنو سالہ آواز کرنے لگا۔

اس نے بہ درکھ دھندا اپنا کر بنی اسرائیل سے کہا کہ موسیٰ خدا کو تلاش کرنے طور پر گئے ہیں خدا تو یہاں موجود ہے، بنو اسرائیل کی قوم عجائب پرست تو تھی ہی، لگی گنو سالہ پوجنے، حضرت ہارون علیہ السلام نے ہر چند سمجھایا کہ یہ کیا شرک کر رہے ہو، تو بہ کرو، دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہاری خاطر طور پر احکام لینے گئے ہیں، انکی آمد کا انتظار کرو مگر قوم نے صاف کہہ دیا کہ ہم تمہاری بات پر گنو سالہ پرستی ترک نہیں کر سکتے، موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے تو ہم مان لیں گے اور یہ بات اس حد تک بڑھ گئی کہ حضرت ہارون علیہ السلام کے قتل کے درپے ہو گئے۔

انہیں اسرائیلیوں میں تقریباً دس ہزار آدمی ایسے بھی تھے، جو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ رہے اور گنو سالہ پرستی میں شریک نہیں ہوئے، حضرت ہارون علیہ السلام کے لئے سخت مشکل کا سامنا تھا، جماعت کو چھوڑ کر جاتے ہیں، تو انکا معاملہ بھی خطرہ میں پڑ جاتا ہے، نہیں جاتے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام کی ناراضی کا خطرہ مول لیتے ہیں بقول شخصی ”نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن“ مگر موسیٰ علیہ السلام کا غصہ تو حقیقت حال معلوم کر نیکی بعد ٹھنڈا ہو سکتا ہے

لیکن اگر قوم گمراہ ہوگئی تو خدا کے سامنے کیا جواب دے سکوں گا۔

پس ایک طرف موسیٰ پیغمبر کی ناراضگی ہے اور دوسری طرف خداوند قدوس کی ناراضگی، ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اَھوٰن البلیتین کو اعظم البلیتین کے مقابلہ میں اختیار کرنا عین دانشمندی ہے، خیر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تو وہیں یہ معلوم ہو گیا تھا کہ قوم گنہگار پرستی میں مبتلا ہوگئی ہے، اس پر جتنا بھی غصہ ہو کم ہے۔

یہ غصہ تو عین تقاضائے ایمان ہے اس میں جس قدر بھی شدت ہوگی اسی قدر ایمان اعلیٰ اور کامل سمجھا جائے گا، الحب فی اللہ والبغض فی اللہ من الایمان، آتے ہی سب سے پہلے قوم کو جھاڑا لیکن یہ خیال فرماتے ہوئے کہ اصلاح کی ذمہ داری حضرت ہارون علیہ السلام پر تھی اس بگاڑ میں ان کا دخل ضرور ہے، موسیٰ جلال کا پورا مظاہرہ بھائی کے سامنے ہوا، توراہ کی تختیاں ہاتھ میں ہیں مگر معاملہ شرک کو دیکھ کر شدت غضب کے باعث ادھر التفات نہیں رہ سکا، جلدی سے ہاتھ خالی کر کے ہارون علیہ السلام کے پٹھے اور داڑھی پکڑ کر اپنی جانب کھینچنا شروع کیا، یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں انہوں نے ذمہ دار بن کر کوتاہی کی، ایسا کیوں نہیں کیا کہ حالات بگڑتے ہی فوراً مطلع کرتے، اصول شریعت کی بنا پر راعی اپنی رعیت کے بارے میں مسئول ہوتا ہے اور کوتاہی ثابت ہونے پر مستحق سزا بھی ہوتا ہے، یہاں بڑے بھائی کی بے حرمتی یا نبی کی توہین کا کوئی سوال نہیں ہے، یہاں تو ایک ذمہ دار سے اسکی ذمہ داری کے متعلق باز پرس ہے وہ اپنے سے چھوٹا ہو یا بڑا، ہارون پیغمبر ضرور ہیں مگر موسیٰ علیہ السلام اس شریعت کے حامل قرار پائے ہیں اور حضرت ہارون کی وہ حیثیت نہیں ہے، غرض یہ اس قدر درشتی اور سخت گیری کا معاملہ بخیاں حضرت موسیٰ ایک ذمہ دار کی کوتاہ عملی کے باعث ہوا، یہی وجہ ہے کہ جب ہارون علیہ السلام نے حقیقت حال سے آگاہ کر دیا تو حضرت موسیٰ کا غصہ فرو ہو گیا اور ان کی استمالت قلب اور دل داری میں لگ گئے اور دعاء مغفرت میں انہیں اپنے ساتھ شریک کر لیا، رہا توراہ کے پٹھنے کا معاملہ تو وہ بھی ایک سرسری نظر ہے، حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اول تو القاء کا ترجمہ پھینکا کرنا ہی صحیح نہیں ہے، ڈالنے اور پھینکنے میں فرق ہے اور ڈالنے کے دو طریقے ہیں، اطمینان کیساتھ اور جلدی سے، اگر کسی چیز کے رکھنے میں عجلت سے کام لیا جائے تو عجلت کے اثر سے ایسا معلوم ہوگا کہ اسے پھینکا جا رہا ہے اس بنا پر القی الالواح کے معنی وضع الالواح بعجلة کے ہیں، اسی لئے قذف کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا، رہا ان الواح کا ٹوٹنا تو یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ ہے، جب ایک دھکے میں قبطنی کا قضیہ پاک ہو سکتا ہے تو اس میں کچھ استبعاد نہیں۔ القی کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ الواح کی جانب سے توجہ بالکل ہٹ گئی، یعنی پوری توجہ تو قومی معاملہ کی جانب تھی اس لئے الواح کی جانب منعطف نہ رہ سکے۔

حضرت یونس علیہ السلام | حضرت یونس علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم کے آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں شہر نینوا میں تبلیغ کی غرض سے مبعوث کیا گیا، لیکن قوم نے انکی ایک نہ سنی، دعوت کی اس ناکامی پر حضرت یونس علیہ السلام بہت متاثر ہوئے اور ایک دن غصہ میں یہ کہہ بیٹھے کہ اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تین ہی روز کے بعد عذاب آجائے گا اور اس کی صورت یہ ہوگی اور اس سلسلہ میں حضرت یونس علیہ السلام نے عذاب کے ابتدائی آثار بھی معین فرمادیئے، حضرت یونس علیہ السلام کہنے کو تو یہ بات کہہ گئے لیکن پھر خود ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ میرے لئے ہرگز ایسا مناسب نہ تھا کہ بلا انتظار وحی اپنی طرف سے ایسا کرتا، ہو سکتا ہے کہ منشاء خداوندی اس قوم کی ہلاکت کا نہ ہو، اس صورت میں اعلان کی تمام تر ذمہ داری مجھ پر ڈال دی جائے، پھر کیا ضروری ہے کہ خداوند کریم میرے قول کی لاج رکھتے ہوئے عذاب نازل ہی فرمادے، فی الحقیقت میں نے سخت غلطی کی ہے جو یقیناً قابل گرفت ہے، بالفرض اگر عذاب نہ آیا تو قوم میں میری کیا رہ جائیگی، یہ تو پہلے ہی سے بدگمان ہیں، اس صورت میں تو انہیں اچھا خاصہ بہانہ ہاتھ آجائے گا، اسلئے یہاں سے میرا ہٹ جانا ہی مناسب ہے، یہ خیال فرما کر آبادی سے باہر کسی مقام پر چھپ کر بیٹھ گئے، بات پیغمبر کی تھی، وہ توجیح ہونی ہی تھی، ورنہ من جانب اللہ نبوت کی تکذیب ہو جاتی، حق تعالیٰ تو ان مخلصین مومنین کی باتوں کو بھی سچا کر دیتا ہے جو اس پر اعتماد کرتے ہوئے کسی بات پر قسم کھا بیٹھتے ہیں، پھر حضرت یونس علیہ السلام کا یہ اعلان ان کی الہامی زبان کا نکلا ہوا تھا، کیوں نہ پورا ہوتا۔

غرض جب تیسرا دن ہوا اور عذاب کے ابتدائی آثار ظاہر ہونے لگے تو قوم کو عذاب کا یقین ہو گیا اور گھبرا کر حضرت یونس علیہ السلام کی تلاش میں نکلے تاکہ توبہ کے بعد حضرت یونس علیہ السلام کی معرفت عفو و درگزر کی درخواست کی جائے مگر حضرت یونس تو چھپ کر نکل چکے تھے، جب اس قوم کو حضرت یونس علیہ السلام کی جانب سے مایوسی ہو گئی تو یہ لوگ عورتوں بچوں اور جانوروں کو لیکر باہر جنگل میں نکل آئے اور زونا شروع کیا اور معافی طلب کی، عذاب اٹھایا گیا، ارشاد ہے۔

چنانچہ کوئی بستی ایمان نہ لائی کہ ایمان لانا اس کو
نافع ہوتا مگر یونس کی قوم جب وہ ایمان لے آئی
تو ہم نے رسوائی کے عذاب کو دنیوی زندگی میں
ان پر سے ٹال دیا، اور ان کو ایک وقت خاص
تک عیش دیا۔

فلولا كانت قرية آمنت فنفعها
إيمانها الا قوم يونس لما آمنوا
كشفنا عنهم عذاب الخزي في
الحياة الدنيا و متعناهم الى حين
(پ ۱۱ ع ۱۵)

حضرت یونس علیہ السلام جہاں چھپے تھے وہیں یہ بات ان کے علم میں آئی کہ قوم ان کی تلاش میں ہے اور یہ کہ عذاب روک لیا گیا ہے، حضرت یونس علیہ السلام کو خیال ہوا کہ قوم الزام کے لئے تلاش کر رہی ہے تاکہ سختی کا معاملہ

کرے، اسلئے آپ وہاں سے بھاگ نکلے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے، کشتی کچھ دیر بعد منجھار میں پھنس گئی، ملاح حیران ہے کہ کیا معاملہ ہے؟ کسی باخدا نے کہا کہ اس کشتی میں کوئی غلام ہے جو آقا سے بھاگ کر آیا ہے، حضرت یونس علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ہی وہ غلام ہوں، لیکن حضرت یونس علیہ السلام کی پیغمبرانہ صورت دیکھ کر کسی کو یقین نہ آیا اسلئے قرعہ ڈالا گیا، قرعہ میں بھی ہر بار حضرت یونس علیہ السلام ہی کا نام نکلا، مجبور ہو کر انہیں دریا میں ڈال دیا گیا اور مچھلی نے امانت کے طور پر انہیں نگل لیا، اسی بھاگنے پر قرآن کریم میں حضرت یونس علیہ السلام پر الزام قائم کیا گیا کہ تم نے بھاگ کر یہ سمجھا تھا کہ تم ہماری گرفت سے نکل جاؤ گے، تم نے ہماری قدرت کو محدود سمجھا کہ آبادی میں رہتے ہوئے تو اس کا تعلق ہو سکتا ہے اور آبادی سے باہر اس کا امکان نہیں، ارشاد فرمایا۔

وذا النون اذ ذهب مغاضباً
فظن ان لن نقدر علیہ
فنادی فی الظلمت ان لا
الہ الا انت سبحانک
انی کنت من الظلمین (پ ۱۷۷ ع ۶)

اور مچھلی والے کا تذکرہ کیجئے جب وہ خفا ہو کر
گئے اور انہوں نے یہ سمجھا کہ ہم ان پر کوئی دارو گیر
نہ کریں گے پس انہوں نے اندھیروں میں پکارا
کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، آپ پاک ہیں
میں بے شک قصور وار ہوں۔

اصل بات یہ ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کی یہ اطلاع کہ اگر انہوں نے میرا کہنا نہ مانا تو عذاب آئیگا صحیح تھا لیکن عذاب کا وقت معین نہ تھا اور نہ کوئی معین صورت ہی بتلائی گئی تھی مگر جوش میں حضرت یونس علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ اگر آئندہ بھی تم نے اسی طرز عمل کا مظاہرہ کیا جس کا آج تک رہا ہے تو تین لاؤز کے بعد سلسلہ عذاب شروع ہونے والا ہے اور اس کے ابتدائی آثار یہ ہیں، یہ باتیں حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے قلب سے فرمائی تھیں، خداوند قدوس کی جانب سے ان کا تعین نہ ہوا تھا اور مقصد تہدید و تخویف تھا، اور ظاہر ہے کہ پیغمبر کی زبان سے نکلا ہوا کوئی کلمہ عام انسانوں کے اقوال کی طرح نہیں ہوتا جس کا کوئی مصداق نہ ہو، پیغمبرانِ عظام کی شان تو بہت بلند و بالا ہے صالحین کے بارے میں خود بخاری ہی میں ارشاد ہے۔

ان من عباد اللہ من لواقسم
علی اللہ لا برہ!

اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں کہ اگر وہ اللہ پر
اعتماد کر کے قسم کھالیں تو اللہ انکی قسم پوری کر دیتا ہے۔

اسلئے حضرت یونس علیہ السلام کی بات درست ہو سکتی تھی اور ہوئی لیکن خود حضرت یونس کو یہ خیال ہوا کہ میں نے غلطی کی ہے، مجھے اس بارے میں خداوند قدوس کی جانب سے وحی کا انتظار کرنا چاہیے تھا، مجھے پیغمبرانہ حیثیت سے قبل از وقت یہ کلمات مناسب نہ تھے۔

گویہ اعتماد بھی اپنی جگہ قائم تھا کہ میں جو بات کہہ رہا ہوں، اسے خداوند قدوس پورا فرمادے گا، اسی خیال سے چھپ گئے، عذاب کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں تو قوم نے حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کرنا شروع کیا، نہ ملے تو خود ہی جا کر جنگل میں گریہ وزاری شروع کر دی، خداوند قدوس نے توبہ کے بعد معاف فرمادیا، گویا اب یہ لوگ اجمالاً ایمان لے آئے، تفصیلات کا انتظار ہے کہ یونس ملیں تو ان سے معلوم کریں اور حضرت یونس علیہ السلام کو اپنے قول پر اس درجہ ندامت ہے کہ منہ دکھانا گوارا نہیں ہے، اور جب دیکھا کہ تیسرے دن عذاب نہیں آیا تو خیال ہوا کہ نہ جانے کیا بات پیش آگئی ہے، اس لئے نکل کھڑے ہوئے اور اس سلسلہ میں حکم خداوندی کا انتظار نہیں فرمایا، حالانکہ انہیں بھی بستی نہ چھوڑنی چاہئے تھی، یہ دراصل اجتہادی خطا تھی، راستہ میں دریا تھا، کشتی جارہی تھی، بیٹھ گئے، لیکن وہ چل نہ سکی، کشتی والے نے سمجھا کہ کوئی غلام بھاگ آیا ہے، واقعہ کی تفصیل گذر چکی ہے، اس سلسلہ میں آیت میں ظن ان لن نقد رعلیہ کے عنوان سے الزام قائم کیا گیا ہے، آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ ذوالنون جب غصہ میں چل پڑے غصہ کس پر کر رہے ہیں، اگر قوم پر غصہ آیا تھا تو علیحدہ نہ ہونا چاہئے تھا بلکہ اس کے بارے میں حکم خداوندی کا انتظار مناسب تھا، اب جو بھاگے ہیں، تو اس طرز عمل سے معلوم ہو رہا کہ ہم قادر نہیں، خدا نخواستہ یہ مطلب نہیں ہے، کہ واقعہ حضرت یونس نے ایسا سمجھا بلکہ طرز عمل سے جو چیز معلوم ہو رہی ہے، اس کے بارے میں الزام قائم کر دیا گیا، کہ بھاگ نہ گئے کیا یہ سمجھا تھا کہ بھاگ جاؤں گا تو گرفت سے بچ جاؤں گا، چنانچہ وہیں روک دیا گیا اور مچھلی کے پیٹ میں مقید کر دیا گیا۔

گویا یہ الزام صرف صورت عمل کے پیش نظر ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حضرت یونس کے قلب مبارک پر یہ گمان واقعہ گزرا بھی تھا۔

ظن کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ انہوں نے خود ہی سزا بھگتنی چاہی تھی، اس وقت قدر کے معنی تنگ کرنا ہونگے، مفہوم یہ ہے کہ اگر خداوند قدوس کی جانب سے تنگی ہوئی تو مصیبت ہو جائے گی، اس لئے خود ہی جرم کی سزا تجویز کی کہ آبادی سے نکل گئے، کیونکہ اگر حاکم غضبناک ہوتا ہے تو محکوم اسکے غصہ سے بچنے کے لئے سامنے سے ہٹ جایا کرتے ہیں، چنانچہ ایک اسرائیلی کا قصہ حدیث شریف میں موجود ہے کہ جب وہ مرنے لگا تو اس نے اپنی اولاد کو جمع کیا اور ان سے پوچھا کہ میں تمہارا کیسا باپ تھا، اولاد نے جواب دیا آپ ہمارے بہترین باپ تھے، مرتے وقت اس نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ جب میں مرجاؤں تو میرے لاشہ کو آگ میں جلانا اور ہڈیوں کو پینا اور ایسے دن کا انتظار کرنا کہ جسمیں ہوا تیز چل رہی ہو اور اس دن کچھ راگھ ہوا میں اڑا دینا اور کچھ تری میں پھینک دینا، لیکن اللہ نے ہوا اور پانی کو حکم دیا اور اسکے جسم کے تمام اجزاء جمع کر دیئے گئے، حدیث ہی کے الفاظ میں اسکی غرض یہ بیان کی گئی ہے۔

لو اللہ لئن قدر اللہ علیٰ ليعذبني پس بخدا اگر خداوند قدوس مجھ پر قادر ہو گیا تو مجھے

عذاباً ما عذبه احداً

ایسا عذاب دیگا جو کسی کو نہیں دیا۔

گو اس عبارت میں بھی بظاہر خداوند قدوس کی قدرت سے انکار ہے، لیکن معاف کر دیا گیا، کیونکہ اس شخص نے خود ہی اپنی سزا تجویز کر لی تھی یعنی اگر خداوند قدوس کی جانب سے گرفت کی نوبت آگئی تو اس کا برداشت کرنا بہت مشکل ہو جائیگا اس لئے خداوند قدوس کی جانب سے عذاب آنے کے قبل ہی اپنی سزا تجویز کر لینا اپنے حق میں اچھا ہے۔ بالکل یہی صورت حضرت یونس علیہ السلام کے معاملہ کی ہے، انہوں نے بھی یہی خیال فرمایا کہ اگر خداوند قدوس نے گرفت شروع فرمادی تو مصیبت آجائگی، اسلئے خود ہی سزا تجویز کر کے جنگل میں نکل کھڑے ہوئے اب ”ظن ان لن نقدر علیہ“ کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت یونس نے یہ سمجھا کہ ہم ان پر تنگی نہ کریں گے اور یہی معنی اکثر مفسرین نے بیان فرمائے ہیں۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو طرز ادا سے شبہ پیدا ہو گیا اور اس کو ان منکر اور ضعیف روایات سے تقویت پہونچی جو بنی اسرائیل کی جانب سے کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں، کہا یہ جاتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور یا کی عورت پر عاشق ہو گئے اور چاہا کہ اور یا عورت کو چھوڑ دے اور حضرت داؤد علیہ السلام اس سے شادی کر لیں، وہ چھوڑنے پر راضی نہ ہوایا عورت راضی نہ ہوئی تو معاذ اللہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ صورت اختیار کی کہ اور یا کو ایسی جنگ پر بھیج دیا جہاں سے بظن غالب انکے زندہ واپس آئیکا امکان نہ تھا، دراصل اس کا منی وہ منکر روایات ہیں جن کو مفسرین اور بعض محدثین نے حضرت داؤد علیہ السلام کے قصہ کے ذیل میں ذکر کر دیا ہے، مفسرین کی عادت کچھ ایسی ہے کہ جب ایک روایت کے مختلف طریقے ان کے سامنے آتے ہیں تو یہ حضرات یہ کہہ کر کندھا ڈال دیتے ہیں کہ اس روایت کی ضرورت کوئی اصل ہوگی اور پھر ان حضرات میں جو محققین سمجھے جاتے ہیں وہ تاویلات کرتے ہیں، مفسرین سے کچھ زیادہ حیرت بھی نہیں ہے کہ انکے یہاں نقد و نظر کا کام نہیں، لیکن حیرت ان محدثین پر ہے جو صحیح روایات پر بھی تنقید کر دیتے ہیں پھر وہ اس قسم کی منکر روایات کو کیوں نقل کرتے ہیں، اسلم طریق یہ تھا کہ ایسی روایات کو بالکل غلط قرار دیا جاتا، مانا کہ یہ روایات تعدد طرق کی بنا پر محدثانہ ضابطہ کے مطابق حسن لغیرہ کے درجہ میں ہوں، مگر قطعیات کے مقابلہ میں ان کا کیا وزن ہو سکتا ہے، حضرت علیؑ سے منقول ہے کہ داؤد علیہ السلام کے واقعہ میں زن اور یا کے قصہ کے نقل کرنیوالوں کو ایک سو ساٹھ کوڑے کی سزا دی جائے، انبیاء علیہم السلام پر افترا کرنے کی یہی سزا ہے۔

قرآن عزیز کی آیات حضرت داؤد کے قصہ سے پہلے قرآن کریم میں رسول اکرم ﷺ کو صبر و تحمل کی تلقین کی جا رہی ہے، اور اس سلسلہ میں حضرت داؤد علیہ السلام کا عمل پیش کیا جا رہا ہے کہ کافروں کا

یہ طرز عمل تنہا آپ کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ تمام انبیاء نے ان خدمات کو برداشت کیا ہے، داؤد علیہ السلام کو دیکھئے کہ انہوں نے کس طرح خلاف طبع صبر و تحمل سے کام لیا، صورت واقعہ یہ پیش آئی کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے ایام کو مختلف کاموں کے لئے تقسیم کر رکھا تھا، ایک دن مقدمات کے فیصلہ کا تھا، ایک دن اہل و عیال کے ساتھ رہنے کا اور ایک دن عبادت کا، عبادت کے دن حضرت داؤد علیہ السلام عبادت خانہ میں عبادت فرماتے تھے، کسی شخص کو ملاقات کی اجازت نہ تھی، دربانوں کو بھی ہدایت تھی کہ کوئی شخص اندر نہ آنے پائے، عبادت کا دن تھا، اچانک دو شخص دیوار پھاند کر داخل ہوئے، ان حضرات کا اس غیر معمولی طریق پر داخل ہونا حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے فزع کا باعث بن گیا آنیوالوں نے کہا، آپ خوفزدہ نہ ہوں ہمارا ایک مقدمہ ہے، آپ اس کا تصفیہ فرمادیں، کیونکہ معاملہ بڑھ گیا ہے اور نوبت جھگڑے تک پہنچ گئی ہے، دروازہ پر پہرہ بیٹھا ہوا ہے جو کسی کو اندر آنے نہیں دیتا، اسلئے مجبوراً یہ صورت اختیار کی گئی ہے، معاملہ یہ ہے کہ میرا ایک بھائی ہے اسکے زیر ملکیت ننانوے دنییاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک دنی ہے، یہ چاہتا ہے کہ میری ایک دنی پر بھی قبضہ کر لے اور کچھ ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ میں دب گیا ہوں، آپ انصاف کا فیصلہ کر دیجئے اور دیکھئے حد سے تجاوز نہ ہو، اس میں حضرت داؤد کے صبر و تحمل کا ذکر ہے کہ داؤد ایک پیغمبر ہیں اور سلطان ہیں اور ان کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ رات کو بلا اطلاع چوروں کی طرح دیوار پھاند کر دو شخص آتے ہیں اور حکومت جتاتے ہیں کہ دیکھئے انصاف سے فیصلہ کیجئے، دیکھئے حد سے تجاوز نہ ہو جائے اور پھر ایک اور بات کہ ” اهدنا الی سواء الصراط “ حضرت داؤد علیہ السلام چاہتے تو سخت سے سخت سزا دے سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا، صبر و تحمل سے کام لیا، واقعہ بالکل صاف ہے، اس میں حضرت داؤد علیہ السلام کی منقبت کا ذکر ہے، ان فاسد خیالات کا اس سے کوئی علاقہ نہیں ہے، ان اسرائیلیات کی روایت سے اس کا یہ جوڑ لگایا کہ اس میں ایک شخص کی ننانوے دنییاں ہیں اور دوسرے کی ایک، اور حضرت داؤد علیہ السلام کے حرم بھی ننانوے تھیں اور اوریا کی ایک بیوی تھی، بس اسی مناسبت سے قصہ تیار ہو گیا، حالانکہ یہ واقعہ حضرت داؤد علیہ السلام کے امتحان سے متعلق تھا، حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ فرمادیا کہ اسکی یہ طلب سراسر ظلم ہے اور شرکاء میں اکثر ایسی چیرہ دستیایں ہوتی رہتی ہیں، فیصلہ کے بعد حضرت داؤد کو خیال ہوا کہ میرا امتحان ہے اور جب خداوند قدوس امتحان لیتا ہے تو کامیابی مشکل ہوتی ہے اس لئے معافی طلب کی اور استغفار کیا۔

اصل حقیقت | صحیح اور بے غبار بات حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک عبادت خانہ تیار کرایا اور جب تیار ہو گیا تو اسکو ہمہ وقت عبادت سے معمور کرنے کے لئے مختلف حضرات کی ڈیوٹیاں لگا دیں کہ فلاں وقت فلاں عبادت کرے گا اور اس عبادت کے لئے حضرت داؤد علیہ السلام سب سے زیادہ وقت دیتے تھے، جب عبادت خانہ تیار ہو گیا تو خداوند قدوس کے سامنے حال پیش کیا اور گو مقصد تحدیث بالنعمة تھا مگر انداز تقاخر کا پیدا ہو گیا، خداوند قدوس نے فرمایا کہ اچھا امتحان لیا جائے گا، اور یہ فرمایا کہ یہ تو محض ہمارا فضل ہے چنانچہ

ایک دن جب حضرت داؤد علیہ السلام عبادت میں مشغول تھے کہ اچانک دو آدمی دیوار پھاند کر عبادت خانہ میں آدھمکے، آواز ہوئی تو حضرت داؤد گھبرا گئے، متوجہ ہوئے تو فوراً مقدمہ پیش ہو گیا، اس میں دیر لگ گئی صورت عبادت کا کام مختل ہو گیا۔

اب حضرت داؤد علیہ السلام کو بات یاد آگئی کہ یہ میرا امتحان ہوا ہے تو فوراً استغفار کیا یعنی اتنی دیر تک عبادت خانہ عبادت سے خالی رہا، اس کے لئے استغفار فرمایا اور پھر اس استغفار پر خداوند قدوس نے بطور انعام فرمایا۔

یا داؤد انا جعلناک خلیفة فی الارض
فا حکم بین الناس بالحق (پ ۲۳ ع ۱۱)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے،
سولوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا۔

اب خود سوچئے کہ انعام کا استحقاق کس صورت میں ہو سکتا ہے، کیا یہ بھی کوئی انعام کی صورت ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام اور یا کی عورت کو اپنے نکاح میں لانیکی غرض سے اور یا کو ایک عظیم مہم پر جہاں سے اس کا زندہ واپس آنا بنظر غالب ناممکن ہو بھیج دیں اور خود اس فکر میں رہیں کہ اس کا قصہ تمام ہو جائے تو میں اسکی عورت سے شادی کرنے میں کامیاب ہو سکوں، لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم، یہ بات بالکل بے سرو پا ہے، رہا استغفار تو وہ یا عبادت سے ایک وقفہ کے لئے تغافل کی وجہ سے کیا یا استغفار کی ایک یہ وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ حضرت داؤد عبادت میں خلل کے باعث فیصلہ بہت جلد کرنا چاہتے تھے، چنانچہ آیت کریمہ میں جو ارشاد فرمایا گیا ہے اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد نے فریق ثانی سے جواب بھی طلب نہیں کیا، یعنی فیصلہ سے قبل مدعی سے شہود لینے چاہئیں اور اگر وہ شہود پیش کرنے سے قاصر ہے تو مدعا علیہ سے قسم لی جائے، لیکن عجلت کے باعث حضرت داؤد نے شہود، طلب فرما سکے اور نہ ہی قسم لے سکے جیسا کہ آیت کریمہ کے سکوت سے معلوم ہوتا ہے، اب استغفار کا منشاء یہ ہے کہ عبادت کی وجہ سے فیصلہ میں جس عجلت سے کام لیا ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ فیصلہ خلاف شرع ہو گیا ہو، زن اور یا کا قصہ قطعاً غلط اور بے بنیاد ہے اور خصوصاً وہ باتیں تو غلط ہی ہیں جو اس سلسلہ میں افراط و تفریط کیساتھ کہی گئی ہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ داؤد علیہ السلام کی نظر اتفاقی طور پر پڑی ہو اور اسکی بنا پر کچھ اثر بھی ہو، حضرت داؤد علیہ السلام نے اس کا علاج یہ سوچا کہ اگر اس سے نکاح ہو جائے تو یہ بات ہمیشہ کیلئے ختم ہو جائیگی (یہ بات بھی گودوراز کا رہے لیکن بات اگر ہو تو صرف اسی قدر ہو سکتی ہے) اور یہ سوچ کر داؤد علیہ السلام نے اور یا سے فرمایا کہ تم اس کو طلاق دے دو اور انکی شریعت کا یہ حکم ہو کہ اگر پیغمبر علیہ السلام کسی کے متعلق طلاق کا حکم فرمائیں تو طلاق دینا واجب ہو جاتا ہے کیونکہ پیغمبر اپنی امت کا سب سے زیادہ خیر خواہ ہوتا ہے اور وہ جانتا ہے کہ امت کے حق میں کیا چیز مفید ہے اور کیا مضر، اب اگر حضرت داؤد کے حکم کے باوجود بھی اس نے طلاق نہیں دی تو جرم کا ارتکاب اس کی جانب سے ہوا، اس کی نظیر یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی بیوی کو طلاق دلانا چاہتے تھے، لیکن ابن عمر کو اپنی بیوی سے تعلق تھا وہ اس پر آمادہ نہ تھے، حضرت ابن عمر نے حضور ﷺ

سے معاملہ کے متعلق عرض کیا، آپ نے فرمایا کہ عمر کی اطاعت کرو، معلوم ہوا کہ باپ اگر دینی مصلحت کے پیش نظر بیٹے کو طلاق دینے کے لئے کہے اور بیٹا سمجھتا ہو کہ میرا باپ مجھ سے زیادہ خیر خواہ اور عالم دین ہے تو اس پر طلاق دینا واجب نہ سہی لیکن مستحسن ضرور ہے اور ہماری شریعت کا قانون ہے کہ اگر آنحضرت ﷺ کسی سے بھی طلاق کے بارے میں فرمائیں تو اسکو طلاق دینا واجب ہو جائیگا خواہ اسے بیوی سے کتنا ہی تعلق خاطر ہو، اس اصول کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ اگر حضرت داؤد نے ان سے طلاق کے بارے میں کہا بھی تھا تو دینی مصلحت پیش نظر تھی، رہا غزوہ پر بھیجنے کا معاملہ تو غزوہ کے لئے تو واقعہً بھیجا تھا، لیکن اس لئے بھیجا تھا کہ وہاں اور یا ہی جیسے بہادر انسان کی ضرورت تھی اسکا مقصد اور یا کی زندگی کو ختم کرنا نہ تھا، یہ لغویت ہے، یہ کیا ضروری ہے کہ اور یا ہی کام آجائے پھر کیا ضروری ہے کہ عورت راضی بھی ہو جائے، عورت اگر یہ کہتی کہ خاوند مر جائے تو نکاح کر لوں گی، افسوس کہ قصہ بنانیوالوں نے ترتیب و تسبیق کا لحاظ بھی نہ رکھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام | حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں معترضین نے طرح طرح کے قصے گھڑ رکھے ہیں، قرآن کریم میں:

فطفق مسحاً بالسوق

والاعناق

سوانہوں نے انکی پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ

صاف کرنا شروع کیا۔

فرمایا گیا ہے، معترضین کہتے ہیں کہ حضرت سلیمان نے اپنی غلطی پر ایک ہزار اسیل گھوڑوں کو ختم کر دیا، غفلت اپنی تھی اور خواہ مخواہ ایک اچھے مال کو ضائع کیا اور انکی جانوں کو ختم کر دیا، دوسری آیت ہے۔

ولقد فتنا سليمان والقينا على

كرسيه جسداً (پ ۲۳ ع ۱۲)

اور ہم نے سلیمان کو امتحان میں ڈالا اور ہم نے انکے

تخت پر دھڑلا ڈالا (پھر انہوں نے رجوع کیا)

اسکے بارے میں صحیحہ جنی کا قصہ گھڑ رکھا ہے کہ حضرت سلیمان جب قضائے حاجت کے لئے جاتے تھے تو انگوٹھی ایک خادمہ کو دے جاتے تھے، ایک مرتبہ گئے تو صحیحہ جنی نے حضرت سلیمان کی شکل میں آکر خادمہ سے انگوٹھی حاصل کر لی اور حضرت سلیمان کے تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے لگا، حضرت سلیمان آئے تو بہت پریشان ہوئے اس انگوٹھی میں اسم اعظم تھا، چند ماہ بعد صحیحہ جنی کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی گر گئی تو اسے ایک مچھلی نے نگل لیا اور پھر مچھلی کے پیٹ سے وہ انگوٹھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے ہاتھ آئی تو دوبارہ حکومت کرنے لگے۔

ایک تیسری بات اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے سلسلہ میں یہ کہی جاتی ہے کہ انہوں نے معاذ اللہ بلقیس کی پنڈلیاں دیکھنے کے لئے ایک شیشہ کی نہر بنوائی تھی تاکہ وہ پانی سمجھ کر پائینچے اٹھائے اور حضرت سلیمان پنڈلی دیکھ کر یہ معلوم کر سکیں کہ اس کے متعلق بالوں کی خبر غلط ہے یا درست۔

لیکن یہ تینوں باتیں غلط اور بے بنیاد ہیں، پہلی بات تو نہایت بے تکی ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے

غیرت حق کے لئے جو اقدام کیا تھا، آپ نے اپنے تصور علم کی بنا پر اسے اضاعت مال سمجھا، بیشک اگر بلاوجہ خواہ مخواہ ان کی گردنیں مار دیتے تو اضاعت مالی کا الزام عائد ہوتا، لیکن اگر تقرب مقصد ہو تو نہ صرف یہ کہ اضاعت نہیں ہے بلکہ اعلیٰ درجہ کی اطاعت ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب یہ سمجھا کہ مجھ سے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہو گئی ہے تو اسکے تدارک کے لئے ان تمام جانوروں کو قربان کر دیا جو بظاہر اس کوتاہی کا سبب بنے تھے، یہ غیرت حق تھی اور ایسے مواقع پر انسان یہی کرتا ہے، غزوہ تبوک کے موقعہ پر حضرت کعب بن مالک کو اہتلاء پیش آیا تھا، آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا کہ لوگ جہاد کی تیاری کریں، یہ جہاد کی تیاری کے لئے آج کی بات کل پر نالتے رہے، حتیٰ کہ رسول اکرم ﷺ فارغ ہو کر تشریف لے آئے اور حضرت کعب شریک نہ ہو سکے، آپ کے تشریف لانیکے بعد حضرت کعب نے اعتراف تقصیر کیا، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان کے توبہ قبول ہونے تک ان سے تعلقات منقطع کر لئے جائیں!

چنانچہ جب توبہ قبول ہو گئی تو حضرت کعب نے اپنا تمام اثاثا البیت حاضر کر دیا کہ میں اسے خیرات کرنا چاہتا ہوں آپ نے فرمایا کہ بقدر ضرورت روک لو، جب دوسرا مال آجائے تو اسے بھی صدقہ کر دینا، دیکھئے یہ تھی غیرت حق جس نے اس پورے مال کو اللہ کے راستہ میں قربان کرنے پر آمادہ کر دیا۔

حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب امر و ہومی کی رائے گرامی | حضرت مولانا نے فرمایا کہ دراصل حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ خیال فرمایا تھا کہ

اپنی مستقل فوج بنانی چاہیے یعنی یہ کہ صرف اپنے گھر کی اولاد وغیرہ کی ایک فوج تیار ہو جائے تاکہ ان سب کا عمل میرے عمل سے منظم ہو سکے اور وہ ہر اٹھاب حاصل ہو سکے۔

اس خیال کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ فیصلہ کیا کہ آج رات کو تمام ازواج کے پاس جاؤں گا اور اسکے نتیجہ میں ایک ہزار اولاد کی فوج تیار ہو جائیگی، ضعیف روایات میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی حرم اور باندیوں کی تعداد ایک ہزار تھی، اس خیال سے گئے، لیکن ”ان شاء اللہ“ کہنا بھول گئے، یاد بھی دلایا گیا لیکن نہ کہہ سکے اسی کے ساتھ ساتھ یہ انتظام بھی کہ اس ایک ہزار فوج کیلئے ایک ہزار اسیل گھوڑے ہونے چاہئیں، اس کام کے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات کو مقرر کیا، انہوں نے مختلف مقامات سے گھوڑے فراہم کئے، حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ گھوڑوں کو پیش کر دو پیش ہوئے تو حضرت سلیمان نے اجمالی نظر ڈالی اور فرمایا بہت اچھے ہیں اور جب اجمالی نظر کا یہ سلسلہ ختم ہوا تو فرمایا۔

ردوہا علی (پ ۱۲۶۲۳) ان گھوڑوں کو ذرا میرے سامنے لاؤ۔

میں تفصیلی نظر سے دیکھوں گا یعنی پٹھے اور ایال کو، گھوڑے کی گردن اور پیروں کو دیکھا جاتا ہے، حضرت سلیمان

علیہ السلام نے ایک ایک گھوڑے کی گردن اور پنڈلیاں چھو کر دیکھیں، یہی ترجمہ

فطفق مسحاً بالسوق والاعناق (پ ۱۲۳ع ۱۲۴) سو لگے چھونے ان کی گردنوں کو اور پنڈلیوں کو

کا ہے، اسی طرح تو اورت بالحباب کا ترجمہ بھی یہی ہے کہ اجمالی نظر کے بعد وہ سلسلہ نظر سے اوجھل ہو گیا۔

پھر چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے اس شغف خاطر کے ساتھ معائنہ فرمانے سے مال کیساتھ زیادہ محبت کا اندیشہ دل میں گزرتا تھا اسلئے اپنی جانب سے صفائی فرما رہے ہیں کہ مال کی یہ محبت خیر کی محبت ہے، ارشاد ہے:-

انی احببت حب الخیر عن ذکر ربی۔ میں اس مال کی محبت میں اپنے رب کی یاد سے غافل ہو گیا

یہاں عن ذکر ربی کا ترجمہ لاجل ذکر ربی، ہے۔

اور چونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام انشاء اللہ نہ کہہ پائے تھے اسلئے انجام یہ ہوا کہ ان ایک ہزار میں سے صرف ایک کو حمل ہوا اور اس حمل سے بھی آدھا بچہ پیدا ہوا، دایانے لاکر پیش خدمت کر دیا اسی کے بارے میں

القینا علی کرسیہ جسداً (پ ۱۲۳ع ۱۲۴) اور ہم نے ان کے تخت پر دھڑلا ڈالا۔

فرمایا گیا ہے، جسکے سلسلہ میں صحرہ جنی کا واقعہ گھڑا گیا ہے اسی کو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام ان شاء اللہ کہہ دیتے تو

لجاء وافرسانا اجمعین پس وہ سب کے سب ضرور شہسوار پیدا ہوتے۔

اسی طرح تیسری بات بھی ایک لغو اور غلط چیز ہے، اول تو یہی مسئلہ دیکھنے کا ہے کہ شیشہ میں عکس لیکر ستر پر نظر کرنا درست ہے یا نہیں اور اس سلسلہ میں ہماری شریعت کا کیا فیصلہ ہے، پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے یہ نہر صرف اس لئے بنوائی تھی کہ بلیقیس کے دل پر انکی عظمت سلطنت کا گہرا نقش قائم ہو، یہ مقصد کہ حضرت سلیمان علیہ السلام یہ امتحان کرنا چاہتے تھے کہ یہ جن کی بیٹی تو نہیں اور اسکی پنڈلی پر بال تو نہیں، نہایت غلط ہے، ایک ایسا انسان جس کی سلطنت، انسان اور جن پر یکساں چلتی ہو اتنی سی بات معلوم کرنیکے لئے اس درجہ اہتمام کرے اور مشقت میں پڑے، سمجھ میں نہیں آتا، مقصد صرف یہ تھا کہ بلیقیس کو اپنی سلطنت پر جو غرہ اور ناز ہے وہ ختم ہو جائے اور بس۔

حضرت خاتم الانبیاء ﷺ | نبی اکرم ﷺ کے بارے میں جو قصہ بیان کیا جاتا ہے وہ اس آیت سے متعلق ہے۔

واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ
وانعمت علیہ امسک علیک زوجک
واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ
اور جب آپ اس شخص سے فرما رہے تھے جس پر اللہ نے
بھی انعام کیا اور آپ نے بھی انعام کیا کہ اپنی بیوی کو اپنی
زوجیت میں رہنے دے اور خدا سے ڈرا اور آپ اپنے دل

مبديہ وتخشى الناس واللہ احق
ان تخشاه فلما قضی زید منها
وطرأ زوجنکھا
(پ ۲۴۲۲)

میں وہ بات چھپائے ہوئے تھے جس کو اللہ ظاہر کر نیوالا ہے
اور آپ لوگوں کے طعن سے اندیشہ کرینوالے تھے اور ڈرنا
تو آپ کو خدا ہی سے بہتر ہے پھر زید کا اس سے جی بھر گیا
تو ہم نے آپ سے اسکا نکاح کر دیا۔

ان آیات میں حضرت زید اور انکی بیوی زینب کا ذکر ہے جو بعد میں امہات المؤمنین میں داخل ہوئیں،
حضرت زیدؓ حضور ﷺ کے متبنی تھے، آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن سے ان کا عقد کر دیا تھا، حضرت زینب عقد پر راضی
نہ تھیں کیونکہ وہ شریف خاتون تھیں اور حضرت زید پر بہر حال داغ غلامی لگ چکا تھا، اگرچہ وہ اس وقت آزاد تھے اور
انہیں متبنی ہونے کا شرف عظیم حاصل تھا، لیکن چونکہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد تھا اسلئے تعمیل ضروری ہوئی، مگر طبعی طور پر
کشیدگی کے اسباب پیدا ہوتے رہے جسکی بنا پر وقتاً فوقتاً حضرت زیدؓ کو شکایت ہو جاتی تھی لیکن چونکہ عقد پیغمبر علیہ السلام
نے فرمایا تھا اسلئے اپنے اختیار سے علیحدہ گی کا عمل مناسب نہ سمجھتے تھے بلکہ آپ سے اس سلسلہ میں اجازت طلب کرتے
تھے، آپ سمجھا دیتے تھے کہ میاں بیوی میں ایسا بھی ہو جاتا ہے مگر حتی الامکان اسے نبھانا چاہیے مگر تقدیر الہی سابق آئی
اور زید طلاق پر مجبور ہو گئے، عدت گزرنیکے بعد حق تعالیٰ نے انکو پیغمبر علیہ السلام کی زوجیت کا شرف بخشا، قرآن عزیز
میں اس واقعہ کو ان الفاظ میں بیان فرمایا گیا۔ واذ تقول الآية .

بعض مفسرین نے اس موقع پر ایک قصہ گھڑ لیا کہ معاذ اللہ آپ کے دل میں حضرت زینب کی محبت پیدا ہو گئی
تھی اور آپکی خواہش تھی کہ زید طلاق دیدیں تو ان سے نکاح کر لوں اور اس سلسلہ میں بعض منکر روایتیں بھی انہیں مل گئی
ہیں جن کو اکابر محدثین اور اعظم مفسرین درست نہیں سمجھتے۔

دراصل بات یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں اول قرآن کریم کے سیاق و سباق پر نظر کرنی چاہیے اگر اس
میں کچھ ابہام اور اجمال ہو تو احادیث صحیحہ کی مدد لیکر اس کو رفع کرنا چاہیے۔

اس اصول پر جب آیت کے سیاق و سباق کو دیکھا تو معاملہ کی نوعیت بے غبار ہو کر سامنے آ گئی واقعہ اس طرح
پر تھا کہ حضرت زینب، حضرت زیدؓ سے نکاح پر راضی نہ تھیں مگر ارشاد نبی سے مجبور ہو کر نکاح قبول کر لیا، اور قدرتی طور پر
ناموافقت کے اسباب پیدا ہوتے رہے اور حضرت زید نے سمجھا کہ نبھاؤ نہ ہو سکے گا، طلاق کی اجازت طلب کی، آپ
نے بہت کچھ سمجھایا اور اسکو خلاف معاملہ قرار دیتے ہوئے خدا سے ڈرنے کا حکم دیا، ظاہر ہے کہ حضرت زید نے نبھاؤ کی
پوری کوشش کی ہوگی، مگر جب کوئی صورت نہ رہی اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب طلاق کے سوا چارہ کار نہیں ہے تو اجازت
دے دی، ادھر اب سامنے حضرت زینب کا معاملہ تھا کہ انہوں نے آپ ہی کی حکم برداری میں اس خلاف منشا نکاح

کو قبول کیا تھا، لہذا انکی دلداری بھی ضروری تھی کہ سوسائٹی میں ان کی عزت برقرار ہے اور لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ زینب کے اخلاق اچھے نہ تھے جب ہی تو زینب نے بھی ان سے تعلق منقطع کر لیا۔

ایسی صورت میں پیغمبر علیہ السلام سمجھتے تھے کہ زینب کی دلداری کی شکل صرف یہ ہے کہ میں انہیں اپنے نکاح میں لے لوں، یہی وہ بات ہے جس کو

وتخفى فى نفسك ما الله مبديه

(پ ۲۴۲۲)

آپ اپنے جی میں وہ بات چھپا رہے تھے کہ جسکو
اللہ ظاہر کر نیوالا ہے۔

میں بیان کیا گیا ہے، یہ کہنا نہایت بیہودگی اور جسارت ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت زینب کی محبت کو چھپا رکھا تھا، اگر ایسی بات ہے تو ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ نے ما اللہ مبديه بھی تو فرمایا ہے پھر اللہ نے کیا ظاہر کیا۔ رہا اس خیال کو چھپانے کا راز سو جاہلیت میں حقیقی بیٹا اور منہ بولا بیٹا دونوں ایک درجہ میں سمجھے جاتے تھے جس طرح حقیقی بیٹے کی بہو سے نکاح درست نہیں ہے اسی طرح متبنی کی بہو سے درست نہ تھا، دستور یہ ہے، اور زینب متبنی ہیں، اور اللہ کو منظور ہے کہ یہ رسم ختم ہو جائے، اسلئے آپ کے چھپانے کی وجہ یہ تھی کہ لوگ طعنہ دینگے، محمد ﷺ نے اپنے بیٹے کی بہو سے نکاح کر لیا، اسی لئے فرمایا جا رہا ہے۔

تخشى الناس والله احق ان

تخشاه (پ ۲۴۲۲)

اور آپ لوگوں سے اندیشہ کرتے تھے اور ڈرنا

تو آپ کو خدا ہی سے سزاوار ہے۔

یعنی آپ ایک رسم کو ختم کرنے کے سلسلہ میں لوگوں کی زبانون کا خیال کرتے ہیں، آپ کو صرف اللہ سے ڈرنا چاہئے اور جو بات خداوند قدوس کی جانب سے طے ہو چکی ہے اسے کسی دوسری مصلحت کا خیال کئے بغیر ظاہر کر دینا چاہئے۔

رہا حضرت زینب کا معاملہ، وہ فی الحقیقت بہت سلیقہ مند اور اطاعت شعار خاتون تھیں اور وہ اسی قابل تھیں کہ پیغمبر علیہ السلام انہیں اپنے نکاح میں لیں، لیکن خداوند قدوس کا مقصد یہ تھا کہ مومنین کو اپنے منہ بولے بیٹوں کی ازواج سے تعلق کرنے میں جو تنگی پیدا ہو گئی ہے وہ ختم ہو جائے۔

حضرت زینب دوسری ازواج کے مقابلہ پر یہ فخر کیا کرتی تھیں کہ میرا عقد خدا نے آسمان پر کیا ہے اور معلوم ہے کہ شرف کا استحقاق ایسی عورت کو نہیں ہو سکتا جس میں خرابیاں ہوں۔

آنحضور ﷺ کے اس قصہ پر انبیاء کرام کے متعلق بیان کردہ وہ قصے ختم ہو گئے جنہیں لیکر عصمت انبیاء کے مسئلہ کو مجروح کیا جاتا ہے اس مختصر سی بحث سے معلوم ہو گیا کہ ان آیات کریمہ کا تعلق ان قصص کے ساتھ نہیں ہے جسکو

معرضین نے اعتراض ہی کی غرض ہے گھڑ کر پیش کیا، بہر کیف عصمت انبیاء کا مسئلہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جس میں کسی منصف مزاج کے لئے چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

[۱۴] بَابُ مَنْ كَرِهَ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُقَدَفَ فِي النَّارِ، مِنَ الْإِيمَانِ

(۲۱) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ

قَالَ ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ مَنْ كَانَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلَّهِ وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْقَذَهُ اللَّهُ كَمَا يَكْرَهُ

(گذشتہ ۱۶)

أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ .

ترجمہ | باب، جو کفر میں جانا اس طرح ناپسند کرتا ہو جیسے آگ میں پھینکا جانا تو یہ ایمان ہی سے ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص میں تین خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کی شیرینی پالے گا، جس شخص کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول پوری دنیا سے زیادہ محبوب ہوں اور جو شخص کسی بندے سے محبت کرے تو وہ صرف اللہ کے لئے کرے اور جو شخص کفر سے نکلنے کے بعد کفر کی طرف لوٹنا اسی طرح برا سمجھتا ہو جس طرح آگ میں ڈالا جانا۔

مقصد ترجمہ | یہ ترجمہ بھی سابق تراجم کی طرح اسی غرض سے منعقد کیا گیا ہے کہ مرجیہ کی تردید ہو جائے اس میں بھی مرجیہ کی کھلی تردید موجود ہے، ان کے مذہب کا حاصل یہ ہے کہ ایمان کو نہ طاعت کی ضرورت ہے اور نہ اسے معصیت مضر ہے، اس سلسلہ میں امام کئی باب منعقد کر چکے ہیں، یہاں بھی مقصد وہی ہے کہ ایمان کو طاقت کی ضرورت ہے اور یہ کہ ایمان کے ساتھ اس کی حلاوت بھی مطلوب ہے جو اعمال ہی کے راستہ سے حاصل ہو سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ اعمال میں تفاوت ہے تو مراتب حلاوت میں بھی اسی نسبت سے تفاوت ہوگا اور مدار حلاوت اعمال ہوئے تو ان کا ترک یقیناً ایمان کو بے لطف اور کمزور کر دیگا، کیونکہ جس چیز میں لذت نہیں محسوس ہوتی اس کی طرف رغبت بھی کم ہوتی ہے اور معلوم ہے کہ بیدلی اور بے رغبتی کا عمل بے جان ہوتا ہے، اور اگر عمل بیجان ہوگا تو ضرور اس کا اثر ایمان کی طاقت پر پڑے گا اور یہ کھلا ضرر ہے۔

تشریح حدیث | حدیث گزر چکی ہے، مفہوم یہ ہے کہ جس شخص میں یہ تین خصلتیں ہوں گی وہ ایمان کا حظ حاصل کر سکے گا، اور جس طرح میٹھی چیز مرغوب ہوتی ہے اور اسے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے

اسی طرح ایمان میں حظ اور حلاوت محسوس کرنے کی وجہ سے وہ اعمال کو اختیار کرنیکی کوشش کرے گا، بعد اذ انقذہ اللہ کے اندر دونوں صورتیں داخل ہیں، خواہ پہلے مسلمان نہ تھا اور اب اسلام میں داخل ہوایا مسلمان ہی تھا لیکن اب اعمال اس قدر مزیدار معلوم ہوتے ہیں کہ کفر کے خیال سے بھی بھاگتا ہے حدیث کے تینوں جملوں کی شرح آچکی ہے۔

[۱۵] بَابُ تَفَاضُلِ أَهْلِ الْإِيمَانِ فِي الْأَعْمَالِ

(۲۲) حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ يَدْخُلُ أَهْلُ الْجَنَّةِ الْجَنَّةَ وَأَهْلُ النَّارِ النَّارَ ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُ أَخْرِجُوا مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيْمَانٍ فَيُخْرِجُونَ مِنْهَا قَدْ اسْوَدُّوا فَيُلْقَوْنَ فِي نَهْرِ الْحَيَاةِ وَالْحَيَاةِ شَكٌّ مَالِكٌ فَيَنْبُتُونَ كَمَا تَنْبُتُ الْحَبَّةُ فِي جَانِبِ السَّبِيلِ أَلَمْ تَرَ أَنَّهَا تَخْرُجُ صَفْرَاءَ مُلْتَوِيَةً، قَالَ وَهَيْبٌ حَدَّثَنَا عَمْرُو الْحَيَاةِ وَقَالَ خَرْدَلٌ مِنْ خَيْرٍ.

(آئندہ: ۲۵۸۱، ۲۹۱۹، ۶۵۶۰، ۶۵۷۴، ۷۴۳۸، ۷۴۳۹)

ترجمہ | باب، اعمال کی وجہ سے اہل ایمان کے درمیان فرق مراتب۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل دوزخ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ دوزخ سے اس کو نکال لو جس کے دل میں رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو، چنانچہ ایسے لوگ بالکل سیاہ ہو چکنے کے بعد اب جہنم سے نکالے جائینگے پھر وہ بارش کی نہریا زندگی کی نہر میں ڈال دیئے جائیں گے، (یہ شک امام مالک کا ہے) پھر وہ لوگ اس طرح بڑھنے لگیں گے، جس طرح سیلاب کے ایک کنارے میں دانہ اگنے لگتا ہے، کیا تم نہیں جانتے کہ وہ اول اول زرد لپٹا ہوا نکلتا ہے، وہیب نے (عن عمرو کی جگہ) حدیث عمرو (اور بغیر شک کے) نہر الحیاة کہا ہے اور (خردل من ایمان کی جگہ) خردل من خیر کہا ہے۔

مقصد ترجمہ | مقصد وہی مرجیہ کی تردید ہے یعنی مومنین میں اعمال کے اعتبار سے درجات کا تفاوت ہوتا ہے، یہاں فی الاعمال میں فی سبیہ ہے یعنی۔

تفاضل اهل الايمان بسبب الاعمال جیسے

عذبت امرأة في هرة لا هي اطعمتها
ولاتركتها تاكل من خشاش
الارض . (بخاری شریف ص: ۴۹۵)

ایک عورت کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا جو
نہ اسکو کھانا کھلاتی تھی اور نہ اسے چھوڑتی تھی
کہ وہ زمین کی گھاس پھوس کھا سکے۔

میں فی سبیہ ہے اور معنی بسبب ہرہ ہے یعنی ایک عورت کو بلی کی وجہ سے عذاب دیا گیا جو نہ بلی کو کھانے کو دیتی تھی اور نہ اسے چھوڑتی تھی کہ وہ اپنا رزق خود تلاش کرے چنانچہ اسے یہ عذاب دیا گیا کہ بلی اسپر مسلط کر دی گئی جو اسے چھوڑتی تھی، بہر کیف فی سبیہ ہے، اور مقصد یہی ہے کہ اعمال کی وجہ سے ایمان میں تفاوت ہوتا ہے۔

یہاں یہ اشکال ہوتا ہے کہ جب اعمال ایمان کا جز ہوئے تو عمل کے اعتبار سے ایمان کا تفاوت بے معنی ہو گیا۔ کیونکہ

اس تقدیر پر اعمال غیر ایمان نہ ہوں گے تو۔ باب تفاضل اہل الایمان۔ کے معنی ہوئے۔ تفاضل اہل الایمان فی الایمان۔ اور اس کی لغویت ظاہر ہے۔

اس کا جواب یوں سمجھئے کہ جس طرح محاورات میں علماء کا فرق، مراتب علم ہی کے بعض مخصوص شعبوں کے لحاظ سے قائم کیا جاتا ہے، مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں عالم فصاحت، بلاغت اور قوتِ بیانیہ میں دوسرے علماء سے ممتاز ہے حالانکہ فصاحت، بلاغت خود علم ہے، اسی طرح اعمال اور ایمان کے معاملہ کو سمجھیں کہ فلاں مومن کو فلاں مومن پر بہ لحاظ اعمال فوقیت حاصل ہے کہ اسکے پاس اعمال کا ذخیرہ وافر ہے جو اس کے مقابل کے پاس نہیں۔

تفاضل کے معنی | حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جب اہل جنت، جنت میں داخل ہو جائیں گے اور اہل جہنم جہنم میں، تو کچھ عرصہ کے بعد خداوند قدوس انبیاء کرام کے قلوب میں یہ بات ڈالے گا کہ ان

مومنین کو جہنم سے نکالنے کے لئے ہمارے دربار میں سفارش پیش کریں جو اپنی بد اعمالیوں کی بدولت جہنم میں داخل ہیں، چنانچہ انبیاء کرام شفاعت کی غرض سے تشریف لیجائیں گے اس شفاعت پر خداوند قدوس ارشاد فرمائے گا۔

اخر جوا من کان فی قلبه مثقال

اس کو دوزخ سے نکال لو جس کے دل میں

رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان ہو۔

حبة من خردل من ایمان

اسکے معنی یہ ہوئے کہ مومنین میں دنیاوی اور اخروی اعتبار سے فرق مراتب ہے، دنیاوی اعتبار سے تو ہم ظاہر

ہی کو دیکھ کر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ایک شخص کو اعمال صالحہ اختیار کرنیکی توفیق ہوتی ہے دوسرے کو نہیں ہوتی۔

اخروی تفاضل یہ ہے کہ جو لوگ جہنم میں گئے انکے قلب میں ایمان موجود ہے اور ایمان کا تقاضا جنت ہے، اس

تقاضے کو پورا کرنے کی صورت یہ ہوگی کہ سفارش کرائی جائیگی تاکہ انبیاء کرام کا درجہ ظاہر ہو۔

جس کا عمل زائد ہوگا اسکو پیغمبر کی سفارش پر سب سے پہلے نکالا جائیگا اور پھر دوسرے نمبر پر ان لوگوں

کو نکالا جائیگا جو انکی بہ نسبت کم اعمال والے ہوں گے، معلوم ہوا سب کچھ اعمال پر منحصر ہے جن کے اعمال اونچے تھے وہ

جہنم سے محفوظ رہ گئے اور جنکے اعمال میں خامی تھی اور حکمت باری اسکی مقتضی تھی کہ انھیں جہنم کی ہوا کھلا دی جائے،

انھیں پیغمبر کی سفارش سے نکالا جائیگا اور اس طرح مراتب کی تفریق کا علم ہوگا، پھر یہ بھی نہیں کہ جہنم سے بالترتیب

نکالیں گے، اور جنت میں سب کو ایک ساتھ داخل کیا جائے گا بلکہ وہاں بھی ترتیب رہے گی۔

جہنم سے نکال کر فوراً ہی جنت میں داخل نہیں کر دیا جائیگا بلکہ جنت کے دروازہ پر ایک نہر

نہر حیات اور اسکا اثر | ہے جس کا نام نہر الحیاء ہے (یہاں راوی کو ”نہر حیات“ اور ”نہر حیا“ کے درمیان اشتباہ

ہو رہا ہے ”حیا“ کے معنی بارش کے ہیں اس سے بھی زندگی ملتی ہے) پہلے جہنم سے نکال کر اس نہر میں ڈال دیا جائیگا تاکہ

جہنم کی آگ سے جھلے ہوئے انسانوں میں تروتازگی اور زندگی آجائے، لیستون میں فاء تعقیب مع الوصل کیلئے ہے،

یعنی نہر میں ڈالتے ہی نشوونما شروع ہو جائیگا، اور پھر اس سرعبت نمو کیلئے ایک خارجی مثال بیان فرمائی جا رہی ہے کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ اگر گھاس کا دانہ سیلاب کے کنارے کی مٹی میں پڑ جائے تو اس کے نمو میں کچھ دیر نہیں لگتی چلتے چلتے نمو ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم نے دیکھا ہوگا کہ جب وہ دانہ اول اول نکلتا ہے تو اس کا رنگ زرد ہوتا ہے وہ نیچے کی طرف مڑا ہوا ہوتا ہے یعنی سرنگوں ہوتا ہے لیکن جونہی باہر کی ہوا لگتی ہے اس میں استقامت پیدا ہو جاتی ہے اور رنگ بھی بدل جاتا ہے، ارباب تحقیق نے بیان کیا کہ دانہ کا یہ رنگ اور کچی اسکے احساس کی غماز ہیں کہ اب زندگی کے بعد اس پر کچھ ذمہ داریاں آگئی ہیں، یعنی جب تک وہ دانہ تھا اس وقت تک اسے کسی قسم کا خوف نہ تھا، لیکن اب سبزہ بن جانیکے بعد اس کے ساتھ مخلوق خداوندی کے نفع و ضرر کا تعلق ہے اسی احساس ذمہ داری کے بوجھ سے وہ کمر خمیدہ اور زرد پیدا ہوتا ہے۔

حدیث و ترجمہ کا انطباق | اشکال یہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمہ میں تفاضل اہل الایمان فی

الاعمال فرمایا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اہل ایمان میں اعمال کی راہ سے تفاوت و تفاضل آتا ہے لیکن اس کے ذیل میں پیش کردہ حدیث میں اخر جوا من کان فی قلبه مثقال حبة من ایمان فرمایا گیا یعنی جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو، اسے جہنم سے نکال لو، اور اس میں کہیں بھی بد اعمالی کا ذکر نہیں ہے، نیز یہ کہ امام کا مقصد یعنی مرجیہ کی تردید بھی اسی پر موقوف ہے کہ یہاں اعمال کا ذکر کیا جائے۔

سو اس کا جواب یہ ہے کہ امام بخاری کے یہاں ایمان میں اعمال بھی داخل ہیں، اور تصدیق کی طرح اعمال پر بھی انکے یہاں ایمان کا اطلاق ہوتا ہے لیکن اگر کوئی بخاری سے الجھے کہ کس ثبوت کے پیش نظر اس حدیث میں ایمان سے اعمال مراد ہیں تاکہ تفاضل اہل الایمان فی الاعمال کا ترجمہ ثابت ہو سکے تو اس کے لئے امام بخاری نے اس حدیث کے دوسرے طریق سے من خیر کا لفظ نقل فرمادیا جس کا عمل پر اطلاق شائع ذائع ہے، قرآن کریم میں او کسبت فی ایمانها خیرا (پ ۷۸ ع ۷) یا اس نے اپنے ایمان میں کوئی نیک عمل نہ کیا ہو۔

میں خیر سے اعمال خیر ہی مراد ہیں اور دیکھئے فرماتے ہیں:

من يعمل مثقال ذرة خیرا یرہ

سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کریگا اس کو دیکھ لے گا

ومن يعمل مثقال ذرة شرا یرہ (پ ۳۰ ع ۲۳)

اور جو شخص ذرہ برابر بدی کریگا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

لیکن اس صورت میں اعتراض یہ ہے کہ جب روایت میں دونوں لفظ وارد ہوئے ہیں تو بخاری نے من ایمان کو اصل اور من خیر کو اس کا تابع کیوں قرار دیا اس کا عکس کیوں نہ کیا، حالانکہ مقصد کے لحاظ سے من خیر کو اصل کی حیثیت میں ذکر کرنا انب تھا، بلاشبہ ایسا کرنا بہتر ہوتا مگر بخاری کے پیش نظر اس سے بھی زیادہ ایمان اور عمل کے اتحاد کا معاملہ ہے اور اس طریق عمل میں مرجیہ کی تردید کا پہلو جس قدر نمایاں ہوتا ہے عکس کی صورت میں اتنا نمایاں نہیں ہوتا۔

لہذا امام بخاری نے من ایمان کی روایت کو اصل قرار دیتے ہوئے یہ ظاہر کیا کہ یہاں من ایمان، من خیر کی جگہ بولا گیا ہے یعنی یہاں اعمال کو ایمان فرمایا گیا ہے پھر مرجیہ کا یہ قول کہ عمل کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں کس قدر لغو اور باطل ہے۔

لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ اعتراض باقی رہ جاتا ہے کہ اس روایت میں عمل کا ذکر صراحت کے ساتھ نہیں ہے، رہا لفظ خیر سواس میں دو پہلو ہیں اصل خیر تو ایمان ہی ہے کہ اس کے بغیر کوئی چیز معتبر نہیں اور اگر خیر کا اطلاق ایمان پر بھی درست ہے تو کیا ضروری ہے کہ ہم عمل ہی مراد لیں۔

امام کا مقصد تو جب ثابت ہوتا ہے کہ حدیث میں صراحت کے ساتھ عمل کا لفظ ہوتا، اسکے لئے ہمیں تفصیلی روایت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا، حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ عنہ کی تفصیلی روایت میں اعمال کا ذکر کیا گیا ہے، چنانچہ مسلم شریف میں یہ روایت بدیں الفاظ منقول ہے۔

يقولون ربنا كانوا يصومون معنا
وجنتي عرض كريغكيه كه هماره رب وه لوگ هماره ساتھ
ويصلون ويحجون فيقال لهم
روزے رکھتے تھے، نماز پڑھتے تھے، حج کرتے تھے،
اخرجوا من عرفتم
پس ان سے کہا جائے گا کہ جنکو تم پہچانتے ہو انکو نکال لو۔

یعنی جب جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے اور وہ یہ دیکھیں گے کہ فلاں فلاں شخص جو ہمارے ساتھ ان اعمال خیر میں شریک تھے یہاں نہیں ہیں تو یہ لوگ انکے متعلق عرض کریں گے کہ انہیں جہنم سے نکال دیا جائے، اسکے بعد آنحضرت ﷺ ان حضرات کے لئے سفارش کریں گے، بس یہاں جن چیزوں کو سفارش کے لئے بنیاد قرار دیا گیا ہے وہ اعمال ہیں پھر ایسے لوگ نکالے جائیں گے تو نوبت ایسے لوگوں کی آئیگی جن کے پاس اعمال جوارح کا تو کوئی حصہ نہ ہوگا مگر اعمال قلبیہ میں مختلف درجات کے اعمال ہونگے چنانچہ انکو بذریعہ سفارش حسب تفاوت درجات علی الترتیب نکالا جائیگا، اب صرف وہ لوگ رہ جائیں جو شافعیین کی نظر میں خلود فی النار کے مستحق ہیں کیونکہ ان کے پاس عمل اور خیر کا کوئی ادنیٰ حصہ بھی نہ ہوگا اور انکا ایمان بھی اسقدر مضحک ہوگا کہ سید الانبیاء کی عمیق نظر بھی اس کو نہ دیکھ پائیگی، تو خداوند کریم خود ہی بہ تقاضائے کرم ان لوگوں کا اخراج فرمائے گا۔

یہ کون لوگ ہوں گے آیا کلمہ گو مسلمان ہونگے یا شواہق جہال کے رہنے والے انسان جنکو کسی نبی کی دعوت نہ پہنچی ہوگی یا اصحاب فترۃ، شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس سوائے توحید کے اور کچھ نہ ہوگا یعنی یہ اہل فترۃ ہیں جنہیں رسالت کا زمانہ نہیں ملا اور بروئے عقل وہ خدا کی توحید کے قائل ہوئے۔

اور چونکہ انکی توحید بواسطہ رسول نہیں اسلئے اخراج میں بھی رسالت کا واسطہ نہیں رکھا گیا، ہمارے حضرت علامہ کشمیری اس رائے سے متفق نہیں، گویا شیخ اکبر کو ان روایات سے دھوکا لگا جن میں صرف لا الہ الا اللہ کا ذکر ہے

شہادتیں مذکور نہیں۔ حالانکہ لا الہ الا اللہ اسلام کا شعار ہے اور لا الہ الا الہ کہنے کے معنی اسلام لائیکے ہیں جو شہادتین کے بغیر درست نہیں ہوتا، نیز اسکی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسطرح کے لوگ ہر رسول کی امت میں ہونگے لہذا کسی رسول کا خصوصی نام اسمیں لایا ہی نہیں جاسکتا کہ وہ موہم شخص ہوتا ہے۔
واللہ اعلم

روایت کا مزید فائدہ یہاں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ خداوند قدوس کے اذن کے باوجود پیغمبر علیہ السلام ایسے افراد کو جہنم سے نکالنے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے اور صاف کہہ دیں گے کہ اب تو صرف من و جب علیہ الخلود رہ گئے ہیں لیکن جب خداوند قدوس ان افراد کو نکالیں گے تو معلوم ہوگا کہ پیغمبران عظام کتنے افراد کو اپنی لاعلمی کی بنا پر نہ نکال سکے تھے، معلوم ہوا کہ پیغمبر عالم الغیب نہیں ہیں۔

یہ عالم الغیب کہنے والے جب زیادہ دباؤ محسوس کرتے ہیں تو کہتے کہ کہ زندگی کے آخری لمحات میں یہ علم دیا گیا ہے لیکن اس روایت کا کیا جواب ہے جو زندگی کے آخری لمحات کے بعد بھی لاعلمی کا ثبوت پیش کر رہی ہے، یہ روایت پیغمبر علیہ السلام کے عالم الغیب نہ ہونے کے بارے میں نص ہے۔

اس روایت سے اور بھی کچھ بحثیں متعلق ہیں مگر وہ ”باب زیادة الايمان ونقصانه“ میں پیش کی جائیں گی، وہاں یہ روایت حضرت انسؓ کے طریق سے آئیگی، روایت تقریباً ایک ہی ہے، فرق یہ ہے کہ یہاں اسباب نجات میں اعمال کو لیا گیا ہے اور وہاں ایمان کو۔

(۲۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحِ بْنِ شَهَابٍ عَنْ أَبِي أَمَامَةَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حَنِيفٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ يَقُولُ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ بَيْنَا أَنَا نَائِمٌ رَأَيْتُ النَّاسَ يُعْرَضُونَ عَلَيَّ وَعَلَيْهِمْ قُمْصٌ مِنْهَا مَا يَبْلُغُ الثُّدِيَّ وَمِنْهَا مَا دُونَ ذَلِكَ وَعُرِضَ عَلَيَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَعَلَيْهِ قَمِيصٌ يَجْرُهُ قَالُوا فَمَا أَوْلَتْ ذَلِكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ - الدِّينَ - (آئندہ: ۳۶۹۱، ۷۰۰۸، ۷۰۰۹)

ترجمہ | حضرت ابوسعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں یہ دیکھا کہ لوگ میرے سامنے پیش کئے جا رہے ہیں اور وہ طرح طرح کے قمیص پہنے ہوئے ہیں بعض سینے تک پہنچتی ہیں اور بعض اس سے نیچے اور عمر بن الخطاب اس حال میں میرے سامنے لائے گئے کہ وہ اپنی قمیص کو کھینچتے تھے، صحابہ نے عرض کیا، آپ نے اس کی تاویل کیا فرمائی ہے، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ دین۔

حدیث کی غرض منطوق | پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ لوگ میرے سامنے چھوٹے بڑے کرتے پہنے ہوئے پیش کئے جا رہے ہیں کسی کا کرتہ سینہ تک اور کسی کا اور نیچے اسی حال میں عمر سامنے آئے تو ان کا کرتہ پورے جسم کو ڈھکنے کے بعد زمین پر گھسٹ رہا تھا۔

صحابہ نے عرض کیا، آپ نے اس کا کیا مصداق معین فرمایا، آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہین یعنی مجھے لوگوں کی دینی کیفیت دکھلائی گئی ہے، معلوم ہوا کہ لوگوں میں دین کے اعتبار سے تزايد و تفاوت ہے چونکہ پیش کئے گئے تمام افراد میں حضرت عمر کا قیص سب سے بڑا تھا اسلئے ان کا دین سب سے فزول تر ہے۔

یہ قیص کیا چیز ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ اعمال ہی سے تعبیر ہے کیونکہ قیص باہر کی چیز ہے، قیص کے ذریعہ انسان اپنے بدن کی حفاظت کرتا ہے، یہ بدن کو گرمی سردی سے بچاتا ہے، زیبائش بدن کا کام دیتا ہے، پھر یہ ایک ایسی چیز ہے جس کے سنبھالنے میں تکلف کم ہے، چادر ہو تو سنبھالتے سنبھالتے پریشان ہو جاؤ، تہم کا معاملہ بھی یہی ہے ہوا لگی اور ادھر سے ادھر ہو گیا، کشف ستر کا خوف رہتا ہے لیکن یہ لباس ایسا ہے کہ پہن لیجئے اور بے خطر ہو جائیے، دوسرے کام انجام دینے میں بھی دقت پیش نہیں آتی، بدن کا ہر حصہ پوری طرح ڈھک جاتا ہے کیونکہ وہ قیص خود بھی ایک بدن بن جاتا ہے۔

اسی طرح دین انسان کا محافظ ہے، انسان کیلئے اعلیٰ زینت و زیبائش ہے اور جہنم کے طبقہ نار اور طبقہ زمہریر سے محافظ بھی، گویا یہ دین بدن انسان کی ایسی جگہ حفاظت کرتا ہے جہاں کوئی دوسری چیز حفاظت نہیں کر سکتی اور جب دین حاصل ہو جاتا ہے تو ہر چیز کی جانب قدم بڑھانے میں سہولت رہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ روحانی زیبائش بھی حاصل ہوتی ہے اور سچا دین دار انسان خداوند کریم کے یہاں معزز اور مقبول ہوتا ہے اور دنیا والے بھی اسکی عزت کرتے ہیں اور اس کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہیں، کیونکہ اس نے ایک ایسی زینت حاصل کی ہے جو سب کے نزدیک محمود ہے اور محمود چیز سب کو پسند ہوتی ہے، اب وہ بات کہ ”اہل ایمان میں دین کے اعتبار سے تقاضل ہے، اس حدیث کے اندر بھی آگئی۔“

یہاں ایک سرسری اشکال اور اس کا حل | یہاں ایک سرسری اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ اس حدیث میں حضرت عمرؓ کے قیص کو سب سے بڑا دکھلایا گیا ہے اور اسکی مراد دین بتلائی گئی ہے، حالانکہ

اس پر اجماع ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد سب سے بڑا دین صدیق اکبرؓ کا ہے اور صدیق اکبر کے بعد فاروق اعظم کا درجہ ہے اور یہاں معلوم ہو رہا ہے کہ دینی حیثیت سے حضرت عمرؓ کی شان تمام لوگوں کے مقابل زائد ہے کیونکہ حدیث میں الناس کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو حسب تقاضائے مقام استغراق پر محمول ہو سکتا ہے، اشکال گو وزن دار نہیں ہے لیکن بہر کیف شبہ ضرور پیدا کرتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو حدیث میں بیان کردہ تقسیم حاضر نہیں ہے، ان تین درجات کے علاوہ اور بھی بہت سے مراتب اور درجات قائم ہو سکتے ہیں، حدیث میں تین چیزیں ہیں ایک ثدی اور دوسری بات مادیون ذلك اور تیسری بات یجو قمیصہ عقلی طور پر اور بھی احتمالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا قیص اس سے بھی زائد ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ صدیق اکبر کو پیش نہ کیا گیا ہو کہ ان کا کمال ایمانی مسلم ہے انکے عرض کی حاجت نہیں، البتہ

حضرت عمر اور دوسرے اصحاب کو پیش فرما کر بلحاظ دین حضرت عمر کا تفوق دکھلانا مقصود ہو، اس صورت میں الف لام کا استفراق عربی ہوگا نہ حقیقی، البتہ اگر صدیق اکبر کا نام لیکر حضرت عمر کے متعلق یہ ارشاد ہوتا تو اعتراض کا موقعہ ہو سکتا تھا مگر یہاں ایسا نہیں ہوا، دوسری بات یہ کہ اگر تقسیم حاضر بھی ہو تو زائد سے زائد یہ ایک منام کا واقعہ ہوگا اور صدیق اکبر کی فضیلت کا اظہار بہ حالت یقظہ ہوتا رہا ہے، اس اعتبار سے بھی صدیق اکبر ہی کو فضیلت رہی، کجا یقظہ اور کجا منام۔ مانا کہ یہ منام پیغمبر علیہ السلام کا ہے جو حکما و جی ہوتا ہے مگر پھر بھی یہ تو ماننا پڑے گا کہ حالت یقظہ کی تصریحات کے بالمقابل منامی اشارہ ادنیٰ درجہ میں رہے گا پھر اگر برابری مسلم بھی ہو تو یہ خبر واحد کا نتیجہ ہوگا اور صدیق اکبر کی فضیلت نصوص قطعہ متواترہ سے ثابت ہے، اور خبر واحد اعلیٰ سے اعلیٰ ہو کر بھی ظنی ہی رہے گی تو پھر قطعیات سے ظنیات کا کیا مقابلہ، اور اگر مان لیں کہ روایات میں دونوں جانب قطعیت ہے، تب بھی صدیق اکبر کی فضیلت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا کیونکہ صدیق اکبر کی فضیلت پر امت عادلہ کا اجماع ہے جو تمام قطعیات سے اوپر کے درجہ میں ہے، بہر صورت پیش کردہ صحابہ میں حضرت عمر کا تفوق دکھانا اس روایت کا مقصد ہے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

حضرت الاستاذ کارحمان | اس حدیث میں فاروق اعظم کی ایک جزئی فضیلت کا اظہار کیا گیا ہے کہ ان کے عہد خلافت میں فتوحات کی کثرت ہوگی جو صدیق اکبر کے عہد خلافت میں نہ ہو سکے گی جو قمیص علی الارض میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے مگر ظاہر ہے کہ اس جزئی فضیلت کو لیکر صدیق اکبر کی فضیلت کا مقابلہ نہیں ہو سکتا، صدیق اکبر کا فضل کلی ہے، اور عند التقابل ترجیح فضل کلی ہی کو رہے گی۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ قیامت کے دن مؤذنین کو نورانی ممبروں پر بیٹھایا جائیگا اور وہ ایسے اعلیٰ قسم کے ہونگے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام انہیں دیکھ کر غبطہ فرمائیں گے، حالانکہ بیچارہ مؤذن کہاں اور رفیع الدرجات حضرات انبیاء کرام کہاں؟ کوئی نسبت ہی نہیں، انکی نشست گا ہیں مؤذنین سے بدرجہا اعلیٰ اور افضل ہونگی مگر پھر غبطہ کی نوبت آئے گی ظاہر ہے کہ غبطہ اسی چیز پر ہوا کرتا ہے جو اپنے پاس موجود نہ ہو، اگرچہ اس سے اعلیٰ چیزیں خود کو حاصل ہوں مگر یہ مؤذن کی ایک فضیلت جزئی ہوئی جوئی حد ذاتہ فضیلت ہوتے ہوئے بھی انبیاء علیہم السلام کے فضائل کلیہ کے مقابل میں محض بے حقیقت ہے، ٹھیک اسی طرح حضرت عمر کی اس فضیلت کو سمجھئے۔

یامثلًا کوئی شخص کرسی پر بیٹھا ہوا ہے اور ایک دوسرا تخت پر ہے اور وہ تخت شاندار ہونیکے باوجود کرسی سے نیچا ہے ایسی صورت حال میں گو تخت پر بیٹھنے والے کی حیثیت اونچی ہے لیکن کرسی والے کو اونچا ہونیکے ایک جزئی فضیلت حاصل ہے اور جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو آنحضرت ﷺ پر ایک جزئی فضیلت حاصل تھی، یعنی وہ آنحضور ﷺ سے زیادہ صبیح تھے۔

اس اجمالی کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر کا زمانہ خلافت بہت مختصر رہا، صرف دو سال چارہ ماہ

دور خلافت ہے، اور اس دور خلافت میں زیادہ تر ان لوگوں کی اصلاح کی گئی ہے جنہوں نے پیغمبر علیہ السلام کے وصال کے بعد ارتداد اختیار کیا تھا، صدیق اکبر کی خلافت کا بیشتر حصہ ان ہی لوگوں کی سرکوبی میں صرف ہوا جسکے نتیجہ میں اکثر افراد تائب ہو کر پھر اسلام میں داخل ہوئے اور فاروق اعظم کے دور کی فتوحات کا سلسلہ بہت وسیع ہے۔

حضرت صدیق اکبر فتنہ ارتداد کی اصلاح کے بعد اس طرف متوجہ ہوئے تھے لیکن ابھی سلسلہ دمشق ہی تک پہنچا تھا کہ ان کی وفات ہو گئی، حضرت فاروق اعظم نے ایک ہزار شہر اسلامی سلطنت میں داخل کئے، لیکن یہ ایک جزئی فضیلت ہے، صدیق اکبر کی فضیلت تو وہاں معلوم ہوتی ہے جہاں رسول اکرم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں۔

ما صبَّ اللہ فی قلبی صبیئہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں میرے قلب میں القا فرمائی ہیں

فی قلب ابی بکر میں نے انکو حضرت ابو بکر کے قلب میں ڈال دیا ہے۔

صلح حدیبیہ کے موقعہ پر شرط لگائی گئی کہ اگر مشرکین کا کوئی آدمی مسلمانوں کے پاس آجائیگا تو اسے واپس کیا جائیگا اور اگر مسلمان مشرکین کے پاس پہنچے گا تو اسے واپس نہ کریں گے، اس شرط پر بہ ظاہر مسلمانوں کا پہلو کمزور معلوم ہو رہا ہے اسی وجہ سے فاروق اعظم نے آن حضور ﷺ سے عرض کیا

السنا علی الحق وہم علی

الباطل کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں۔

پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا، اللہ نے مجھے پیغمبر بنایا ہے، میں اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتا، پھر حضرت عمرؓ جوش میں بھرے ہوئے صدیق اکبر کے پاس پہنچے اور یہی کہا، صدیق اکبر نے بھی وہی جواب دیا جو آن حضور ﷺ نے دیا تھا، صدیق اکبر کو کہاں کہاں دیکھو گے، پیغمبر علیہ السلام کے وصال کے بعد حضرت عمرؓ کس قدر بے حال تھے اور حضرت ابو بکر کس قدر مستقیم اچاں تھے باوجودیکہ ان کا کلیجہ جل رہا تھا، حضرت عائشہؓ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے کلیجہ جلنے کی بو سونگھی تھی، دفن کا مسئلہ آیا تو سب لوگ مختلف الخیال تھے ہر شخص جسد اطہر کو اپنے قریب رکھنا چاہتا تھا لیکن صدیق اکبر نے فیصلہ کیا کہ پیغمبر ان کرام کو اسی جگہ دفن کیا جاتا ہے جہاں ان کی وفات ہوتی ہے۔

جیش اسامہ کو بھیجنے کے سلسلہ میں سارے مسلمانوں کا دماغ ایک طرف تھا اور صدیق اکبر کا ایک طرف تمام لوگ مخالف تھے کہ اگر یہ لشکر بھیج دیا گیا تو مدینہ خالی ہو جائیگا، صدیق اکبر نے فرمایا کہ لشکر روکا نہیں جاسکتا، پیغمبر علیہ السلام کا تیار کردہ لشکر ضرور جائیگا، جسکی مصلحت بعد میں ظاہر ہوئی کیونکہ اگر یہ لشکر نہ جاتا تو دشمن سمجھتے کہ مسلمان ڈرے ہوئے ہیں، پیغمبر کے امور نافذ کرنے میں بھی تردد ہو رہا ہے اور لشکر چلا گیا تو تمام دشمن یہ سوچ کر دب گئے کہ ضرور کوئی ناقابل شکست طاقت مسلمانوں کے پاس ہے، اسی لئے تو ان حالات میں اتنا بڑا لشکر بغیر کسی پرواہ کے بھیج

دیا گیا ہے۔

اور جب حضرت صدیق اکبرؓ نے اپنی دماغی اور عملی کاوشوں سے فتنہ ارتداد کو فرو کر دیا اور فتوحات کے لئے راہ ہموار ہو گئی تو فاروق اعظم نے انکی صاف کی ہوئی شاہراہ پر چلنا شروع کیا اور اس طرح فتوحات کا ایک طویل و عریض سلسلہ شروع ہو گیا، اسلئے گو سب سے بڑا کام حضرت صدیق اکبرؓ نے انجام دیا لیکن فتوحات کے کثرت کی جزئی فضیلت حضرت عمر کے حصہ میں آئی علیہ قمیص یجرہ میں اسی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، جدھر سے گزرتے ہیں فتح ہی فتح ہوتی ہے جیسا کہ ایک دوسری حدیث میں آیا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ایک کنویں سے پانی نکالا، پھر میرے بعد ابو بکر نے نکالا اور پھر عمر کی باری آئی تو ڈول ایک بڑے چرس کی صورت میں تبدیل ہو گیا، عمر نے بڑی قوت کے ساتھ کھینچنا شروع کیا حتیٰ کہ تمام لوگ سیراب ہو گئے اور اپنی اپنی جگہ آرام سے پہنچ گئے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

ثم جاء عمر بن الخطاب فاستحالت
غربا فلم اربعقريا يفري فريه حتى
روى الناس و ضربوا العطن .
(مسلم: ج ۲، ص ۲۷۵)

پھر حضرت عمر بن الخطاب آئے پس وہ ڈول چرس کی
صورت میں تبدیل ہو گیا، پس نہیں دیکھا میں نے کسی
عبقری کو جو ان جیسا عظیم الشان کام کرے حتیٰ کہ لوگ
سیراب ہو گئے اور آرام پا گئے۔

تو فرض کیجئے کہ حضرت عمرؓ کا قیص زمین پر گھسٹ رہا تھا اور حضرت صدیق اکبرؓ کا قیص ان سے کم تھا تو یہ حضرت فاروق اعظمؓ کی جزئی فضیلت رہی جس کا کلی فضیلت کے مقابلہ پر کوئی اعتبار نہیں۔

[۱۶] بَابُ: الْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ

(۲۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ أَبِيهِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ مَرَّ عَلَى رَجُلٍ مِنَ الْأَنْصَارِ وَهُوَ يَعِظُ أَخَاهُ فِي الْحَيَاءِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ دَعَاهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ . (آئندہ: ۶۱۱۸)

ترجمہ | باب، حیاء ایمان کا ایک حصہ ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ ایک انصاری کے پاس سے گزرے اور وہ اپنے بھائی کو حیاء سے روک رہا تھا اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اسے رہنے دو، کیونکہ حیاء ایمان کا ایک حصہ ہے۔

حدیث کا مفہوم | پیغمبر علیہ السلام ایک انصاری کے نزدیک سے گزرے، وہ انصاری دوسرے انصاری بھائی کو حیاء کے بارے میں نصیحت کر رہا تھا کہ میاں فلا نے تم اس حیاء کو چھوڑ دو کیونکہ تو اس سے کس قدر

نقصان اٹھا رہے ہو، وعظ کے معنی روکنے کے آتے ہیں ایک روایت میں يعظ کی جگہ يعاتب کے الفاظ وارد ہوئے ہیں، یعنی یہ زجر و توبیخ کے انداز میں تھا، گویا وہ انصاری اپنے خیال میں ایک برے کام سے روک کر ہمدردی کا کام کر رہا تھا کیونکہ جس انسان پر حیاء کا غلبہ ہوتا ہے وہ لوگوں سے اپنے حقوق طلب کرنے میں شرماتا ہے، دوسرا انسان بے طلب کئے نہیں دیتا اور یہ انسان شرم کی وجہ سے مطالبہ نہیں کر سکتا، اسلئے اسے نقصان اٹھانا پڑتا ہے، دوسرا نقصان یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بھی سستی آجاتی ہے، یہ کسی انسان کو غلط کام میں مبتلا بھی دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ یہ بڑے ہیں زیادہ تجربہ کار اور واقف ہیں، ادب المفرد کی روایت سے اس مقصد کی پورے طور پر وضاحت ہو جاتی ہے جسکے یہ الفاظ ہیں:

حیاء کے بارے میں اپنے بھائی کو عتاب کر رہا ہے
گویا کہ وہ اسے کہہ رہا ہے کہ حیاء نے تجھ کو بہت
نقصان دیا۔

يعاتب اخاه في الحياء
حتى كانه يقول اضربك
(ادب المفرد ص ۸۷)

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ حیاء کے معاملہ میں ان سے تعرض مت کرو، حیاء تو ایک خلق حسن ہے جو انسان کو معاصی کے ارتکاب سے روکتا ہے۔

یعنی جو شخص بندوں کے حقوق کی ادائیگی اور ان سے اپنے مطالبات کے حصول میں حیاء کرتا ہو تو وہ خداوند قدوس سے کس درجہ حیاء کرے گا، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا الحياء من الايمان

حیاء کسے کہتے ہیں | حیاء وہ انفعال ہے جو کسی برے کام کے خیال سے انسان کے اندر پیدا ہو۔ بالفاظ دیگر وہ خلق حسن جو انسان کو بھلائی پر ابھارے اور برائی سے روکے، حیاء ہے، حیاء اس خلق کا نام ہے جو جن اور عفت سے مرکب ہے، نری عفت سے کام نہیں چلتا اور محض جن بھی کوئی اچھی چیز نہیں، چنانچہ پیغمبر علیہ السلام نے جن سے پناہ مانگی ہے، حیاء میں یہ دونوں تقاضے اپنا اپنا کام کرتے ہیں، عفت اسے نیک کاموں کی طرف لاتی ہے اور جن برائیوں سے روکتا ہے اسی لئے عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ بزدل انسان بہت کم فاسق ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگوں کے طعنوں سے ڈرتا ہے اور بہادر انسان عقیف کم ہوتا ہے۔

یہیں سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ جو لوگ شرعی امور میں حیاء سے کام لیتے ہیں اس کا نام حیاء رکھنا ہی غلط ہے بلکہ یہ انکی طبیعت کی کمزوری ہے، مثلاً کوئی طالب علم استاد سے بات پوچھتے ہوئے ڈرتا ہے یا غسل کی ضرورت ہے اور بڑوں کے سامنے فراغت میں عار محسوس کر رہا ہے تو یہ اسکی طبیعت کا جن ہے جسے حیاء کا نام دیکر چھپانا درست نہیں ہے، حیاء اور جن میں بہت بڑا فرق ہے جسے کم لوگ سمجھ پاتے ہیں۔

ترجمہ کا مقصد وہی مرجیہ کی تردید ہے کہ ایمان کے لئے اعمال کی ضرورت ہے خواہ قلب کا عمل ہو یا جوارح کا

بدون عمل کے ایمان کمزور رہیگا، دیکھئے اس حدیث میں حیا کو من الایمان فرمایا ہے پھر لفظ من سے خواہ جزئیت کا اظہار مقصود ہو یا ایمان سے حیا کا اتصال، بہر تقدیر ایمان میں ان کی مطلوبیت ثابت ہے، اسی طرح ترک حیا میں ایمان کا ضرر واضح ہے۔

[۱۷] بَابُ: فَإِنْ تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ (توبہ: ۵)

(۲۵) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْمُسْنَدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو رَوْحٍ الْحَرَمِيُّ بْنُ عُمَارَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ وَاقِدِ بْنِ مُحَمَّدٍ قَالَ سَمِعْتُ أَبِي يُحَدِّثُ عَنِ ابْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ أَمَرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتَّى يَشْهَدُوا أَنَّ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُولُ اللَّهِ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ فَإِذَا فَعَلُوا ذَلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّ الْإِسْلَامِ وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ.

ترجمہ | باب، اگر وہ توبہ کریں نماز ادا کریں، زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ محمد بن زید حضرت ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ مجھ کو اللہ کی جانب سے حکم ہوا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کرتا رہوں تا اینکه یہ لوگ شہادتین کا اقرار کریں، یعنی اس بات کا اقرار کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نماز کو پوری طرح ادا کریں اور زکوٰۃ دیں پس جب وہ ایسا کریں گے تو مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو محفوظ کر لیں گے، مگر یہ عصمت اسلامی حقوق کے بارے میں قائم نہیں رہے گی اور ان کا حساب اللہ پر ہوگا۔

باب اور اس کا مقصد | اگر اس باب کو اضافت کے ساتھ پڑھا جائے تو معنی ہوں گے، باب تفسیر قولہ تعالیٰ فان تابوا الایہ گویا ذیل کی حدیث میں اسی آیت کی تفسیر ہے اور جو معنی آیت کے ہیں وہی عصموا منی دماءہم و اموالہم کے ہیں اور اگر بات کو تنوین کے ساتھ پڑھیں تو معنی گو وہی ہونگے اور تقدیر یہ ہوگی باب فی تفسیر قولہ تعالیٰ فان تابوا الایہ۔

لفظ باب کی تنوین اور اضافت کی دونوں صورتیں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمائی ہیں لیکن علامہ عینی حافظ کی اس رائے سے متفق نہیں، کہتے ہیں کہ یہاں تفسیر کا کیا ذکر؟ یہ تو کتاب الایمان ہے لیکن ہر اعتراض بر محل نہیں ہوتا بیشک یہ کتاب الایمان ہے کتاب التفسیر نہیں مگر بہ لحاظ مقصد ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے، یہ دیکھنا چاہیے کہ اس تفسیر کے ذکر میں مرجحہ کی تردید ہو رہی ہے یا نہیں اگر ہو رہی ہے تو کتاب الایمان سے اس کا جوڑ لگ گیا۔

ترجمہ کا مقصد مرجحہ اور کرامیہ کے عقیدہ باطل پر ضرب کاری لگانا ہے یعنی تمہارا یہ کہنا کہ ایمان کیلئے اعمال کی ضرورت نہیں ہے بالکل باطل اور لغو ہے کیونکہ آیت میں تخلیہ سبیل کے لئے توبہ اور اعمال کا ساتھ ساتھ ذکر کیا گیا ہے

جس سے ہر دو امر کی ضرورت محقق ہوگئی، ظاہر ہے کہ توبہ سے مراد شرک اور کفر سے توبہ ہے جسکو حدیث میں حتیٰ
 يشهدوا ان لا اله الا الله وان محمد رسول الله کے عنوان سے پیش فرمایا گیا ہے اور یہ بتانے کے لئے کہ تخلیہ
 سبیل کے واسطے محض شہادتین کا اقرار کافی نہ ہوگا اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ کو اس کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے۔

اب مرجیہ سوچیں کہ ان اعمال کی ایمان کو کیا ضرورت ہے اور بدون ان اعمال کے ایمان میں کتنا نقصان آتا
 ہے، جب دنیا میں بھی بدون ان اعمال کے تخلیہ سبیل کی صورت نہیں تو آخرت میں عذاب سے رستگاری کی کیا سبیل
 ہو سکتی ہے؟ اس سے مرجیہ اور کرامیہ دونوں فریق کی واضح تردید ہو رہی ہے طاعت سے ایمان قوی ہوتا ہے اور معاصی
 ایمان کے لئے مضر ہیں ان سے ایمان کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔

آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اس وقت تک لوگوں سے قتال جاری رکھنے کا حکم
 مفہوم حدیث کی وضاحت دیا گیا ہے کہ جب تک وہ اقرار شہادت نہ کریں، یعنی میرا قتال دنیوی مقصد کے

لئے نہیں ہے بلکہ یہ صرف دین کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہے، دنیا میں کفر کی اشاعت کے باعث جو طرح طرح
 کے مصائب نازل ہو رہے ہیں اور پوری دنیا غیر مطمئن زندگی بسر کر رہی ہے، اسلام کا مقصد یہ ہے کہ ایک ایسا نظام
 عمل پیش کیا جائے کہ زندگی پر امن ہو جائے اور مادہ فساد نکل جائے اور اس نظام عمل کے نقاط یہ ہیں جب تک کوئی
 شخص اقرار نہ کرے گا جنگ رہے گی، یہ میرا مشن ہے جس کو لیکر میں آیا ہوں اور جس کی مجھے تعلیم دی گئی ہے، میں
 اعلان کرتا ہوں کہ جب لوگ اس کو قبول کر لیں گے اور اسپر عمل پیرا ہو جائیں گے تو وہ لوگ اپنی جانوں، مالوں اور عزت
 و آبرو کے محافظ بن جائیں گے۔

الابحق الاسلام۔ یعنی ان تمام باتوں کے علی الرغم اسلامی مطالبات ہوں گے، اگر کسی نے اسلام لے آنے
 کے بعد کسی کو قتل کر دیا تو قصاص ضرور لیا جائے گا، چوری کی تو ہاتھ ضرور کاٹا جائے گا، زنا کی تہمت لگانے پر اتنی کوڑوں کی
 سزا دی جائیگی وغیرہ وغیرہ، اس حق اسلام کے علاوہ اور کوئی تعرض نہ ہوگا۔

وحسابہم علی اللہ۔ یعنی یہ تمام معاملہ دنیا کا معاملہ ہے، جب ایک شخص نے شہادتین کا اقرار کر کے اپنے
 عمل سے اپنے مومن ہونے کی تصدیق کر دی تو ہم اسے مسلمان سمجھیں گے، اسکے ساتھ ہمارا معاملہ بالکل اسلامی ہوگا رہا
 دل کا معاملہ وہ اللہ کے یہاں معلوم ہوگا، ہم اسکے مکلف نہیں کہ دل چیر کر دیکھیں اور یہ معلوم کریں کہ اس کا یہ عمل
 اور اقرار واقعی ہے یا نمائشی، اس کو اللہ ہی جان سکتا ہے یعنی آخرت کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

الحاصل ہم مظہر اسلام کو مسلمان قرار دیتے ہوئے جملہ اسلامی حقوق میں اسے برابر کا شریک رکھیں گے لیکن
 ہمارا یہ دنیوی مساوات کا معاملہ اس امر کی ضمانت نہ ہوگا کہ آخرت میں بھی یہ شخص مسلمانوں کے برابر ہی رہے گا، بلکہ
 وہاں کے معاملات اس کے ضمیر کے مطابق ہوں گے، اگر یہ شخص ظاہر و باطن ہر لحاظ سے مسلمان ہوگا تو جنت کا مستحق ہوگا

ورنہ جہنم میں ڈال دیا جائے گا، البتہ مومن عاصی کا معاملہ تحت المشییت ہوگا، خداوند قدوس کو اختیار ہے خواہ بر بنائے معصیت اس کو سزا دے یا بہ تقاضائے کرم یونہی جنت عطا فرمادے۔

نہ اثابت مطیع اس پر لازم ہے اور نہ عقاب عاصی، ورنہ خدا کو مجبور ماننا پڑیگا وہ خدا ہی کیا ہوا جس پر انسانی اعمال کی حکومت رہے اور وہ اثابت مطیع اور عقاب عاصی پر مجبور ہو جائے، پھر تو جابر کو خدا ماننا چاہیے نہ کہ مجبور کو، کاش معتزلہ اس حقیقت کو سمجھتے اور ایسی بیہودہ بات زبان سے نہ نکالتے۔ واللہ العالی۔

توبہ اور اقرار شہادتین | فرمایا گیا ہے امرت ان اقاتل الناس حتی یشہدوا ان لا الہ الا اللہ یہاں شہادت سے قبل توبہ کا ذکر نہیں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اقرار شہادتین ہی توبہ ہے لیکن حضرت امام احمد فرماتے ہیں کہ اس اقرار سے قبل توبہ ضروری ہے۔ توبہ کی صورت یہ ہے کہ سابق دین سے بیزاری کا اظہار کرے دل میں نادم ہو اور زبان سے توبہ کا لفظ اختیار کرے، اگر ان آداب کے ساتھ توبہ کی توبہ کلمہ جاہلیت کے اعمال کیلئے ہادم ہو جائے گا اور اگر ان آداب کے بغیر صرف یہ کلمہ زبان سے پڑھ لیا تو یہ

الاسلام یهدم ما کان قبلہ (مسلم ج ۱ ص ۷۶) اسلام اپنے ما قبل گناہوں کو ختم کر دیتا ہے۔

کے تحت نہیں آتا بلکہ اسکے بعد یہ دیکھیں کہ عمل کیسا ہے اگر معاملات اسلامی طریق پر ہیں تو یہ اس کی علامت ہے کہ اسلام حسن ہے، اس لئے سابق جرائم معاف اور اگر مسلمان ہونے کے باوجود اعمال میں فرق نہیں آیا تو اخذ بالاول والاخر اول اور آخر دونوں لئے جائیں گے۔

جو گناہ اسلام سے قبل تھے وہ بھی قائم ہیں اور جو اسلام میں آنے کے بعد کئے وہ بھی، یہ امام احمد رحمہ اللہ کا مسلک ہے، جمہور کا فیصلہ یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ شہادتین کا اقرار بھی توبہ ہے، مستقل طور پر توبہ کی ضرورت نہیں کیونکہ اخلاص کیساتھ کلمہ وہی پڑھے گا جو اپنے سابق دین پر نادم ہو کر اس سے نفرت کر چکا ہو ورنہ تبدیل مذہب میں اسکو مخلص نہ کہیں گے بلکہ منافق کہیں گے، ظاہر ہے کہ اخلاص اور نفاق کا اجتماع ضدین کا اجتماع ہے جس کا بطلان ظاہر ہے اور جب یہ شخص اخلاص کے ساتھ سابق دین کو ہدم کر کے آیا ہے تو دین اسلام کا یہ فائدہ اسکو ضرور پہنچنا چاہیے کہ قبل از اسلام کے معاصی کا ہدم ہو جائے اور آئندہ کا معاملہ اس کے آئندہ اعمال کے مطابق رہے، اسی حدیث کو دیکھئے امام بخاری نے بہ ضمن تفسیر آیت ذکر فرمایا ہے کہ اس میں توبہ کے مقابلہ پر شہادتین کو رکھا گیا ہے شہادتین سے قبل توبہ کا ذکر نہیں ہے، جس سے معلوم ہوا کہ توبہ سے مراد شہادت ہی ہے اور کچھ نہیں۔

قتال سے روکنے کی متعدد صورتیں اور حدیث باب | یہاں یہ اشکال کیا جاتا ہے کہ حدیث باب سے قتال روکنے کی صرف ایک صورت معلوم ہو رہی ہے،

حالانکہ قرآن کریم سے معلوم ہو رہا ہے کہ جز یہ بھی ترک قتال کی ایک صورت ہے، ارشاد ہے۔

کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ دینا
منظور کریں۔

حتى يعطوا الجزية عن يد وهم
صاغرون (پ ۱۰ ع ۱۰)

مگر اس قوم کے مقابلہ میں نہیں کہ تم میں اور ان میں
باہم عہد ہو۔

الا على قوم بينكم وبينهم
ميثاق (پ ۱۰ ع ۶)

کی روشنی میں اسی ترک قتال کی تیسری صورت ہے حالانکہ حدیث باب سے صرف ایک ہی صورت معلوم ہو رہی ہے اس
اشکال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں۔

پہلا جواب یہ ہے کہ حدیث باب میں بیان کردہ حکم ابتدائی حکم ہے صلح کا حکم ۶ھ اور جزیہ کا حکم ۹ھ کا ہے، لہذا
اس روایت کا عموم جس سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ صرف اقرار شہادتین ہی ترک قتال کی صورت ہے ان بعد کے احکام
سے منسوخ ہو گیا۔

دوسرا جواب شواہد کے اصول کے مطابق مامن عام الا وقد خص منه البعض ہے چونکہ دوسری روایات
اور آیات اسکی تخصیص چاہتی ہیں، لفظ الناس عرب و عجم اور مشرکین و اہل کتاب سب کو شامل تھا لیکن دوسری روایات
اور آیات بنا پر تخصیص کر لی گئی، جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ از قبیلہ عام مخصوص منہ البعض ہے۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تعبیر عام لفظوں سے ہوتی ہے مگر مراد میں عموم نہیں ہوتا یعنی الفاظ
عام ہیں اور وہ اپنی عموم کی وجہ سے ہر ہر فرد پر صادق آرہے ہیں لیکن متکلم کی مراد میں عموم نہیں اور ظاہر بات ہے کہ کلام
متکلم کا فعل ہے، لہذا اگر متکلم نے وہ کلام خاص معنی کیلئے بولا ہے تو اس کی رعایت ضروری ہے، اس بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ
گو لفظ الناس عام ہے مگر اس سے مراد مشرکین ہیں اہل کتاب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور جزیہ کا قانون صرف اہل
کتاب سے متعلق ہے اور اس امر کی دلیل کہ یہاں لفظ ناس سے خاص مشرکین ہی مراد ہیں نسانی کی روایت ہے جس میں
امرت ان اقاتل المشرکین مجھے مشرکین سے قتال کا حکم دیا گیا ہے۔

کی صراحت ہے، رہی صلح کی صورت وہ اسلئے دائرہ عمل سے خارج ہے کہ اس میں قتال ختم نہیں ہوتا بلکہ ایک مدت تک
کے لئے مؤخر کر دیا جاتا ہے۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ حتی یشہدوا کے معنی حتی یدعونوا للاسلام کے ہیں یعنی یہ گردن جھکانے
اور ہار ماننے سے کنایہ ہے، یعنی قتال خود مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود اعلاء کلمۃ اللہ ہے، اسکے راستہ میں یہ کفار روڑا بنے
ہوئے ہیں، اگر اعلاء کلمۃ اللہ کا راستہ صاف ہو گیا اور مخالفین نے ہار مان لی تو مقصد حاصل ہو گیا، خواہ اس صورت
میں کہ طاقت استعمال کر نیکی بعد ان پر اسلام کی حقانیت واضح ہو گئی اور اسلام کو قبول کر لیا یا عاجز ہو کر جزیہ دینے پر آمادہ

ہو گئے یا صلح و مصالحت پر اتر آئے کہ یہ بھی اقرارِ عجز کی ایک صورت ہے۔

پانچواں جواب یہ ہے کہ حتیٰ یشهدوا میں تعیم کی جائے اور معنی یہ ہوں کہ حتیٰ یسلموا حالا او یلتزموا ما یؤدیہم الی الاسلام من اداء الجزیة یعنی ضربِ جزیہ بھی اسلام کی طرف کھینچنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے جس کی تفصیل آگے آئیگی تو اعطاءِ جزیہ سبب ہوا قبولِ اسلام کا اور قبولِ اسلام سبب ہوا ترکِ قتال کا، لہذا بقاعدہ سبب السبب سبب منتہائے قتالِ جزیہ کی صورت میں اسلام ہی رہا ولو معنی۔

حاصل یہ ہوا کہ قتال کا مقصد انہیں مسلمان بنانا ہے خواہ فی الحال مسلمان ہو جائیں، یا ایسا عمل کریں جو اسلام کا سبب ہو جائے تو شہادت گو اس وقت نہیں ہے لیکن یہ چیز سبب بن سکتی ہے بالفاظِ دیگر یوں کہا جاسکتا ہے کہ ہر انسان اپنے خیال کے مطابق عزت کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے، کوئی قوم بے عزتی کے ساتھ جینا پسند نہیں کرتی، یہ اور بات ہے کہ معیارِ عزت ہی انسانوں کی نظر میں مختلف ہے۔

جب یہ بات ہے تو حقیقی عزتِ اسلام میں ہے ارشاد ہے۔

لله العزة ولرسوله وللمؤمنین
اللہ ہی کی عزت ہے اور اس کے رسول کی اور
مومنین کی۔ (پ: ۲۸/۱۲۶)

لیکن ابھی ایسی صلاحیت نہیں ہے کہ اس حقیقی عزت کو سمجھ سکیں اس لئے ایسا عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے جو حقیقی عزت سمجھنے کا سبب بن جائے، ظاہر ہے کہ جزیہ کے اندر ذلت ہے، ارشاد ہے:-

حتى یعطوا الجزیة عن ید وھم
یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہو کر اور رعیت بن کر جزیہ
دینا منظور کریں۔ (صاغرون (۱۰ع/۱۰))

اور جب یہ ان اہل کتاب پر واجب کیا جائیگا جو اپنے آپ کو سب سے افضل سمجھتے ہیں تو انہیں خیال ہوگا کہ ہمیں عزت کی زندگی بسر کرنی چاہیے، اول اول تو مذہب کی محبت میں جزیہ کو قبول کر لیں گے اور سوچیں گے کہ ہمیں انتقام کیلئے موقعہ کا منتظر رہنا چاہیے اور بالآخر اسلام کی روشنی ان کے قلوب میں پہنچے گی، نیز اہل کتاب کے لئے سوچنے کا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ اسلام نے مشرکین عرب کو جزیہ کا موقعہ نہیں دیا بلکہ اما الاسلام و اما السیف۔ اس بنا پر اہل کتاب کو اس رعایت کا شکر یہ ادا کرنا چاہیے اور اسلام کی طرف مائل ہونا چاہیے یعنی اسلام نے مشرکین کو بھی اس رعایت سے نہیں نوازا حالانکہ ان سے قرابت داری بھی ہے، معلوم ہوا کہ صرف اہل کتاب ہونیکل رعایت کی گئی ہے۔

مشرکین عرب سے جزیہ نہ لینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بنو اسماعیل ہیں اور بنو اسماعیل کو بچھد و جوہ دیگر تمام قبائل پر شرف حاصل ہے، اس شرف کا تقاضا ہے کہ انکی موت اور زندگی دونوں عزت کے ساتھ ہوں، عرب بستر پر اپنی موت مرنے کو بہت زیادہ محسوس کرتے ہیں کیونکہ مرد کی مردانگی اور شہامت کا تقاضا ہے کہ اسے شہادت کی موت میسر آئے

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ شہادت کی تمنا میں بستر مرگ پر جان دیتے ہوئے بہت افسوس فرماتے تھے۔
تسابط شراً کا شعر حماسہ کے اندر ہے کہ ایک موقع پر جب دشمنوں میں گھر گئے تو سلامتی کے ساتھ غار کی
دوسری جانب نکلنے کی یہ صورت اختیار کی کہ مشک کا شہد پتھر پر بہایا اور مشک سینہ پر باندھ کر شہد کے سہارے پھسلتے پھسلتے
بہ آسانی نیچے اتر گئے اور یہ شعر پڑھا۔

فَرَشْتُ لَهَا صَدْرِي فَزَلُّ عَنِ الصَّفَا بِهْ جُوْ جُوْ ضَخْمٍ وَمَتْنٌ مُخَصَّرٌ
هُمَا خَطَا إِسَارٌ وَمِنَّةٌ وَإِمَّا دَمٌ وَالْقَتْلُ بِالْحُرِّ أَجْدَرُ

تو اسلام نے مشرکین کے لئے صرف دو راستے رکھے اور اہل کتاب کے لئے تیسرا راستہ کھول دیا۔

اقامت صلوة کا مسئلہ | دوسرا مسئلہ اقامت صلوة کا ہے، یہ اسلام کا بڑا شعار ہے اور تخلیہ سبیل وغیرہ کا انحصار بھی
اسی پر فرمایا گیا ہے، اب قدرتنا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص نماز نہ پڑھے اس کا کیا حکم
ہوگا اور اسلامی حیثیت میں اس کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے، حضرت امام احمد کے یہاں تارک صلوة کافر ہے اور بر
بنائے روت اس کا قتل واجب ہے، باقی ائمہ ثلاثہ ایسے شخص کو کافر تو نہیں کہتے البتہ امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ خدا
اس کے قتل کا حکم دیتے ہیں، اس بارے میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب تو یہ ہے کہ اس کو قید میں ڈال دیا جائے اگر تین روز
کے اندر اندر اس نے تائب ہو کر نماز شروع کر دی تو فبہا ورنہ اس کے جسم کو کوڑوں سے لہولہان کر دیا جائے اور اس وقت
تک نہ چھوڑا جائے جب تک کہ نماز کا عمل شروع نہ کرے، البتہ امام کو اختیار ہے کہ وہ بر بنائے سیاست اگر قتل کرنا
مناسب سمجھے تو قتل بھی کر سکتا ہے، چنانچہ مخدوم ہاشم سندھی نے اپنی بیاض میں امام کی طرف سے یہ قول بھی ذکر فرمایا ہے
اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ مبتدع کا قتل سیاست جائز ہے۔

اگر یہ نسبت صحیح ہے تو گویا چاروں امام قتل پر متفق ہو گئے، رہا زکوٰۃ نہ دینے والے کا مسئلہ اس میں کمی اختلاف
ہے، راجح یہی ہے کہ قتل نہ کیا جائے کیونکہ زکوٰۃ زبردستی بھی لی جاسکتی ہے، نماز میں زبردستی نہیں چلتی، تارک زکوٰۃ کے
سلسلہ میں صدیق اکبر اور فاروق اعظم کے نظریہ کا اختلاف آئندہ آجائے گا۔

[۱۸] بَابُ مَنْ قَالَ إِنَّ الْإِيمَانَ هُوَ الْعَمَلُ

لِقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (زخرف ۷۲) وَقَالَ عِدَّةٌ مِنْ أَهْلِ
الْعِلْمِ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى فَوَرَبِّكَ لَنَسَأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (حجر: ۹۲، ۹۳) عَنْ قَوْلِ لَا إِلَهَ
إِلَّا اللَّهُ وَقَالَ تَعَالَى لِمَثَلٍ هَذَا فليعمل العاملون . (سورة صافات: ۶۱)

(۲۶) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ يُونُسَ وَمُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَا حَدَّثَنَا إِبْرَاهِيمُ بْنُ سَعْدٍ حَدَّثَنَا

ابن شہاب عن سعید بن المسیب عن ابي هريرة ان رسول الله ﷺ سئل أي العمل افضل فقال إيمان بالله ورسوله قيل ثم ماذا قال الجهاد في سبيل الله قيل ثم ماذا قال حج مبرور.

(آئندہ: ۱۵۱۹)

ترجمہ | باب، اس بارے میں کہ عمل ہی کا نام ایمان ہے کیونکہ باری تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تملك الجنة الاية یعنی جنت تم اس کے وارث ان چیزوں کے بدلے میں بنائے گئے ہو جو تم عمل کیا کرتے تھے۔ اور اہل علم کی ایک جماعت نے باری تعالیٰ کے قول فوردك الاية کے بارے میں یہ کہا ہے کہ اس کا تعلق لا اله الا الله کے قول سے ہے اور خداوند قدوس نے فرمایا ہے لمثل هذا فليعمل العاملون یعنی اس جیسی چیز کی خاطر عمل کر نیوالوں کو عمل کرتے رہنا چاہئے۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ سے پوچھا گیا کہ سب سے افضل کونسا عمل ہے، فرمایا اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لانا، عرض کیا گیا پھر اس کے بعد؟ فرمایا اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا، عرض کیا گیا، پھر اس کے بعد؟ ارشاد فرمایا۔ حج مقبول۔

مقصد ترجمہ | سابق ابواب میں یہ بات مذکور ہوتی چلی آئی ہے کہ اعمال ایمان کے اندر داخل ہیں اور ایمان کے ساتھ اعمال کا خاص ربط ہے اور اعمال ہی سے ایمان کی حفاظت اور ترقی ہوتی ہے اور ترک اعمال سے ایمان پڑمردہ اور بیجان ہو جاتا ہے، اب اس بات میں امام بخاری ترقی فرما رہے ہیں کہ ایمان عمل ہی کا نام ہے اور غیر عمل کوئی چیز ایمان نہیں۔

علامہ قطب الدین فرماتے ہیں کہ اس ترجمہ سے مرجیہ کے خاص فرقہ کرامیہ کا رد مقصود ہے جو صرف قول لسانی کو ایمان کی حقیقت بتلاتے ہیں لیکن یہ خیال صحیح نہیں بلکہ بخاری یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ مرجیہ کا عمل کو غیر ایمان سمجھنا کھلی حماقت ہے ایمان تو خود عمل ہے کیونکہ جس تصدیق کو حقیقت ایمانی کہا جاتا ہے وہ اگر غیر اختیاری ہو تو ایمان نہیں اور اگر اپنے اختیار سے اس کو حاصل کیا ہے تو یہ عمل ہے غیر عمل نہیں۔

رہا زبانی اقرار سوا کہ قلب کی تصدیق کے ساتھ ہو تو داخل ایمان ہوگا اور اگر بدون تصدیق کے ہو تو اس کا ایمان سے کوئی تعلق نہیں، ایسا اقرار تو منافق بھی کرتا ہے، الحاصل عمل کا اطلاق جس طرح جوارج کے اعمال پر ہوتا ہے اسی طرح قلب کے اعمال پر بھی ہوتا ہے۔

آیت کریمہ سے استدلال | امام بخاری نے اس بارے میں آیتیں ذکر فرمائی ہیں، پہلی آیت تملك الجنة التي اور لثموها بما كنتم تعملون (پ: ۲۵، ع: ۸) وہ جنت (جس کا اوپر سے ذکر آ رہا ہے) تمہیں اعمال کے ساتھ وراثت میں دی گئی ہے۔

امام کے استدلال کا حاصل یہ ہے کہ دخول جنت کا مدار ایمان پر ہے، اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہو تو جنت نہ ملے گی اور اگر اعمال نہ ہوں اور ایمان ہو تو جنت مل سکتی ہے، اس لئے تلك الجنة التي اور ثتموها بما كنتم تعملون کے معنی بما كنتم تو ممنون ہوئے یعنی تم مومن ہونے کی وجہ سے وارث ہوئے ہو، مؤمنون کی جگہ تعملون فرمانے کا راز یہ ہے کہ ایمان و عمل کی تفریق کرنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ایمان بھی عمل ہی کا نام ہے اور ایمان اس درجہ کا عمل ہے کہ دیگر تمام اعمال اسی پر موقوف ہیں اور ان کا منجی و مثمر ہونا اسی پر موقوف ہے، اسی سے امام بخاری نے استدلال فرمایا الايمان هو العمل اسی کو دوسری جگہ

جنت میں صرف نفس مومن ہی داخل ہوگا

لن يدخل الجنة الا نفس مؤمنة

فرمایا گیا ہے۔

آیت کریمہ پر دو اشکال کئے گئے ہیں، پہلا اشکال یہ ہے کہ آیت کریمہ میں جنت کے متعلق اورد ثتموها فرمایا گیا ہے۔ وراثت کا اطلاق اس مال پر ہوتا ہے جو مالک

اپنی موت کے بعد اعزہ کے لئے چھوڑ جاتا ہے، اب اشکال یہ ہے کہ یہ بات جنت پر کس طرح راست آسکتی ہے، وراثت کے یہ حقیقی معنی تو یہاں نہیں چل سکتے کیونکہ جنت کسی ذات کی ملک نہیں ہے جس کے انتقال کے بعد دوسروں کو دی جائے۔ بلکہ جنت خدا کی ملک ہے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ وراثت کا لفظ تشبیہا استعمال کیا گیا ہے، یعنی جس طرح مالک کی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور دوسرا انسان ایک مالک کی طرح اس میں تصرفات کرتا ہے، اسی طرح خدا تعالیٰ نے ان حضرات کو بالکل آزادی کے ساتھ تصرفات کا اختیار دیدیا ہے۔

گویا لفظ اراثت اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ جس طرح وراثت کو کوئی واپس نہیں لے سکتا، اسی طرح یہ جنت بھی دائمی طور پر نہیں دیدی گئی ہے، اور اب ان پر کوئی پابندی نہیں، ارشاد ہے۔

لكم فيها ما تشتهي انفسكم ولكم اور تمہارے لئے اس جنت میں جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا

فيها ما تدعون (پ ۲۲ ع ۱۸) موجود ہے اور نیز تمہارے لئے اسمیں جو مانگو موجود ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ خداوند قدوس نے ہر شخص کے لئے جنت اور جہنم میں ایک ایک مکان بنایا ہے، جہنم میں ان لوگوں کے بھی مکانات ہیں جو جنت میں جائیں گے، اسی طرح جنت میں ان لوگوں کے بھی مکانات ہیں جو جہنم میں جائیں گے، اب صورت حال یہ ہے کہ کچھ بندے مومن ہیں اور کچھ کافر، کافر پر جنت حرام ہے اور ایمان جہنم کی چیز نہیں، اب کفار جب جہنم میں گئے تو انہیں اپنے مکان بھی ملے اور وہ مکانات بھی ملے جو ایمان کے باعث نجات پانے والے انسانوں کے لئے بنے تھے۔ اسی طرح مومنین کو جنت میں اپنے مکانات کے ساتھ ان لوگوں کے مکانات بھی ملے جو کفر

کے باعث دخول جنت سے محروم رہے، بس اسی صورت کو ایراث سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسرا اشکال یہ ہے کہ آیت کریمہ میں بما کنتم تعملون فرمایا گیا ہے یعنی جنت اعمال کے مقابل دی گئی ہے حالانکہ دوسری روایت میں فرمایا گیا۔

لن یدخل احدکم الجنة
بعملہ
تم میں سے کوئی بھی صرف اپنے عمل کی وجہ سے
جنت میں نہ جائے گا۔

جب آپ نے فرمایا تو صحابہ کرام نے عرض کیا کہ حضرت! کیا آپ کے لئے بھی یہی ہے، آپ نے ارشاد فرمایا!

نعم الا ان یتغمدنی اللہ
برحمۃ
ہاں! الا یہ کہ مجھے اللہ اپنے دامنِ رحمت میں
چھپالے۔

اب اشکال یہ ہے کہ آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اعمال جنت لینے کا راستہ ہیں اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ کسی شخص کا عمل جنت میں نہیں پہنچا سکتا۔

دراصل اس اشکال کا مدار بقاء پر ہے، روایت اور حدیث میں تعارض اس وقت ہوگا جبکہ باہ کو سہیت کے لئے لیا جائے کیونکہ سبب پر سبب کا ترتیب بطور دلیل کے ہوتا ہے اور اگر بقاء ملا بہت کے لئے ہو تو معنی یہ ہونگے کہ ان اعمال کے ثمرات کے ساتھ جنت کا مالک بنایا گیا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بقاء مقابلہ کی ہو یعنی عمل کے مقابل اور عوض میں دی گئی ہے فرق یہ ہوگا کہ سبب پر موقوف ہوتا ہے اور مقابلہ میں ضروری نہیں ہے، مثلاً جنت میں ایک صورت تو یہ ہے کہ دخول عمل پر موقوف ہے عمل نہ کرو گے تو جنت نہ ملے گی اور ایک صورت یہ ہے کہ جنت عمل کے مقابل تو ضرور ہے لیکن خداوند قدوس نے بطور انعام دی ہے، عمل پر اسے موقوف نہیں رکھا گیا، جیسے ایک چیز مالک دامنوں سے بھی دے سکتا ہے اور مفت بھی، خداوند قدوس عمل کے عوض بھی دے سکتا ہے اور بطور انعام بھی، دوسری صورت (مقابلہ) میں عاملین کو مفت مل رہی ہے جیسے ملازم نے ایک کام کیا مالک نے خوش ہو کر مقدار تنخواہ سے بہت زیادہ دیدیا، اب یہ نہ کہا جائیگا کہ یہ زائد رقم کام کا معاوضہ ہے بلکہ یہ ایک الگ انعام ہے جو مالک کی خوشی پر موقوف ہے دے یا نہ دے۔

جنت کے بارے میں بھی یہی بات ہے کہ تمہارے عمل اس قابل نہ تھے کہ جنت دی جائے یہ خداوند قدوس کی رحمت ہے کہ پہلے اعمال کو شرف قبولیت بخشا اور پھر بطور انعام جنت عطاء فرمائی۔

اور جس روایت سے تعارض ہو رہا ہے اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ صرف اعمال اس قابل نہیں اگر خداوند

قدوس کی رحمت شامل حال نہ ہو گیا اگر بساء ملا بست یا مقابلہ کی ہو تو تعارض نہیں رہتا بلکہ میرے نزدیک تو اگر باء کو سبب کے لئے بھی لیں تب بھی گنجائش نکالی جا سکتی ہے کیونکہ آیت میں صیغہ استمرار استعمال کیا گیا ہے، مفہوم یہ ہے کہ تمہیں اعمال کی وجہ سے وارث بنایا گیا ہے اور اگر تم اعمال چھوڑ دیتے جن میں ”ایمان“ (فعل قلب) بھی ہے تو یہ جنت نہ ملتی چونکہ تم نے اعمال اختیار کئے اور تمہارا عمل مستمر رہا اسلئے تمہیں جنت دی گئی اور تمہارا عمل مستمر نہ رہتا اور خاتمہ بالخیر نہ ہوتا تو نجات نہ ہوتی، اس اعتبار سے معنی یہ ہوئے کہ جنت اس ایمان کی بدولت دی گئی جو مستمر تھا۔

دوسری آیت کریمہ | امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے دوسری آیت کریمہ، فو ربك لنسالنہم اجمعین عما کانوا یعملون۔ بھی استدلال ہی کیلئے پیش کی اور آگے فرماتے ہیں کہ اس کی تفسیر میں چند

اہل علم نے کہا ہے کہ لا الہ الا اللہ سے سوال کیا جائے گا، استدلال کا حاصل یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ ایمان ہے اور اس ایمان پر عمل کا اطلاق ہوا ہے مقصد ثابت ہو گیا کہ ایمان ایک عمل ہے اور امام بخاری کو اپنے مقصد کے اثبات کے لئے اسی قدر بس ہے، لیکن دراصل اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان از روئے عقل زمین و آسمان کا خالق خداوند قدوس کو مانتا ہے، مومن تو اقرار کرتا ہی ہے، لیکن کافر بھی مانتا ہے اور معلوم ہے جب کوئی انسان کسی حکومت کو تسلیم کر لیتا ہے تو اس پر آئین و فرامین کی ذمہ داری آجاتی ہے۔

اسی بنا پر جب خداوند قدوس کی حکومت کے سب سے بنیادی نقطہ۔ لا الہ الا اللہ۔ کو تسلیم کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خداوند قدوس کے بیان فرمودہ تمام اوامر اور نواہی قبول کر لئے، اب قیامت میں لا الہ الا اللہ سے سوال کئے جانے کا مفہوم یہ ہے کہ تم نے جو لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا تھا اسے کس حد تک نبھایا۔ اب اگر یہ سوال ہوتا ہے کہ نماز کیوں نہیں پڑھی، زکوٰۃ کیوں ادا نہیں کی، فریضہ حج کی اہمیت کا احساس کیوں نہیں کیا فلاں فلاں معاملہ میں حکم عدولی کی جرأت کیوں ہوئی، تو دراصل یہ سب اسی لا الہ الا اللہ کے اقرار کا نتیجہ ہے، یہ مطلب نہیں صرف لا الہ الا اللہ سے سوال ہوگا۔

اس اعتبار سے اگر اہل علم یعملون کی تفسیر لا الہ الا اللہ سے کی ہے تو بالکل درست ہے لیکن امام بخاریؒ کو اس سے کوئی بحث نہیں، بلکہ وہ تو صرف یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اہل علم نے یعملون کی تفسیر لا الہ الا اللہ سے کی ہے جو ایمان سے عبارت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان عمل ہے، صرف زبان سے اقرار کافی نہیں، اسی طرح جب ایمان ہی عمل ہے تو یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ایمان کو عمل کی ضرورت نہیں کیونکہ لا الہ الا اللہ کو تمام اعمال کا جامع قرار دیا گیا ہے۔

آگے تیسری آیت پیش فرماتے ہیں لمثل هذا فلیعمل العاملون یہ آیت جنت کے ذکر کے بعد لائی گئی ہے، مفہوم یہ ہے کہ ان جیسی چیزوں کے حصول کیلئے عمل کیا جائے، امام نے استدلال اس طرح فرمایا ہے کہ جنت کے

حصول کے لئے عمل کی ترغیب دی گئی ہے اب اگر ایمان عمل کے علاوہ اور کچھ چیز ہے تو صرف عمل ہی دخول جنت کیلئے کافی ہونا چاہیے، حالانکہ معلوم ہے کہ ایمان کے بغیر کوئی عمل معتبر نہیں بلکہ سب سے پہلے ایمان کی ضرورت ہے، معلوم ہوا کہ فلیعمل العاملون سے مراد فلیومن المومنون ہے اور جب یہ بات ہے تو ایمان پر عمل کا اطلاق کیا گیا ہے اور یہی امام بخاری کا مقصد ہے۔

حدیث گذر چکی ہے، ترتیب اعمال کا مسئلہ کسی دوسری جگہ ذکر ہو رہا ہے انتظار کریں۔ امام بخاری کا مقصد تو صرف یہ ہے کہ حدیث شریف میں ای العمل افضل کے جواب میں ایمان باللہ و رسولہ کو مقدم لایا گیا ہے معلوم ہوا کہ ایمان باللہ و رسولہ بھی ایک عمل ہے۔

[۱۹] بَابُ إِذَا لَمْ يَكُنِ الْإِسْلَامُ عَلَى الْحَقِيقَةِ وَكَانَ عَلَى الْإِسْتِسْلَامِ أَوْ

الْخَوْفِ مِنَ الْقَتْلِ

لِقَوْلِهِ تَعَالَى قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا (حجرات: ۱۳) فَإِذَا كَانَ عَلَى الْحَقِيقَةِ فَهُوَ عَلَى قَوْلِهِ جَلَّ ذِكْرُهُ إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ. (آل عمران: ۱۹)

(۲۷) حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ أَخْبَرَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَنَسٍ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَعْطَى رَهْطًا وَمَعَهُ جَالِسٌ فَتَرَكَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَجُلًا هُوَ أَعْجَبَهُمْ إِلَيَّ فَقُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ فَوَاللَّهِ إِنْ لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ أَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُ قَلِيلًا ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي فَقُلْتُ مَا لَكَ عَنْ فُلَانٍ فَوَاللَّهِ إِنْ لَأَرَاهُ مُؤْمِنًا فَقَالَ أَوْ مُسْلِمًا فَسَكَتُ قَلِيلًا ثُمَّ غَلَبَنِي مَا أَعْلَمُ مِنْهُ فَعُدْتُ لِمَقَالَتِي وَعَادَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ ثُمَّ قَالَ يَا سَعْدُ إِنْ لَأَعْطَى الرَّجُلَ وَغَيْرُهُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِنْهُ خَشِيَةَ أَنْ يَكْبَهُ اللَّهُ فِي النَّارِ. وَرَوَاهُ يُونُسُ وَصَالِحٌ وَمَعْمَرُ وَابْنُ أَبِي الزُّهْرِيِّ عَنِ الزُّهْرِيِّ.

(آئندہ: ۱۳۷۸)

ترجمہ | باب، جبکہ اسلام حقیقت پر مبنی نہ ہو بلکہ وہ ظاہری طور پر تابعداری ہو یا قتل کے خوف سے ہو تو یہ اطلاق درست ہے اس لئے کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے، اعراب نے کہا کہ ہم ایمان لائے آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے لیکن یہ کہو کہ بظاہر تابعداری قبول کی، پس اگر وہ ایمان حقیقت پر مبنی ہو تو باری تعالیٰ کے ارشاد ان الدین عند اللہ الاسلام (بے شک اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے) کا مصداق ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کچھ لوگوں کو (بطور تالیف قلب) مال دیا اور حضرت سعد بھی حاضر تھے اور ایک آدمی کو چھوڑ دیا (حضرت سعد فرماتے ہیں) جو میرے نزدیک ان میں سب سے زیادہ پسندیدہ تھا چنانچہ میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ آپ نے فلاں شخص کو کیوں ترک فرما دیا۔ اللہ کی قسم میں اسے مومن سمجھتا ہوں، آپ نے فرمایا مومن کہہ رہے ہو، یا مسلم، میں کچھ دیر تک چپ رہا، پھر مجھے اس بات نے مجبور کیا جو مجھے اس شخص کے بارے میں معلوم تھی، چنانچہ میں نے دوبارہ وہی کہا اور عرض کیا آپ نے فلاں شخص کو کیوں ترک فرمایا۔ اللہ کی قسم میں اسے مومن سمجھتا ہوں، آپ نے فرمایا مومن یا مسلم، چنانچہ پھر تھوڑی دیر میں خاموش رہا، پھر مجھے اس بات نے مجبور کیا جو مجھے اس شخص کے بارے میں معلوم تھی اور میں نے دوبارہ وہ بات کہی اور رسول اکرم ﷺ نے بھی وہی ارشاد فرمایا، پھر آپ نے فرمایا، سعد! میں ایک شخص کو مال دیتا ہوں، حالانکہ دوسرا انسان مجھے اس سے زیادہ محبوب ہوتا ہے، اس ڈر سے کہ اللہ اس کو جہنم میں اوندھانہ گرا دے، اس روایت کو زہری سے یونس، صالح، معمر اور زہری کے بھتیجے نے بیان کیا۔

ترجمہ کا مقصد | ترجمہ کا مقصد جیسا کہ عام طور پر شرح بخاری نے اختیار کیا ہے یہ ہے کہ بخاری نے اب تک جن دلائل سے مرجیہ کی تردید کی ان کا مدار ایمان و اسلام کے اتحاد یا تلازم پر ہے، کیونکہ ایمان و اسلام الگ الگ ہوں تو مرجیہ کہہ دیں گے، آپ نے جن دلائل سے عمل کی ضرورت کا اثبات کیا ہے وہ اسلام سے متعلق ہیں۔ رہا ایمان سوا سے کسی عمل کی ضرورت نہیں، اسی مقصد کے پیش نظر امام بخاری ایمان و اسلام شرعی میں اتحاد ثابت کر رہے ہیں اور جب اتحاد ثابت ہو گیا تو جو چیزیں ایک کا جز ہوں گی وہ بقاعدہ اتحاد یا تلازم دوسرے کا بھی جز ہوں گی۔

اسی ضمن میں امام نے یہ بتلایا کہ اسلام کے دو معنی ہیں، ایک اسلام شرعی، حقیقی، واقعی، اور دوسرے اسلام اسمی، حکائی، غیر واقعی، اسلام شرعی حقیقی واقعی تو ایمان کے ساتھ متحد ہے لیکن اسلام اسمی، نمائشی وغیرہ واقعی متحد نہیں، اس تقسیم سے امام نے بتلایا کہ مرجیہ جن دلائل کو ایمان و اسلام کے درمیان منافات کے سلسلہ میں پیش کرتے ہیں ان کا تعلق اسلام اسمی، نمائشی، حکائی غیر واقعی سے ہے مثلاً آیت

قالت الاعراب آمننا قل
لم تو منوا ولكن قولوا اسلمنا ولما
يدخل الايمان في قلوبكم (پ ۲۶ ع ۱۳۶)

یہ گنوار کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے آپ فرمادیجئے
کہ تم ایمان تو نہیں لائے لیکن یوں کہو کہ ہم مطیع ہو گئے
اور ابھی تک ایمان تمہارے قلوب میں داخل نہیں ہوا۔

بنو اسد کے کچھ حضرات نے قحط سالی کے زمانہ میں مویشیوں اور اپنی اولاد کیساتھ مدینہ میں آکر اقامت اختیار کی اور نبی اکرم ﷺ پر احسان جتلیا کہ ہم آپ کے پاس عیال و اصہار لیکر آئے ہیں اور ہم نے مقابلہ کئے بغیر ایمان قبول کیا ہے اس لئے ہماری مدد کیجئے، حق تعالیٰ نے فرمایا کہ تمہارا یہ آمناً کہنا درست نہیں ہے تم تو زائد سے زائد یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم نے تابعداری اختیار کی۔

آگے فرمایا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم بظاہر اشکال ہے کہ لم تو منوا کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے، علامہ عینی نے فرمایا کہ لم تو منوا میں ان کے دعوے کی تعلیظ ہے اور لما یدخل الایمان الایۃ میں توفیق فرمائی گئی ہے، یعنی جب تک تمہارے قلوب میں ایمان داخل نہ ہو اس وقت تک تمہیں اسلمنا کہنا چاہئے اور ہو سکتا ہے کہ انہیں لم تو منوا کہنے پر ناگواری ہوئی ہو اور یہ اس ناگواری کا جواب ہو یعنی اس آیت میں تردید کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ تمہارے دل میں ابھی ایمان نہیں اُترتا ہے اسلئے یہ کہا جا رہا ہے اور جب ایمان دل نشین ہو جائے گا تو یہ نہ کہا جائے گا۔

حدیث شریف کی توضیح | حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کچھ لوگوں کو مال تقسیم فرمایا، درمیان میں ایک شخص کو جسے سعد اپنے خیال میں سب سے اچھا سمجھ رہے تھے نہیں دیا، حضرت سعد نے اس خیال سے کہ شاید آپ کو خیال نہ رہا ہو بطور یاد دہانی عرض کیا، آپ نے اس شخص کو کیوں چھوڑ دیا بخدا میں تو اسے مومن سمجھتا ہوں، حضرت سعد ان کو اپنے گمان کے مطابق ایسا ہی سمجھ رہے تھے جیسا انہوں نے ظاہر کیا ورنہ قسم نہ کھاتے۔

حضرات شراح اس بارے میں مختلف رائے نظر آتے ہیں کہ لا راہ بفتح الہمزہ ہے یا بضم الہمزہ، بفتح الہمزہ ہو تو یہ روایت سے ہو کر "اعلمہ" کے معنی میں ہوگا اور بضم الہمزہ ہو نیکی تقدیر پر یہ رائے سے ماخوذ ہوگا اور معنی میں "اظنہ" کے ہوگا، روایت میں دونوں قسم کے قرائن موجود ہیں، ظن غالب پر علم کا اطلاق درست ہے اور شریعت کی نظر میں غلبہ ظن کو یقین کے درجہ میں رکھا گیا ہے، اسی بنا پر روایت میں ثم غلبنی ما اعلم کا لفظ مذکور ہے اور مسلم میں لا راہ کی جگہ لا علمہ منقول ہوا ہے، غرض جب حضرت سعد نے یہ عرض کیا تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کیا کہہ رہے ہو سمجھ کر کہو مومن کہہ رہے یا مسلم۔

لفظ او اگر ہمزہ اور فتح واؤ کے ساتھ ہو تو ان دونوں کے درمیان ایک مناسب کلمہ نکالا جائیگا، مثلاً اتقول کذا و هو مسلم اور اگر ب سکون واؤ ہو اور یہی مختار ہے تو اس میں تنویج اور بل دونوں معنی کی گنجائش ہے، بل کی تقدیر پر معنی یہ ہوں گے لا تقلہ مو منا بل قل مسلما یعنی تم مسلم تو کہہ سکتے ہو کہ اس کا تعلق ظاہری اعمال سے ہے مگر مومن کا حکم نہیں لگا سکتے کہ وہ باطن کا معاملہ ہے جہاں تمہاری رسائی نہیں ہے، یہ منصب پیغمبر کا ہے کہ وہ وحی کے ذریعہ باطن احوال سے واقف ہو سکتا ہے، تمہاری یہ جرأت اپنے درجہ سے تجاوز ہے۔

حضرت سعد کا بیان ہے کہ یہ ارشاد سن کر میں کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بغلبہ حال میری زبان سے وہ کلمات نکل گئے اور نبی اکرم ﷺ نے پھر وہی بات فرمائی، پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد وہی کیفیت ظاری ہوئی، اور وہی عرض کر بیٹھا، اب آنحضرت ﷺ نے فرمایا اقتالاً یا سعد سعد سفارش کرتے ہو یا لڑتے ہو، تمبیہ ہو گئی، معلوم ہوا کہ چھوٹوں کو

بڑے کی خدمت میں سفارش کا حق ہو نچتا ہے، ورنہ پہلے ہی روک دیا جاتا اور اگر چھوٹے کے خیال میں یہ امر راسخ ہو کہ ممکن ہے اس طرف التفات نہ رہا ہو یا بات خیال سے اتر گئی ہو تو مکرر عرض معروض کر سکتا ہے یہاں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے کہ حضرت سعد یاد دہانی کے لئے عرض کر رہے ہیں کہ حضرت یہ اپنا ہی آدمی ہے۔

غرض چھوٹے کو اس قسم کا حق حاصل ہے اور بڑے کو اختیار ہے کہ قبول کر لے یا رد کر دے، نیز آنحضرت ﷺ کے ارشاد سے معلوم ہوا کہ اگر گزارش کا طریق قابل اصلاح ہو تو اس پر اسی مجلس میں تنبیہ فرماتے ہوئے عرض معروض کا مناسب طریقہ تعلیم فرما دیا جائے، اور اگر چھوٹے کی گزارش معقول ہو تو اس کی تسلی اور اطمینان خاطر کے لئے وجہ بھی بیان کرنی چاہئے جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت سعد سے فرمایا کہ سعد! تم سمجھ رہے ہو کہ جن لوگوں کو دیا جا رہا ہے وہ زیادہ قابل اعتبار ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ تالیف قلب کے طور پر دیا جا رہا ہے اور معلوم ہے کہ تالیف نو وار دین اسلام کی ہوتی ہے پختہ کاروں کی نہیں ہوتی، تالیف قلب کا مقصد یہ ہے کہ پریشان ہو کر مصیبت ارتداد میں گرفتار نہ ہو جائیں اور ظاہر ہے کہ ارتداد کفر سے بڑی مصیبت ہے۔

اس لئے جن لوگوں کی تالیف کی ضرورت سمجھی گئی انہیں دیا گیا ہے اور ان لوگوں کو نہیں دیا گیا جو پختہ کار ہیں اور جنہیں تم مومن کہہ رہے ہو وہ واقعہ پختہ کار ہیں ان کی تالیف کی ضرورت نہیں، یہاں سے ایک یہ بات بھی نکل آئی کہ امام کو کچھ مال علیحدہ رکھنے کا اختیار ہے تاکہ وقتی مصالحوں کے ماتحت اسے لوگوں پر خرچ کرے۔

ترجمہ و حدیث کا ارتباط | بظاہر اشکال یہ ہے کہ امام بخاری نے ترجمہ کے ذیل میں جو حدیث بیان فرمائی ہے وہ مقصد سے بہت دور ہے کیونکہ امام کا مقصد تو ایمان و اسلام کے اتحاد کا اثبات ہے اور حدیث باب میں مسلم اور مومن کے درمیان تفریق کی گئی ہے، جیسا کہ حضرت سعد سے فرمایا کہ تم مومن ہونیکا فیصلہ نہ کرو تمہیں تو صرف مسلم کہنے کا حق ہے لیکن یہ اشکال محض سرسری ہے حدیث شریف میں ایمان و اسلام کا تغایر ثابت کرنا پیش نظر ہی نہیں ہے۔

حدیث کے الفاظ پر غور کیجئے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ اسلام اور ایمان میں تلازم ہو یا تغایر اس سے کچھ بحث نہیں، یہاں تو یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہر مسلمان کے دو احوال ہیں، ایک کا تعلق باطن سے ہے اور ایک کا ظاہر سے، ایمان یعنی دل کا اذعان یہ باطنی امر ہے جس کا واقعی علم سوائے خداوند قدوس کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا، وہی کسی کو بتادیں تو یہ دوسری بات ہے، البتہ کسی شخص کے ظاہری احوال کو دیکھ کر مثلاً وہ متشرع ہے، نماز روزہ کا پابند ہے یہ علم لگا دیتے ہیں کہ یہ پکا مسلمان ہے اور اسی لحاظ سے یوں بھی کہہ دیتے ہیں کہ بڑا مومن ہے۔

حضرت سعد نے جب قسم کھا کر یہ کہا کہ بخدا یہ مومن ہے تو آپ نے تنبیہ فرمادی کہ انکے متعلق جن باتوں کا علم ہے اسکی بناء پر تم انکو مسلم تو کہہ سکتے ہو لیکن مومن کہنے کا حق نہیں رکھتے، اسکا فیصلہ تو پیغمبر بھی اپنی رائے سے نہیں

کر سکتے یہ تو خدا کا مخصوص علم ہے۔ تمکو بھی انکی سفارش بلفظ مسلم کرنی چاہئے تھی، تمہارا قسم کے ساتھ، انسی لاراہ مومنا کہنا ہرگز مناسب نہ تھا، گو یہ شخص مومن بھی ہو لیکن انکے ایمان کے متعلق تمہارا یہ فیصلہ اپنے درجہ سے اونچی بات ہے جو بالکل نامناسب ہے، یہ تشبیہ ایسی ہے جیسا کہ ایک انصاری عورت نے پیغمبر علیہ السلام کی موجودگی میں ایک صحابی کے انتقال پر کہا تھا۔

فشہادتی علیک ابا السائب ابو سائب میں شہادت دیتی ہوں کہ تم اہل جنت سے ہو

اس پر بطور تشبیہ آپ نے فرمایا تھا، تمہیں کیسے معلوم ہوا اور تمہیں اس شہادت کا کیا حق ہے، آپ نے فرمایا میں باوجود پیغمبری کے اس درجہ وثوق سے نہیں کہہ سکتا بلکہ میں اپنے متعلق بھی نہیں کہہ سکتا کہ کیا احوال پیش آنے والے ہیں۔ خداوند قدوس ہی بتا دے تو دوسری بات ہے، یہاں درحقیقت اصلاح مقصود تھی یہ نہیں کہ تردید تھا بلکہ انہیں چونکہ ان الفاظ کے استعمال کا حق نہ تھا اس بناء پر تشبیہ فرمادی۔

یا ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک بچے کے انتقال پر عصفور من عصفیر الجنة فرمایا تھا، چونکہ مسلم کا بچہ تھا اسلئے یہ کہا لیکن آنحضور ﷺ نے اصلاح فرمائی تم ایسی بات کہتی ہو تمہیں اس کا کیا حق ہے، یہ پیغمبر چیزیں ہیں اس میں تمہارا اقدام مناسب نہیں۔

الحاصل بخاری نے اسلام کے دو معنی بتا کر دربارہ اسلام و ایمان جو مغایرت معلوم ہوتی تھی اس کا جواب دیتے ہوئے یہ واضح کر دیا کہ اسلام شرعی اور ایمان حقیقی میں کوئی مغایرت نہیں یہ تو متحد یا لازم ملزوم ہیں۔ البتہ وہ اسلام جو محض رسمی اور حکائی ہو اور اس کا واقعی محکی عنہ نہ ہو وہ یقیناً ایمان کا غیر ہے۔

ہم نے القول الفصیح میں اس ترجمہ کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ بخاری اسلام منجی اور غیر منجی میں تفریق کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام منجی وہ ہے جو جذر قلب میں ہو اور نیت صادقہ کے ساتھ ہو، اور جو محض رسمی حکائی ہو وہ خواہ دنیوی امور میں مفید ہو مگر آخرت میں نجات کا باعث نہیں ہو سکتا، حضرت شاہ صاحب کا بھی اس ترجمہ کے متعلق یہی فیصلہ ہے، ایمان اور اسلام کے اتحاد کا مسئلہ باب سوال جبرائیل سے متعلق ہے۔

[۲۰] بَابُ إِفْشَاءِ السَّلَامِ مِنَ الْإِسْلَامِ

قَالَ عَمَّارٌ ثَلَاثٌ مَنْ جَمَعَهُنَّ فَقَدْ جَمَعَ الْإِيمَانَ الْأَنْصَافَ مِنْ نَفْسِكَ وَبَذَلَ السَّلَامَ لِلْعَالَمِ
وَالْإِنْفَاقَ مِنَ الْإِقْتَارِ

(۲۸) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيدَ بْنِ أَبِي حَبِيبٍ عَنْ أَبِي الْخَيْرِ عَنْ عَبْدِ

اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ رَجُلًا سَأَلَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَيُّ الْإِسْلَامِ خَيْرٌ قَالَ تَطْعِمُ الطَّعَامَ وَتَقْرَأُ

(گذشتہ: ۱۲)

السَّلَامَ عَلَى مَنْ عَرَفْتَ وَمَنْ لَمْ تَعْرِفْ.

باب، سلام کی اشاعت از جملہ اسلام ہے۔ حضرت عمار نے فرمایا تین خصلتیں ہیں جس شخص نے انہیں جمع کر لیا اس نے ایمان کامل کر لیا، اپنے نفس سے انصاف کرنا، سلام کو عالم میں پھیلا نا اور تنگدستی کے باوجود اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کونسا اسلام بہتر ہے آپ نے فرمایا یہ کہ تم کھانا کھلاؤ اور متعارفین وغیر متعارفین سب کو سلام کرو۔

مقصد ترجمہ | درمیان میں دفع دخل مقدر کے طور پر اسلام کی دو قسمیں بیان کی گئی تھیں، اب پھر وہیں آگئے جہاں سے چلے تھے یعنی فلاں عمل ایمان سے متعلق ہے اور فلاں اسلام سے، مقصد وہی مرجیہ کی تردید ہے کہ تم بڑے بڑے اعمال کو بھی ایمان سے الگ سمجھتے ہو، یہاں تو معمولی عمل بھی ایمان میں شمار کیا گیا ہے یعنی گویا یہ سنت کے درجہ کی چیز ہے لیکن چونکہ اسے ایمان میں داخل مانا گیا ہے اس لئے اسکے تقاضے ایمان پر مرتب ہونے چاہئیں اور بہ تقاضائے جزئیات اس پر عمل سے تقویت اور ترک سے ضعف آنا چاہئے۔

در اصل یہاں اسلام حقیقی کی علامت بتلائی جا رہی ہے اور وہ یہ کہ یہ شخص سلام کی کثرت کرتا ہو یعنی سلام کو تعارف کی شرط یا یا کسی خاص وقت کے ساتھ مقید نہ کرے بلکہ ہر سامنے آنیوالے کو سلام کرے۔ افشاء کے یہی معنی ہیں کہ وقت یا شخص کے ساتھ مخصوص نہ ہو بلکہ ہر وہ مسلمان جو اپنے افعال کی وجہ سے دعائے سلامتی کا مستحق ہو اسکو عادی جائے، اسی قید سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اگر اسکے افعال سے سلامتی کا مستحق نہ بناتے ہوں تو اس کو سلام بھی درست نہیں۔ مثلاً کوئی شخص جوا، شطرنج، تاش کھیلتا ہے یا شراب پیتا ہے، کھلے بندوں فسق و فجور میں مبتلا رہتا ہے وہ تو وہ مستحق سلام نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس تقاضے میں تمام مصالح سے آنکھ بند کر لی جائے بلکہ اگر وہی فاسق آدمی سلام کی ابتدا کرتا ہے تو جواب دینا چاہئے، اسی طرح اگر فاسق صاحب اقتدار ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر میں نے اسے سلام نہ کیا تو یہ میرے درپے آزار ہو جائیگا تو ایسی صورت میں سلام کی اجازت ہے یا اگر فاسق کو دیکھ کر اپنی بڑائی کا خیال دل میں پیدا ہو تو یہ شعبہ کبر ہوگا اس کو توڑنے کی غرض سے ابتداء بالسلام بھی مناسب ہوگا، مسائل کی تفصیل کتب فقہ میں ملاحظہ فرمائیں۔

پھر یہ معاملہ تو مسلمان کا ہے اگر کوئی کافر سامنے آئے اور وہ سلام کرے تو مناسب الفاظ میں اسکا جواب دیں اس میں اسکی تالیف قلب بھی ہے اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ بھی، نیز یہ کہ جواب نہ دینے کی صورت میں مذہبی کشاکش کے ساتھ معاشرہ بھی متاثر ہوتا ہے اور بعض مخصوص مصالح کی بناء پر ابتداء بالسلام کی بھی اجازت ہے، غرض مختلف وجوہ کی بناء پر سلام کا عمل یا سلام کی تقدیر پر جواب کا عمل مشروع کیا گیا ہے۔

حضرت عمارؓ کا ارشاد | حضرت عمار فرماتے ہیں کہ تین چیزیں جس کے اندر جمع ہو جائیں گی اس نے ایمان کو جمع کر لیا، پہلی بات تو یہ ہے کہ اپنے نفس سے انصاف کرے یعنی جیسا کہ آپ دوسروں کے اعمال پر گرفت کرتے ہیں اسی طرح اپنے اعمال کا جائزہ لیں اور نفس سے پوچھیں کہ تو نے یہ عمل کیوں کیا۔

نفس سے محاسبہ کے سلسلہ میں ایک معاملہ خدا کا ہے اور ایک بندہ کا، نفس سے دونوں قسم کا محاسبہ متعلق ہے، خداوند قدوس کے معاملہ میں محاسبہ کا مطلب یہ ہے کہ نفس سے ہر کوتاہی کے بارے میں باز پرس کرے، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، تب طبیعت اس محاسبہ کی عادی ہو جائیگی تو خود بخود اوامر کی طرف مائل ہوگی اور نواہی سے اجتناب کریگی اور بندوں کے معاملہ میں محاسبہ کا مطلب ہے کہ تم نے فلاں انسان کے ساتھ تشدد کیوں کیا، بلا وجہ اسے تکلیف کیوں پہنچائی، فلاں کو مالی نقصان کیوں پہنچایا، آخر یہ کیوں ہوا، کیا تجھے خدا کا خوف نہیں ہے، تو یہ نہیں سمجھتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا، غرض اس طرح محاسبہ کر کے نفس کو خوب کسے اور توبہ کرنے پر مجبور کرے۔ ایک معنی تو الانصاف من نفسک کے یہ ہیں اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ تمہارا نفس خود انصاف کرنے لگے اور وہ انصاف خود تمہارے نفس سے شروع ہو یعنی خود تمہاری طبیعت میں انصاف پیدا ہونے لگے، اسی صورت میں من ابتداً یہ ہوگا اور نفسک معنی فاعل ہوگا اور اول معنی کے اعتبار سے مفعول ہوگا۔

دوسری خصلت بذل السلام ہے جو ترجمہ سے متعلق ہے اس میں بخل نہ کرو بلکہ جتنا خرچ کر سکتے ہو کرو، اس میں عالم کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو یہ بتلا رہا ہے کہ سلام کا عموم اور شیوع مطلوب ہے، اس میں اپنے پرانے متعارف وغیر متعارف اور دیسی و پردیسی کی تفریق نہ ہونی چاہیے۔

تیسری خصلت۔ الانفاق من الاقتار ہے یہ ”من“ بہ معنی فی بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ

اذا نودی للصلوة من يوم الجمعة

جب جمعہ کے دن اذان دی جائے

میں ”من“ فی کے معنی میں ہے اور عند اور مع کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ

لن تغنی عنهم اموالهم ولا اولادهم

ہرگز ان کے کام نہ آویں گے ان کے مال اور

من اللہ شیئاً (پ ۳۷ ع ۳)

انکی اولاد اللہ کے مقابلہ میں۔

میں من بمعنی عند آیا ہے، پہلی صورت میں معنی یہ ہیں کہ تنگدستی کے زمانہ میں خرچ کرے یعنی قحط سالی کے زمانہ میں لوگوں کی امداد کرے اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہے کہ تنگدستی کے باوجود خرچ کرے یعنی اپنا ہاتھ تنگ ہے پھر بھی دوسروں پر خرچ کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص تنگدستی میں بھی خرچ کرے گا وہ فراخی میں ضرور خرچ کریگا۔ مذکور چیز سے مسکوت کی اولویت معلوم ہوتی ہے جیسا کہ ابن ماجہ میں ہے۔

صہیب، اللہ کا اچھا بندہ ہے اگر اسے خوف

نعم العبد صہیب لو لم يخف الله

خدا بھی نہ ہوتا تب بھی معصیت نہ کرتا۔

لم يعص

اسی طرح یہاں بھی جب ایک انسان اقدار کی حالت میں خرچ کرتا ہے تو مال کی فراوانی کے ایام میں ضرور خرچ کریگا، انفاق من الاقدار میں اپنے اہل و عیال کا خرچ، مہمانوں کی مدارات، اور مسافرین کی خدمت کے مصارف وغیرہ آجاتے ہیں، جو شخص ان اوصاف کا جامع ہوگا وہ کامل الایمان ہوگا۔

علامہ عینی فرماتے ہیں کہ حضرت عمار کے اس ارشاد میں ایمان کی تمام خصال کا احاطہ کر لیا گیا ہے، خصال ایمان یا مالی ہوگی یا بدنی اور پھر بدنی کی دو صورتیں ہیں، ایک کا تعلق خالق عالم سے ہے اور دوسری کا مخلوق خدا سے، انفاق من الاقدار میں اسی مالی خصلت ایمان کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مال وہی شخص خرچ کریگا جسے باری تعالیٰ کی ذات پر پورا پورا اعتماد ہو، جو انفاق کو نفاذ مال کا سبب نہ سمجھے، بلکہ اسے ترقی و برکت کا موجب قرار دے۔

”انصاف من نفسک“ میں خداوند قدوس کے اوامر و احکام کی حرمت و تعظیم کی طرف اشارہ ہے اور انشاء سلام مخلوق خدا کے ساتھ حسن سلوک پر مشتمل ہے اس سے انسان کے خلق حسن کا اندازہ ہوتا ہے، علامہ عینی کے اس ارشاد سے ان خصال کے اختیار کر لینے پر استکمال ایمان کی حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔

امام نے ترجمہ تو صرف انشاء سلام رکھا ہے مگر ان کا مقصد ان تمام اجزاء سے متعلق ہے یعنی مرجیہ کی تردید، مرجیہ جو اعمال کو بالکل غیر ضروری بتاتے ہیں ان کی تردید منظور ہے جو حضرت عمار کے ارشاد کے ہر جز سے ہو رہی ہے، کیونکہ یہاں استکمال ایمان کو تینوں خصلتوں پر موقوف رکھا گیا ہے۔

حدیث گذر چکی ہے، وہاں حضرت عمرو بن خالد کے طریق سے تھی اور یہاں حضرت قتیبہ کے طریق سے ہے، ترجمہ دونوں جگہ الگ الگ ہے، اس میں ایک لطیفہ ہے جس کی رعایت عام طور پر محدثین نہیں کرتے لیکن دقیق النظر حضرات اس کی رعایت کرتے ہیں۔

در اصل اس حدیث کو امام بخاری کے ایک شیخ نے انشاء سلام کے تحت پیش کیا اور دوسرے شیخ نے اس روایت سے اطعام طعام کا اثبات کیا تھا۔ امام بخاری نے دونوں شیوخ کے مقاصد کا خیال کیا اور دونوں کی روایت کو ایک جگہ جمع نہیں فرمایا بلکہ الگ الگ ذکر کیا۔

[۲۱] بَابُ كُفْرَانِ الْعَشِيرِ وَ كُفْرٍ دُونَ كُفْرٍ

فِيهِ أَبُو سَعِيدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ

(۲۹) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ أُرِيْتُ النَّارَ فَإِذَا أَكْثَرُ أَهْلِهَا النِّسَاءُ يَكْفُرْنَ قِيلَ أَيْ كَفُرْنَ بِاللَّهِ قَالَ يَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ وَيَكْفُرْنَ الْإِحْسَانَ لَوْ أَحْسَنْتَ إِلَى إِحْدَاهُنَّ الدَّهْرَ ثُمَّ رَأَتْ مِنْكَ شَيْئًا

قَالَتْ مَا رَأَيْتُ مِنْكَ خَيْرًا قَطُّ . (آئندہ ۴۳۱، ۴۲۸، ۴۱۰، ۳۲۰، ۵۱۹)

ترجمہ | باب، خاوند کی ناشکری اور ایک کفر کے دوسرے کفر سے کم ہونے کے بیان میں، اور اس باب میں وہ حدیث ہے جسے حضرت ابو سعید خدریؓ نے آنحضرت ﷺ سے بیان فرمایا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے جہنم دکھائی گئی تو اس میں زیادہ تر عورتیں تھیں جو کفر کرتی ہیں، عرض کیا گیا، کیا اللہ کے ساتھ کفر کرتی ہیں، آپ نے فرمایا۔ خاوند کی ناسپاسی کرتی ہیں اور احسان کا اعتراف نہیں کرتیں اگر تم عمر بھران میں سے کسی کے ساتھ احسان کا معاملہ کرو، پھر تمہاری جانب سے کوئی ناگواری کی بات ہو جائے تو وہ یہ کہے گی میں نے تجھ سے کبھی بھلائی نہیں پائی۔

مقصد ترجمہ | اب تک امام بخاریؒ نے اسلام اور ایمان کی تشریح کا مثبت پہلو اختیار فرمایا تھا یعنی ایمانیات کے ساتھ ایمان کی تشریح کی تھی، اب امام دوسرے منفی طریق کو پیش فرمانا چاہتے ہیں تاکہ حقیقت ایمانی دوسرے پہلو سے منفتح ہو جائے۔ کسی حقیقت کو سمجھانے کے دو طریقے ہیں ایک تو یہ کہ اگر وہ چیز بسیط ہے تو اس کی حقیقت ذکر کر دی جائے اور اگر مرکب ہے تو اسکے اجزاء الگ الگ بتلا دئے جائیں کہ اس کی یہ حقیقت ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ اسکو سمجھانے کے لئے اسکی ضد کا حال بتا کر اصل مقصد کی طرف انتقال کیا جائے۔

اب تک امام بخاریؒ نے پہلے طریق کو اختیار فرمایا تھا یعنی اب تک جتنے ابواب آئے تھے ان میں ایمان کے اجزاء یا مکملات کا ذکر تھا۔ پھر ذکر کے سلسلے میں امام نے یہ بھی احتیاط رکھی تھی کہ پیغمبر علیہ السلام نے جس چیز کو اسلام کے تحت ذکر فرمایا تھا اسے امام نے بھی اسلام کے عنوان سے پیش کیا تھا اور جس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے ایمان کا عنوان اختیار فرمایا تھا وہاں امام نے بھی ایمان کا صیغہ اختیار فرمایا اور یہ معلوم ہے کہ امام کے یہاں اسلام شرعی اور ایمان دونوں لازم و ملزوم ہیں، لہذا جو چیز اسلام کا جز ہوگی وہ ایمان کا بھی جز ہوگی۔ اس طریقہ سے مرجیہ کی واضح طور پر تردید ہوتی چلی آرہی ہے۔

اب امام بخاریؒ دوسرا طریق لاتے ہیں کہ ایمان کی ضد کفر ہے، لہذا اگر ایمان کو سمجھنا ہو اور اسکی حقیقت کو منفتح کرنا ہو تو اسکی ایک صورت یہ بھی ہے کہ کفر کو سامنے رکھو اور اسکی حقیقت پر غور کرو کہ اس کے کیا اجزاء ہیں اور انہیں کفر سے کیا نسبت ہے، جب تم یہ سمجھ لو گے کہ یہ ایسی حقیقت ہے جسکے نیچے بہت سے اجزاء ہیں، پھر یہ کہ وہ اجزاء باہم ایک نسبت نہیں رکھتے بلکہ کوئی قوی ہے اور کوئی اقوی، کوئی ادنیٰ ہے کوئی اعلیٰ، اور اسی اعتبار سے ان کے احکام و اثرات بھی مختلف ہیں۔

اگر یہ بات کفر کے اندر جاری ہوتی ہے اور دیکھنے والا ان اجزاء کو کفر ہی سمجھتا ہے تو اسلام بھی اسی کا مقابل ہے، اسے بھی اسی آئینہ میں دیکھا جائیگا۔ اگر اس میں مراتب قائم ہیں تو ایمان میں بھی ہونگے، اگر کفر میں تشکیک ہے تو ایمان میں بھی ہوگی، پھر جس طرح کفر کے تحت آئیو الے اعمال کفریہ پر کفر کا اطلاق حقیقت ہے اسی طرح طاعات پر ایمان کا اطلاق

بھی حقیقت ہوگا مجاز نہ ہوگا کیونکہ کلی مشکل اپنے افراد پر بطریق حقیقت صادق آتی ہے، خواہ وہ افراد قوی ہوں یا ضعیف، چھوٹے ہوں یا بڑے، گو وہ افراد اپنے اشخاص کے اعتبار سے باہم دگر مختلف ہوتے ہیں، انکی صورتیں بھی مختلف ہوتی ہیں اور انکے ذاتی احکام بھی الگ الگ ہوتے ہیں، لیکن اس اختلاف کے باوجود ان سب پر نوعی حکم ایک ہی لگتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ کفر جس کے معنی ستر یا انکار کے ہیں ایک کلی ہے اور اس کلی کے ماتحت مختلف انواع ہیں ایک نوع وہ ہے جس میں ستر کے ساتھ انکار شامل ہے، عناد، جھوٹ، نفاق شامل ہے اسکو کفر حقیقی کہا جاتا ہے جس کا نتیجہ خلودنی النار ہے، پھر اسی ستر کے اندر تحتانی مراتب ہیں کہ جن میں واقعی طور پر انکار اور جھوٹ تو نہیں ہوتا لیکن عمل ایسا ہے کہ جس سے انکار مترشح ہوتا ہے یعنی معاصی کا عمل، گویا کفر کا اطلاق جس طرح کفر حقیقی پر آیا ہے جو محبط اعمال ہے اسی طرح ان اعمال پر بھی آیا ہے جن میں معصیت ہے، اسکے بالمقابل جب دیکھیں گے کہ ایمان کے معنی ہیں مان لینا، اسکے مراتب میں ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ خدا کے ساتھ شریک نہ مانے، بلکہ خدا کو خدا مانے اور رسول کو رسول، اب اسکے بعد جتنے بھی اعمال ہیں، فرائض ہوں یا سنن ہوں یا مستحبات اور ہر وہ چیز جس میں طاعت کا رنگ موجود ہے ایمان میں داخل ہوگی اور پھر جس طرح بعض اجزاء کفر، ایمان کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں اسی طرح بعض اجزاء ایمان، کفر کے ساتھ بھی جمع ہو سکیں گے۔ لیکن کفر و ایمان کا وہ درجہ جس پر خلودنی النار، یا دخول فی الجہنم موقوف ہے آپس میں جمع نہیں ہو سکتے۔

نیز جس طرح کفر کی چیزوں پر کفر کا اطلاق حقیقت ہے اسی طرح اسلام کی چیزوں پر اسلام کا اطلاق حقیقت ہوگا، اور جب یہ اطلاق حقیقی ہے تو جہاں شریعت نے کفر کا لفظ استعمال کیا ہے وہاں مجاز مراد لینے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ اطلاق بھی حقیقت ہے لیکن سب کفر برابر نہیں جیسا کہ

من ترك الصلوة متعمدا فقد كفر
جس نے عمداً نماز ترک کر دی، اس نے کفر کیا

یا جیسا کہ اس شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے جو زادوراحلہ کی استطاعت رکھتا ہو اور فریضہ حج ادا نہ کرے۔
فلا علیہ ان يموت يهوديا ولا نصرانيا
پس نہیں ہے اس پر یہ کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی۔

ان باتوں کا مقصد یہ ہے کہ کفر اور کفر برابر نہیں، امام بخاری رحمہ اللہ نے کتاب الایمان میں یہ ترجمہ رکھ کر ایمان کی حقیقت کو بہت واضح کر دیا، پہلے تو اجزاء ایمان کو الگ الگ کر کے بتلایا، اور پھر اس کی ضد یعنی کفر کو پیش کیا، تاکہ حقیقت ایمان بالکل واضح ہو جائے متنبی نے کہا ہے۔

وَنَذُّهُمْ وَبِهِ عَرَفْنَا فَضْلَهُمْ
وَبِضْدِهَا تَتَبَيَّنُ الْأَشْيَاءُ

امام بخاریؒ یہی اشارہ فرما رہے ہیں کہ کفر اور کفر برابر نہیں، ایک کفر وہ ہے جس پر سخت سزا دی گئی ہے اور دوسرا وہ کفر ہے جو اس درجہ کا نہیں ہے، دیکھئے۔

اہم ان کی مذمت کرتے ہیں اور اسی سے ہمیں ان کے فضل کا اندازہ ہوتا ہے، کیونکہ اشیاء اپنی ضد سے واضح ہوتی ہے۔

ومن لم يحكم بما انزل الله فاولئك

اور جو شخص خدا تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے کے موافق حکم نہ کرے سوائے لوگ بالکل کافر ہیں۔

هم الكافرون (پ ۶ ع ۱۱)

کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کفر دون کفر فرما رہے ہیں یعنی یہ وہ کفر نہیں ہے جس کی سزا خلود فی النار ہے، یہ اس سے نیچے درجہ کا کفر ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے کفر دون کفر کا ٹکڑا وہیں سے لیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت

فیہ ابو سعید الخ کا مفہوم یہ ہے کہ اس باب کے ذیل میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی وہ روایت بھی ہے جسے امام بخاریؒ نے عیاض بن عبد اللہ کے

طریق سے کتاب الحیض میں ذکر فرمایا ہے، امام بخاریؒ فرمانا چاہتے ہیں کہ روایت مذکورہ فی الباب ایک دوسرے طریق سے بھی مروی ہے اور وہ حضرت ابوسعید خدریؓ کا طریق ہے جو آگے آرہا ہے۔

حدیث باب کی وضاحت

ارشاد ہے کہ جنت اور جہنم کی سیر کرائی گئی، جہنم کے دروازے پر کھڑا کر کے دکھلایا گیا، آنحضور ﷺ فرماتے ہیں کہ عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اور وجہ ارشاد فرمائی کہ

ان میں مادہ کفر زیادہ ہے اور جس کے ساتھ مادہ کفر ہوگا وہ جہنم سے قریب ہوگا کسی نے دریافت کیا۔ کیا خدا کے ساتھ کفر کرتی ہیں، فرمایا اپنے عشیر کے ساتھ کفر کرتی ہیں العشیر میں الف لام اگر عہد کے لئے ہو اور یہی رانج ہے تو زوج مراد ہے جس سے اس کی عشرت متعلق ہے اور جو اسکی تمام ضروریات کا کفیل ہے اور اگر جنس کا ہو تو معنی ہر وہ شخص جس سے اختلاط رہتا ہے، کسی کا احسان نہیں مانتیں بلکہ جہان کوئی بات خلاف طبع سنا منے آتی ہے تو تمام کئے دھرے پر پانی پھیر دیتی ہیں کہ ما رأیت فی دارک خیراً قط، اسی ناسپاسی کے باعث زیادہ تر حصہ جہنم انہیں سے بھرا گیا۔

زوج کے حقوق

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ خاوند کی اطاعت اس درجہ میں ہے کہ اگر غیر اللہ کو سجدہ جائز ہوتا تو میں حکم دیتا کہ عورت خاوند کو سجدہ کرے، طبرانی میں واقعہ ہے کہ آنحضور ﷺ نے نکاح کی ترغیب

دی، ایک عورت آئی اور اس نے عرض کیا کہ مجھے خاوند کے حقوق معلوم ہونے چاہئیں اگر حقوق ادا کر سکوگی تو نکاح کرونگی، آپ نے فرمایا کہ خاوند کے حقوق اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر اس کا جسم پھوڑوں سے پک رہا ہو اور عورت اسے اپنی زبان سے چاٹے تب بھی حقوق ادا نہ ہونگے، وہ گھبرا گئی۔

اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ کفران عشیر بھی ایک قسم کا کفر ہی ہے مگر یہ کفر، کفر باللہ کے مقابلہ میں ادنیٰ اور بلحاظ نتائج اس کا غیر ہے کہ کفر باللہ کا انجام خلود فی النار ہے، اور کفران عشیر اور دیگر امور کفریہ کا انجام خلود فی النار نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ابواب الایمان میں کفران عشیر اور اس سے ملحق جو اور تین یا بعض نسخوں میں چار ابواب مذکور ہیں انکا اصل مقصد ایمانیات کو اور زیادہ منقح کرنا ہے کیونکہ یہ تو معلوم ہی ہے کہ کفر ایمان کی ضد ہے اور یہ بھی معلوم ہے

کہ ضدین کے احکام متحد ہوتے ہیں، اب ان ابواب میں یہ دکھلایا گیا ہے کہ کفر میں تشکیک ہے تو بعلاقہ ضدیت ایمان میں بھی تشکیک لازم ہے اور جس طرح کفر کے مراتب میں کوئی اعلیٰ ہے اور کوئی ادنیٰ، اور پھر ان امور میں باہم فرق مراتب ہے اسی طرح ایمان کو سمجھئے، پھر جس طرح ایمان کا ایک وہ درجہ ہے کہ اگر وہ نہ ہو تو ابد الآباد کے لئے اس پر جنت حرام ہو جائے اور وہ ہو تو خلود فی النار اس کے حق میں ممتنع بن جائے، ٹھیک اسی طرح مراتب کفر میں کفر کا ایک وہ درجہ ہے کہ معاذ اللہ اگر وہ آجائے تو خلود جنت اس کے حق میں شجرہ ممنوعہ بن جائے اور اس حالت کی موت خلود فی النار کا باعث ہو، اس بیان سے بالبداہتہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ معاصی میں کھلے طور پر ایمان کا ضرر ہے اور طاعات میں سرتاسر ایمان کا نفع ہے اور یہ دونوں چیزیں مرجیہ کے لئے موت کا پیغام ہیں۔

[۲۲] بَابُ الْمَعَاصِي مِنْ أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ وَلَا يُكْفَرُ صَاحِبُهَا بِأَرْكَابِهَا إِلَّا بِالشِّرْكِ

لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ إِنَّكَ أَمْرٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ وَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (نساء: ۴۸) وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَسَمَّاهُمُ الْمُؤْمِنِينَ . (حجرات: ۹)

(۳۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحْمَنِ بْنُ الْمُبَارَكِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا أَيُّوبُ وَيُونُسُ عَنِ الْحَسَنِ عَنِ الْأَحْنَفِ بْنِ قَيْسٍ قَالَ ذَهَبْتُ لِأَنْصُرَ هَذَا الرَّجُلَ فَلَقِينِي أَبُو بَكْرَةَ فَقَالَ أَيْنَ تُرِيدُ قُلْتُ أَنْصُرُ هَذَا الرَّجُلَ قَالَ أَرْجِعْ فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِذَا التَّقِيُّ الْمُسْلِمَانِ بِسَيْفِيهِمَا فَالْقَاتِلُ وَالْمَقْتُولُ فِي النَّارِ قُلْتُ يَا رَسُولَ اللَّهِ هَذَا الْقَاتِلُ فَمَا بِالْمَقْتُولِ قَالَ إِنَّهُ كَانَ حَرِيصًا عَلَى قَتْلِ صَاحِبِهِ . (آئندہ: ۶۸، ۷۰، ۸۳)

ترجمہ | باب، اس بیان میں کہ معاصی جاہلیت کے امور سے ہیں مگر باستثناء شرک انکے مرتکب کو کافر نہیں کہا جائیگا اسلئے کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا تھا کہ ابھی تمہارے اندر جاہلیت موجود ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ شرک کی بخشش نہیں فرمائے گا اور اس کے ماسواء جس گناہ کو چاہے گا بخش دیگا اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں قتال کریں تو ان میں باہم صلح کرادو، یہاں اللہ تعالیٰ نے دونوں گروہوں کو مومن کے لفظ سے ذکر فرمایا ہے۔

حضرت احنف بن قیس کا بیان ہے کہ میں اس شخص (یعنی حضرت علیؓ) کی مدد کے لئے چلا، درمیان میں حضرت ابو بکرؓ سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے پوچھا، کہاں کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ میرا ارادہ اس شخص کی مدد کرنے کا ہے، فرمایا واپس ہو جاؤ اس لئے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب دو مسلمان اپنی

تکواریں لیکر ایک دوسرے کے مقابل ہوں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنمی ہیں، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ تو قاتل ہے لیکن مقتول کا جرم کیا ہے۔ فرمایا کہ وہ بھی اپنے بھائی کو قتل کر نیکیے درپے تھا۔

ترجمہ الباب کا مقصد | اس کے متعلق صاف اور بے تکلف بات تو یہ ہے کہ سابق ترجمہ میں اگرچہ مرجیہ کی تردید ہو رہی ہے مگر بعض معاصی پر اطلاق کفر سے خوارج کے لئے طمع خام پکانے کا موقعہ تھا، لہذا بخاری نے اس ترجمہ میں یہ واضح کر دیا کہ معاصی من امر الجاہلیہ ہیں مگر انہیں باستثناء شرک اور کوئی معصیت ایسی نہیں ہے جس کے ارتکاب سے وہ کافر ہو جائے۔ کافر ہونا تو درکنار اسے کافر کہنا بھی درست نہیں۔

ترجمہ کے جز اول میں مرجیہ کی تردید ہو رہی ہے کہ معاصی دور جاہلیت یعنی دور کفر کی چیزیں ہیں۔ ہر معصیت میں کسی نہ کسی درجہ میں کفر کا رنگ جھلکتا ہوا نظر آتا ہے، لہذا ان کا مضر ایمان ہونا یقینی اور بدیہی ہے اور ترجمہ کا دوسرا جزء رد خوارج و معتزلہ میں بالکل صاف ہے، اس سلسلہ میں بخاری نے جو دلائل پیش کئے ہیں ان میں بظاہر پہلی دلیل پہلے ترجمہ سے متعلق ہے، طعن فی النسب کے باعث انکو انک امرء فیک جاہلیہ کے الفاظ میں تشبیہ کی گئی، مگر اس لحاظ سے کہ اس خلق جاہلیت کے باوجود کسی کو بھی انکے کامل الایمان ہونے میں شبہ نہیں گذرا اور نہ آنحضور ﷺ نے ان کو تجدید ایمان کا امر فرمایا، یہ ٹکڑا جزو ثانی پر بھی روشنی ڈال رہا ہے اور دوسری اور تیسری دلیل تو گویا رد خوارج ہی کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ ان اللہ لا یغفر الا یہ میں مرجیہ کا رد ہو رہا ہے جیسا کہ ناظر متامل پر مخفی نہیں ہے اور ہم بھی اس کا اشارہ کریں گے، آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذلك لمن یشاء میں خداوند قدوس نے اپنی شان کا اظہار فرمایا ہے کہ ہم شرک کے علاوہ بڑے سے بڑے گناہ کو معاف کر سکتے ہیں، یہ ہماری شان ہے، اس بارے میں نہ ہم سے کوئی مزاحمت کر سکتا ہے اور نہ کوئی ہمارے ذمہ کسی امر کو لازم کر سکتا ہے، اثابت مطیع اور عقاب عاصی دونوں ہماری مشیت کے ماتحت ہیں، ہم جس طرح مجرم کی توبہ قبول کر کے اس کے جرم معاف کر دیتے ہیں اسی طرح بلا توبہ بھی اس کا جرم معاف کر سکتے ہیں، یہ شان رحمت کا تقاضا ہے یا در ہے ہم ارحم الراحمین ہیں۔

اب سمجھئے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ یعنی کافر کی مغفرت نہیں ہو سکتی اور یغفر ما دون ذلك لمن یشاء یعنی عاصی کی مغفرت ہو سکتی ہے، تو یہ عاصی کون ہوا، مؤمن یا کافر؟ مغفرت کی شرط اولین اس کا مؤمن ہونا ہے، نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ مؤمن عاصی مؤمن ہے ایمان سے خارج نہیں ہے، اور نہ اسے کافر کہنا ہی درست ہے بلکہ بلا توبہ بھی وہ مغفرت کا مستحق ہے ورنہ مشرک اور کافر بھی بعد التوبہ بشرط قبول توبہ مستحق مغفرت ہو جاتا ہے۔

اب ہم ردّ اذ جاء کا اشارہ ذکر کرتے ہیں کہ وعدہ مغفرت خود اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ عاصی کا ایمان کمزور ہو چکا ہے، اس میں خود تقاضاے مغفرت باقی نہیں، لہذا سہارے کی ضرورت پڑی، یہ اشارہ سمجھ دار کیلئے کافی ہے، آیت

کے شان نزول سے بھی یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے، اکابر مفسرین نے اس سلسلہ میں وحشی قاتل حضرت حمزہؓ کا تذکرہ ان الفاظ میں نقل کیا ہے کہ یہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا

انا مستجیر بک حتی
اسمع کلام اللہ
میں آپ کی پناہ میں آ رہا ہوں اس وقت تک کے لئے کہ میں
اللہ کا کلام سن سکوں۔

خیر اس نے کہا میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ میں نے شرک، زنا، قتل سب کچھ کیا ہے، کیا ان جرائم کے بعد بھی میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟ آپ نے تامل فرمایا تو یہ آیت نازل ہوئی۔

الا من تاب و آمن و عمل عملا
صالحا فاولئك يبدل الله سيئاتهم
حسنات (پ ۱۹ ع ۴)
مگر جو توبہ کرے اور ایمان لے آوے اور نیک کام
کرتا رہے تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے گناہوں
کی جگہ نیکیاں عنایت فرمادے گا۔

وحشی نے یہ آیت سکر کہا کہ اس میں تو عمل صالح کی قید لگی ہے، میں نہیں جانتا کہ میں عمل صالح کر سکوں گا یا نہیں، میں ابھی آپ کے جوار میں ہوں، اس پر دوسری آیت نازل ہوئی۔

ان الله لا يغفر ان يشرك به
ويغفر ما دون ذلك لمن يشاء
(پ ۵ ع ۱۴)
بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے
ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے علاوہ
گناہ جس کیلئے منظور ہوگا بخش دیں گے۔

وحشی نے کہا کہ اس میں تو لمن يشاء کی قید لگی ہے، میں نہیں جانتا کہ میں مشیت کے ماتحت آتا ہوں یا نہیں اور وحشی نے پھر یہی کہا انا فی جوارک اب تیسری آیت آئی۔

قل يعبادي الذين اسرفوا على
انفسهم لا تقنطوا من رحمة الله
ان الله يغفر الذنوب جميعا (پ ۲۲ ع ۳)
آپ کہہ دیجئے کہ میرے بندو! جنہوں نے اپنے
اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے ناامید
مت ہو بل یقین اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا
اب وحشی نے کہا کہ اس میں کوئی قید نہیں ہے، میں ایمان لاتا ہوں۔

خوارج کے مقابلہ پر دوسری دلیل وان طائفتان من المؤمنين الآیہ، ذکر فرما کر طریق استدلال پر خود ہی تنبیہ فرمادی کہ فسماهم المؤمنین یعنی عمل اقبال کے باوجود ایمان کا اسم ان سے علیحدہ نہیں کیا گیا اگر وہ کافر ہو گئے ہوتے تو نہ ان کو اس شریف لقب سے نوازا جاتا اور نہ ان میں صلح کرانے کا حکم ہوتا بلکہ خس کم جہاں پاک، انہیں لڑ کر ختم ہونے دیا جاتا، معلوم ہوا کہ قتالہ کفر میں اس عمل کی شدت اور غلظت کا اظہار مقصود ہے نہ کہ اس کے کفر کا اعلان، اسی سے کفر دون کفر کا معاملہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ یہ کفر اس کفر سے نچلے درجہ کا ہے، جس کے لئے خلود فی النار لازم

ہے، ہم نے ان تراجم کے متعلق حضرت شیخ الہند کا نظریہ اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے اس کے علاوہ ایک اور نظریہ بھی ہے جس کو ”فیض الباری“ میں علامہ کشمیری کا نظریہ قرار دیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفر دون کفر میں دون، غیر کا معنی میں ہے، ادنیٰ کے معنی میں نہیں ہے اور بطور قرینہ کے بخاری کے دوسرے نسخے سے کفر بعد کفر کا لفظ نقل فرمایا ہے اور باب المعاصی من امر الجاہلیۃ ولا یکفر صاحبها الا بارتکاب الشرك یعنی معاصی من امر الجاہلیۃ ہیں ان پر اپنی طرف سے کفر کا اطلاق مت کرو، جن معاصی پر صاحب شرع سے کفر کا اطلاق آچکا ہے اس کو وہیں تک محدود رکھو، وہ کفر دون کفر کی فہرست میں شامل ہو گئے، اسی بناء پر ترجمہ میں لا یُکْفَرُ بہ صیغۃ استقبال ذکر فرمایا گیا ہے، اگر مقصد تشکیک فی الکفر کا بیان ہوتا تو یکفر فرمایا جاتا۔

یہ ناچیز اس کے سمجھنے سے قاصر ہے، یہاں تو لایکفر صاحبها بارتکاب الشرك اس امر کا قرینہ ہے کہ اس کفر سے وہ کفر مراد ہے جو جہت اعمال اور خلود فی النار کا موجب ہو، اس میں اور کفر دون کفر میں کوئی منافات نہیں ہے، اس کا تعلق تحتانی درجہ کی کفریات سے ہے اور لایکفر صاحبها کا تعلق فوقانی درجہ کے کفر سے، یعنی یوں تو ہر معصیت جاہلیت سے متعلق ہے خواہ شرک ہو یا اور قسم کے گناہ ہوں مگر ملت سے خارج کرنے والا گناہ شرک ہی ہے، لہذا معتزلہ اور خوارج کا یہ دعویٰ کہ ہر مرتکب کبیرہ ملت سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور اگر بلا تو بہ مر جائے تو ابد الابد کیلئے جہنم میں رہے گا غلط اور قطعاً غلط ہے۔

یہاں تو لایکفر ہی کا موقع ہے، یکفر کہنے میں خلاف مقصود کا ایہام ہی نہیں بلکہ مدعائے خوارج کی تصریح ہو جاتی ہے جس سے بچنے کے لئے مصنف علام نے کفر دون کفر کا طریق اختیار فرمایا تھا۔

باقی یہ بات کہ اگر مقصد تشکیک فی الکفر کا اثبات ہوتا تو کفر دون کفر کے تحت قتالہ کفر یا من ترک الصلوۃ متعمداً فقد کفر جیسی روایات ذکر کی جاتیں، لیکن مصنف کی عادت کے لحاظ سے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، دیکھئے لا یستقبل القبلة بغائط الا عند البناء وغیرہ میں حضرت عبداللہ بن عمروؓ والی روایت کو نہیں نکالا، حالاں کہ حضرت علامہ کشمیری کے نزدیک وہی روایت اس استثناء کی بنیاد ہے۔

نیز دون کا لفظ جس طرح غیر اور سوی کے معنی میں مستعمل ہے اسی طرح ادنیٰ کے معنی میں بھی ہے قرآن سے کسی معنی کی تعیین کر لی جاتی ہے، شاید فیض الباری کے مؤلف سے حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ کا مفہوم سمجھنے میں کچھ تسامح ہو گیا ہو اور یہ تشریح خود ان کی طبع زاد ہو۔

واللہ اعلم

حدیث باب | احنف بن قیس کہتے ہیں کہ میں گھر سے حضرت علیؓ کی مدد کے خیال سے نکلا، یہ دور جنگ جمل کا ہے جس میں ایک طرف حضرت علیؓ تھے اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ، راہ میں حضرت ابو بکرؓ ملے فرمایا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا حضرت علیؓ کی مدد کے لئے نکلا ہوں، حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا، میاں جاؤ، گھر بیٹھو، میں نے

رسول ﷺ سے سنا ہے کہ جب دو مسلمان تلواریں سوت کر ایک دوسرے کے مقابل آجائیں تو دونوں جہنم میں جائیں گے۔ یعنی میں بطور خیر خواہ کہہ رہا ہوں کہ اپنے آپ کو کیوں اس حدیث کا مصداق بناتے ہو۔

ابو بکرہ کہتے ہیں کہ جب نبی اکرم ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تو میں نے عرض کیا، قاتل کی بات تو سمجھ میں آرہی ہے لیکن مقتول فی النار کیوں ہے، آپ نے فرمایا کہ قتل ہی کے ارادہ سے تو وہ بھی نکلا تھا، گویا جرم میں دونوں برابر ہیں، اتفاق سے ایک کا ارادہ کارگر ہو گیا۔

امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اس موقع پر فی النار فرمایا ہے یہ نہیں فرمایا کہ ارتداد عن الاسلام یا خرجا عن الاسلام، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس حالت میں بھی مسلمان مسلمان ہی رہتا ہے، اسلام سے خارج نہیں ہو جاتا۔

ابھی یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ اذ التقی (الحدیث) یہاں کیسے صادق آیا، ایک جنگ جمل اور حدیث شریف | طرف حضرت علیؑ ہیں اور دوسری طرف حضرت عائشہؓ، حضرت علیؑ کے ساتھ بھی صحابہ ہیں اور حضرت عائشہؓ کے ساتھ بھی، جس قدر مہاجرین ہیں تین حصوں پر تقسیم ہیں، کچھ حضرت علیؑ کے ساتھ ہیں کچھ حضرت عائشہؓ کے، اور کچھ خاموش ہیں، اور انصار کل حضرت علیؑ کے ساتھ ہیں، اشکال یہ ہے کہ جب قاتل بھی صحابہ ہیں اور مقتول بھی صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تو فی النار کا کیا موقعہ ہے اور حضرت ابو بکرہؓ کے اس موقعہ پر حدیث کو پیش فرمانے کا کیا مفہوم ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ حضرت ابو بکرہ کی سمجھ میں کوئی بات نہ آسکی، اسی لئے خود بھی شریک نہ ہوئے جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا اور بھی بعض اصحاب ہیں جن کا یہی مسلک رہا ہے، اسی وجہ سے حضرت ابو بکرہ نے احنف بن قیس کو دیکھا تو روک دیا، باوجودیکہ حضرت ابو بکرہؓ نبی اکرم ﷺ کے موالی میں داخل ہیں اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے۔

من كنت مولا ه فعلى مولا ه میں جس کا مولی ہوں پس علی اسکے مولا ہیں

اس ارشاد کی روشنی میں انہیں حضرت علیؑ کے ساتھ رہنا چاہیے تھا، لیکن جب تک حق ان کے سامنے روشن نہ ہو جائے کوئی صورت تلوار اٹھانے کی نہ تھی۔

رہی حدیث شریف سوا اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان جب لڑنیکے لئے نکل آئیں اور جنگ حق کی بنا پر نہ ہو بلکہ ہوس ملک گیری یا عصبیت وغیرہ اسکی محرک ہوں تو قاتل مقتول دونوں جہنمی ہیں اور اگر منشا صحیح ہو اور لڑنے والے حق کی حمایت میں جا رہے ہوں تو قاتل بھی جنتی اور مقتول بھی۔

تاریخی واقعہ اور مروان کی خیانت | صورت واقعہ یہ ہوئی کہ حضرت عثمانؓ پر جب یورش ہوئی اور بلہائیوں نے دار الخلافہ کا محاصرہ کر لیا تو حضرت عثمانؓ نے یہ کوشش کی کہ معاملہ آسانی سے رفع دفع ہو جائے، چنانچہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بہت سمجھایا اور ان خصوصیات کا ذکر فرمایا جو پیغمبر علیہ السلام نے صحابہ کے سامنے ان کے متعلق بیان فرمائی تھیں اور یاد دلایا کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ اگر عثمان اس عمل کے بعد کوئی عمل نہ بھی کریں تو کوئی ضرر نہیں۔

لیکن وہ بلوائی جو خیانت پر اترے ہوئے تھے کسی طرح رام نہ ہوئے، اور بد قسمتی سے انہوں نے محمد بن ابی بکر کو سردار بنا لیا اور یہ وہ ہیں جو اسماء کے بیٹے ہیں، حضرت ابو بکر کے انتقال کے بعد حضرت علی نے اسماء بنت عمیس زوجہ ابی بکر سے عقد کر لیا تھا اور ان محمد کو اولاد کی طرح پالا تھا، یہ اس وقت دو سال کے تھے اور جب حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا تو کمان کر رہے تھے۔

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ مصریوں کو گورنر مصر حضرت عمرو بن العاص سے کچھ اختلاف ہو اور ان کی خواہش یہ ہوئی کہ انکی جگہ محمد بن ابی بکر کو گورنر بنائیں، چنانچہ بلوائی مصر سے دار الخلافہ پہنچے، امیر مصر کی شکایت کی اور محمد بن ابی بکر کے لئے سفارش کی، حضرت عثمان نے تحریر لکھی کہ ان کو معزول کر دیا گیا اور محمد بن ابی بکر کو امیر بنایا گیا اور جب یہ وہاں پہنچیں تو انہیں قبول کر لو۔ الفاظ تھے فاقبلوہ

میرنشی مروان تھا، بڑا شرارت پسند آدمی تھا، اس نے فاقبلوہ (انہیں قبول کر لو) کے بجائے (فاقتلوہ) انہیں قتل کر دو لکھ دیا، اور حضرت عثمان غنیؓ کے غلام کو حضرت عثمان کی مخصوص اونٹنی پر بٹھا کر روانہ کر دیا اور خط پر حضرت عثمان کی مہر بھی لگادی۔

بلوائی اپنی کامیابی پر خوش ہیں، ادھر غلام بھی بے خطر جا رہا ہے، لیکن جب بلوائیوں نے غلام کو جاتے ہوئے دیکھا تو پکڑ لیا، دیکھا تو خط میں فاقتلوہ لکھا ہے، بس وہین سے پلٹ پڑے کہ ہمارے ساتھ دغا کی گئی ہے، کیونکہ معاملہ ہی ایسا ہے، تحریر موجود ہے اور اس پر مہر خلافت ثبت ہے، آکر معاملہ حضرت عثمان کے سامنے پیش کیا، حضرت عثمان نے تحریر سے انکار کیا اور یقین دہانی کی ہر چند کوشش کی، مگر انہیں یقین نہ آیا، بالآخر دار الخلافہ کا محاصرہ کر لیا گیا۔ محمد بن ابی بکر کو خیال ہوا کہ میرے قتل کی سازش کی گئی ہے اور چونکہ محمد حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پروردہ ہیں اس لئے یہ بھی خیال ہوا کہ یہ حضرت علی کی سازش سے ہوا کیونکہ محمد پیش پیش ہیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ انتظام کیا کہ ایک دروازے پر اپنے صاحبزادے حسن اور دوسرے دروازہ پر حسین رضی اللہ عنہما کو مقرر کیا اسی طرح حضرت طلحہ نے بھی اپنے صاحبزادوں کو مقرر فرمایا۔

یہ تمام صاحبزادے دروازوں پر کھڑے ہیں، لیکن بلوائی مکان کی پشت سے اندر داخل ہوئے، حضرت عثمان

قرآن کریم کی تلاوت فرما رہے تھے، بلوایوں کو دور کر نیکیے لئے حضرات صحابہ اور غلاموں نے اجازت چاہی غلاموں کی تعداد چار ہزار تھی، لیکن حضرت عثمان نے غلاموں کو آزاد کر دیا اور صحابہ کو روک دیا، محمد بن ابوبکر نے حضرت عثمان غنیؓ کی ریش مبارک پکڑ کر تھپڑ مارا، حضرت عثمان نے نظر اٹھائی اور فرمایا کہ ابوبکر ہوتے تو تمہاری اس حرکت کو گوارا نہ کرتے، اس پر محمد نے داڑھی چھوڑ دی، دوسرے شورہ پشت لوگوں نے سر میں تیر گھسایا اور گلا گھونٹ دیا، آنکھیں اُبل آئیں اور حضرت کا خون آیت

اللہ تعالیٰ ان کو کافی ہے اور وہ سننے والا

فسیکفیکہم اللہ وهو السميع

اور جاننے والا ہے۔

العلیم

پرگرا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت حج کے لئے مکہ تشریف لے گئی تھیں، مدینہ کے لوگوں نے حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی، ادھر حضرت معاویہ شام کے گورنر تھے انہیں خیال ہوا کہ حضرت علی نے سازش کی ہے اسلئے وہاں انہوں نے بیعت لے لی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما باہر ہیں، معلوم ہوا کہ حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے ہیں اور بلوایوں کا زور ہے اور بلوایں حضرت علی کے لشکر میں ہیں چنانچہ یہ دونوں اصحاب، حضرت عائشہ کے پاس پہنچے کہ مدینہ کی ہوا خراب ہو رہی ہے آپ وہاں نہ جائیں اور آپ چونکہ ام المومنین ہیں اسلئے آپ کو خلیفہ کے قصاص کا مطالبہ کرنا چاہئے، یہ اصحاب حضرت عائشہ کو لیکر بصرہ پہنچے اور وہاں لشکر جمع کیا، حضرت علی کو معلوم ہوا کہ بالا ہی بالا معاملہ ہو رہا ہے، لامحالہ مدافعت کرنا پڑی، مطالبہ یہ تھا کہ قاتلین عثمان ہمارے حوالہ کئے جائیں اور یہی مطالبہ جنگ صفین میں حضرت معاویہ کا تھا، حضرت علی قصاص میں دو وجہ سے متامل تھے پہلی بات تو یہ کہ خلافت بالکل نئی ہے اور بلوایں تقریباً تین ہزار ہیں، ایک خلیفہ کو وہ شہید کر چکے ہیں اور اتنی بڑی جمعیت سے قصاص لینا مشکل ہے، دوسری بات یہ ہے کہ قاتل معین نہ تھا لیکن حضرت علی کے اس تامل کو وہ لوگ سازش سمجھ رہے ہیں، چنانچہ حضرت عائشہ مقابلہ کے لئے نکل آئیں، رات کے وقت جب لشکر مقام حواب پر پہنچا تو حضرت عائشہ کے اونٹ پر کتا بھونکا، حضرت عائشہ نے پوچھا اس مقام کا کیا نام ہے بتلایا گیا ”حواب“ حضرت عائشہ کو نام سن کر یاد آیا کہ میں غلطی پر ہوں فرمایا چلو بات یہ تھی کہ ایک بار حضرت عائشہ اور علی رضی اللہ عنہما موجود تھے آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ عائشہ تم علی کے مقابلہ پر نکلو گی اور مقام حواب پر کتا بھونکے گا اور علی حق پر ہوں گے، حضرت عائشہ کو یہ بات یاد آئی تو واپسی کا قصد فرمایا، طلحہ اور زبیر بھی جنگ سے الگ ہو گئے۔

بلوایوں نے یہ صلح دیکھی تو گھبرا گئے، وہ تو یہ سوچتے تھے کہ اگر یہ لڑتے رہیں تو اپنا الو سیدھا رہے اور اگر مل گئے تو شامت آجائے گی بلوایں چونکہ دونوں طرف ہیں رات کے وقت جب لوگ سو گئے تو نصف شب کو بلوایوں نے پتھر پھینکے، اب شور مچا ہر فریق سوچتا تھا کہ ہمارے ساتھ دھوکا کیا گیا، لامحالہ جنگ ہوئی چونکہ حضرت عائشہ اونٹ پر سوار تھیں اسلئے اس کا نام جنگ جمل رکھا گیا، حضرت عائشہ کے ہودج کی حفاظت کے لئے ۸ بڑے بڑے لوگ آتے اور شہید

ہو جاتے کشتوں کے پتے لگ گئے اونٹ کی بھی کوچیں کٹ گئیں، گرنے لگیں تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پورے احترام کے ساتھ اتار لیا اور مدینہ پہنچا دیا یہاں اسی کا ذکر ہے۔

اب جو لوگ حضرت علی کو حق پر سمجھ کر شریک ہوئے وہ قاتل ہوں یا مقتول حق پر ہیں اور جنت میں، لیکن جو بلوائی ہیں اور ان کا تعلق حق سے نہیں وہ قاتل ہوں یا مقتول از روئے حدیث جہنمی ہیں، اسی طرح حضرت عائشہؓ کی طرف جو لوگ حق کی حمایت کے لئے کھڑے ہوئے ہیں جنت میں جائیں گے گویا معاملہ حضرت عائشہ کی خطائے اجتہادی کا ہے لیکن مجتہد کو خطا پر بھی ایک ثواب ملتا ہے اور صواب پر دو ثواب ملتے ہیں، اسی جنگ میں حضرت طلحہ اور حضرت زبیرؓ بھی شہید ہوئے جو عشرہ مبشرہ میں ہیں، حضرت عائشہؓ کے ساتھ کچھ لوگ اسلئے بھی شریک تھے کہ یہ آنحضرت ﷺ کی حرم ہیں اور انہیں آنحضرت ﷺ سے زیادہ قرب ہے، اس نیت سے شریک ہونیوالے حضرات بھی مستحق ثواب ہوں گے لیکن جن لوگوں کا مقصد اقتدار پسندی، تعصب، عہدہ کی طمع یا اور کوئی دنیوی غرض تھی ان کے متعلق القاتل والمقتول فی النار (قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں) فرمایا گیا ہے عصبیت کی جنگ کا مفہوم یہ ہے کہ واقعہ کی تفتیش کے بغیر صرف یہ سمجھ کر مدد کی جائے کہ یہ اپنا آدمی ہے۔

(۳۱) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ وَاصِلِ الْأَحْذَبِ عَنِ الْمَعْرُورِ قَالَ لَقِيتُ أَبَا ذَرٍّ بِالرَّبَذَةِ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ وَعَلَى غُلامِهِ حُلَّةٌ فَسَأَلْتُهُ عَنْ ذَلِكَ فَقَالَ إِنِّي سَابَبْتُ رَجُلًا فَعَيَّرْتُهُ بِأَمِّهِ فَقَالَ لِي النَّبِيُّ ﷺ يَا أَبَا ذَرٍّ أَعَيَّرْتَهُ بِأَمِّهِ إِنَّكَ أَمْرٌ فِيكَ جَاهِلِيَّةٌ إِخْوَانُكُمْ خَوْلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللَّهُ تَحْتَ أَيْدِيكُمْ فَمَنْ كَانَ إِخْوَهُ تَحْتَ يَدِهِ فَلْيُطْعِمَهُ مِمَّا يَأْكُلُ وَلْيَلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ وَلَا تُكَلِّفُوهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ فَإِنْ كَلَّفْتُمُوهُمْ فَاعِينُوهُمْ.

(آئندہ: ۲۵۳۵، ۶۰۵۰)

ترجمہ حضرت معرورؓ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ میں حضرت ابوذر سے بمقام ربذہ ملا، حضرت ابوذرؓ ایک حلقہ پہنے ہوئے تھے اور ان کا غلام بھی ایک حلقہ پہنے ہوئے تھا، میں نے حضرت ابوذرؓ سے اسکا سبب پوچھا حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ میں نے ایک شخص کو گالی دی اور اسکو اس کی ماں کی طرف سے شرمندہ کیا اس پر رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ابوذر تمہارے اندر جاہلیت کی باتیں چلی آتی ہیں تمہارے غلام تمہارے بھائی ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارے ہاتھوں کے نیچے رکھا ہے جس کا بھائی اس کے زیر دست ہو اس کو چاہئے کہ جو خود کھائے اس میں سے اپنے غلام کو بھی کھلائے اور اپنا جیسا لباس پہنائے اور انہیں ایسی چیز کا حکم مت دو جو ان کیلئے بھاری ہو اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو ان کی امداد کرو۔

تشریح حدیث معرورؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ کے جسم پر حلقہ تھا، حلقہ دو چادریں ہوتی ہیں ایک تہہ کی جگہ اور دوسری جسم کے بالائی حصہ پر، یہ دونوں ایک قسم کی ہونی چاہئیں، بعض کے نزدیک ان کا جدید

ہونا بھی ضروری ہے حلہ کو حلہ اسلئے کہتے ہیں کہ ایک کپڑا دوسرے کپڑے پر اترتا ہے، سوال کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں حلے ایک رنگ اور ایک قیمت کے تھے اسلئے سائل کو اس مساوات پر حیرت ہوئی کیونکہ غلاموں کے ساتھ مساویانہ عمل کا دستور نہ تھا لیکن ابوداؤد اور مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حلے دو قیمت کے تھے مگر انہیں اس طرح تقسیم کر لیا تھا کہ عمدہ اور گھٹیا کا ایک ایک حصہ حضرت ابوذر کے بدن پر ہے اسی طرح دونوں حلوں کا ایک ایک حصہ حضرت کے غلام کے بدن پر ہے، اس بظاہر تعارض کی وجہ سے میرے خیال میں علیہ حلہ کا ترجمہ یہ کرنا چاہئے کہ ان کے جسم پر ایک عجیب قسم کا حلہ تھا، حلہ کی تنوین سے یہ معنی نکالے جاسکتے ہیں، اب سوال کا منشا یہ ہوگا کہ اگر آپ دونوں چادریں ایک قسم کی رکھتے اور اسی طرح غلام کی چادریں بھی ایک طرح کی ہوتیں تو دونوں حلے مکمل ہو جاتے، اس کا جواب حضرت ابوذر نے یہ دیا کہ میں نے ایک شخص کو اس کی ماں کی جانب سے عار دلانی، بعض نے کہا کہ یہ حضرت بلالؓ تھے، حضرت ابوذر نے انہیں ابن السوداء کہہ دیا تھا، انہوں نے آنحضرت ﷺ سے شکایت کر دی تو آپ نے فرمایا کہ ابوذر جاہلیت کی بو نہیں گئی، یہ سنتے ہی ابوذر زمین پر گر گئے اور کہا کہ جب تک رخسارہ کو بلالؓ پیروں سے نہ روندیں میں نہیں اٹھوں گا چنانچہ بلال آئے رخسار روند تو ابوذر اٹھے، یہاں حضرت ابوذر نے سائل کے جواب کے لئے پوری حدیث نقل کی جس میں غلاموں کے ساتھ مساوات کا حکم ہے۔

مقصد سے ربط | مقصد صرف یہ ہے کہ حضرت ابوذر کو تنبیہ فرمائی لیکن ایمان سے خارج نہیں بتلایا اور نہ یہی امکان ہے کہ ان کے ایمان میں کمزوری آئی ہو، مدعا ثابت ہے کہ معاصی من امور الجاہلیہ ہیں مگر معصیت چھوٹی ہو یا بڑی کافر کہنے کی اجازت نہیں، پھر یہ کہ حدیث شریف میں مساوات کا نہیں، مواسات کا حکم ہے، اچھا تو یہی ہے کہ غلاموں کو اپنے ساتھ کھلایا جائے لیکن ایسا نہ کر سکے تو یہ حدیث کی رو سے حرام نہیں ہے کیونکہ فلیطعمہ مما یاکل فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنے کھانے میں سے کچھ کھلایا کرو، جیسا کہ دوسری روایت میں آتا ہے فانه ولسی علاجہ یعنی چونکہ کھانا تیار کرنے میں اس نے دقتیں برداشت کی ہیں اسلئے اسے کھانا دے دینا چاہئے، اسی طری ولبسہ مما یلبس میں بھی من کا یہی فائدہ ہے کہ اس لباس میں سے اسے بھی کچھ پہنا دینا چاہئے، اگر تم ململ پہنتے ہو تو غلام کو بھی اسی نوع کا دوسرا کپڑا پہنا دینا بہتر ہے۔

[۲۳] بَابُ ظُلْمِ دُونَ ظُلْمِ

(۳۲) حَدَّثَنَا أَبُو الْوَلِيدِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ ح قَالَ وَحَدَّثَنِي بِشْرٌ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ عَنْ

شُعْبَةَ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ لَمَّا نَزَلَتْ الْدِّينَ آمَنُوا وَلَمْ

يَلْبَسُوا إِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ قَالَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِنَّا لَمْ يَظْلِمْنَا فَانزَلَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ

إِنَّ الشُّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ - (لقمان: ۱۳)

(آئندہ: ۳۳۶۰، ۳۳۲۸، ۳۳۲۹، ۴۷۷۶، ۶۹۱۸، ۶۹۳۷)

ترجمہ | باب، اس بیان میں کہ بعض ظلم بعض سے ادنیٰ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ جب آیت
الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم
اولئک لهم الامن واولئک هم المہتدون
(پ ۷۷ ع ۱۵)
اور وہی راہ پر چل رہے ہیں۔

نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کیا ہم میں سے کون شخص ایسا ہے جس نے ظلم نہ کیا
ہو تو اللہ تعالیٰ نے آیت ان الشُّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ (بیشک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے) نازل فرمائی۔

ترجمہ کا مقصد | یہ ترجمہ بھی سابق تراجم کی طرح ایمان میں کمی بیشی کے اثبات کے لئے لایا گیا ہے تاکہ واضح طور
پر مرجیہ کی تردید ہو جائے، کمی بیشی کا اثبات اس طرح ہو رہا ہے کہ آیت میں کفر و شرک کو ظلم کا ایک
فرد بتلایا گیا ہے اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ ظلم کے مراتب ہیں کوئی اعلیٰ ہے کوئی ادنیٰ کوئی عظیم ہے کوئی غیر عظیم
اور خود آیت میں بھی مراتب ظلم کا اشارہ موجود ہے، غرض آیت اور حدیث سے ظلم کے مراتب ثابت ہوئے تو شرک اور
کفر میں بھی جو ظلم ہی کے افراد ہیں ضرور یہ مراتب قائم و ثابت ہونگے اور یہ سابق میں مذکور ہو چکا ہے کہ کفر ضد ایمان
ہے تو لا محالہ ایمان میں بھی یہ درجات و مراتب تسلیم کرنے پڑینگے اور یہی ان تراجم کا مقصود تھا جو بدابہت ثابت ہو گیا
اور اس سے جہاں مرجیہ کا مذہب حرف غلط ہو کر رہ گیا وہیں خوارج اور معتزلہ کی حماقت کا پردہ بھی چاک ہو گیا۔

آیت کریمہ | حضرت عبداللہ سے روایت ہے کہ آیت ان الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانہم بظلم الایۃ
نازل ہوئی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں بے چینی پیدا ہو گئی کیونکہ آیت سے یہ معلوم ہو رہا
ہے کہ امن اور اہتداء صرف ان لوگوں کے لئے ہے جن کا ایمان ہر قسم کے مظالم سے محفوظ ہو اور انبیاء علیہم السلام کے
سوا کون ہو سکتا ہے کہ جس سے کسی قسم کا بھی ظلم سرزد نہ ہوا ہو، کبار نہ سہی مگر صغائر سے کوئی بھی محفوظ نہیں، تو پھر ہم نہ
مہتدی ہوئے اور نہ عذاب سے مامون، اشکال کا منشا دو امر ہو سکتے ہیں خطاب نے تو یہ فرمایا ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ
علیہم اجمعین شرک کو ظلم کے نام سے نہ جانتے تھے بلکہ ان کے نزدیک ظلم کا لفظ شرک سے نیچے درجہ کے معاصی پر بولا جاتا
تھا، اسی بنا پر یہ اشکال پیش آیا کہ ہم میں سے کون شخص ایسا ہے جس سے کسی قسم کا ظلم نہ ہو اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں
کہ ظلم کا لفظ صحابہ کرام کے نزدیک بھی کفر و شرک اور معاصی سب ہی پر عام تھا اور چونکہ یہاں نگرہ سیاق نفی میں واقع
ہو رہا ہے اسلئے قانون کے مطابق اشکال پیش آنا ہی چاہئے تھا کہ کون شخص ہے جس سے کسی قسم کا ظلم نہ ہو، خطاب نے
ارشاد کے مطابق پیغمبر علیہ السلام کے جواب کا مطلب یہ ہے کہ ظلم کفر اور شرک دونوں کو اسی طرح شامل ہے جس طرح

کہ دوسرے معاصی جو ارجح کو، مگر آیت میں ظلم سے ظلم عظیم مراد ہے یعنی شرک، کیا تم نے لقمان کا قول ان الشـرک لظلم عظیم . نہیں سنا اور حافظ کے قول کے مطابق منشأ اشکال ظلم کی تعظیم تھا تو مرادی تخصیص سے اس کا ازالہ کیا گیا پھر تقدیر جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ یہاں ظلم سے ظلم عظیم مراد ہے کہ وہ شرک ہے، اب خواہ منشأ اشکال خطاب کے خیال کے مطابق ہو یا حافظ کی رائے کے مطابق، صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی پریشانی کا علاج ہو گیا۔

یہاں ایک اور اشکال یہ کیا گیا ہے کہ حدیث شریف میں صحابہ کرام کا پیش
اشکال کی آئینی حیثیت اور جواب | آمدہ اعتراض تو قانون کے تحت ہے کیونکہ ان حضرات نے نکرہ کو سیاق

میں دیکھ کر یہی معنی سمجھے لیکن پیغمبر علیہ السلام کے ارشاد کیلئے بہ ظاہر کوئی قرینہ نظر نہیں آتا، عام طور پر شارحین بخاری نے اس اشکال کا جواب یہ دیا ہے کہ لم یلبسوا ایمانہم بظلم میں ظلم کی تنوین تعظیم کے لئے ہے اور ظلم سے مراد ظلم عظیم ہے۔

حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا ارشاد گرامی | آں حضور ﷺ کے جواب کا قرینہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے
حضرت شیخ الہند نے نقل کرتے ہوئے یہ بیان فرمایا تھا کہ دراصل

صحابہ کرام کا اشکال ظلم سے متعلق ہے اور رسول اکرم ﷺ کے جواب کا تعلق ”لم یلبسوا“ سے ہے، لبس کے معنی لغتاً اختلاط کے ہیں اور معلوم ہے کہ اختلاط وہیں ممکن ہے جہاں دونوں چیزوں کا ظرف ایک ہو، اب لم یلبسوا ایمانہم بظلم کے معنی ظاہر ہیں کہ ظلم سے اعمال جو ارجح یعنی معاصی مراد نہیں ہو سکتے، کیونکہ معاصی کا محل جو ارجح ہیں اور ایمان کا محل قلب ہے تو اختلاط اور لبس کہاں؟ ہاں کفر و شرک اور ایمان کا محل ایک ہے یعنی قلب، پس اگر ایمان سے ظلم کا اختلاط ہو سکتا ہے تو اسی ظلم کا جو ظرف ایمان میں پہنچنے والا ہو اور وہ بجز کفر اور شرک کے اور کوئی نہیں، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اختلاط اور لبس دونوں کا مفہوم غیر غیر ہے، اختلاط کے معنی ہیں حقیقتہً دو چیزوں کا ملجانا، سو ضدین کا اس طرح گھل مل جانا کہ امتیاز رفع ہو جائے ناممکن ہے، برخلاف لبس کے کہ اس میں اتصال صوری ہوتا ہے حقیقی نہیں ہوتا یعنی دو چیزیں رل گئیں، سو یہ اتحاد ظرف کی صورت میں متصور ہے آیت میں لم یلبسوا فرمایا ہے لم یختلطوا نہیں فرمایا۔

حضرت الاستاذ مدظلہم نے فرمایا کہ جب حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے یہ قرینہ بیان فرمایا تو
ایک علمی لطیفہ | علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے کہا کہ یہی قرینہ علامہ تاج الدین سبکی نے ”عروس الافراح“ میں لکھا ہے،

اس توافق پر حضرت کو بڑی مسرت ہوئی۔

[۲۴] بَابُ عَلَامَاتِ الْمُنَافِقِ

(۳۳) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ أَبُو الرَّبِيعِ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ قَالَ حَدَّثَنَا

نَافِعُ بْنُ مَالِكِ بْنِ أَبِي عَامِرٍ أَبُو سُهَيْلٍ عَنْ أَبِيهِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ
آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا أَوْثَمَنَ خَانَ.

(آئندہ: ۲۶۸۲، ۲۷۳۹، ۲۰۹۵)

(۳۳) حَدَّثَنَا قَبِيصَةُ بْنُ عُقْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ مَرْوَةَ
عَنْ مَسْرُوقٍ عَنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا
خَالِصًا وَمَنْ كَانَ فِيهِ خِصْلَةٌ مِنْهُنَّ كَانَتْ فِيهِ خِصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدْعَهَا إِذَا أَتَمَنَ
خَانَ وَإِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ تَابَعَهُ شُعْبَةُ عَنِ الْأَعْمَشِ.

(آئندہ: ۲۳۵۹، ۳۱۷۸)

ترجمہ | باب، منافق کی علامتوں کا بیان۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ منافق کی تین نشانیاں ہیں جب گفتگو کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے اور جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ بالکل منافق ہوگا اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی حتیٰ کہ وہ اس سے باز آجائے جب اس کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے، جب بات کرے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے وعدہ خلافی کرے، جب کسی سے جھگڑے تو پھٹ پڑے، شعبہ نے اعمش سے اس کی متابعت کی ہے۔

ترجمہ کا مقصد | اوپر ظلم دون ظلم کا باب منعقد کر کے یہ بتلایا تھا کہ شرک، ظلم کا فردِ اعلیٰ ہے اور نفاق، کفر کا فردِ اعلیٰ، اس میں کفر باللہ کے ساتھ خداع مع المسلمین بھی شامل ہے اس لئے عام کفار کے مقابلہ میں اسکی سزا بھی سخت رکھی گئی ہے، فقال عزوجل:

ان المنافقين في الدرك الاسفل
من النار (پ ۵ ع ۱۸)

بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نیچے کے
طبقہ میں جاویں گے۔

لہذا ابواب متعلقہ بالکفر کے خاتمہ پر اس کا ذکر مناسب ہوا، رہا ترجمہ کا مقصد تو وہ وہی ہے جو ابواب سابقہ میں مذکور ہوتا چلا آ رہا ہے یعنی مرجیہ اور خارجیہ کی تردید کہ معاصی سے ایمان میں نقصان آجاتا ہے، اس سے بڑھ کر نقصان کیا ہوگا کہ ان افعالِ قبیحہ کی وجہ سے یہ شخص زمرہ منافقین میں آجاتا ہے اگرچہ یہ وہ نفاق نہیں ہے جس کی سزا ان المنافقین الایہ ہے لیکن ایمان کیساتھ ان منافقانہ افعال کا ارادہ خالی از خطرہ نہیں، پھر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کبار کے ہوتے ہوئے بھی یہ نہیں فرمایا گیا کہ ایسے شخص پر تجدید ایمان لازم ہے بلکہ ان قبائح کا چھوڑ دینا ہی اس شخص کی

نفاق سے براءت کے لئے کافی سمجھا گیا ہے تو خوارج اور معتزلہ کا دماغ بھی درست ہو گیا کہ معاصی کے ارتکاب سے نہ ایمان سے خارج ہوتا ہے اور نہ کافر ہوتا ہے، الحاصل نفاق میں بھی کفر اور ظلم کی طرح مراتب ہیں بعضہا ادنیٰ من بعض اعلیٰ مرتبہ تو نفاق اعتقادی ہے جس کا کفر ہونا محتاج بیان نہیں، باقی مراتب عملی نفاق کے ہیں پھر ان میں بھی درجات کا تفاوت ہے جیسا کہ احادیث مرویہ فی الباب سے ظاہر ہو رہا ہے پس جب اضداد میں یہ مراتب قائم اور مسلم ہیں تو ایمان میں بھی ضرور ہونے چاہئیں کما ہوا الظاہر۔

نفاق کیا ہے | نفاق کے معنی ظاہر و باطن کے اختلاف کے ہیں، لسان شرع میں منافق اسکو کہتے ہیں جس کا باطن کفر سے بھرا ہوا ہو اور ظاہر میں مسلمان بنا ہوا ہو، یہ لفظ دراصل نفاق سے لیا گیا ہے، نفاق گھونس (جسے عربی میں 'یربوع' کہتے ہیں چوہے کی طرح ایک جانور ہوتا ہے) کے بل کے دو دروازوں میں سے ایک پوشیدہ دروازے کا نام ہے، یہ گھونس بہت حیلہ باز جانور ہوتا ہے، اپنے بل کے دو دروازے بناتا ہے، ایک وہ دروازہ جس سے آتا جاتا ہے اور دوسرا دروازہ ایسا ہوتا ہے جس سے آمد و رفت کا سلسلہ نہیں ہوتا اور نہ وہ کھلا ہوتا ہے بلکہ وہاں کی زمین اس قدر نرم ہوتی ہے جو بہ وقت ضرورت اس کی ٹکر سے کھل جاتی ہے اس پوشیدہ دروازہ کا نام نفاق اور دوسرے دروازہ کا نام قاصعہ ہے، جب شکاری اس کا شکار کرنا چاہتا ہے تو یہ قاصعہ سے داخل ہو جاتا ہے شکاری اسی خیال میں رہتا ہے کہ جانور جس دروازے سے داخل ہوا ہے اسی سے باہر نکلے گا لیکن یہ نفاق سے نکل کر فرار ہو جاتا ہے، یہی حال منافق کا ہے کہ ایک راہ سے داخل ہوتا ہے اور دوسری راہ سے فرار ہو جاتا ہے۔

ایک اور وجہ مناسبت یہ بیان کی گئی ہے کہ نفاق بہ ظاہر، ہموار زمین کی طرح نظر آتا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک دروازہ ہے، منافق بھی بہ ظاہر مسلمان معلوم ہوتا ہے مگر اندرونی طور پر اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا محض دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے، منافق کا یہ لفظ اسلام کے بعد ان معنی میں استعمال کیا گیا اسلام سے پہلے یہ لفظ ان معنی میں مستعمل نہ تھا۔

نفاق کی علامتیں | حدیث شریف میں نفاق کی علامتوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، پہلی علامت اذا حدث کذب ہے یعنی جب بھی کوئی بات کہے خلاف واقعہ ہو "اذا" کا لفظ تکرار کی جانب مشیر ہے یعنی اسکی یہ طبیعت اور سبیت بن گئی ہو کہ جب بھی کوئی بات کہے اس میں جھوٹ ضرور شامل کر دے خواہ اسکا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے، لیکن کذب کے کذب ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے بیان کو خود غلط سمجھتا ہو اور اگر ایسا ہے کہ بات گو واقعہ کے اعتبار سے غلط ہے لیکن اسکی اپنی معلومات کی حد تک صحیح ہے تو وہ اس میں داخل نہیں، دوسری خصلت عہد شکنی ہے یعنی جب کسی کے ساتھ کوئی عہد و پیمانہ باندھتا ہے تو اسے نبھانیکی کوشش نہیں کرتا بلکہ ختم کر دیتا ہے، عہد و پیمانہ دونوں جانب سے کیا جاتا ہے اور وعدہ ایک جانب سے، تیسری خصلت خیانت ہے، جب بھی کوئی شخص امین سمجھ کر اسکے پاس امانت رکھتا ہے تو اس میں خیانت کرتا ہے، امانت کا تعلق صرف مال ہی سے نہیں ہے بلکہ بات اور راز بھی امانت میں

داخل ہیں، اسی طرح اگر کسی کی گری پڑی چیز کسی کے ہاتھ لگ گئی ہے تو وہ بھی امانت ہے اس میں کوئی ایسا تصرف درست نہ ہوگا جو اس کے ضیاع کا سبب بن جائے، چوتھی علامت وعدہ خلافی ہے، جب کسی سے کوئی وعدہ کرتا ہے پورا کرنا نہیں جانتا، وعدہ پورا کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وعدہ کے وقت ہی اس کے دل میں چور ہے یعنی محض رسمی وعدہ ہے پورا کرنے کا خیال نہیں تو یہ واقعہ نفاق کی علامت ہے، چنانچہ طبرانی کی روایت میں

ومن نیتہ ان لا یفیہ
اور اس کی نیت ایفاء کی نہیں

یا اس کے مقارب الفاظ موجود ہیں، لیکن اگر صورت حال یہ ہے کہ وعدہ کرتے وقت وہ اس کے ایفاء کے لئے پوری طرح تیار تھا لیکن اتفاق سے کوئی مانع پیش آ گیا اور وہ ایفاء نہ کر سکا تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں، اس سلسلہ میں ایک عام چیز لوگوں میں پیدا ہو گئی ہے کہ اگر اتفاق سے سر راہ ملاقات ہو گئی یا راہ چلتے چلتے اتفاقی طور پر آگئے تو خواہ مخواہ یہ کہا کرتے ہیں کہ اچھا پھر کسی وقت آؤں گا، حالانکہ جب زبان ان جملوں کو ادا کرتی ہے اور ذہن میں اس کا کوئی مصداق معین نہیں ہوتا الا ماشاء اللہ، یہ بات بھی وعدہ خلافی کے اندر آتی ہے بلکہ یہ اس طرح کا وعدہ ہے کہ وعدہ کرتے وقت اس کے ایفاء کا تصور ذہن کے کسی گوشہ میں نہیں، یہ ایک ایسی بات ہے جس میں عوام، طلبہ اور علماء سب ہی مبتلا ہیں، پانچویں بات گالی گلوچ پر اتر آنا ہے جہاں کسی سے ان بن ہوئی اور گالی گلوچ تک نوبت پہنچی، اس کے لئے حدیث شریف میں فجور کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنی میل عن الحق کے ہیں، حدیث شریف میں ان علامتوں کے لئے خصلت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور اسلوب بیان میں ”اذا“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اتفاقی اور احمیانی طور پر اگر کوئی چیز پیش آگئی ہے تو اسے مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے، اور نہ اسے نفاق کی علامت قرار دینگے بلکہ ان چیزوں کی عادت کو علامت نفاق قرار دیا جائے گا۔

علامت اور علت کا فرق | حدیث شریف میں ان چیزوں کو صرف علامت قرار دیا گیا ہے علت نہیں فرمایا گیا جس سے معلول کا تخلف نہیں ہوتا، اس بنا پر بعض حضرات کا یہ اشکال کہ ایسے انسان کو منافق کہا جائے درست نہیں ہے، کیونکہ یہاں صرف علامت فرمایا ہے اور ضروری نہیں کہ جہاں علامت موجود ہو وہاں اصل شے بھی پائی جائے بلکہ علامتیں مشترک بھی ہوتی ہے نبض کی سرعت بخار کی علامت ہے، مگر کبھی قوت نفس کی بنا پر ایسا ہو جاتا ہے، اسی طرح بدن کی زردی صفراء کے غلبہ کی علامت ہے مگر زردی خوف و ہراس کی بنا پر بھی ہوتی ہے، اسی طرح سیاہی سواد کے غلبہ کی علامت ہے لیکن کبھی غم و حزن بھی انسان کے چہرے کی رونق کو ختم کر دیتے ہیں، اسی طرح یہاں ان چیزوں کو نفاق کی علامت بتلایا گیا ہے یعنی ان سے نفاق کا اشتباہ ہوتا ہے، ایک مسلمان کو ان چیزوں سے احتراز لازم ہے، لیکن ان کے وجود سے نفاق کے وجود پر استدلال درست نہیں ہے، جس طرح افعال کفریہ کے ارتکاب پر کفر کا اطلاق درست نہیں اسی طرح ان علامات نفاق کو دیکھ کر کسی کے نفاق کا فیصلہ بھی نادرست ہے، اسی وجہ سے

حدیث شریف میں حتیٰ بدعہا فرمایا گیا ہے یعنی صرف چھوڑ دینا کافی ہے اگر ان علامات کے ارتکاب سے وہ منافق ہو گیا ہوتا تو حتیٰ یومن یا حتیٰ بجدد ایمانہ فرماتے لیکن صرف چھوڑ دینے ہی کو کافی فرما رہے ہیں اس کا صاف اور صریح مفہوم یہ ہے کہ وہ منافق نہیں ہو گیا ہے۔

جب یہ بات ہے کہ ان علامات سے وجود نفاق پر استدلال درست نہیں بلکہ اگر یہ مفہوم حدیث پر اشکال | باتیں کسی مسلمان کے اندر پائی جاتی ہیں تو وہ مسلمان ہی رہتا ہے پھر اربع من کن فیہ کان منافقاً خالصاً کا کیا مفہوم ہے؟ اس سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ان اعمال سے نفاق آجاتا ہے اس اشکال کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں۔

(۱) ایک جواب تو یہ ہے کہ کان منافقاً خالصاً کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ وہ شریعت اسلامیہ کی نظر میں منافق ہو گیا بلکہ ان اعمال کا مرتکب اس انسان کے اعتبار سے منافق ہے جس کے ساتھ نقض عہد کیا ہے، جس سے وعدہ خلافی کی ہے جس کی امانت میں خیانت کی ہے، اس معنی کے اعتبار سے بھی روایت اپنے مفہوم میں واضح رہتی ہے اور امام بخاری نے بھی اس سے یہی بات سمجھی ہے کیونکہ وہ یہاں نفاق اصطلاحی کو بیان نہیں فرما رہے ہیں بلکہ وہ ایمان میں کمی و زیادتی کے اثبات کی غرض سے کفر اور ظلم میں کمی و بیشی کا اثبات کر چکے ہیں اور اسی طرح اب نفاق میں بھی اس کا اثبات چاہتے ہیں تاکہ نفاق کے اندر درجات کے اثبات سے ایمان میں بھی درجات کا اثبات کیا جائے۔

(۲) خطاب نے یہ جواب دیا ہے کہ آن حضور ﷺ کا یہ ارشاد محض تحذیر کے لئے ہے تاکہ مومنین کو ان بری خصلتوں سے بچایا جائے اور اس ارشاد کا یہ مطلب ہے کہ ان چیزوں سے اجتناب ضروری ہے کیونکہ یہ نفاق کی علامتیں ہیں جو نفاق تک لیجا سکتی ہیں۔

(۳) بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ نفاق کی دو صورتیں ہیں، ایک عرفی اور ایک شرعی، نفاق شرعی تو معلوم ہے کہ باطن میں نفاق کو چھپائے ہوئے ہے اور زبان و عمل سے ایمان دکھلانا چاہتا ہے اور نفاق عرفی کا مفہوم ہے کہ ایمان کے علی الرغم ایسے کام کر رہا ہے جو نہ کرنیکے تھے، حدیث شریف میں نفاق عرفی ہی کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے، گویا منافق فی العقیدہ کافر اور منافق فی العمل فاسق ہے۔

(۴) چوتھی بات یہ ہے کہ حدیث شریف میں بیان کئے گئے لفظ آية المنافق میں دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ ”الف لام“ جنس کے لئے لیا جائے، یا عہد کے لئے لیا جائے، اور دونوں صورتیں درست ہیں اگر ”الف لام“ کو جنس کے لئے لیں تو ان علامتوں کو تشبیہ کے لئے لیا جائے گا یعنی مفہوم یہ ہے کہ ان چیزوں کے ارتکاب سے منافقین کے ساتھ مشابہت ہو جاتی ہے، ان چیزوں سے مومن کو بچنا چاہئے تاکہ لوگ اس کے ایمان کے بارے میں مطمئن رہیں اور اسے اشتباہ کی نظر سے نہ دیکھیں اور اگر ”الف لام“ عہد کے لئے ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں کہ مہود کوئی خاص فرد ہو یا

خاص جماعت، بعض حضرات کا خیال ہے کہ معبود فرد واحد ہے، پیغمبر علیہ السلام کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ جب کسی انسان کا حال بیان فرمانا منظور ہوتا اور اس کا یہ حال کسی عیب یا برائی کی وجہ سے اس کے لئے وجہ ایذا بن سکتا تو آپ مواجہہ نہ فرماتے تھے بلکہ اس مواجہہ کو اخلاق کریمانہ کے خلاف سمجھتے تھے، اور صورت حال کی اصلاح کے لئے اس چیز کو اوصاف کے رنگ میں ڈھال دیتے تاکہ صاحب واقعہ کی اصلاح کے ساتھ ساتھ اس ارشاد کو زندگی کے لئے لائحہ عمل بھی بنایا جاسکے چنانچہ آپ ایسی صورت میں ما بال اقوام یفعلون کذا فرماتے تھے، بس یہی بات یہاں بھی پیش آئی کہ ایک شخص کی اصلاح کے لئے آپ نے ایسا فرمایا، دوسری صورت یہ ہے کہ اس سے کوئی مخصوص جماعت مراد لی جائے، چنانچہ عطاء بن ابی رباح، ابن عمر، ابن عباس، سعید بن جبیر رضی اللہ عنہم اور حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہی ارشاد ہے کہ اس سے وہ منافقین مراد ہیں جو آپ کے دور نبوت میں تھے، چنانچہ منقول ہے کہ کسی نے حضرت عطاء کے سامنے حضرت حسن بصری کا یہ ارشاد نقل کیا۔

جس میں یہ تین خصلتیں ہوں میں اسے منافق کہنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا جب بات کرے جھوٹ بولے جب وعدہ کرے خلاف کرے جب امانت رکھی جائے خیانت کرے۔

من كان فيه ثلاث خصال لم اخرج ان اقول انه منافق اذا حدث كذب واذا وعد اخلف واذا ائمن خان (یعنی جلد ۱ ص ۲۵۸)

یہ سنکر حضرت عطاء نے فرمایا کہ حسن سے یہ کہنا کہ عطاء نے سلام کہا ہے اور یہ کہا ہے کہ اخوت یوسف کا معاملہ یاد فرمائیے اور یہ بھی کہ نفاق کا لفظ اس انسان پر راست آسکتا ہے جس کے دل میں ایمان نہ رہا ہو کیونکہ خداوند قدوس نے منافقین کے بارے میں۔

ذلك بانهم امنوا ثم كفروا
یہ اس لئے کہ وہ ایمان لائے پھر کفر اختیار کیا۔

فرمایا ہے، اس میں صراحت کے ساتھ منافقین کے قلوب سے اسلام کے زوال کی اطلاع دی گئی ہے چنانچہ اس نے حضرت حسن سے یہ بات کہی، اس پر حضرت حسن نے اپنے تلامذہ سے فرمایا کہ اگر کوئی عالم میری بات کو نادرست قرار دے تو تم مجھے اس کا جواب بتلا دیا کرو، روایت کتنی ہی کمزور سہی لیکن معلوم ہوا کہ حضرت حسن نے جو ان علامات کے بعد لفظ نفاق کے اطلاق میں کوئی حرج نہ سمجھتے تھے اپنے قول سے رجوع فرمایا۔

حضرت سعید بن جبیر سے روایت ہے کہ انہیں اس حدیث کے بارے میں کچھ اشکال پیش آیا اور انہوں نے حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے ذکر کیا، دونوں نے فرمایا کہ ہمیں بھی یہی اشکال ہوا تھا، ہم نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا، آپ نے فرمایا کہ اس کا تم سے کیا تعلق؟ میری مراد تو منافقین سے تھی، اذا حدث كذب کا اشارہ

ااخوت یوسف کے معاملہ کی تفصیل اور ان کے اس عمل کی حقیقی توجیہ اسی جلد میں عصمت انبیاء کے ذیل میں گذر چکی ہے۔ ۱۲ مرتب

آیت اذا جاءك المنافقون الآیہ کی جانب ہے کیا تم اپنے آپ کو ایسا سمجھتے ہو؟ ہم نے عرض کیا نہیں اور اذا وعد اخلف کا اشارہ آیت منهم من عاهد الله لئن آتانا من فضله کی طرف تھا، کیا تم اپنے آپ کو ایسا سمجھتے ہو؟ ہم نے عرض کیا نہیں اور اذا اؤتمن خان کا اشارہ آیت انا عرضنا الامانة الایة کی جانب تھا، کیا تم اپنے آپ کو ایسا سمجھتے ہو؟ ہم نے عرض کیا نہیں، آپ نے فرمایا

تم سے اس کا کوئی واسطہ نہیں، تم اس سے
بری ہو۔

لا علیکم انتم من ذلك براء

(یعنی جلد اس ۲۵۹)

بہر کیف اتنی بات متفق علیہ ہے کہ ان خصائل کے اختیار سے مومن، منافق نہیں بن جاتا بلکہ وہ مومن ہی رہتا ہے اور یہ چیزیں صرف علامتیں ہیں اور علامتوں کے وجود سے معلم علیہ کا وجود ضروری نہیں اور حدیث کے مختلف معنی بن سکتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہ کی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ نفاق کی تین علامتیں ہیں اور اسلوب
علامات نفاق کی تعداد بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ علامات نفاق کا انحصار بھی تین ہی میں ہے لیکن دوسری
حضرت عبداللہ بن عمرو کی روایت سے معلوم ہو رہا ہے کہ نفاق کی چار علامتیں ہیں، ان چار میں دو علامتیں اور زائد ہیں، اسلئے یہ ظاہر یہ روایت اسکے معارض ہے لیکن غور کیا جائے تو یہ کوئی تعارض نہیں ہے، اس کے جواب میں علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے آں حضور ﷺ کے علم میں پہلے یہی تین خصلتیں ہوں اور بعد میں کچھ اور خصلتیں معلوم ہوئی ہوں اور دوسری حدیث میں ان کو بھی ذکر فرمایا ہو، دوسرے بعض علماء نے دونوں روایات کو اس طرح جمع فرمایا ہے کہ اگر دونوں روایتوں کی علامتوں کو ملا یا جائے تو کل علامتیں پانچ ہو جاتی ہیں، دروغ بیانی، خیانت، وعدہ خلافی، عہد شکنی اور فجور، یعنی تجاوز عن الحد، دروغ بیانی اور خیانت تو دونوں روایتوں میں موجود ہیں لیکن وعدہ خلافی صرف پہلی میں اور عہد شکنی اور فجور صرف دوسری روایت میں مذکور ہیں۔

اور اگر غور کیا جائے تو ان پانچوں کو تین ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے، کیونکہ وعدہ خلافی اور عہد شکنی میں مصداق کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، اسی طرح فجور بھی جو میل عن الحق سے تعبیر ہے دروغ بیانی کے تحت آسکتا ہے کیونکہ فجور آپ سے باہر ہونیکلی اور جھگڑے کے وقت گالیوں پر اتر آئیگی تعبیر ہے، ایسی صورت میں صرف تین ہی خصلتیں باقی رہ جاتی ہیں، اور تیسری اور آخری بات یہ ہے کہ مقصود حصر نہیں ہے بلکہ عمومی طور پر منافقین کی تین ہی خصلتیں ذکر کی گئی ہیں اب اگر کسی دوسری روایت میں کوئی اور بھی خصلت ذکر کی جاتی ہے تو وہ اس سے متعارض یا مخالف نہیں ہے اور اگر مسلم کی روایت سامنے ہو تو یہ بات بالکل بے غبار ہو کر سامنے آ جاتی ہے کیونکہ وہاں، من آية المنافق ثلاث فرمایا گیا۔

تین علامات میں انحصار کی وجہ علامہ عینی نے ان علامتوں پر انحصار کے سلسلہ میں بہت عمدہ بات تحریر فرمائی ہے کہ مومن کے ایمان کی تمامیت اور کمال اس کے قول، فعل اور نیت پر موقوف ہے، اب اگر ان تینوں میں سے کسی ایک میں بھی نقصان یا کمزوری ہے تو یہ اس کے نفاق کی دلیل ہے، علامات نفاق میں۔ اذا حدث کذب سے فساد قول، اور اذا ائمن خان سے فساد عمل اور اذا وعد اخلف سے فساد نیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے، پہلی دو باتیں تو بالکل واضح ہیں تیسری علامت سے فساد نیت پر استدلال اس طرح ہے کہ وعدہ خلافی وہی معیوب ہے جس میں وعدہ کرتے وقت یہ نیت کر لی گئی ہو کہ اسے پورا کرنا نہیں ہے اور اگر پورا کرنے کی نیت اور کوشش کے باوجود ناکامی رہی تو اس میں کوئی برائی اور قباحت نہیں، معلوم ہوا کہ اذا وعد اخلف سے فساد نیت کی جانب اشارہ منظور ہے، علامہ عینی رحمہ اللہ علیہ کا یہ ارشاد آب زہر سے لکھنے کے قابل ہے۔

[۲۵] بَابُ قِيَامِ لَيْلَةِ الْقَدْرِ مِنَ الْإِيمَانِ

(۳۵) حَدَّثَنَا أَبُو الْيَمَانِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ يَقُمْ لَيْلَةَ الْقَدْرِ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ .

(آئندہ: ۳۷، ۳۸، ۱۹۰۱، ۲۰۰۸، ۲۰۰۹، ۲۰۱۲)

ترجمہ باب، شب قدر کا قیام ایمان سے ہے، حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ شب قدر میں قیام کریگا اس کے سابق گناہوں کی مغفرت ہو جائے گی۔

باب سابق سے ربط استطرادی طور پر جن ابواب کا درمیان میں ذکر فرمایا تھا ان سے فراغت ہو گئی، اب اصل مقصد کی طرف عود ہے، مقصد ہے ایمان کے متعلقات اور اجزاء کا ذکر، تاکہ فرق باطلہ خصوصاً مرجیہ، کرامیہ نیز خوارج وغیرہ کے عقائد اور خیالات کا بطلان پورے طور پر محقق ہو جائے، اسی سلسلہ میں کفر سے متعلق چند ابواب کا ذکر فرمایا، سابق ابواب میں ایمانیات سے متعلق آخری بات باب افشاء السلام تھا، اب باب قیام لیلۃ القدر کا ربط باب افشاء السلام سے یہ سمجھئے کہ شب قدر میں فرشتے سلام کی اشاعت کرتے ہیں، روایت میں ہے کہ جبریل امین فرشتوں کے ایک لشکر کے ساتھ شب قدر میں نزول کرتے ہیں اور جس شخص کو نماز، تلاوت ذکر و شغل وغیرہ میں مصروف پاتے ہیں اسے سلام کرتے ہیں اور یہ سلسلہ صبح تک برابر جاری رہتا ہے، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

سلام ہی حتی مطلع الفجر (پ ۳۰ ع ۲۲) سراپا سلام ہے وہم شب طلوع فجر تک رہتی ہے۔

اور اگر باب سابق یعنی باب علامات المنافق سے ربط تلاش کرنا چاہیں تو دو صورتیں ہیں کہ وہاں ایسے

اعمال کا ذکر تھا جن سے نفاق کا اندازہ ہوتا ہے اب ایسی علامتوں کا ذکر ہے جن سے ایمان و اخلاص کا پتہ چلتا ہے، دوسری بات یہ کہ لیلۃ القدر کا معاملہ بڑی محنت و مشقت کا ہے، یہ کام وہی شخص کرے گا جس کے دل میں اخلاص تام ہو، اور جسے دین سے بے پناہ تعلق اور لگاؤ ہو، منافق کو اس سے کیا سروکار اور اسے لیلۃ القدر کی قدر و قیمت کا کیا اندازہ۔

ظاہری الفاظ کا ترجمہ ”قدر کی رات“ قدر اگر تقدیر سے ہے تو اس رات سے وہ رات مراد ہے

لیلۃ القدر کیا ہے | جس میں فرشتوں کو اس سال سے متعلق تقذیرات کا علم دیا جاتا ہے، یعنی اس سال جو حوادث پیش آئیوں گے ہیں، کسی کی موت، کسی کی زندگی، کسی کا عروج، کسی کا زوال، کسی کا عیش، کسی کا فقر وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں فرشتوں کو اس رات میں بتلا دی جاتی ہیں، دوسرے معنی قدر کے عزت ہیں یعنی عزت کی رات، یہ عزت رات سے بھی متعلق ہو سکتی ہے یعنی جو رات تمام راتوں میں خاص امتیاز اور وزن رکھتی ہے اور عابدین سے بھی یہ عزت متعلق ہو سکتی ہے یعنی اس رات میں کی گئی عبادت دوسری راتوں کے مقابلہ پر بڑی قدر و منزلت رکھتی ہے، یہ رات قدر و منزلت کی رات ہے۔

ایمان و احتساب | لفظ ایمان میں اس پر تشبیہ ہے کہ اس رات کا احیاء ایمانی تقاضے کے ماتحت ہو کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ مقتضیات ایمانی خواہ وہ از قبیل نوافل ہی کیوں نہ ہوں ایمان میں شمار ہوتے ہیں تو ان کی رعایت سے یقیناً ایمان کی ترقی ہوگی اور جس کے ایمان میں اس قسم کے تقاضے شامل نہ ہوں گے اس کا ایمان کمزور ہوگا۔ و ہذا ہوا المدعی

علامہ کشمیری کا ارشاد | آگے احتساب کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں نیت کا استحضار یعنی احتساب اصل نیت سے زائد علم العلم کا درجہ ہے، جس کا بہ وقت عمل استحضار اجر میں ترقی کا باعث ہوتا ہے ورنہ اختیاری افعال کیلئے جس درجہ کی نیت درکار ہے تحصیل اجر کیلئے وہ بھی کافی ہے، ایک شخص جاگ رہا ہے اور عمل خیر میں مشغول ہے تو یقیناً یہ بڑی سعادت ہے، لیکن اگر اسی احیاء لیل کے ساتھ نیت کا استحضار بھی ہو جائے تو درجات ثواب میں بہت زیادتی ہو جاتی ہے، حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ شریعت میں احتساب کا لفظ مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے لیکن ان سب میں نیت کا استحضار قدر مشترک ہے، بعض اعمال ایسے ہیں جن میں صرف نیت کا ذکر ہے اور بعض کے ساتھ صرف ایمان کا اور بعض اعمال ایسے ہیں جنہیں ایمان و احتساب دونوں کا ذکر فرمایا گیا ہے، فرماتے تھے کہ احادیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ احتساب کا لفظ یا تو ایسے اعمال کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جہاں وہ عمل خیر خود بڑی مشقت کا عمل ہو اور اس لحاظ سے کہ اعمال خیر میں جس قدر مشقت ہوتی ہے اسی قدر اس کا اجر بھی زیادہ ہوتا ہے، اجر کم علی قدر نصیبکم حضور کا ارشاد ہے، بسا اوقات ایسے موقع پر نیت کے استحضار سے ذہول ہو جاتا ہے اور اس ذہول میں عامل کا نقصان ہے، لہذا احتساب کا لفظ بڑھا کر اس کی طرف توجہ مبذول کرنی چاہی ہے تاکہ

استحضار نیت کیساتھ اجر میں مزید ترقی ہو، اسی طرح احتساب کا لفظ ایسے موقع پر بھی ذکر کیا گیا ہے جہاں انسان اپنے آپکو بیدست و پادیکھتا ہو اور اس کو اپنے حدود و اختیار سے باہر سمجھتا ہو کہ وہاں اجر کا خیال تک نہیں ہوتا، کیونکہ اجر کا تعلق تو اختیاری امور سے ہوتا ہے جس کا انسان مکلف ہے، لہذا شریعت ایسے مواقع پر اس کو یہ بتاتی ہے کہ یہ چیز اگرچہ غیر اختیاری ہے مگر اس میں بھی مزید اجر حاصل کرنے کا ایک پہلو موجود ہے اور وہ ہے استشعار قلب اور استحضار نیت۔

مثلاً یہ شب قدر کا معاملہ ہے یہ اپنی دشوری اور مشقت کے اعتبار سے مستقل ثواب کا کام ہے لیکن اگر اس میں احیاء لیل کی نیت بھی شامل ہو جائے تو ثواب بڑھ جائیگا، اسی مقصد کیلئے یہاں لفظ احتساب بڑھایا گیا ہے تاکہ استحضار نیت کی جانب توجہ دلائی جائے، مشقتوں کے مواقع پر اس لئے بھی لفظ احتساب لاتے ہیں کہ طبیعت اسکی جانب بڑھتے ہوئے ہچکچاتی ہے، انسان پیچھے ہٹنا چاہتا ہے، احتساب کا لفظ بڑھا کر تشویق کا کام لیتے ہیں اور بعض اعمال ایسے ہیں کہ جنہیں انسان اپنی طبیعت کے تقاضے سے کرتا ہے اور انہیں رسمی اور رواجی سمجھتا ہے ان اعمال کے بارے میں اسکو اجر و ثواب کا خطرہ بھی نہیں ہوتا جیسے بیوی اور بچوں پر خرچ کرنا چونکہ ایسے مواقع پر انسان نیت سے محروم رہ جاتا ہے لہذا شریعت احتساب کا لفظ بڑھا کر اس جانب متوجہ کرتی ہے کہ یہی عمل اگر اس نیت سے کیا جائے کہ شریعت نے مجھے حسن معاشرت اور خدمت اہل و عیال کا مکلف بنایا ہے اور میں سب کچھ اسی غرض سے کر رہا ہوں اور اسی نیت سے بیوی کے منہ میں لقمہ دیتا ہوں تو یہ معاملہ بھی خالص دینی بن گیا اور ترقی درجات کا ایک اور آسان راستہ ہاتھ آ گیا اور جیسا کہ جنازہ مسلم کے ساتھ چلنے میں احتساب کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کیونکہ انسان سمجھتا ہے کہ موت و حیات تکوینی امور ہیں اور اس سلسلہ میں رسمی طور پر جو اعمال ہوتے ہیں مثلاً مبارکباد یا تعزیت کہ وہ دنیا سازی کا ایک طریق ہے اس کا اجر سے کیا تعلق؟ اس میں میت کے ساتھ قبرستان جانا بھی شامل ہے کیونکہ عموماً یہ خیال ہوتا ہے کہ موت و حیات کا سلسلہ تو لگا رہتا ہے اگر ہم دوسروں کی میت میں شرکت کریں گے تو ہمارے یہاں بھی لوگ شریک ہوں گے اور اگر ہم نہیں جائیں گے تو ہمارے یہاں بھی کوئی نہیں آئے گا اور اس مصیبت میں کام دشوار سے دشوار تر ہو جائے گا، لہذا بلفظ احتساب توجہ دلائی جا رہی ہے کہ محض اس کو رسمی سمجھ کر مت کرو بلکہ قضائے حق مسلم کی نیت سے یہ کام کرو تاکہ یہ کام تمہارے حق میں باعث اجر بن جائے۔

مقصد اس باب کا بھی وہی مرجیہ و کرامیہ کی تردید ہے کہ تم نے اعمال کو ایمان سے بالکل بے تعلق بتلایا تھا حالانکہ ہم قدم قدم پر اعمال کی ضرورت کا احساس کرتے ہیں حتیٰ کہ قیام لیلۃ القدر کی تاکید کی جا رہی ہے کہ یہ کام ہر شخص کے بس کا نہیں کیونکہ پورے سال میں دائر ہے، روایات سے گور رمضان کے عشرہ آخر کی طاق راتوں میں ستائیس کی تائید ہو رہی ہے لیکن روایات مختلف ہیں اس لئے بہتر دشوار کام ہے اور اسی وجہ سے تشویق کی غرض سے احتساب کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔

[۲۶] بَابُ الْجِهَادِ مِنَ الْإِيمَانِ

(۳۶) حَدَّثَنَا حَرَمِيُّ بْنُ حَفْصٍ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ حَدَّثَنَا عُمَارَةُ حَدَّثَنَا أَبُو زُرْعَةَ بْنُ عَمْرٍو قَالَ سَمِعْتُ أَبَا هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ انْتَدَبَ اللَّهُ لِمَنْ خَرَجَ فِي سَبِيلِهِ لَا يُخْرِجُهُ إِلَّا إِيْمَانًا بِي وَتَصَدِيقًا بِرُسُلِي أَنْ أُرْجِعَهُ بِمَا نَالَ مِنْ أَجْرٍ أَوْ غَنِيمَةٍ أَوْ أُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ وَلَوْ لَا أَنْ أَشُقَّ عَلَيَّ أُمَّتِي مَا قَعَدْتُ خَلْفَ سَرِيَّةٍ وَلَوْ دِدْتُ أَنْ أُقْتَلَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ أُحْيَى ثُمَّ أُقْتَلَ ثُمَّ أُحْيَى ثُمَّ أُقْتَلَ .

(آئندہ: ۲۷۸۷، ۲۷۹۷، ۲۹۷۲، ۳۱۲۳، ۴۲۲۶، ۴۲۲۷، ۴۳۵۷، ۴۴۶۳)

ترجمہ | باب، (بیان میں اس امر کے کہ دین کو بالا کرنے کی غرض سے) کافروں سے جہاد کرنا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے اس شخص کا ذمہ لیا ہے جو اسکے راستہ میں جہاد کیلئے نکلے اور اسکا یہ نکلنا محض اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کے پیغمبروں پر تصدیق کی بنا پر ہو کہ اس کو اجر و غنیمت دیکر واپس لوٹا دے یا اسکو جنت میں داخل کر دے اور اگر میں اپنی امت کو مشقت میں نہ ڈالتا تو کسی سر یہ کا ساتھ نہ چھوڑتا اور مجھے یہ مرغوب ہے کہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہو جاؤں۔

باب سابق سے ربط | ابھی ابھی شب قدر کا بیان تھا اور اس سے اگلا باب قیام رمضان سے متعلق ہے دونوں میں گہری مناسبت تھی لیکن امام بخاری نے درمیان میں جہاد سے متعلق ایک اور باب قائم فرمادیا، لوگوں کو اس ترتیب پر اشکال بھی پیش آیا لیکن صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ جہاد دو قسم کے ہیں ایک جہاد مع النفس اور دوسرا جہاد مع الکفار، اور ظاہر ہے کہ جہاد مع الکفار جہاد مع النفس پر موقوف ہے، پہلے اپنے نفس سے جہاد کر کے اسے فرمان الہی کے تابع بنا لو، پھر حقیقی معنی میں جہاد مع الکفار کر سکو گے، کیونکہ جہاد مع الکفار کا مقصد اصلاح ہے خونریزی نہیں، مجاہد فی سبیل اللہ وہی کہلائے گا جس کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہو، اس کی نیت میں نہ خونریزی ہو نہ انتقامی آگ بھڑک رہی ہو، نہ عصبیت کا خیال ہو، نہ مال و زر کا لالچ ہو، نہ عورتوں کی طمع دامنگیر ہو۔ اور یہ تمام اندیشے جب ہی ختم ہو سکتے ہیں کہ انسان اپنے سب سے بڑے دشمن نفس کو عبادات کے ذریعہ مرتاض بنا لے، دیکھئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جہاد مع الکفار کے فضائل سن کر پیغمبر علیہ السلام سے جہاد کی اجازت طلب کرتے ہیں لیکن ان کو اجازت نہیں دی جاتی اور یہ فرمایا جاتا ہے کہ ابھی نہیں، پہلے اپنے نفس کو مرتاض بنا لو، نمازیں پڑھو، زکوٰۃ دو اور اس کو جہاد فی سبیل اللہ کا وسیلہ بناؤ، اس کے بعد جہاد مع الکفار کی اجازت دی جائے گی، ارشاد فرماتے ہیں۔

کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا کہ ان کو یہ کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو تھامے رہو اور نمازوں کی پابندی رکھو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔

الم تر الى الذين قيل لهم كفوا ايديكم واقموا الصلوة واتوا الزكوة (پ ۸۵ع)

اور

يا ايها الذين آمنوا اتقوا الله وابتغوا اليه الوسيلة وجاهدوا في سبيله (پ ۱۰ع ۱۰)
اے ایمان والو! اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور خدائے تعالیٰ کا قرب ڈھونڈو اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا کرو۔
قیام لیلۃ القدر میں جہاد مع النفس کا ذکر تھا اور اس باب میں جہاد مع الکفار کا ذکر ہے، اور جہاد کی جہاد سے مناسبت ظاہر ہے۔

حل لغات | الانتداب تین معانی میں مستعمل ہے، مسارعت، اجابت، تکفل، یعنی ذمہ داری میں لینا، یہاں یہی تیسرے معنی مراد ہیں جیسا کہ دوسری روایت میں تکفل کا لفظ موجود ہے ارجع رجع يرجع ضرب يضرب سے ہے، اگر اس کا مصدر رجعا ہو تو یہ متعدی ہے اس کے معنی لوٹنا ہیں اور رجوعا ہو تو لازم ہے، اس کا ترجمہ لوٹنا ہے، ایک روایت میں ارجع بضم الہمزہ آیا ہے، یعنی باب افعال سے۔

مفہوم حدیث | حدیث بتلا رہی ہے کہ مجاہد فی سبیل اللہ وہ ہے جس کا خروج محض ایمان باللہ اور تصدیق بالرسول کے نتیجے میں ہو، ارشاد ہے مجاہد فی سبیل اللہ کے لئے خداوند قدوس نے دو چیزوں کی ذمہ داری لی ہے اگر شہادت حاصل ہوگئی تو سیدھا جنت میں گیا، روایات سے ثابت ہے کہ شہید حور کی گود میں گرتا ہے، اس سے حساب و کتاب کچھ نہیں ہے اور نہ اس کا دخول فی الجنۃ یوم جزاء پر موقوف ہے، یہ تو دن بھر جنت کی سیر کرتا ہے اور جنت کے میوے کھاتا ہے اور رات کو عرش سے معلق قندیلوں میں بسیرا کرتا ہے، اور اگر شہادت کا منصب عظیم حاصل نہ ہو سکا بلکہ سلامتی کے ساتھ گھر واپس ہو گیا تو اس کی دو صورتیں ہیں یا ظاہری و باطنی دونوں قسم کی نعمتوں سے نالا مال ہوگا، یعنی دنیا کی متاع اور آخرت کا اجر، یہ تو اس صورت میں ہوگا جب کہ غنیمت حاصل ہوئی ہو، اور اگر غنیمت حاصل نہ ہو تو اجر تام کے ساتھ واپس ہوگا بما نال من اجر او غنیمۃ کی اصل عبارت یوں ہے ان ارجعه بما نال من اجر فقط او اجر مع غنیمۃ کیونکہ اجر و غنیمت دونوں جمع ہو سکتے ہیں، اور یہ ممکن نہیں کہ کوئی بھی چیز نہ ملے، چونکہ اجر، اجر میں تکرار ہو رہا تھا اس لئے فہم سامع پر اعتماد کرتے ہوئے معطوف سے لفظ اجر کو حذف کر دیا اور ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں، کلام بلغاء میں اس کا عمل عام طور پر ہوتا رہتا ہے، اس روایت میں دو جگہ لفظ او آیا ہے۔ سو پہلا ”او“ یعنی اجر و غنیمت کے مابین مانعہ الخلو کے لئے ہے یعنی اجر اور غنیمت دونوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ مجاہد فی سبیل اللہ دونوں سے محروم رہے، اور دوسرا ”او“ یعنی جو ”او ادخلہ الجنة“ میں ہے انفصال کے لئے ہے کہ یہ دونوں نہ جمع

ہو سکتے ہیں اور نہ مرفوع ہو سکتے ہیں۔

آگے ارشاد فرما رہے ہیں کہ اگر مجھے اس بات کا ڈر نہ ہوتا کہ میں ہر موقعہ پر شریک غزوہ ہو کر امت کے لئے ایک مشقت پیدا کر دوں گا تو کسی غزوہ یا سر یہ سے پیچھے نہ رہتا، یعنی جہاد کی بڑی فضیلت ہے لیکن یہ امر مانع ہے کہ اگر شریک ہوتا ہوں تو وہ لوگ جو بالکل بے سہارا ہیں، نہ اس کے پاس اسلحہ ہیں اور نہ اتنا مال ہے کہ اسلحہ خرید سکیں اور نہ اس وقت بیت المال میں اتنی گنجائش ہے کہ ان کے لئے اسلحہ مہیا کر سکے اور دل میں جہاد کی تڑپ رکھتے ہیں جب یہ دیکھیں گے کہ پیغمبر تو جہاد کے میدان میں موجود ہیں اور ہم گھر میں پڑے ہیں تو ان پر کیا گزرے گی اور انہیں گھروں میں کس طرح قرار آئے گا، لہذا ان کی خاطر میں بھی ہر سر یہ کے ساتھ جہاد میں شرکت نہیں کرتا تاکہ میں ان کے لئے سہارا بنار ہوں۔

یہاں بعض حضرات کو یہ اشکال پیش آیا ہے کہ پیغمبر تو پیغمبر ہیں، ان کا درجہ ہر حال میں شہید سے بہت اونچا ہے، شہید ستر بار بھی قربان ہو تو نبوت کے مقام پر نہیں پہنچ سکتا بلکہ

درجہ نبوت و شہادت

شہادت تو تیسرا درجہ ہے، قرآن کریم میں دوسرا درجہ صدیقین کو دیا گیا ہے ارشاد ہے من النبیین والصدیقین والشهداء اسلئے یہ درست نہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے تمنائے شہادت کا اظہار فرمایا بلکہ یہ تمنا حضرت ابو ہریرہؓ نے ظاہر فرمائی ہے جیسا کہ ترمذی شریف کی ایک روایت سے اس کی تائید ہو رہی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ جی چاہتا ہے بار بار زندگی ملے اور قتال کروں، لیکن بیشک یہ تمنا حضرت ابو ہریرہؓ کے مناسب حال ہے لیکن روایات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے اور اس تمنا کی راہ سے امت کو بتلانا چاہتے ہیں کہ شہادت کا مرتبہ بہت بلند ہے اور جب پیغمبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تمنائے شہادت کے بارے میں یہ حال ہے تو امت کا کیا ہونا چاہئے، تمہیں تو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے، تمہاری جان اللہ کی خریدی ہوئی ہے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰ مِنْ الْمُؤْمِنِيْنَ

جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے۔

اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ (پ ۱۱ ع ۳۶)

نیز یہ کہ پیغمبر کے درجات بلند اور بہت بلند ہیں لیکن شہادت کا درجہ بھی اپنی بلندی کے اعتبار سے اور درجات پر فائق ہے، اگر پیغمبر علیہ السلام بھی اس درجہ کی تمنا کریں تو کوئی استبعاد نہیں۔

”سر الشہادتین“ میں حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے لکھا ہے کہ شہادت ظاہری، شان پیغمبری کے خلاف تھی اسلئے زہر سے شہادت باطنی کا درجہ دیا گیا اور شہادت ظاہری کی تکمیل حضرت حسینؑ سے کرادی گئی، حضرت ابو ہریرہؓ کا قول قرار دینے کی ضرورت نہیں۔

حدیث باب میں اجر کی مقدار نہیں بتلائی گئی، ابوداؤد میں روایت آئی ہے کہ اگر مجاہد فی سبیل اللہ کو غنیمت مقدار اجر ملی اور وہ واپس آ گیا تو اسے دو ملٹ اجر مل گیا اور ایک ملٹ یوم جزا کیلئے محفوظ ہے اور اگر غنیمت نہیں ملی

مقدار اجر

تو اس کا پورا اجر محفوظ رہیگا، ابوداؤد کی روایت کو دیکھ کر بظاہر تعارض کا شبہ ہوتا ہے کیونکہ یہاں بظاہر غنیمت اور اس کے ساتھ پورا اجر سمجھ میں آتا ہے اور ابوداؤد کی روایت سے دو ٹوٹا اجر کا دنیا ہی میں مل جانا معلوم ہوتا ہے، اغلب یہی ہے کہ ابوداؤد کی روایت صحیح ہے کیونکہ یہاں تو صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ کسی صورت ناکامی نہیں، شہادت ہے تو منصب عظیم ملا، سلامتی ہے تو اجر و غنیمت دونوں ہاتھ آئے یا غنیمت نہیں ملی تو اجر آخرت محفوظ ہے، اسی کو قرآن کریم میں۔

هل تر بصون بنا الا احد
الحسنین (پ ۱۰ ع ۱۳۶)

تم تو ہمارے حق میں دو بہتریوں میں سے
ایک کے منتظر رہتے ہو۔

فرمایا گیا ہے، اب یہ کہنا کہ اس حدیث سے اجر کامل کا تبادلہ ہوتا ہے درست نہیں ہے کیونکہ جب سلامتی کے ساتھ غنیمت لیکر واپس ہو رہا ہے تو غنیمت کے حصہ کا اجر کم ہو ہی جانا چاہئے۔

کیا تمنائے قتال تمنائے کفر ہے | اس موقع پر بعض حضرات کو یہ اشکال پیش آیا ہے کہ زندگی بھر قتال کرتے رہنے کی تمنا کا مفہوم تو یہ ہے کہ دنیا سے کفر کا سلسلہ منقطع نہ ہو بلکہ ہزاروں جانوں کے قربان کر دینے کی تمنا کا مطلب تو یہ ہے کہ سلسلہ کفر بقائے عالم تک رہے تاکہ جہاد کیا جاسکے، ورنہ شہادت کس طرح حاصل ہوگی مگر ظاہر ہے کہ یہ اشکال بے معنی ہے، کیونکہ بار بار زندگی عطا کئے جانے کی تمنا ایک ایسی تمنا ہے جو ہونیوالی نہیں ہے اور یہ اسلوب ایک مقصد حسن کے لئے اختیار کیا گیا ہے، یعنی جہاد اور شرف جہاد کا حصول ایسی چیزیں ہیں کہ اگر ہزار جانیں بھی ملیں تو سب کو قربان کر دینا چاہئے، یہاں کفر کی تمنا سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور اتنی بات بھی معلوم ہے کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا، ارشاد ہے۔

الجهاد ماض الی یوم القیامہ (ابوداؤد جلد ۱ ص ۳۵۰) | جہاد قیامت کے دن تک جاری رہے گا۔
اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر بھی ہر دور میں رہے گا، اور جب کفر رہے گا تو سلسلہ جہاد منقطع نہ ہوگا۔

[۲۷] بَابُ تَطَوُّعِ قِيَامِ رَمَضَانَ مِنَ الْاِيْمَانِ

(۳۷) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ
عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ
مِنْ ذَنْبِهِ.

(گذشتہ: ۳۵)

ترجمہ | باب، قیام رمضان کا تطوع بھی ایمان سے متعلق ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا جو شخص رمضان کی راتوں میں ایمان کے تقاضے سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے قیام کرتا ہے اس کے سابق گناہوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔

مقصد ترجمہ | امام بخاریؒ مرجیہ کے مقابل ایمان میں اعمال کی ضرورت کا اثبات فرماتے آرہے ہیں، یہاں پہنچ کر تطوع کے لفظ سے یہ تشبیہ مقصود ہے کہ ضرورت اور جزئیت کی بات صرف فرائض ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ نوافل بھی بدرجہ خود داخل ایمان ہیں، تطوع قیام سے مراد تراویح کا عمل ہے جو رمضان المبارک کی راتوں کا مخصوص عمل ہے، اسکے علاوہ تہجد، نوافل، ذکر، اذکار، تلاوت قرآن مجید یہ سب اپنے اپنے درجہ میں قیام سے متعلق ہیں، اصل مقصد لیلیٰ رمضان کا احیاء ہے کہ یہ راتیں مخصوص رحمت کی راتیں ہیں ان سے بقدر امکان فائدہ اٹھانے کی کوشش کرنی چاہئے، اس کا اقل درجہ صلوٰۃ تراویح ہے کہ یہ ذکر اور تلاوت قرآن پاک کی اکمل اور اعلیٰ شکل ہے، اس سے پہلے لیلۃ القدر کے قیام کا ذکر تھا، درمیان میں جہاد لے آئے، اب پھر تطوع قیام رمضان ہے، ربط یہی ہے کہ یہ اعمال بہت زیادہ شاق ہیں، انہیں وہی انسان ادا کریگا جس کے دل میں اخلاص کوٹ کوٹ کر بھرا گیا ہو۔

تطوع اور مغفرت ذنوب | یہاں کئی جگہ یہ آچکا ہے کہ ان اعمال کے اختیار کرنے پر خداوند قدوس سابق گناہوں کی مغفرت فرمادے گا، دراصل یہ مغفرت ان اعمال کا خاصہ ہے، خواہ وہ لیلۃ القدر کا قیام ہو یا مطلق رمضان کا، اور معلوم ہے کہ خاصہ کے پائے جانیکے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی مانع موجود نہ ہو، جس طرح دواؤں کے خاصے ہوتے ہیں، لیکن ہر دوا کی تاثیر مانع کے نہ ہونے پر موقوف ہوتی ہے، اگر کوئی مانع موجود ہوتا ہے تو دوا کا لاکھ استعمال کیجئے، وہ خاصہ نہ دکھلا سکے گی، بالکل اسی طرح یہ اعمال اپنے خاصہ کے اعتبار سے مغفرت ذنوب کے مقتضی ہیں۔ یہاں یہ اشکال کیا گیا ہے کہ جب بہت سے اعمال خیر اس خاصہ میں شریک ہوئے تو جب کسی ایک عمل سے مغفرت ذنوب حاصل ہو چکی تو باقی اعمال کیا کریں گے، مغفرت ذنوب تو بقاء ذنوب کی فرع ہے، جب دونوں ہی ختم ہو گئے تو مغفرت کیسی؟ سو اس کا جواب یہ ہے کہ مغفرت ذنوب کے ہزار ہا درجات ہیں، ان درجات کے لحاظ سے مغفرت ترقی کرتی رہے گی تا ایں کہ یہی مغفرت ترقی درجات اور قرب منزلت کا باعث بن جائیگی، علاوہ بریں جب یہ معلوم ہو چکا کہ اس قسم کی روایات میں ان اعمال کے خواص پر تشبیہ کی جا رہی ہے کہ ہر عمل اپنے اندر مغفرت کا خاصہ رکھتا ہے تو اس سے ان اعمال کی طرف خاص رغبت پیدا ہوگی اور ان کی اضداد سے بچنے کا پورا اہتمام ہوگا اور یہی ایک فرماں بردار کا منتہائے مقصد ہے، کیونکہ بندہ یہ سمجھے گا کہ خداوند کریم اپنے عاجز بندوں پر کس قدر مہربان ہے کہ ہمارے لئے ان طاعات کے سلسلہ میں ہزار ہا تقرب کے راستے کھول دئے، اب بھی اگر ہم طاعات بجا نہ لائیں تو ہمارے اوپر ترف ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان اعمال کے خواص کو اس طرح سمجھو جس طرح طبی مفردات الادویہ میں ایک ایک مرض کے لئے دس دس، بیس بیس، مفرد جمع کردئے جاتے ہیں کہ یہ تمام اس مرض کے ازالہ میں مفید ہیں، لیکن جب مرکب تیار کیا جاتا ہے تو ان مختلف المزاج ادویہ کا مزاج وہ نہیں رہتا، بلکہ مجموعہ کا مزاج جزو غالب کے مزاج کے

تابع ہو جاتا ہے، ٹھیک اسی طرح ان اعمال کو سمجھئے کہ مفرد، مفرد میں کسی میں کسی کا مزاج گرم ہے تو کسی کا سرد، کسی پر خشکی غالب ہے تو کسی پر تری، کوئی جنت کی چیز ہے تو کوئی جہنم کی، زندگی میں اسکا مجموعن مرکب تیار ہوتا رہتا ہے، موت پر اس کا آخری مزاج قائم ہو جاتا ہے، پھر یا تو غلبہ معاصی کے باعث جہنم کا مزاج بنتا ہے یا غلبہ طاعات کے باعث جنت کا۔

[۲۸] بَابُ صَوْمِ رَمَضَانَ اِحْتِسَابًا مِنَ الْاِيْمَانِ

(۳۸) حَدَّثَنَا ابْنُ سَلَامٍ قَالَ اَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْفَضِيلِ قَالَ ثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ عَنْ أَبِي سَلَمَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَانًا وَاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ .

(گذشتہ: ۳۵)

ترجمہ باب، بہ امید ثواب رمضان کے روزے رکھنا داخل ایمان ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ایمانی تقاضے کے ماتحت ثواب کی نیت رکھتے ہوئے رمضان کے روزے رکھے گا اس کے سابق گناہ بخش دئے جائیں گے۔

صوم رمضان اور نوافل کی ترتیب | یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ صوم رمضان فرض ہے اور قیام رمضان نفل تو بہ لحاظ ترتیب صوم رمضان کے باب کو تطوع قیام رمضان کے باب سے مقدم ہونا چاہیے تھا، ترتیب میں تطوع کی تقدیم کس رعایت سے ہوئی، جو اب یہ ہے کہ رمضان کے اعمال میں پہلا عمل قیام رمضان کا ہے کہ وہ چاند دیکھتے ہی شروع ہو جاتا ہے روزہ کا عمل دن سے متعلق ہے، لہذا جو عملاً مقدم تھا اس کو ذکر میں بھی مقدم کیا گیا، دوسری بات یہ ہے کہ یہ رات کا عمل ہے اور رات زمانا دن پر مقدم ہے، تیسری بات یہ ہے کہ تطوع قیام رمضان تمہید ہے صیام رمضان کی، اور تمہید ہمیشہ اصل سے مقدم ذکر کی جاتی ہے، چوتھی بات یہ ہے کہ امام بخاری نے یہ چاہا کہ فریضہ میں سنت کے راستہ سے داخل ہو جائے کہ یہی راستہ مقبولیت کا ہے، پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے۔

فرض الله عليكم صيامه
وَسَنَنْتُ لَكُمْ قِيَامَهُ
اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کے روزے فرض کئے
اور میں نے اس میں قیام تمہارے لئے سنت قرار دیا۔

یہاں سے یہ مسئلہ بھی صاف ہو جاتا ہے کہ حاجی اول مکہ معظمہ حاضر ہو اور وہاں سے فارغ ہو کر مدینہ طیبہ میں حاضری دے یا اول بارگاہ نبوی میں حاضری دے کر صلوة و سلام پڑھے اور دربار نبوی میں عرض معروض کر کے آپ کے توسط سے حج کا عمل شروع کرے۔ پانچویں بات یہ ہے کہ صوم ترکی ہے اور قیام فعلی، لہذا فعلی کو ترکی پر مقدم کیا گیا اور غالباً اسی لئے تطوع رمضان کے ساتھ احتساب کا لفظ ترجمہ میں ذکر نہیں فرمایا کیونکہ وہاں تو عمل کی صورت خود ہی مذکور

مبنی ہوئی ہے جو احتساب کے مقصد کو پورا کرنے کے لئے کافی ہے، برخلاف صوم کے کہ وہاں کوئی ظاہری صورت نہیں جو تذکیر کا کام دیتی، لہذا ترجمہ میں اس کا اضافہ کر دیا اور یا اس طرز عمل کو تفصیل قرار دیا جائے۔ واللہ سبحانہ اعلم

ایک اور بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ایمان اور احتساب لازم ملزوم نہیں جو ایک کا ذکر دوسرے کے ذکر سے مستغنی کر دے کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عمل تو ایمان کا ہے مگر فاعل کی نیت میں اخلاص نہیں ہوتا اور اسی طرح ایک عمل بڑے اخلاص سے ہو رہا ہے مگر یہ عامل کا اپنا طبعی تقاضا ہوتا ہے ایمان کا خیال بھی نہیں ہوتا۔

[۲۹] بَابُ الدِّينِ يُسْرٌ

وَقَوْلُ النَّبِيِّ ﷺ أَحَبُّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ الْحَنَفِيَّةُ السَّمْحَةُ

(۳۹) حَدَّثَنَا عَبْدُ السَّلَامِ بْنُ مُطَهَّرٍ قَالَ نَا عُمَرُ بْنُ عَلِيٍّ عَنْ مَعْنِ بْنِ مُحَمَّدٍ الْغِفَارِيِّ عَنْ سَعِيدِ بْنِ أَبِي سَعِيدٍ الْمُقْبَرِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ فَسَدِّدُوا أَوْقَارِ بُؤَا وَأَبْشِرُوا وَاسْتَعِينُوا بِالْغُدُوءِ وَالرُّوحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدَّلْجَةِ .

(آئندہ: ۵۶۷۳، ۶۳۶۳، ۷۲۳۵)

ترجمہ | باب، یہ دین یسر والا ہے، اور نبی اکرم ﷺ کا قول کہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب دین دین حنیف ہے، جس کی بنیاد سہولت اور سہولت پر قائم کی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دین سہل ہے اور دین کے ساتھ کوئی پہلوانی نہ کرے گا مگر یہ کہ دین اسکو پچھاڑ دیگا۔ پس تم میانہ روی اختیار کرو اور قریب قریب رہو اور خوش خبری حاصل کرو اور صبح و شام اور آخر شب کے اوقات سے (اپنے کاموں میں) مدد حاصل کرو۔

مقصد ترجمہ | ایک مقصد مرجیہ اور کرامیہ کی تردید تو اوپر سے برابر چلا ہی آ رہا ہے، جو تقریباً ہر باب میں مشترک ہے، یہاں ایک اور مقصد کی جانب امام بخاریؒ توجہ فرما رہے ہیں کہ اوپر ذکر کئے گئے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ دین میں بڑی مشقت ہے، روزہ ہے، رمضان میں رات کا قیام ہے، لیلۃ القدر کی ترغیب ہے وغیرہ وغیرہ، لہذا معلوم ہوتا ہے کہ دین میں مشقت مطلوب ہے، جب یہ بات ہے تو اعمال میں وہ طریق اختیار کرنا چاہئے جس میں زیادہ سے زیادہ تعب اور مشقت ہو، پھر اس خیال سے کہ ہر شخص تو اعمال میں شدائد کو برداشت نہیں کر سکتا تو لامحالہ عزائم میں سستی اور کمزوری پیدا ہو جائیگی، اور عمل کا جذبہ آہستہ آہستہ فنا ہو جائیگا، لہذا امام بخاریؒ یہاں ”الدین

الدین کا الف لام عہد کا ہے، مراد دین اسلام ہے اور یسر کا حمل الدین پر بتاویل ذویسر ہے، یا از قبیل زید عدل ہے یعنی غایت یسر کی بنیاد پر یہ دین خود یسر بن گیا۔

یسر“ رکھ کر بتلاتے ہیں کہ دیکھو وہ اعمال جو اوپر گزرے ہیں ان میں اعتدال کی رعایت ملحوظ ہے، یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ یہ عمل تقرب کا باعث ہے اس لئے نفس پر کتنا ہی گراں کیوں نہ ہو زیادہ سے زیادہ کرنا چاہئے، امام تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر تشدد اختیار کیا تو دب کر رہ جاؤ گے اور تھک کر کام چھوڑ بیٹھو گے دین پر غلبہ پانا ہر ایک کا کام نہیں۔

اب اگر کسی کو شبہ ہو کہ اعمال مذکورہ تو عسر کے اعمال ہیں پھر الدین یسر فرمانا کس طرح صحیح ہوگا تو اس کا جواب یوں سمجھو کہ عسر اور یسر از جملہ امور اضافیہ ہیں، تم اپنے سے پہلے ادیان پر نظر ڈالو تو تمہیں صاف معلوم ہوگا کہ ہمارا دین بڑا آسان ہے، جو مشقتیں سابق ادیان میں تھیں، اس کا تو عشر عشر بھی ہمارے دین میں نہیں پایا جاتا، اہل کتاب کے یہاں ناپاک کپڑا بغیر کاٹے ہوئے پاک ہو نہیں سکتا تھا، تمہارے یہاں کیسی ہی نجاست ہو اس کو تین مرتبہ دھو ڈالنے پاک ہو جائیگا، نیز تم کو مزید تیمم کا طریقہ بتا دیا گیا۔ ان کی نمازین صرف ان کے معابد میں ہو سکتی تھیں اور تم وقت ہونے پر جہاں بھی ہو پڑھ لو ادا ہو جائے گی، ان کی یہاں توبہ میں قتل نفس ہوتا تھا، اور تمہاری توبہ دل کی شرمندگی کے ساتھ اس سے احتراز کا عہد ہے، غرض اس جیسے پچاسیوں احکام دیکھو گے کہ جن میں سابق ادیان میں شدت تھی اور تمہارے لئے سہولت کر دی گئی، یہ تو یسر ادیان سابقہ کے لحاظ سے ہے، اور اگر دین کو اپنی حقیقت کے اعتبار سے دیکھا جائے تب بھی یسر ہی یسر ہے۔

خداوند قدوس نے اپنی عبادت کا جو کچھ حکم فرمایا ہے اور جس قدر بھی پابندیاں اپنے بندوں پر عائد کی ہیں، وہ ان احسانات و انعامات کی نسبت کچھ بھی نہیں ہیں جو خداوند قدوس نے مجھ سے اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں پر فرمائے ہیں، اس رب السموات والارضین کے احسانات کا کیا شمار ہے، پیدا ہونے سے پہلے ہی وہ تمام ضروریات مہیا فرمادیں جن پر حیات کا مدار ہے، تاکہ پیدائش کے بعد کچھ پریشانیاں لاحق نہ ہوں، رحم مادر سے لیکر بلوغ تک کی طوریل مدت احسانات کی طویل حکایت ہے جس کے صلہ میں کوئی چیز مطلوب نہیں کوئی خدمت یا عبادت متعلق نہیں، اور بلوغ کے بعد جو عبادتیں متعلق کی گئی ہیں وہ بھی کچھ نہیں، صرف پانچ وقت کی نمازیں، ایک ماہ کے روزے، عمر میں ایک حج اور اگر اللہ تعالیٰ مالدار بنا دے تو صرف چالیسواں حصہ اس کے نام پر، اس کے علاوہ جو چیزیں مطلوب ہیں وہ سب انسان کی انسانیت کے تقاضے ہیں جو انسان کو بہ حیثیت انسان اختیار کرنے چاہئیں، غرض احسانات کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے مقابل جو عبادت متعلق کی گئی ہے وہ نہایت مختصر اور قلیل وقت میں انجام پائی ہوئی، حالانکہ انعامات کی فراوانی کا تقاضا تھا کہ شکر گزاری کی فراوانی ہو، سچ ہے۔

شکر نعمتہائے تو چنداں کہ نعمتہائے تو
عذر تقصیرات ما چنداں کہ تقصیرات ما

معلوم ہوا کہ دین فی نفسہ آسان ہے ورنہ تقاضا تھا کہ کوئی ساعت عبادت سے خالی نہ ہو اور اگر انفرادی طور پر ان فرائض کو دیکھا جائے تو بھی اس یسر کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، مثلاً روزہ ہی ہے، اول تو بارہ ماہ میں صرف ایک ماہ کے

روزے ہیں، پھر اس میں بھی یہ آسانی دیدی گئی کہ اگر تم بیمار ہو تو تمہیں اجازت ہے کسی اور موقعہ پر رکھ لینا، عورت حاملہ یا مرضہ ہے، سمجھتی ہے کہ اگر روزہ رکھوں گی تو بچے کو یا خود اس کو نقصان پہنچے گا، تو مؤخر کرنے کی اجازت ہے، شیخ فانی جو اپنی عمر کی وجہ سے اپنے قوی ختم کر چکا ہے، اسے روزہ کی تکلیف نہیں دی گئی، اس کے حق میں روزہ کا بدل فدیہ قرار دیا گیا ہے، اسی طرح مسافر کو سفر کی ضرورت سے اجازت ہے کہ وہ سفر سے واپسی پر اپنے روزے پورے کرے۔

یہ تو روزہ کا معاملہ تھا اب نماز کو لیجئے کہ دن رات میں صرف پانچ نمازیں رکھی گئی ہیں اور وہ بھی مختلف اوقات میں، اور اوقات بھی ایسے کہ جس میں مکلف نشاط کے ساتھ عمل کر سکے، پھر مریض اور مسافر کیلئے مزید تخفیف کی صورتیں بنادی گئیں، مرض کی وجہ سے وضو نہ کر سکتے ہو تو تیمم کر لو، کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر نماز ادا کر لو اور بیٹھنے کی بھی ہمت نہ ہو تو لیٹے لیٹے اپنے مالک سے رشتہ جوڑ لو، اگر مرض کی تکلیف میں ہر نماز کا اسکے مناسب وقت میں ادا کرنا دشوار ہو تو دو نمازوں کو اپنے وقت میں اس طرح ادا کر لو کہ دونوں سے ایک ساتھ فراغت ہو جائے، مسافر کے حق میں چہار گانہ نماز کو دو گانہ کر دیا گیا، راستہ میں اتر کر نماز پڑھو تو اختیار دیدیا کہ سنتیں پڑھو یا مت پڑھو، سواری کی حالت میں اگر کسی وجہ سے اترنے کا موقع نہ ہو تو اپنی سواری ہی پر رکوع و سجود کے اشارے سے نماز ادا کر سکتے ہو، غرض عمل کا ارادہ ہو تو اس کے لئے ہر قسم کی آسانیاں رکھ دی گئی ہیں اور نہ کرنا ہو تو خونے بدرابہانہ بسیار۔ زکوٰۃ میں مال کا چالیسواں حصہ مقرر ہوا اور وہ بھی اس وقت جبکہ یہ مال سال بھر کے مختلف قسم کے اخراجات سے اور نیز قرضہ جات سے فاضل ہو اور نصاب کی مقدار میں ہو تب آپ سے مطالبہ ہوگا اور وہ بھی آپ ہی کے غریب اور مسکین بھائیوں کے لئے لیا جائیگا، اگر بہ نظر انصاف دیکھا جائے تو آپ کا وہ مال بھی آپ ہی کی ضروریات میں صرف ہو رہا ہے۔

رہا حج سوا اول تو فریضہ عمر ہے، دوسرے اس کا تعلق بھی مالداروں سے ہے، غرباء اور مساکین پر یہ فریضہ حج نہیں ہے، پھر اس میں ان سہولتوں کی رعایت ہے کہ راستہ پر امن ہو اور کوئی ایسی معذوری بھی نہ ہو جو سفر سے مانع ہو، غرض اس کا مدار قدرت میسرہ پر ہے۔۔۔ جہاد نہ ہو وقت ہے نہ ہر شخص سے مطلوب ہے وہاں بھی وہی قدرت اور طاقت کا سوال ہے، غرض کوئی عمل ایسا نہیں ہے جو اپنی حیثیت میں مکلف کی قدرت اور قوت برداشت سے باہر ہو، نوافل جس قدر بھی ہیں وہ تمام تر مکلف کے اختیار پر چھوڑ دیئے گئے ہیں، اوپر سے ان کا مطالبہ نہیں، ان کے کرنے پر ثواب تو ضرور ہے مگر نہ کرنے پر مواخذہ نہیں۔

حنیفیت سچے پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خدا کے نزدیک وہ طاعت پسندیدہ ہے جس میں حنیفیت اور سچیت کی شان ہو، حنیفیت وہ عمل جو دین حنیف کا ہو، حنیف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا لقب ہے جو صابی کے مقابل ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بعثت صائبین کی طرف ہوئی ہے جو خدا تک پہنچنے کے لئے صرف اعمال کو کافی سمجھتے تھے اور ان کا عقیدہ تھا کہ جس طرح اعمال کے ذریعہ ستاروں کو مسخر کر لینا ممکن ہے اسی طرح خداوند قدوس کو بھی

مسخر کیا جاسکتا ہے، یہ لوگ ستاروں کی پوجا کرتے تھے ان کی جانب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو مبعوث کیا گیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتایا کہ دن کو ڈوبنے اور تاریک ہو جانے والے ستاروں کی پوجا درست نہیں ہے، جو خود ڈوب جائے وہ دوسروں کو کیا تیرا سکتا ہے اور جو خود تاریک ہو وہ دوسروں کو کیا تیرگی سے نکال سکتا ہے بلکہ آپ نے فرمایا۔

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلذِّنَى فَطَرَ
السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ خَنِيفًا
میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں یکسو ہو کر
جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔

خنیف مائل بہ حق، اور یکسو ہونے والا، اسکی صفت لاتے ہیں سمحہ یعنی سہل، یعنی خداوند قدوس کے نزدیک وہ دین پسندیدہ ہے جس میں خدا سے خالص تعلق کی تعلیم ہے اور جس کے اعمال میں یسر اور سہولت ہے۔

تشدد فی الدین کا مطلب | فرمایا گیا ہے کہ جو شخص دین کے ساتھ پہلوانی کریگا وہ دین کو مغلوب نہ کر سکے گا بلکہ خود دب جائیگا، دین کے اندر پہلوانی کا مفہوم یہ ہے کہ صرف عزائم کی تلاش میں

رہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دین کے اعمال دو قسم کے ہیں ایک عزیمت اور دوسرے رخصت، عزیمت وہ ہے جس کو شارع کے جانب سے بلا لحاظ اعذار مقرر کیا گیا ہو اور جس عمل کے اندر اعذار عباد کا لحاظ ہو تو وہ رخصت ہے، یہ دونوں چیزیں دین میں داخل ہیں، جب یہ بات ہے تو عبدیت کا تقاضا ہے کہ دونوں پر عمل ہو، عزیمت کی حالت میں عزیمت پر عمل کرو اور رخصت کے موقع پر رخصت سے فائدہ اٹھاؤ، ہر موقع پر رخصت کی تلاش بددینی ہے اور ہر موقع پر عزائم کی تمنا حد سے تجاوز، اب اگر آپ دین کے ساتھ پہلوانی دکھاتے ہیں اور صرف عزائم کی تلاش میں رہتے ہیں تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ دین آپکو پچھاڑ دے گا اور اگر آپ رخصت ہی کی تلاش میں رہتے ہیں تو نتیجہ میں دین کی عظمت ختم ہو جائیگی اور دین باز سچے اطفال بنکر رہ جائیگا، مثلاً اگر کوئی انسان اپنی سہولت کے لئے ائمہ اربعہ کے مذاہب سے ہر باب کی رخصتیں چھانٹ لے اور اس پر عمل شروع کر دے، عزائم کو بالکل ترک کر دے تو وہ دین کہاں رہا، وہ خواہشات نفسانی کا مجموعہ بن گیا۔ ہارون رشید نے امام مالک سے موطا لکھنے کی درخواست کی تو یہ بھی کہا کہ رخصت ابن عباس اور عزائم ابن عمر سے اجتناب فرمائیں، خلاصہ یہ ہوا کہ صرف عزائم پر اصرار درست نہیں ہے، اور نہ تنہا رخصت ہی کی تلاش روا ہے، ایسا کرنے میں ناکامی کا خطرہ اور نامرادی کا اندیشہ رہتا ہے۔

میانہ روی کی تعلیم | بلکہ ان دونوں کے درمیان تمہیں ایک راہ نکالنی چاہئے، فرمایا سددوا، من السداد بفتح
السین، بہ معنی میانہ روی اور بکسر السین بمعنی ڈاٹ، یہاں معنی یہ ہیں کہ میانہ روی اختیار کرو
جسے اقتصاد کہتے ہیں، زیادہ بلند پروازی نہ کرو، مگر چونکہ یہ کام نہایت دشوار ہے کہ انسان ہر موقع پر مستقیم رہے اس لئے
ایک دوسری صورت بتلاتے ہیں کہ قساد ہوا یعنی اگر میانہ روی پورے طور پر اختیار نہ کر سکو تو تمہاری کوشش ہر موقع پر
میانہ روی اور استقامت کی ہونی چاہئے، کم از کم قریب تو رہو اور اس طرح عمل کرنے پر بشارت حاصل کرو، استقامت

کا طریقہ اختیار کرنا اس قدر دشوار ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔

شیبئی ہود (ترمذی جلد ۲ ص ۱۶۲) سورہ ہود نے مجھے بوڑھا کر دیا

سورہ ہود میں فاستقم کما امرت (جس طرح حکم دیا گیا ہے اس پر استقامت سے قائم رہیے) فرمایا گیا ہے، یہ اس قدر ذمہ داری کا معاملہ تھا کہ پیغمبر علیہ السلام فرماتے ہیں، مجھے اس نے قبل از وقت بوڑھا کر دیا، عمر شریف ۶۳ سال ہوئی ہے، مگر اعضاء میں اس قدر کمزوری آگئی تھی کہ ہڈیوں نے گوشت چھوڑ دیا تھا، رکوع سجود میں تکلف ہونے لگا تھا، اسی لئے آپ نے صحابہ کرام سے فرمایا تھا کہ تم رکوع و سجود میں مجھ سے آگے نہ بڑھ جایا کرو، پیچھے پیچھے چلو اس لئے کہ بڑھاپے کے آثار قبل از وقت پیدا ہو گئے ہیں۔

جب استقامت کے مرحلہ پر پیغمبر علیہ السلام یہ فرماتے ہیں تو آحاد امت کا کیا ذکر ہے، یہ کس طرح ہر موقعہ پر استقامت قائم رکھ سکیں گے، اسی لئے سد دو ا کے بعد "قار بو" فرمایا یعنی اگر پورے طور پر سدا اور استقامت حاصل نہ ہو تو اس کے قریب قریب رہو اور بشارت حاصل کرو، بشارت کو صرف استقامت میں منحصر نہ سمجھو بلکہ اگر اس کے قریب قریب بھی رہے تو بشارت کے مستحق ہو گئے، کیونکہ قریب شے کو شے کا حکم دے دیا جاتا ہے الشیء اذا قارب الشئی یاخذ حکمہ، بشارت دل بڑھانے کا ایک طریق ہے اس سے عامل کی ہمت بلند ہو جاتی ہے اور عزم میں ایک نئی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔

اوقات کی تعیین فرماتے ہیں کہ مشکل کام کو ہلکا اور سہل بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اسے مختلف اوقات نشاط پر تقسیم کر دیا جائے، کچھ صبح، کچھ بعد الزوال اور کچھ رات کے آخر میں، اس طریقہ پر تمہیں مقصد کے اندر کامیابی ہوگی، یہ اوقات تسبیح و تحمید کے ہیں، ان اوقات میں نماز پڑھنے اور خدا کا ذکر کرنے سے طاقت پیدا ہوتی ہے، طاقت پیدا ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ہر کام دل کی قوت و طاقت سے انجام پاتا ہے اور قلب کو اللہ کے ذکر سے تقویت ہوتی ہے، ارشاد فرمایا گیا۔

الابد ذکر اللہ تطمنن القلوب خوب سمجھ لو کہ اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو اطمینان

(پ ۱۳ ع ۱۰) ہو جاتا ہے۔

واستعینوا بالصبر والصلوة صلوة و صبر سے مدد حاصل کرو۔

پیغمبر علیہ السلام کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی پریشانی کی صورت پیش آتی تو آپ نماز شروع فرمادیتے کان اذا حزبه امر بادر الی الصلوة۔ حاصل یہ نکلا کہ پریشانی میں خدا سے لو لگاؤ، خدا اس پریشانی کو دور فرمادے گا، قلب اعضاء انسانی کا بادشاہ ہے، اگر بادشاہ میں قوت ہوگی تو تمام اعضاء اپنے اپنے کام میں چست رہیں گے اور اگر کہیں بادشاہ ہی میں کمزوری ہے تو دوسرے اعضاء کچھ نہ کر سکیں گے، اس بنا پر قلب کو قوت دینے کے لئے نماز کا عمل کرنا

چاہئے، اس ارشاد میں اوقات صلوٰۃ کی طرف اشارات موجود ہیں، سب سے پہلے صبح کا وقت ہے، یہ سب سے زیادہ نشاط کا وقت ہے، رات کو سو کر دن بھر کا تکان ختم ہو جاتا ہے، اب تمام اعضاء تازہ دم ہیں، اس لئے نماز فجر کا حکم دیا گیا، دوسرا وقت روح ہے، بعد الزوال غروب آفتاب تک اس میں دو نمازیں ہیں، ایک قیلولہ کے بعد جسے ظہر کہتے ہیں، قیلولہ سے طبیعت ہلکی ہو جاتی ہے، دوسری کاروبار کے زور پکڑنے سے قبل جسے عصر کہتے ہیں، تیسرا وقت رات کا ہے اس میں مغرب اور عشاء ہیں۔

ان اوقات کی تعیین میں ایک لطیفہ یہ ہے کہ سفر کے اوقات بھی یہی ہیں، نمازوں کیلئے ان اوقات کی تعیین میں اشارہ ہے کہ ہم مسافرین آخرت ہیں اور یہ دنیوی منازل جن میں ہم اپنے حواس جمع کر رہے ہیں، درحقیقت ٹھہرنے کا مقام نہیں ہیں بلکہ جس طرح مسافر چلتے چلتے ستانے اور آرام کرنے کے لئے اتر جاتا ہے، اسی طرح ہم بھی یہاں ستانے اور دوسری منزل کے لئے تیاری کرنیکی غرض سے رکے ہوئے ہیں، اب اگر کوئی انسان منزل تک پہنچنے کیلئے رات دن برابر چلتا رہے، درمیان میں آرام نہ لے تو بالآخر ہار تھک کر پڑ رہیگا اور اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہوگا، کیونکہ کچھ دن کے بعد ہمت پست ہو جائے گی۔

اسلئے سفر کا اصول یہ ہے کہ اپنے دن، رات کے اوقات کو آرام اور سفر پر تقسیم کر دیا جائے، آرام کے وقت آرام کیا جائے اور سفر کے وقت سفر، انبساط اور نشاط کے وقت میں سفر کیا جائے، تھکن ہو جائے تو آرام، اور آرام کے بعد پھر منزل کی جانب قدم بڑھایا جائے، اور معلوم ہے کہ اوقات نشاط وہی ہیں جن کا ذکر حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے، اسی لئے حضرات صوفیہ رحمہم اللہ ان اوقات میں اذکار کی تعلیم فرماتے ہیں اور اسی وجہ سے فجر اور عصر کے بعد تسبیحات رکھی گئی ہیں۔

[۳۰] بَابُ الصَّلَاةِ مِنَ الْإِيمَانِ

وَقَوْلُ اللَّهِ تَعَالَى وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ (بقرہ: ۱۴۳) يَعْنِي صَلَاتَكُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ

(۴۰) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ خَالِدٍ قَالَ نَا زُهَيْرٌ قَالَ نَا أَبُو إِسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ

كَانَ أَوَّلَ مَا قَدِمَ الْمَدِينَةَ نَزَلَ عَلَى أَجْدَادِهِ أَوْ قَالَ أَخْوَالِهِ مِنَ الْإِنصَارِ وَأَنَّهُ صَلَّى قَبْلَ

بَيْتِ الْمَقْدِسِ سِتَّةَ عَشَرَ شَهْرًا أَوْ سَبْعَةَ عَشَرَ شَهْرًا وَكَانَ يُعْجِبُهُ أَنْ تَكُونَ قِبَلَتُهُ قَبْلَ

الْبَيْتِ وَأَنَّهُ صَلَّى أَوَّلَ صَلَاةٍ صَلَّاهَا صَلَاةُ الْعَصْرِ وَ صَلَّى مَعَهُ قَوْمٌ فَخَرَجَ رَجُلٌ مِمَّنْ

صَلَّى مَعَهُ فَمَرَّ عَلَى أَهْلِ مَسْجِدٍ وَهُمْ رَاكِعُونَ فَقَالَ أَشْهَدُ بِاللَّهِ لَقَدْ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُولِ

اللَّهِ ﷺ قَبْلَ مَكَّةَ فَدَارُوا كَمَا هُمْ قَبْلَ الْبَيْتِ وَكَانَتْ الْيَهُودُ قَدْ أَعْجَبَهُمْ إِذْ كَانَ

يُصَلِّي قَبْلَ بَيْتِ الْمَقْدِسِ وَأَهْلَ الْكِتَابِ فَلَمَّا وَلَّى وَجْهَهُ قِبَلَ الْبَيْتِ أَنْكَرُوا ذَلِكَ قَالَ
زُهَيْرٌ حَدَّثَنَا أَبُو إِسْحَاقَ عَنِ الْبَرَاءِ فِي حَدِيثِهِ هَذَا أَنَّهُ مَاتَ عَلَى الْقِبْلَةِ قَبْلَ أَنْ تَحْوَلَ
رِجَالٌ وَقِيلُوا فَلَمْ نَذِرْ مَا نَقُولُ فِيهِمْ فَأَنْزَلَ اللَّهُ تَعَالَى وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ إِيمَانَكُمْ .

(آئندہ: ۳۹۹، ۴۰۸، ۴۱۲، ۴۲۵، ۴۲۶)

(بقرہ: ۱۴۳)

ترجمہ | باب، نماز ایمان کا شعبہ ہے، اور اسکو خداوند کریم کے اس ارشاد میں دیکھو، ما کان اللہ الاية، اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے، یعنی بیت اللہ کے پاس (استقبال بیت المقدس کے ساتھ) ادا کی گئی نمازوں کو۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب اول اول مدینہ پہنچے تو انصار میں اپنے اجداد یا احوال کے یہاں نزول فرمایا اور سولہ یا سترہ ماہ تک آپ نے بیت المقدس کی جانب نماز ادا فرمائی، اور آپ کو یہ بات طبعاً پسند تھی کہ بیت اللہ قبلہ قرار دیا جاتا، اور پہلی وہ نماز جو بیت اللہ کی جانب پڑھی عصر کی نماز تھی اور آپ کے ساتھ ایک جماعت نے نماز ادا فرمائی آپ کے ساتھ نماز اداء کرنے والے حضرات میں سے ایک صحابی نکلے اور وہ ایک مسجد والوں کے پاس سے گزرے، یہ لوگ نماز ادا کر رہے تھے، چنانچہ انہوں نے کہا کہ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں اس وقت کی نماز (عصر کی) پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مکہ کی طرف پڑھ کر آیا ہوں، چنانچہ وہ اصحاب اسی حالت میں بیت اللہ کی جانب گھوم گئے جس زمانہ میں آپ بیت المقدس کا استقبال فرمایا کرتے تھے تو یہود اور عام اہل کتاب آپ کے اس فعل کو اچھی نظر سے دیکھتے تھے، پس جب آپ نے بیت اللہ کی جانب روئے مبارک پھیرا تو یہ بات انکو ناگوار گزری، حضرت زبیر نے حضرت براء سے بروایت ابو الخلق اسی حدیث میں یہ بیان کیا کہ تحویل قبلہ سے قبل کچھ اصحاب وفات پا گئے اور شہید کر دئے گئے، پس ہم نے نہیں سمجھا کہ ان کے بارے میں کیا کہیں، سو اللہ تعالیٰ نے آیت ما کان اللہ لیضیع ایمانکم۔ (نہیں ہے اللہ کہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے) نازل فرمائی۔

باب سابق سے ارتباط اور مقصد | باب سابق میں فرمایا تھا کہ دین یسر ہے، اس باب میں یسر کی ایک مثال پیش کی ہے کہ اگر دین کی آسانی کو دیکھنا ہو تو دین کی اس سب سے بڑی عبادت کو

دیکھو جسے کفر و ایمان کے درمیان حد فاصل قرار دیا گیا ہے، اور جو عماد الدین ہے، اس کی سہولت کا بیان باب سابق میں گزر گیا، اور مقصد وہی مرجیہ کی تردید ہے کہ تم تو یہ کہتے ہو کہ اعمال کا ایمان سے کوئی تعلق ہی نہیں، ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن عزیز میں صلوٰۃ کو ایمان کہا گیا ہے، تو کیا اس سے ایمان و صلوٰۃ کا خصوصی تعلق ظاہر نہیں ہوتا، ہاں ہوتا ہے اور ضرور ہوتا ہے اور بہت زیادہ ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو، یہ تو ایمان کا زبردست شعار ہے، بندہ اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے، دین کا مستحکم ستون ہے، اس شدت تعلق کی بنا پر صلوٰۃ گویا عین ایمان ہے۔

آیت کریمہ اور اشکال

ماکان اللہ لیضیع ایمانکم (اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرے والا نہیں) یعنی یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ ہماری ان نمازوں کا کیا ہوگا جو ہم نے بیت المقدس کی طرف پڑھی ہیں، کیونکہ جو عمل تم نے بہ تقاضائے ایمان کیا ہے اللہ کے نزدیک اس کی بڑی قیمت ہے، وہ بڑا قدر دار ہے، اس کا نام شکور ہے، یہاں ایک اشکال پیش کیا گیا ہے جب بیت کا لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو اس سے مراد بیت اللہ ہوتا ہے، اسلئے آیت وماکان اللہ لیضیع ایمانکم میں اطلاق کی وجہ سے بیت اللہ مراد ہوگا جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری بیت اللہ کی جانب ادا کی گئی نمازوں کو ضائع نہیں فرمائے گا، حالانکہ تردد بیت المقدس کی جانب ادا کی گئی نمازوں کے بارے میں تھا نہ کہ بیت اللہ کی جانب پڑھی ہوئی نمازوں میں، اول تو یہ بات یوں بھی ظاہر ہے کہ شبہ کی بنیاد استقبال بیت اللہ کا امر ہے پھر نسائی میں صلواتکم الی بیت المقدس کی تصریح موجود ہے اور البیت کے الف لام کو عہد پر محمول کرتے ہوئے بیت المقدس کا ارادہ، خلاف معروف ہے اس بنا پر بخاری کا صلواتکم عند البیت فرمانا محل نظر ہوا، اس اشکال کے مختلف جوابات دئے گئے ہیں، بعض حضرات نے تو آنکھ بند کر کے یہ کہہ دیا کہ یہاں تصحیف ہو گئی اور عند البیت، غیر البیت کی تصحیف ہے، عین اور غین میں تو صرف نقطوں کا فرق ہے، جن کا قدیم زمانہ میں خاص اہتمام بھی نہ تھا، اور دال وراء میں بھی فرق بہت کم ہے، غرض عند کا غیر ہو گیا، اب معنی میں کوئی اشکال نہیں۔

علامہ سندھی کا ارشاد

علامہ سندھی نے ارشاد فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ اشکال کی وجہ یہ ہے کہ عند کو صلوة کا ظرف سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ یہ ظرف صلوة نہیں ہے، بلکہ یہ یضیع سے متعلق ہے اور معنی یہ ہیں کہ اب جبکہ تم بیت اللہ کی جانب نمازیں ادا کر رہے ہو خداوند قدوس تمہاری سابق نمازوں کو ضائع کرنے والا نہیں ہے، اس طرح بھی کوئی اشکال نہیں رہتا، علامہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی بات دل لگتی اور اچھی خاصی ہے۔

حضرت شیخ الہندیہ کا ارشاد

لیکن حضرت شیخ الہندیہ سے بھی پسند نہیں فرماتے بلکہ ان کے نزدیک عند کا تعلق صلوة ہی سے ہے، فرماتے ہیں کہ عند البیت فرمانا اس بات کا قرینہ ہے کہ نمازیں الی البیت نہیں، جب الی البیت نہیں تو الی بیت المقدس ضرور ہو گئیں اور مراد یہ ہے کہ بیت اللہ کے نزدیک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے ادا کی گئی نمازوں کو خداوند قدوس ضائع کرنے والا نہیں۔

ایک اور اشکال اور اس کا جواب

آگے ایک اور اشکال یہ پڑتا ہے کہ جس طرح کئی زندگی میں نمازیں بیت المقدس کی طرف ادا کی گئیں اسی طرح مدینہ منورہ میں بھی یہ عمل سولہ یا سترہ ماہ تک بدستور جاری رہا، پھر حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صرف ان نمازوں کے بارے میں تردد کیوں ہوا جو مکہ میں ادا کی گئیں یا ان ہی نمازوں کے متعلق عدم اضاعت کا کیوں اعلان فرمایا گیا جو مکہ میں ادا ہوئیں، مدینہ کی سولہ ماہ کی نمازیں کیا ہوئیں۔

اسکا جواب حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ اول تو مکہ میں بیت المقدس کی جانب ادا کی گئی نمازوں کی تعداد، مدینہ کی نمازوں کے مقابل بہت زیادہ ہے اور دوسری بات یہ کہ مکی زندگی میں بیت اللہ کے قریب رہ کر بیت المقدس کا استقبال کیا گیا ہے گویا افضل کی موجودگی میں مفضل کا استقبال ہوا، اور بیت اللہ بیت المقدس سے بدرجہا افضل ہے اس لئے اشکال ان نمازوں کے متعلق پیش آیا جو افضل کی موجودگی میں مفضل کی جانب رخ کر کے ادا کی گئیں، مدینہ میں افضل کی موجودگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تمہیں جو شبہ پیدا ہوا ہے ہم اس کے متعلق اطمینان دلاتے ہیں، تم نے اگرچہ بیت اللہ کے قریب بیت المقدس کا استقبال کیا لیکن از خود نہیں کیا ہمارے حکم سے کیا اور امتثال کا تقاضا ہے کہ جو حکم ملے اسے بلاپس و پیش قبول کر لیا جائے۔ اور جب ہمارے حکم کی امتثال میں یہ ہوا ہے تو اس سے کیا بحث ہے کہ بیت اللہ افضل ہے یا مفضل، اللہ تعالیٰ تمہاری نمازوں کو ضائع کرنے والا نہیں ہے، اب اطمینان ہو گیا کہ جب زیادہ وہ حصہ جس کے متعلق یہ خدشہ تھا کہ اگر یہ ضائع ہو گیا تو سمجھو کہ ایمان ہی ضائع ہو گیا جب وہ حصہ بھی اللہ کے نزدیک مقبول ہے تو دوسری قلیل نمازیں جن کی ادائیگی بیت اللہ سے بہت دور فاصلہ پر ہوئی ہے یقیناً خطرہ میں نہیں، اس تقریر پر عند مکان کے لئے ہوگا جو اس کی اصل وضع ہے۔

مکی زندگی کا قبلہ | اب یہ بحث اس بات پر موقوف ہے کہ مکی زندگی میں استقبال بیت اللہ کا کیا گیا یا بیت المقدس کا، بعض حضرات کا خیال ہے کہ مکہ میں بیت اللہ کا استقبال کیا جاتا تھا اور مدینہ میں آ کر بیت المقدس کا حکم ہوا، لیکن اکثر حضرات نے اسکو قبول نہیں کیا، دوسری تحقیق جو روایات سے موید ہے یہ ہے کہ بیت المقدس ہی کا استقبال مکی زندگی میں ہوتا تھا لیکن صورت یہ ہوتی تھی کہ پیغمبر علیہ السلام نماز کیلئے کھڑے ہوتے تو بیت اللہ درمیان میں آ جاتا، گویا مقصود بالاستقبال اور متوجہ الیہ تو بیت المقدس ہوتا تھا مگر بیت اللہ بھی سامنے ہوتا تھا اور مدینہ میں پہنچ کر یہ صورت ناممکن ہو گئی کیونکہ مدینہ سے شمال کی جانب بیت المقدس ہے اور جنوب میں بیت اللہ، اس لئے وہاں بیت المقدس کے استقبال کے ساتھ بیت اللہ کا استقبال ناممکن ہو گیا اس صورت میں تکرار نسخ کا الزام بھی نہیں آتا، پہلی صورت میں تکرار نسخ لازم آتا ہے۔

ایک تحقیق یہ ہے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس کی طرف نمازوں کا عمل تقسیم بلاد کے اصول پر ہوا ہے پھر یہ عمل اختیاری بھی ہو سکتا ہے اور حکم خداوندی سے بھی، آپ جب تک مکہ میں رہے بیت اللہ کا استقبال فرماتے رہے کیونکہ مکہ کے لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ان کا قبلہ بیت اللہ تھا، اور جب مدینہ پہنچے تو وہاں کے رہنے والے یہود اہل کتاب تھے اور ان کا قبلہ بیت المقدس تھا، اس لئے مدینہ میں بیت المقدس کا استقبال کیا گیا، اصل یہ ہے کہ بیت اللہ اور بیت المقدس دونوں قدیم سے قبلہ چلے آ رہے ہیں اور دونوں مقام دو جلیل القدر پیغمبروں کی قربان گاہ ہیں، اسماعیل علیہ السلام، اہل عرب جن کی اولاد ہیں ان کو قربانی کے لئے مکہ مکرمہ میں پیش کیا گیا تھا لہذا ان کا قبلہ بیت

اللہ قرار دیا، اور اسحاق علیہ السلام کو بیت المقدس کے مقام پر قربانی کی خاطر پیش کیا گیا، اسلئے وہ مقام ان کی ذریت کا قبلہ ہوا جو بنی اسرائیل کے نام سے موسوم ہوئے، پس اگر مکہ معظمہ میں بیت اللہ کا استقبال تقسیم بلاد کے اصول پر ہوتو نہ اس میں تکرار نسخ ہے اور نہ یہ محض اجتہادی معاملہ ہوگا، حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا مختار یہی ہے۔ واللہ اعلم اور آیت ماکان اللہ لیضیع ایمانکم کا یہ مطلب ہے کہ سولہ سترہ ماہ کی وہ نمازیں جو بیت المقدس کی طرف مدینہ میں آنے کے بعد ادا کی گئی ہیں، خداوند قدوس کے نزدیک ضائع نہیں ہیں یعنی قیام مکہ کے ایام میں تو چونکہ قبلہ بیت اللہ ہی رہا ہے اس لئے ان نمازوں کے بارے میں توضیحات کا خطرہ ہے ہی نہیں، خطرہ تو ان نمازوں کے متعلق ہے جو مدینہ میں بیت المقدس کی طرف ادا کی گئیں، آیت نازل فرما کر ان کے دلوں سے نقصان اجر کے شبہ کو دور فرما دیا یعنی اللہ ایسا نہیں ہے کہ وہ کسی کے اچھے اعمال کو جو بتقاضائے ایمان اسی کی خاطر کئے گئے ہوں ضائع کر دے اور بے اثر بنا دے، اس تحقیق پر ”عند استقبال البیت“ کے معنی یہ ہونگے کہ استقبال بیت اللہ کے حکم کے وقت تمہاری سابق نمازیں جو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے تم نے پڑھی ہیں قائم ہیں ضائع نہیں۔

آیت میں ضیاع کا مفہوم | ایک بات یہ اور رہ گئی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خدشہ ضیاع کیوں پیش آیا جب کہ وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے ساتھ اس عمل میں پیغمبر علیہ السلام بھی شریک ہیں، نیز یہ کہ عمل حکم خداوندی سے ہوا ہے، اگر پیغمبر علیہ السلام بیت اللہ کی جانب نمازیں ادا فرماتے اور صحابہ کرام کو بیت المقدس کے استقبال کا حکم ملتا تب بھی شبہ کے لئے گنجائش تھی لیکن جب پیغمبر علیہ السلام کی معیت میں ایک عمل ہوا ہے اور معلوم ہے کہ پیغمبر کا عمل بیکار نہیں ہو سکتا، اسلئے اصل بات یہ ہے کہ صحابہ کرام کو نہ یہ خیال تھا اور نہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا عمل بالکل ضائع ہے جبکہ وہ پیغمبر علیہ السلام کے عمل اور خداوند قدوس کے حکم کو دیکھ رہے ہیں بلکہ انہیں خیال یہ تھا کہ گو یہ سب کچھ درست ہے، لیکن افضلیت و فضولیت کی بنا پر اتنا فرق ضرور ہوگا کہ قبلہ مفضول کی جانب ادا کی گئی نمازوں میں وہ شان تقرب نہ ہوگی جو قبلہ افضل کی جانب پڑھی جانے والی نمازوں میں ہوگی، بیت اللہ کے حکم کے بعد یہ خیال ہوا کہ آیا ہماری ان نمازوں کے تقرب کا کیا حال ہوگا جو بیت المقدس کی جانب ادا کی گئی ہیں، اسی نقصان اجر کے اندیشہ کو ضیاع عمل سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تحویل قبلہ کے بارے میں شبہ کا اصل منشا | یہاں ایک قابل غور بات یہ ہے کہ آخر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تحویل قبلہ کے باعث نمازوں کے بارے میں اشکال کیوں پیش آیا، اور تردد کی اصل بنیاد کیا ہوئی، حافظ نے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلا نسخ قبلہ کا ہوا، صحابہ نسخ سے واقف نہ تھے، نسخ کی صورت پہلے پہل پیش آئی تو اشکال ہونا ہی چاہئے تھا کہ جن دوسرے حضرات کی حیات میں یہ حکم نہیں آیا تھا ان کا کیا ہوگا، لیکن صحیح یہ ہے کہ حضرت ابن عباس کا یہ ارشاد ان کے اپنے علم کے مطابق ہے،

ورنہ نسخ کی صورت اس سے پہلے بھی پیش آچکی تھی، اب اشکال اور قوی ہو جاتا ہے کہ جب اس سے پہلے بھی نسخ کی صورت پیش آچکی ہے اور اس میں کسی قسم کا تردد نہیں ہوا تو اس میں یہ صورت کیوں پیش آئی، پھر نسخ کا معاملہ یہ ہے کہ نسخ کا منسوخ سے افضل ہونا ضروری نہیں، کبھی نسخ اونچا ہوتا ہے اور کبھی منسوخ کے برابر، اس بناء پر ہمیں اس معاملہ میں منشاءً شبہ کو تلاش کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں حضرت شیخ الہند کی بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے،
حضرت شیخ الہند کا ارشاد گرامی فرماتے ہیں کہ خود معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہوگئی کہ تردد پیدا ہو گیا حضرت

فرماتے کہ اس قسم کے شبہات اسکے علاوہ اور ایک موقع پر صراحت سے موجود ہیں، یہ دو موقع تو نظر کے سامنے ہیں اور ممکن ہے ایک آدھ موقع اور نکل آئے۔

ایک موقع حرمت خمر کا ہے، خمر عرب کی گھٹی میں داخل تھی، بچپن سے اس کے عادی ہو جاتے، اور شراب پی کر جو بد مستی طاری ہوتی اس سے گو طرح طرح کے فسادات برپا ہوتے، لیکن ان تمام نقصانات کے باوجود یہ لوگ چھوڑتے نہ تھے، اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو مصلحہ ایک ہی مرتبہ حرمت کا حکم نہیں دے دیا، بلکہ تدریج کا طریق اختیار فرمایا تاکہ آسانی کے ساتھ اس خصلت بد سے نجات دی جائے اور اگر یکبارگی حرمت کا اعلان کر دیا جاتا تو ممکن تھا کہ کچھ ضعیف الایمان حضرات اس کے قبول کرنے میں پس و پیش کرتے، اس بنا پر رفتہ رفتہ حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا۔

یستلونک عن الخمر و المیسر قل
 فیہما اثم کبیر و منافع للناس و
 الہمما اکبر من نفعہما (پ ۱۱ع ۱۱)

یعنی منافع جن کا تعلق دنیا سے ہے کم ہیں اور نقصانات جن کا تعلق آخرت سے ہے بہت زیادہ ہیں، اسی آیت سے کچھ صحابہ سمجھ گئے کہ اگر آج چھوڑنے کا حکم نہیں دیا ہے تو عنقریب یہی حکم آئیوالا ہے، حضرت عمرؓ نے اسی آیت کے بعد عرض کیا۔

اللہم بین لنا بیان شفاء
 اے اللہ! تشریف بخش حکم نازل فرمادے۔

کچھ دن گزرتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمنؓ کے یہاں صحابہ مدعو تھے، شراب پی گئی، نماز کا وقت ہوا، نماز کے لئے کھڑے ہوئے اور حالت سکر میں لا اعبدا ماتعبدون کی جگہ اعبدا ماتعبدون پڑھ گئے، آیت نازل ہوگئی۔

یا ایہا الذین آمنوا لا تقربوا
 الصلوۃ وانتم سکاری حتی
 تعلموا ماتقولون (پ ۴۵ع ۴۵)

اے ایمان والو! تم نماز کے پاس ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو۔

حرمت خمر کے سلسلہ میں یہ دوسرا قدم تھا، بہت سے سمجھ دار حضرات تو یہ کہہ کر اسی وقت تائب ہو گئے کہ شراب نہایت گندی چیز ہے جو تقرب کی راہ میں حائل ہوتی ہے لیکن جو حضرات شراب کلمہ انتہائی خوگر تھے گنجائش پا کر پیتے رہے، حضرت عمرؓ نے پھر عرض کیا اللہم بین لنا فی الخمر بیان شفاء آیت آگئی۔

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون، انما یرید الشیطان ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فهل انتم منتہون . (پ: ۲/۷: ۲)

بات یہی ہے کہ شراب اور جو اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں سو ان سے بالکل الگ رہو تاکہ تم کو فلاح ہو شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ تمہارے آپس میں عداوت اور بغض واقع کر دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سواب بھی باز آؤ گے۔

صحابہ کرام نے فهل انتم منتہون سکر عرض کیا انتہینا۔ انتہینا اس سے معلوم ہوا کہ پہلی مرتبہ جو انہما اکبر من نفعہما فرمایا تھا وہ بھی چھوڑ دینے کے لئے کافی تھا، چنانچہ حضرت عمر اور بعض دوسرے اصحاب نے چھوڑ دی تھی، اور اگر اس وقت نہ چھوڑی تھی تو لا تقربوا الصلوٰۃ سے تو سمجھ ہی لینا چاہئے تھا، لیکن پھر بھی پیتے ہی رہے۔ اب ارشاد ہوتا ہے کہ شیطان تمہیں شراب اور جوئے میں ڈال کر ذکر خدا سے روکنا چاہتا ہے، کیا تم اب بھی باز آؤ گے؟ اس لہجہ میں کس قدر ناراضگی ٹپک رہی ہے، صحابہ کرام ڈر گئے، اب سوال ہوا کہ جو لوگ ان آیات کے نزول کے درمیان بھی شراب پیتے رہے اور اسی اثنا میں وفات پا گئے، ان کا کیا حشر ہوگا، آیت آگئی۔

لیس علی الذین امنوا و عملوا الصلحت جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا و امنوا و عملوا الصلحت ثم اتقوا و امنوا ثم اتقوا و احسنوا، واللہ یحب المحسنین (پ: ۲/۷: ۲)

ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں، اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں جبکہ وہ لوگ پرہیز رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں، پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں، اور اللہ نیکو کاروں سے محبت رکھتے ہیں۔

آیت پاک میں اس شبہ کا جواب ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں سے مواخذہ نہیں ہے، بلکہ الفاظ کے عموم کے پیش نظر مجتہدین کرام کے اصول استنباط کے مطابق آیت کا مطلب یہ ہے کہ زندہ ہوں یا مردہ جو لوگ ایمان اور عمل

صالح کی دولت سے مالا مال ہیں ان کے لئے اباحت کے زمانے میں مباح چیزوں کے استعمال کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں، خصوصاً جبکہ وہ عام احوال میں تقویٰ، ایمان اور احسان جیسے اوصاف حمیدہ سے متصف ہوں، پھر ان چیزوں میں برابر ان کا قدم ترقی کی جانب اٹھتا رہا ہو، پس جن پاکباز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ایمان اور تقویٰ کی حالت میں عمر گزاری، اور احسان کی نسبت حاصل کی، پھر وہ اللہ کے راستے میں شہید ہوئے، ان کے بارے میں اس طرح کے توہمات اور خلجان پیدا کرنے کی گنجائش نہیں کیونکہ وہ ایک ایسی چیز استعمال کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے ہیں جو اس وقت تک حرام نہیں تھی اور اس کے بارے میں احکام نازل ہو رہے تھے، خلاصہ یہ ہے کہ اس مضمون کو عمومی انداز میں بیان کر کے ان صحابہ کرام کی فضیلت و منقبت بھی بتلا دی گئی اور اس طرح کے اشکالات کا آئندہ کے لئے بھی دروازہ بند کر دیا گیا، اس طرح کا دوسرا معاملہ تحویل قبلہ کے موقع پر پیش آیا۔

بیت اللہ کا معاملہ | اب دیکھنا یہ ہے کہ استقبال بیت اور تحویل قبلہ کے معاملہ میں بھی کوئی ایسی بات ہے جو شبہ کا باعث ہو، ہمیں کسی اور بحث میں جانے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ پیغمبر علیہ السلام کے لئے کونسا قبلہ مناسب تھا اور آپ کا طبعی میلان کس طرف تھا یا کس طرف ہونا چاہئے تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور بالخصوص حاضر باش صحابہ کرام آپ کے طبعی رجحانات سے واقف تھے۔

اس سے قطع نظر کہ مکہ معظمہ آپ کا اصل وطن تھا وطن کی ہر چیز سے طبعی محبت ہوتی ہے، کسی نے خوب کہا ہے

حب وطن از ملک سلیمان خوشتر خار وطن از سنبل وریحاں خوشتر

اس سلسلہ میں ایک روایت بھی نقل کرتے ہیں ”حب الوطن من الایمان“ احقر کو اس کی سند کا علم نہیں لیکن اتنی بات تو صحیح روایات سے ثابت ہے کہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کے وقت آپ نے رو قبلہ ہو کر اپنے حزن و ملال کا اس طرح اظہار فرمایا تھا کہ اگر یہ لوگ جھکو ترک وطن پر مجبور نہ کرتے تو میں ہرگز تجھے نہ چھوڑتا، اس میں وہی حب وطن جلوہ افروز ہے، واللہ اعلم، حضرت بلالؓ کے وہ اشعار بھی اس سلسلہ میں پیش ہو سکتے ہیں جو مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد آپ کی زبان پر جاری رہتے تھے ”الایلیت شعری“ جس میں مکہ مکرمہ کی پہاڑیوں، وادیوں اور گھاسوں کو یاد کر کے روتے تھے اور نکالنے والوں پر لعنت بھیجتے تھے، غرض یہ بھی ایک معقول وجہ اس طبعی رجحان کی ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اور دوسری وجوہ بھی اس طبعی رجحان کی ہو سکتی ہیں، مثلاً یہ کہ پیغمبر علیہ السلام تمام انبیاء کرام کے سردار بنائے گئے اور آپ کی یہ سیادت عالم بالا میں مقرر ہو چکی تھی۔

میں عبد اللہ، خاتم النبیین ہوں حالانکہ آدم ابھی

انی عبد اللہ لخاتم النبیین وان آدم لمنجدل

تک اپنی مٹی ہی میں تھے

فی طینتہ (مسند احمد جلد ۲ ص ۱۲۷)

دوسری جگہ آیا، اول ما خلق اللہ نوری، آپ کی اس شان اولیت کی پیش نظر قبلہ وہی ہونا چاہئے جس میں

اولیت کی شان ہو، قرآن کریم میں بیت اللہ کی اولیت کے بارے میں ارشاد ہے۔

ان اول بیت وضع للناس للذي

بيكة مباركا وهدى للعالمين

(پ ۱۴۳)

یقیناً وہ مکان جو لوگوں کے لئے سب سے پہلے مقرر کیا گیا وہ
مکان ہے جو مکہ میں ہے برکت والا ہے، اور جہاں بھر کیلئے
رہنما ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بیت اللہ کو مرکزیت حاصل ہے، چنانچہ بعض روایات کے مطابق بیت اللہ ناف ارض
قائم ہے، اولاً وہ نقطہ جو پانی پر زمین بنا کر پھیلا یا گیا، اسی مقام پر ابھرا تھا جہاں بیت اللہ قائم ہے، پھر وہاں سے اسکو
بڑھا کر ہر سمت میں پانی پر بچھا دیا گیا کیونکہ بیت اللہ مرکز ارض پر واقع ہے اور ہر چیز اپنے مرکز کی طرف بالطبع مائل ہوتی
ہے اس لئے بیت اللہ کی طرف آپکارہ حجان خاطر عین مقتضائے طبع اور عقل سلیم کے بالکل موافق ہے، یہیں سے حج کا
بیت اللہ کے ساتھ مخصوص ہونا بھی سمجھ میں آ گیا، پھر یہی نہیں کہ بیت اللہ کو اولیت اور مرکزیت حاصل ہے بلکہ مبداء عالم
ہونیکے ساتھ ساتھ یہ مدار عالم بھی ہے، قرآن کریم میں اس کو قیاما للناس فرمایا گیا ہے، یعنی بیت اللہ دنیا کے لئے وجہ
قیام و ثبات ہے، پیغمبر علیہ السلام کا وجود باوجود تمام عالم میں اولیت اور کمالات میں مرکزیت کی شان رکھتا ہے، اسی طرح
آپ کا وجود بقائے عالم کے لئے سامان بھی ہے اور مرکز کی مرکز کے ساتھ مناسبت ظاہر ہے، بیت اللہ ظاہر کا مرکز ہے
اور آپ باطن کا مرکز ہیں۔

تیسری بات یہ کہ آپ کی ملت، ملت ابراہیمی ہے، قبلہ ابراہیمی بیت اللہ ہے، ملت کی حیثیت سے بھی مناسب
یہی تھا کہ بیت اللہ آپ کا قبلہ ہوتا۔

چوتھی وجہ بیت اللہ کو قبلہ بنانے کی یہ ہے کہ اس میں اہل عرب کی تالیف تھی، کیونکہ اہل عرب کا قبلہ بھی بیت اللہ
تھا اور آپ کی دعوت سب سے پہلے اہل عرب ہی کو پہنچانی تھی، اس لئے جب تک اہل مکہ کا معاملہ ختم نہیں ہو گیا باہر جہاد نہیں
کیا گیا، بلکہ جب یہ اہل عرب ایمان لے آئے تب دوسرے ممالک کی طرف توجہ دی گئی، اسی کے ساتھ آپ کی صوری
مشابہت اور روحانی قرب ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ایک مستقل وجہ اختیار، بیت اللہ کی ہو سکتی ہے۔

بیت المقدس کے استقبال کی حکمت

رہا یہ کہ جب بیت اللہ مختلف وجوہ سے قبلہ ہونیکے لئے انبث تھا تو پھر
مکہ معظمہ اور مدینہ میں چند ماہ تک بیت المقدس کے استقبال کا حکم
کیوں فرمایا گیا، اس حکمت کے لئے دراصل اس بات پر نظر ضروری ہے کہ بیت المقدس تمام انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ رہا
ہے اور ظاہر ہے کہ جس مقام پر کوئی بزرگ عبادت کرتا ہے تو تجلیات ربانی صرف اسی کی ذات تک محدود نہیں رہتیں بلکہ
اس مقام سے بھی متعلق ہو جاتی ہیں، اسلئے چلہ کشی کرنے والے، بزرگوں کی عبادت گاہوں میں چلہ کشی کیا کرتے ہیں
اور انہیں اس میں اعلیٰ کامیابی ہوتی ہے، اسلئے انبیاء بنی اسرائیل کا قبلہ ہونیکے حیثیت سے ان تجلیات ربانی کا تعلق بیت

المقدس سے بھی ہوا جو انبیاء کرام پر نازل ہوئی تھیں، اور اس لحاظ سے بیت المقدس ان تمام خصوصیات کا حامل ہوا جو جدا جدا ہر پیغمبر کو عطا ہوئی تھیں اور معلوم ہے کہ آپ کی بعثت تمام عالم کے لئے ہے عام اس سے کہ وہ بنی اسرائیل ہوں یا بنی اسماعیل، اور چونکہ یہ عالم شہود عالم اسباب ہے، یہاں ہر چیز اسباب کے ساتھ مربوط ہے، اور اسباب ہی کے ذریعہ اس کا حصول اور انتقال ہوتا ہے تو اگرچہ آپ ازل ہی سے مجمع کمالات بنائے گئے تھے اور عالم کے تمام کمالات آپ ہی کی روحانیت کا فیض ہیں مگر اس عالم میں اس کا ظہور تدریجی اور ارتقائی اصول کے مطابق ہوا، نبوت ہی کو دیکھ لیجئے کس قدر ریاضتوں کے بعد عطا ہوئی، اور چونکہ آپ کو جامع کمالات اور جامع شرائع بنانا تھا اس لئے تدریجی ارتقاء کے ساتھ منزل جامعیت تک پہنچایا گیا، اسی تدریج کے پیش نظر معراج میں بیت اللہ سے براہ راست آسمان پر نہیں چڑھایا گیا بلکہ اسکے لئے بیت المقدس کی راہ اختیار کی گئی کیونکہ بیت المقدس کتاب کمالات کا راستہ ہے اور اسی کسب کمال اور شان جامعیت کے پیدا کرنے کے لئے تمام انبیاء کرام کو بیت المقدس میں جمع کیا گیا اور امامت کا شرف آپ کو عطا کیا گیا کیونکہ جماعت میں تعاکس انوار ہوتا ہے، جماعت کی مشروعیت کی بڑی حکمت یہ ہے کہ خداوند قدوس کی جو رحمتیں امام پر نازل ہو رہی ہیں ان میں تمام مقتدی شریک ہو سکیں، کیونکہ جب تمام انسان ملے جلے کھڑے ہیں اور قلوب آئینہ کی طرح ہیں، اب اگر کسی ایک کے دل پر بھی فیضان ہو رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ اسی کی ذات تک محدود نہیں رہیگا، بلکہ حسب استعداد تجلیات سب ہی پر پہنچیں گی، جیسا کہ چند آئینوں کے درمیان شمع جلادی جائے تو روشنی ہر آئینہ تک پہنچتی ہے غرض جماعت کی صورت قائم فرمانے کا مقصد یہ تھا کہ اس راہ سے پیغمبروں کے کمالات آپ تک منتقل کر دیئے جائیں آپ کو امام بنانے میں امتوں کے اس عذر کا بھی جواب ہے کہ ہم اپنے مقتدی کو نہیں چھوڑ سکتے، یعنی جب نبی اکرم ﷺ تمام انبیاء کے مقتدی بن گئے، اب کسی نبی کے امتی کو یہ کہنے کا حق ہی نہیں رہا کہ ہم نے بہ حکم خدا جس نبی کو اپنا پیغمبر مان کر اس کی شریعت کا التزام کیا ہے اسے کس طرح چھوڑ دیں۔

یہ ایک تدریجی ارتقاء تھا، چنانچہ جب واپس کیا گیا تو بیت المقدس کی راہ نہیں اختیار کی گئی، بلکہ براہ راست بیت اللہ واپسی ہوئی، اشارہ اس طرف ہے کہ بیت المقدس کسب کمالات کی راہ ہے اور بیت اللہ ان کمالات کی انتہاء، غرض آپ کی ذات مبارکہ میں جامعیت کی شان پیدا کرنے کے لئے کچھ دن بیت المقدس کو قبلہ بنایا گیا، ضمناً یہ فائدہ بھی تھا کہ یہود کی تالیف قلب ہو جائے اور یہود کو اسلام میں داخل کرنے کی زیادہ ضرورت اسلئے تھی کہ اہل کتاب ہونے کی حیثیت سے انکی تصدیق و تکذیب لوگوں کی نظر میں وقعت رکھتی تھی، اگر یہ تصدیق کر دیتے تو دوسروں کو مجال انکار باقی نہ رہتا اور چونکہ عرب کے اہل کتاب میں سب سے بڑی جماعت یہود کی تھی اس لئے سب سے پہلے ان ہی کی تالیف کی طرف توجہ دی گئی لیکن ان لوگوں نے قریب آنیکے بجائے الثانیہ نتیجہ نکالا کہ آج یہ ہمارا قبلہ قبول کر رہے ہیں تو آئندہ یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ہمارا مذہب بھی قبول کر لیں گے، یہ ان کی سراسر حماقت تھی، چاہئے تو یہ تھا کہ وہ استقبال

بیت المقدس کو دیکھ کر یہ سمجھتے کہ یہ تو ان کے پیغمبر آخر الزماں ہونے کا خاص نشان ہے، جس کو آسمانی کتابوں میں بہ طور علامت ذکر کیا گیا ہے، پھر اگر تردد رہتا تو بجائے انکار پر اتر پڑنے کے اس دوسری حالت کا انتظار کرتے، یعنی تحویل الی بیت اللہ کا، کہ اس کے بعد وہ تردد بھی ختم ہو جاتا، مگر واہ رے بنی اسرائیل ایسی کھلم کھلا علامات کے بعد بھی انکار پر اڑے رہے۔

غرض وہ وقت آ گیا کہ اب پیغمبر علیہ السلام کو اس اصلی قبلہ کی طرف متوجہ کر دیا جائے جو آپ کے شایان شان تھا اور جس کے آپ متمنی بھی تھے، چنانچہ آپ کے قلب مبارک میں اس کی لگن بڑھادی گئی اور آپ وحی کے انتظار میں بار بار آسمان کی طرف دیکھنے لگے، آیت نازل ہوئی۔

ہم آپکے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے
ہیں اسلئے ہم آپکو اس قبلہ کی طرف متوجہ کر دینگے
جسکے لئے آپکی مرضی ہے۔

قد نرى تقلب وجهك في
السماء فلنولينك قبلة ترضاها
(پ ۱۷۲)

اس میں اسی قبلہ مرضی یعنی بیت اللہ کے اعطاء کا وعدہ ہوا تو بمصداق شاعر

وعدہ وصل چوں شود نزدیک آتش شوق تیز تر گردد

طلب میں تیزی ہو گئی، ادھر سے فول و جھک شطر المسجد الحرام نازل فرما کر اس وعدہ کا ایفاء فرما دیا، اب یہ بات منقح ہو کر سامنے آ گئی کہ بیت المقدس کا استقبال عارضی تھا جو چند در چند مصالح کی بنا پر اختیار کرایا گیا تھا ورنہ اصلی قبلہ تو بیت اللہ ہی تھا، حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے یہ تمام نقشہ تھا اور "فلنولينك" کے بعد تو پورا یقین ہو گیا تھا کہ بس آج نہیں توکل ضرور بیت اللہ قبلہ ہو کر رہیگا، یہی وجہ ہے کہ جب تحویل قبلہ کے بعد ایک شخص نے جو آپ کے پیچھے بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ کر نکلا تھا جب مسجد بنی سلمہ میں پہنچا اور انکو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے دیکھا تو اس نے بہ حلف یہ کہا کہ میں ابھی ابھی بیت اللہ کی طرف نماز پڑھ کر آ رہا ہوں تو اہل مسجد بلا توقف نماز ہی کی حالت میں بیت اللہ کی طرف پھر گئے حالانکہ یہ شخص واحد کی خبر تھی جو محض ظنی ہے یہ مضمون آگے مفصل آرہا ہے۔

چنانچہ جب بیت اللہ کا حکم آ گیا اور اس عارضی قبلہ کو منسوخ قرار دیدیا گیا تو یہ اشکال پیش آیا کہ ہماری نمازوں کا کیا ہوگا جو عارضی قبلہ کی طرف ادا کی گئی ہیں کہ وہ مفضول قبلہ کی طرف ادا ہونے کے باعث مفضول ہوں گی اور جو لوگ زندہ ہیں وہ تو تدارک اور تلافی کر لیں گے لیکن جو لوگ وفات پا چکے ہیں ان کا کیا انجام ہونا ہے، آیت آ گئی کہ اللہ تعالیٰ ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں، غرض نسخ کی وجہ سے یہ اشکال پیش نہیں آیا بلکہ خود معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہو گئی تھی جس نے اشکال پیدا کر دیا۔

احوال واجداد | حضرت براءؓ کا بیان ہے کہ اول اول سے پہنچے تو آپ نے اپنے احوال واجداد کے یہاں نزول فرمایا، یہاں احوال واجداد کا لفظ استعمال کرنے میں مجاز کو اختیار کیا گیا ہے، کیونکہ آپ کے دادا

ہاشم ملک شام سے تجارت کے لئے مال لاتے اور لیجاتے تھے، راستہ میں مدینہ بھی پڑتا ہے وہاں بھی اترتے تھے، مدینہ میں ایک عورت تھی اس کا نام سلمیٰ تھا، یہ بہت حسین تھیں اور انہوں نے اپنے عقد کے لئے یہ شرط لگائی تھی کہ نکاح کا معاملہ میرے اختیار میں رہے گا جب چاہوں گی الگ کر دوں گی، ہاشم نے یہ شرط منظور کر لی اور عقد ہو گیا، ان سے عبدالمطلب پیدا ہوئے عبدالمطلب کا اصلی نام شیبۃ الحمد ہے ہاشم کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے اپنے حقیقی بھائی مطلب سے کہا کہ تم میرے بعد اس کو اپنی تربیت میں لے لینا، چنانچہ مطلب تربیت کے لئے شیبۃ الحمد کو لینے پہنچے اور اونٹ پر پیچھے بٹھالیا، لوگوں نے انہیں پیچھے بیٹھا دیکھ کر بے ساختہ عبدالمطلب کہا، اسی دن سے ان کا نام عبدالمطلب پڑ گیا، اس رشتہ سے بنونجار کے ساتھ آپ کی قرابت قائم ہوئی اور بنونجار آپ کے جد فاسد ہوئے اور اسی رشتہ سے انہیں احوال بھی کہنا صحیح ہوا چنانچہ ہجرت کے بعد آپ مدینہ پہنچے تو ہر قبیلہ کا سردار حاضر خدمت ہوا اور عرض کیا کہ حضرت ہمارے یہاں آرام بھی ہے اور حمایت بھی ہے، آپ فرماتے کہ اونٹنی کو چھوڑ دو یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے، یہ حضرات بھی پہنچے جنہیں آپ کے جد امجد ہاشم کی وساطت سے قرابت تھی، لیکن آپ نے یہی فرمایا چنانچہ ناقہ ایک مقام پر بیٹھ گیا اور پھر اٹھ کر چلا، پھر واپس آیا اور اسی جگہ پر بیٹھ گیا اور اس طرح بیٹھا کہ گردن ڈال دی، گویا اس میں جان ہی نہیں، یہ مکان حضرت ابوایوب انصاری کا تھا، ابوایوب آپ کے اس تنہیال کے حقیقی بھائی کے سلسلہ میں ہیں، اسی بنا پر احوال واجداد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

مدینہ میں استقبال بیت المقدس کی مدت | مدینہ پہنچ کر سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کا استقبال کیا گیا سولہ یا سترہ کی تعداد میں اختلاف ہے، بعض روایات میں صرف

سولہ ہے اور بعض میں صرف سترہ، لیکن بخاری کی اس روایت میں شک کے ساتھ دونوں کو ذکر کیا گیا ہے، تطبیق اس طرح دی گئی ہے کہ اس پر تو اتفاق ہے کہ مدینہ میں داخلہ ربیع الاول میں ہوا اور ابن عباس کی روایت کے مطابق بارہ ربیع الاول میں، اور اس پر بھی اکثر حضرات کا اتفاق ہے کہ اگلے سال پندرہ رجب کو تحویل قبلہ کا حکم آیا، ۱۲ ربیع الاول سے ۱۵ رجب تک سولہ ماہ اور تین دن ہوتے ہیں، اب اگر ماہ دخول اور ماہ تحویل کو الگ الگ شمار کریں تو سترہ ماہ ہوتے ہیں اور اگر دونوں کو ملا لیں تو سولہ ماہ رہ جاتے ہیں۔

یہود اور اہل کتاب کی مسرت | فرمایا گیا ہے کہ یہود کے ساتھ اہل کتاب بھی بیت المقدس کے قبلہ بنائے جانے پر خوش تھے، قرین قیاس یہ ہے کہ اہل کتاب سے نصاریٰ مراد ہوں لیکن

اشکال یہ ہے کہ نصاریٰ مراد ہیں تو یہود کی خوشی کی تو ایک جائز وجہ یہ تھی کہ ان کے قبلہ کا استقبال کیا جا رہا ہے، مگر نصاریٰ کی خوشی کے لئے اس میں کوئی سامان نہ تھا، بعض حضرات نے کہا ہے کہ نصاریٰ کی خوشی کی وجہ یہ تھی کہ ان کا قبلہ بیت اللحم بھی جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی اسی سمت میں واقع ہے اور خوشی کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسلام کے

مقابلہ پر تمام ملتیں ایک ہیں، نصاریٰ یہ سوچ سکتے تھے کہ بلا سے ہمارا قبلہ معین نہ ہوا لیکن جو قبلہ انکے لئے وجہ سکون تھا وہ بھی تو نہ بن سکا، اور اگر اہل کتاب سے نصاریٰ مراد نہ لیں تو کوئی اشکال ہی نہیں بلکہ یہ یہود سے مراد عوام اور اہل کتاب سے مراد علماء یہود بھی ہو سکتے ہیں، اور اہل کتاب سے وہ یہود بھی مراد ہو سکتے ہیں جو اسلام لے آئے تھے یا وہ یہود جو اسلام لانے والے تھے اور انکی خوشی کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں اپنے ایمان کیلئے ایک اور علامت مل گئی، کیونکہ آں حضور ﷺ کی نبوت کی علامتوں میں سے ایک یہ بھی علامت تھی کہ وہ کچھ دنوں تک بیت المقدس کا استقبال کریں گے۔

تحویل قبلہ اور نماز عصر | حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی وہ نماز جو بیت اللہ کی جانب رخ کر کے ادا کی گئی نماز عصر تھی اور سیر کی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نماز ظہر تھی، اس میں اختلاف ہے اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ عمل تحویل مسجد نبوی میں ہو یا مسجد بنی سلمہ میں۔

واقعہ یہ پیش آیا کہ بنو سلمہ میں بشر بن البراء بن المعرور کی وفات ہو گئی، آں حضور ﷺ نماز جنازہ ادا کر نیکے لئے تشریف لے گئے، یہ مقام مسجد نبوی سے تین میل کے فاصلہ پر ہے، وہاں ظہر کا وقت ہو گیا، آپ نے ظہر کی نماز مسجد بنی سلمہ میں ادا فرمائی، دو رکعت بیت المقدس کی جانب پڑھی جا چکی تھیں، کہ تحویل کا حکم آ گیا، اسی حالت میں آپ اور تمام اصحاب کرام بیت اللہ کی جانب متوجہ ہو گئے جو لوگ نماز میں شریک تھے انہیں تحویل کا علم ہو گیا، آج بھی اس مسجد میں دونوں قبلوں کی محرابیں بنی ہوئی ہیں، اس کے بعد پہلی وہ نماز جو پوری کی پوری بیت اللہ کی جانب ادا کی گئی نماز عصر ہے جو مسجد نبوی میں ادا ہوئی، یہاں بہت سے لوگوں کو علم ہوا اور ان کی وساطت سے دوسری مساجد تک اطلاع پہنچی، اہل قبا کو فجر میں تحویل کا علم ہو سکا، اب ان مختلف روایات، ظہر عصر اور فجر میں تطبیق دی جاسکتی ہے کہ اصل معاملہ تو ظہر میں پیش آیا لیکن مدینہ طیبہ میں اس کا علم عام طور اس وقت ہو سکا جب عصر کی نماز بیت اللہ میں پڑھی گئی۔

نماز ہی میں عمل تحویل | ارشاد ہے کہ ایک صحابی جنہوں نے عصر کی نماز آں حضور ﷺ کے ساتھ پڑھی تھی، دوسری مسجد والوں سے گزرے اور تحویل کی اطلاع دی، وہ لوگ بلا تردد گھوم گئے اس موقع پر ایک اشکال یہ کیا جاتا ہے کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا تو قطعی طور سے معلوم تھا، اس قطعی چیز کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے محض ایک صحابی کے حلفیہ بیان سے بدل دیا، حالانکہ ایک قطعی چیز کو بدلنے کیلئے دوسری قطعی چیز کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا مشہور اور صحیح جواب یہ ہے کہ گواہی صحابی کی خبر، خبر واحد ہے، لیکن یہ کس نے کہا کہ خبر واحد سے یقین حاصل نہیں ہوتا، البتہ یقین کے مراتب مختلف ہوتے ہیں اگر خبر واحد مقرون بالقرائن ہو تو اس سے قطعیت کا فائدہ ہوتا ہے، مثال کے طور پر یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ کے کانوں میں پڑوسی کی بیماری کی اطلاع ملی ہے، آپ دیکھتے ہیں کہ لوگوں کی آمد و رفت برابر جاری ہے، طیب اور ڈاکٹر بھی آ جا رہے ہیں، پھر دفعہ مکان سے رونے کی آواز آنے لگی، لوگ جوق در جوق اس کے مکان پر جمع ہونے لگے دیکھا گیا کہ سامنے کفن سل رہا ہے، لوگ ماتمی لباس پہنے ہوئے ہیں، اب

اگر کوئی اس پڑوسی کے انتقال کی خبر دیتا ہے تو بغیر کسی شبہ کے یقین آجاتا ہے کہ موت واقع ہوگئی، اس طرح بیت اللہ کا معاملہ ہے، صحابہ کرام کو تحویل کے متعلق معلومات ہیں، آپ کے طبعی رجحان کا علم ہے خداوند قدوس کا وعدہ

الحق من ربك فلا تكونن

یہ امر واقعی منجانب اللہ ہے، سو ہرگز شبہ

من الممترین (پ ۱۷۲) لانے والوں میں شمار نہ ہونا۔

بھی معلوم ہے، اب اگر کسی ایک صحابی کے بہ حلف اطلاع دینے پر یقین آگیا تو اس میں کچھ استبعاد نہیں اور نہ اشکال ہے کیونکہ ایک یقین دوسرے یقین کو تبدیل کر رہا ہے۔

ردالمختار شامی میں ہے کہ اگر غیر مصلی، مصلی کو تنبیہ کرے اور وہ بغیر سوچے سمجھے عمل شروع کر دے تو اسکی فقہی مسئلہ | تعلیم مفسد ہوگی اور اگر اس کی تعلیم کی بعد مصلی کو اپنی لغزش یاد آگئی اور اس نے عمل شروع کیا تو نماز درست ہوگی۔

بخاری کا دوسرا طریق | دوسرے طریق سے بھی یہ روایت امام کے پاس متصل ہے، تعلق نہیں ہے، کتاب التفسیر میں امام بخاری نے اسے متصل ذکر فرمایا ہے، اس میں فرمایا گیا ہے کہ قبلہ مفضولہ پر بعض صحابہ کا انتقال ہو گیا اور بعض مقتول ہو گئے، ان حضرات کے بارے میں اصحاب کرام کا بیان ہے کہ ہم فیصلہ نہ کر سکے یہ دس اصحاب تھے، تین مکہ میں عبد اللہ بن شہاب، مطلب بن ازہر اور سکران بن عمرو عامری اور پانچ حبشہ میں، خطاب بن الحارث، عمرو بن امیہ، عبد اللہ بن الحرث، عروہ بن عبد العزی اور عدی بن نصلہ اور دو مدینہ میں براء بن معرور، اور اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہم، ان حضرات کے بارے میں تشویش تھی آیت نازل فرمادی گئی، یہاں ”قتلوا“ کا لفظ لوگوں کے لئے باعث اشکال ہے کیوں کہ اس وقت تک کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی اور سوائے زہیر کی روایت کے اور کہیں ”قتلوا“ کا ذکر بھی نہیں ہے لیکن اشکال کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر جنگ نہیں ہوئی ہے تو قتل بھی نہ ہوا ہو، جنگ نہ سہی کفار کے ساتھ دشمنی تو تھی، اس سے بھی قتل کی نوبت آسکتی ہے۔

[۳۱] بَابُ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ

(۳۱) قَالَ مَالِكٌ أَخْبَرَنِي زَيْدُ بْنُ أَبِي عَطَاءٍ أَنَّ عَطَاءَ بْنَ يَسَارٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ أَبَا سَعِيدٍ الْخُدْرِيَّ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ سَمِعَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ إِذَا أَسْلَمَ الْعَبْدُ فَحَسَنَ إِسْلَامُهُ يُكْفِرُ اللَّهُ عَنْهُ كُلَّ سَيِّئَةٍ كَانَ زَلَفَهَا وَكَانَ بَعْدَ ذَلِكَ الْقِصَاصُ الْحَسَنَةَ بِعَشْرِ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةٍ ضِعْفٍ وَالسَّيِّئَةَ بِمِثْلِهَا إِلَّا أَنْ يَتَجَاوَزَ اللَّهُ عَنْهَا .

(۳۲) حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ مَنْصُورٍ قَالَ أَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ أَخْبَرَنَا مَعْمَرٌ عَنْ

هَمَّامٌ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِذَا أَحْسَنَ أَحَدُكُمْ إِسْلَامَهُ فَكُلُّ
حَسَنَةٍ يَفْعَلُهَا تُكْتَبُ لَهُ بِعَشْرِ امْتَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِائَةٍ ضِعْفٍ وَكُلُّ سَيِّئَةٍ يَفْعَلُهَا
تُكْتَبُ لَهُ بِمِثْلِهَا .

ترجمہ | باب، انسان کے اسلام کی اچھائی میں۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ انہوں نے رسول
اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ جب کوئی مسلمان ہو اور اس کا اسلام اچھا ہو تو اللہ تعالیٰ اسکی سچپلی کی ہوئی ہر
برائی کو معاف فرما دیتا ہے، اور اسکے بعد قصاص کا اصول چلتا ہے اچھائی کا بدلہ دس گنے سے لیکر سات سو گنے تک دیا
جاتا ہے اور برائی کا بدلہ اسی کے برابر، الا یہ کہ خداوند قدوس اسے معاف فر دیں۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی اپنے اسلام کو اچھا کر
لے تو ہر وہ اچھائی جس کا وہ ارتکاب کریگا دس گنی سے لیکر سات سو گنی تک لکھی جائے گی، اور ارتکاب کردہ ہر برائی اسی
جیسی لکھی جائیگی۔

باب سابق سے ربط | حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ باب سابق - الصلوة من الایمان - میں یہ ذکر تھا کہ صحابہ
کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے دین کا کس درجہ خیال اور اپنے مسلمان بھائیوں کیساتھ کس درجہ
ہمدردی تھی، اس تدین اور ہمدردی کا مظاہرہ تحریم خمر کے بارے میں ہوا اور خداوند کریم نے انکی طمانیت کے لئے آیت
لیس علی الذین آمنوا و عملوا الصالحات جناح فیما طعموا تا و اللہ یحب المحسنین نازل فرمائی،
اس آیت میں، نیز آیت انا لا نضیع اجر من احسن عملاً ان دونوں آیتوں میں لفظ احسان استعمال کیا گیا ہے،
اس مناسبت سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ”الصلوة من الایمان“ کے بعد ”حسن اسلام المرء“ کا باب منعقد
فرمایا، بات بڑی پاکیزہ ہے اور بڑی طویل مسافت کے بعد کہی گئی ہے یعنی پہلے واقعہ تحویل قبلہ سے صحابہ کے تدین
و ہمدردی کے جذبہ کی بنا پر تحریم خمر کی طرف انتقال ذہنی ہوا اور پھر تحریم خمر کے سلسلہ کی آیات سامنے آئیں جن میں لفظ
احسان کا استعمال کیا گیا تھا اور پھر اس مناسبت سے حسن اسلام المرء کا باب منعقد فرمایا، لیکن اس نکتہ آفرینی سے
علامہ عینی ناخوش ہیں، فرماتے ہیں کہ اس سے تو باب اور باب کے درمیان مناسبت قائم نہ ہوئی، پھر علامہ عینی نے ارشاد
فرمایا کہ مناسبت ظاہر ہے، باب سابق میں ”الصلوة من الایمان“ فرمایا تھا، اور معلوم ہے کہ دین و اسلام میں حسن
صلوة سے آتا ہے لا یحسن اسلام المرء الا بالصلوة واقعہ علامہ عینی رحمہ اللہ کا بیان کردہ ربط حافظ علیہ الرحمہ کے
ارشاد سے عمدہ اور قریب تر ہے۔

مقصد ترجمہ | امام بخاری مختلف صورتوں سے مرجیہ کی تردید کرتے آرہے ہیں، یہاں بھی اسلام کے لئے حسن
ثابت کر رہے ہیں جسکا حاصل یہ ہے کہ حسن اسلام کی صفت ہے، اور معلوم ہے کہ حسن میں مراتب

قائم ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام میں بھی مراتب قائم ہوں گے، امام بخاری کا مقصد حاصل ہو گیا کہ مرجیہ جو اعمال کی ضرورت کا یکسر انکار کرتے ہیں درست نہیں ہے، کیونکہ حدیث باب بتلا رہی ہے کہ اسلام کا حسن اعمال کا مرہون منت ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب انکا اختیار کرنا وجہ حسن ہے تو ان کا ترک موجب نقصان ہوگا اسی طرح حدیث باب کے دوسرے جز سے جس میں سیدہ کا ذکر ہے خارجہ کی بھی تردید ہوگئی کہ سیدہ سے مسلمان اسلام سے خارج نہیں ہوتا بلکہ مسلمان ہی رہتا ہے۔

مفہوم حدیث | ارشاد ہے کہ جب کوئی شخص سچے دل سے اسلام قبول کر لے اور وہ نمائشی نہ ہو، تو خداوند قدوس اس اسلام کی برکت سے اس کے تمام سابق گناہوں کو معاف فرمادیتا ہے، یہی مضمون دوسری حدیث میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔ الا سلام یهدم ما کان قبلہ (مسلم جلد ۱ ص ۷۶) اسلام اپنے سے قبل کے گناہ منہدم کر دیتا ہے۔

اور اسکے بعد معاملہ برابری، سرا بری کا چلیگا، جس کی تعبیر لسان شرع میں قصاص سے کی گئی جس کی تشریح یہ ہے کہ اگر نیکی کا عمل ہوگا تو اس پر ثواب دس گنا کر دیا جائے گا اور یہ آخری حد نہیں بلکہ بقدر اخلاص درجات بڑھتے رہیں گے حتیٰ کہ یہ بڑھوتری متجاوز ہو کر سات سو تک پہنچ جاتی ہے اور یہ سات سو بھی آخری حد نہیں ہے بلکہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

واللہ یضاعف لمن یشاء (پ ۴۳) اور اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے یہ افزونی عطا کرتا ہے

یہاں مضاعفت کی کوئی حد نہیں ہے چنانچہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ارشاد ہے۔

کتب اللہ عشر حسنات الی سبع مائة اللہ تعالیٰ ایک نیکی کا بدلہ دس سے لیکر سات سو تک،

ضعف الی اضعاف کثیرہ (مسلم شریف) بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ عطا فرماتے ہیں۔

اور جہاں تک سیئات کا تعلق ہے انہیں بڑھا کر نہیں لکھیں گے، عام اس سے کہ وہ سیدہ کبیرہ ہو یا صغیرہ، اس کا مرتکب مرد ہو یا عورت بلکہ جس درجہ کا سیدہ ہوگا اسی قدر اس کی جزا لکھدی جائیگی لیکن اگر اسلام میں حسن نہیں ہے بلکہ وہ ایک نمائشی چیز ہے تو اس کے اگلے پچھلے گناہوں کی معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اگلے اور پچھلے گناہ قائم رہتے ہیں اور ہر گناہ پر مواخذہ ہوتا ہے، رہے وہ حسنہ جن کا مدار ہی نمائشی ایمان پر ہے ہرگز وجہ ثواب نہیں ہو سکتے، ہاں کافروں کے دوسرے اچھے کام (مثلاً رفاہ عام کے کام) اگرچہ نار سے نجات کا سامان نہیں ہو سکتے لیکن عذاب میں تخفیف کا باعث ہو سکتے ہیں۔

کافر کے اچھے اعمال کا حکم | یہاں ایک اشکال یہ کیا گیا ہے کہ حضرت ابوسعید الخدریؓ کی اس روایت میں ایک دوسرا حصہ اور بھی ہے کہ کافر اگر سچے دل سے مسلمان ہو جائے تو ایام کفر کے حسنات

بھی اس کے بپاقہ اعمال میں لکھ دئے جاتے ہیں، نووی نے کہا ہے کہ امام مالک سے دارقطنی نے اس حصہ کو نو طریق سے ذکر فرمایا ہے، شارحین کا خیال ہے کہ یہ حذف اتفاقی نہیں ہو سکتا، بلکہ عمداً امام بخاری اس کو نظر انداز فرما رہے ہیں، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ٹکڑا اصول شریعت کے خلاف معلوم ہو رہا ہے، اصول امام بخاری کے نزدیک یہ ہے کہ زمانہ کفر کی کوئی نیکی قابل قبول نہیں، اور چونکہ یہ روایت اس کے خلاف نظر آئی اس لئے اسے حذف کر دیا مگر دیکھنا یہ ہے کہ یہ اصول احادیث کی روشنی میں درست بھی ہے یا نہیں۔

حکیم بن حزامؓ نے آں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ مجھے ایام جاہلیت کے اچھے کاموں کا کچھ فائدہ حاصل ہو گا یا نہیں، پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا

اسلمت علی ما اسلفت من خیر (مسلم جلد ۱ ص ۷۶) تمہیں سابق اعمال خیر ہی پر توفیق اسلام ہوئی ہے اگر اس کے یہ معنی لئے جائیں کہ تمہیں اسلام کی توفیق انہیں اعمال خیر کے باعث ہوئی ہے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ ایام کفر کے اعمال صالحہ کارآمد ہو گئے، جب بحالت کفر اعمال صالحہ کا اعتبار ہو سکتا ہے تو کفر کے بعد اسلام کی حالت میں ان کا اعتبار بدرجہ اولیٰ کرنا چاہیے، اور اگر ”علی ما اسلفت“ میں کلمہ علی، مع کے معنی میں ہو تو اس وقت یوں ترجمہ ہو گا کہ تم اپنے سابق اعمال خیر کو ساتھ لئے ہوئے مسلمان ہوئے ہو، یعنی اسلام کی برکت سے تمہارے جملہ اعمال خیر قائم رہے اور آئندہ کے لئے ترقی درجات کا دروازہ کھل گیا۔

اسی طرح ابوطالب کا معاملہ ہے جو آں حضور ﷺ کی بڑی خدمت کرتے تھے، پیغمبر علیہ السلام سے ان کے بارے میں دریافت کیا گیا فرمایا کہ اگر ان کے یہ اعمال نہ ہوتے تو انہیں جہنم کے وسط میں رکھا جاتا لیکن ان اعمال کی وجہ سے انہیں جہنم کے کنارے پر رکھا گیا ہے، ان کے پیر کے جوتے کے تھے آگ کے ہیں جس سے ان کا دماغ کھولتا رہتا ہے، حضرت عائشہؓ نے ابن جدعان کے بارے میں دریافت کیا کہ ان کے اعمال خیر کا کیا صلہ دیا گیا، آپ نے فرمایا کہ انہوں نے کبھی یہ الفاظ ادا نہیں کئے۔

رب اغفر لی خطیبتی یوم الدین اے اللہ! قیامت کے دن میرے گناہوں کو بخش دینا۔

معلوم ہوا کہ اگر وہ اسلام کے بعد یہ کلمات صدق دل سے کہہ لیتے تو ان کے ایام کفر کے اعمال صالحہ کا اعتبار

ہو جاتا۔

علامہ کشمیریؒ کا ارشاد | حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا اور اس ارشاد پر انہیں پورا پورا وثوق ہے کہ جو طاعات کفر کے زمانہ میں کی گئی ہیں ان کی دو قسم ہیں ایک عبادات اور دوسرے قربات، عبادت کیلئے نیت شرط ہے اور نیت کی شرط اسلام ہے، اسلئے کافر کا کوئی عمل عبادت نہیں بن سکتا، لیکن اس کے علاوہ اور امور جو نیکیوں سے متعلق ہیں وہ یقیناً آخرت اور دنیا دونوں میں کارآمد ہوں گے، آخرت کا ثمرہ اسلام و ایمان کے

بغیر نجات عن النار تو ہونہیں سکتا کیونکہ یہ تو صرف ایمان پر موقوف ہے، ہاں عذاب میں تخفیف ہو سکتی ہے، رحم دل کافر کو بد مزاج کے مقابلہ میں، اسی طرح عادل کو ظالم کے مقابلہ میں عذاب کی تخفیف رہے گی، بہر حال کافر کے طاعات و قربات جبکہ وہ کفر ہی پر مرے عذاب میں تخفیف پیدا کر دیتے ہیں اور اگر اسلام پر خاتمہ ہو تو خداوند قدوس اسلام کی برکت سے بہ طور تفضل اور احسان اسکے ان اعمال پر بھی ثواب عطا فرمائے گا، یہی حق ہے۔

سابق میں معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اسکی بدولت کفر کے زمانے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور آئندہ ترقی درجات کا راستہ کھل جاتا ہے، مگر امام احمد نے اس پر تعجب کا اظہار فرمایا کہ امام ابوحنیفہ یہ کہاں سے فرماتے ہیں کہ اسلام سابق گناہوں کا ہادم ہے، حالانکہ عبد اللہ بن مسعود کی حدیث میں تو صاف مذکور ہے کہ مسی فی الاسلام سے اسکے قبل الاسلام اور بعد الاسلام دونوں قسم کے گناہوں پر مواخذہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ جب پہلے گناہوں کا ہدم ہو چکا اور وہ اسکے نامہ اعمال سے مٹا دئے گئے تو پھر اس پر مواخذہ کیسا؟ معلوم ہوا کہ محض اسلام لانا جاہلی گناہوں کا ہادم نہیں بلکہ اول ان گناہوں سے توبہ کرائی جائے، اسکے بعد کلمۃ الاسلام پیش ہو، توبہ سے سابق گناہ معاف ہونگے اور اسلام سے قرب الہی کا راستہ آسان ہوگا، جمہور کی رائے اس سے مختلف ہے، ان کے نزدیک اسلام خود توبہ کو مضمّن ہے جب کوئی اسلام قبول کرتا ہے تو سابق ادیان و اعمال سے تفرق اور اعمال اسلام سے مناسبت کے نتیجے میں کرتا ہے، اگر اعمال اسلام اسے پسند نہ ہوتے تو وہ قبول ہی کیوں کرتا، اس کا اپنی رغبت سے اسلام کے اندر آنا ہی اسکی محکم دلیل ہے کہ وہ سابق دین اور اسکے اعمال سے بیزار ہے، یہی معنی الاسلام بھدم ما کان قبلہ۔ کے ہیں اس سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ اعمال کفریہ کفر سے ناشی تھے، اسلام حسن نے کفر کی جڑ اکھاڑ دی اور اسکی جگہ ایمان نے لے لی، جڑ اکھڑی تو ساتھ ساتھ اسکی فروع بھی اکھڑ گئیں، لہذا سابق اعمال کفریہ تو سچے اسلام کے ساتھ ہی ختم ہو گئے، اسلام کے بعد کے اعمال کا معاملہ تو وہ حسب تصریح حدیث علیحدہ رہیگا، رہے امام احمد رحمہ اللہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسلام کو ایک معاہدہ کی صورت دے رہے ہیں جس کی ماتحت متعدد دفعات ہیں، خداوند قدوس کی جانب سے رسول کی معرفت وہ عہد نامہ بندہ کے سامنے پیش ہوتا ہے اور بندہ ان تمام دفعات پر خداوند قدوس سے اسکی پابندی کا عہد کرتا ہے پھر اگر وہ شخص مسلمان ہونیکے بعد اپنی سابق حرکات سے باز نہیں آتا تو اسکے معنی یہ ہوئے کہ اس شخص نے معاہدہ کی بعض دفعات کو قبول ہی نہیں کیا، لہذا اسکے اول گناہوں پر مواخذہ قائم رہا، اس تحقیق کا حاصل یہ ہوا کہ امام احمد کے نزدیک ایمان بذات خود مطلوب نہیں بلکہ اعمال صالحہ مقصود ہیں اور اسلام و ایمان اس مقصد کا ذریعہ، حالانکہ اصل اور مقصود ایمان ہے، اعمال اس کی فرع اور تابع ہیں، امام احمد رحمہ اللہ نے اصل کو فرع اور فرع کو اصل بنا دیا، اب سنئے جس پر امام احمد رحمہ اللہ تعجب فرما رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہ دعویٰ ابن مسعود کی حدیث کے بالکل خلاف ہے، یہ محض ان کا خیال ہی

خیال ہے، ورنہ امام ابوحنیفہؒ کا پایہ نہایت مضبوط ہے، دیکھئے مسلم میں الاسلام یہدم ما کان قبلہ صحیح طریق سے موجود ہے، ابن مسعودؓ والی روایت جسے آپ اپنے خیال میں معاون سمجھ رہے ہیں اس کے معارض نہیں، حقیقت میں اسلام حسن اور اسلام سوء، یہ دو جدا گانہ چیزیں ہیں اور دونوں کے نتائج و ثمرات بھی الگ الگ ہیں، اسلام حسن، ظاہر و باطن کے انقیاد سے عبارت ہے، اس کا نتیجہ ہدم سینات ہے اور دوسرے اسلام سوء، یہ ظاہر و باطن کی تفریق کا نام ہے، اس کا نتیجہ ہدم سینات نہیں بلکہ اخذ بالاول والآخر اس کا ثمرہ ہے، اس معنی کے لحاظ سے نہ احادیث میں تعارض باقی رہتا ہے، نہ مذہب پر کوئی اشکال ہوتا ہے، یہی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا مختار ہے اور اسی کو امام نوویؒ نے ترجیح دی ہے۔ امام احمدؒ سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اسلام میں داخل ہونے سے قبل توبہ کے کیا معنی؟ کیا حالت کفر کی توبہ بھی قبول ہوسکتی ہے، یہ تو وہی بات ہوگئی کہ تارک صلوة کافر ہو گیا، امام احمدؒ نے فرمایا، امام شافعیؒ نے کہا اچھا پھر مسلمان کیسے ہو؟ امام نے فرمایا نماز پڑھے، امام شافعیؒ نے کہا، کیا حالت کفر کی نماز درست ہوگی، امام احمد خاموش ہو گئے!

[۳۲] بَابُ أَحَبِّ الدِّينِ إِلَى اللَّهِ أَدْوَمُهُ

(۲۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنَّى قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ هِشَامٍ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبِي عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ دَخَلَ عَلَيْهَا وَعِنْدَهَا امْرَأَةٌ فَقَالَ مِنْ هَذِهِ قَالَتْ فُلَانَةٌ تُذَكِّرُ مِنْ صَلَاتِهَا قَالَ مَهْ عَلَيْكُمْ بِمَا تُطِيقُونَ فَوَاللَّهِ لَا يَمْلُ اللَّهُ حَتَّى تَمَلُّوا أَوْ كَانَ أَحَبُّ الدِّينِ إِلَيْهِ مَا دَاوَمَهُ عَلَيْهِ صَاحِبُهُ.

(آئندہ: ۱۱۵۱)

ترجمہ | باب، اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ محبوب دین وہ ہے جس پر مداومت کی جائے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ تشریف لائے، اسوقت ایک عورت بھی ان کے پاس بیٹھی تھی، آپ نے فرمایا یہ کون ہے؟ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا فلاں عورت ہے جس کی نماز کا بڑا چرچا ہے، آپ نے فرمایا بس کرو، تمہیں وہی عمل اختیار کرنا چاہیے جسے نبھا سکو، پس قسم اللہ کی، اللہ تنگ دل نہیں ہوتا یہاں تک کہ تم تنگ دل ہو، اور اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین وہ ہے جس پر مداومت کی جائے۔

مقصد ترجمہ | مقصد وہی مرجیہ کی تردید ہے کہ یہاں اعمال پر دین کا اطلاق کیا گیا ہے، کیونکہ احب الدین الیہ ماداوم علیہ صاحبہ میں ظاہر ہے کہ اعتقادات مراد نہیں لئے جاسکتے، کیونکہ وہاں تو ذرا بھی شک ہو اور ایمان رخصت، اس لئے ظاہر ہے کہ مراد اعمال ہی ہونگے، امام بخاریؒ کا مقصد مرجیہ کے مقابل میں اس طرح حاصل ہوگا کہ حدیث باب سے معلوم ہوا کہ اعمال کی مطلوبیت تو مسلم ہے ہی، اس سے آگے ان اعمال پر دوام اور استمرار بھی مطلوب ہے، پھر جو عمل ہی کو دین نہ ماننا ہو وہ دوام عمل کو کیا مانے گا۔

ترجمہ سابق سے مناسبت

حافظ ابن حجر نے ترجمہ سابق سے مناسبت کے سلسلہ میں فرمایا کہ باب سابق میں یہ کہا گیا تھا کہ اسلام و ایمان میں حسن اعمال سے آتا ہے، اب ان اعمال کی حد بندی فرما رہے ہیں کہ اعمال مطلوب تو ہیں مگر اس درجہ میں نہیں کہ تم اعمال سے زبردستی کرنے لگو بلکہ اس حد تک مطلوب ہیں کہ ان پر دوام ہو سکے، حافظ کا ارشاد بھی درست ہے ورنہ بات اچھی تو یہ تھی کہ باب سابق میں فرمایا تھا کہ حسن اسلام مطلوب ہے اور اس باب میں فرمایا کہ وہ حسن دوام عمل میں ہے۔

مفہوم حدیث

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، حواء بنت تویت میرے پاس بیٹھی تھیں، آپ کے تشریف لانے پر یہ اٹھیں، آپ نے پوچھا یہ کون ہیں، حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ یہ حواء بنت تویت ہیں، اب اگر ”تذکرہ بالتاء معروف“ ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ یہ نمازیں بہت پڑھتی ہیں، یعنی فرائض کے علاوہ نوافل کے لئے رات بھر کھڑی رہتی ہیں، اور اگر ”یذکرہ بالیاء مجہول“ ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ وہی ہیں جن کی نماز کا بڑا چرچا ہے، یہ سکر آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ خطاب حضرت عائشہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ بس رہنے دو زبان بند کرو، یعنی منہ پر تعریف نہیں کیا کرتے، اس سے شیطان کو رہزنی کا موقع ملتا ہے، اور اگر وہ حواء سے خطاب ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ بس کرو جی! اتنا زیادہ بار اپنے اوپر نہ لینا چاہیے جس کا نبھانا دشوار ہو جائے، آگے فرمایا علیکم بما تطیعون اتنا کام کرو جسے نبھاسکو، عمل اتنا نہ ہو کہ دل تنگی کے باعث ترک عمل تک نوبت پہنچے، فرماتے ہیں کہ خداوند کریم تو اجر دینے میں دل تنگی نہیں کرتا، ہاں تم ہی عمل سے اکتا جاؤ اور کام چھوڑ بیٹھو تو اس کا کیا علاج ہے۔

ملال کے معنی

الفاظ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند قدوس کے یہاں بھی ملال ہے، حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ ملال کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز پہلے رغبت اور توجہ سے شروع کی گئی تھی، اب دل تنگی کے باعث چھوڑی جا رہی ہے اور ان معنی کا استعمال خداوند قدوس کی شان میں گستاخی ہے، اسلئے ملال کے مختلف معنی کئے گئے، اچھے اور مناسب معنی یہ ہیں کہ ملال کا نتیجہ ترک ہے، جب کسی چیز سے ملال خاطر متعلق ہو جاتا ہے تو انسان اسے چھوڑ دیتا ہے، خداوند قدوس کی جانب اس لفظ کی نسبت اسی ترک کے معنی میں کی گئی ہے، مراد یہ ہے کہ خداوند قدوس ثواب سے اس وقت تک محروم نہیں کرتا جب تک کہ تم عمل ترک نہیں کرتے، مفہوم یہ ہے کہ خداوند قدوس تو اعمال پر جزا دیتا ہے، اب اگر کوئی عمل سے جی چراتا ہے تو یہ اس کی حرماں نصیبی ہے، گویا خداوند قدوس کے لئے ملال کا لفظ بہ طور صنعت مشاکلہ استعمال کیا گیا ہے جیسے فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم یا جزاء سیئۃ سیئۃ مثلاً یہاں اعتداء اور سیئہ کے جواب کو اعتداء اور سیئہ کہا گیا ہے، حالانکہ نہ اعتداء کا جواب اعتداء ہے اور نہ سیئہ کا بدلہ سیئہ، دوسرے معنی یہ ہیں کہ خداوند قدوس کے یہاں ملال نہیں ہے، یعنی وہ دینے سے نہیں تھکتا، پھر کیا بات ہے کہ تم تھک جاتے ہو، یعنی اگر دینے میں کمی کرتا تو تمہارا دل تنگ ہو جانا ایک درجہ میں معقول تھا لیکن جب ایسا نہیں ہے تو تمہاری

جانب سے دل تنگی کا مظاہرہ بالکل ناروا ہے، اسلئے صرف ایسے کام اختیار کرو جن پر تمہیں نبھانے کا پورا یقین ہو۔
دوام عمل کا فائدہ فرمایا گیا کہ خداوند قدوس کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ وہ عمل ہے جس پر مداومت ہو، یعنی خداوند کریم دیکھنا چاہتا ہے کہ میرا بندہ واقعی مجھ سے تعلق رکھتا ہے، اور مجھ کو معبود مان کر میری اطاعت کر رہا ہے یا غرض کا بندہ ہے، اگر عمل کا مقصد اپنی نیاز مندی اور بندگی کا اظہار ہے تو عامل کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ عمل کو بہ تدریج ترقی دیتا رہے اور کسی وقت بھی اس سے پریشان خاطر ہو کر چھوڑنے کو تیار نہ ہو لیکن خود غرضی کا کام کبھی پورا نہیں ہوگا، غرض پوری ہو یا نہ ہو، اول صورت میں غرض نکلنے کے بعد کام کی ضرورت نہیں رہی، اور ثانی تقدیر پر مایوسی ترک عمل کا سبب بن جائیگی۔

یاد رکھئے کہ عمل خواہ کتنا بھی چھوٹا ہو، لیکن اگر اس میں مداومت ہے تو اس سے انسان کی غلامی اور بندگی کا اظہار ہوتا ہے اور اگر جوش میں بڑا کام شروع کر دیا لیکن چند دن کے بعد اسے ترک کرنا پڑ گیا تو اس میں آقا کی ناراضگی کا اندیشہ ہے، ایک شخص شاہی دربار میں روزانہ حاضری دیتا ہے اور روزانہ معین وقت پر حاضری دیکر چلا جاتا ہے تو وہ ایک نہ ایک دن بادشاہ کی توجہات کھینچ لے گا، لیکن وہ انسان جو صرف ایک بار آیا اور دربار کے پورے وقت حاضر رہا، شہنشاہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا، اسلئے مداومت میں تقرب کی شان نمایاں ہے، امام غزالی رحمہ اللہ نے اس کی مثال یہ دی ہے کہ کسی چٹان پر اگر ایک موسلا دھار بارش ہو جائے تو ظاہر ہے کہ چٹان پر اس کا کچھ اثر نہ ہوگا، لیکن اگر قطرہ قطرہ ہو کر مسلسل گرتا رہے تو وہ پتھر کے اندر اپنی جگہ بنا لیتا ہے، اس لئے اپنی غلامی کے اظہار اور خداوند قدوس کا قرب حاصل کر نیچے لئے ضروری ہے کہ عمل میں مداومت ہو، خواہ وہ عمل کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو۔

الفاظ حدیث پر ایک اشکال اور اس کا جواب لفظ منہ بمعنی اکفف اسم فعل ہے، اس کا خطاب حضرت عائشہؓ اور حواءؓ دونوں سے ہو سکتا ہے، شارحین کے عام مذاق کے مطابق اسکی توجیہ و تقریر بھی کر دی گئی ہے، یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ منہ پر تعریف کرنا ناجائز ہے تو حضرت عائشہ نے ایسا کیوں کیا، اس کے جواب میں حسن بن سفیان کے مسند سے یہ نقل کیا جاتا ہے کہ یہ بات ان کے چلے جانے کے بعد ہوئی تھی، چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہیں۔ کانت عندی امرأة فلما قامت قال رسول اللہ ﷺ من

ہذہ آہ لغيری یہ تعریف انکی موجودگی میں نہیں ہوئی تاکہ اعتراض پیدا ہو، اس اعتراض کی صحت اس پر موقوف ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس سے قبل منہ پر تعریف کرنے کو منع فرمایا ہو، اگر ممانعت اسی وقت ہوئی ہو جس وقت حضرت عائشہؓ ان کی تعریف کرنے لگی ہوں تو نہ اعتراض پڑتا ہے اور نہ جواب کی ضرورت رہتی ہے، پھر اگر یہ بات ہے تو منہ فرما کر روکنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تو کوئی خوبی کی بات نہ ہوئی جس کی تعریف تم کر رہی ہو کیونکہ اس قسم کے شدید

مجاہدات کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوتا، کیونکہ چند روز کے بعد تھکاوٹ محسوس ہونے لگے گی اور اس سے بہ وقتِ عمل گھبراہٹ پیدا ہو جائے گی اور دل تنگی ہوگی، نتیجہ میں یا عمل چھوڑ بیٹھے گا یا بیدلی کے ساتھ کرتار ہے گا اور دونوں حالتیں مذموم ہیں، عمل ترک ہو گیا تو اس کا اجر بھی ختم ہو گیا، اور اگر بیدلی کے ساتھ کرتار ہا تو بیکار کیا، کیونکہ اصل عمل تو قلب کا عمل ہے، جب دل میں عمل کی رغبت نہیں بلکہ اس کے برعکس ایک گونہ نفرت ہو گئی ہے تو وہ عمل، منافقانہ عمل کے مشابہ ہو گیا اعاذنا اللہ منہ، اور یہ خطاب حضرت عائشہؓ کی وساطت سے حواء سے ہو سکتا ہے، یعنی وہ اگر چلی بھی گئی ہوں تو حضرت عائشہؓ ان کو یہ پیغام پہنچادیں، ورنہ مجرد قیام خروج کو مستلزم نہیں اور خروج کے بعد بھی انہیں واپس بلا کر تعلیم کا موقعہ ہو سکتا ہے۔

واللہ اعلم

[۳۳] بَابُ زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَ تَقْصَانِهِ

وَقَوْلِ اللَّهِ زِدْنَهُمْ هُدًى (كهف: ۱۳) وَيَزِدَادُ الَّذِينَ آمَنُوا إِيمَانًا (مدثر: ۳۱)
 وَقَالَ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ (مائدة: ۳) فَإِذَا تَرَكَ شَيْئًا مِنَ الْكَمَالِ فَهُوَ نَاقِصٌ
 (۳۳) حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ أَبِرَاهِيمَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ حَدَّثَنَا قَتَادَةُ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ
 ﷺ قَالَ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزُنْ شَعِيرَةٌ مِنْ خَيْرٍ وَيَخْرُجُ
 مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزُنْ بُرَّةٌ مِنْ خَيْرٍ وَيَخْرُجُ مِنَ النَّارِ مَنْ قَالَ لَا
 إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَفِي قَلْبِهِ وَزُنْ ذَرَّةٌ مِنْ خَيْرٍ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ قَالَ أَبَانُ حَدَّثَنَا قَتَادَةُ حَدَّثَنَا
 أَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِنْ إِيمَانٍ مَكَانٍ خَيْرٍ .

(آئندہ: ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸)

ترجمہ باب، ایمان کی کمی اور زیادتی کا بیان، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہم نے ان (یعنی اصحاب کھف) کی ہدایت میں اور ترقی کردی تھی اور ایمان والوں کا ایمان اور بڑھ جائے۔ اور بڑھتے رہتے ہیں ایمان والے اپنے ایمان میں اور ارشاد فرمایا، آج میں نے تمہارا دین تمہارے لئے مکمل کر دیا، پس اگر کمال میں سے کوئی چیز چھوڑ دی جائے تو وہ شخص نقصان میں آجائے گا۔

حضرت انسؓ نے بیان فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جہنم سے ہر وہ شخص نکلے گا یا نکال لیا جائے گا جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اسکے دل میں جو کے برابر بھی خیر ہو اور جہنم سے ہر وہ شخص نکلے گا یا نکال لیا جائے گا جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اسکے دل میں جیہوں کے برابر خیر ہو اور جہنم سے نکلے گا یا نکال لیا جائے گا جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اسکے دل میں ذرہ برابر بھی خیر ہو۔ امام بخاریؒ نے کہا کہ ابان نے حضرت قتادہ سے حدیث بیان کی اور

انہوں نے حضرت انسؓ سے (بصیغہ تحدیث) رسول اکرم ﷺ سے اس روایت میں من خیر کی جگہ من ایمان کا لفظ نقل فرمایا۔

الزام تکرار اور اسکی حقیقت | امام بخاریؒ باب منعقد فرما رہے ہیں کہ ایمان کی زیادتی کو قبول کرتا ہے کتاب الایمان کے اوائل میں ”باب بنی الاسلام علی خمس“ کے ذیل میں ”یزید وینقص“ کا ذکر آچکا ہے اسلئے بہ ظاہر تکرار کا اشتباہ ہوتا ہے، اسکے مختلف جوابات دئے گئے ہیں۔

پہلا جواب یہ دیا گیا ہے کہ زیادت و نقصان کا ذکر وہاں ضمنی طور پر آ گیا تھا، مقصود بالذات نہ تھا مقصود تو ”بنی الاسلام علی خمس“ تھا اور اسی کے لئے حدیث مرفوع بھی ذکر فرمائی تھی، اور یہاں مقصود کی زیادتی کا بیان ہے اسلئے الزام تکرار درست نہیں، جواب قاعدہ کے مطابق صحیح ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ امام نے وہاں تین ترجمے رکھے تھے اور تینوں ترجمے باہم اس طرح مربوط تھے کہ سابق لاحق کیلئے بمنزلہ علت کے تھا، اس لئے وہاں زیادت و نقصان کی بحث کو ذیلی قرار دینا صحیح نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ عنوان بدلا ہوا ہے، وہاں امام نے ”بنی الاسلام“ فرمایا تھا گویا یزید وینقص میں اسلام کی کمی زیادتی بتلائی تھی اور یہاں زیادت و نقصان کے ساتھ ایمان کا لفظ استعمال فرمایا ہے، اگرچہ امام بخاریؒ کے نزدیک اسلام و ایمان لازم و ملزوم ہیں یا ان میں مساوات کی نسبت ہے لیکن امام نے اپنے مذاق کے مطابق تراجم میں کہیں لفظ اسلام استعمال کیا ہے اور کہیں ایمان، اسلئے یہ جواب بھی ہو سکتا ہے، یعنی وہاں اسلام کا قابل زیادت و نقصان ہونا مذکور ہے اور یہاں براہ راست ایمان میں زیادتی و کمی کو ثابت کیا جا رہا ہے وہاں تو مرجحہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلام میں کمی بیشی کے تو ہم منکر نہیں ہیں، گفتگو تو ایمان کے بارے میں ہے اور وہ ابھی تک ثابت نہیں اور یہ ضروری نہیں کہ امام بخاریؒ کی طرح مرجحہ بھی ایمان و اسلام کو مساوی یا متحد و لازم و ملزوم کہیں، لہذا اس باب کی شدید ضرورت محسوس کی گئی اور سابق باب کو اثبات مقصد میں کافی نہیں سمجھا گیا۔

چوتھا جواب یہ ہے کہ ایمان کی کمی بیشی کئی طرح کی ہے ایک کمی و بیشی نفس تصدیق کے اعتبار سے ہے اور دوسری کمی و بیشی عمل سے متعلق ہے اور تیسرے مومن بہ کے لحاظ سے ہے، امام فرماتے ہیں کہ ایمان ہر طرح کی کمی و بیشی کو قبول کر لیتا ہے، تصدیق کی کمی و بیشی تو ایمان کی کیفیات میں سے ہے اور عمل کے اعتبار سے کمی و بیشی ظاہر ہے، مومن بہ کے اعتبار سے کمی و بیشی کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے دو چار ہی چیزوں پر ایمان لانا ضروری تھا اور بعد میں ان کی تعداد بڑھ گئی اور جب وہ تمام چیزیں سامنے آ گئیں تو اعلان ہو گیا الیوم اکملت لکم دینکم، اس باب میں مومن بہ کے بارے میں کمی و بیشی کا اثبات مقصود ہے، یہاں امام نے تین آیتیں ذکر کی ہیں، تیسری آیت بتلا رہی ہے کہ پہلی دو آیتوں

پہلے ترجمہ سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ کلمہ بمعنی معروف و مجهول دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ ۱۲

میں بھی مومن بہ کی کمی زیادتی مقصود ہے، کیونکہ تیسری آیت تو یقیناً مومن بہ کی زیادتی کے لئے آئی ہے، اب ایمان کی یہ کمی و بیشی، جو مومن بہ کے اعتبار سے ہے، نسبی اور اضافی ہوگی، واقعی نہیں، کیونکہ واقعی ایمان تو جمیع ماجاء بہ الرسول کی تصدیق ہے اور وہ بہر صورت حاصل ہے مومن بہ ایک ہو یا ہزار، کیونکہ ”ما جاء بہ الرسول“ کی تصدیق کا مطلب تو یہ ہے کہ جو آچکی ہیں وہ بھی سچی ہیں اور جو آئیں گی وہ بھی برحق ہیں، اس لئے وہ صحابہ بھی کامل الایمان تھے جو فرضیت صلوة کے بعد رخصت ہو گئے اور وہ بھی کامل الایمان رہے جن کا وصال بعد میں ہوا، اب الزام تکرار ختم ہو گیا، کیونکہ یہاں مومن بہ کے اعتبار سے زیادتی و کمی کا اثبات منظور ہے، وہاں نہ تھا۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن جہنم سے تمام وہ لوگ نکال لئے جائیں گے جنہوں نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا ہو اور انکے دل میں جو یا گے ہوں یا بقدر ذرہ ایمان ہو

یہاں خیر سے مراد ایمان بھی ہو سکتا ہے اور ایمان سے متعلق دوسرے امور بھی اور وہ کیفیات بھی مراد ہو سکتی ہیں جو ایمان کے آثار میں شمار کی جاتی ہیں جیسے انبساط و انشراح وغیرہ، یہاں اشکال یہ پیش آتا ہے کہ ترجمہ ایمان کی کمی زیادتی کا تھا اور حدیث خیر کی کمی زیادتی بتلا رہی ہے اور خیر عمل سے عبارت ہے اس سے بھی معلوم ہوا کہ زیادتی و کمی نفس ایمان کی نہیں، شرائع و احکام کی ہے اس کے لئے امام بخاری نے متابع پیش کر کے یہ بتلادیا کہ خیر سے مراد ایمان ہے۔

متابعت کے فوائد | متابعت کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ ابان نے قتادہ کے طریق سے حضرت انسؓ کی اس روایت میں ”خیر“ کے بجائے ”ایمان“ کا لفظ ذکر کیا ہے، گویا یہاں خیر سے ایمان مراد ہے، متابعت کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ قتادہ مدلس ہیں، اگر سماع کی تصریح نہ ہو تو ان کا عنعنہ قابل قبول نہیں ہوتا اور یہ روایت معصن تھی اس لئے امام نے متابع نقل فرما کر تحدیث کی تصریح کر دی۔

اب شبہ ہو سکتا ہے کہ جب ابان کی روایت میں قتادہ نے تحدیث کی تصریح کی ہے تو امام بخاری کو ابان ہی کی روایت ذیل میں ذکر کرنی چاہئے تھی، ایسا کیوں کیا کہ ہشام کی یہ روایت جو قتادہ سے عنعنہ کے ساتھ ہے اس کو تو باب میں اصل قرار دیا پھر متابعت پیش کر کے اس تائید میں تحدیث کی تصریح نقل کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ گویا ابان اور ہشام دونوں ہی ثقہ ہیں لیکن ہشام کا درجہ ثقاہت میں ابان سے بہت اونچا ہے اس لئے روایت تو ہشام کے طریق سے نقل کی لیکن اسکی خامی کو دور کرنے کے لئے تحدیث کی تصریح بھی نقل فرمادی اور متابعت کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ ہشام کی روایت کی تقویت ہو گئی اب متابعت کی تین فائدے ہو گئے (۱) تعیین مراد خیر، (۲) تصریح سماع، اور (۳) تقویت روایت۔

اشکال یہ ہوتا ہے کہ ”باب زیادة الایمان“ الخ میں حضرت انسؓ کی روایت اور ”باب تفاضل اهل الایمان“ میں حضرت ابوسعید الخدریؓ کی

روایت نقل کی گئی ہے، مضمون دونوں کا ایک ہی ہے، سوال یہ ہے کہ امام نے ایسا کیوں نہیں کیا کہ حضرت ابوسعید الخدریؓ

کی روایت پر باب زیادة الايمان و نقصانہ کا ترجمہ رکھتے اور حضرت انسؓ کی روایت پر باب تفاضل اهل الايمان کا، جبکہ ایمان اور خیر دونوں ہی طرح کے الفاظ دونوں روایتوں میں مذکور ہیں، بلکہ بلحاظ مقصد اولیٰ و انسب یہی تھا کہ باب سابق میں حضرت انسؓ کی روایت لاتے اور اس باب میں حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت ذکر فرماتے کیونکہ حضرت ابوسعیدؓ کی اس روایت میں جس پر ”تفاضل اهل الايمان“ کا ترجمہ رکھا ہے کہیں بھی اعمال کا ذکر نہیں اور اسی عمل کے ذکر کے لئے امام کو متابع پیش کرنا پڑا حالانکہ حضرت انسؓ کی روایت میں خیر کا ذکر پہلے سے موجود ہے اور خیر عمل ہے، اسی طرح حضرت انسؓ کی روایت پر ”زیادة الايمان“ ترجمہ رکھا حالانکہ خیر کا لفظ اس میں مذکور تھا اور پھر اسکی تاویل کے لئے دوسرا متابع لفظ ”ایمان“ پیش کرنیکی ضرورت پڑی، گویا اقرب الی المقصود یہ تھا کہ امام عکس فرمادیتے۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت کو اعمال کے ساتھ خاص کرنیکی وجہ یہ ہے کہ اس میں اوزان کا تفاوت نہیں دکھلایا گیا ہے لیکن حضرت انسؓ کی روایت میں جو گہوں اور ذرہ سے ایمان قلبی کے اوزان کا تفاوت بتلایا گیا جو ایمانگی کی زیادتی کے بارے میں نص ہے اس لئے امام بخاری نے ”باب زیادة الايمان“ کے تحت اس حدیث کو ذکر کیا جو اس بارے میں نص تھی اور تفاضل اهل الايمان فی الاعمال کے ذیل میں اس حدیث کا ذکر فرمایا جو اس بارے میں محتمل تھی، لیکن علامہ کشمیری رحمہ اللہ علیہ کی بات اس سے قریب تر ہے۔

علامہ کشمیریؒ کا ارشاد | علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ تراجم کے انعقاد کے سلسلہ میں دراصل امام بخاری کی نظر انہیں الفاظ پر نہیں رہتی جنہیں امام ذکر فرماتے ہیں بلکہ امام حدیث کے تمام طرق پر نظر رکھنے کے بعد تراجم منعقد کرتے ہیں، یہاں امام کی نظر حضرت ابوسعیدؓ کی اس تفصیلی روایت پر ہے جو مسلم میں ان الفاظ کیساتھ ذکر کی گئی ہے۔

يقولون ربنا كانوا يصومون معنا
ويصلون ويحجون فيقال لهم اخرجوا
من عرفتم (مسلم كتاب الايمان)

اور اسکے بعد علی الترتیب مراتب خیر کا ذکر ہے اور پھر آخر میں ارشاد ہے۔

فيقبض الله قبضة من النار فيخرج
منها قوما لم يعملوا قط (ايضاً)

چنانچہ اللہ تعالیٰ دوزخ سے ایک مٹھی لینگے اور ان لوگوں کو نکالینگے جنہوں نے کبھی کچھ عمل نہیں کیا۔

اس میں کہیں بھی ایمان کا ذکر نہیں ہے اعمال ہی اعمال ہیں گو ایمان کا ہونا ضروری ہے اور وہ مراد بھی ہے لیکن مذکور نہیں ہے، اس تفصیلی روایت کے پیش نظر امام نے اعمال کا ترجمہ منعقد فرمایا اور حضرت انسؓ کی تفصیلی روایت میں کہیں بھی ایمان کا ذکر نہیں ہے اس لئے وہاں ترجمہ بھی ایمان ہی کے لفظ سے منعقد فرمایا حضرت انسؓ کی تفصیلی روایت میں

فمن كان في قلبه مثقال حبة من برة او شعيرة من ايمان فاخرجه (ايضا)
 جس کے دل میں گیہوں اور جو کے برابر بھی ایمان
 ہوا سے جہنم سے نکال لو۔

کے الفاظ ہیں، اس تفصیل کے پیش نظر حضرت ابوسعید الخدری کی روایت کیلئے وہی ترجمہ مناسب تھا جو امام نے منعقد فرمایا اور حضرت انس کی روایت کے لئے بھی وہی ترجمہ موزوں تھا جس کو امام بخاری نے عنوان میں اختیار فرمایا، غرض اسباب نجات مختلف تھے ایک جگہ اعمال کا ذکر فرمایا کہ عمل بھی نجات من النار کا راستہ ہے، دوسرے موقعہ پر خود ایمان کے مراتب کو اس سلسلہ میں پیش فرمایا کہ عمل کچھ بھی نہ ہو مگر ایمان ہو اور ایمان بھی کتنا ہی کمزور ہو مگر نجات کا فائدہ اس سے بھی حاصل ہوگا۔

(۴۵) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ سَمِعَ جَعْفَرَ بْنَ عَوْنٍ حَدَّثَنَا أَبُو الْعُمَيْسِ أَخْبَرَنَا قَيْسُ بْنُ مُسْلِمٍ عَنْ طَارِقِ بْنِ شَهَابٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ أَنَّ رَجُلًا مِنَ الْيَهُودِ قَالَ لَهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ آيَةٌ فِي كِتَابِكُمْ تَقْرُونَهَا لَوْ عَلَيْنَا مَعْشَرَ الْيَهُودِ نَزَلَتْ لَا تَتَّخِذْنَا ذَلِكَ الْيَوْمَ عِيدًا قَالَ أَيُّ آيَةٍ قَالَ الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا، قَالَ عُمَرُ قَدْ عَرَفْنَا ذَلِكَ الْيَوْمَ وَالْمَكَانَ الَّذِي نَزَلَتْ فِيهِ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَهُوَ قَائِمٌ بِعَرَفَةَ يَوْمَ جُمُعَةٍ .

(آئندہ: ۷، ۴۳۰، ۶، ۴۶۰، ۸، ۷۲۶۸)

ترجمہ | باب، حضرت عمرؓ سے طارق بن شہاب روایت کرتے ہیں کہ کسی یہودی نے آپ سے یہ کہا، امیر المؤمنین آپ کی کتاب میں ایک آیت ہے جسکو آپ پڑھتے رہتے ہیں، اگر ہم جماعت یہود پر وہ آیت نازل ہوئی ہوتی تو ہم اس دن کو عید بنا لیتے، حضرت عمرؓ نے پوچھا وہ کونسی آیت ہے اس نے کہا، الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا، حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہمیں وہ دن اور وہ جگہ معلوم ہے، جہاں رسول اکرم ﷺ پر یہ نازل ہوئی، آپ اسوقت عرفات میں تشریف فرما تھے اور جمعہ کا دن تھا۔

حدیث شریف کا مفہوم | حضرت عمرؓ سے ایک یہودی نے کہا کہ آپ کی کتاب (قرآن مجید) میں ایک ایسی آیت ہے جسکی سب تلاوت فرماتے ہیں، لیکن اس کا وزن کسی کو معلوم نہیں، اگر یہود پر وہ آیت نازل ہوتی، تو مارے خوشی کے یہود اس دن کو یوم عید بنا کر سال کے سال اس میں خوشی کا اظہار کرتے رہتے حضرت عمرؓ نے پوچھا کونسی آیت ہے تو اس نے بتلایا۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (پ ۵۷۶)

آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا اور میں بلحاظ دین تمہارے لئے اسلام سے راضی ہوں

حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ہمیں وہ دن، وہ جگہ وہ ساعت معلوم ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی، جمعہ کے دن میدانِ عرفات میں اس کا نزول ہوا ہے، حضرت عمرؓ کا مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ کہہ رہے ہو کہ اگر ہمارے یہاں نازل ہوئی ہوتی تو ہم اتنی قدر کرتے کہ وہ دن ہمارے لئے تاریخی ہو جاتا، یعنی تم اپنی طرف سے خوشی مناتے اور ہمارے یہاں اس کا نزول ہی عید کے دن ہوا ہے اور ایسی جگہ پر نزول ہوا ہے کہ وہ بھی تاریخی ہے اور زبردست تقدیس کا حامل ہے، جمعہ کا دن تھا، ذی الحجہ کی نویں تاریخ تھی اور عرفات کا میدان تھا، اب کہو کونسی خوشی درحقیقت خوشی کہلانے کا حق رکھتی ہے، یعنی ایک خوشی وہ ہے جسے انسان خود مقرر کرے اور ایک وہ جو خداوند قدوس کی جانب سے مقرر کی جائے، اور اصل خوشی وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ ہو۔

سوال و جواب کی مطابقت | بہ ظاہر حضرت عمرؓ کا جواب یہودی کے سوال کے مطابق درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ وہ کہہ رہا ہے کہ ہم اس آیت کے یوم نزول کو یوم عید بنا لیتے، اسکا

جواب تو یہ تھا کہ یوم نزول تو خود یوم عید ہی تھا عید بنانے کے کیا معنی؟ لیکن آپ نے صرف یہ فرمایا کہ وہ دن اور وہ جگہ ہمیں معلوم ہے، اصل بات یہ ہے کہ یہ روایت یہاں مختصر ہے طبرانی وغیرہ میں آپ کے پورے الفاظ اس طرح مذکور ہیں

نزلت یوم جمعة یوم عرفة و کلاهما

یہ آیت جمعہ اور عرفہ کے دن نازل ہوئی اور وہ

بحمد اللہ لنا عید (طبرانی)

دونوں بحمد اللہ ہمارے لئے عید ہیں

اور ترمذی میں بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ الفاظ منقول ہیں

نزلت فی یوم عیدین یوم الجمعة

یہ آیت دو عیدوں والے دن نازل ہوئی، یعنی

ویوم عرفة (ترمذی جلد ۲ ص ۱۳۰)

جمعہ اور عرفہ کے دن

بعض صحیح روایات میں اسکی صراحت ہے کہ یوم عرفہ میں آیت کا نزول بعد العصر ہوا ہے، جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ آیت کے نزول کے وقت ہمارے یہاں دو عیدیں تھیں، یوم جمعہ جسکو عید المؤمنین قرار دیا گیا اور یوم عرفہ جو اہل اسلام کے لئے سب سے بڑا خوشی کا دن ہے اور اس کے ختم پر عید الاضحیٰ ہے جو منجانب اللہ یوم دعوت ہے، پھر یہ دونوں عیدین وقتی نہیں بلکہ دوامی ہیں اور خدا کی طرف سے ہیں، ہماری خود ساختہ نہیں اور خود ساختہ عید اور منجانب اللہ عید کا تفاوت ظاہر ہے۔

یہاں عرفہ کو یوم عید بتلایا گیا ہے، جس طرح کہ رمضان کے متعلق، شہر اعیاد لا ینقصان فرمایا گیا ہے کیونکہ

رمضان کے فوراً بعد عید آتی ہے، اسی طرح یہاں بھی عرفہ کو یوم عید سے اسی لئے تعبیر کیا گیا ہے کہ عرفہ کے فوراً بعد آتی ہے

مسئلہ زیادت و نقصان کا ثبوت | آیت کریمہ کا شان نزول بتلادیا، لفظ اکمال سے معلوم ہوا کہ دین کمال کو

قبول کرتا ہے اور جو چیز کمال کو قبول کر سکتی ہے وہ چیز نقصان کو بھی قبول کر سکتی

ہے، لیکن یہ صرف مومن بہ کے اعتبار سے ہے، ورنہ اصل ایمان تو ان چیزوں کی تصدیق سے عبارت ہے جنہیں آل

حضور ﷺ لیکر آئے خواہ وہ دو چار ہوں یا دس ہزار، جسوقت جتنی چیزوں کی تصدیق مطلوب ہے بس انہیں کی تصدیق کمال ہے اور صحابہ کرام ہر دور میں جمیع ماجاء کی تصدیق فرماتے رہے، غایتہ مافی الباب یہ نقصان و کمال ایک اضافی چیز ہے، ایک نے چار عمل کئے اور رخصت ہو گیا اور دوسرا آٹھ عمل کے بعد رخصت ہوا تو دوسرے کا ایمان اکمل ہے لیکن فی نفسہ پہلے کا ایمان بھی ناقص نہیں، اور جس طرح شریعت عیسوی اور موسوی کو آپ کی شریعت کے بالمقابل ناقص گردان کر یہ نہیں کہہ سکتے کہ جن لوگوں نے بعثت محمدی سے قبل شریعت عیسوی و موسوی پر عمل کیا وہ ناقص الایمان تھے، اسی طرح اس شریعت کے دور اول، اور دور کمال کا اعتبار کر کے کسی کے دین کو ناقص نہیں کہا جاسکتا، غرض ایک کمال حقیقی ہے ایک کمال نسبی، حقیقت کے اعتبار سے دین، کمی، زیادتی کو قبول نہیں کرتا لیکن نسبی اور اضافی کمی بیشی سے انکار کی بھی گنجائش نہیں۔

[۳۴] بَابُ الزَّكَاةِ مِنَ الْإِسْلَامِ

وَقَوْلُهُ تَعَالَى وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ حُنَفَاءَ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِينُ الْقِيَمَةِ . (بیتہ: ۵)

(۳۶) حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكُ بْنُ أَنَسٍ عَنْ عَمِّهِ أَبِي سُهَيْلِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ سَمِعَ طَلْحَةَ بْنَ عُبَيْدِ اللَّهِ يَقُولُ جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ مِنْ أَهْلِ نَجْدٍ نَائِرِ الرَّاسِ نَسَمِعُ دَوِيَّ صَوْتِهِ وَلَا نَفْقَهُ مَا يَقُولُ حَتَّى دَنَا فَإِذَا هُوَ يَسْأَلُ عَنِ الْإِسْلَامِ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ خَمْسُ صَلَوَاتٍ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ فَقَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَصِيَامُ رَمَضَانَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهُ قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ وَذَكَرَ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ الزَّكَاةَ قَالَ هَلْ عَلَيَّ غَيْرُهَا قَالَ لَا إِلَّا أَنْ تَطَوَّعَ قَالَ فَادْبَرَ الرَّجُلُ وَهُوَ يَقُولُ وَاللَّهِ لَا أَزِيدُ عَلَيَّ هَذَا وَلَا أَنْقُصُ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ . (آئندہ: ۱۸۹۱، ۲۶۷۸، ۶۹۵۶)

ترجمہ | باب، زکوٰۃ اسلام کا رکن ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ یکسو ہو کر عبادت اسی کیلئے خاص رکھیں اور نماز کی پابندی کریں اور زکوٰۃ ادا کریں، یہ مضبوط دین ہے۔ مالک سے روایت ہے کہ انہوں نے طلحہ بن عبید اللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس اہل نجد میں سے ایک آدمی آیا جسکے سر کے بال پراگندہ تھے، ہم اسکی آواز کی گنگناہٹ سنتے تھے اور اسکی بات سمجھتے نہ تھے حتیٰ کہ وہ نزدیک ہو گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اسلامی اعمال کے متعلق کچھ پوچھ رہا ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دن اور رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں

ساقط ہے، کوئی کہتا ہے تعزیر کی جائے گی امام شافعی فرماتے ہیں کہ میں فرض تو نہیں کہتا مگر چھوڑنے کی بھی کسی حال میں اجازت نہیں دیتا، صرف لفظ وجوب سے تحاشی اور گریز ہے پھر یہ گڑ کھانا اور گلگلوں سے پرہیز کرنا نہیں تو اور کیا ہے، علاوہ بریں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں خمس صلوات فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ نمازیں پانچ وقت میں لازم ہیں اور چونکہ وتر کا وقت وہی عشاء کا وقت ہے اس کا اپنا کوئی مستقل وقت نہیں ہے اسی وجہ سے اسے عشاء پر مقدم کرنا جائز ہے پس جب وتر کا عمل عشاء کے وقت میں عشاء کی نماز کے بعد ہوتا ہے تو اس کا شمار بھی عشاء ہی کے ساتھ ہونا چاہئے اس کو یوں سمجھ سکتے ہیں کہ فرائض خمسہ کے لئے جداگانہ اذان و اقامت ہے اور جماعت بھی مطلوب ہے مگر وتر میں نہ جماعت ہے اور نہ اسکی مستقل اذان۔

اس کی حیثیت مازاد علی الفریضہ کی ہوگئی ہے، جس طرح داخلی اور خارجی تطوعات مکملات فرائض ہیں جن سے صورت و حقیقت کی تکمیل ہوتی ہے، مکمل صورت کو واجب اور مکمل حقیقت کو سنت کہتے ہیں، گویا وتر مکمل صورت ہے اسی وجہ سے اسے مستقل شمار نہیں کیا گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ حنفیہ کی تحقیق کے مطابق وتر پر دو دور گزرے ہیں، ایک دور سنیت کا، اور دوسرا وجوب کا، سنیت کے دور میں گنجائش رہی ہے کہ دابہ پر ادا کریں یا زمین پر، اور دابہ پر ادا کرنے کی اجازت صرف نوافل میں ہے فرائض میں نہیں اور دوسرا دور وجوب کا ہے، ہو سکتا ہے کہ سائل کی آمد سنیت وتر کے دور میں ہوئی ہو، اب ذرا وجوب کے اشارات بھی سن لو، ارشاد ہوتا ہے۔

ان اللہ امدکم بصلوٰۃ ہی خیر لکم
من حمر النعم (ابوداؤد جلد ۱ ص ۲۰۸)
اللہ تعالیٰ نے تمہاری نمازوں میں ایک نماز کا اضافہ
فرمایا ہے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے
اسی طرح نوم یا نسیان کی وجہ سے قضا ہو جائیں تو اس کے بارے میں یاد آنے پر قضا لازم قرار دی گئی ہے، ارشاد
ہوتا ہے۔

من نسی الوتر او نام عنها فليصلها
اذا ذكرها (مسند احمد جلد ۳ ص ۳۳)
جو وتر کی نماز کے وقت سو گیا یا بھول گیا تو اسے
یاد آنے پر پڑھ لینا چاہئے۔

اس تاکید سے فرائض کی طرح قضا لازم قرار دی گئی ہے ایک روایت میں

الوتر حق فمن لم يوتر فليس منا
الوتر حق فمن لم يوتر فليس منا
الوتر حق فمن لم يوتر فليس
منا (ابوداؤد جلد ۱ ص ۲۰۸)
وتر حق ہے پس جو شخص وتر ادا نہ کرے وہ ہم میں سے
نہیں ہے وتر حق، پس جو شخص وتر ادا نہ کرے وہ ہم
میں سے نہیں وتر حق ہے پس جو وتر ادا نہ کرے وہ ہم
میں سے نہیں۔

فرمایا گیا ہے ایک جگہ وتر کے سلسلہ میں یہ تاکید فرمائی گئی ہے کہ اسے نماز صبح سے قبل ادا کر لیا کرو اور ان جیسی بیسیوں روایات ہیں جن میں وتر کے وجوب کے اشارات موجود ہیں جو ان شاء اللہ اپنی جگہ ذکر کئے جائیں گے، تیسری بات یہ ہے کہ اگر یہاں عدم ذکر ذکر عدم کی دلیل ہے تو پھر وتر ہی کی کیا خصوصیت ہے، یہاں توجح کا بھی ذکر نہیں، صدقہ فطر بھی نہیں؛ حالانکہ وہ امام بخاری کے نزدیک فرض ہے، صلوٰۃ جنازہ کا بھی ذکر نہیں حالانکہ وہ بھی ضروری ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ امام بخاری نے دوسری جگہ اسی روایت میں یہ الفاظ بھی نکالے ہیں۔

فاخبرہ رسول اللہ ﷺ بشرائع الاسلام رسول اکرم ﷺ نے اس کو شرائع اسلام کی تعلیم دی۔

اگر اس وقت وتر بھی درجہ وجوب میں ہوگا تو یہ بھی تعلیم میں آگیا ہوگا ان دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح

ہو جاتی ہے کہ صرف اس حدیث کا سہارا لیکر وجوب وتر سے انکار درست نہیں۔

یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ اگر نفلی عبادت شروع کی اور وہ کسی وجہ سے فاسد ہوگئی تو اسکی قضا قضا تطوع کا اختلاف ہوگی یا نہیں، احناف کے نزدیک قضا لازم ہے اور شوافع اور دوسرے حضرات حج کے

علاوہ اور تمام نفلی عبادات میں قضا لازم نہ کرنیکے قائل ہیں، حج کے بارے میں یہ حضرات بھی یہی کہتے ہیں کہ حج نفلی اگر فاسد ہو جائے تو اسکی قضا ہے، جو لوگ قضا نہ کرنے کے قائل ہیں وہ یہ کہتے ہیں الا ان تطوع کا استثناء استثناء منقطع ہے جو لکن کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ واجب کچھ نہیں ہاں اگر نفل ادا کرنا چاہو تو منع نہیں کیا جائیگا اور احناف کہتے ہیں کہ استثناء متصل ہے اور یہی استثناء میں اصل ہے اور استثناء متصل میں ضروری ہے کہ مستثنیٰ، مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہو، اس لئے معنی اب یہ ہوں گے کہ تطوع کے شروع کرنے میں تو تم مختار ہو اور اس کا مدار جمعیت خاطر پر ہے، جی چاہے شروع کرو جی چاہے شروع نہ کرو، لیکن اگر شروع کر دو گے تو اس کا اتمام واجب ہو جائے گا، اب اسے نا تمام نہیں چھوڑ سکتے اور اگر کسی ضرورت سے نا تمام چھوڑتے ہو تو اس کا قضا کرنا اس پر واجب ہو جائے گا پھر یہی حکم روزے کا ہے اور یہی حج کا۔

استثناء میں چونکہ انقطاع اصل نہیں ہے اسلئے انقطاع کا قول کر نیوالوں کو قرآن و دلائل حضرات شوافع کے دلائل کی ضرورت ہے چنانچہ ان حضرات نے دلیل میں نسائی کی روایت پیش کی ہے۔

رسول اکرم ﷺ کبھی کبھی نفلی روزے

کی نیت فرمالتے تھے اور پھر افطار

کر لیتے تھے۔

ان رسول اللہ ﷺ کان احیانا

ینوی صوم التطوع ثم یفطر

(نسائی کتاب الصوم)

نیز بخاری کی روایت میں ہے کہ آپ نے جو یہ بنت حارث کو جمعہ کے دن روزہ شروع کرنے کے بعد افطار

کا حکم دیا ان دنوں موقعوں پر روزے کے افطار کا ذکر ہے لیکن یہ مذکور نہیں کہ قضا بھی کی گئی، معلوم ہوا کہ نفلی روزہ اگر کسی وجہ سے فاسد ہو جائے تو اس کی قضا نہیں ہے اور جب یہ حکم روزہ کا ہے تو دوسری عبادات کا بھی یہی ہونا چاہئے۔

احناف رحمہم اللہ کا ارشاد | احناف رحمہم اللہ نے اس سلسلہ میں یہ فرمایا ہے کہ ان احادیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ روزہ افطار کیا یا کرایا گیا، لیکن اسمیں یہ کہاں مذکور ہے کہ قضا نہیں کرائی گئی، کیا عدم ذکر، ذکر عدم کی دلیل بن سکتا ہے؟ آپ گھر میں تشریف لاتے، پوچھتے کچھ کھانے کے لئے ہے، اگر نہ ہوتا تو روزہ رکھ لیتے اور ہوتا تو تناول فرما لیتے، ایک دن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مالیدہ پیش کیا آپ نے افطار فرمایا، یہ کیا استدلال ہوا؟ حضرت عائشہ نے آپ ہی کیلئے رکھا تھا اور ممکن ہے وہ چیز بھی ایسی ہو جو شام تک نہ رک سکے، انکار میں ایک تو اس چیز کا ضیاع تھا اور دوسری طرف حضرت عائشہ کی دل شکنی ہوتی تھی، پھر اس روایت میں جس لفظ سے یہ سمجھا گیا کہ آپ نے روزہ افطار فرمایا وہ اس بارے میں نص نہیں ہے اس کے معنی تو یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ خیال تو تھا کہ آج روزہ رکھ لیں مگر تم نے میری خاطر یہ چیز روک رکھی ہے تو لے آؤ پھر رکھ لیا جائے گا، یعنی بہ نیت صیام آپ نے روزہ کا عمل شروع نہیں فرمایا تھا، محض خیال ہی خیال تھا۔

جو یہ بنت حارث کا معاملہ یہ ہے کہ آپ نے ان کا جمعہ کا روزہ افطار کر دیا تھا، اس لئے گو جمعہ ایک بڑی فضیلت کا دن ہے اور اس کا روزہ بھی افضل ہی ہونا چاہئے لیکن اپنی طرف سے کسی افضل دن کو کسی خاص نوع عبادت کے لئے مخصوص کر لینا جبکہ شارع علیہ السلام نے وہ دن اس عبادت کے لئے معین نہ فرمایا ہو، خداوند کریم کے مقررہ حدود سے آگے بڑھنا ہے جو کسی بھی وقت بدعت کا رنگ اختیار کر سکتا ہے، اس لئے شریعت کے ابتدائی تقرر کے زمانے میں ان امور کا زیادہ خیال کیا جاتا ہے اس لئے آپ نے ان سے یہ معلوم فرمایا کہ جمعرات کے دن روزہ رکھا تھا یا جمعہ کے بعد شنبہ کا روزہ رکھنا ہے؟ جب ایسا نہیں ہے تو پھر جمعہ ہی کا روزہ کیا ہے اسے افطار کرو، یہاں افطار کا حکم بہ طور تنبیہ تھا، علاوہ بریں نفلی روزے کے افطار پر قضا کا حکم دوسری روایات میں صراحتہ مذکور ہے، مسند احمد میں روایت ہے کہ حفصہ اور عائشہ رضی اللہ عنہما کا روزہ تھا، بکری کا گوشت ہدیہ میں آیا، آں حضور ﷺ سے پوچھا، آپ نے فرمایا۔

صَوْمًا يَوْمًا مَكَانَهُ (مسند احمد) اس کے بدلے کسی دوسرے دن روزہ رکھ لینا

دارقطنی میں ام سلمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نفلی روزہ رکھا پھر افطار کر لیا، آپ نے فرمایا تقضی یوما مکانہ اس کے بدلے دوسرے دن قضا کر لینا۔

ان دلائل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی استثناء متصل ہے اور نفلی عبادت اگر فاسد ہو جائے تو اس کی قضا ضروری ہے۔

احناف کا اصل استدلال | الا ان تطوع سے یہ استدلال صرف احناف نے نہیں کیا بلکہ مالکیہ نے بھی اسی سے استدلال کیا ہے، حنفیہ نے استدلال میں لا تبطلوا اعمالکم کو بھی پیش کیا

ہے یعنی اپنے اعمال کو باطل مت کرو ”ولا تبطلوا“ نبی کا صیغہ ہے اور اصل نبی میں تحریم ہے پس جب ابطال حرام ٹھیرا تو اس عمل کا قائم اور برقرار رکھنا ضروری ہوا، اسلئے اس کا افساد لامحالہ موجب قضا ہوگا۔

اس استدلال پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ یہ آیت دراصل ثواب کے لئے نازل کی گئی ہے، اس لئے مسئلہ ذیل میں آیت کو پیش کرنا سیاق سے صرف نظر کرنا ہے؛ لیکن یہ بات ہماری سمجھ سے بالاتر ہے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ آیت کریمہ میں عمل کے فاسد کر نیکو حرام قرار دیا گیا ہے، اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان نفلی کام تقرب کے لئے از خود شروع کرتا ہے تو یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ عمل کو نا تمام چھوڑ دے، یہ تو ایسا ہوگا کہ آپ کسی حاکم یا بڑے کیلئے کوئی ہدیہ پیش کریں اور جب وہ اسے قبول کر نیکی کے لئے ہاتھ بڑھائے تو آپ اپنا ہاتھ کھینچ لیں، اس حرکت کو حاکم اپنی توہین سمجھے گا اور ناراض ہو جائے گا، اسی طرح ایک عمل کو تقرب کے لئے شروع کر کے بلا عذر فاسد کرنا درست نہیں ہو سکتا اور اگر کسی طبعی یا شرعی معذوری کی بنا پر اسکو نا تمام چھوڑتا ہے تو بطور تدارک اسکی قضا لازم ہوگی، معترض کے اعتراض میں جس امر کا ذکر کیا گیا ہے وہ اپنی جگہ مسلم ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ”لا تبطلوا اعمالکم“ کے عموم میں وہ صورت بھی آتی ہے جس کو آیت کے ذیل میں حضرات احناف نے پیش فرمایا ہے، یعنی عمل شروع کر کے ملیا میٹ کر دینا درست نہیں ہے۔

ایک دوسری نہایت اہم بات یہ ہے کہ جب تک عمل شروع نہیں کیا تھا، اختیار تھا کہ شروع کرو یا نہ کرو لیکن شروع کر نیکی بعد یہ چیز نذر فعلی بن گئی ہے اور نذر کا ایفاء ضروری ہے خواہ نذر قولی ہو یا فعلی، ارشاد خداوندی

ولیفوا نذورہم
اور اپنی نذوروں کو پورا کریں۔

میں دونوں قسمیں داخل ہیں، نذر فعلی کا مطلب یہ ہے کہ جب نیت کر کے عمل شروع کر دیا تو نذر بن گیا، ہاں جب تک شروع نہیں کیا تھا نفل تھا، مگر شروع کرنے کے بعد وہ نذر فعلی بن چکا ہے، اس لئے اب اگر کسی وجہ سے فاسد ہو جائے گا تو اس کی قضا ضروری ہوگی۔

دو حاضر کا ایک فتنہ | اہل حدیث اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے سنن کے اہتمام سے پہلو تہی کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ فلاح کے لئے صرف پانچ چیزوں کو کافی سمجھا گیا ہے لیکن یہ کھلی زیادتی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ حضرات صحابہؓ کا کیا عمل رہا ہے اور پیغمبر علیہ السلام نے ترغیب و تہدید کے لئے کیا الفاظ استعمال فرمائے ہیں، یہاں تو صرف یہ فرمایا جا رہا ہے کہ خدا کی طرف سے تمہارے ذمہ صرف پانچ نمازیں لازم کی گئی ہیں، اس کے ساتھ اور کوئی اضافہ نہیں ہے، رہا تطوع کا معاملہ سو وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے بلکہ بندہ اسے خود لازم کرتا ہے اور اتمام کا ذمہ دار ہوتا ہے، جس وقت الا ان تطوع فرمایا جا رہا ہے اس وقت سنیت اور وجوب سے بحث نہیں ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ سنیت و وجوب کا قصہ آپ کی وفات کے بعد کا ہے کیونکہ پیغمبر علیہ السلام کا مواظبت مع ترک مرة اور مرتین سنیت کی دلیل ہے اور اگر مواظبت اس طرح فرمائی کہ ایک بار بھی ترک نہیں ہوا تو مختلف فیہ ہے کہ آیا ایسا فعل واجب

ہو گا یا وجوب کے لئے مواظبت مع التکریر علی التارک ضروری ہے، ابن نجیم صاحب بحر فرماتے ہیں کہ مواظبت مجردہ کافی ہے اور شیخ ابن ہمام کے نزدیک مواظبت مع التکریر علی التارک ضروری ہے، بہر کیف سنن کا درجہ مواظبت مع التکریر مجردہ اور تین کا ہے اور جس وقت آپ الا ان تطوع فرما رہے ہیں اس وقت مواظبت مجردہ اور مواظبت مع التکریر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ آپ امت کے درمیان موجود ہیں، آپ کے بعد مواظبت معلوم ہوگی، اس بنا پر سنن سے بے توجہی کے لئے اس روایت کو پیش کرنا غلط بات ہے۔

ایک اہم اشکال اور اسکی توجیہات | سائل نے کہا خدا کی قسم میں نہ اس میں اضافہ کروں گا اور نہ کمی، آپ نے فرمایا، اگر یہ سچ کہہ رہا ہے تو فلاح یاب ہے دوسری روایت میں ”افلح

ان صدق بھی ہے، یعنی چونکہ یہ سچ کہہ رہا ہے اسلئے فلاح یاب ہے، یہاں ایک اشکال یہ کیا گیا ہے کہ حدیث باب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے بس وہی مدار فلاح ہیں، حالانکہ ان کے علاوہ اور بہت سے امور ہیں جن کے بغیر فلاح کا حصول دشوار نظر آتا ہے، اس کے جواب میں چند باتیں ذکر کی جاتی ہیں کہ سائل کے ”لا ازید ولا انقص“ کا تعلق ان کی عملی صورت سے نہیں بلکہ اعتقاد سے ہے یعنی جس طرح آپ نے فرائض و تطوعات کی تقسیم فرمائی ہے، میں اسی کے مطابق اپنا عقیدہ قائم رکھوں گا یعنی فرائض کو فرائض کے درجہ میں اور تطوعات کو تطوعات کے درجہ میں، ظاہر ہے کہ ہر شخص اس اعتقاد میں مفلح اور کامیاب ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کا تعلق عمل سے ہے یعنی میں اسلامی فرائض کو بدرجہ فرض عمل میں رکھوں گا اور ان کی بجا آوری میں کبھی کوتاہی نہیں کروں گا اور تطوعات کو عمل کے اعتبار سے وہ حیثیت نہ دوں گا جس سے وہ فرائض کے ساتھ مشتبہ ہو جائیں اور یہ بھی فلاح کا راستہ ہے۔

تیسری بات یہ کہ مقدار فرض میں کمی بیشی نہ کروں گا کہ پانچ کے چار کر دوں یا چھ بنا دوں، یہ عمل اور اعتقاد دونوں سے عام ہے یا مراد یہ ہو کہ عمل کی مقررہ صورتوں میں کمی بیشی نہ کروں گا مثلاً فجر کی چار کر دوں یا چہار گانہ کو اپنے عمل میں دو گانہ یا سہ گانہ کر دوں لیکن ان سب کے مقابلہ پر صحیح ہی کی ایک روایت پیش ہو سکتی ہے جس میں لا ازید کی بجائے لا تطوع کی تصریح ہے، یعنی تطوعات کا عمل نہیں کروں گا، اس تصریح کے بعد تمام توجیہات درست نہیں معلوم ہوتیں پھر کس طرح اس کو فلاح یاب قرار دیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات تو یہ ہے کہ احادیث میں مختلف الفاظ ہوتے ہیں اور کبھی ان میں تعارض بھی ہو جاتا ہے اسلئے رفع تعارض یا آپ کے صحیح مفہوم تک پہنچنے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ غور و فکر اور قرآن و شواہد کی روشنی میں یہ معلوم جائے کہ ان میں کونسی تعبیر رسول اکرم ﷺ کی ہے اور کونسی تعبیر راوی کے روایت بالمعنی کا نتیجہ ہے، جب ایک واقعہ سے متعلق اکثر روایات صحیحہ ایک بیان پر متفق ہوں اور کوئی راوی اس واقعہ میں ایک ایسا لفظ ذکر

کرے جس سے اصل لفظ یا اصل روایت کا مفہوم بدلتا ہو تو اس امر کا فیصلہ کہ اصل کیا ہے اور اسمیں کیا تغیر ہوا ہے بہت آسانی سے ہو سکتا ہے اور ایسی روایت کو شذوذ پر محمول کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے، پھر یہاں تو ”لا ازید“ کی جگہ ”لا اتطوع“ کی کافی گنجائش ہے کہ تطوع کا زوائد پر اطلاق ہوتا ہے اور اگر یہ مان ہی لیا جائے کہ اس شخص نے ”لا اتطوع“ ہی کہا تھا اور معنی بھی وہی ہوں جسکی طرف خیال جاتا ہے تو پھر یہ اسکی خصوصی رعایت ہوگی، اسکو ضابطہ اور قانون بنانے کا کوئی حق نہیں، اس قسم کی خصوصیات تو اور بھی متعدد مواقع پر ثابت ہیں مگر انکو کہیں بھی قانونی حیثیت نہیں دی گئی۔

اصل بات یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے کچھ امتیازی اور خصوصی اختیارات بھی ہیں جن کو آپ مناسب مواقع پر استعمال فرمایا کرتے تھے، اور عام قانون سے جس شخص کو الگ فرمانا چاہتے ہیں اسکو مستثنیٰ فرما دیتے۔

دنیا کی آئینی حکومتوں کا بھی دستور رہا ہے کہ انتظامی قوانین بنائے جاتے ہیں پھر ان کے گزٹ ہونے سے قبل اگر کوئی شخص اپنے لئے خصوصی رعایت حاصل کرنا چاہتا ہے تو صاحب قانون اپنے اختیارات خصوصی کی بنا پر وہ رعایت دے سکتا ہے، دیگر حضرات بدستور اس قانون کے پابند رہیں گے، انہیں یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آپکو بھی اس رعایت کا مستحق قرار دیں، یہاں بھی یہی صورت ہے کہ تقرر شرائع سے قبل ایک ہی شخص نے اپنے لئے یہ رعایت حاصل کی اور پیغمبر علیہ السلام نے افلح ان صدق فرما کر اس کے حق میں لا اتطوع کو منظور فرمایا تو یہ رعایت اس شخص کا خصوصی حق تھا، ہر کسی کیلئے جائز نہ ہوگا کہ لا اتطوع کا بہانہ لیکر عام ضوابط شرعیہ سے کنارہ کشی اختیار کریں۔

حضرت علامہ کشمیریؒ یہی فرمایا کرتے تھے اس کے نظائر میں بہت سے واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں، مثلاً پیغمبر علیہ السلام نے نماز عید الاضحیٰ کے بعد اعلان فرمایا کہ اگر کسی شخص نے نماز سے قبل قربانی کر دی ہے تو اسکی قربانی نسک کے سلسلہ میں معتبر نہیں ہے بلکہ انماھی شاة لحم وہ صرف کھانے کے لئے ہے۔

اس اعلان پر ابو بردہ بن نیار کھڑے ہوتے ہیں کہ حضور! عید الاضحیٰ کا دن تھا، پڑوسی غریب تھے، میں نے سوچا کہ یہ قربانی نہیں کر سکتے، میں پہلے کر دوں تاکہ یہ لوگ بھی عید کی نماز سے قبل گوشت کھا سکیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری بکری صرف کھانے کے لئے ہے پھر قربانی کے لئے ایک سال کی بکری ہونی چاہئے، ابو بردہ نے عرض کیا، حضور! میرے پاس دو بکریاں تھیں ایک عمر کی پوری تھی جس کی قربانی کر دی اور دوسری گو فر بہ ہے مگر عمر میں کم ہے آپ نے اس کی قربانی کی اجازت دی اور فرمایا۔

لا تجزی عن احد بعدك (مسند احمد جلد ۴ ص ۲۹۸) تمہارے بعد کسی اور کیلئے یہ روا نہیں ہے۔

اسی طرح وہ اعرابی جس نے رمضان میں جماع کر لیا تھا، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ صورت حال بیان کی، آپ نے فرمایا غلام آزاد کرو یا ساٹھ روزے رکھو یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلاؤ، اس نے ہر چیز پر عذر

کیا اتنے میں کہیں سے بھجوریں آگئیں، آپ نے ان کو دیکر فرمایا جاؤ انکا صدقہ کر دو، اس نے کہا مدینہ کی آبادی میں مجھ سے زیادہ غریب کوئی نہیں ہے، آپ نے فرمایا کہ پھر تم ہی خرچ کر لینا، بعض طرق میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ کسی دوسرے کے لئے ایسا کرنا درست نہیں ہے۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحب شرع اگر کسی مخصوص انسان کو اجازت دیں اور مستثنیٰ فرمادیں تو یہ بالکل درست ہے، علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے تو کمال ہی کر دیا، اسی اصول استثناء سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے ابوداؤد کی حضرت عبداللہ بن فضالہ کی روایت کے تحت مرقاة الصعود میں تصریح فرمائی ہے کہ آں حضور ﷺ کی جانب سے فجر و عصر کے علاوہ اور تمام نمازیں ان کے لئے معاف کر دی گئی تھیں، حضرت عبداللہ بن فضالہ عن ابیہ سے منقول ہے۔

رسول اکرم ﷺ نے مجھے تعلیم فرمائی چنانچہ آپ کی تعلیمات میں یہ بات تھی کہ پانچوں نمازوں پر محافظت کرو، فضالہ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا کہ ان اوقات میں مجھے مصروفیات رہتی ہیں آپ مجھے کسی جامع چیز کا حکم فرمادیں، اگر میں اسے کر لیا کروں تو کافی ہو، آپ نے فرمایا، فجر و عصر کی پابندی کیا کرو۔

قال علمنی رسول اللہ ﷺ فكان
فیما علمنی وحافظ علی الصلوات
الخمیس قال قلت ان هذه ساعات
لی فیہا اشغال فمرنی بامر جامع
ان انا فعلتہ اجزاً عنی فقال حافظ
علی العصرین .
(مرقاة الصعود بحوالہ فیض الباری)

علامہ سیوطی لکھتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے مخصوص اختیارات سے انہیں باقی نمازوں سے مستثنیٰ فرما دیا تھا، گویا پیغمبر علیہ السلام کو نمازوں سے بھی مستثنیٰ فرمانے کا اختیار تھا، لیکن یہ درست نہیں ہے، قبیلہ ثقیف کے لوگ اسلام کے لئے حاضر خدمت ہوئے اور چند شرطیں رکھیں کہ نہ ہمیں جہاد کے لئے جمع کیا جائے نہ ہم سے عشر وصول کیا جائے اور نہ نماز پر دھوائی جائے۔ آپ نے تمام شرطیں قبول کر لیں مگر فرمایا:

لاخیر فی دین لیس فیہ رکوع
اس دین میں کوئی بھلائی نہیں جس میں نماز نہ ہو۔

معلوم ہوا کہ آپ نے نماز سے کسی کو مستثنیٰ نہیں فرمایا، اسلئے حدیث مذکور کے متعلق علامہ سیوطی کا مستثنیٰ خیال کرنا درست نہیں ہے، علامہ کشمیری نے فرمایا کہ آپ نے تعلیم میں پانچوں نمازوں کیساتھ کچھ اذکار بھی تعلیم فرمائے تھے اس پر انہوں نے عرض کیا کہ حضور بسا اوقات مجھے مصروفیت رہتی ہے، مجھے تو مختصر سا عمل تلقین فرمادیجئے، جس پر عمل کر کے میں فلاح یاب ہو سکوں، آپ نے فرمایا اچھا تو فجر و عصر میں تو ان اذکار کو کر ہی لیا کرو، گویا اب اصل صلوة سے اس استثناء کا تعلق نہیں، اذکار سے ہے اور اگر معنی یہ ہیں کہ انہوں نے نمازوں ہی کے بارے میں مشغولیت کا عذر کیا تھا تب

بھی آپ کا فجر و عصر کے بارے میں تاکید فرمانا ان نمازوں کے اہتمام کے پیش نظر تھا، کیونکہ ان دونوں نمازوں کی محافظت بقیہ نمازوں کی محافظت کا راستہ ہے جو شخص فجر و عصر کی محافظت کر لے گا اس کے لئے بقیہ نمازوں کی محافظت سہل ہو جائیگی کیونکہ فجر کا وقت غفلت کا وقت ہے اور عصر کا وقت بازار کی گرما گرمی کا ہے، عصر و فجر کے بارے میں دوسری روایات میں بھی تاکید آئی ہے۔

جو شخص طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے
قبل ہی نمازیں ادا کریگا جہنم میں نہ جائے گا۔

لا یلج النار احد صلی قبل طلوع الشمس
وقبل ان تغرب (مسند احمد جلد ۴ ص ۲۶۱)

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

جو شخص دو وقت کی دونوں نمازیں ادا کر لے
گا داخل جنت ہوگا۔

مَنْ صَلَّى الْبُرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ

(بخاری جلد ۱ ص ۸۱)

اس لئے ”حافظ علی العصرین“ کے معنی بھی اب یہی ہوں گے، ان دونوں نمازوں کی تاکید کے لئے علامہ کشمیری وجہ بیان کرتے تھے کہ یہ دونوں نمازیں لیلۃ المعراج سے قبل بھی آپ ادا فرماتے تھے، لیلۃ المعراج میں تین نمازوں کا اضافہ ہوا، بخاری ہی میں روایت آئے گی کہ رسول اکرم ﷺ چند اصحاب کیساتھ سوق عکاظ کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں فجر کی نماز جماعت سے ادا فرمانے لگے۔

جنات کی ایک جماعت کا اس طرف سے گزر رہا تو انہوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ نماز پڑھا رہے ہیں، قرآن کی آواز کانوں میں پڑی تو بیتاب ہو کر نیچے اترے، اب کیا تھا گرویدہ ہو گئے، قرآن دل میں گھر کر گیا، ایمان لے آئے کس لئے آئے تھے اور کیا کر گئے، سورہ جن میں اس کی تفصیل دیکھئے، یہ واقعہ معراج سے قبل کا ہے، معلوم ہوا کہ آپ نماز فجر پہلے سے ادا فرماتے تھے آیت میں جو

اور اپنے رب کی حمد کیساتھ تسبیح کیجئے، آفتاب

وسبح بحمد ربك قبل طلوع الشمس

نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب سے پہلے۔

وقبل غروبها (پ ۱۶ ع ۱۷)

فرمایا گیا ہے اس سے بھی علامہ کشمیری کے نزدیک نماز فجر کی طرف اشارہ ہے، علامہ سیوطی کی بات درست نہ سہی لیکن اتنی بات تو معلوم ہو گئی کہ استثناء خاص کا یہ اصول ایک مسلم اصول ہے، اگر آپ اپنے مخصوص اختیارات سے کسی کی فلاح کا مدار صرف فرائض فرمادیں تو آپ کو اس کا اختیار ہے، اب اگر انہیں نمائندہ نہ مانیں، اور نہ لا اتطوع کی روایت کو شاذ کہیں تو علامہ کشمیری کا یہ ارشاد قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ سائل نے اپنے آپکو پیغمبر علیہ السلام سے فرائض کے بارے میں مستثنیٰ کر لیا تھا اور اگر یہ ثابت ہو کہ یہ شخص قوم کا نمائندہ تھا خواہ ضام کا واقعہ اور یہ واقعہ متحد ہوں یا نہ ہوں تو لا ازید ولا انقص پر آپ کا افسح ان صدق کا ارشاد انکے فرائض نمائندگی سے متعلق ہوگا یعنی اس شخص نے بوقت

رخصت یہ اطمینان دلایا کہ میں قوم میں آپ کا یہ پیغام بے کم و کاست پہنچا دوں گا، نہ ایک حرف بڑھاؤں گا نہ ایک حرف گھٹاؤں گا، اس پر آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ یہ شخص اگر اپنے قول میں سچا ہے تو کامیاب ہے، ایک نمائندہ کی اصلی کامیابی یہی ہے کہ وہ پیغام رسائی میں کتر بیونت نہ کرے، جوں کو توں پہنچا دے۔
واللہ اعلم

[۳۵] بَابُ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ مِنَ الْإِيمَانِ

(۲۷) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَلِيٍّ الْمَنْجُورِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا رَوْحٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنِ الْحَسَنِ وَ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ مَنْ اتَّبَعَ جَنَازَةَ مُسْلِمٍ إِيْمَانًا وَاحْتِسَابًا وَ كَانَ مَعَهُ حَتَّى يُصَلِّيَ عَلَيْهَا وَ يُفْرَغَ مِنْ دَفْنِهَا فَإِنَّهُ يَرْجِعُ مِنَ الْأَجْرِ بِقِيرَاطَيْنِ كُلِّ قِيرَاطٍ مِثْلُ أُحْدَوِ مَنْ صَلَّى عَلَيْهَا ثُمَّ رَجَعَ قَبْلَ أَنْ تُدْفَنَ فَإِنَّهُ يَرْجِعُ بِقِيرَاطٍ، تَابَعَهُ عُثْمَانُ الْمُؤَذِّنُ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ نَحْوَهُ.

(آئندہ: ۱۳۲۳، ۱۳۲۵)

ترجمہ | باب، جنازے کے ساتھ چلنا داخل ایمان ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ایمان کے تقاضے سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے مسلم کے جنازے کیساتھ ساتھ چلے اور نماز و دفن سے فراغت تک اسی کیساتھ رہے تو وہ اجر کے دو قیراط لیکر واپس ہوگا، ہر قیراط جبل احد کے برابر ہوگا اور جو شخص نماز کے بعد ہی دفن سے قبل واپس آ گیا وہ صرف ایک قیراط کا مستحق ہوگا، عثمان مؤذن نے اسکی متابعت کی فرمایا کہ عوف نے حضرت ابو ہریرہؓ سے بواسطہ محمد بن سیرین رسول اکرم ﷺ سے اسی جیسی روایت کی ہے۔

باب سابق سے ربط | فرمایا ہے کہ جنازہ کیساتھ چلنا بھی ایمان کے اندر داخل ہے، اس باب میں ایمان و احتساب کے الفاظ ہیں اور اس سے قبل کے ابواب میں بھی یہ الفاظ آچکے ہیں، مناسب ہوتا کہ امام بخاری اس باب کو بھی انہی ابواب کیساتھ ذکر فرمادیتے لیکن امام نے اس روایت کو ان ابواب سے الگ کر دیا اور درمیان میں الزکوٰۃ من الاسلام لے آئے، ربط کے سلسلہ میں جو بات ہماری سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ زکوٰۃ اور اتباع جنازہ میں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر موجود ہے، اسی اشتراک کے باعث امام نے دونوں ابواب ساتھ رکھے، اسے اختصار کے ساتھ یوں سمجھنا چاہئے کہ زکوٰۃ کا مقصد غربا پروری ہے یعنی زکوٰۃ کی مشروعیت کا راز یہ ہے کہ غرباء کے لئے سامان مہیا کر دیا جائے تاکہ وہ اسکے ذریعہ سہولت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں، امراء کی امداد کے بغیر یہ لوگ مجبور محض ہیں، قدم قدم پر انہیں سہارے کی ضرورت ہے اور جس طرح یہ مفلس اپنے افلاس کی وجہ سے بمنزلہ میت ہوتا ہے، اسکے حوائج دوسرے انسانوں کی مدد سے پورے ہوتے ہیں، اسی طرح مرینوالا بھی اپنی ضروریات کی تکمیل میں

اپنی منزل تک پہنچنے میں دوسرے انسانوں کا محتاج ہے، یہ احتیاج جو ایک باب میں زندگی کیساتھ ہے اور دوسرے باب میں زندگی کے بعد، دونوں ابواب میں قدر مشترک ہے، اسی اشتراک احتیاج کے باعث امام بخاری نے الزکوٰۃ من الاسلام کے بعد اتباع الجنائزہ من الاسلام کا باب منعقد فرمایا۔

احتساب کی وجہ احتساب اسلئے فرمایا جا رہا ہے کہ جنازہ کیساتھ ساتھ جانا عموماً اسلئے ہوتا ہے کہ لوگ اسے رسی خیال کرتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ یہ ہمارا عزیز یا دوست ہے اور ایک کا دوسرے کے ساتھ مرنے اور جینے کا ساتھ ہے، یہ ہمارے یہاں ایسے حوادث میں شریک ہوتے ہیں ہمیں ان کے یہاں جانا چاہئے، ثواب تک نگاہ نہیں پہنچتی، شریعت نے احتساب کا لفظ بڑھا کر اس جانب توجہ مبذول کرادی کہ اگر آپ اپنے عمل کے ساتھ یہ نیت کر لیں کہ ہم اپنے مسلمان بھائی کا آخری حق ادا کر رہے ہیں اور دعاؤں کے ساتھ اسے الوداع کہہ رہے ہیں تو اجر و ثواب بہت بڑھ جاتا ہے۔

جنازے کیساتھ کہاں رہنا بہتر ہے شوافع و احناف اس سلسلہ میں باہم مختلف ہیں کہ جنازہ کے ساتھ چلنے والے جنازہ سے آگے رہیں یا پیچھے، حضرات شوافع رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ آگے چلیں اور حضرات احناف رحمہم اللہ کے نزدیک پیچھے چلنا اولیٰ ہے، اختلاف دراصل حاملین کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ حاملین کی ضرورت تو چاروں طرف رہتی ہے، انہیں تو آگے پیچھے ہر طرف ہونا چاہئے، اختلاف تو دراصل فارغین کے بارے میں ہے، شوافع کہتے ہیں کہ یہ لوگ سفارشی کی حیثیت رکھتے ہیں، اور خداوند کریم سے مجرم کے گناہوں کی مغفرت کیلئے سفارش کرنے آئے ہیں اور قاعدہ ہے کہ سفارشی مجرم سے آگے جاتے ہیں اور مجرم کو پیچھے رکھتے ہیں، لیکن احناف کہتے ہیں کہ پیچھے رکھنا کیا معنی؟ اگر یہی سفارش منظور ہے اور جرم کا اقرار و اعتراف ہے تو اسے شکستہ حال میں لائیکسی ضرورت تھی، کہیں مجرم کو بھی نہلا، دھلا کر کپڑے پہنائے جاتے ہیں، تم نے تو اسے دو لہا بنا رکھا ہے اور اس قدر تعظیم کے ساتھ لا رہے ہو، اگر یہ مجرم ہے اور تم بھی اسکے جرم کی معافی کے لئے سفارش کر رہے ہو تو یہ تعظیم و تکریم نہ ہونی چاہئے، دوسری بات یہ کہ سفارشی مجرم سے پہلے جب پہنچتے ہیں کہ مجرم ساتھ نہ ہو لیکن اگر مجرم ساتھ ہوتا ہے تو اسے آگے ہی لیجاتے ہیں، بہر کیف احناف کے نزدیک جنازے کو آگے رکھنا ہی اولیٰ ہے جیسا کہ حدیث شریف کے لفظ اتباع سے معلوم ہوتا ہے۔

آگے رکھنے کی دو وجہیں آگے رکھنے میں دو باتیں مزید حاصل ہوتی ہیں، ایک عبدیت اور دوسرے دعا میں اخلاص، عبدیت بایں معنی کہ جنازہ لیجانے والے جب یہ دیکھیں گے کہ کل تک یہ انسان ایک حکومت و سلطنت پر قابض تھا، جو چاہتا کر گزرتا تھا لیکن وائے عبرت کہ آج ایک ایک قدم کے لئے دوسروں کی امداد کا محتاج ہے، جب پورے راستے جنازہ نگاہوں کے سامنے رہے گا تو عبرت کا مقصد زیادہ حاصل ہوگا

اور انسان جنازہ کی مجبوری کو دیکھ کر یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ ایک دن ہمیں بھی اس مجبوری کی منزل سے گزرنا ہے اسلئے ہمیں بھی اسکے لئے ہمہ وقت تیار رہنا چاہئے اور دعا کے اندر اخلاص کا مفہوم یہ ہے کہ اس وقت یہ لوگ میت کے لئے مغفرت کی دعا کر رہے ہیں اور دعا کے اندر جس قدر اخلاص ہوگا اسی قدر مقبولیت کی شان اس میں زائد ہوگی اور اخلاص پیدا کرنیکی صورت یہ ہے کہ ان حضرات کو میت پر گزرنیوالی کیفیات کا احساس ہو، جب جنازہ انکے سامنے رہے گا تو اس منزل کی دشواریوں کے احساس میں تیزی آئیگی اور اخلاص کے ساتھ کی گئی دعا اس کے لئے رحمت و مغفرت کا سامان بن سکے گی۔

حدیث شریف | ارشاد فرمایا گیا کہ جو شخص میت کے ساتھ نماز میں شریک رہا اور دفن تک ساتھ ہی رہا، اسے اجر میں دو قیراط ملیں گے، یہاں تین چیزیں ہیں، میت کیساتھ رہنا، نماز میں شرکت کرنا، دفن تک ساتھ رہنا، اگر صرف دفن میں شرکت کی تو یہ نہیں ہے کہ اجر ہی نہیں ملے گا، بلکہ اجر موعود نہ ملے گا اجر موعود دو قیراط ہیں، صرف نماز کی شرکت یا صرف دفن کی شرکت سے ایک قیراط ملتا ہے اور قیراط بھی دنیا کا نہیں جو دینار کا بارہواں حصہ ہوتا ہے بلکہ اس سے آخرت کا قیراط مراد ہے جسکی مقدار جبل احد کے برابر ہے، دراصل حدیث شریف میں اجر اخروی کی تحدید کی گئی ہے اور وہاں کے قیراط کو جبل احد کے برابر بتلایا گیا ہے، یہاں اس تاویل کی ضرورت نہیں کہ قیراط کو جبل احد کے برابر بتلانا تکثیر ثواب کے لئے ہے۔

یہاں بھی امام بخاری کا مقصد مرجیہ کی تردید ہے کہ تم نے طاعت کو ایمان سے بالکل الگ بتلایا ہے، یہاں تو جنازہ کی شرکت کو داخل ایمان بتلایا جا رہا ہے اور پھر اجر میں کمی و بیشی بھی بتلائی گئی ہے کہ اگر صرف نماز میں شرکت کرو گے تو ایک قیراط ملے گا اور اگر دفن میں بھی شریک ہو تو دو قیراط ملیں گے۔

تابعہ الخ کا مقصد یہ ہے کہ میں نے جو روح کی طریق سے حضرت ابو ہریرہ کی روایت نقل کی ہے اسکی موافقت میں عثمان موزن سے یہ ایک روایت منقول ہوئی ہے مگر میری روایت میں عوف، حسن بصری، اور محمد بن سیرین دو سے روایت کر رہے ہیں، اور عثمان موزن کی روایت میں عوف صرف محمد بن سیرین سے ابو ہریرہ کا یہ بیان نقل کر رہے ہیں، دوسرا فرق یہ ہے کہ میری روایت باللفظ ہے اور عثمان کی روایت بالمعنی ہے، اسلئے بجائے مثلہ کو نحوہ سے تعبیر کیا گیا ہے پھر یہ متابعت اگر اول سند سے ہوتی تو متابعت تامہ ہوتی اور جب یہ متابعت استاد الاستاد یا اسکے اوپر والے راوی کے ساتھ ہو تو وہ متابعت قاصرہ کہلاتی ہے، گویا جو روایت امام نے اپنے صحیح میں ذکر فرمائی وہ ہر لحاظ سے عثمان والی روایت کے مقابلہ میں جسکو اسماعیل نے اپنے مستخرج میں موصولاً ذکر کیا ہے اعلیٰ اور بہتر ہے۔

[۳۶] بَابُ خَوْفِ الْمُؤْمِنِ مِنْ أَنْ يَحْبَطَ عَمَلُهُ وَهُوَ لَا يَشْعُرُ

وَقَالَ إِبْرَاهِيمُ التَّمِيمِيُّ مَا عَرَضْتُ قَوْلِي عَلَى عَمَلِي إِلَّا خَشِيتُ أَنْ أَكُونَ مُكْذِبًا، وَقَالَ ابْنُ أَبِي مُلَيْكَةَ أَدْرَكْتُ ثَلَاثِينَ مِنْ أَصْحَابِ النَّبِيِّ ﷺ كُلُّهُمْ يَخَافُ النِّفَاقَ عَلَى نَفْسِهِ مَا مِنْهُمْ أَحَدٌ يَقُولُ إِنَّهُ عَلَى إِيمَانٍ جَبْرَيْلَ وَمِيكَائِيلَ وَيَذْكُرُ عَنِ الْحَسَنِ مَا خَافَهُ إِلَّا مُؤْمِنٌ وَلَا أَمِنَهُ إِلَّا مُنَافِقٌ وَمَا يُحَدِّثُ مِنَ الْإِصْرَارِ عَلَى التَّقَاتِلِ وَالْعِصْيَانِ مِنْ غَيْرِ تَوْبَةٍ لِقَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ . (آل عمران: ۱۳۵)

ترجمہ | باب، مومن کو بے شعوری میں حبط اعمال سے ڈرنا چاہئے، حضرت ابراہیم تیمی نے فرمایا کہ میں نے جب بھی اپنے قول کا عمل سے تقابل کیا تو یہ خوف ہوا کہ کہیں میری تکذیب نہ کجائے اور ابن ابی ملیکہ نے فرمایا کہ میری ملاقات میں اصحاب کرام رضی اللہ عنہم سے ہوئی ہے، انہیں سے ہر صحابی اپنے بارے میں نفاق سے خائف تھا، ان میں کوئی یہ نہ کہتا تھا کہ میرا ایمان جبرئیل و میکائیل جیسا ہے اور حضرت حسن بصری سے منقول ہے کہ نفاق سے نہیں ڈرتا ہے مگر مومن، اور نفاق سے بے فکر نہیں رہتا ہے مگر منافق اور اس باب میں ان چیزوں کا بھی بیان ہے جن سے ڈرایا جاتا ہے یعنی باہمی جنگ اور گناہوں پر بغیر توبہ کے اصرار کرنا کیونکہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ لوگ جان بوجھ کر گناہوں پر اصرار نہیں کرتے۔

مقصد ترجمہ | اس باب میں امام دوسرے پہلو سے مرجیہ کی تردید فرما رہے ہیں، اس سے قبل ان اعمال کا ذکر فرمایا تھا جن سے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے رونق بڑھتی ہے، ان ابواب میں بھی مرجیہ کی تردید منظور تھی جو ایمان کیلئے کسی بھی عمل کو ضروری نہیں سمجھتے، اب اس باب میں دوسرے پہلو سے مرجیہ کی تردید فرما رہے ہیں کہ ایمان لانے کے بعد بالکل نڈر ہو جانا تقاضائے ایمان کے خلاف ہے، مومن وہ ہے جو اپنے ایمان کے بارے میں ہمہ وقت خائف رہے اور اپنے ایمان کی حفاظت کے لئے تدبیر کرتا رہے اور حفاظت ایمان اعمال صالحہ سے ہوتی ہے کوئی بھی مومن اپنے ایمان پر اس طرح مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا کہ انجام سے بے فکر ہو جائے، ممکن ہے زبان سے ایسا کوئی کلمہ نکل جائے جس سے سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے یا عمل ہی میں کوئی ایسی چیز داخل ہو جائے جسے عامل نے گواہم نہ سمجھا تھا لیکن خداوند قدوس کے نزدیک وہ چیز ایمان کے لئے خطرناک ہو، جس طرح یہ ممکن ہے کہ انسان ایک کام کو غیر اہم جان کر کرے اور اللہ کے نزدیک اسکی بڑی قیمت ہو، غرض مومن کو کسی بھی وقت اپنے ایمان سے بے خوف نہ رہنا چاہئے بلکہ جب بھی عمل خیر کرے خداوند قدوس سے دعا کرے کہ اے اللہ تو نے مجھے عمل خیر کی توفیق عطا کی تھی، اب تو ہی اسکے اجر کو برقرار رکھ، حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے بھی یہی فرمایا ہے کہ مکملات ایمان کے بعد مضرات

کا تذکرہ فرمایا جا رہا ہے، حضرت کے اس ارشاد سے ما قبل کے ساتھ ربط بھی واضح ہو گیا یعنی ما قبل میں اعمال صالحہ کا ذکر ہو رہا تھا لیکن ساتھ ہی یہ باب منعقد فرما کر تنبیہ کر دی کہ اعمال صالحہ کی باوجود عامل کو اپنے اعمال پر مغرور نہ ہونا چاہئے بلکہ ہر عمل کے بعد یہ سوچنا چاہئے کہ مجھے اللہ کی جانب سے اس عمل کی توفیق ہوئی اس لئے اس کے شکر یہ میں اور بھی دوسرے اعمال انجام دوں۔

حبط کے دو معنی | حبط کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ تمام اعمال صالحہ محو ہو گئے اور کیا کرایا سب سوخت ہو گیا، یہ معنی تو اس وقت ہوتے ہیں کہ جب کفر و ارتداد کی نوبت آجائے، کفر و ارتداد سے تمام اعمال سوخت ہو جاتے ہیں اور حبط کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ کسی وجہ سے عمل میں کمزوری آگئی اور اثر ماند پڑ گیا یا تاثر باقی نہ رہی، دوسرے معنی احباط فی الوزن سے ماخوذ ہیں، یعنی جب حسنات ترازو کے ایک جانب اور سیئات دوسری جانب رکھے جائیں گے تو جس کے حسنات زائد ہوں گے وہ نجات پا جائے گا اور جس کے سیئات کا وزن زائد ہو گا وہ کچھ دنوں سزا کی مصیبت جھیلے گا، یہ دوسرے معنی مجازی ہیں اور یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں، یعنی مومن کو ہمہ وقت دونوں باتوں سے خائف رہنا چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان غفلت میں کوئی ایسا کام کرادے جو تمام اعمال کی بربادی کا سبب ہو جائے اور ہمیں معلوم بھی نہ ہو، کیونکہ ہمارے پاس اعمال کی ترازو نہیں ہے بلکہ وہ صرف خدا کے پاس ہے۔

ابراہیم تیمیٰ کا ارشاد | ابراہیم تیمیٰ بڑے عابد، زاہد اور متقی انسان تھے، وعظ کہا کرتے تھے، ان کا ارشاد ہے کہ جب میں اپنے اقوال کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے یہ خوف ہوتا ہے کہ میری تکذیب نہ کر دی جائے، کیونکہ میری باتیں سننے والے جب میرے اعمال دیکھیں گے تو کہیں گے، جناب یہ تمام باتیں برائے گفتنی معلوم ہوتی ہیں، خود آپ کا عمل ان کی تکذیب کر رہا ہے، اگر یہ باتیں درست ہوتیں تو کم از کم آپ کا عمل انکی موافقت میں ہوتا، حضرت ابراہیم گو بہت محتاط اور متقی انسان تھے لیکن انکے اس ارشاد سے معلوم ہو رہا ہے کہ کمال ایمانی کے بہت سے درجات ہیں اور اگر مکذبا کو بکسر الزال پڑھیں تو معنی یہ ہونگے کہ میرا عمل کہیں ان لوگوں کے مشابہ نہ ہو جائے جو دین کی تکذیب کیا کرتے ہیں یعنی منافقین جنکی زبان میں تو بڑی طاقت ہوتی ہے، لیکن عمل کے میدان میں وہ صفر ہوتے ہیں۔

ابن ابی ملیکہ کا ارشاد | فرماتے ہیں کہ میں تمیں اصحاب کرام سے ملا ہوں، ان میں سے کسی کو بھی اپنے ایمان کے سلسلہ میں مطمئن نہیں پایا بلکہ ہر شخص اپنے ایمان کے بارے میں نفاق کا اندیشہ ظاہر کرتا تھا یہ حضرات صحابہ کا حال تھا جنکے کمال ایمانی کی شہادت نص قرآنی اور احادیث نبوی میں موجود ہے، انکے برابر کس کا ایمان ہو سکتا ہے ان اصحاب میں جن سے ابن ابی ملیکہ کی ملاقات ہوئی حضرت عائشہ، اسماء، ام سلمیٰ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں، آگے فرماتے ہیں کہ ان میں سے کسی کو یہ کہتے نہیں سنا کہ میرا ایمان جبرئیل و میکائیل کے ایمان کی طرح

ہے کیونکہ انہیں اپنے معاملہ میں ہر دم نفاق کا اندیشہ لگا رہتا تھا، جب یہ چیز ہے تو کیسے دعوے کریں کہ ہمارا ایمان جبرئیل و میکائیل جیسا ہے، کیونکہ جبرئیل و میکائیل کا ایمان تو خطرہ سے باہر ہے، اور ہم ہمہ وقت خطرہ میں مبتلا ہیں، علامہ عینی فرماتے ہیں کہ کلہم یخاف النفاق علی نفسہ کے معنی یہ ہیں کہ ان میں ہر شخص اپنے ایمان کو نفاق سے بچانے کیلئے کوشاں رہتا تھا اور کوشش کے باوجود اس قسم کے دعاوی سے محترز تھا۔

یہ ظاہر اس قول میں امام اعظم پر تعریض ہے کیونکہ امام سے ایمانی کا ایمان جبرئیل کے الفاظ منقول ہیں، تعریض بایں طور ہے کہ جب اتنے اتنے اونچے اصحاب کرام بلند دعاوی سے احتراز فرماتے ہیں تو امام اعظم کو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ وہ ایسے لمبے چوڑے دعاوی کریں کیونکہ جبرئیل کا ایمان یقینی ان کا خاتمہ علی الایمان یقینی، لیکن علاوہ مبشرین بالجنۃ کے دوسرا کون ہے جسکے جنتی ہونیکا فیصلہ ہو سکے، جنتی ہونا تو حسن خاتمہ پر موقوف ہے اور وہ نامعلوم ہے۔

اب اگر یہ واقعہ امام صاحب رحمہ اللہ پر تعریض ہے تو کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ ایسا کہنا واقع کے خلاف ہے یا محض اس بنا پر کہ حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسا کبھی نہیں کہا، لہذا امام کا یہ قول قابل اعتراض ہو یا پیغمبر علیہ السلام کی امت میں جبرئیل و میکائیل کے ایمان کے برابر کسی بھی شخص کا ایمان متصور نہیں تو کیا اسکی وجہ یہ ہے کہ انہیں عالم غیب کی بہت سی چیزوں کا مشاہدہ ہے جو آحاد امت کو حاصل نہیں یا اس لحاظ سے کہ وہ ہمہ وقت خداوند کریم کی اطاعت میں لگے رہتے ہیں، اور ہمارا حال ایسا نہیں یا اس بنا پر کہ وہ مامون العاقبہ ہیں، انہیں زوال ایمان کا خطرہ نہیں اور ہم ہمہ وقت خطرہ میں ہیں لہذا ہمارا یہ دعوی مساوات غلط ہے۔

ان تمام اشکالات کے لئے گزارش یہ ہے کہ ان وجوہ سے امام اعظم رحمہ اللہ کی ارشاد کی تغلیط خود غلط اور باطل ہے، یہ سمجھنا کہ فی نفسہ یہ قول واقع کیخلاف ہے محض ایک دعوی ہے، جسکے لئے مدعی کے پاس کوئی دلیل نہیں، ہم انشاء اللہ قریب ہی میں اس دعوی کی تصحیح پیش کریں گے۔

فرماتے ہیں، ”صحابہ نے یہ بات کبھی نہیں کہی“ اول تو یہ کیسے معلوم ہوا کہ انہوں نے کبھی ایسا نہیں فرمایا کیا ابن ابی ملیکہ کے سامنے نہ کہنے سے یہ سمجھ لیا گیا کہ انہوں نے ایسا کبھی نہیں کہا ہوگا، کیا ابن ابی ملیکہ ہمہ وقت انکی خدمت میں حاضر رہتے تھے، کیا ہر بات کا ہر شخص کے سامنے ظاہر کرنا بھی ضروری ہے، اچھا انہوں نے نہیں فرمایا تو کیا یہ اصول بنا دیا جائیگا کہ جو بات انکی فرمودہ نہ ہو وہ غلط ہے، کیا اس ملازمہ پر کوئی دلیل قائم ہے، ہم تو ہزاروں باتیں ایسی دیکھ رہے ہیں کہ وہ ان کی فرمودہ نہیں ہیں مگر اہل علم انہیں درست اور صحیح مان کر ان پر عامل ہیں۔ اب ذرا ابن ابی ملیکہ کے اول کلام کو ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہے کلہم یخاف النفاق علی نفسہ یعنی یہ تمام حضرات کمال ایمان اور اعلیٰ اطاعت کے باوجود ہمہ وقت ترساں و لرزاں رہتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ ہمارے اعمال مراتب اخلاص کے اعتبار سے قاصر ہیں، اسی کوتاہی کا نام ان کے یہاں نفاق تھا، یہ ایک خاص حال ہے جو صاحب حال کے کمال ایمان کی دلیل ہے، ان کی شان یدعون ربہم خوفا وطمعاً ہوتی ہے، ایسی حالت میں اس قسم کے دعاوی مناسب نہیں، لہذا ابن

ابی ملیکہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ یہ حضرات ایمانی کا ایمان جبرئیل و میکائیل کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں، ورنہ فی الحقیقت ان دونوں باتوں میں کوئی منافات نہیں ہے، اعیان صحابہ جن کا جنتی ہونا بہ نص حدیث قطعی ہے وہ بھی کبھی مطمئن نہیں ہوئے، اور تو اور حضرات انبیاء علیہم السلام کو ترساں ولرزاں دیکھا گیا ہے حالانکہ اہل سنت کے مسلک کی رو سے انبیاء علیہم السلام خواص ملائکہ سے بھی افضل ہیں، پھر ان کی قوت ایمانی کے بارے میں کیا ارشاد ہوگا۔

اب لیجئے دوسری وجہ کہ کسی امتی کے لئے اس درجہ کی قوت ایمان متصور نہیں کیونکہ عالم غیب کی اشیاء کا مشاہدہ نہیں، اس بنا پر مماثلت بھی نہیں، یہ دلیل بھی عجیب ہے، کیا یقین کی قوت مشاہدہ ہی پر موقوف ہے، کیا مشاہدہ کیلئے ضروری ہے کہ جہاں وہ چیز ہو وہیں جا کر اس کو دیکھے، اس کے بغیر نہ ان چیزوں کا مشاہدہ ہوگا اور نہ یقین میں وہ قوت پیدا ہوگی جو مشاہدہ کے بعد ہوتی، یہ دونوں باتیں غیر مسلم ہیں، اگرچہ بالعموم مشاہدہ کے بعد اس کا علم پختہ اور یقینی ہو جاتا ہے مگر قوت یقین کے لئے اس کو مدار علیہ قرار دینا صحیح نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ علم یقین میں عین یقین کے برابر قوت ہو یا اس سے بھی بڑھ جائے، حضرت علیؑ کا یہ مقولہ متعدد طرق سے منقول ہوا ہے لو كشف الحجاب ما ازدت یقینا۔ یعنی مجھے آخرت کی مغیبات کا اس قدر اعلیٰ اور کامل یقین ہے کہ اگر یہ مغیبات پردے ہٹا کر سامنے کر دی جائیں تو میرے سابق یقین پر اس کشف حجاب کے باعث کچھ اضافہ نہ ہوگا، معلوم ہوا کہ علم یقین میں وہ قوت ہو سکتی ہے جو عین یقین سے بے نیاز کر دے۔

نیز یہ خیال بھی درست نہیں کہ وہ ہمہ وقت طاعت میں مصروف ہیں اور انسان غافل؛ کیونکہ طاعت کی حقیقت اوامر کی بجا آوری اور نواہی سے اجتناب ہے، اللہ تعالیٰ کے بہرے سے مقبول بندے ایسے ہیں کہ جن کا دنیوی اور اخروی ہر عمل اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کے حکم کے ماتحت ہوتا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ تصحیح نیت کے ساتھ ہر عمل طاعت بن جاتا ہے تو اکابر اہل اللہ کے متعلق بدگمانی کا کیا موقع ہے؟ حضرات ائمہ بالخصوص امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا درجہ اولیاء اللہ میں بہت اونچا ہے اور اگر قوت ایمانی میں اس اعلیٰ درجہ پر فائز ہوں جس درجہ پر جبرئیل و میکائیل فائز ہیں تو اس پر کیا تعجب ہے اور اگر ذرا وسعت نظر سے کام لیں اور حقیقت سمجھنے کی کوشش کریں تو اصل عمل قلب کا ہے، غفلت اور تذکر کا عمل براہ راست قلب سے متعلق ہے اور اہل اللہ کا قلب ہمیشہ ذکر الہی سے معمور رہتا ہے، ایک لمحہ کی غفلت بھی ان کے نزدیک کفر ہے، اب احوال کا موازنہ کرنے سے بشرطیکہ تعصب سے کام نہ لیا جائے معلوم ہو سکتا ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کا ارشاد بالکل درست ہے۔

رہی یہ بات کہ وہ مامون العاقبت ہیں اور ہم ہمہ وقت مشتبہ حالت میں ہیں تو یہ بھی سرسری نگاہ کا مال ہے ورنہ بہت سی آیات ہیں جو ان کے مامون العاقبت ہونے کا اعلان کر رہی ہیں، ارشاد ہے۔

الذین امنوا ولم یلبسوا ایمانہم
جولوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان شرک سے

بظلم اولئك لهم الا من وهم مخلوط نہیں کرتے ایسوں ہی کیلئے امن ہے اور وہی راہ پر ہیں
مہتدون (پ ۱۵۷)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے۔

الَاِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ
ولا هم يحزنون (پ ۱۱۷ ع ۱۲)

یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہے
اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں۔

اسی طرح پیغمبر علیہ السلام کے ارشادات میں بھی یہ چیز ملتی ہے، آخر مَنْ يرد الله به خيرا يفقهه في الدين میں کوئی خیریت مراد ہے، اسکے باوجود اکابر کا ہمہ وقت خائف رہنا تو یہ انہیں کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ملائکہ مقربین کا بھی یہی حال ہے اور سب کچھ قدرت الہی پر نظر کا نتیجہ ہے اور اس معاملہ میں جس کی نظر جتنی بالغ ہوگی اسی قدر خشیت کے آثار زیادہ نمایاں ہوں گے، یہ کلام تو ان حضرات کے بارے میں تھا جو حضرات امام کے اس قول پر طعن و تشنیع کرتے ہیں۔ اب ذرا امام ہمام کے اصل کلام کو دیکھنا چاہئے کہ آپ نے کیا فرمایا ہے اور کس اعتبار سے فرمایا ہے اس کے متعلق امام کی طرف تین قول منسوب ہیں ایک ایمانی کا ایمان جبرئیل ولا اقول مثل ایمان جبرئیل۔ یہ قول زیادہ مشہور ہے، دوسرا قول ”خلاصہ“ میں بدیں الفاظ منقول ہے اکره ان يقول الرجل ایمان جبرئیل ولكن يقول امن بما امن به جبرئیل اور اسکی تائید میں امام محمد کا قول موجود ہے کہ میں نہ تو کا ایمان جبرئیل کہتا ہوں اور نہ مثل ایمان جبرئیل کہتا ہوں، میں کہتا ہوں کہ امن بما امن به جبرئیل یعنی ہمارا اور جبرئیل کا مومن بہ ایک ہے، اس میں کوئی تفاوت نہیں۔

تیسرا قول کتاب العالم والمعلم میں مذکور ہے ان ایماننا مثل ایمان الملائكة یہ اقوال بظاہر متعارض نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں نظر ان کو متعارض اور متناقض نہیں دیکھتی بلکہ اس کے نزدیک ان تمام اقوال کا مرجع اور مال ایک ہی امر ہے اور وہ ہے مومن بہ کا اتحاد اور یہ تعبیری اختلاف بقاضائے احوال پیدا ہوا، قول مشہور ولا اقول مثل ایمان جبرئیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی کے جواب میں فرمایا ہے، شاید کسی کم فہم کو یہ شبہ ہوا ہو کہ ان کا ایمان اور جبرئیل کا

العالم والمعلم میں جو امام اعظم علیہ الرحمہ سے ابو مقاتل کا علمی مذاکرہ ہے وضاحت کیساتھ مذکور ہے، ایمانی کا ایمانی جبرئیل فرماتا مومن بہ کے اعتبار سے ہے اور اس میں ہم اور تمام ملائکہ برابر ہیں ابو مقاتل سوال کرتے ہیں اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ایک بات پوچھوں، کیا ہمارے لئے یہ کہنا مناسب ہے کہ ہمارا ایمان ملائکہ اور رسول جیسا ایمان ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم سے زیادہ مطیع و فرمانبردار ہیں، ابو حنیفہؒ تم جانتے ہو کہ وہ ہم سے زیادہ مطیع و فرمانبردار ہیں اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ایمان اور عمل دونوں الگ الگ چیزیں ہیں ہمارا ایمان انہیں جیسا ایمان ہے کیونکہ ہم نے وحدانیت رب کی تصدیق کی ہے اس کی قدرت اور اس کے پاس سے جو کچھ آیا ہے اس کی تصدیق کرتے ہیں اور انہیں چیزوں کی انبیاء اور رسول نے تصدیق کی ہے یہاں سے معلوم ہوا کہ ہمارا اور ان سب کا ایمان ایک جیسا ہے“ (آثار امام) اس سے معلوم ہوا کہ امام اعظم رحمہ اللہ نے ایمانی کا ایمانی جبرئیل میں مومن بہ کا اتحاد مراد لیا ہے۔ (مرتب)

ایمان کس طرح برابر ہو گیا اور وہ قوت و ضعف کے لحاظ سے دونوں ایمانوں میں فرق سمجھ رہا ہوا اس کے جواب میں حضرت امام اعظمؒ نے یہ فرمایا ہو کہ تم نے میرے الفاظ پر توجہ نہیں دی، میں نے تو کہا ایمان جبرئیل کہا ہے مثل ایمان جبرئیل نہیں کہا پھر کیا شبہ ہے، کاف تشبیہ کے لئے آتا ہے تشبیہ میں یہ ضروری نہیں کہ مشبہ اور مشبہ بہ دونوں یکساں ہوں البتہ دو چیزوں میں مماثلت کے لئے یکسانیت اور مساوات ضروری ہے سو میں اس کا مدعی نہیں ہوں، یہ جواب الزامی بھی ہو سکتا ہے اور حقیقی بھی، جس کا منشا اس قسم کے مواقع میں احتیاط پر عمل کرنا ہے ورنہ مومن بہ کی تفصیلات کے بعد مثل کا لفظ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے چنانچہ کتاب العالم والمتعلم میں خود حضرت امام صاحب سے لفظ مثل منقول ہوا ہے کیونکہ تفصیلات کے بعد کسی غلط فہمی کا مظنہ باقی نہیں رہتا۔

اور کراہت کا قول عوام کے اعتبار سے ہے، وہ بیچارے کہاں کاف اور مثل کاف فرق کر سکیں گے، لہذا انہیں ایک صاف اور نکھری ہوئی بات بتادی کہ تمہیں تو یہ اعتقاد رکھنا چاہئے کہ اجمالا ہمارا اور جبرئیل علیہ السلام کا مومن بہ ایک ہے یعنی جن چیزوں کی تصدیق سے جبرئیل مومن ہوئے انہیں چیزوں کی تصدیق سے ہم سب مومن ہیں، اس بارے میں ہمارا اور جبرئیل کا ایمان برابر ہے۔

بہر کیف حقیقت کے واضح ہونے کے بعد امام اعظمؒ کا ارشاد بالکل صحیح اور واقع کے عین مطابق ہے، اب اگر معترضین کے اعتراضات ناواقفیت پر مبنی نہیں ہیں تو پھر یہ کھلا تعصب ہے، بھلا یہ بھی کوئی اعتراض ہوا کہ ہم نے فلاں، فلاں کو ایسا کہتے نہیں سنا، اگر بات صحیح ہے تو بھلا کہتے ہیں کیا مضائقہ ہے، اگر خداوند قدوس اپنے کسی بندے کو ایمان کا وہ درجہ عنایت فرمادے جو جبرئیل کو حاصل ہے تو اس میں کیا استبعاد ہے اور اس کے اظہار میں کیا مضائقہ ہے، بلکہ اما بنعمة ربك فحدث۔ سے اظہار کی مطلوبیت اور کتمان کی ناپسندیدگی مترشح ہوتی ہے، تو اضع الگ چیز ہے، اکابر کے یہاں دونوں قسم کے احوال ملتے ہیں۔

ایمان جبرئیل کیساتھ تشبیہ خلوص کے اعتبار سے بھی صحیح ہے یعنی جس طرح جبرئیل کا ایمان خالص ہے کہ اس میں نفاق کا شائبہ بھی نہیں ہے اسی طرح میرا ایمان بھی نفاق کی آمیزش سے قطعاً پاک ہے نیز اس تشبیہ کے یہ معنی بھی درست ہیں کہ میرا ایمان قدامت کے لحاظ سے جبرئیل کے ایمان کے مماثل ہے، یعنی بیشاق کے دن سے اس وقت تک میرے ایمان میں کبھی تزلزل نہیں آیا، جس طرح کہ جبرئیل کا ایمان غیر متزلزل ہے اسی طرح میرا ایمان بھی ہے، یہ امام کی غایت احتیاط کی بات تھی کہ حرف کاف استعمال کیا اور لفظ مثل سے انکار فرمایا۔

حضرت حسن بصریؒ کا ارشاد | حضرت حسن بصریؒ سے مذکور ہے کہ نفاق سے وہی ڈرے گا جس کا ایمان کامل ہو اور بخوف وہ رہے گا جس کے دل میں نفاق ہو، مومنین کی شان خوف و طمعا بیان کی گئی ہے یعنی انہیں خوف بھی رہتا ہے اور طمع بھی، نبی اکرم ﷺ کی شان کثیر الحزن بیان کی گئی ہے، حضرت

حسن نے بھی یہی فرمایا کہ کبھی اپنے اعمال پر اعتماد و اطمینان درست نہیں ہے بلکہ ہمہ وقت نفاق سے خائف رہنا چاہئے، بعض حضرات نے مخالفہ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹا دی ہے، اس سے معنی تو بالکل صحیح رہتے ہیں لیکن اس صورت میں معنی کا ترجمہ سے کوئی ربط باقی نہیں رہتا، پھر حضرت حسن بصریؒ کی پوری روایت میں جسے دوسری کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے نفاق کی تصریح موجود ہے، اس بنا پر اس مختصر روایت کے معنی بھی اسی مفصل روایت کے مطابق کئے جائینگے، امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں یہ ذکر کرنا کہ وہ صیغہ مجہول ذکر فرمایا، اور صیغہ مجہول کا استعمال اس بات کی دلیل شمار کیا جاتا ہے کہ اس کی سند کمزور ہے؛ حالانکہ قول بالکل درست ہے اور اس کی سند بھی کمزور نہیں ہے، اسکے جواب میں حافظ رحمہ اللہ نے اپنے شیخ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ امام بخاری کے نزدیک صیغہ ترمیض کا استعمال صرف ضعف سند ہی کی طرف اشارہ کرنے کے لئے نہیں ہوتا بلکہ اگر وہ کسی قول کو مختصر کریں یا نقل بالمعنی کریں تب بھی صیغہ ترمیض ہی کا استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا ترجمہ | وما يحذر من الاصرار من غير توبة سے امام بخاریؒ دوسرا ترجمہ منعقد کر رہے ہیں اس کا عطف خوف المؤمن پر ہے یعنی دوسری وہ چیز جس سے مومن کو ڈرنا چاہئے گناہوں پر اصرار ہے، گناہوں پر اصرار کرنا بھی خطرناک چیز ہے اسکے لئے امام بخاری آیت پیش فرما رہے ہیں۔

والذین اذا فعلوا فاحشة او ظلموا انفسهم
ذکروا اللہ فاستغفروا لذنوبهم
ومن یغفر الذنوب الا اللہ
ولم یصروا علی ما فعلوا
وہم یعلمون (پ ۵۴)

اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں
جس میں زیادتی ہو یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں
تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر لیتے ہیں پھر اپنے گناہوں کی
معافی چاہنے لگتے ہیں اور اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہوں کو
بخشتا ہو اور وہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے اور وہ جانتے ہیں

آیت میں فعلوا فاحشة سے مراد متعدی گناہ ہیں اور ظلموا انفسہم سے مطلب یہ ہے کہ ان سے جب کوئی خطا ہوتی ہے خواہ اس کا اثر کرنے والے تک محدود رہے یا متعدی ہو وہ ہر حال میں مغفرت طلب کرتے ہیں، اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو لوگ توبہ نہیں کرتے، مغفرت کے طالب نہیں ہوتے بلکہ گناہوں پر اصرار کئے جاتے ہیں وہ اس انعام کے مستحق نہیں۔

(۴۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرَعْرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ زُبَيْدٍ قَالَ سَأَلْتُ أَبَا وَائِلٍ عَنِ

الْمُرْجِنَةِ فَقَالَ حَدَّثَنِي عَبْدُ اللَّهِ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ سَبَابُ الْمُؤْمِنِ فُسُوقٌ وَقِتَالُهُ كُفْرٌ .

(آئندہ: ۶۰۳۳، ۶۰۷۶، ۷۰)

ترجمہ | زبید سے روایت ہے کہ میں نے ابو وائل سے مرجیہ کے بارے میں دریافت کیا انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے حضرت عبداللہ بن مسعود نے یہ حدیث بیان کی کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے

اور اس سے قتال کرنا کفر ہے۔

تشریح حدیث | حضرت ابو وائل سے مرجیہ کے متعلق دریافت کیا گیا، یعنی یہ پوچھا گیا کہ ان کے عقائد کہاں تک درست ہیں، فرمایا کہ حضرت ابن مسعود سے مروی ہے کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے اور ظاہر ہے کہ کفر اور فسق ایمان کے لئے مضر ہیں، کفر تو ایمان ہی کی ضد ہے، اسی طرح فسق کا نقصان بھی ظاہر ہے، ارشاد باری ہے۔

کرہ الیکم الکفر و الفسوق و العصیان کفر اور فسق اور عصیان سے تم کو نفرت دیدی۔

آیت کریمہ میں پہلا نمبر کفر کا ہے، دوسرا فسق اور تیسرا عصیان کا، معلوم ہوا کہ فسق عصیان سے بڑھا ہوا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ گالی میں براہ راست دوسرے کی عزت پر حملہ ہے، عصیان میں ایسا نہیں ہے کیونکہ اس کا ابتدائی تعلق عاصی کی اپنی ذات سے ہے، اور جب سبب کا یہ حال ہے تو قتال تو اس سے بھی اونچے درجہ کی چیز ہے، حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے خطاب فرمایا تھا۔

لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم

میرے بعد کفر اختیار نہ کرنا کہ آپس میں ایک

رقاب بعض (بخاری جلد ۱ ص ۲۱۵)

دوسرے کی گردنیں کاٹنے لگو۔

یعنی بلا وجہ مسلمان پر تلوار اٹھانا اس امر کی غمازی کر رہا ہے کہ تم اسکو مسلمان نہیں سمجھتے، ورنہ اپنے بھائی کی گردن کیوں مارتے اور خواہ مخواہ کسی مسلمان کو کافر بنانا خود اپنے لئے کفر کا خطرہ پیدا کرنا ہے۔

اس حدیث میں صراحت کیساتھ مرجیہ کا رد ہو گیا، کیونکہ ان کے یہاں اہل طاعت اور اہل معصیت کا کوئی فرق نہیں ہے، ایمان کے بعد نہ اطاعت کا کوئی فائدہ ہے نہ معصیت سے کوئی ضرر، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بعض معاصی تو کفر تک پہنچا دیتے ہیں، اور بعض اسکو فسق بنا دیتے ہیں، اس حدیث سے مرجیہ کا مذہب تو حرف غلط ہو گیا، مگر خوارج کو اپنی طمع خام پکانے کا موقعہ ہاتھ لگ گیا، کیونکہ خوارج مرتکب کبیرہ کی تکفیر کر رہے ہیں، اور اس روایت میں قتالہ کفر کی صراحت موجود ہے، حالانکہ اہل سنت مرتکب کبیرہ کو کافر نہیں سمجھتے تو اس کا جواب بھی سن لیجئے کہ یہاں، قتالہ کفر سبب المومن فسوق کے مقابلہ پر وارد ہوا ہے جسکا منشا قتال مسلم کی تغلیظ و تشدید کا اظہار ہے، یعنی جب سبب مومن فسق ٹھہرا تو قتال مومن کو کیا درجہ دیا جائے جو اس سے بہت اوپر کی چیز ہے، یعنی اس سے قبل گالی دینے کو فسق فرمایا جا چکا ہے اسلئے اگر اب قتال کے لئے بھی وہی لفظ استعمال کریں تو مقصد پوری طرح سے حاصل نہ ہوگا اور جرم قتال کی نوعیت پوری طرح واضح نہ ہوگی، اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ مسلمان کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے گالی دینا فسق اور اسی حیثیت سے جنگ کرنا کفر ہے، اب جہاں یہ حیثیت یقینی ہوگی وہاں کفر بھی یقینی ہوگا اور جہاں یہ حیثیت قطعی نہ ہوگی وہاں قطعی طور پر کفر کا اطلاق بھی درست نہ ہوگا، مثال کے طور پر حضرات انبیاء کرام علیہم

السلام کا ایمان یقینی ہے لہذا ان کا قتال کفر حقیقی ہوگا اور چونکہ دوسرے مومنین کا معاملہ یہ ہے کہ ان کا ایمان یقینی نہیں اس لئے ان سے قتال بھی یقینی طور پر کفر نہیں ہے، اسی طرح وہ مومن جس کا ایمان نص قطعاً سے ثابت ہو، اس کے قتال کا حکم بھی انبیاء کے قتال کا حکم ہوگا۔

(۴۹) أَخْبَرَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ حَدَّثَنِي إِسْمَاعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ أَنْسٍ قَالَ أَخْبَرَنِي عَبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ خَرَجَ يُخْبِرُ بَلَيْلَةَ الْقَدْرِ فَتَلَا حِي رَجُلَانِ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فَقَالَ إِنِّي خَرَجْتُ لِأَخْبِرْكُمْ بَلَيْلَةَ الْقَدْرِ وَإِنَّهُ تَلَا حِي فُلَانٌ وَفُلَانٌ فَرُفِعَتْ وَعَسَى أَنْ يَكُونَ خَيْرَ الْكَمِ التَّمْسُوهَا فِي السَّبْعِ وَالتَّسْعِ وَالْخَمْسِ .

(آئندہ: ۲۰۲۳، ۲۰۲۹، ۶۰۲۹)

ترجمہ | باب، حضرت انسؓ سے روایت ہے حضرت عبادہ بن صامتؓ نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ لیلۃ القدر کی خبر دینے کیلئے باہر تشریف لائے، مسلمانوں ہی میں دو آدمی باہم جھگڑنے لگے، آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں لیلۃ القدر کی خبر دینے کیلئے آیا تھا، فلاں فلاں جھگڑنے لگے، اسلئے وہ میرے سینے سے نکال لی گئی، اور شاید تمہارے لئے ایسا ہی بہتر ہو، اسے سات، نو اور پانچ میں تلاش کرو۔

تشریح حدیث | فرمایا گیا کہ رسول اکرم ﷺ لیلۃ القدر کی اطلاع دینے کیلئے باہر تشریف لائے مسجد میں دو مسلمان عبداللہ بن حدر اور کعب ایک حق کے معاملہ میں جھگڑا کر رہے تھے، آپ ان کا جھگڑا ختم کرانے میں لگ گئے کہ وہ علم آپ کے قلب مبارک سے نکال لیا گیا، آپ نے فرمایا کہ میں اس وقت تمہیں یہ بتلانے آیا تھا کہ لیلۃ القدر کس شب میں واقع ہو رہی ہے تاکہ تم بہ آسانی اسے پاسکو، لیکن فلاں فلاں شخص کا باہمی الجھاؤ تمہاری محرومی کا سبب بن گیا اور اس کا خصوصی علم میرے دل سے اٹھالیا گیا، معلوم ہوا کہ ملاحات اور خصومت بہت ہی بری چیز ہے، جب پیغمبر علیہ السلام کے قلب مبارک پر دوسروں کے جھگڑے کا اثر ہو سکتا ہے تو پھر دوسرے مومنین بالخصوص جھگڑنے والوں کا کیا حال ہوگا، پھر آپ نے فرمایا کہ تمہارے لئے شاید یہی بہتر ہو یعنی تعین کی صورت میں تلاش کرنے کی کوشش سے بچتے اور صرف معین وقت پر اٹھ کر استغفار کو کافی سمجھتے اور تلاش و جستجو کے ثواب سے محروم رہتے، معین نہ کرنے کی صورت میں تلاش و تفتیش کا ثواب بھی ملے گا اور اس سے طلب صادق و غیر صادق کا امتیاز بھی ہو جائے گا، یعنی جسے شغف ہوگا وہی تلاش کرے گا۔

احادیث کا ترجمہ سے ربط | شارحین فرما رہے ہیں کہ امام نے ذیل میں دو حدیثیں پیش کی ہیں، وہ باب کے ذیل میں منعقد کئے گئے دونوں تراجم سے متعلق ہیں، ایک ترجمہ خوف المومن ان

یحبط عمله تھا اور دوسرا ترجمہ ما یحذر من الاصرار من غیر توبۃ تھا، شارحین فرما رہے ہیں کہ دوسرے ترجمہ

کیلئے امام نے پہلی حدیث پیش کی، جس میں فرمایا گیا ہے کہ مومن کو گالی دینا فسق اور اس سے قتال کرنا کفر ہے، یعنی ان معاصی پر بغیر توبہ کے اصرار کئے جاتا فسق و کفر ہے اس طور پر یہ حدیث دوسرے ترجمہ کے اثبات کیلئے لائی گئی ہے، اور دوسری حدیث پہلے ترجمہ خوف المومن من ان یحبط عملہ سے ہے کیونکہ عموماً خصوصیت کے موقعہ پر آوازیں بلند ہو ہی جاتی ہیں، اور پیغمبر علیہ السلام کی موجودگی میں رفع صوت پر حبط عمل کا خطرہ قرآن عزیز کی اس آیت میں منصوص ہے۔

یا ایہا الدین آمنوا لا ترفعوا اصواتکم
فوق صوت النبی ولا تجہروا لہ
بالقول کجہر بعضکم لبعض ان تحبط
اعمالکم وانتم لا تشعرون (پ ۲۶ ع ۱۳)

اے ایمان والو! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے بلند مت کرو
اور نہ ان سے ایسے کھل کر بولا کرو جیسے تم آپس میں
ایک دوسرے سے کھل کر بولتے ہو کبھی تمہارے اعمال
برباد ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔

اول تو منازعت خود ہی ایک مذموم فعل ہے پھر اگر یہ مذموم فعل مسجد میں ہو جو عبادت اور ذکر کی جگہ ہے تو اسکی مذمت اور بڑھ جائیگی، پھر یہ واقعہ جہاں پیش آیا وہ مسجد نبوی تھی جہاں کی ایک عبادت پچاس ہزار عبادتوں کا درجہ رکھتی ہے، اسلئے وہاں کی معصیت کا اندازہ بھی اسی سے کیا جائے گا، مزید یہ کہ پیغمبر علیہ السلام تشریف فرما ہیں، یہ تمام چیزیں عمل کی برائی کو کہاں سے کہاں تک پہنچا سکتی ہیں حتیٰ کہ اس صورت میں حبط اعمال کا خطرہ ہے، اب ترجمہ سے مناسبت ظاہر ہے کیونکہ ترجمہ بھی، خوف المومن من ان یحبط عملہ تھا۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد | حضرت شیخ الہند نے ایک بے تکلف بات ارشاد فرمائی کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے ترجمہ یعنی، خوف المومن من ان یحبط عملہ کے اثبات کے لئے ابراہیم تمیمی اور دوسرے تابعین کے اقوال ذکر فرمائے ہیں، اور دوسرے ترجمہ ما یحذر من الاصرار من غیر توبہ کے لئے دو حدیثیں ذکر فرمائی ہیں، لیکن چونکہ احادیث میں اصرار من غیر توبہ کا ذکر نہ تھا اسلئے امام نے آیت ذکر فرما کر اس کی کو پورا فرمادیا، اب دونوں ترجمے بے تکلف احادیث اور اقوال سے ثابت ہو گئے۔

حضرت الاستاذ نے ترجمہ اول سے حدیث کے ارتباط کے سلسلہ میں ایک لطیف بات ارشاد فرمائی کہ نبی اکرم ﷺ کے قلب مبارک سے علم نکالنے میں امت کیلئے یہ تشبیہ مقصود ہے کہ یہ بھی احباط کی ایک قسم ہے، اسلئے حبط کے تمام اسباب سے ہر طرح بچنا چاہئے، نیز یہ کہ جس طرح علم ایک باردے جانے کے بعد اٹھایا جاسکتا ہے اسی طرح اصرار من غیر توبہ کے اثر سے عمل بھی بے کار اور لغو ہو سکتا ہے۔
واللہ اعلم

[۳۷] بَابُ سُؤَالِ جِبْرِئِلَ النَّبِيِّ ﷺ عَنِ الْإِيمَانِ وَالْإِسْلَامِ وَالْإِحْسَانِ وَعِلْمِ السَّاعَةِ

وَبَيَانِ النَّبِيِّ ﷺ لَهُ، ثُمَّ قَالَ جَاءَ جِبْرِئِلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ يُعَلِّمُكُمْ دِينَكُمْ فَحَقَّلَ ذَلِكَ

كُلُّهُ دِينًا وَمَا بَيْنَ النَّبِيِّ ﷺ لَوْ فِدَ عَبْدِ الْقَيْسِ مِنَ الْإِيمَانِ وَقَوْلِهِ تَعَالَى وَمَنْ يَتَّبِعْ غَيْرَ
الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ .
(آل عمران: ۸۵)

ترجمہ باب، حضرت جبرئیل علیہ السلام کا رسول اکرم ﷺ سے ایمان، اسلام، احسان اور قیامت کے بارے میں سوال کرنا اور آپ کا بیان فرمانا، پھر آپ نے فرمایا کہ جبرئیل تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے، یہاں آپ نے ان تمام چیزوں کو دین شمار فرمایا اور وہ چیز جسے رسول اکرم ﷺ نے وفد عبد القیس کے سامنے ایمان کے بارے میں بیان فرمایا تھا، اور باری تعالیٰ کا ارشاد کہ جو اسلام کے علاوہ اور کسی دین کو تلاش کریگا تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

ترجمہ اور اس کا مقصد اس باب کے ذیل میں امام بخاری نے تین تراجم منعقد فرمائے ہیں، پہلا ترجمہ سوال جبرئیل سے متعلق ہے، جس میں حضرت جبرئیل نے آل حضرت ﷺ سے علی الترتیب چند سوالات کئے ہیں اور آپ نے ان کے جوابات عنایت فرمائے ہیں اور پھر فرمایا ہے، جاء جبرئیل يعلمکم دینکم اس ترجمہ کے مقصد کو امام بخاری فجعل ذلك كله من الايمان سے واضح کر رہے ہیں، یعنی دین، ایمان، اسلام، احسان اور اعتقاد و ساعت سب پر مشتمل ہے۔

دوسرا ترجمہ وما بين لوفد عبد القيس یعنی اس باب میں ان چیزوں کا بیان ہے جنہیں آپ نے وفد عبد القیس کے لئے ایمان کے سلسلہ میں بیان فرمایا تھا، اس دوسرے ترجمہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایمان کے اندر اعمال داخل ہیں، عام اس سے کہ ان کا تعلق افعال سے ہو یا ترک سے کیوں کہ وفد عبد القیس کو ایمان کے سلسلہ میں اعمال ہی کی تعلیم دی گئی تھی۔

تیسرا ترجمہ ومن يتبع غير الاسلام دينا فلن يقبل منه ہے، معلوم ہوا کہ اصل دین، دین اسلام ہے اور دین اور اسلام ایک ہی چیز سے عبارت ہیں، کیونکہ اگر اسلام دین سے مغائر ہوتا تو من يتبع غير الاسلام دينا میں اسلام کا تلاش کرنے ولا دین کا تلاش کرنے والا نہ بن سکتا اور وفد عبد القیس کو ایمان کے سلسلہ میں جو چیزیں تعلیم فرمائی گئی ہیں وہ وہی ہیں جو جبرئیل علیہ السلام کو اسلام کے جواب میں ارشاد فرمائی گئی ہیں، معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان بھی ایک ہی چیز کی دو تعبیریں ہیں ورنہ ایمان کا تلاش کرنے والا بھی غیر دین کا تلاش کرنے والا قرار دیا جاتا، اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اسلام ایمان اور دین تینوں الفاظ معنی کے اعتبار سے متحد ہیں، یہ وہ حقیقت ہے جو شریعت میں معتبر ہے، یہاں ان کے لغوی مفاہیم سے کوئی بحث نہیں۔

اس اتحاد کے اثبات سے امام بخاری کا مقصد ان مختلف تعبیرات کو صحیح ثابت کرنا ہے جو امام نے اعمال کو داخل ایمان بتلانے کے سلسلہ میں ابواب سابقہ میں اختیار کی تھیں، ان تمام ابواب کا مقصد مرجیہ کی تردید تھا جو ایمان کے لئے

اعمال کو غیر ضروری قرار دیتے ہیں، امام بخاری نے مختلف تعبیرات سے یہ بتلایا تھا کہ یہ سب اعمال ایمان میں داخل ہیں اور چونکہ سابق ابواب میں کہیں من الایمان کہیں من الاسلام اور کہیں من الدین کے الفاظ آئے تھے اس لئے اب آخر میں اس باب میں یہ فرما رہے ہیں کہ یہ سب الفاظ متحد المعنی ہیں اور اصل یہ ہے کہ اگر ایمان و اسلام کے الفاظ ساتھ ساتھ ایک ہی جگہ استعمال ہوں تو ان کا مدلول مختلف ہوگا جیسا کہ حضرت جبرئیل کے سوالات کے بارے میں ہے اور اگر دونوں کا استعمال ساتھ ساتھ نہ ہو بلکہ الگ الگ ہو یعنی صرف ایمان یا صرف اسلام استعمال کیا جائے تو وہاں یہ ایک دوسرے کو لازم ہوں گے گویا، اذا تفرقا اجتماعا واذا اجتماعا تفرقا کا اصول ان میں چلتا ہے، مقصد امام بخاری کا یہی ہے کہ جب اسلام شرعی اور ایمان شرعی ایک ہیں تو ابواب سابقہ میں جو عنوانات سلف کے اتباع میں اختیار کئے گئے ہیں، ان سے مرجعہ کی تردید واضح طور پر ثابت ہو رہی ہے۔

(۵۰) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ إِبرَاهِيمَ أَخْبَرَنَا أَبُو حَيَّانَ التَّمِيمِيُّ عَنْ أَبِي زُرْعَةَ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ بَارِزاً يَوْمًا لِلنَّاسِ فَاتَاهُ رَجُلٌ فَقَالَ مَا الْإِيمَانُ قَالَ الْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللَّهِ وَوَلَدَيْهِ وَبِلِقَائِهِ وَبِرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ قَالَ مَا الْإِسْلَامُ قَالَ الْإِسْلَامُ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهِ وَتُقِيمَ الصَّلَاةَ وَتُؤَدِيَ الزَّكَاةَ الْمَفْرُوضَةَ وَتَصُومَ رَمَضَانَ قَالَ مَا الْإِحْسَانُ قَالَ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ قَالَ مَتَى السَّاعَةُ قَالَ مَا الْمَسْئُولُ بِأَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ وَسَأَخْبِرُكَ عَنْ أَشْرَاطِهَا إِذَا وَلَدَتِ الْأُمَّةَ رَبَّتْهَا وَإِذَا تَطَاوَلَتْ رِعَاةُ الْأَبْلِ الْبُهْمِ فِي الْبُنْيَانِ فِي خَمْسٍ لَا يَعْلَمُهُنَّ إِلَّا اللَّهُ ثُمَّ تَلَا النَّبِيُّ ﷺ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ الْآيَةَ (لقمان: ۳۴) ثُمَّ أَذْبَرَ فَقَالَ رُدُّوهُ فَلَمْ يَرَوْا شَيْئاً فَقَالَ هَذَا جِبْرَائِيلُ جَاءَ يُعَلِّمُ النَّاسَ دِينَهُمْ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ جَعَلَ ذَلِكَ كَلِمَةً مِنَ الْإِيمَانِ.

(آئندہ: ۲۷۷)

ترجمہ | باب، حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ ایک دن مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک انسان آیا اور اس نے سوال کیا، ایمان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ایمان یہ ہے کہ تم اللہ، اسکے ملائکہ، اسکے انبیاء اور حشر و نشر پر یقین رکھو، اس نے سوال کیا، اسلام کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، اسلام یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اسکے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، نماز پوری طرح ادا کرو، زکوٰۃ مفروضہ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو، اس نے سوال کیا احسان کیا ہے؟ فرمایا: احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت ایسے کرو جیسے تم اسکو دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے، اس نے سوال کیا کہ قیامت کب ہوگی، آپ نے فرمایا، مسئول سائل سے زیادہ باخبر نہیں ہے اور میں تمہیں اسکی نشانیاں بتلاتا ہوں، جب باندی اپنے سردار کو جنے اور سیاہ اونٹوں کے چرواہے عمارتوں میں تقاخر کرنے

لگیں، قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں سے ہے جنہیں خدا کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا، پھر آپ نے آیت تلاوت فرمائی ان اللہ عنده علم الساعة (قیامت کا علم صرف خدا کو ہے) پھر وہ انسان واپس چلا گیا، آپ نے فرمایا اس کو واپس بلاؤ لیکن وہ کسی کو بھی نہ مل سکا، آپ نے فرمایا یہ جبریل تھے، جو لوگوں کو ان کا دین سکھانے کی غرض سے تشریف لائے تھے، ابو عبد اللہ بخاری نے کہا کہ آپ نے ان تمام چیزوں کو ایمان قرار دیا۔

بروز کے معنی

بروز کے معنی ظہور کے ہیں، یہاں بروز سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے لئے ایک مختصر سا چوترا بنا دیا گیا تھا تاکہ باہر سے آنیوالوں کو اشتباہ نہ ہو اور وہ غیر پیغمبر کو، پیغمبر نہ سمجھ لیں، حالانکہ وہ پیغمبر علیہ السلام سے ملاقات کے لئے آئے ہیں جیسا کہ ہجرت کے موقع پر حضرت صدیق اکبر کو پیغمبر سمجھ لیا گیا، صورت یہ ہوئی، کہ پیغمبر علیہ السلام آرام فرماتے اور صدیق اکبر بیدار، دیکھنے والوں نے سمجھا کہ یہی پیغمبر ہوں گے، مصافحہ اور سلام خوب خوب کئے گئے، لیکن جب دھوپ ہوئی اور صدیق اکبر نے آپ کو دھوپ کی تمازت سے بچانے کے لئے چادر تان کر سایہ کیا تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام آرام فرما ہیں، اسی قسم کے اشتباہ سے بچنے کے لئے مٹی کا ایک چوترا بنا دیا گیا تھا، اب معنی یہ ہوئے کہ آپ ممتاز مقام پر تشریف فرما تھے، اسی اثنا میں ایک شخص آیا، رجل کا لفظ ہے، اس میں نکارت ہے یعنی اجنبی آدمی دوسری روایت میں ہے، لا یعرفہ منا احد یعنی ہم میں سے کوئی شخص اس کو پہچانتا نہ تھا، لباس چونکہ صاف تھا اسلئے مسافر بھی نہ معلوم ہوتا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی یقین تھا، کہ وہ یہاں کا باشندہ نہیں، کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی اسے پہچانتا نہ تھا، غرض یہ اجنبی آیا اور چند سوالات کئے۔

ایمان کیا ہے؟

اس شخص نے سب سے پہلے آکر یہ سوال کیا کہ ایمان کیا ہے؟ معلوم ہے کہ ما سوال حقیقت کے لئے آتا ہے اسلئے جواب میں صرف تصدیق کا ذکر کافی تھا، لیکن چونکہ یہاں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان اور تصدیق کا تعلق کن چیزوں سے ہوتا ہے، اسلئے آپ نے جواب میں وہ چیزیں بیان کیں جن سے تصدیق متعلق ہوتی ہے، اس میں اعمال کا ذکر نہیں ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ جب حقیقت ایمان سے سوال ہوگا تو جواب میں ان چیزوں کی تصدیق مذکور ہوگی جو مغیبات سے متعلق ہیں، اعمال اس میں داخل نہ ہوں گے، اس سے امام ابو حنیفہ کے مسلک بساطت کا اثبات ہوتا ہے، غرض آپ نے فرمایا کہ ایمان خدا کی تصدیق کا نام ہے، اللہ کی تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام صفات کمال کا جامع ہے، شوائب نقص و امکان سے منزہ ہے، اس کا علم ہر شے کو شامل ہے، اس کی قدرت پورے عالم کو محیط ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، صرف وہی عبادت کے لائق ہے، و ملائکتہ یعنی اللہ نے ایک ایسی مخلوق پیدا کی ہے جس کا تعلق نور سے ہے، خداوند قدوس نے تکوینی انتظامات اور دوسرے امور ان کے سپرد فرمائے ہیں، ان میں سے بعض سفارت پر معین ہیں، یہ مخلوق معدن خیر ہے، کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتی، مختلف صورتوں میں وہ متشکل ہو سکتی ہے، یہ غلط ہے کہ فرشتہ انسان کے اعمال خیر کی قوت کا نام ہے، جیسا کہ بعض حضرات

کا خیال ہے، کہ فرشتہ انسان کے اعمال خیر کی اور شیطان انسان کے اعمال شر کی قوت کا نام ہے، بلکہ فرشتہ ایک جداگانہ مخلوق ہے جیسا کہ شیطان ایک مستقل مخلوق ہے

لقاء کے معنی | لقاء پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ خدا سے ملنے پر ایمان رکھیں، یعنی خدا کی رویت پر، یہ ضروری نہیں کہ رویت سب کو ہو، بلکہ یہ صرف ان لوگوں کو نصیب ہوگی جو اس کے اہل ہوں گے، شیعہ اور معتزلہ رویت کے منکر ہیں؛ حالانکہ روایت میں اسے جزو ایمان قرار دیا جا رہا ہے، اور اس میں استحالہ بھی نہیں کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کی درخواست کی، اگر یہ چیز محال ہوتی تو ایک جلیل القدر پیغمبر کی طرف سے اس کی درخواست نہ کی جاتی، پھر جواب میں رویت کو استقرار جبل پر معلق کیا گیا جو فی نفسہ ممکن ہے، اس سے رویت کا امکان سمجھ میں آتا ہے اسی طرح قرآن کریم میں ارشاد ہے کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون یعنی انہیں خداوند قدوس کی زیارت نہ ہوگی، حرماں نصیبی کو صرف ان لوگوں کے ساتھ خاص رکھنا بتلا رہا ہے کہ دوسرے حضرات کو دیدار ہوگا، اس لئے رویت ممکن ہے اور اس عالم میں بھی ممکن ہے، گو اس کا وقوع کسی وجہ سے نہیں ہے، اور وہاں صرف ممکن ہی نہیں بلکہ انشاء اللہ صالحین کیلئے اپنے اپنے درجات کے مطابق واقع ہوگی۔

امام نووی اعتراض کر رہے ہیں کہ چونکہ رویت سب کو نہ ہوگی، اسلئے اس کا مکلف بنانا سمجھ میں نہیں آتا لیکن یہ عجیب بات ہے، حاصل تو صرف اس قدر ہے کہ امکان رویت کا اعتقاد رکھے آخر جنت و دوزخ پر بھی اعتقاد ہے لیکن کیا سب اعتقاد رکھنے والے جنت یا سب کے سب درزخ میں جائیں گے؛ جب ایسا نہیں ہے تو امکان لقاء اور بعض کے لئے اس کے حصول پر ایمان رکھنا بھی درست ہے، اسی سے بچنے کے لئے بعض حضرات نے لقاء کے معنی محاسبہ کے لئے ہیں یعنی حساب و کتاب ہوگا، بعض حضرات نے لقاء کا ترجمہ موت سے کیا ہے یعنی موت ذریعہ لقاء ہے، الموت جسر یوصل الحیب الی الحیب لیکن اشکال یہ ہے کہ موت امر محسوس ہے اور ایمان کا تعلق مغیبات سے ہوتا ہے، اسلئے یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک موت شخص انسانی یا فرد واحد کی موت ہے اور ایک موت عالم اکبر کی موت ہے، یہ تو سب نے دیکھا ہے کہ ایک شخص مرا، ایک عمارت منہدم ہوگئی، ایک شہر تباہ ہو گیا لیکن یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ پورا عالم فنا ہو گیا بایں معنی اس کا تعلق بھی مغیبات ہی سے رہا۔

اس کو یوں سمجھا جاسکتا ہے، کہ ایک تو قیامت صغریٰ ہے یعنی شخصی موت، چنانچہ ارشاد ہے، اذا مات الانسان قیامت قیامتہ اور ایک قیامت وسطیٰ ہے جس کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے ایک شب عشا کی نماز کے بعد یہ فرمایا کہ آج کی رات سے سو برس کی مدت تک کوئی انسان باقی نہیں رہے گا، چنانچہ اس کا منشاء ”اختتام قرن“ ہے، اور ایک تمام عالم کی موت ہے، یعنی فنا کل یہ قیامت کبریٰ ہے جس کا عمل نفع صور کے ذریعہ ہوگا و ہر سلسلہ یعنی پیغمبروں کی تصدیق بھی داخل ایمان ہے یہ وہ جماعت ہے جسے اللہ نے گناہوں سے محفوظ رکھا ہے

اور پیغام رسانی کے لئے ہدایات دی ہیں، ان حضرات نے مصیبتیں برداشت کیں لیکن قوم کے مصالح کے لئے جو کچھ بھی ہو سکا اس میں کوتاہی نہیں کی، ان کی تفصیلی و اجمالی تصدیق داخل ایمان ہے، یعنی جن پیغمبروں کا ذکر تفصیل سے آیا ہے ان کی تفصیلی تصدیق، اور جن کا اجمالی ذکر لم نقصصہم علیک کے اندر ہے، انکی اجمالی تصدیق کافی ہے، یہاں تک جتنی چیزیں مذکور ہیں وہ ایک صیغہ تو من کے ذیل میں آتی ہیں، آگے فرمایا گیا ”وتومن بالبعث“ یہاں ”بعث“ کے ساتھ تو من کا لفظ مکرر ذکر کیا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان بالبعث ایمانیات میں کوئی مستقل نشان رکھتا ہے، اس کے متعلق علامہ عینی اور قسطلانی فرماتے ہیں کہ اس سے قبل جن مغیبات کا تعلق بتلایا گیا ہے وہ تو سب اس وقت بھی موجود ہیں مگر بعث اس وقت موجود نہیں بلکہ آنے والی چیز ہے، اسی بنا پر اس کو مستقل عنوان کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، یہ بات گودرست ہے، مگر اس میں ذرا سی کمزوری ہے کہ لقاء کے معنی زیارت و رویت کے لئے گئے ہیں جو اس وقت موجود نہیں ہے، اس لئے اس سلسلہ کو موجودات میں شمار کرنا اور بعث کو غیر موجود ہونے کے باعث الگ کرنا شبہ کا باعث بن سکتا ہے، اس بنا پر دوسرا صیغہ استعمال کرنے کی بہتر وجہ یہ ہے کہ ایمان بالبعث ایک مستقل چیز ہے اور اس کا انکار تمام غیر مسلم جماعتوں کی طرف سے ہوا ہے، بعث پر ایمان ایک امتیازی نشان ہے، جو صرف اسلام ہی کی خصوصیت ہے، اسلام اپنے لغوی معنی کے اعتبار سے ان تمام مذاہب پر صادق آتا ہے جو منزل من اللہ ہوں اور ان کے پیرو بھی اس اعتبار سے مسلم ہوئے، مگر اسلام کا مخصوص لقب دین محمد علی صاحبہا الف الف تحیۃ و سلام کے لئے ہے اور اس اعتبار سے مسلم صرف وہی شخص کہلایگا جو اس دین میں داخل ہو، لقب گو مخصوص ہے لیکن اپنے مفہوم کے اعتبار سے اسلام ہر دین سماوی کو شامل ہے، اور لقاء پر ایمان رکھنا ادیان سماویہ کا نشان امتیاز ہے کیونکہ اہل یونان کے عقیدے میں لقاء باری تعالیٰ محال ہے، اسی طرح ہندو مذہب میں یہ عقیدہ ہے کہ دیوتا اور اتار میں الوہیت حلول کر گئی ہے اور ارواح میں انکے یہاں عقیدہ تاسخ ہے، لقاء کا ان کے یہاں سرے سے ذکر ہی نہیں۔

اس بنا پر لقاء کا اگر کوئی قائل ہے تو وہ صرف ادیان سماویہ کے ماننے والے ہیں، اسی نشان امتیاز ہونے کی بنا پر اس کے لئے مستقل طریقہ پر صیغہ تو من استعمال کیا گیا۔

اسلام کیا ہے؟ | دوسرا سوال ہے اسلام کیا چیز ہے؟ یعنی اسلام کے اعمال کیا ہیں؟ ارشاد فرمایا گیا کہ کسی دوسرے کو شریک کئے بغیر خدا کی اطاعت کیجائے، لا تشرك به میں یہ اشارہ ہے کہ دین میں معبودین کے تعدد کا تصور ہی نہ رکھنا چاہئے ایک روٹھ گیا تو دوسرے کو منالیں گے یہ تصور باطل ہے بلکہ نیکی و بدی دونوں کا واسطہ اسی ایک ذات سے ہے، اس لئے ذلت اور تعبد کا جو بھی درجہ ہو وہ صرف اسی ایک ذات کے لئے ہو، غیر سے اس کا تعلق نہ ہونا چار قسم کا ہوتا ہے شرک ذات میں، صفات میں افعال میں، عبادات میں، تفصیل کا یہ مقام نہیں لیکن شرک کسی بھی قسم کا ہو اسلام سے خارج کر دیتا ہے و تقیم الصلوٰۃ و تودی الزکوٰۃ المفروضۃ اس روایت میں زکوٰۃ کے ساتھ

مفروضہ کا لفظ ہے، لیکن صلوٰۃ کے ساتھ کوئی لفظ نہیں ہے، دوسری روایت میں صلوٰۃ کے ساتھ بھی مکتوبہ کا لفظ ہے، یہاں صرف زکوٰۃ کے ساتھ اس صفت کی زیادتی کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ عرب میں جو دو سخا کا مادہ بہت تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کے تمام جو دو سخا کا مقصد یہ تھا کہ انہیں کریم کہا جائے، اسلام نے تعلیم دی کہ صرف مال خرچ کرنا کافی نہیں ہے، جب تک کہ وہ قانون کے دائرہ میں نہ ہو، زکوٰۃ جتنی واجب ہے، اتنی ہی ادا کرو، اس میں کمی نہ ہو، مصارف پر خرچ کرو غیر مصرف پر خرچ نہ ہو وغیرہ وغیرہ و تصوم رمضان رمضان کے روزے رکھو، اس روایت کے دوسرے طریق میں حج کی بھی تصریح ہے، یہاں یہ روایت مختصر ہے، بعض حضرات نے کہا ہے کہ حج اس وقت تک فرض نہ تھا، لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ اجماع کی روایت میں تصریح ہے کہ یہ سوالات آخر عمر میں ہوئے اور حج ۷ھ یا ۹ھ میں فرض ہو چکا ہے، اور بعض روایات میں ان تہج کی تصریح بھی ہے، صرف ایک روایت میں حج کا ذکر نہ ملنے سے یہ حکم لگا دینا درست نہیں، اس روایت میں تو بہت اختلاف ہے کسی میں غسل جنابت کا بھی ذکر ہے اور کسی میں زکوٰۃ بھی مذکور نہیں، پھر کہاں کہاں ان تعبیرات کا اعتبار کرو گے اور ان اختلافات کی رعایت ہو سکے گی؟ اسلئے یا تو اسے راوی کا ذہول کہا جائے اور اگر ذہول نہیں تو مقام کے اقتضاءات سے ایسا ہوا۔

احسان کے معنی | احسان کے معنی عمل کے نکھار کے ہیں، عمل میں نکھار اور خوبصورتی جب ہی پیدا ہو سکتی ہے کہ جب ظاہر و باطن میں پوری طرح درست ہو، ظاہر میں عمل کے تمام شرائط اور آداب داخل ہیں اور باطن میں نیت کا اخلاص، قلب اور جوارح کا خشوع و خضوع شامل ہے، یہاں احسان کے متعلق سائل کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو معلوم ہو گیا کہ اسلام و ایمان میں فلاں فلاں اعمال مطلوب ہیں لیکن عمل خیر کا وہ کونسا درجہ ہے جس کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ مادحانہ انداز میں کیا گیا ہے ارشاد فرمایا گیا ان اللہ یحب المحسنین اور ان رحمة اللہ قریب من المحسنین اور للذین احسنوا الحسنی و زیادة. ان تمام آیات میں درجہ احسان کا ذکر تو ہے، لیکن اس کے حصول کا طریقہ مذکور نہیں اس لئے سائل نے حدیث باب میں یہی سوال کیا ہے کہ عمل میں احسان کی کیا صورت ہے اور اسکے حاصل کرنے کا کیا طریق ہے تاکہ اسے اختیار کر کے خداوند کریم کی رحمت کو اپنے آپ سے قریب تر کیا جاسکے، اس کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا، ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یواک آپ کے اس ارشاد گرامی کے مختلف معنی بیان کئے گئے ہیں۔

عام شارحین بخاری | عام طور پر شارحین بخاری کا یہ خیال ہے کہ اس ارشاد میں اخلاص کے دو مرتبے قائم فرمائے گئے ہیں، ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ، اخلاص کا اعلیٰ درجہ مشاہدہ ہے اور اگر یہ میسر نہ ہو سکے تو مراقبہ، مشاہدہ یہ ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کی جائے کہ جیسے خدا نگاہوں کے سامنے ہے گویا نظر و قلب اسی کی طرف لگ جائیں اور اگر یہاں تک رسائی نہ ہو تو عبادت گزار یہ سمجھے کہ اگر میں خدا کو نہیں دیکھ سکتا تو خداوند قدوس ہر آن ہر جگہ موجود ہے، وہ مجھے دیکھ رہا ہے جس عابد کو یہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے وہ بھی پورے اخلاص کے ساتھ اپنا کام

ٹھکانے سے کرتا ہے، سچ پوچھو تو عمل میں پوری کوشش کا مدار مالک کے عامل کو دیکھنے پر ہے، عامل کے مالک کو دیکھنے پر نہیں، چنانچہ آقا اگر نابینا ہو اور عامل اس کو دیکھ بھی رہا ہو تب بھی عمل میں وہ خوبصورتی پیدا نہیں ہوتی جو اس تصور کے بعد ہوتی ہے کہ میرا مالک میرے عمل کی نگرانی کر رہا ہے، اور اگر عامل کو یہ خیال ہو کہ میرے اوپر نگرانی کرنے والا کوئی نہیں ہے تو وہ عمل میں خوبی پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گا، مشاہدہ اور مراقبہ کا یہ درجہ عام شارحین بخاری نے قائم کیا ہے، ہمارے اکابر اس سلسلہ میں بہت اونچی بات ارشاد فرماتے ہیں۔

حضرت گنگوہی کا ارشاد | حضرت شیخ الہند نے حضرت گنگوہی قدس سرہ سے اس ارشاد کے یہ معنی نقل فرمائے ہیں کہ تمہیں خدا کی عبادت اس طرح کرنی چاہئے جیسے تم اسے دیکھ رہے ہو، اب شبہ یہ ہوا

کہ اس عالم میں ان آنکھوں سے خداوند قدوس کی رویت کہاں ہو سکتی ہے، ہا و شما کا تو ذکر ہی کیا، موسیٰ علیہ السلام کو بھی رویت نہ ہو سکی، اور انکی یہ تمنا دل کی دل ہی میں رہی، پھر ایک نہ ہونیوالی چیز کا تصور کیسے کیا جائے، جب یہ اشکال ہو تو فرمایا کہ اسمیں کیا استبعاد ہے تم اگر نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہے ہیں، اس یقین کے بعد تمہارا خود دیکھنا یا نہ دیکھنا دونوں برابر ہیں، کیونکہ احسانِ عمل کا مدار ان کے دیکھنے پر ہے نہ کہ تمہارے اپنے دیکھنے پر، لہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ گویا ہم بھی نہیں دیکھ رہے ہیں یعنی وہ گرجس سے عمل میں احسان پیدا ہو سکتا ہے وہ بہر صورت حاصل ہے اور چونکہ خداوند قدوس کی نگرانی حقیقی ہے اس لئے اس کے واسطے صیغہ انہ یراک استعمال کیا گیا اور چونکہ ہماری رویت حقیقی نہیں ہے اس لئے اس کے واسطے صیغہ گمان (گویا کہ) استعمال ہوا، بالفاظِ دگر اسکو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا اخلاص تمہارا خداوند قدوس کو دیکھنا نہیں ہے، بلکہ خداوند قدوس کا تمہیں دیکھنا ہے، کیونکہ تمہیں تو اپنے آقا کو اپنا کام دکھلانا ہے اور اس پر انعام لینا ہے، اسلئے یہ تصور رہنا چاہئے کہ وہ میرے کام کو دیکھ رہا ہے، اگر عمل میں یہ خیال غالب ہے کہ وہ دیکھ رہے ہیں تو یقیناً اسمیں بھی وہی سحرائی اور نکھار ہوگا جو تمہارے دیکھنے کی صورت میں ہوتا۔

اکابر رحمہم اللہ کے ارشاد میں مراقبہ اور مشاہدہ کے دو درجہ نہیں ہیں، بلکہ ایک ہی بات ہے، لیکن دوسری صورت کا اضافہ صرف اس لئے فرمایا گیا ہے کہ پہلی صورت کو مستبعد سمجھا جاسکتا تھا، لہذا اسی مقصد کو دوسرے طریق سے بیان فرما کر اس استبعاد کو دور کر دیا گیا کہ اگر تم نہیں دیکھ سکتے تو کیا ہے، ان کا تمہیں دیکھ لینا بھی تمہارے اخلاص کیلئے بہت ہے، حضرات صوفیہ رحمہم اللہ اپنے مسلک کے مطابق ایک دلچسپ بات بیان فرماتے ہیں۔

حضرات صوفیہ رحمہم اللہ | حضرات صوفیہ رحمہم اللہ اپنے مذاق کے مطابق عجیب تاویل فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد میں پہلے جملے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ تمہیں خدا کی عبادت اس طرح کرنی

چاہئے کہ تم اسے دیکھ رہے ہو اور دوسرے جملہ میں دیکھنے کی صورت یہ بتلائی گئی ہے یعنی فان لم تکن تراه میں کان تامہ ہے اور معنی یہ ہیں کہ اگر تم اپنی ہستی فنا کر دو اور ”لم تکن“ بن جاؤ تو دیکھ سکتے ہو یعنی تمہارے اور تمہارے رب کے

درمیان تمہارا وجود حائل ہے، اگر تمہارا اپنا وجود تمہارے پیش نظر نہ رہے تو سامنے خدا ہی خدا ہے، حضرات صوفیہ نے فان لم تکن تراہ کو الگ کر دیا اور فانہ یراک کو الگ، یہ وہی بات ہے جس مقام پر منصور نے انا الحق کہہ دیا تھا کیونکہ اپنی ہستی ختم ہو جانے کے بعد خدا ہی خدا سامنے آجاتا ہے، حضرات صوفیہ کی اس تاویل پر مختلف اشکالات کئے گئے ہیں کہ اگر تراہ، فان لم تکن کی جزا ہے تو اس کا الف گر جانا چاہئے تھا کیونکہ یہ اس وقت مجزوم ہوگا، دوسری بات یہ کہ الگ جز فانہ یراک کا ماقبل سے کچھ جوڑ نہیں رہے گا، تیسری بات یہ کہ دوسری روایات اس کے مخالف پڑتی ہیں کیونکہ کسی روایت میں فانک ان لا تراہ، اور کسی روایت میں فان لم ترہ وارد ہوا ہے، گویا یہاں کون کی نفی نہیں ہے بلکہ نفی رویت پر داخل کی گئی ہے جس سے اس تاویل کا مجروح ہونا ظاہر ہو جاتا ہے، یہ مختلف اعتراضات ہیں، ہمارے نزدیک بھی حدیث کی اصل شرح تو وہ ہی ہے جو ذکر کی گئی لیکن چونکہ ہمیں حضرات صوفیہ سے بھی اعتقاد ہے اسلئے یہ کہتے ہوئے باک نہیں ہے کہ ان کی تاویل ان کے مذاق کے اعتبار سے درست ہے، رہا جواب شرط کا مجزوم ہونا تو ابن مالک نے کہا ہے کہ الف کو باقی رکھنا بھی ایک لغت ہے، اسی طرح فانہ یراک کا بے جوڑ ہونا بھی کوئی قوی بات نہیں ہے، محذوف مانا جاسکتا ہے کہا جاسکتا ہے، فان لم تکن تراہ، فاحسن العبادۃ، فانہ یراک رہا دوسری روایات کا اختلاف تو اصل صحاح کی روایت ہے۔

قیامت کا سوال اور اس کا ماقبل سے ربط | چوتھا سوال یہ ہے کہ قیامت کب آئیگی، سوال یہ نہیں ہے کہ قیامت کیا ہے؟ جیسا کہ اس سے قبل سوالات کئے گئے ہیں، بلکہ سوال

قیامت کے وقت سے ہے، آپ نے فرمایا مسئول، سائل سے زیادہ باغبر نہیں، یعنی اتنا علم تو ہم دونوں کو ہے کہ ضرور آئیگی لیکن کب آئیگی اس کا علم نہ تمہیں ہے نہ مجھے، اللہ ہدایت دے ان حضرات کو جو اس ارشاد کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ قیامت کا علم مجھے بھی ہے اور تمہیں بھی، چونکہ یہ حضرات علم غیب کے قائل ہیں، یہ روایت خلاف دعویٰ نظر آئی اسلئے اسکے معنی گھڑ لئے، حالانکہ معنی بالکل صاف ہیں کہ تعین وقت کا علم خدا نے اپنے لئے مخصوص رکھا ہے قرآن کریم میں ہے لا یجلیہا لوقتہا الا هو، الی ربک منتہاھا، یسئلونک کانک حفیٰ عنہا۔ رہا آپ کا یہ فرمانا کہ ہم دونوں برابر ہیں یعنی سیدھا جواب تو یہ تھا کہ معلوم نہیں، یا نہ مجھے معلوم ہے، نہ تمہیں؛ لیکن اس سیدھی تعبیر کو چھوڑ کر دوسرا طریقہ جواب معنی میں عموم رکھنے کے لئے ہے، یعنی نہ کوئی سائل اسکو جانتا ہے نہ کوئی مسئول، تمام انبیاء کا اس پر اتفاق ہے، حمیدی نے نوادرات میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جبرئیل سے قیامت کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا، ما المسئول عنہا باعلم من السائل تو قطع نظر اس سے کہ صحابہ کو تعلیم دینا مقصود ہے اور قطع نظر اس سے کہ سائل ہونے کی حیثیت لاطعی کو واضح کر رہی ہے، سوال و جواب کا یہ انداز عموم باقی رکھنے کیلئے ہے یعنی کوئی سائل ہو اور کوئی مسئول کسی کو اسکی خبر نہیں۔ یہ ان پانچ چیزوں میں ہے جن کا علم صرف خدا کو ہے، یہاں پہنچ کر یہ سوال ہوتا ہے کہ قیامت

کے اس سوال کا دوسرے سوال سے کیا ربط ہے، ابھی تو ایمان و اسلام کے بارے میں سوالات ہو رہے تھے، ایمان پر اسلام متفرع تھا اور اسلام پر احسان، لیکن یہ قیامت کا سوال درمیان میں کس مناسبت سے آگیا، اس کا جواب حضرات متقدمین کے یہاں تو نہایت مختصر ہے کہ جب کوئی چیز کمال کو پہنچ جاتی ہے تو اس میں نقصان آنے لگتا ہے، جب یہ کارخانہ عالم کمال کو پہنچ گیا تو خود بخود یہ سوال پیدا ہوا کہ اب اس کا زوال کب ہوگا؟ اسی زوال کی انتہا کا نام قیامت ہے، اب یہ سوال باموقع ہے، بے محل نہیں، اکابر نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ یہ پورا کارخانہ عالم انسان و جنات کیلئے ہے باری تعالیٰ کا ارشاد ہے خَلَقَ لَكُمْ مَافِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَأَنْتُمْ لَهَا رَبُوبٌ لَنْ يَكُونَ لَكُمْ مَرْجِعُهَا إِلَّا إِلَىٰ مَنْ عِنْدَهُ لِيَبْجِزَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَافِي الْأَرْضِ وَمَنْ فِيهَا بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ہمارے مادی زندگی کا انحصار غذا پر ہے اور غذا کا حصول مختلف اسباب پر اور اس عالم کی تمام چیزیں ہمارے لئے غذا ہیں یا غذا کے اسباب، گویا پورا کارخانہ عالم ہماری غذا کے حصول کے لئے سرگرم عمل ہے، اور خود ہماری تخلیق کا مقصد عبادت ہے، حق جل شانہ کا ارشاد ہے مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ اور تکمیل عبادت کے دو مرتبے ہیں ایک تکمیل کمتی، دوسرے تکمیل کیفی، کیفیت کے اعتبار سے تکمیل رسول اکرم ﷺ نے فرمادی کیونکہ ایک پیغمبر کی دور کعتیں امت کی تمام نمازوں سے کیف میں بڑھی ہوئی ہیں کیونکہ کیف کا مدار معرفت پر ہے اور پیغمبر کی معرفت امت کی معرفت سے یقیناً بدرجہا زائد ہے پھر یہ کہ رسول اکرم ﷺ کی معرفت تمام انبیاء علیہم السلام کی مجموعی معرفت سے بھی بدرجہا زائد ہے، اس کی تعبیریوں بھی ہو سکتی ہے کہ آپ کی معرفت تمام انبیاء سابقین کے مقابلہ پر ایسی سمجھو جیسی خود انبیاء کی معرفت اپنی ام کے مقابلہ پر، پس جس طرح آپ کی ذاتِ قدسی صفات خاتم الانبیاء ہے، اسی طرح آپ کی معرفت حق تمام معرفتوں کی خاتم ہے، لہذا آپ کی ذات سے عبادت کی کیفاً تو تکمیل ہو چکی، رہا کما تکمیل کا معاملہ تو یہ اس وقت ہوگا جب کہ معمورہ دنیا کا ہر گھر اسلامی نور سے جگمگا اٹھے گا، جیسا کہ حدیث میں موجود ہے کہ قیامت سے پہلے کوئی کچا پاپکا گھر ایسا نہ رہے گا جس میں حق تعالیٰ شانہ اسلام نہ داخل فرمادیں گے، کما تکمیل کے بعد یہ بساط عالم لپیٹ دی جائے گی، اس مناسبت سے اسلام و احسان کے بعد قیامت کے بارے میں سوال کیا گیا۔

حضرت الاستاذ کا ارشاد | لیکن اسی مناسبت پر انحصار نہیں، سوال و جواب کے ربط کے لئے اور بھی دوسری مناسبتیں تلاش کی جاسکتی ہیں اور ہر شخص اپنے ذوق کے مطابق کچھ نہ کچھ کہہ سکتا ہے، یہاں فرمایا گیا تھا کہ عبادت میں رنگ احسان پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تمہاری عبادت اس شخص کے مشابہ ہو جائے جو خدا کو دیکھ رہا ہے اور اتنی بات بھی مسلم ہے کہ رویت حقیقی ممکن ہے گو اس عالم میں نہ ہو، اسکے لئے دوسرے عالم کی ضرورت ہے، اسلئے اب یہ سوال پیدا ہو گیا کہ وہ وقت کب آئے گا جب رویت حقیقی ہوگی، اسی وقت کا نام "ساعت" ہے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ خود حضور ﷺ کی بعثت بھی علامات قیامت میں سے ہے، آپ کا ارشاد ہے بعثت انا

والساعة کھاتین، اب یہ سوال پیدا ہوا کہ آپ تشریف لے آئے قیامت کب آئیگی اور مناسبت کے سلسلہ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ احسان کے درجہ تک پہنچنے کے بعد قدرتی طور پر اس کے ثمرات کے لئے ذہن متوجہ ہوا، کیونکہ اس عالم کی تمام چیزوں کا فنا ہو جانا ایک یقینی امر ہے، پھر یہ دنیا دار العمل ہے دارالجزا نہیں، جزاء کا تعلق دوسرے عالم سے ہے جو اس عالم کے فنا ہونیکے بعد ظاہر ہوگا اور یہ معلوم نہیں کہ کب ظاہر ہوگا اور اس کا کب تک انتظار کرنا پڑیگا، لہذا اغلبہ شوق سے بیتاب ہو کر یہ سوال کرتا ہے کہ وہ عالم کب آئے گا؟

آگے آپ نے فرمایا کہ قیامت تو معلوم نہیں لیکن میں تمہیں اس کی علامات بتائے دیتا ہوں

علامات قیامت

”اذا ولدت الامة ربتهنا“ جب عورت اپنے مالک کو جننے لگے، امة کے معنی ”عورت“ اور ”باندی“ دونوں کے ہیں، سب اماء اللہ کہلاتی ہیں، ایک روایت میں اذا ولدت الامة بعلمها آیا ہے، اس سے ”بیوی“ کے معنی مترشح ہوتے ہیں، عورت اپنے مالک یا باندی اپنے آقا کو جننے لگے تو یہ قیامت کی علامت ہے، عورت کے مالک کو جننے کا مطلب یہ ہے کہ عقوق والدین پھیل جائے، اولاد ماں باپ کو ذلیل و خوار سمجھے اور ان سے اس طرح کام لے جسے خاوند بیوی سے، یا آقا باندی سے لیتا ہے، اور خصوصاً وہ صنف جو بہت زیادہ ماں سے محبت رکھتی ہے، یعنی لڑکی وہ نافرمانی پر اتر آئے، اور جب چھوٹے بڑوں کا احترام نہ کریں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ باندی بچے برسر اقتدار آجائیں یعنی اماء سے جو بچے پیدا ہوں گے، فطری طور پر ان کے اخلاق و عادات اور اطوار خراب ہوں گے، پہلے زمانے میں لوگ باندیوں کے اختلاط سے پرہیز کرتے تھے لیکن اگلے دور میں خصوصاً خلفاء عباسیہ کے دور میں ان کے قلوب پر باندیوں کی حکومت ہوگئی، معنی یہ نکلے کہ اقتدار قرب قیامت میں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آجائیگا جو کسی طرح بھی اس کے اہل نہ ہوں گے، شریف نہ ہوں گے رحم دل نہ ہوں گے، درشت مزاج، بدطینت ہوں گے، انصاف کے تقاضوں سے نا آشنا ہوں گے، ان میں علمی، عملی، اخلاقی اور سیاسی شعور نہ ہوگا، جب یہ صورت حال پیش آجائے تو سمجھو کہ قیامت قریب ہے، دراصل اس ارشاد میں انقلاب عالم کی طرف اشارہ ہے، اس انقلاب سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ عالم اب باقی رہنے کے قابل نہیں، اب اسے فنا ہو جانا چاہئے، اس جملہ کے معنی لوگوں نے اور بھی بیان کئے ہیں، آخر کلام رسول ہے، کتنے اختصار سے معانی سمودئے ہیں، مثلاً ایک معنی یہ ہیں کہ کثرت سے باندیاں حاصل ہوں گی، باندیوں کی کثرت جب ہوگی کہ اسلامی فتوحات بڑھیں، گویا اس طرف اشارہ ہے کہ قرب قیامت میں فتوحات کی کثرت ہوگی، اور باندیاں حاصل ہوں گی، شبہ ہوتا ہے کہ فتوحات کی کثرت تو نعمت ہے اور علامات قیامت میں ایسی چیز ہونی چاہئے جو نعمت نہ ہو لیکن یہ اشکال اس لئے درست نہیں، کہ اس علامت کا نعمت ہونا ضروری نہیں، آخر، بعثت محمدی، نزول مہدی، نزول عیسیٰ بھی علامات قیامت میں سے ہیں، اس ارشاد کے معانی میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ام ولد اور امة میں کوئی فرق باقی نہ رہے گا، یعنی جہالت اس طرح پھیل جائے گی کہ حق و باطل کا امتیاز اٹھ جائیگا، کسی نے کہا ہے کہ زنا کی کثرت

ہوگی، وغیرہ وغیرہ، اذا تطاول جب کالے اونٹوں کے چرواہے عمارتوں پر فخر کرنے لگیں یا دست درازی کریں تو سمجھ لو کہ قیامت آرہی ہے، عرب میں سرخ اونٹ بہترین مال اور کالے اونٹ بدتر مال ہیں، کالے اونٹوں کے چرواہے کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اونٹ کے پاس رہنے سے قساوت پیدا ہوتی ہے، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ بکری پالنے والوں میں تواضع و مسکنت اور اونٹ پالنے والوں میں شدت و قساوت پیدا ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ جس جانور کے ساتھ صحبت رہے گی اس کے اخلاق کا اثر پڑے گا کہتے ہیں کہ شیر کی کھال پر بیٹھنے والوں میں شجاعت اور غیرت ہوتی ہے چونکہ شیر شجاع اور غیور ہوتا ہے، خنزیر پالنے والوں میں حد درجہ بے حیائی ہوتی ہے، اور اونٹ چونکہ شری اور کینہ پرور جانور ہے اسلئے اسکی عادت پالنے والوں پر اثر انداز ہوتی ہے، اونٹ پالنے والوں کے مزاج میں انتہائی کجی آجاتی ہے کیونکہ اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہے، اسبوجہ سے قرآن کریم میں الی الابل کیف خلقت فرما کر توجہ دلانی گئی ہے۔

مفہوم حدیث یہ ہے کہ شری قسم کے لوگ عمارتوں پر دست درازی کریں گے، مسند احمد سے دست درازی کے معنی راجح معلوم ہوتے ہیں کہ وہ شہر کی عمارتوں کو ڈھائیں گے اور اپنی بنائیں گے اور اس میں اسی انقلاب عالم کی طرف اشارہ ہے کہ وہ درشت خوا اور کینہ پرور انسان ہوں گے، انہیں تہذیب و تمدن اور باہمی رواداری کا کوئی سلیقہ نہ ہوگا، جب یہ لوگ پرانی عظمتوں کو نیست و نابود کریں اور اپنی عمارتیں ان کی جگہ بنائیں تو سمجھ لو کہ اس کی بساط الٹ دی جانے والی ہے، آج یہ دونوں علامتیں پوری طرح ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں۔

غیب کی پانچ چیزیں | فی خمس لا يعلمن الا اللہ یعنی قیامت کا علم ان پانچ چیزوں میں ہے جنہیں کوئی نہیں جانتا اور اس کے بعد آپ نے آیت تلاوت فرمائی ان اللہ عنده علم الساعة و

ينزل الغيث ويعلم ملقى الارحام وما تدرى نفس ما ذات كسب غداً و ما تدرى نفس باى ارض تموت ، ان اللہ علیم خبیر . معلوم ہوا کہ پیغمبر علیہ السلام کے متعلق علم غیب کا دعویٰ کرنے والے حضرات کس قدر گمراہی اور ضلالت کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں، آپ صاف طریقہ پر فرما رہے ہیں کہ خداوند قدوس نے پانچ چیزیں کسی کو نہیں بتائی ہیں، قیامت کے علاوہ باقی چار چیزیں ایسی ہیں کہ ان سے انسان کا شب و روز کا واسطہ ہے، جب انسان ان ہی چیزوں کے بارے میں نہیں جانتا تو اور کیا جان سکتا ہے، ان چار چیزوں میں سے ایک چیز خود انسان کے اپنے بارے میں ہے کہ وہ کل کیا کرنے والا ہے، جب انسان کا اپنے بارے میں یہ حال ہے تو پھر اور چیزیں تو دور کی ہیں، ان ہی پانچ چیزوں سے نبی اکرم ﷺ نے عنده مفاتيح الغيب لا يعلمها الا هو کی تفسیر فرمائی ہے ”مفاتيح الغيب“ یعنی غیب کی کنجیاں یعنی علم غیب تو درکنار علم غیب کی کنجیاں بھی کسی کو معلوم نہیں جن کے ذریعہ علوم تک پہنچا جاسکے مفاتيح سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انفرادی طور پر بذریعہ وحی کوئی نبی یا بذریعہ الہام کوئی ولی کسی بات کی کوئی خبر دے تو اسے مفاتيح یا اصول نہیں کہیں گے، وہ ایک جزوی بات ہوگی، اصول خدا کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں۔

ان سوالات کے بعد وہ انسان چلا گیا، آپ نے فرمایا انہیں واپس بلاؤ، بھیجا گیا تو پتہ نہ چل سکا، آپ نے فرمایا کہ یہ جبرئیل تھے جو تمہیں دین سکھلانے آئے تھے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ جبرئیل آئے ہوں اور میں نے پہچانا نہ ہو لیکن اس بار میں ان کے چلے جانے سے قبل انہیں نہ پہچان سکا۔

[۳۸] بَاب

(۵۱) حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ حَمْرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحِ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ قَالَ أَخْبَرَنِي أَبُو سُفْيَانَ أَنَّ هِرْقَلَ قَالَ لَهُ سَأَلْتُكَ هَلْ يَزِيدُونَ أَمْ يَنْقُصُونَ فَرَعَمْتُ أَنَّهُمْ يَزِيدُونَ وَكَذَلِكَ الْإِيْمَانُ حَتَّى يَتِمَّ وَسَأَلْتُكَ هَلْ يَرْتَدُّ أَحَدٌ سَخَطَةً لِدِينِهِ بَعْدَ أَنْ يَدْخُلَ فِيهِ فَرَعَمْتُ أَنْ لَا وَكَذَلِكَ الْإِيْمَانُ حِينَ تَخَالِطُ بِشَاشَتِهِ الْقُلُوبَ لَا يَسْخَطُهُ أَحَدٌ (گذشتہ: ۷)

ترجمہ | باب، حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ مجھے ابوسفیان نے یہ بتلایا کہ ہرقل نے ان سے یہ کہا! میں نے تم سے یہ پوچھا تھا کہ انکی تعداد ترقی پذیر ہے یا رو بہ تنزل، تم نے بتلایا ترقی پذیر اور اسی طرح ایمان کا معاملہ ہے، یہاں تک کہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے اور میں نے تم سے پوچھا تھا کہ انکے تبعین میں سے کوئی شخص ایک بار دین میں داخل ہونیکے بعد اسے برا سمجھ کر پھرتا تو نہیں، تم نے بتلایا کہ نہیں اور یہی ایمان کا حال ہوتا ہے، جب اسکی بشاشت دلوں میں گھل مل جاتی ہے تو اس سے کوئی ناراض نہیں ہوتا۔

ترجمہ نہ رکھنے کے وجہ | امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں صرف باب لکھا ہے، کوئی ترجمہ منعقد نہیں فرمایا اور بعض نسخوں میں باب بھی نہیں ہے، اگر باب نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ حدیث پہلے ترجمہ سے متعلق ہے اور اگر باب ہو تو یہ کماالفصل من الباب السابق کہلا ریگا اور ممکن ہے کہ بخاری کا مقصد تشہید اذہان ہو یا پھر مختلف تراجم اور فوائد پیش نظر ہوں اور امام نے کوئی ترجمہ رکھ کر اسے مقید نہ کرنا چاہا ہو، یہ مختلف چیزیں ہو سکتی ہے جنکی تفصیل آگے آرہی ہے، ہرقل کی یہ گفتگو کتاب الوجی میں آچکی ہے، نیز کتاب الجہاد میں امام بخاری اس پوری حدیث کو اسی سند سے لائیں گے، یہاں ایک حدیث کا ٹکڑا الگ کر دیا ہے، محدثین کی اصطلاح میں اسے خرم کہتے ہیں، امام بخاری بکثرت ایسا کرتے ہیں۔

جوازِ خرم کا اختلاف | محدثین میں اختلاف ہے کہ خرم جائز ہے یا ناجائز؟ بعض حضرات مطلقاً جواز کے قائل ہیں اور بعض حضرات مطلقاً عدم جواز کے، لیکن فیصلہ یہ ہے کہ وہ مخروم ٹکڑا اپنے معنی بتانے میں دوسرے اجزاء کا محتاج نہ ہو تو اس کا خرم جائز ہوگا اور اگر اس کے معنی کا سمجھنا دوسرے اجزاء کے ملنے پر موقوف ہو یا خرم

کے بعد اس کے معنی بدل جائیں تو یہ خرم ناجائز ہوگا۔ حدیث کے اس ٹکڑے کو الگ کرنے سے امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ ایمان پر دین اور دین پر ایمان کا اطلاق صرف اسی شریعت میں نہیں ہے بلکہ سابق شریعتوں میں بھی ایسا ہی رہا ہے، کیونکہ پہلا سوال یہ ہے کہ جو لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں ان کی تعداد روز افزوں ہے یا نائل بہ تنزل، اور دوسرے سوال میں ہے کہ کوئی اس دین سے ناراض ہو کر تو نہیں نکلتا، پھر ہر قل کہتا ہے کہ ایمان کی شان بھی یہی ہے کہ رگ و ریشہ میں سرایت کر جانے کے بعد کوئی شخص اس سے بیزار نہیں ہوتا، دیکھئے ہر قل مسخطة لدینہ میں اس کو دین کہہ رہا ہے اور كذلك الايمان میں اس دین کو ایمان کہتا ہے، معلوم ہوا کہ شرائع سابقہ میں جس کا ہر قل زبردست عالم ہے، دین و ایمان ایک ہی سمجھے جاتے تھے، پھر اس کلام میں ایمان کا لفظ دو جگہ مذکور ہے وہاں بھی ایک مقام پر دین مراد ہے اور دوسری جگہ تصدیق، غرض امام بخاری نے دین، اسلام اور ایمان کے اتحاد پر دو زبردست شہادتیں پیش کر دیں، ایک جبرئیل کے بیان سے، دوسرے اہل کتاب کے عالم ہر قل کے بیان سے۔

ہر قل کی شہادت اس لئے قابل قبول ہے کہ وہ علماء اہل کتاب میں سے ہے، اور وہ جو سوالات کر رہا ہے ان سب کا تعلق کتب سابقہ میں بیان کردہ نشانیوں سے ہے اور قرآن کریم میں من عندہ علم الكتاب کا بڑا وزن قائم کیا گیا ہے، اس اعتبار سے اس باب کو كالفصل من الباب السابق کہا جاسکتا ہے، اور اگر ترجمہ جدید لگانا ہو تو حضرت شیخ الہند کے ارشاد کے بموجب یہ باب خوف المؤمن ان يحبط عمله کا تدارک ہے، وہاں امام بخاری نے فرمایا تھا کہ مومن کو کسی بھی وقت اپنے اعمال سے غافل نہ رہنا چاہئے، اور غفلت نفاق کا نتیجہ ہے، مومن کبھی غافل نہیں ہو سکتا، اب امام بخاری نے اس کی تلافی کر دی کہ ایمان اس شخص کا خطرہ میں ہوگا جس کا ایمان قلب میں راسخ نہ ہو اور جس کے قلب میں ایمان راسخ ہو جاتا ہے، اسے دین سے بیزار کرنے والی کوئی طاقت نہیں ہے اس کے لئے ترجمہ لگایا جاسکتا ہے من یرد اللہ بہ خیرا یشرح صدرہ للاسلام یا من یرد اللہ اللہ فما لہ من مضل یعنی ہر وہ شخص آخرت میں کامیاب ہے جس کے رگ و ریشہ میں ایمان اس طرح بس گیا ہو جیسے کپڑے کے ایک ایک تار میں رنگ سرایت کر جاتا ہے، اس لئے ترجمہ نہ رکھنے کی وجہ تشحیذ اذہان بھی ہو سکتی ہے اور باب سابق سے تعلق بھی، نیز تکثیر فوائد بھی ترک ترجمہ کا باعث ہو سکتا ہے۔

واللہ اعلم

[۳۹] بَابُ فَضْلِ مَنْ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ

(۵۲) حَدَّثَنَا أَبُو نَعِيمٍ حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا عَنْ عَامِرٍ قَالَ سَمِعْتُ النُّعْمَانَ بْنَ بَشِيرٍ يَقُولُ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ الْحَلَالُ بَيْنَ وَالْحَرَامِ بَيْنَ وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ فَمَنْ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعَرَضَهُ وَمَنْ وَقَعَ فِي الْمُشَبَّهَاتِ

كَرَاعٍ يَرْعَى حَوْلَ الْحِمَى يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ الْآوَانُ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمَىٰ إِلَّا إِيَّاهُ حِمَىٰ اللَّهُ
فِي أَرْضِهِ مَحَارِمُهُ الْآوَانُ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةٌ إِذَا صَلَّحَتْ صَلَّحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَإِذَا
فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ إِلَّا وَهِيَ الْقَلْبُ - (آئندہ: ۲۰۵۱)

ترجمہ | باب، اسکی فضیلت جس نے اپنے دین کی صفائی رکھی۔ حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہات ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے، جس شخص نے ان مشتبہات سے اجتناب کیا اس نے دین کی صفائی کر لی اور آبرو کو لوگوں کے طعنوں سے بچا لیا اور جس شخص نے اپنے آپ کو مشتبہات میں ڈال دیا اسکی مثال ایسے چرواہے کی ہے جو سرکاری چراگاہ کے ارد گرد چرا رہا ہے، عنقریب وہ جانور چراگاہ میں داخل کر دے گا، خبردار! ہر شہنشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے، خبردار! کہ اس دنیا میں اللہ کی چراگاہ اس کے محارم ہیں، خبردار کہ جسم میں ایک لوتھڑا ہے جب وہ صالح رہتا ہے تو پورا جسم صالح رہتا ہے، اور جب وہ خراب رہتا ہے تو پورا جسم خراب ہو جاتا ہے خبردار کہ وہ قلب ہے۔

ابواب سابق سے ربط | ابواب سابق میں بہت سے ضروری اعمال ذکر ہو چکے ہیں نیز ابواب سابق میں معاصی پر اصرار سے بھی ڈرایا جا چکا ہے، اب امام بخاری ترقی کر کے یہ کہہ رہے ہیں کہ دین میں صرف یہی چیزیں ضروری نہیں بلکہ اسکی بھی ضرورت ہے کہ دین مشتبہات سے پاک ہو، حضرت نعمان بن بشیر فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے، حضرت نعمان ہجرت کے دوسرے سال پیدا ہوئے اور آپکی وفات کے وقت انکی عمر آٹھ سال کی تھی اسی لئے واقدی اور بعض حضرات کا کہنا ہے کہ انکا سماع رسول اکرم ﷺ سے درست نہیں ہے، بخاری نے اسی وجہ سے ایسی روایت پیش کی جس میں سماع کی تصریح ہے، مسلم میں اور واضح الفاظ میں ذکر کیا گیا کہ نعمان کانوں پر ہاتھ رکھ کر فرماتے تھے کہ میں نے ان کانوں سے سنا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر سمجھدار اور باشعور بچہ کسی بات کو سنے اور بلوغ کے بعد اسکی روایت کرے تو جائز ہے، جیسا کہ حضرت نعمان نے بچپن میں آپ کا یہ ارشاد سنا اور بلوغ کے بعد اسکو نقل فرمایا اور دوسرے حضرات نے اسکو قبول کیا۔

مشتبہات کا حکم | آپ نے فرمایا کہ بہت سی چیزوں کی حلت ظاہر ہے اسی طرح بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ جنکی حرمت سب جانتے ہیں، حلال کا استعمال جائز ہے اور حرام کا ناجائز، لیکن انکے درمیان کچھ مشتبہات ہیں یعنی جنکے آثار و شواہد کچھ ایسے ہیں کہ انکی حرمت و حلت کا فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے اور ایسی چیزوں کا حکم اکثر لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا، آپ فرماتے ہیں کہ مکلف کو ایسی چیزوں سے بچنا چاہئے، ایسی چیزوں سے بچ کر ہی دین صاف اور آبرو طعنوں سے محفوظ رہ سکتی ہے، محققین مباح کو مکروہ اور مشتبہات کو محرمت کو زینہ بتلاتے ہیں۔

مشتبہات سے نہ بچنے کا نتیجہ | اگر مباحات کا استعمال شروع کر دیا تو قدم آہستہ آہستہ مکروہات تک پہنچ جائیگا اور مکروہات کے بعد محرمات ہی کا درجہ ہے، حدیث شریف میں مشتبہات سے

بچنے کا نتیجہ دین اور عزت کی حفاظت بتلایا گیا ہے، لیکن امام بخاری نے ترجمہ میں من استبرا لدینہ فرمایا ہے لدینہ و عرضہ نہیں فرمایا، غالباً اسلئے کہ دین کی صفائی میں آبرو کی بھی حفاظت آگئی، عزت کی حفاظت سے ضروری نہیں کہ دین کی بھی حفاظت ہو جائے، ہاں دین کی حفاظت سے عزت کی حفاظت ہو جاتی ہے۔

مباح کی جانب انسان کا میلان یہ سوچکر ہوتا ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے جیسا کہ معتزلہ کا مسلک ہے، اسلئے ایک مباح کے بعد دوسرے، اور دوسرے کے بعد تیسرے کی طرف طبیعت چلے گی، پھر مباحات سے آگے مکروہات کا مقام ہے، مکروہات میں تنزیہی کے بعد تحریمی تک نوبت پہنچے گی اور تحریمی کے بعد اگر قدم حرام پر پڑے گا آپ نے فرمایا کہ اسکی مثال ایسے چرواہے کی ہے جو سرکاری چراگاہ کی قریب اپنے جانور چھوڑ دے پھر جانور کے حمی میں داخل ہونے میں کچھ فاصلہ نہیں رہتا اور معلوم ہے کہ داخل ہونا جرم ہے۔

یعنی مخصوص چراگاہ جس میں دوسرے لوگوں کو جانور چرانے کی اجازت نہ ہو، عرب کا عام دستور حمی کیا ہے؟ | تھا کہ وہ بڑے بڑے میدان اپنے جانوروں کیلئے مخصوص کر لیتے تھے، پھر کیا مجال کہ اس میں دوسرا جانور قدم رکھ سکے، قدم رکھا اور مجرم ہوا، اسکی وجہ سے آپس میں جنگ رہتی تھی، اسی کو محرمات سے تشبیہ دی گئی۔

اللہ کی چراگاہ | حدیث میں جو مثال بیان کی گئی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ انسان راعی ہے اور انسان کا نفس وہ جانور ہے جسے انسان چراتا ہے، اگر آپ نے اس جانور کو چراگاہ حق میں جانے سے روک رکھا تو بہتر ہے، ورنہ چرانے اور چرانے والا دونوں مجرم ہونگے، سرکاری حمی، محرمات ہیں، اور اس چراگاہ کا ماحول مشتبہات ہیں، جس نے اپنے نفس کو مشتبہات کے لئے آزاد چھوڑ دیا وہ یقیناً محرمات میں جاسکتا ہے، کیونکہ محرمات سرکاری حمی ہیں اور معلوم ہے کہ سرکاری حمی بڑی نظر فریب اور خوبصورت ہوتی ہے لیکن اس سے بچنا ضروری ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں اتنی گنجائش رکھ دی ہے کہ محرمات کی طرف آنیکی ضرورت نہیں، اب اتنی چیزوں کی حلت کے باوجود کوئی اس طرف بڑھتا ہے تو یہ خباث نفس ہے، مطعومات میں سینکڑوں چیزیں حلال ہیں، روحانی اور جسمانی لذتوں کیلئے پورے مواقع دئے گئے ہیں، ملابس کے سلسلہ میں بہت چھوٹ ہے ہر قسم کے جانور حلال ہیں تو خنزیر اور کتوں کی طرف کیوں جھکتے ہو، وغیرہ وغیرہ، یہاں مشتبہات کی مثالوں کی ضرورت اسلئے نہیں کہ کتاب البیوع میں امام بخاری مشتبہات کی مثالیں دینگے اور پھر تنزہ عن الشبہات کا باب قائم فرمادیں گے۔

مدار صلاح و فساد | آگے آپ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے بدن میں ایک لوتھڑا ہے جس پر انسان کے صلاح و فساد کا دار و مدار ہے، یہ تمام اعضاء کا بادشاہ ہے، اگر بادشاہ میں صلاح ہے تو تمام بدن صالح

رہے گا اور اگر اس میں بگاڑ آ گیا تو پورا نظام جسم مختل ہو جائیگا اور وہ تو تھڑا قلب ہے، جس صلاح و فساد کو یہاں قلب سے متعلق بتلایا گیا ہے وہ روحانی بھی ہو سکتا ہے اور طبی بھی، طبی اعتبار سے بھی اعضاء کی صحت اور سقم کا مدار قلب ہی پر ہے اور باطنی نظام اسی پر استوار ہے، باطنی نظام کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے قلب میں بگاڑ ہوگا اسکے جوارح سے صادر ہونے والے افعال بھی اسی کے آئینہ دار ہوں گے، لیکن طبی اور اعصابی نظام جسم جس قلب سے قائم ہے وہ مضغہ مصنوعی ہے اور وہ قلب جس پر نظام باطنی کا مدار ہے اس ذات سے عبارت ہے جس سے ایمان کا تعلق ہے اور وہی محل نیت ہے، یہاں اس ارشاد ہے کہ حرام و حلال اور مشتمہات میں فیصلہ کیلئے بھی قلب راہبری کر سکتا ہے، اسے صالح رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے، اگر قلب صالح ہے تو ارشاد ہے کہ اس سے استفتاء بھی درست ہے، فرمایا استفت قلبك قرآن کریم میں فرمایا گیا ان فی ذلك لذكری لمن كان له قلب او القی السمع وهو شهید معلوم ہوا کہ مدار قلب ہے اور اسلئے صلاح کی کوشش کرنی چاہئے۔

[۴۰] بَابُ اَدَاءِ الْخَمْسِ مِنَ الْاِيْمَانِ

(۵۳) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ الْجَعْدِ قَالَ اخبرنا شعبة عن ابي جمره قال كنت اقعده مع ابن عباس يجلسني على سريره فقال اقم عندي حتى اجعل لك سهمين مالي فاقمت معه شهرين ثم قال ان وفد عبد القيس لما اتوا النبي ﷺ قال من القوم او من الوفد قالوا ربعة قال مرحبا بالقوم او بالوفد غير خزايا ولا ندامي فقالوا يا رسول الله اننا لا نستطيع ان ناتيک الا في الشهر الحرام وبيننا وبينک هذا الحي من کفار مضر فمرنا بامر فصل نخبر به من وراءنا وندخل به الجنة وسألوه عن الاشربة فامرهم بربع ونهاهم عن اربع امرهم بالايمان بالله وحده قال اتدرون ما الايمان بالله وحده قالوا الله ورسوله اعلم قال شهادة ان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله واقام الصلوة وابتاء الزکوة و صيام رمضان وان تعطوا من المغنم الخمس ونهاهم عن اربع عن الحنتم والذبائ والنقيرو المزقت وربما قال المقير وقال افظوهن واخبروا بهن من وراءكم .

(آئندہ: ۸۷، ۵۲۳، ۱۳۹۸، ۳۰۹۵، ۳۵۱۰، ۴۳۶۸، ۴۲۶۹، ۶۱۷۶، ۷۲۶۶، ۷۵۵۶)

ترجمہ | باب، خمس کا ادا کرنا ایمان میں داخل ہے۔ حضرت ابو جمرہ سے روایت ہے کہ میں حضرت ابن عباس کے پاس بیٹھتا تھا اور وہ مجھے اپنے تخت پر بٹھا لیتے تھے انہوں نے فرمایا کہ تم میرے پاس کچھ روز اقامت کرو میں تمہارے لئے اپنے مال میں سے کچھ حصہ مقرر کر دوں گا، چنانچہ میں ان کے پاس دو ماہ اقامت پذیر رہا، پھر انہوں نے

فرمایا کہ وفد عبدالقیس جب رسول اکرم ﷺ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا کہ کس قوم سے آئے ہیں یا کس قوم کے وفد ہیں، وفد نے کہا ربیعہ، آپ نے قوم یا وفد کو مرحبا کہا کہ نہ رسوا ہو، اور نہ ندامت ہی کی کوئی بات ہے، پھر وفد نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہم شہر حرام کے علاوہ اور کسی ماہ میں آپ کے پاس نہیں آسکتے، ہمارے اور آپ کے درمیان کفار مضر کا ایک قبیلہ ہے؛ اسلئے آپ ہمیں دو ٹوک بات بتلا دیجئے جسے ہم ان لوگوں کو بھی بتلا دیں جو ہمارے پیچھے ہیں اور ہم داخل جنت ہوں، اور ان لوگوں نے مشروبات (ظروف) کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے انہیں چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے روکا، آپ نے انہیں یہ حکم دیا کہ وہ اللہ کی توحید پر ایمان رکھیں آپ نے فرمایا تم جانتے ہو اللہ کی وحدانیت پر ایمان کا کیا مطلب ہے انہوں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جاننے والے ہیں، آپ نے فرمایا، اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں اور نمازوں کا قائم رکھنا، زکوٰۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ ادا کرنا، اور چار چیزوں سے منع فرمایا، سبز ٹھلیا سے، تو نبی سے، کھجور کی لکڑی کے برتن سے اور اس برتن سے جس پر روغن زفت ملا گیا ہو، آپ نے فرمایا تم ان باتوں کو محفوظ کر لو اور ان لوگوں کو اس سے باخبر کر دینا جو تمہارے پیچھے ہیں۔

تشریح حدیث

ابو جمرہ فرماتے ہیں کہ میں بصرہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے پاس بیٹھتا تھا، وہ میرا اعزاز فرماتے تھے، حضرت علیؓ کی خلافت میں حضرت ابن عباسؓ بصرہ کے حاکم تھے، ابو جمرہ فرماتے ہیں کہ میں نے جانیکا ارادہ کیا تو ابن عباس نے فرمایا کہ تمہیں میرے پاس کچھ اور دن ٹھہرنا چاہئے، میں تمہاری خدمت کرنا چاہتا ہوں یعنی بیت المال سے میرا جو وظیفہ مقرر ہے وہ ملنے والا ہے، تم ٹھہرے رہو میں اس میں تمہارا بھی حصہ لگا رہا ہوں، دیکھنا یہ ہے کہ حضرت ابن عباس کے اس اعزاز و اکرام کی کیا وجہ تھی، بعض حضرات کا خیال ہے کہ حضرت ابن عباسؓ ان سے ترجمانی کا کام لیتے تھے، کیونکہ حضرت ابن عباس کے پاس ہر زبان میں مقدمات آتے تھے، فارسی زبان میں بھی آتے تھے، ابن جمرہ فارسی سے واقف تھے اس لئے ترجمانی کا کام ان سے لیا جاتا تھا، دوسرے یہ کہ ابن جمرہ حضرت ابن عباس کی آواز دور تک پہنچا دیا کرتے تھے، اسی لئے حضرت ابن عباس نے انہیں پاس ٹھہرا لیا تھا، اصل وجہ بخاری کی کتاب الحج میں مذکور ہے، خود ابو جمرہ کا بیان ہے کہ حضرت ابن عباس کا یہ اعزاز و اکرام اور شفقت ایک خواب کی وجہ سے تھی، ابو جمرہ کہتے ہیں کہ میں نے تمتع کا احرام باندھا، لوگوں نے اعتراض کیا تو میں نے حضرت ابن عباسؓ سے فتویٰ پوچھا، انہوں نے فرمایا کہ درست ہے پھر میں نے ایک خواب دیکھا کہ کوئی حج مبرور و عمرہ متقبلہ کہہ رہا ہے، میں نے حضرت ابن عباس سے خواب کا تذکرہ کیا تو فرمایا سننے ابی القاسمؓ۔

پھر ابن عباسؓ نے اقامت کا حکم دیا کہ میں اپنے وظیفہ میں سے کچھ تمہیں دینا چاہتا ہوں، شعبہ نے ابو جمرہ سے پوچھا کہ اس اعزاز و اکرام کی کیا وجہ تھی؟ فرمایا للرویا التی رأیت یعنی میرا خواب وجہ اعزاز و اکرام تھا، بہر کیف یہ وہاں اقامت پذیر تھے کہ حضرت ابن عباس کی خدمت میں ایک بڑھیا آئی اور اسے نبیذ کے بارے میں دریافت

کیا، حضرت ابن عباس نے اس کا جواب دیا، ابو جمرہ کو خیال آیا کہ جرہ میں میں بھی نبیذ بناتا ہوں اور گواس میں سکر نہیں ہوتا، لیکن کسی مجلس میں دیر تک بیٹھے رہنے سے بہکی بہکی باتوں کا اندیشہ ہو جاتا ہے، اس پر ابن عباس نے وفد عبد القیس والی حدیث سنائی۔

جب وفد عبد القیس نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کون لوگ ہیں؟ قبیلہ عبد القیس بحرین میں آباد تھا اور درمیان میں قبیلہ مضر اور مختلف قبائل آباد تھے جن سے انکی جنگ رہتی تھی، عام اوقات میں حاضری کا موقع نہ تھا، صرف اشہر حرم میں آسکتے تھے، بحرین تک اسلام منقذ بن حیان کے ذریعہ پہنچا، منقذ بحرین کے تاجر تھے، مدینہ میں کپڑے کی تجارت کیا کرتے تھے، نبی اکرم ﷺ انکے پاس تشریف لے گئے اور بحرین کے احوال پوچھے اور اسقدر پوچھے کہ منقذ کو حیرت ہونے لگی کہ آپ تو کبھی بحرین تشریف نہیں لے گئے اور ساتھ ہی مسلمان بھی ہو گئے، آپ نے پوچھا منقذ ملقب بہ اشج کا کیا حال ہے، یہ منقذ بن حیان کے خسر تھے گھر پہنچے تو کچھ دن تک ایمان چھپاتے رہے، نماز کا وقت ہوتا تو گھر میں پڑھ لیتے، انکی بیوی نے اپنے باپ سے ذکر کیا کہ اب کی بار منقذ جب مدینہ سے واپس ہوئے ہیں تو رنگ بدلا ہوا ہے، فلاں فلاں وقت اطراف دھوتے ہیں اور قبلہ رخ ہو کر جھکتے ہیں اور کبھی زمین پر گر جاتے ہیں، خسر نے پوچھا تو پوری داستان سنادی اور بتلایا کہ انہوں نے آپ کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا، یہ بھی مسلمان ہوئے، پھر انکی تبلیغ سے آہستہ آہستہ ایک جماعت نے اسلام قبول کر لیا اور ۶ھ میں بارہ حضرات کا وفد حاضر ہوا، دوسرا وفد ۸ھ میں حاضر ہوا تو ان کی تعداد چالیس تھی، جب یہ لوگ حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا مسر حبا بالقوم جب کوئی مہمان آئے تو اسکی جانب سے گفتگو کا انتظار کئے بغیر مستحب یہی ہے کہ خود پوچھ لیا جائے کہاں سے تشریف لارہے ہیں؟ ربیعہ او مضر، آپ نے فرمایا قبیلہ مضر سے تعلق ہے یا ربیعہ سے؟ انہوں نے کہا ربیعہ سے، ربیعہ اور مضر دونوں بھائی بھائی ہیں، مضر سے آل حضور ﷺ کا نسب ملتا ہے، اس رشتہ سے یہ وفد آپ کے بنی اعمام میں سے ہوا، یہ کئی بھائی۔ ان کے باپ کا جب انتقال ہونے لگا تو انہوں نے اشارے سے ترکہ اپنی اولاد میں تقسیم کیا، گھوڑے ربیعہ کے حصہ میں آئے اور سونا مضر کے حصہ میں، اسلئے ربیعہ کو ربیعہ الخیل اور مضر کو مضر الخمراء کہتے ہیں، غیر خزا یا ولاندامی، یعنی تم ایسے طریقے پر آئے ہو کہ نہ رسوائی ہے، نہ شرمندگی، یعنی چونکہ اسلام قبول کر کے آئے ہو اس لئے جنگ نہیں ہے کہ گرفتاری کے بعد ندامت یا رسوائی ہو، خزا یا، خزی سے ہے بمعنی رسوائی ندامی جو ندامان کی جمع ہے شراب کی مجلس کے لوگ اور یہاں مراد ہے نادم بمعنی پشیمان، اشکال یہ ہے کہ ندامت سے نادم کی جمع نادمون آتی ہے نہ کہ ندامی، جو ندامان کی جمع ہے اس کے معنی شرابی مجلس کے ہمنشین کے ہیں، اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ

۱۔ مسر حبا مہمان کی آمد پر میزبان کی طرف سے اسکے اعزاز و اکرام اور اسکے دل سے اجنبیت کے خیال کو دور کرنے کیلئے کہا جاتا ہے، یہ ردِ حبا سے ماخوذ ہے اسکے معنی وسعت کے ہیں گویا میزبان اپنے مہمان سے یہ کہتا ہے کہ مجھے آپ کی آمد پر خوشی حاصل ہوئی، میرے دل میں آپ کیلئے وسعت اور گنجائش ہے، آپ ایک وسیع اور آرام وہ جگہ پر تشریف لائے ہیں۔ ۱۲

یہاں خزا یا کہ رعایت سے ندائی کہا گیا جیسا کہ خدا یا اور عشا یا میں یہی امر ملحوظ ہے، لیکن اس کی ضرورت نہیں بلکہ اہل لغت نے تصریح کی ہے کہ نادم اور ندمان دونوں شرمندگی کے معنی میں مستعمل ہیں، وفد نے عرض کیا کہ حضور ہم کفار مضر کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے بار بار حاضر نہیں ہو سکتے اسلئے آپ ہمیں دو ٹوک باتیں بتلا دیجئے اور یہ مختصر بات ہم اسلئے چاہتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے پیچھے ہیں انہیں بھی ہم مطلع کر سکیں، لمبی چوڑی باتیں ممکن ہے محفوظ نہ رہ سکیں، ان لوگوں نے اثر بہ کے بارے میں دریافت کیا اس پر آپ نے انہیں چار چیزوں کا حکم دیا اور چار سے روکا، امر اس کا ہے کہ اللہ پر ایمان رکھو، اور تم جانتے ہو اللہ پر ایمان رکھنے کا کیا مفہوم ہے، یعنی پہلے تو تصدیق ہی پر ایمان تھا، لیکن اب کی بار اس کے ساتھ اعمال کی بھی ضرورت پیش آئی اگر یہ حاضری ۶ھ کی ہے تو نماز و روزہ اور زکوٰۃ سب فرض ہو چکی ہیں اور اگر حاضری ۸ھ کی ہے تو ایک قول کے مطابق حج بھی فرض ہو چکا ہے۔

اجمال و تفصیل میں گنتی کا تضاد | یہاں اشکال یہ پیش آتا ہے کہ اجمال کے درجہ میں امر ہم باربع فرمایا گیا ہے یعنی انہیں چار چیزوں کا حکم دیا، حالانکہ ہم گنتے ہیں تو وہ چیزیں پانچ ہیں، شہادت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، اداء خمس، اسکے مختلف جوابات دئے گئے ہیں کسی نے کہا کہ اگر چہ چار ہی چیزوں کا ذکر تھا لیکن آپ نے پانچوں ”ان تعطوا من المغنم الخمس“ زائد بتلادی، گویا ایمان کی تفسیر کے سلسلہ میں چار باتیں الگ رہیں یعنی ان تعطوا من المغنم الخمس کا عطف امر ہم باربع پر ہے، لیکن اس تاویل پر اشکال یہ ہے کہ امام بخاری نے اداء الخمس من الایمان ترجمہ رکھا ہے اور اس ترکیب پر خمس کی ادائیگی ایمانیات سے نہیں رہتی، بلکہ وہ ایک زائد بات ہو جاتی ہے؛ لیکن کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری انعقاد تراجم کے سلسلہ میں ذرا ذرا سی بات کو کافی سمجھتے ہیں، ان لوگوں نے ایسے اعمال کا سوال کیا تھا جن سے جنت میں داخل ہونا آسان ہو جائے، آپ نے جواب میں کچھ اعمال تعلیم فرمائے جن میں اداء خمس بھی ہے گویا اداء خمس بھی جنت میں داخل ہونیکا ایک عمل ہے، بس اتنی بات امام بخاری کے ترجمہ کے اثبات کے لئے کافی ہے، کسی نے کہا کہ دراصل بیان کرنا تو اعمال کا تھا لیکن بطور تمہید آپ نے شہادت کا بھی ذکر فرما دیا، اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ امر ہم باربع سے یہ چار عمل مراد ہیں جو شہادت کے بعد ذکر کئے گئے۔ رہی شہادت تو وہ محض تبرک کیلئے ہے، کسی نے کہا کہ ان تعطوا من المغنم الخمس کوئی جداگانہ چیز نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ کی تفصیل ہے، ایک زکوٰۃ وہ ہے جو ہمہ وقت وصول کی جاتی ہے اور ایک گا ہے گا ہے لیکن ہمارے نزدیک سب سے زیادہ صحیح اور قوی بات یہ ہے کہ آپ نے چار چیزوں کا حکم فرمایا اور چار چیزوں سے نبی فرمائی اور ان دونوں کے دو دور درجے قائم کئے، ایک اجمال کا اور دوسرے تفصیل کا، امر کے سلسلہ کا اجمال شہادت ہے اور نبی کے سلسلہ کا اجمال یہ ہے کہ مسکرات سے منع فرمایا، گویا اجمال کا درجہ ایمان باللہ ہے جس کی شرح شہادتیں سے کی گئی ہے، اور اس کی تفصیل میں چار عمل ذکر کئے گئے ہیں، اسی طرح منہیات کے اجمال پر نظر کیجئے کہ وہاں مسکرات سے منع فرمایا

۱۲۔ حضرت علامہ کشمیری نے قول فصل کا ترجمہ نمٹی ہوئی بات سے کیا ہے۔

اور اسکی تفصیل حنتم، دباء، نقیر، مزفت سے فرمائی حنتم روغنی ٹھلیا، مرتبان کی طرح ہوتی ہے اور مرتبان ہی کی طرح ایک دستہ بھی بغل میں ہوتا ہے، دباء تو مڑی، کدو کو پیڑ ہی پر خشک کر لیتے ہیں اور اندر ہی سے خالی کر کے نبیذ کا برتن بناتے ہیں، نقیر، نقر کے معنی کھودنے کے ہیں، کھجور کی جڑ کو کھود کر برتن کی شکل دیدیتے ہیں، اور اس میں شراب بناتے ہیں۔ مزفت وہ برتن جس پر روغن زفت لگایا گیا ہو، زفت علامہ کشمیری کی تحقیق کے مطابق تارکول کی طرح ایک روغن ہوتا ہے، غیاث اللغات میں اس کا ترجمہ رال سے کیا ہے، علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔

ابو اب سابقہ سے ربط | اب یہاں ایک یہ بات باقی رہ جاتی ہے کہ سابق میں بہت سے ایسے ابواب گزرے ہیں جن میں امام بخاری نے اجزاء ایمان کا ذکر کیا اور اداء الخمس من الایمان کا ان ابواب سے گہرا ربط تھا، چاہئے تھا کہ امام بخاری اس باب کو بھی ان ابواب کے ساتھ رکھتے لیکن وہاں سے علیحدہ کر کے یہاں لے آئے، اسکی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ سابق ابواب میں امام بخاری نے جن اجزاء ایمانیہ کا ذکر فرمایا ہے ان کا تعلق ایمان سے ہمیشہ ہمیشہ کا ہے اور یہ اداء خمس ایک ایسی چیز ہے جس کا تعلق مستقل نہیں ہے بلکہ گاہے گاہے کا ہے، اب ترجمہ کے انعقاد سے یہ تشبیہ ہو سکتی ہے کہ جزو ایمان شمار کرنے کیلئے ضروری نہیں کہ وہ چیزیں مستقل طور پر ایمان سے متعلق ہوں بلکہ وہ چیزیں بھی ایمان ہیں جو کبھی کبھی ایمان سے متعلق ہوتی ہیں پھر اس ترجمہ کا آگے اور پیچھے کے ترجموں سے گہرا ربط ہے، اس سے پہلا ترجمہ من استبراء لدینہ تھا یعنی اس شخص کی فضیلت جس نے دین کی صفائی کی، اس باب میں وفد عبدالقیس کے آپ سے نکھری ہوئی باتیں دریافت کرنے کا ذکر ہے، جس سے طلب معلوم ہوتی ہے اور طلب وہی کریگا جس کے دل میں دین کی صفائی کا خیال ہوگا اور جو خود کو مشتبہ چیزوں سے بچانا چاہیگا، طلب صادق رکھنے والا انسان ہی علماء کی مجلس میں حاضر ہو کر ایسے امور کی تحقیق کرے گا جن پر عمل کرنے سے دخول جنت میسر آئے اور عزت و آبرو محفوظ رہے، لیکن صرف عمل کی صورت اختیار کرنے سے یہ مقصد پورا نہیں ہوتا جب تک کہ عامل کی نیت بخیر نہ ہو، لہذا اس کے متصل ہی باب ما جاء ان الاعمال بالنیة والحسبة منعقد فرمادیا۔

نیز چونکہ اس حدیث کے تمام ہی اجزاء پر امام بخاری جتنہ جتنہ تراجم منعقد فرما چکے ہیں صرف خمس پر ترجمہ منعقد نہ فرمایا تھا، اسلئے یہاں اس پر بھی ترجمہ منعقد فرمادیا۔

[۴۱] بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ الْأَعْمَالَ بِالنِّيَّةِ وَالْحِسْبَةِ

وَلِكُلِّ أَمْرٍ مَّا نَوَىٰ فَدَخَلَ فِيهِ الْإِيمَانُ وَالْوُضُوءُ وَالصَّلَاةُ وَالزَّكَاةُ وَالْحَجُّ وَالصَّوْمُ
وَالْأَحْكَامُ وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَىٰ قُلْ كُلُّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ، (اسراء: ۸۳) عَلَىٰ نِيَّةٍ، وَنَفَقَةٌ
الرَّجُلِ عَلَىٰ أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا صَدَقَةٌ، وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ وَلَكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ.

(۵۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ يَحْيَى بْنِ سَعِيدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ إِبْرَاهِيمَ عَنْ عَلْقَمَةَ بْنِ وَقَاصٍ عَنْ عُمَرَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّةِ وَلِكُلِّ أَمْرٍ مَنَئِي فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ فَهَاجَرَتْهُ إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ لِدُنْيَا يُصِيبُهَا أَوْ امْرَأَةٍ يَتَرَوُّهَا فَهَاجَرَتْهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ . (گذشتہ: ۱)

(۵۵) حَدَّثَنَا حَجَّاجُ بْنُ مِنْهَالٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ أَخْبَرَنِي عَدِيُّ بْنُ ثَابِتٍ قَالَ سَمِعْتُ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ يَزِيدَ عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِذَا أَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلَى أَهْلِهِ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لَهُ صَدَقَةٌ . (آئندہ: ۲۰۰۶، ۵۳۵۱)

(۵۶) حَدَّثَنَا الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ حَدَّثَنِي عَامِرُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَاصٍ أَنَّهُ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِنَّكَ لَنْ تُنْفِقَ نَفَقَةً تَبْتَغِي بِهَا وَجْهَ اللَّهِ إِلَّا أُجِرْتَ عَلَيْهَا حَتَّى مَا تَجْعَلُ فِي فَمِ امْرَأَتِكَ . (آئندہ: ۱۲۹۵، ۲۷۲۲، ۲۷۲۳، ۳۹۳۶، ۴۲۰۹، ۵۳۵۴، ۵۶۵۹، ۵۶۶۸، ۶۳۷۳، ۶۷۳۳)

ترجمہ | باب، اعمال کا مدار نیت اور احتساب پر ہے اور ہر انسان کے لئے وہی ہے جس کی اس نیت کی ہے، اس میں ایمان، وضو، نماز، زکوٰۃ، حج، روزہ اور دوسرے احکام بھی داخل ہو گئے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے، آپ فرمادیجئے کہ ہر شخص اپنی نیت کے مطابق عمل پیرا ہے اور انسان کا اپنے اہل پر بہ نیت ثواب خرچ کرنا صدقہ ہے اور رسول اکرم ﷺ نے فرمایا لیکن جہاد اور نیت باقی ہیں حضرت عمر سے روایت ہے، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اعمال کا مدار نیت پر ہے اور ہر انسان کے لئے وہی چیز ہے جو اسکی نیت میں ہے، پس جسکی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کی طرف ہو اسکی ہجرت اللہ اور اسکے رسول کی طرف ہے اور جسکی ہجرت حصول دنیا یا کسی عورت کی طرف ہو جس سے وہ نکاح کرے تو اسکی ہجرت اسکی نیت کے مطابق ہوگی، حضرت ابو مسعود بدری رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اگر انسان اپنے اہل پر بہ نیت ثواب خرچ کرے تو یہ اس کے لئے صدقہ ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں ہر اس نفقہ پر ثواب دیا جائے گا جس سے تمہارا مقصد خداوند قدوس کی خوشنودی حاصل کرنا ہو حتیٰ وہ لقمہ بھی جسے تم اپنی بیوی کے منہ میں رکھو۔

مقصد ترجمہ | ترجمہ کا مقصد مرجیہ کے اس فرقہ کی تردید ہے جو زبانی اقرار کو بھی ایمان شمار کرتا ہے اور اسے نجات کے لئے کافی سمجھتا ہے، امام بخاری نے بتلادیا کہ نیت کے بغیر کوئی عمل عمل ہی نہیں، زبان کا اقرار گو ایک قسم کا عمل ہے لیکن جب تک نیت نہ ہو اس کا اعتبار نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ آخر میں امام بخاری دو باتوں پر تنبیہ کر رہے ہیں، ایک تو یہ کہ سابق میں جتنے اعمال ایمانیات کے ذیل میں شمار کئے گئے ان سب کے لئے اخلاص نیت کی ضرورت ہے، دوسرے یہ کہ امام ہمیں یہ بتلا رہے ہیں کہ ہم نے سابق ابواب میں مرجیہ، خارجیہ اور کہیں بعض اہل

سنت پر تعریضات کی ہیں۔ لیکن ہماری نیت میں اخلاص ہے، خواہ مخواہ کی چھیڑ چھاڑ ہمارا مقصد نہیں اور نہ ہمیں شہرت کی ہوس ہے، بلکہ یہ ایک خیر خواہی کے جذبہ سے ہم نے کیا، اور جہاں کوئی فرقہ بھٹک گیا یا کسی انسان کی رائے ہمیں درست نظر نہ آئی وہاں ہم نے بہ نیتِ ثواب صحیح بات وضاحت سے بیان کر دی۔

یہاں امام نے پہلا ترجمہ ان الاعمال بالنیۃ اور دوسرا ترجمہ بالحبسۃ رکھا یعنی ان الاعمال بالحبسۃ گویا نیت تو اعمال کے لئے ضروری ہے ہی لیکن اگر نیت کو متحضر کر لیا جائے تو ثواب میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور تیسرا ترجمہ لکل امر مانوی ہے، ان تینوں تراجم کے لئے امام بخاریؒ علی الترتیب تین احادیث لارہے ہیں اور اگرچہ پہلی حدیث میں پہلے اور تیسرے ترجمہ کی دلیل ہے لیکن درمیان میں حبسۃ کا ترجمہ اس لئے بڑھا دیا کہ حبسۃ نہ صرف یہ کہ نیت سے مقارن ہے بلکہ نیت ہی کی تفسیر ہے۔

عمل کی صحت و ثواب اور نیت | نتیجہ کے طور پر امام بخاری فرما رہے ہیں کہ نیت کے بغیر جب کوئی عمل نہیں ہوتا تو ایمان وضو، نماز، زکوٰۃ، سب کچھ اس میں داخل ہو گیا، ایمان میں نیت کی ضرورت اس لئے ہے کہ امام بخاری ایمان کو عمل قرار دیتے ہیں، اسلئے دیگر اعمال کی طرح اس میں بھی نیت مانتے ہیں ورنہ تو ایمان خود اذعان قلبی اور تصدیق کا نام ہے اس کے لئے مزید نیت کے کیا معنی؟

صلوٰۃ و زکوٰۃ وغیرہ میں تو احناف کے نزدیک بھی نیت کی وہی نوعیت ہے لیکن وضو کا مسئلہ مختلف فیہ ہے، احناف کے نزدیک وضو کی دو شان ہیں اور دونوں کا حکم الگ الگ ہے، ایک تو یہ کہ وضو کو صرف آکہ صلوٰۃ بنایا جائے، اور دوسرے یہ کہ وضو خود قربت مقصودہ ہو، اگر صرف آکہ صلوٰۃ بنانا مقصود ہے تو اس کے لئے نیت کی ضرورت نہیں بلکہ اس کیلئے تو مفتاح الصلوٰۃ الطہور فرمایا گیا، اور حصول طہارت کے لئے نیت ضروری نہیں بلکہ صرف ماء طہور کا استعمال کافی ہے، ہاں اگر وضو کو قربت مقصودہ بنانا ہو تو اس کے لئے نیت کی ضرورت ہے اور اس وضو کو وضوئے اسلام کہتے ہیں، شوافع کے نزدیک وضو بغیر نیت کے ہوتا ہی نہیں اور اس معاملہ میں امام بخاریؒ شوافع کے ہم نوا ہیں، اصل یہ ہے کہ اعمال کا ثواب و عقاب اور حسن و قبح تو نیت پر موقوف ہے لیکن اعمال کی صحت کا مدار اس پر نہیں، البتہ عبادات بغیر نیت کے درست نہیں ہو سکتے، معاملات تو اور حضرات کے نزدیک بھی بغیر نیت کے صحیح مانے گئے ہیں۔

رہا شوافع کا ہر عمل کیلئے نیت کو ضروری قرار دینا تو یہ بات ہر جگہ نہیں چلتی، ہر عمل مباح نیت کے بغیر درست ہے ہاں اسے عبادت کا رنگ دینے کے لئے نیت کی ضرورت ہوتی ہے۔

کل یعمل علی شاکلتہ ہر شخص کا عمل اس کی نیت کے مطابق ہوتا ہے، یعنی جیسا سانچہ ہوگا ایسی ہی چیز ڈھلے گی، معاملات میں بھی یہی بات ہے کہ اگر کوئی اچھی نیت سے کرتا ہے تو ثواب اور بری نیت سے کرتا ہے تو عقاب، لیکن عمل کی درستگی و جو نیت پر موقوف نہیں ہے، بہت سے احکام ایسے ہوتے ہیں کہ انسان جنہیں اپنے طبعی تقاضے سے کرتا ہے اور ثواب اور عقاب کا کوئی تصور اسکے ساتھ شامل نہیں ہوتا۔

جہاد و نیت یہ اس حدیث کا ایک حصہ ہے جو فتح مکہ کے بعد آپ نے ارشاد فرمائی تھی، یعنی فتح مکہ کے بعد اب ہجرت ختم ہو چکی ہے، ہجرت کا ثواب ختم ہو چکا ہے، لیکن ثواب حاصل کرنیوالوں کو مایوس نہ ہونا چاہئے کہ جہاد اور نیت قیامت تک رہنے والی چیزیں ہیں، اس راہ سے ثواب حاصل کیا جاسکتا ہے، اس کے بعد امام بخاری نے احادیث پیش کی ہیں، اس سلسلہ میں پہلی روایت حضرت عمر کی ہے جو کتاب الوحی میں گزر چکی ہے اور اسکی پوری تفصیلات ذکر ہو چکی ہیں، یہاں بھی ظاہر ہے کہ اس کا تعلق ان الاعمال بالنیۃ اور لکل امریء مانوی سے ہے۔

دوسری روایت حضرت ابو مسعود بذری کی ہے، بعض اعمال ایسے ہیں جو بہ ظاہر طاعت نہیں معلوم ہوتے بلکہ انسان انہیں اپنی طبیعت کے تقاضے سے کرتا ہے، اس کو تقاضائے طبیعت یا حسن عشرت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن اگر نیت کا استحضار ہو جائے تو یہ عمل طاعت کا عمل ہو سکتا ہے، عقلمند وہ ہے جس کا ہر لمحہ یاد خداوندی میں بسر ہو، سونا، جاگنا، معاشرتی تعلقات قائم رکھنا یہ سب نیت کے استحضار سے موجب قربت ہو سکتے ہیں اگر سونے کے ساتھ یہ نیت کر لی جائے کہ طبیعت میں نشاط آئیگا تو فرائض کی ادائیگی میں سہولت رہے گی، رات کو سوتے وقت یہ نیت کرے کہ صبح کو فجر نماز جماعت سے ادا کروں گا، اس نیت کے ساتھ سونا مقدمہ عبادت ہونے کی وجہ سے باعث اجر و ثواب ہو جائیگا، فقہ کی کتابوں میں ہے کہ رمضان میں مغرب کے بعد آرام کرنا تا کہ تراویح میں آرام رہے باعث اجر و ثواب ہے اور رمضان کے علاوہ دوسرے ایام میں اس وقت آرام کروہ ہے۔ تیسری روایت حضرت سعد بن وقاص کی ہے، حضرت سعد حجۃ الوداع میں بیمار ہوئے اور اسقدر بیمار ہوئے کہ زندگی سے مایوسی ہو گئی، آں حضور ﷺ عیادت کے لئے تشریف لے گئے، حضرت سعد نے سمجھا کہ آخری وقت ہے وصیت کر جاؤں مال زیادہ ہے اور بیٹی ایک، انہوں نے چاہا کہ مال صدقہ کر دوں، آپ نے روک دیا، آگے تفصیل آئے گی، یہاں مقصود یہ ہے کہ تم یہ کیوں سمجھتے ہو کہ صدقہ صرف وہی مال ہے جو غیر کو دیا جائے، بال بچوں پر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے، تم خود اپنے اوپر خرچ کر کے بھی ثواب حاصل کر سکتے ہو، بیوی کے منہ میں لقمہ دینا بھی باعث اجر ہے اگر نیت ثواب کی کر لی جائے، گو اس میں استلذاذ بھی ہے اور یہ طبیعت کا تقاضا بھی ہے، اس پر صحابہ کو اشکال پیش آیا عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا قضائے شہوت میں بھی اجر ہے، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ حرام کام میں یہ لذت حاصل کرنا یعنی ایسی صورت میں گنہگار ہوتا تو پھر اپنے محل میں یہ عمل باعث اجر کیوں نہ ہو، بہر کیف یہ معلوم ہو گیا کہ اعمال میں نیت کی درستگی سے ثواب پیدا ہوتا ہے اور علامہ کشمیری رحمہ اللہ کی رائے میں اگر عمل خیر ہے تو نیت کرے یا نہ کرے ثواب ضرور ملے گا، ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ استحضار نیت سے ثواب بڑھ جاتا ہے۔

[۴۲] بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ الدِّينُ النَّصِيحَةُ

لِلَّهِ وَلِرَسُولِهِ وَلَا نَمَّةَ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ وَقَوْلِهِ تَعَالَى إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ (توبہ: ۹۱)

(۵۷) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ إِسْمَاعِيلَ قَالَ حَدَّثَنِي قَيْسُ بْنُ حَازِمٍ عَنْ

جَرِيرِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ بَايَعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ عَلَى إِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ وَالنُّصْحِ
لِكُلِّ مُسْلِمٍ .

(آئندہ: ۵۲۳، ۱۳۰۱، ۲۱۵۷، ۲۷۱۳، ۲۷۱۵، ۲۷۱۷، ۲۷۱۹)

(۵۸) حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَوَّانَةَ عَنْ زِيَادِ بْنِ عِلَاقَةَ قَالَ سَمِعْتُ جَرِيرَ بْنَ
عَبْدِ اللَّهِ يَقُولُ يَوْمَ مَاتَ الْمُغِيرَةُ بْنُ شُعْبَةَ قَامَ فَحَمِدَ اللَّهَ وَ أَثْنَى عَلَيْهِ وَقَالَ عَلَيْكُمْ بِاتِّقَاءِ
اللَّهِ وَخِدَّةِ لِأَشْرِيكَ لَهُ وَالْوَقَارِ وَالسَّكِينَةِ حَتَّى يَأْتِيَكُمْ أَمِيرٌ فَإِنَّمَا يَأْتِيكُمْ الْآنَ ثُمَّ قَالَ
اسْتَعْفُوا لِأَمِيرِكُمْ فَإِنَّهُ كَانَ يُحِبُّ الْعَفْوَ ثُمَّ قَالَ أَمَا بَعْدُ فَإِنِّي أَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ قُلْتُ
أَبَايَعُكَ عَلَى الْإِسْلَامِ فَشَرَطَ عَلَيَّ وَالنُّصْحَ لِكُلِّ مُسْلِمٍ فَبَايَعْتُهُ عَلَى هَذَا وَرَبِّ هَذَا
الْمَسْجِدِ إِنِّي لَنَاصِحٌ لَكُمْ ثُمَّ اسْتَغْفَرَ وَنَزَلَ .

ترجمہ | باب، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ دین اللہ اور اللہ کے رسول، ائمہ مسلمین اور عامۃ الناس کے ساتھ خیر
خواہی کا نام ہے اور باری تعالیٰ کا ارشاد: جبکہ وہ اللہ اور اس کے رسول سے خیر خواہی کا تعلق رکھیں۔ حضرت جریر
بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ پر نماز کی ادائیگی زکوٰۃ کی ادائیگی اور ہر مسلمان سے خیر
خواہی پر بیعت کی۔

زیاد بن علاقہ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت جریر بن عبد اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جب حضرت
مغیرہ کی وفات ہوئی تو حضرت جریر کھڑے ہوئے اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ تمہیں خداوند قدوس سے ڈرنا چاہئے جسکا
کوئی شریک نہیں اور دوسرے امیر کے آنے تک وقار اور سکون سے رہنا چاہئے بس وہ عنقریب ہی آ جائینگے پھر انہوں
نے فرمایا کہ اپنے امیر کیلئے دعائے مغفرت کرو اسلئے کہ وہ عفو پسند آدمی تھے انہوں نے فرمایا کہ میں رسول اکرم ﷺ
کے ہاتھ پر اسلام کی بیعت کر نیکی لئے حاضر ہوا، آپ نے مجھے ہر مسلمان کیساتھ خیر خواہی کی بھی وصیت فرمائی چنانچہ
میں نے اس پر بیعت کی اور اس مسجد کے رب کی قسم میں تمہیں اسوقت نصیحت کر رہا ہوں، پھر انہوں نے استغفار کیا اور
منبر سے اتر آئے۔

مقصد ترجمہ | یہاں ترجمہ میں نصیحت کا دین پر حمل کیا گیا ہے اور سابق میں گزر چکا ہے کہ دین و ایمان متحد ہیں، لہذا
الایمان النصیحة ہو گیا اور چونکہ یہ حمل اوّلی ہے اسلئے معلوم ہوا کہ ایمان اور نصیحت میں گہرا ربط
ہے، نیز چونکہ نصیحت کے درجات مختلف ہیں؛ اسلئے ایمان کے درجات بھی مختلف ہو گئے، اس سے ایمان کی کمی بیشی کا
معاملہ بھی صاف ہو گیا اور اس طرح کتاب الایمان کا مبدا و منہا باہم مرتبط ہو گیا۔

تشریح حدیث | نصیحت کے معنی سینے کے ہیں، چونکہ سینے والا کپڑے کے مختلف حصوں کو جوڑ کر ایک مکمل لباس تیار
کر دیتا ہے جو زینت کا کام بھی دیتا ہے، اور سردی و گرمی سے حفاظت کا بھی، بالکل اسی طرح
نصیحت سے وہ دین جو پارہ پارہ ہونے لگتا ہے درست ہو جاتا ہے، اسلئے دین کا نام نصیحت رکھا گیا اور یہ لفظ نصیحت

العسل سے بھی ماخوذ ہو سکتا ہے یہ لفظ اس وقت بولا جاتا ہے جب شہد سے موم الگ کر لیا گیا ہو۔
 امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ آنحضرت نے فرمایا: دین خیر خواہی کا نام ہے، یہ خیر خواہی، اللہ، اللہ کے رسول،
 ائمۃ المسلمین اور عامۃ الناس کیساتھ ہونی چاہیے، اللہ کے ساتھ نصیحت یہ ہے کہ اسکی عبادت کیجائے کسی کو اسکا شریک نہ
 ٹھہرایا جائے، اوامر و نواہی میں اس کی فرماں برداری کی جائے، اسے عیوب سے منزہ قرار دیا جائے، رسول کے ساتھ
 نصیحت اسکی تعظیم و تکریم اور فرما برداری ہے، احکام کی بجا آوری ہے، اس کی دعوت کی تبلیغ ہے، ائمۃ المسلمین کیساتھ خیر
 خواہی یہ ہے کہ شرعی حدود میں انکی اطاعت کی جائے، اگر نظام حکومت میں اختلال کا اندیشہ ہو تو کوشش یہ ہونی چاہئے
 کہ رعایا حکومت سے مل جائے اور حاکم رعایا کیلئے نرم ہو جائے اور عامۃ المسلمین کیساتھ نصیحت یہ ہے کہ انہیں دین
 سکھایا جائے، اخلاق رذیلہ سے بچا کر ملکات فاضلہ کی تعلیم دی جائے وغیرہ وغیرہ۔

باب کے ذیل میں امام بخاری نے دو حدیثیں ذکر کی ہیں لیکن چونکہ پہلی روایت جس میں النصیحة لله و لرسوله
 و لائمة المسلمین ہے علی شرط البخاری نہ تھی اسلئے اسے ترجمہ کا جز بنایا اور کسر کو پورا کرنے کے لئے آیت پیش کر دی، جریر
 بن عبد اللہ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تو آپ نے النصح لکل مسلم کی بھی شرط لگائی،
 حضرت جریر بن عبد اللہ کی وفات سے چھ ماہ قبل مشرف باسلام ہوئے بہت ہی خوبصورت تھے، آنحضرت ﷺ انہیں
 دیکھ کر تبسم فرماتے تھے، انکا لقب یوسف هذه الامة ہے، اسلام سے قبل عمدہ لباس پہنتے تھے، لیکن اسلام لانے کے بعد انکے
 جسم پر موٹا کبیل اور بٹن کی جگہ کاٹا لگا ہوا دیکھا گیا، دوسرا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ امیر معاویہ کی طرف سے حضرت مغیرہ بن
 شعبہ کوفہ کے گورنر تھے، حضرت مغیرہ کی وفات ہونے لگی تو انہوں نے حضرت جریر کو بلایا اور نصیحت فرمائی اور بعض حضرات کے
 قول کے مطابق انہیں قائم مقام بنایا؛ چنانچہ یہ حضرت مغیرہ کی وفات کے بعد منبر پر چڑھے اور لوگوں کو نصیحت فرمائی کہ دیکھو
 مصیبت خدا کی طرف سے آتی ہے؛ اسلئے اسے برداشت کرنا چاہئے، صبر و سکون سے رہنا چاہئے، اور دوسرے حاکم کے آنے
 تک کسی خلفشار یا فوضویت کا مظاہرہ نہ ہونا چاہئے؛ بعض حضرات نے کہا کہ اس کا مفہوم یہ تھا کہ میں امیر ہوں اور ابھی اس کا
 اعلان کروں گا لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ مغیرہ کے بعد زیاد کو حاکم بنایا گیا، پھر حضرت جریر، حضرت مغیرہ کے لئے دعائے
 مغفرت کراتے ہیں کہ وہ بڑے عفو پسند تھے، اب چونکہ شبہ یہ ہوتا تھا کہ امیر کا انتقال ہوا ہے تو دوسرے بڑے موجود تھے، آپ
 ہی کو نصیحت کرنیکی کیا ضرورت تھی، معلوم ہوا کہ راہ ہموار کر رہے ہیں، اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے فرماتے ہیں کہ رسول اکرم
 ﷺ نے عامۃ المسلمین کی خیر خواہی کے لئے مجھ سے عہد لیا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مصیبت کا وقت خیر خواہی کا زیادہ محتاج
 ہے؛ اس لئے میں فرض سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر نصیحت کروں یعنی میرا مقصد آنحضرت ﷺ کے ارشاد کی تعمیل ہے، اور آپ
 حضرات کی خیر خواہی، اور پھر استغفار پڑھا کہ بلندی پر چڑھے تھے جس میں ترفع کا اندیشہ تھا۔

الی هنا تم کتاب الایمان ویتلوہ کتاب العلم . ان شاء اللہ تعالیٰ



[۲] ﴿ كِتَابُ الْعِلْمِ ﴾

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

[۱] . بَابُ فَضْلِ الْعِلْمِ

وَقَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى يَرْفَعُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (مجادلہ: ۱۱) وَقَوْلِهِ عَزَّ وَجَلَّ رَبِّ زِدْنِي عِلْمًا. (طہ: ۱۱۴)

ترجمہ | علم کی فضیلت کا بیان، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ خداوند کریم تم لوگوں میں سے ان لوگوں کو درجات کے اعتبار سے بلندی عطا فرمائے گا جو ایمان لائے اور جنہیں علم دیا گیا اور اللہ تعالیٰ تمہارا اعمال سے پوری طرح باخبر ہے اور باری تعالیٰ کا ارشاد کہ آپ کہئے ”میرے رب! میرے علم میں زیادتی فرما“۔

کتاب الایمان سے ربط | ایمانیات سے فراغت کے بعد اب امام بخاری علیہ الرحمہ نے کتاب العلم کا افتتاح فرمایا، گویا امام کے نزدیک ایمان کے بعد دوسرا درجہ علم ہی کا ہے، کیونکہ جو چیزیں ایمان کے اندر مطلوب ہیں اور جن پر عمل کرنے سے ایمان میں کمال آتا ہے وہ علم کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں، یعنی ایمان و علم کے درمیان ایک زبردست رابطہ ہے کہ نہ علم کے بغیر ایمان میں روشنی اور جلا کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ ایمان کے بغیر علم ہی لائق اعتناء ہے اور علوم میں بھی چونکہ سب سے مقدم ایمانیات کا علم ہے یعنی خدا کا یقین، رسالت کا یقین اور قیامت پر وثوق وغیرہ، اس لئے مصنف نے ایمان کے فوراً بعد کتاب العلم کو تحریر کیا اور کتاب العلم میں بھی سب سے پہلے باب فضل العلم رکھا تا کہ علم کی فضیلت معلوم ہو جائے کیونکہ جب تک کسی چیز کی فضیلت معلوم نہ ہو اس وقت تک اس کی طرف شوق و رغبت کا پیدا ہونا مشکل ہے اور بدون خاص رغبت کے اس کا حصول تقریباً ناممکن ہے اس لئے توجہ دلانے کی غرض سے امام نے سب سے پہلے فضیلت بتلا دی اور اس کے بعد علم سے متعلق دیگر ابواب کا استیعاب فرمایا کیونکہ تنہا فضیلت ہی نہیں بلکہ علم کے بہت سے ابواب ہیں، کچھ متعلمین سے متعلق ہوتے ہیں کچھ آداب معلمین کے لئے ضروری ہوتے ہیں، بعض خود علم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ امام بخاری کو جزائے خیر دے کہ اس سلسلے کے تمام ہی آداب کتاب العلم میں ذکر فرمادے جیسا کہ آئندہ ابواب میں معلوم ہو جائیگا۔

علم کی تعریف | امام بخاریؒ نے علم کی طرف صرف توجہ دلائی ہے، علم کی تعریف نہیں کی کیونکہ علم تعریف سے مستغنی ہے، بعض اکابر علماء کا تو یہ فیصلہ بھی ہے کہ علم واضح اور بدیہی چیزوں میں سے ہے اور اس وضاحت کے باعث اسکی تعریف مشکل ہو گئی ہے یعنی ہر شخص جانتا ہے کہ علم جہالت کی ضد ہے اور جہالت تاریکی کا نام ہے، جہالت میں بین چیزیں بھی چھپی رہتی ہیں، اور جب علم کی روشنی نمودار ہوتی ہے تو وہ چیزیں واضح ہونے لگتی ہیں بہر کیف مصنفؒ نے خود تعریف سے تعرض نہیں کیا، شارحین کا خیال ہے کہ یہ کتاب چیزوں کے حقائق بیان کرنے کے لئے نہیں اور یہ درست بھی ہے۔

اختلاف تراجم اور الزام تکرار | باب فضل العلم کا یہ ترجمہ بعض نسخوں میں ہے اور بعض میں نہیں جن نسخوں میں نہیں ہے وہاں قول اللہ عزوجل کتاب العلم سے متعلق ہے اور عبارت اس طرح ہے بسم اللہ الرحمن الرحیم کتاب العلم وقول اللہ الایة کیونکہ امام بخاری کی یہ عادت ہے کہ جب کوئی کتاب شروع کرتے ہیں تو پہلے ایک مناسب آیت لاتے ہیں جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بارے میں آیت کو اصل سمجھا جائے اور اس کے ذیل میں جس قدر ابواب آرہے ہیں وہ سب اسی ماخذ منبع سے متعلق ہیں، غرض اگر باب العلم نہ ہو تو قول اللہ کتاب العلم سے متعلق رہا اور اگر باب فضل العلم ہو تو پھر اس کے معنی کیا ہوں گے کیونکہ آگے چل کر خود مصنف ایک باب ”فضل العلم“ ہی کے عنوان سے قائم کریں گے اور اس باب کے ذیل میں ذکر کردہ حدیث بھی فضیلت علم ہی پر دل ہے اس لئے اگر فضیلت علم ہی کا مسئلہ یہاں بھی ہو تو بلا وجہ کا تکرار ہوگا جو مصنف کی شان سے بعید ہے، اسی تکرار سے بچنے کے لئے علامہ عینی نے ارشاد فرمایا کہ یہاں مقصد علماء کی فضیلت کا بیان ہے گویا باب فضل العلم سے مراد باب فضل العلماء ہے، اب ایک جگہ علم کی فضیلت ہے اور دوسری جگہ علماء کی، اب تکرار نہیں رہا تکرار سے بچنے کی یہ راہ گو کسی درجہ میں درست ہے، لیکن علامہ کی زبان سے اچھی نہیں لگتی اور اس سے زیادہ غیر مناسب بات وہ ہے جو علامہ نے دلیل کے طور پر بیان کی ہے کہ ان آیات کا تعلق فضل علماء سے ہے نہ کہ فضل علم سے، یہ بات اگر مان بھی لی جائے تو ہم علامہ سے بکمال ادب یہ سوال کریں گے کہ علماء کی اس خصوصی فضیلت کا منشا کیا علم کے علاوہ کوئی اور چیز ہے، پھر اگر علم کوئی فضیلت نہیں رکھتا تو علماء میں یہ فضیلت کہاں سے آئی اور دوسری آیت تو براہ راست علم ہی کی فضیلت سے متعلق ہے کہ باوجود پیغمبر علیہ السلام کے علم الخلاق ہونے کے آپ کو اور استزادہ علم کا حکم دیا جا رہا ہے، پھر موقع اور محل کے لحاظ سے کہ کتاب العلم کے فوراً بعد فضل العلم کا باب رکھ دینا یہی ظاہر کرتا ہے کہ اس جگہ علم ہی کی فضیلت کو نمایاں کرنا ہے، اس بنا پر علامہ عینی کی بات دل کو نہیں لگتی۔

تکرار کا صحیح جواب | اعتراض تکرار کو رفع کرنے کے لئے جس طرح علم کے معنی میں تغیر کر کے علامہ عینی نے جواب دیا ہے اس سے اچھی اور مناسب بات یہ ہے کہ فضل کے معنی میں تغیر کیا جائے اور جبکہ فضل

کے معنی میں گنجائش بھی ہے تو یہ بات اور واضح ہو جاتی ہے، فضل کے دو معنی ہیں ایک فضل بمعنی فضیلت اور دوسرے فضل بمعنی فاضل یعنی زائد یہاں فضل فضیلت کے معنی میں ہے جیسا کہ ذیل کی دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے اور دوسری جگہ فضل بمعنی فاضل از حاجت ہے، جیسا کہ ان شاء اللہ العزیز اپنی جگہ معلوم ہو جائے گا، حافظ ابن حجر نے یہی معنی اختیار فرمائے ہیں اور حضرت شیخ الہند نے بھی اسی کو اختیار فرمایا ہے۔

فضیلت علم اور آیات ذیل | یہ بات تو معلوم ہو گئی کہ یہاں علماء کی فضیلت کا بیان نہیں بلکہ خود علم کی فضیلت مراد اور مقصود ہے، اس کے لئے امام نے بطور دلیل دو آیتیں ذکر فرمائی ہیں۔ ارشاد ہے

”باب فضل العلم وقول اللہ“ قول کا عطف فضل پر مان کر علامہ عینی اسکے مجرور پڑھنے پر زور دے رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ مرفوع پڑھنے کی یہاں کوئی وجہ مذکور نہیں ہے کیونکہ رفع یا تو فاعلیت کی بناء پر آتا ہے یا ابتداء کی بناء پر، اور یہ قول نہ فاعل ہے اور نہ خبر ہی محذوف ہے کیونکہ خبر محذوف ہے تو سوال ہوگا کہ خبر کا حذف بعض جگہ واجب ہوتا ہے اور بعض جگہ جائز اور یہاں جواز اور وجوب میں سے کوئی بھی وجہ نہیں ہے لیکن علامہ سنندی فرماتے ہیں کہ مرفوع پڑھنا اولیٰ ہے اور اصل نسخہ میں بھی رفع ہی ہے اور اسکی دو صورتیں ہیں، یا تو یہ خبر مقدم محذوف کے لئے مبتداء ہے یعنی باب فضل العلم وفيه قول اللہ رہا یہ سوال کہ حذف کا قرینہ کیا ہے تو قرینہ یہ ہے کہ یہاں علم کی فضیلت کا بیان ہے اور اسی بارے میں یہ آیت لائی جا رہی ہے اور یا یہ فعل محذوف کا فاعل ہے یعنی باب فضل العلم وجاء قول اللہ الآیة اس وقت بھی وہی فضیلت علم کا بیان قرینہ ہے جسکے لئے آیت لائی گئی لیکن باب کے ذیل میں مصنف نے کسی حدیث کا استخراج نہیں کیا، لوگوں کو مزہ آتا ہے کہتے ہیں کہ امام نے پہلے تراجم قائم کئے اور بعد میں احادیث لکھیں اور اس باب کے ذیل میں حدیث لکھنے کا موقعہ نہیں ملا، بعض کہتے ہیں کہ بخاری کو اپنی شرائط کے مطابق کوئی صحیح حدیث نہیں ملی لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ حدیث کے مقابلہ پر آیت کا کتنا وزن ہے اور آیت کے بعد حدیث کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے، تمام دلائل میں آیت سب سے قوی دلیل ہے پھر دروازہ کار اور لا طائل باتوں سے کیا فائدہ۔

بہر کیف امام نے فضیلت علم کے سلسلہ میں دو آیتیں ذکر فرمائی ہیں پہلی آیت برفع اللہ الذین امنوا منکم والذین اتوا العلم درجات ہے اس میں ایمان و عمل کا رابطہ مذکور ہے نیز ایمان کو علم پر مقدم رکھا گیا ہے جس میں ایک لطیف اشارہ مصنف علیہ الرحمۃ کے حسن ترتیب کی طرف بھی ہے کیونکہ مصنف نے پہلے کتاب الایمان اور اس کے بعد کتاب العلم کا عقد فرمایا ہے، آیت سے علم کی فضیلت اس طرح معلوم ہو رہی ہے کہ آیت میں ترقی درجات کے سلسلہ میں دو امر مذکور ہیں ایمان اور علم، یعنی اہل ایمان کے درجات بلند ہوں گے اور اہل ایمان میں بھی وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں معلوم ہوا کہ علم کی بڑی فضیلت ہے۔

درجات جمع سالم ہے اور نکرہ ہونے کی وجہ سے غیر معین، اور چونکہ تنوین تعظیم کیلئے ہے اسلئے معنی یہ ہیں کہ ان

درجات کی کوئی حد نہیں ہے دنیا میں تو درجات کی بلندی شہرت اور علمی یادگاروں سے ہوتی ہے اور آخرت کی ترقی اخلاص اور حسن نیت پر موقوف ہے جس کی طرف واللہ بما تعملون خبیر سے اشارہ فرمایا گیا ہے، دوسری آیت سے فضیلت اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کو طلب زیادت کا حکم فرمایا جا رہا ہے حالانکہ آپ کو کسی بھی سلسلہ میں طلب زیادت کا حکم نہیں ہے، معلوم ہوا کہ علم کی بڑی فضیلت ہے حتیٰ کہ پیغمبر علیہ السلام کو بھی اس بارے میں طلب زیادت کا امر ہے۔

جب علم کی فضیلت ثابت ہوگئی تو لامحالہ طالب کو اس کی تحصیل کا شوق دامنگیر ہوگا اور وہ خود کو پوری مستعدی کے ساتھ اس راہ میں قدم ڈالنے کے لئے تیار کرے گا اور اس مقصد اعظم کی تحصیل میں ہر مشقت کو بخندہ پیشانی لبیک کہے گا نیز فضیلت علم کے اثبات سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ علم میں جس قدر زیادتی ہو اس قدر اچھائی ہے اور اسی مقصد کیلئے مصنف نے آگے باب رفع العلم و ظهور الجہل کے بعد باب فضل العلم کا انعقاد کیا، وہاں فضل زیادتی کے معنی میں ہے۔

واللہ اعلم

[۱۲] بَابُ مَنْ سَأَلَ عِلْمًا وَهُوَ مُشْتَغَلٌ فِي حَدِيثِهِ فَاتَمَّ الْحَدِيثَ ثُمَّ أَجَابَ السَّائِلَ

(۵۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانَ قَالَ حَدَّثَنَا فُلَيْحٌ ح وَحَدَّثَنِي إِبْرَاهِيمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ فُلَيْحٍ قَالَ حَدَّثَنَا أَبِي قَالَ حَدَّثَنِي هِلَالُ بْنُ عَلِيٍّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ بَيْنَمَا النَّبِيُّ ﷺ فِي مَجْلِسٍ يُحَدِّثُ الْقَوْمَ جَاءَهُ أَعْرَابِيٌّ فَقَالَ مَتَى السَّاعَةُ فَمَضَى رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُحَدِّثُ فَقَالَ بَعْضُ الْقَوْمِ سَمِعَ مَا قَالَ فَكِرِهَ مَا قَالَ وَقَالَ بَعْضُهُمْ بَلْ لَمْ يَسْمَعْ حَتَّى إِذَا قَضَى حَدِيثَهُ قَالَ آيْنَ أَرَاهُ السَّائِلَ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ هَا أَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ فَأَذَا ضِيَعَتِ الْإِمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ قَالَ كَيْفَ إِضَاعَتُهَا قَالَ إِذَا وَسَدَ الْأَمْرُ إِلَى غَيْرِ أَهْلِهِ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ . (آئندہ: ۶۳۹۶)

ترجمہ | باب، اس شخص کے بیان میں جس سے علم کے بارے میں سوال کیا گیا جبکہ وہ اپنی گفتگو میں مشغول تھا پس اس نے گفتگو کو پورا کیا، پھر سائل کا جواب دیا، عطاء بن یسار حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے حدیث بیان فرما رہے تھے کہ اچانک ایک اعرابی آیا اور آتے ہی سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی، رسول اکرم ﷺ نے اپنا بیان جاری رکھا، بعض حضرات نے کہا کہ آپ نے بات سن لی ہے مگر آپ کو یہ بات ناگوار ہوئی اور بعض حضرات نے کہا نہیں بلکہ آپ نے سنا ہی نہیں۔ حتیٰ کہ جب آپ اپنا بیان ختم فرما چکے تو فرمایا کہ قیامت کے بارے میں سوال کرنے والا کہاں ہے؟ سائل نے عرض کیا میں حاضر ہوں، آپ نے فرمایا

جب امانت ضائع کی جانے لگے تو قیامت کا انتظار کرو، اس نے کہا امانت کی اضاعت کا کیا مفہوم ہے؟ آپ نے فرمایا جب معاملات نا اہل لوگوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو قیامت کا انتظار کرنا چاہئے۔

باب سابق سے ربط اور مقصد | باب سابق میں استزادہ علم کا ذکر تھا اب یہاں اس کا طریق بتاتے ہیں کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نامعلوم چیزوں کو اہل علم سے دریافت کیا جائے، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ العلم سوال و جواب اور حسن السؤال نصف العلم اس حدیث میں معلم اور متعلم کے کچھ آداب مذکور ہیں مثلاً یہ کہ معلم متعلم کے ساتھ کس قسم کا برتاؤ کرے تو معلوم ہوا کہ معلم کو متعلم کے ساتھ نرمی برتنی چاہئے خواہ مخواہ زجر و توبیخ اور تشدد پر نہ اتر پڑے جیسا کہ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے گفتگو کے دوران اعرابی کی بیجا مداخلت پر زجر و توبیخ سے کام نہیں لیا، نیز یہ کہ معلم کو ایسی صورت میں اسکی اجازت ہے کہ مصلحت کے مطابق جواب کو موخر کر دے، اسی طرح متعلم کے لئے کچھ آداب کی طرف اشارہ ہے کہ اگر عالم کسی کے ساتھ گفتگو میں مشغول ہے تو خواہ مخواہ دخل انداز نہ ہو کیونکہ جن لوگوں کیساتھ معلم گفتگو میں مشغول ہے ان کا حق مقدم ہے اسی طرح اور دوسرے آداب کی طرف بھی اشارہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ مقصد ترجمہ کے سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ مصلحت کے مطابق معلم کا سائل کے جواب سے اعراض کرنا، کتمان علم نہیں ہے جس کی مذمت قرآن پاک میں بدیں الفاظ وارد ہوئی ہے۔

اولئك يلعنهم الله ويلعنهم اللاعنون - ان کو اللہ لعنت دیتا ہے اور سب لعنت والے لعنت دیتے ہیں اور حدیث میں فرمایا گیا:

من کتم علما الجم بلجام من نار جس شخص نے علم کو چھپایا اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی چونکہ رسول اکرم ﷺ نے سائل کے سوال کا جواب مصلحت کے عین مطابق تاخیر سے دیا اس لئے معلوم ہوا کہ جواب میں مصلحت کے مطابق تاخیر کتمان علم نہیں، ہاں کتمان علم کا اطلاق اس وقت ہو سکتا ہے جب معلم جواب کا بالکل ہی ارادہ نہیں رکھتا ہو، خواہ اسکا تعلق کبر سے ہو یا بخل سے، اور یا اس وقت بھی کتمان علم کا اطلاق درست ہے جب موقت سوال کو وقت سے موخر کر دے۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد | حضرت شیخ الہند مقصد ترجمہ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ معلم کو سائل کا جواب فوری طور پر دینا لازم نہیں بلکہ وہ اپنی ضروریات لاحقہ سے فراغت کے بعد جواب دے سکتا ہے جیسا کہ آپ نے ضروریات سے فراغت کے بعد اطمینان سے جواب دیا، نیز یہ کہ بعض روایات میں اہل مجلس کی بات قطع کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایسا نہ ہو تم اہل مجلس کی گفتگو کا سلسلہ منقطع کر کے اپنی بات شروع کر دو، اس روایت سے معلوم ہو گیا کہ ممانعت کا تعلق اس وقت ہے جب اہل مجلس کا

حرج ہو، ورنہ اجازت ہے جیسا کہ اعرابی کی بیجا مداخلت پر آپ کے سکوت سے معلوم ہوتا ہے۔

سوال و جواب کا واقعی حکم

حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر فوری جواب میں اہل مجلس کا حرج ہو تو جواب نہ دے لیکن حرج نہ ہو تو جواب دے سکتا ہے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سکوت اور اعرابی کو زبردستی نہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے، دراصل سوال کا جواب دینے اور نہ دینے کا مسئلہ چند باتوں کے لحاظ پر موقوف ہے اور اس میں اصل یہ ہے کہ جو اہم ہو اسے مقدم رکھا جائے، اس سلسلہ میں سوال کی نوعیت اور مسائل و مسائل کے احوال پر نظر رکھنا نہایت ضروری ہے، سوال کی نوعیت کا مفہوم یہ ہے کہ سوال عقیدہ سے متعلق ہے یا عمل سے اور دونوں صورتوں میں وہ ضروری ہے یا غیر ضروری، نیز یہ کہ اس کا وقت معین ہے یا غیر معین وغیرہ وغیرہ، اسی طرح مسائل کے حال کی بھی رعایت ضروری ہے کہ وہ مسافر ہے یا شہری ہے، جواب ہی کی غرض سے حاضر ہوا ہے یا اسے کسی وجہ سے جلدی ہے نیز مسئول عنہ کی بھی رعایت ہوگی کہ وہ کسی کام میں مشغول ہے یا فارغ ہے، پھر تنہا مسئول عنہ ہی اس کا جواب دے سکتا ہے یا وہاں اور لوگ بھی ایسے موجود ہیں جو اس فریضہ کو انجام دے سکیں وغیرہ ان تمام صورتوں کا لحاظ کر کے فیصلہ کیا جاسکے گا کہ جواب فوری طور پر لازم ہے یا تاخیر کی گنجائش ہے مثلاً رسول اکرم ﷺ خطبہ دے رہے ہیں، ایک شخص آیا اور اس نے دین کے بارے میں سوال کیا کہ دین کیا ہے؟ آپ نے خطبہ درمیان میں چھوڑ دیا اور اسے دین سمجھایا کیونکہ معاملہ عقیدہ کا تھا، اسی طرح خطبہ موقت نہ تھا بلکہ آسمیں تاخیر کی گنجائش تھی لیکن دین کا معاملہ اہم ہے اگر سمجھانے میں دیر ہوتی تو ممکن تھا کہ اس کا خیال بدل جائے اس لئے آپ نے جواب موخر نہیں فرمایا۔

اور قیامت کب آئے گی؟ اس کا تعلق نہ عقیدے سے ہے نہ عمل سے، ایک زائد بات ہے لہذا فی الفور جواب کی طرف توجہ نہیں فرمائی، البتہ کچھ مخصوص علامات ہیں جنکے ظہور سے قیامت کا آنا اور اس کا قرب مفہوم ہوتا ہے لہذا بعد فراغت اس پر تنبیہ فرمائی اور مسائل کا اعرابی ہونا اس امر کا قرینہ ہے کہ مسائل مدینہ کا باشندہ نہیں تھا اور حاضری کے بعد فوری سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سوال ہی کی غرض سے حاضر ہوا تھا اور سوال ایسا تھا جس کا پیغمبر علیہ السلام ہی جواب دے سکتے تھے اس لئے آپ نے مسائل کو وہ بات بتلا دی جس سے دوسرے حضرات صحابہ کی علمی معلومات میں بھی ایک مزید علمی شے کا اضافہ ہو گیا۔

واللہ سبحانہ اعلم

مفہوم حدیث | ارشاد ہے کہ اعرابی آیا اور سلسلہ گفتگو کا لحاظ کئے بغیر اس نے سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی، آپ نے سلسلہ کلام جاری رکھا، آپ کے اس اعراض پر صحابہ کرام میں بعض حضرات کو خیال ہوا کہ آپ نے سنا نہیں اور بعض حضرات کو خیال ہوا کہ سن تو لیا لیکن قیامت کے بارے میں سوال آپ کو طبعاً ناگوار ہے اس لئے جواب نہیں دیا، مگر جب گفتگو ختم ہو گئی تو آپ نے مسائل کے بارے میں دریافت کیا، وہ سامنے آ گیا، آپ نے ارشاد فرمایا جب امانت ضائع ہو جائے تو قیامت کا انتظار کرنا چاہئے لیکن اعرابی کی سمجھ میں ضیاع امانت کی بات نہ آئی، اس

نے سوال کیا کیف اضاعتھا؟ دوسرا مسئلہ یہ نکل آیا کہ اگر متعلم کی سمجھ میں معلم کی بات نہ آئے تو اسے استفسار اور وضاحت چاہنے کی اجازت ہے، آپ نے تشریح فرمادی کہ جب معاملات نا اہلوں کے سپرد کئے جائے لگیں تو سمجھ لو کہ معاملہ دگرگوں ہو گیا، انقلاب آنے لگا، اب اس کا انجام قیامت ہے، اب ایک حد تک ضیاع امانت کا مفہوم معین ہو گیا کہ مناصب کی تقسیم میں اہل و نا اہل کی تمیز اٹھ جائے تو اس کا نتیجہ بد نظمی کی شکل میں ظاہر ہوگا اور انجام کار قیامت آجائے گی۔

امانت کیا ہے؟ | حدیث باب میں امانت کا ذکر آیا ہے، دیکھنا یہ ہے کہ امانت کیا ہے؟ آیا یہ خیانت کی ضد ہے جس کی معنی غدر کے ہیں مثلاً ایک شخص آپ کو اپنی چیز یا قول کا امین بناتا ہے لیکن آپ عہد کی خلاف ورزی کرتے ہیں، یہ غدر ہے جو از قبیل افعال ہے لیکن یہاں یہ مراد نہیں ہے بلکہ یہ امانت وہ ہے جو انسا عرضنا الامانة على السموات والارض میں ہے اس امانت کا حاصل ہے قومیت اور انتظام، باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم نے آسمانوں زمینوں اور پہاڑوں پر اس امانت کو پیش کیا لیکن سب نے یہی کہا کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں لیکن انسان نے سنبھال لیا کیونکہ قوم وہ شخص ہے جو ہر چیز کو اپنی جگہ پر رکھے، اگر کسی میں اس کی صلاحیت نہیں یا کوئی انسان یہ کام نہیں کرتا تو وہ قوم و امین نہیں کہلائے گا۔

اصل بات یہ تھی کہ جب قومیت پیش کی گئی تو ہر ایک نے اپنی قوت پر نظر کرتے ہوئے انکار کر دیا لیکن انسان نے اپنے اوپر نظر نہیں کی، اپنے اوپر نظر کرنا تو ارشاد باری کی مطابق خلق الانسان ضعيفا تھا ہی، لیکن انسان نے اپنے اوپر نظر نہیں کی بلکہ اس کی حیثیت عاشق کی تھی اور عاشق اپنے اوپر نظر نہیں کرتا اور نہ اپنی طاقت دیکھتا ہے بلکہ وہ محبوب کی نگاہ کا اشارہ دیکھتا ہے جیسا حکم ہوا بے چون و چرا قبول کر لیا نہ کان ظلوما جھولا کا بھی یہی مفہوم ہے کہ اپنے اوپر ظلم کر کے محبوب کی بات مان گیا اور جھول ہے یعنی ماسوی اللہ سے جاہل ہے۔

احادیث میں بھی اس امانت کا ذکر ہے ارشاد ہے لا ایمان لمن لا امانة له جس کے پاس امانت نہیں اس کے پاس ایمان بھی نہیں گویا ایمان کا تخم امانت ہے جس قدر امانت ہوگی اسی قدر ایمان ہوگا، فرماتے ہیں۔

ان الامانة نزلت فی جذر قلوب الرجال ثم نزل القرآن
امانت لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں اتری پھر
قرآن کریم نازل ہوا۔

تو امانت کی حیثیت تخم کی ہے اور دوسری چیزیں آبیاری کے درجہ میں ہیں، اسی امانت کے ضیاع پر قیام قیامت کو موقوف بتایا گیا ہے۔
واللہ اعلم

[۳] بَابُ مَنْ رَفَعَ صَوْتَهُ بِالْعِلْمِ

(۶۰) حَدَّثَنَا أَبُو النُّعْمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو عَوَانَةَ عَنْ أَبِي بَشِيرٍ عَنْ يُونُسَ بْنِ مَاهِكٍ عَنْ

عَبْدُ اللَّهِ بْنِ عَمْرِو قَالَ تَخَلَّفَ عَنَّا النَّبِيُّ ﷺ فِي سَفَرَةٍ سَافَرْنَا هَا فَأَذَرَ كُنَا وَقَدْ
 أَرْهَقْتَنَا الصَّلَاةَ وَنَحْنُ نَتَوَضَّأُ فَجَعَلْنَا نَمْسُحُ عَلَيَّ أَرْجُلِنَا فَنَادَى بِأَعْلَى صَوْتِهِ وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ
 مِنَ النَّارِ مَرَّتَيْنِ أَوْ ثَلَاثًا.
 (آئندہ: ۹۶، ۱۶۳)

ترجمہ | باب، اس شخص کا بیان جو علم کے ساتھ اپنی آواز بلند کرے، حضرت عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے کہ رسول
 اکرم ﷺ ہم سے ایک ایسے سفر میں پیچھے رہ گئے جو ہم نے کیا تھا، پس آپ نے ہمیں اس حال میں پایا کہ ہم
 پر نماز چھائی ہوئی تھی اور ہم وضو کر رہے تھے چنانچہ ہم اپنے پیروں پر پانی چڑھنے لگے پس آپ نے بلند آواز سے پکارا
 خرابی ہے ایڑیوں کے لئے دوزخ کی آگ سے، اور آپ نے یہ بات دو مرتبہ یا تین مرتبہ فرمائی۔

مقصد ترجمہ | حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اس ترجمہ کا مقصد یہ ہے کہ آں حضور ﷺ کی صفات میں لیس
 اصحاب آتا ہے، یعنی آپ شور و غل نہ فرماتے تھے، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ لہو و لعب میں
 اصحاب (شور و غل کرنے والے) نہ تھے لیکن تعلیم و تبلیغ اور وعظ و تقریر میں جہاں بلند آواز کی ضرورت ہوتی وہاں آپ
 آواز بلند فرماتے تھے حضرت الاستاذ نے حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی مراد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ لہو
 و لعب میں شور نہ کرنا، لہو و لعب میں شریک نہ ہونے ہی سے عبارت ہے کیونکہ لہو و لعب کے لئے شور و غل عادتاً لازم ہے
 اس لئے شور و غل کی نفی سے لہو و لعب کی نفی ہوگئی، یہ مراد نہیں ہے کہ لہو و لعب میں تو شریک ہوتے مگر شور نہ کرتے کیونکہ یہ
 بات نبوت کے خلاف شان ہوگی۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد | حضرت شیخ الہند نے ارشاد فرمایا کہ دراصل اس باب کی ضرورت یوں پڑی کہ چونکہ
 ضرورت سے زیادہ آواز کا بلند کرنا پیغمبرانہ وقار کے خلاف تھا اور علمی شان کے لئے

بھی نامناسب جس سے تعلیم کے وقت معلم کا بلند آواز سے تعلیم دینا قابل اعتراض معلوم ہوتا ہے، امام بخاری نے
 حدیث باب سے یہ بتلادیا کہ اگر ضرورت ہو تو اس میں کچھ اندیشہ نہیں بلکہ مستحسن ہے ہاں اگر تکبر یا لاپرواہی کے سبب
 رفع صوت ہو تو وہ مذموم ہے، اس ارشاد کی توضیح یہ ہے کہ شور و غل یوں تو ہر انسان کے لئے طبعاً مذموم ہے بالخصوص عالم
 کے لئے پھر وہ بھی تعلیم کی حالت میں، دیکھئے قرآن کریم میں حضرت لقمان علیہ السلام کی زبان سے لڑکے کو نصیحت
 کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

واغضض من صوتك ان الکر اپنی آواز نیچی کر، بیشک بری سے

الاصوات لصوت الحمیر بری آواز گدھوں کی آواز ہے۔

پھر نبی اکرم ﷺ کی شان بھی رحیم و رفیق تھی اور باب سابق میں آچکا ہے کہ عالم کو متعلم کیساتھ نرمی کا معاملہ
 رکھنا چاہئے، ان تمام وجوہ کے پیش نظر یہ خیال ہو سکتا تھا کہ رفع صوت مطلقاً ممنوع ہے، اس وجہ سے امام بخاری نے یہ

باب منعقد فرما کر بتلادیا کہ ضرورت کے مواقع پر رفع صوت کی اجازت ہے مثلاً کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا دور ہے یا مجمع کثیر ہے اور مقرر چاہتا ہے کہ آخر مجمع تک آواز پہنچادے، کبھی خود مضمون کی اہمیت کا تقاضہ ہوتا ہے کہ آواز بلند کی جائے، کبھی طالب علم کی کوئی وضع ایسی ہوتی ہے کہ اسے ڈانٹنے کی ضرورت ہوتی ہے، ان مواقع پر رفع صوت نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے، خود پیغمبر علیہ السلام کے خطبہ کے متعلق مسلم شریف میں حضرت جابرؓ فرماتے ہیں۔

كان النبي ﷺ اذا خطب وذكر

الساعة اشتد غضبه وعلا صوته

وانتفخت اوداجه

جب آپ ﷺ خطبہ دیتے اور قیامت کا ذکر فرماتے تو آپ کا غصہ تیز ہو جاتا، آواز بلند ہو جاتی اور گردن کی رگیں پھول جاتیں۔

غرض امام نے باب منعقد فرما کر یہ ثابت کر دیا کہ جہاں بلند آوازی کی ضرورت ہو وہاں آواز بلند کرنی چاہئے

مفہوم حدیث | یوسف بن مابک حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک سفر میں نبی اکرم ﷺ ہم سے پیچھے رہ گئے، عصر کا وقت تنگ ہو جا رہا تھا اسلئے ہم آپ کا مزید انتظار کئے بغیر جلدی جلدی وضو کرنے لگے، اس جلد بازی میں بعض اصحاب کی ایڑی کا کچھ حصہ خشک رہ گیا، اتنے میں آپ تشریف لائے اور خشک ایڑیوں کو دیکھ کر دور ہی سے ڈانٹنا شروع کیا ویل للاحقاب من النار یعنی ایڑیوں کو خوب اچھی طرح دھونا چاہئے خشک رہ جانے والی ایڑیوں کا انجام جہنم ہے۔

یہاں نمسح کا لفظ ہے جس کے ایک معنی تو ظاہری ہیں اور ایک معنی مرادی، اول معنی کے لحاظ سے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ کسی وقت پیر کا مسح مشروع تھا بعد میں منسوخ ہوا چنانچہ امام عطاوی نے اس خیال کا اظہار فرمایا ہے، اور معنی مرادی کے اعتبار سے یوں کہا جائیگا کہ ہوا تو غسل ہی تھا مگر جلد بازی میں غسل رجل کی پوری احتیاط نہ ہو سکی جس کے باعث بعض کی ایڑیوں کا کچھ حصہ خشک رہ گیا گویا وہ غسل ان بعض کے حق میں مسح ہو کر رہ گیا، اب ترجمہ یوں کریں گے کہ لغسلھا غسلا خفیفاً مبقعاً اور وجہ یہ تھی کہ پانی تو کم تھا اور وضو کر نیوالے اصحاب زیادہ تھے اور تنگی وقت کے باعث ہر ایک کو عمل کی عجلت تھی، اس گھبراہٹ میں کما حقہ پیروں کا غسل نہ ہو سکا، اصل مسئلہ کیلئے کتاب الوضوء کا انتظار کریں، انشاء اللہ پوری تفصیل سے بحث آرہی ہے۔

۱۔ ماہک اگر فتح البہاء ہو تو اس کے منصرف اور غیر منصرف ہونے میں اختلاف ہے لیکن غیر منصرف پڑھنا راجح ہے، کیونکہ اگر یہ فارسی لفظ ہے تو یہ ماہ کی تفسیر ہے، فمیر کے معنی میں اور اس وقت اس میں علیت اور عجمہ دو سبب ہیں اور اگر یہ فارسی لفظ نہ ہو بلکہ باب مفاعلہ کا ماضی ہو مہاکتہ سے جس کے معنی زوجین کے جماع میں کوشش کرنے کے ہے تو اس وقت دوسرے اسباب ہوں گے یعنی وزن فعل اور علیت بہر کیف دونوں صورتوں میں غیر منصرف ہے اور جو لوگ اسے منصرف پڑھتے ہیں وہ علیت کے بجائے وصفیت کا اعتبار کرتے ہیں تنہا عجمہ ہونا غیر منصرف ہونے کے لئے کافی نہیں اور اگر مابک بکسر البہاء ہو تو یہ اس وقت مہک سے اسم فاعل ہوگا اور بلا اختلاف منصرف ہوگا مہک کے معنی گھسنے میں مبالغہ کرنے کے ہے۔

[۴] بَابُ قَوْلِ الْمُحَدِّثِ حَدَّثَنَا وَأَخْبَرَنَا وَأَنْبَأَنَا

وَقَالَ الْحَمِيدِيُّ كَانَ عِنْدَ ابْنِ عُيَيْنَةَ حَدَّثَنَا وَأَخْبَرَنَا وَأَنْبَأَنَا وَسَمِعْتُ وَاحِدًا وَقَالَ
ابْنُ مَسْعُودٍ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوقُ وَقَالَ شَقِيقٌ عَنْ
عَبْدِ اللَّهِ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ كَلِمَةً كَذًا وَقَالَ حُدَيْفَةُ حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ ﷺ
حَدِيثَيْنِ وَقَالَ أَبُو الْعَالِيَةِ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ فِيمَا يَرُوهُ عَنْ رَبِّهِ عَزَّ وَجَلَّ
وَقَالَ أَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ يَرُوهُ عَنْ رَبِّهِ عَزَّ وَجَلَّ وَقَالَ أَبُو هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ
يَرُوهُ عَنْ رَبِّكُمْ عَزَّ وَجَلَّ .

(۶۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اسْمَعِيلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ دِينَارٍ عَنْ ابْنِ
عُمَرَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجْرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَإِنَّهَا مَثَلُ الْمُسْلِمِ
حَدَّثُونِي مَا هِيَ فَوْقَ النَّاسِ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي قَالَ عَبْدُ اللَّهِ وَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ
فَاسْتَحْيَيْتُمْ ثُمَّ قَالُوا حَدَّثَنَا مَا هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ .

(آئندہ: ۶۲، ۷۲، ۱۳۱، ۲۲۰۹، ۳۶۹۸، ۵۳۳۳، ۵۳۳۸، ۶۱۲۲، ۶۱۳۳)

باب، محدث کے حدثنا، اخبرنا اور انبأنا کہنے کا بیان۔ حمیدی نے کہا کہ ابن عیینہ کے نزدیک حدثنا،
ترجمہ | اخبرنا، انبأنا اور سمعت ایک ہیں، حضرت ابن مسعود نے ارشاد فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے حدیث بیان
فرمائی اور آپ صادق و مصدوق ہیں، شقیق نے ابن مسعود سے روایت کی کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے ایک کلمہ
سنا، حدیفہ نے کہا کہ رسول اکرم ﷺ نے ہم سے دو حدیثیں بیان فرمائیں، ابو العالیہ نے حضرت ابن عباس سے،
بصیغہ عن، رسول اکرم ﷺ سے روایت عن ربہ نقل کی، حضرت انس نے بصیغہ عن پیغمبر علیہ السلام سے نقل کیا کہ آپ
پروردگار بزرگ و برتر سے روایت لے رہے ہیں، حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے ہمارے
سامنے حق سبحانہ تعالیٰ سے لی ہوئی روایت بیان فرمائی، حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا
کہ درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جو پت جھڑ نہیں ہوتا اور بلاشبہ وہ مومن کی طرح ہے پس تم مجھے یہ بتاؤ کہ وہ کیا
ہے؟ چنانچہ لوگ جنگل کے درختوں میں پہنچ گئے، حضرت ابن عمر کا بیان ہے کہ میرے جی میں یہ بات آئی کہ وہ
کھجور ہے، پس میں کہتے ہوئے شرمایا گیا، پھر صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ فرمائیں وہ کونسا درخت ہے،
آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ کھجور ہے۔

علم کے سلسلہ میں اس سے قبل باب من سنل علماً اور فضل العلم کے ابواب گزر چکے ہیں ماسبق سے ربط اور یہ بات معلوم ہے کہ قرب الہی کا مدار عمل کی درستی پر ہے اور عمل کی درستی علم صحیح پر موقوف ہے اور وہ اس پر موقوف ہے کہ اس کا استناد پیغمبر علیہ السلام کی طرف صحیح ہو اس لئے امام بخاری نے باب منعقد فرما کر یہ بتانا چاہا کہ علم صحیح کے حاصل کرنے کا طریق کیا ہے۔

چنانچہ امام بخاری نے باب قول المحدث حدثنا الخ منعقد فرما کر یہ بتلادیا کہ علم صحیح وہ کہلائے گا جس کی سند معتبر ہو اور جس علم کی سند معتبر نہ ہوگی وہ معتبر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر سند سے قطع نظر کر لیں تو ہر انسان کو اپنی من مانی بات کہنے کی آزادی رہے گی، اسی لئے کہا جاتا ہے الاسناد من الدین ولو لا الاسناد لقال من شاء ما شاء امام بخاری نے اس باب میں علم صحیح کے مختلف طریقے پیش فرمائے ہیں۔

ترجمہ کے مقاصد | اس ترجمہ کے مختلف مقاصد ہو سکتے ہیں، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ محدثین کرام نے نقل روایت کے سلسلہ میں جو مختلف الفاظ مخصوص کر رکھے ہیں آیا یہ ان کی دماغ کی اختراع ہے یا اس سلسلہ میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے اصحاب سے بھی کچھ ثابت ہے اور چونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اسناد داخل دین ہے اسلئے اب یہ تلاش ضروری ہوئی کہ جو طریقے محدثین کرام نے اختیار فرمائے ہیں ان کی بھی کوئی اصل ہے یا نہیں اگر ان کی کوئی اصل ہے یعنی پیغمبر علیہ السلام یا آپ کے اصحاب نے ان الفاظ کا استعمال فرمایا ہے تو یہ بات مستند ہوگی کیونکہ دین بھی پیغمبر اسلام کا ہوگا اور طریقہ نقل بھی آپ ہی سے ثابت ہوگا اور اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہے گی، نیز یہ کہ عنوان میں ارشاد فرمودہ قول المحدث حدثنا و اخبرنا و انبأنا کا مطلب یہ ہوگا کہ عنوان کے اندر صرف تین چیزیں ہیں اور ان ہی کے متعلق تفتیش منظور ہے، بلکہ ان کے علاوہ اور بھی جتنے طریقے نقل روایت کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں وہ سب داخل مراد ہوں گے، اس تقدیر پر قال لنا الحمیدی کان عند ابن عیینہ الخ یہ جملہ استطرادی ہوگا داخل مقصود نہ ہوگا۔

دوسرا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ محدثین کرام کے یہاں نقل روایت کے سلسلہ میں مختلف الفاظ کا استعمال ہوتا ہے ان کی حیثیت اور وزن کیا ہے؟ یعنی آیا یہ الفاظ برابر کے ہیں یا ان میں قوت و ضعف کا فرق ہے، اس صورت میں قال لنا الحمیدی کان عند ابن عیینہ الخ جملہ استطرادی نہ ہوگا بلکہ اسکا مطلب یہ ہوگا کہ ان الفاظ میں باہم فرق مراتب نہیں بلکہ یہ سب برابر ہیں محدث کو اختیار ہے چاہے حدثنا کا استعمال کرے اور چاہے تو سمعت کا صیغہ لائے، حمیدی کے ارشاد کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جواز تمسک اور معمول بہا ہونے میں سب طریقے برابر ہیں یہ الگ بات ہے کہ بعض طریقوں کو بعض پر ترجیح ہے، جس طرح حدثنا کی تعبیر سے روایت درست ہوگی، اسی طرح اخبار و انباء کے صیغہ کا بھی اعتبار ہوگا، اس صورت میں ترجمہ کا مقصد یہ ہوگا کہ آیا یہ طریقے جائز ہیں یا ان

میں کوئی طریقہ ایسا بھی ہے جسے ناجائز قرار دیا جائے کیونکہ بعض حضرات نے انباء کے طریقہ کو کمزور اور بعض نے اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے، امام بخاری نے ترجمہ منعقد کر کے بتلادیا کہ تمام طریقے جائز اور قابل استناد ہیں بہر کیف حمیدی کے قول کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں کہ یہ تمام الفاظ بلحاظ قوت برابر ہیں یا استناد اور قابل قبول ہونے میں برابر ہیں۔

نقل روایت کے مختلف طریقے | محدثین کرام کے یہاں نقل روایت کے مختلف طریقے ہیں، سماع، تحدیث اخبار، انباء، مراسلت، مکاتبت وغیرہ وغیرہ، یہ تمام طریقے قریب قریب

سب ہی کتابوں میں پائے جاتے ہیں تحدیث و اخبار اور انباء کے لئے تو خود قرآن کریم کی آیات
لا ینبئک مثل خبیر
خبر رکھنے والے کی طرح تجھے کوئی نہ بتا دے گا

اور یومئذ تحدث اخبارها . اس دن وہ اپنی باتیں کہہ ڈالے گی۔

سے استدلال کیا جاتا ہے، تحدیث و اخبار کا معاملہ تو ظاہر ہے لیکن انباء کے طریق میں اصطلاحی فرق ہو جاتا ہے اور اسی اصطلاحی فرق کے اعتبار سے انباء کا طریق تحدیث و اخبار کے مقابلہ پر کمزور قرار پاتا ہے، بات یہ ہے کہ انباء کا لفظ محدثین کے یہاں بالمشافہہ اجازت نہیں بلکہ مطلق اجازت کے لئے استعمال ہوتا ہے اور اجازت کا معاملہ یہ ہے کہ اسے بعض حضرات معتبر مانتے ہیں اور بعض نہیں مانتے، جو لوگ معتبر نہیں مانتے ان کے یہاں اگر حدیث صحیح بھی بلفظ ”انباء“ منقول ہوگی تو شبہ ہوگا؛ اسی لئے محدثین کرام احتیاط برتتے ہیں اور انباء بلکہ بعض اوقات اخبار کے ساتھ بھی کوئی ایسی قید لگا دیتے ہیں جس سے شبہ ختم ہو جائے، ورنہ اصل لغت کے اعتبار سے اس میں کوئی فرق نہیں ہے، رہے دوسرے طریقے تو بعض حضرات نے کچھ طریقوں سے بغیر قید انکار کیا ہے اور بعض حضرات نے قید کے ساتھ، ان میں سے ”عرض“ اور ”مکاتبہ“ وغیرہ کی بحثیں آگے امام بخاری خود لارہے ہیں۔

نقل روایت کے ان مختلف طریقوں میں آگے چل کر محدثین کرام باہم مختلف ہیں
محدثین کرام کے رجحانات
کہ آیا ان سب کا ایک ہی درجہ ہے یا ان میں کچھ فرق ہے، اتنی بات پر تو سب ہی

کا اتفاق ہے کہ اگر کسی روایت کو شیخ سے سنا ہے تو اس صورت میں حدثنا، اخبارنا، انبانا، اور سمعت چاروں صیغوں کا استعمال درست ہے، لیکن اختلاف اس میں ہے کہ ان چاروں کا درجہ مساوی ہے یا ان میں قوت و ضعف کا فرق ہے تو امام بخاری، علی بن مائنی، حمیدی، سفیان بن عیینہ، امام مالک، سفیان ثوری، زہری، حسن بصری رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ درجہ میں سب برابر ہیں اور حریمین اور کوفہ کے اکثر علماء کا یہی مختار ہے، لیکن جمہور محدثین مشرق کا مختار یہ ہے کہ تحدیث کا طریقہ بمقابلہ اخبار زیادہ قوی ہے لیکن امام مالک کا دوسرا قول یہ بھی ہے کہ قرأت علی الشیخ، سماع من الشیخ کے مقابلہ میں قوی تر ہے، ابن ابی ذئب اور امام ابو حنیفہ بھی اسی کو ترجیح دیتے ہیں، مگر جس صورت میں شیخ شاگردوں کو حفظ احادیث سنا رہا ہو تو اس پر اعتماد زیادہ ہوگا، آگے چل کر اور اختلاف ہو گیا ہے کہ اگر روایت بطریقہ اخبار لی ہے

یعنی شیخ کے سامنے خود پڑھا ہے تو یہ چیز بغیر کسی قید کے معتبر ہے یا اس میں کسی قید کی بھی ضرورت ہے، اس میں امام بخاری، امام مالک اور اکثر علماء کوفہ و بصرہ و حجاز بغیر قید کے معتبر مانتے ہیں لیکن امام احمد، نسائی، عبد اللہ ابن مبارک اور بعض دیگر محدثین فرماتے ہیں کہ قراءۃ علیہ وانا اسمع یا حدثنی الشیخ قراءۃ علیہ قید لگائی جائے گی، امام شافعی فرماتے ہیں کہ حدثنا تو بغیر قید کے بھی درست ہے لیکن اخبارنا میں قید لگانے کی ضرورت ہوگی، متاخرین محدثین کے نزدیک تحدیث اور اخبار نقل روایت کے دو جداگانہ طریق کا پتہ دیتے ہیں یعنی سماع من الشیخ میں صرف حدثنا یا سمعت کا لفظ ہی استعمال ہو سکے گا اخبارنا کہنا صحیح نہ ہوگا اور قراءت علی الشیخ کی صورت میں اسکی حکایت بلفظ "اخبارنا" ہی صحیح ہوگی "حدثنا" کا موقع نہ ہوگا، امام اوزاعی، امام مسلم وغیرہ کا مختار یہی ہے، امام ابو حنیفہ اور امام مالک کا بھی ایک قول اسی کے موافق ہے، مسلم، ابوداؤد کو اٹھا کر دیکھئے کہ حدثنا اور اخبارنا کے فرق پر سندیں بدل رہی ہیں۔ اس کے بعد امام بخاری نے ترجمہ کے مناسب صحابہ کے اقوال نقل فرمائے ہیں کہ حضرات صحابہ اقوال پیغمبر کی حکایت کہیں "حدثنا" سے کرتے ہیں تو کہیں "سمعت" سے پھر نقل روایت کے بھی دو طریق نہیں تھے بلکہ لفظ "عن" اور لفظ روایت بھی ان طرق میں شامل ہے، غرض امام بخاری نے ان قطعاً حدیثیہ کو ذکر فرما کر ثابت کر دیا کہ صحابہ کرام اور خود آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ کا استعمال فرمایا۔

یہ پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ امام بخاری کا ترجمہ میں صرف تحدیث و اخبار اور انباء کو لانا انحصار کیلئے نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ محدثین کے یہاں جتنے بھی الفاظ نقل روایت کے سلسلہ میں مستعمل ہیں ان کی کوئی اصل ہے یا نہیں، یہاں حضرت ابو العالیہ کے قول میں "عن" کا بھی تذکرہ آگیا، معلوم ہوا کہ یہ طریقہ بھی معتبر ہے، معین روایت میں اختلاف ہے کہ آیا اسے اتصال پر حمل کریں گے یا منقطع قرار دینگے تو امام بخاری اور ان کے اساتذہ کا مسلک جن میں حمیدی، سفیان ابن عیینہ اور علی بن المدینی شامل ہیں، قریب قریب یہ ہے کہ اگر راوی معروف ہوں اور تدلیس کے عیب سے بری ہوں پھر راوی کا مروی عنہ سے لقاء بھی ثابت ہو چکا ہو تو ایسے راوی کی جملہ روایات متصل اور صحیح قرار دی جائیں گی، البتہ اگر راوی پر تدلیس کی تہمت ہے تو جب تک راوی اور مروی عنہ کے طریق میں سماع کی تصریح نہ ہو یا لقاء ثابت نہ ہو اسوقت تک عنعنہ کا اعتبار نہ ہوگا، امام مسلم کے یہاں امکان لقاء بھی اتصال کے لئے کافی ہے خواہ تصریح سماع ہو یا نہ ہو۔ ابن رشد نے حضرت ابو العالیہ اور ان کے بعد لائے گئے ارشادات کے بارے میں فرمایا ہے کہ امام بخاری تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کی تمام روایات عن ربہ ہیں خواہ ان میں عن ربہ کی تصریح نہ ہو اور دلیل ہے کہ ابو العالیہ والی جس روایت میں عن ربہ کی تصریح ہے یہی روایت ایک دوسرے مقام پر عن ربہ کی تصریح سے خالی ہے اور شیخ الاسلام نے اپنی شرح میں یہ بتلایا ہے کہ یہ عن ربہ ہے یعنی درمیان میں جبرئیل کا واسطہ نہیں ہے، محدثین کرام نے ایسی روایت کو جس میں عن ربہ کی تصریح ہو الگ درجہ دیا ہے اور اسے حدیث قدسی کہتے ہیں۔

حدیث شریف | ایک مرتبہ آپ نے صحابہؓ سے فرمایا درختوں میں ایک ایسا درخت بھی ہے جو کبھی پت جھڑ نہیں ہوتا اور مسلم کو اس سے تشبیہ دی جاسکتی ہے، بتاؤ وہ کونسا درخت ہے، صحابہ کرامؓ کے خیالات جنگل کی درختوں کی طرف گئے، کھجور کی طرف کسی کا ذہن نہیں گیا، ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میرا ذہن گیا بھی لیکن چونکہ وہاں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ کرام تشریف فرما تھے اس لئے میں خاموش رہا، پھر صحابہؓ نے خود ہی عرض کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس حدیث کا ترجمہ سے کیا ربط ہے اور تحدیث و اخبار اور انباء کے قوت و ضعف میں یا جواز تمسک میں برابر ہونے پر اس سے کس طرح استدلال ہوگا، تو حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں ارشاد فرمایا ہے کہ اس روایت کے مختلف طرق کو جمع کرنے سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ حدیث باب میں جو عبد اللہ بن دینار کے طرق سے ہے حدیثوںی فرمایا گیا اور کتاب التفسیر میں حضرت نافع کے طرق سے اخبار و نبی ہے، اسمعیلی کے طریق میں انبؤنی ہے اور باب الحیاء فی العلم میں مالک کی روایت میں حدیثوںی ماہی ہے اور پھر صحابہ کرام کی جانب سے صیغہ اخبار استعمال کیا گیا ہے، ان تمام طرق کو جمع کرنے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان تینوں الفاظ کا مرتبہ ایک ہی ہے کیونکہ تحدیث کی جگہ اخبار اور اخبار کی جگہ تحدیث اسی طرح انباء کا استعمال کیا جا رہا ہے اگر ان میں کوئی خاص فرق ہوتا تو اہل زبان صحابہ کرام اس قسم کا رد و بدل نہ فرماتے۔

واللہ اعلم

[۵] بَابُ طَرَحِ الْاِمَامِ الْمَسْئَلَةَ عَلٰی اَصْحَابِهِ لِيَخْتَبِرَ مَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ

(۶۲) حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ مَخْلَدٍ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ دِينَارٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ عَنِ

النَّبِيِّ ﷺ قَالَ إِنَّ مِنَ الشَّجَرِ شَجْرَةً لَا يَسْقُطُ وَرَقُهَا وَإِنَّهَا مِثْلُ الْمُسْلِمِ حَدَّثُونِي مَا هِيَ

قَالَ فَوَقَعَ النَّاسُ فِي شَجَرِ الْبَوَادِي قَالَ عَبْدُ اللَّهِ فَوَقَعَ فِي نَفْسِي أَنَّهَا النَّخْلَةُ فَاسْتَحْيَيْتُ

ثُمَّ قَالُوا حَدَّثَنَا يَا رَسُولَ اللَّهِ مَا هِيَ قَالَ هِيَ النَّخْلَةُ. (گذشتہ: ۶۱)

ترجمہ | باب، امام کا اپنے تلامذہ کے سامنے مسئلہ پیش کرنا کہ ان کے علم کا امتحان لے سکے، حضرت ابن عمرؓ نے آنحضرت ﷺ سے روایت بیان کی، آپ نے فرمایا کہ درختوں میں ایک ایسا درخت ہے جو کبھی پت جھڑ نہیں ہوتا اور بیشک مسلمان کی طرح ہے بتلاؤ وہ کیا ہے؟ حضرت ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ لوگوں کے خیالات جنگل کی طرف گئے اور میرے ذہن میں یہ آیا کہ وہ کھجور ہے، لیکن میں نے حیا محسوس کی پھر لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ہی ارشاد فرمائیں، آپ نے فرمایا وہ کھجور ہے۔

ترجمہ کا مقصد اور ربط پہلے ارشاد فرمایا جا چکا ہے کہ جب دین کی کوئی بات بتلائی جائے تو معلم کو سند بھی ذکر کر دینی چاہئے، بے سرو پا اور بے سند باتیں بتلانا درست نہیں، اب یہ بتلا رہے ہیں کہ اپنے تیقظ اور بیداری کیساتھ ساتھ طالب علم کو بھی بیدار رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ درس و تقریر کے موقع پر غفلت سے کام نہ لے، اسکی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ وقتاً فوقتاً طالب علم سے استاذ سوال کرتا رہے، اسکے نتیجہ میں طالب علم کو ہمہ وقت یہ خیال رہیگا کہ اگر کسی موقع پر استاد نے کچھ دریافت کر لیا تو ناکامی کی صورت میں ایک طرف تو استاد کو بدظنی کا موقع ملے گا جو علم سے محرومی کا سبب ہے اور دوسری طرف مجمع میں رسوائی ہوگی، نیز اس امتحان کا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ اس طرح استاد کو طالب علم کے مرتبہ علم کا اندازہ ہو جائیگا اور وہ اسی کے مرتبہ کے موافق گفتگو کرے گا، استاد کے ہوشیار رہنے اور طالب علم کو اس طریقہ پر ہوشیار رکھنے سے علم کا اہتمام نکلتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد | حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ ابوداؤد شریف میں حضرت معاویہؓ کے طریق سے ایک روایت آئی کہ نبی رسول اللہ ﷺ

عن الاغلوطات جس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ امتحان نہ لیا جائے کیونکہ امتحان بیشتر اغلوطات اور پیچیدگی سے خالی نہیں ہوتا، اس کا مادہ ہی محنت ہے جس کے معنی دشواری اور مشقت کے ہیں، امام بخاریؒ نے اس ترجمہ کے انعقاد سے یہ بتلادیا کہ حدیث معاویہؓ کا مقصد امتحان سے روکنا یا منع کرنا نہیں ہے بلکہ اگر ممتحن دقیق بات دریافت کر کے دوسرے کو ذلیل کرنا چاہے یا اس طرح وہ بڑائی کا سکھ جمانا چاہے تو البتہ ایسا کرنا درست نہیں ہے، غرض اغلوطہ کا پیش کرنا کوئی ممنوع بات نہیں البتہ اگر مقصد غلط ہو تو دوسری بات ہے اسلئے اغلوطہ ناجائز نہیں ہاں دوسرے کی تذلیل یا اپنی تعلیٰ ناجائز ہے، یہ الگ بات ہے کہ عند الامتحان یکرم الرجل اوبھان .

طریقہ سوال | طریقہ سوال جیسا کہ حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے یہ رہے گا کہ طالب علم کے سامنے کوئی ایسی چیز پیش کی جائے جس میں کچھ پیچیدگی ہو یعنی وہ نہ تو اس درجہ سہل ہو کہ اسمیں غور و فکر کی ضرورت ہی نہ پڑے اور نہ اس درجہ دقیق اور مشکل ہو کہ تمام قوت فکر و نظر صرف کر دینے کے بعد بھی وہ حل نہ ہو سکے، حدیث باب سے جہاں امتحان کا جواز نکلتا ہے وہیں یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ امتحان ایسی چیزوں میں لیا جائے جو مسئول کی سمجھ سے بالاتر نہ ہوں کیونکہ یہاں سوال کا تعلق ایک مخصوص شان کے درخت سے ہے جس کی تلاش جنگل میں آنے جانیوالے لوگوں کے لئے کچھ دشوار نہیں ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جس چیز کے بارے میں پوچھا جائے اس کا اتنا پتا بھی دیا جائے کیونکہ اس میں دوسری جگہ یہاں تک صریح موجود ہے کہ لا یسقط ورقھا ولا ینقطع نفعھا تا کہ طالب علم ان اشارات کی مدد سے اس کا

حل تلاش کرے۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ درختوں میں ایک ایسا درخت ہے جو کبھی بھی پت جھڑ نہیں ہوتا اور مسلمان کو اس سے تشبیہ دی جاسکتی ہے اس کا نفع کبھی ختم نہیں ہوتا اسکے

پھل ابتداء سے لیکر آخر تک کسی نہ کسی صورت کھائے اور کھلائے جاتے ہیں حضرت ابن عمرؓ کا خیال اس طرف گیا کہ آپ کی خدمت میں ابھی ابھی جمار لایا گیا ہے اور آپ اسے تناول فرما رہے ہیں اور مثل کلمة طيبة كشجرة طيبة اصلها ثابت و فرعها في السماء تلاوت فرما رہے ہیں اس لئے ہونہ ہو یہ کھجور کا درخت ہے، ابن عمرؓ کو یہ خیال تو آیا لیکن حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ جیسے جلیل الشان اصحاب کی موجودگی میں لب کشائی کو جسارت سمجھتے ہوئے آپ خاموش رہے، بعد میں حضرت عمرؓ سے اس کا تذکرہ فرمایا جس کا بیان گزر چکا ہے۔

حدیث باب میں مسلمان کو کھجور سے تشبیہ دی گئی ہے، دیکھنا یہ ہے کہ وجہ شبہ کیا ہے؟ اس کی مختلف وجہ شبہ کیا ہے؟ وجوہ ہو سکتی ہیں، کسی نے کہا کہ استقامت میں تشبیہ ہے یعنی جس طرح مسلمان قدامت اور جسم کی طرح اخلاق و عادات اور دوسرے اعمال میں مستقیم ہوتا ہے اسی طرح کھجور بھی مستقیم القامت ہونے کے ساتھ ساتھ مستقیم الاحوال بھی ہے وہ کسی بھی حالت میں بیکار نہیں، اس کے پھل کچے اور پکے ہر طرح کارآمد ہیں اسکے پتے کام آتے ہیں، اس کا تین نفع بخش ہوتا ہے اور وہ دو اور غذا دونوں طرح استعمال ہوتا ہے، یہی شان مسلم کی ہے اور جس طرح مسلم زندگی اور موت دونوں حالتوں میں دوسروں کیلئے سرچشمہ خیر ہوتا ہے اسی طرح کھجور بھی اپنی موت و حیات دونوں میں نفع بخش ہوتی ہے۔

بعض لوگوں نے وجہ شبہ یہ بیان کی ہے کہ کھجور کو اوپر سے کاٹ دیا جائے تو مردہ ہو جاتا ہے جس طرح سرکٹا انسان، بعض کہتے ہیں کہ اس کا پھل تابیر کے بغیر نہیں آتا، بعض کہتے ہیں کہ اگر پانی میں ڈوب جائے تو درخت خراب ہو جاتا ہے، بعض کہتے ہیں کہ اس کے پھلوں میں آٹا ہوتا ہے اور زرکا آٹا سفید اور مادہ کا زرد ہوتا ہے اور دونوں کی بوئشی کی طرح ہوتی ہے، بعض کہتے ہیں کہ انسان کی طرح اس میں مادہ عشق ہوتا ہے لیکن یہ تمام وجوہ تشبیہ مومن کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ مومن و کافر سب میں پائی جاتی ہیں۔

ایک وجہ شبہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ کھجور کی جڑیں گہری اور مضبوط ہوتی ہے اور اس کا تنہ بلند ہوتا ہے اگر آپ کسی چھوٹے پودے کو اکھاڑنے لگیں تو وہ آسانی سے اکھڑ جائے گا لیکن کھجور کے درخت کو اکھاڑنے کے لئے آپ کو قوت صرف کرنی ہوگی، بالکل یہی حال مومن کا ہوتا ہے کہ ایمان اس کے قلب میں رچا ہوتا ہے اور اعمال خیر اوپر چڑھتے ہیں،

جمار کھجور کے اندر سے ایک سفید گودہ نکلتا ہے جو شیریں ہوتا ہے اور کھایا جاتا ہے اور بعض حضرات کا خیال ہے کہ جمار چنور کو فرمایا گیا ہے جیسا کہ کیلے کے اندر سے چنور نکلتا ہے اس کے بعد پھر درخت پر پھل نہیں آتے۔

یہ وجہ شبہ سوال کے وقت آپ کی تلاوت فرمودہ آیت پاک مثل کلمہ طیبہ سے نکل رہی ہے لیکن ان تمام وجوہ میں سب سے اہم اور واقع بات وہی ہے جو خود حدیث میں ہے کہ لا ینقطع نفعها کہ ہمہ وقت اور ہر حالت میں دو نفع بخش ہے۔
واللہ اعلم

[۶] بَابُ الْقِرَاءَةِ وَالْعَرْضِ عَلَى الْمُحَدَّثِ

وَرَأَى الْحَسَنَ وَسُفْيَانَ وَمَالِكَ الْقِرَاءَةَ جَائِزَةً قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ سَمِعْتُ أَبَا عَاصِمٍ يَذْكُرُ عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ وَمَالِكٍ أَنَّهُمَا كَانَا يَرِيَانِ الْقِرَاءَةَ وَالسَّمَاعَ جَائِزًا حَدَّثَنَا عُيَيْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ إِذَا قُرِئَ عَلَيَّ الْمُحَدَّثُ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَقُولَ حَدَّثَنِي وَسَمِعْتُ وَاحْتَجَّ بَعْضُهُمْ فِي الْقِرَاءَةِ عَلَيَّ الْعَالِمُ بِحَدِيثِ ضِمَامِ بْنِ ثَعْلَبَةَ قَالَ لِسُنِّي صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ تَصَلِيَ الصَّلَاةَ قَالَ نَعَمْ قَالَ فَهَذِهِ قِرَاءَةُ عَلِيِّ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخْبَرَ ضِمَامٌ قَوْمَهُ بِذَلِكَ فَأَجَازَ وَهُوَ وَاحْتَجَّ مَالِكٌ بِالصُّكِّ يُقْرَأُ عَلَى الْقَوْمِ فَيَقُولُونَ أَشْهَدْنَا فَلَانٌ وَيُقْرَأُ عَلَى الْمُقْرَأِ فَيَقُولُ الْقَارِئُ أَقْرَأَنِي فَلَانٌ .

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْحَسَنِ الْوَاسِطِيُّ عَنْ عَوْفٍ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ لَا بَأْسَ بِالْقِرَاءَةِ عَلَيَّ الْعَالِمِ وَحَدَّثَنَا عُيَيْدُ اللَّهِ بْنُ مُوسَى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ إِذَا قُرِئَ عَلَيَّ الْمُحَدَّثُ فَلَا بَأْسَ أَنْ يَقُولَ حَدَّثَنِي قَالَ وَسَمِعْتُ أَبَا عَاصِمٍ يَقُولُ عَنْ مَالِكٍ وَسُفْيَانَ الْقِرَاءَةَ عَلَيَّ الْعَالِمِ وَقِرَاءَتَهُ سَوَاءً .

ترجمہ | قراءۃ اور عرض علی المحدث کا بیان، حسن بصری سفیان ثوری اور مالک قراءت کے طریق کو جائز اور معتبر سمجھتے ہیں، ابو عبد اللہ نے کہا میں نے ابو عاصم سے سنا کہ وہ سفیان ثوری اور مالک کے متعلق یہ بیان کر رہے تھے کہ یہ دونوں حضرات قراءت علی الشیخ اور سماع من الشیخ کے دونوں طریقوں کو جائز اور معتبر قرار دیتے تھے، عبد اللہ بن موسیٰ حضرت سفیان سے روایت کرتے ہیں، کہ جب محدث کے سامنے قراءت کی جائے تو حدیثی اور سمعت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور بعض محدثین نے عالم کے سامنے قراءت کرنے پر ضمام بن ثعلبہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، انہوں نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا تھا کہ کیا اللہ نے آپ کو نماز و نکی ادا نیگی کا حکم فرمایا ہے آپ نے فرمایا،

۱۔ یہاں مصری نسخہ میں باب ماجاء فی العلم وقول اللہ تعالیٰ "وقل رب زدنی علماً" ہے، اور ذیل میں القراءۃ والعرض علی المحدث ہے۔ ۱۲

۲۔ قال ابو عبد اللہ سے وارجح تک عبارت مصری نسخہ کے مطابق ہے۔

ہاں، یہی قراءت علی النبی ﷺ ہے، ضمام بن ثعلبہ نے اپنی قوم کو خبر دی اور ان لوگوں نے اس کو جائز قرار دیا، اور امام مالک نے چک سے استدلال کیا جو قوم کے سامنے پڑھا جائے چنانچہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ اشہدنا فلان ہمیں فلاں نے گواہ بنایا؛ حالانکہ یہ صرف ان کے سامنے پڑھا جاتا ہے اور مقری کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو قاری کہتا ہے اقرانی فلان، محمد بن سلام نے بیان کیا کہ محمد بن الحسن الواسطی نے حضرت حسن سے بواسطہ عوف یہ نقل کیا کہ اسمیں کچھ حرج نہیں ہے کہ عالم کے سامنے قراءت کی جائے، اور محمد بن اسماعیل بخاری نے حضرت سفیان سے بواسطہ عبید اللہ بن موسیٰ بیان کیا کہ جب محدث کے سامنے حدیث پڑھی جائے تو پھر حدیثی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بخاری نے بیان کیا کہ میں نے ابو عاصم سے امام مالک و سفیان کا یہ ارشاد سنا ہے کہ (شاگردوں) کا عالم کے سامنے پڑھنا یا عالم کا (شاگردوں کے سامنے) پڑھنا برابر ہیں۔

باب سابق سے ربط | باب سابق میں طالب علم کے امتحان و اختبار کا ذکر ہے اور اس باب میں طالب علم کو استفسار کی اجازت کا بیان، مناسبت ظاہر ہے کہ پہلے طالب علم کا مبلغ علم معلوم کر لیا گیا اب طالب علم کو عرض کا موقعہ دیا جاتا ہے کہ جو بات لیکر آئے ہو اسے سناؤ اور یہی عام دستور بھی ہے کہ پہلے شاگرد سے معلومات کی جاتی ہیں اور پھر اسے استفسار و سوالات کا موقعہ دیا جاتا ہے۔

مقصد ترجمہ | مقصد یہ ہے کہ محدثین کے یہاں ایک طریقہ قراءت کا بھی ہے کہ استاد نے اور طالب علم پڑھے، پھر چاہے عرض کی صورت ہونہ ہو، عرض کا مطلب یہ ہے کہ طالب کے پاس استاد کی کوئی روایت یا صحیفہ پہلے سے موجود ہے، اب طالب استاد کو سنا کر اسکی اجازت چاہتا ہے اسکا نام عرض ہے، قراءت کیلئے عرض ضروری نہیں، تو ایک طریقہ تو قراءت کا ہے اور دوسرا طریقہ سماع من الشیخ کا ہے۔

سماع من الشیخ کے بارے میں تو پوری دنیا متفق ہے کہ یہ طریق اعلیٰ طریق ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ قراءت اور عرض کا طریق بھی معتبر ہے یا نہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ بعض حضرات نے اس کو قطعاً ناقابل اعتبار اور بعض نے اہون قرار دیا ہے، امام بخاری پہلے بھی ابن عیینہ کے قول سے ثابت کر چکے ہیں کہ حدیثاً، انبائاً، اخبارنا کا ایک ہی حکم ہے، اب یہاں مقصود بنا کر ان اقوال کو جمع کر رہے ہیں جنہوں نے اس کا تحدیث کا درجہ میں اعتبار کیا ہے، اب گویا اس باب میں ناقابل اعتبار یا کم درجہ قرار دینے والوں پر رد ہے، فرماتے ہیں کہ حسن بصری، سفیان اور امام مالک کے نزدیک قراءت کی صورت ایک رائج اور چلتی ہوئی صورت ہے یعنی قابل اعتبار ہے، بخاری کے استاد حمیدی اس مسئلہ پر حضرت ضمام بن ثعلبہ کی روایت سے استدلال کرتے ہیں کیونکہ ضمام نے آپ کے سامنے وہ چیزیں پیش کیں جو اس سے قبل مبلغین اسلام کی زبان سے اپنے یہاں سنی تھیں اس پر آں حضور ﷺ نے مہر تصدیق مثبت فرمائی اور نعم (جی ہاں) سے

زیادہ اور کچھ نہیں فرمایا چنانچہ جب ضمام نے اپنی قوم کے سامنے یہ بات بیان فرمائی تو انہیں کوئی اشکال پیش نہ آیا اور انہوں نے قبول کیا، یہ واقعہ دونوں باتوں کیلئے پختہ دلیل ہے یعنی قابل اعتبار ہونا بھی واضح ہے اور قوت و ضعف میں برابر ہونا بھی، اسلئے کہ اگر عرض اور قراءت علی الشیخ کا طریق سماع من الشیخ کے مقابلہ میں اہون اور کمزور ہوتا تو تبلیغ کے اس موقع پر آں حضور ﷺ احتیاط سے کام لیتے اور خود اپنی زبان مبارک سے ان امور کو ارشاد فرماتے تاکہ کسی کو شک و شبہ کی گنجائش ہی باقی نہ رہے، لیکن آپ نے ایسا نہیں فرمایا جو قراءت و تحدیث کے ہم مرتبہ ہونے کی واضح دلیل ہے۔

امام مالک نے اس کی حجیت پر عجیب انداز سے استدلال فرمایا ہے بخاری نے اس کے دو طریق ذکر فرمائے ہیں پہلا طریق صک کا ہے، صک کا ترجمہ ہے قبالہ یا دستاویز، یہ معرب ہے چک کا، صورت یہ ہوتی ہے کہ دائن، مدیون یا بائع و مشتری غرض متعاقدین کا کوئی بھی معاملہ ہو صک کا یا قبالہ نویس معاملہ کی کتابت کر کے متعاقدین کو گواہوں کی موجودگی میں پڑھ کر سنا دیتا ہے، متعاقدین اسکو تسلیم کر لیتے ہیں وہ گواہوں کے سامنے خود اس کی قراءت نہیں کرتے لیکن بوقت ضرورت قاضی کی عدالت میں وہ گواہ پیش ہو جاتے ہیں اور عدالت ان کی گواہی کو معتبر قرار دیتی ہے، مثال کے طور پر سمجھ لیں کہ زید نے عمر سے سو روپے قرض لئے ہیں دستاویز میں کاتب یہ لکھتا ہے کہ زید ابن فلاں ساکن موضع فلاں نے عمر و ابن فلاں ساکن موضع فلاں سے مبلغ سو روپے سکھ چہرہ شاہی جسکا نصف مبلغ پچاس روپے ہوتے ہیں آج بتاریخ فلاں بموجودگی فلاں فلاں بوعده ادائیگی یک ماہ بطور قرض لئے ہیں الخ، اس دلیل کا خلاصہ یہ ہوا کہ نقل روایت از قبیلہ اخبار ہے اور یہ مسلم ہے کہ شہادت کا معاملہ بمقابلہ اخبار کے زیادہ اہمیت رکھتا ہے پس جبکہ عدالتی فیصلوں میں اس قسم کا اقرار صحیح اور معتبر ہے تو باب روایت میں بدرجہ اولیٰ معتبر ہونا چاہئے، دوسرا طریقہ قراءت کا ہے، شاگرد استاذ کے روبرو قرآن پاک کی قراءت کرتا ہے اور مقری یعنی استاذ اسکو شکر تصویب کر دیتا ہے پھر یہ قاری یعنی شاگرد دوسروں کے سامنے اپنی سند اس طرح بیان کرتا ہے کہ مجھ کو فلاں مقری یعنی استاد نے اس طرح پڑھایا ہے حالانکہ استاد نے تو سنا ہے پڑھایا نہیں مگر قرآنی فلاں کی تعبیر بلا تکثیر شائع ہے، جب قرآن کے معاملہ میں جس کی اہمیت حدیث سے کہیں زائد ہے یہ طریق معتبر ہوا تو حدیث میں اس کا معتبر نہ ہونا کیا معنی رکھتا ہے، مطرف کا بیان ہے کہ میں نے سترہ سال امام مالک کی خدمت میں رہ کر یہی دیکھا ہے کہ تلامذہ ان کی کتاب مؤطا انہیں پڑھکر سناتے رہے ہیں امام مالک نے کبھی اس کی قراءت نہیں فرمائی، انہیں مطرف کا یہ بیان بھی ہے کہ امام مالک ان لوگوں پر بہت سخت انکار فرماتے تھے جو حدیث کے باب میں عرض کے طریق کو نامعتبر کہتے ہیں، قرآن کا معاملہ اس قدر اہم وہاں تو یہ صورت معتبر ہو اور حدیث میں معتبر نہ ہو یہ عجیب تماشہ ہے میں نے حضرت شاہ صاحب سے سنا ہے کہ یہ شرف امام محمدؐ ہی کو حاصل ہے کہ خود امام نے ان کے سامنے قراءت فرمائی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ جو چیز کسی جنس کے اعلیٰ میں مقبول ہو وہ اس کے ادنیٰ میں بدرجہ اولیٰ مقبول ہوگی، ابن وہب نے امام مالک سے نقل فرمایا ہے کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کہ جو کتابیں اور روایات آپ کے سامنے پیش کی جاتی ہیں وہ صحیح و معتبر ہیں، امام مالک نے فرمایا کیوں نہیں، جس طرح میرا حدیث بیان کرنا حجت ہے اسی طرح میرے سامنے پیش ہونا اور میرا نعم کہہ دینا حجت ہے۔

امام مالک کے اس تعال سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی راجح ہے اور اس کی معقول وجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر شیخ پڑھنے میں مشغول ہو تو ممکن ہے کہ سبقت لسانی سے الفاظ میں رد و بدل ہو جائے پھر اس کا اثر معنی پر پڑے اور مفہوم بدل کر کچھ سے کچھ ہو جائے اس لئے اولیٰ یہی ہونا چاہئے کہ شاگرد پڑھے اور استاذ غلطی پر تنبیہ کرتا رہے اور تصدیق کرتا رہے، پھر اگر استاذ غلطی کریگا تو شاگرد ٹوک نہ سکے گا، کبھی ہیبت کی وجہ سے اور کبھی اس وجہ سے کہ شاید استاذ کے یہاں یہی راجح ہو مثلاً اعراب کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، اب استاذ کوئی سا بھی اعراب پڑھ جائیگا، شاگرد کو ٹوکنے کی جرات نہ ہوگی، اسلئے عرض کو ترجیح دی گئی ہیں اور امام ابو حنیفہ سے بھی ایک قول اسی طرح کا ہے اور ایک قول میں دونوں برابر ہیں، لیکن فیصلہ یہ ہے کہ اگر استاذ حفظ سے بیان کر رہا ہے تو تحدیث راجح ہے اور کتاب سامنے ہے تو عرض و قراءت، بہر کیف امام بخاری دونوں کے ہم مرتبہ ہونے کے قائل ہیں اور اس کے لئے امام نے مختلف اکابر کے متعدد اقوال متعدد سندوں سے پیش فرمادیئے ہیں۔

(۶۳) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ بْنُ يُوسُفَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ سَعِيدِ هُوَ الْمُقْبَرِيُّ عَنْ شَرِيكَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ ابْنِ أَبِي نَمِرٍ أَنَّهُ سَمِعَ أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُولُ بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ دَخَلَ رَجُلٌ عَلَى جَمَلٍ فَأَنَاخَهُ فِي الْمَسْجِدِ ثُمَّ عَقَلَهُ ثُمَّ قَالَ لَهُمْ أَيُّكُمْ مُحَمَّدٌ وَالنَّبِيُّ ﷺ مُتَكِي بَيْنَ ظَهْرَانِيهِمْ فَقُلْنَا هَذَا الرَّجُلُ الْاَبْيَضُ الْمُتَكِي فَقَالَ لَهُ الرَّجُلُ يَا ابْنَ عَبْدِ الْمُطَلِبِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ قَدْ أَجَبْتُكَ فَقَالَ الرَّجُلُ لِلنَّبِيِّ ﷺ إِنِّي أَسْأَلُكَ فَمَشَدُّ عَلَيْكَ فِي الْمَسْأَلَةِ فَلَا تَجِدْ عَلَيَّ فِي نَفْسِكَ فَقَالَ سَلْ عَمَّا بَدَا لَكَ فَقَالَ أَسْأَلُكَ بِرَبِّكَ وَرَبِّ مِنْ قَبْلِكَ اللَّهُ أَرْسَلَكَ إِلَى النَّاسِ كُلِّهِمْ فَقَالَ اللَّهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ أَنْشُدْكَ بِاللَّهِ اللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ تُصَلِّيَ الصَّلَوَاتِ الْخَمْسَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ قَالَ اللَّهُمَّ نَعَمْ، فَقَالَ أَنْشُدْكَ بِاللَّهِ اللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ تَصُومَ هَذَا الشَّهْرَ مِنَ السَّنَةِ قَالَ اللَّهُمَّ نَعَمْ قَالَ أَنْشُدْكَ بِاللَّهِ اللَّهُ أَمَرَكَ أَنْ تَأْخُذَ هَذِهِ الصَّدَقَةَ مِنْ أَغْيَانِنَا فَتَقْسِمَ بِهَا عَلَيَّ فَقَرَأْنَا فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اللَّهُمَّ نَعَمْ فَقَالَ الرَّجُلُ أَمَنْتُ بِمَا جِئْتَ بِهِ وَأَنَا رَسُولٌ مَنْ وَرَأَيْتُ مِنْ قَوْمِي وَأَنَا ضِمَامُ بْنُ ثَعْلَبَةَ أَخُو بَنِي سَعْدِ بْنِ بَكْرِ، رَوَاهُ مُوسَى وَعَلِيُّ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ عَنْ سُلَيْمَانَ

عَنْ ثَابِتٍ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ بِهَذَا .

ترجمہ | حضرت انس بن مالک سے روایت ہے انہوں نے فرمایا کہ اس اثناء میں کہ ہم آں حضور ﷺ کے پاس مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک آدمی اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور اس نے اونٹ مسجد میں بٹھا دیا پھر اس کے پیروں میں عقال ڈال دیا، پھر حاضرین سے کہا، تم میں محمد کون ہے؟ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حاضرین کے درمیان سہارا لگائے جلوہ افروز تھے، ہم نے اس شخص سے کہا کہ یہ جو رنگ میں سب سے ممتاز اور سہارا لگائے ہوئے ہیں چنانچہ آپ سے اس انسان نے کہا، اے عبدالمطلب کے بیٹے! آپ نے ارشاد فرمایا میں تمہیں جواب دینے کے لئے ہی یہاں بیٹھا ہوں، اس انسان نے کہا میں آپ سے کچھ سوالات کرنے والا ہوں اور سوالات میں کچھ تشدد بھی کرونگا مگر آپ مجھ پر اپنی جی میں غصہ نہ ہوں، آپ نے فرمایا جو چاہو پوچھو پھر اس نے کہا میں آپ کو آپکے اور آپ سے پہلوں کے رب کی قسم دیکر پوچھتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سب لوگوں کی طرف مبعوث کیا ہے؟ آپ نے فرمایا بخدا ہاں! اس نے کہا میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے دن و رات میں پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے، آپ نے فرمایا بخدا ہاں! اس نے کہا میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے سال میں اس ماہ کے روزوں کا حکم دیا ہے آپ نے فرمایا بخدا ہاں! اس نے کہا میں آپ کو اللہ کی قسم دیتا ہوں کیا آپ کو اللہ نے حکم دیا کہ آپ یہ صدقہ ہمارے امراء سے لیکر ہمارے فقراء پر تقسیم فرمادیں، آپ نے فرمایا بخدا ہاں! پھر اس آدمی نے کہا میں آپ کی لائی ہوئی تمام چیزوں پر ایمان لایا اور میں اپنی قوم کے لوگوں کا فرستادہ ہوں جو میرے پیچھے ہیں اور میں ضمام بن ثعلبہ بنو سعد بن بکر میں سے ہوں، موسیٰ اور علی بن الحمید نے یہ روایت حضرت انسؓ سے بواسطہ سلیمانؓ عن ثابتؓ رسول اکرم ﷺ سے بیان کی ہے۔

تشریح حدیث | حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے اپنا اونٹ مسجد سے باہر عقال سے باندھ دیا، اس روایت میں توفی المسجد ہے لیکن یہ توسع ہے، مسند احمد میں حضرت ابن عباس سے فناخ بعیرہ علی باب المسجد کے الفاظ منقول ہیں، فی المسجد سے امام مالکؒ نے ابوال ابل کی طہارت پر استدلال کیا ہے کیونکہ اونٹ کا مسجد میں بٹھانا خطرہ بول سے خالی نہیں، اور جب بٹھانے پر اعتراض نہیں کیا گیا تو معلوم ہوا کہ بول ابل طاہر ہے، لیکن مسند احمد کی روایت کے بعد یہ بات خود بخود ختم ہو جاتی ہے، آنے کے بعد اس نے پوچھا محمد کون ہیں؟ صحابہ نے بتلایا کہ هذا الرجل الابيض المتكى دوسری روایت میں ابیض کی جگہ امغر کے الفاظ ہیں اس لئے ابیض کے معنی سرخ سفید کے ہوئے ورنہ چونے جیسا سفید رنگ تو بیماری کی علامت ہے، اس نے آ کر یا بن عبدالمطلب کہا اور آپ نے فرمایا اجبتك بعض حضرات کا خیال ہے کہ چونکہ اسنے ایسے کلمات استعمال کئے جو خلاف شان تھے اسلئے آپ نے فرمایا کہ بس میں تمہیں جواب دے چکا! لیکن یہ تعبیر انتہائی غلط ہے انك لعلى خلق عظیم کے بالکل خلاف ہے، اس لئے معنی یہ ہوں گے کہ میں تو بیٹھا ہی جواب

کیلئے ہوں، بے تکلف پوچھو، اس شخص نے یہ معاملہ اس لئے کیا کہ وہ اپنے آپ کو چھپانا چاہتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ اگر ادب کی گفتگو کی اور وہ طریقہ استعمال کیا جو صحابہ کرام استعمال کرتے ہیں تو آداب مجلس کی پابندی مجھ پر آجائے گی اور میں بے تکلف نہ پوچھ سکوں گا، اسی لئے وہ بدوی اور گنوار بن کر آیا اور تمہید اٹھائی کہ حضرت کچھ پوچھنا ہے، پوچھنے میں سختی ہوگی، بار بار قسم دوں گا، گاؤں کا آدمی ہوں، آپ ناراض نہ ہوں، فرمایا نہیں، جو پوچھنا چاہو بے تکلف پوچھو، ممکن ہے اس طریق کے لئے قوم نے ہدایت کی ہو، تاکہ پیغمبر علیہ السلام اور آپ کے اصحاب کے سلیقہ، اخلاق اور تحمل کا امتحان ہو سکے، یا خود انہوں نے یہ چیز اپنی طرف سے سوچی تاکہ یہ بات قوم کے لئے اطمینان کا باعث بن سکے، یعنی یہ کہ اس طرز و طریقہ پر میں نے آپ سے سوالات کئے اور آپ نے خندہ پیشانی سے جوابات دیئے۔

بہر کیف انہوں نے نے آکر پے در پے چار سوالات کئے، چاروں میں قسم دی اور شدید قسم دی۔ آپ نے پوری خندہ پیشانی سے جوابات دئے اور اللہم نعم فرماتے رہے، ”اللہم“ تمام اسماء حسنیٰ کا قائم مقام ہے، اسلئے گویا آپ نے پورے اسماء حسنیٰ کو شامل کر کے جواب دیا، جب یہ ساری باتیں ہو گئیں تو ضمام نے کہا امنت بما جنت بہ میں تو پہلے ہی سے ایمان لا چکا ہوں، بخاری کے رائے بھی یہی ہے، اوزاعی بخاری کیساتھ ہیں، لیکن بعض حضرات کی رائے ہے کہ امنت میں انشاء ایمان ہے اور قرطبی نے ان کے قول زعم سے استدلال کیا کہ اگر یہ ایمان لالچکے ہوتے تو زعم کا استعمال نہ فرماتے کیونکہ زعم قول باطل کیلئے بولا جاتا ہے لیکن یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ زعم بمعنی قال مستعمل ہے اور قول محقق میں بھی اسکا استعمال ثابت ہے کتاب سیبویہ میں جگہ جگہ یہ لفظ قول محقق کے موقعہ پر وارد ہوا ہے۔

انشاء ایمان کہنے والوں کو دوسرا استدلال ابوداؤد کا ترجمہ باب المشرك يدخل المسجد ہے، ابوداؤد نے اس ترجمہ کے ذیل میں یہی ضمام بن ثعلبہ والی حدیث نقل فرمائی ہے، معلوم ہوا کہ ابوداؤد کی نظر میں ضمام مشرک تھے لیکن یہ استدلال بھی درست نہیں ہے، کیونکہ ترجمہ کا ثبوت ضمام کے شرک پر موقوف نہیں بلکہ صحابہ کی موجودگی میں ایک اجنبی انسان آتا ہے اور بے تکلف مسجد میں چلا آتا ہے، اسکے متعلق شرک و ایمان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے، اگر مشرک کا مسجد میں داخل ہونا ممنوع ہوتا تو داخل ہونے سے پہلے ہی اسے روک کر تفصیل معلوم کیجاتی کہ تم مومن ہو یا مشرک لیکن ایسا نہیں کیا گیا، معلوم ہوا کہ مسجد میں داخل ہونے والے کا مومن ہونا شرط نہیں، لہذا ابوداؤد کا ترجمہ اس پر مبنی نہیں بلکہ انکا مومن ہونا قرین قیاس ہے کیونکہ انہوں نے توحید کے دلائل نہیں طلب کئے بلکہ آپ کی رسالت اور ارکان کے بارے میں سوالات کئے پھر اگر یہ ایمان نہ لائے ہوتے تو انہیں معجزات وغیرہ طلب کرنے چاہئے تھے مگر انہوں نے اس سلسلہ کی کوئی بات نہیں کی۔

حج سے سکوت اور ابن التین کی لغزش | اس حدیث میں حج کا ذکر نہیں ہے، ابن التین نے اس بارے میں تحریر کیا ہے کہ حج چونکہ اس وقت تک فرض نہیں تھا اس لئے اس کا ذکر

روایت میں نہیں آیا لیکن یہ بات مختلف وجوہ کی بنا پر درست نہیں ہے، سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلم میں ضمام کی اسی روایت میں موسیٰ نے حج کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

وان علینا حج البيت من استطاع
اليه سبيلا
اور ہم میں اس شخص پر حج ہے جو زاد سفر کی
استطاعت رکھتا ہو

ممکن ہے ابن اتمین کی نظر میں یہ روایت بھی ہو لیکن انہیں دھوکا واقدی اور محمد بن حبیب کے اس خیال سے ہوا کہ ضمام کی آمد ۵ھ کی ہے اور حج کی فرضیت اس کے بعد ہے لیکن یہ واقدی کی تاریخی چوک ہے۔
مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ ضمام کی آمد سورہ مائدہ کی اس آیت نبی کے بعد ہے جس میں صحابہ کرام کو سوالات سے روک دیا گیا تھا، آیت کریمہ میں ہے۔

لا تسئلوا عن اشیاء ان تبدلکم
تسؤکم
ان چیزوں کے بارے میں مت پوچھو جو اگر تمہیں
بتلا دی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔

یہ آیت سورہ مائدہ کی ہے جس کا نزول مؤخر ہے اس لئے یہ کہنا کہ ضمام ۵ھ میں آئے درست نہیں ہے۔
دوسری بات یہ کہ ضمام کی حدیث میں یہ ذکر ہے کہ آپ کے فرستادہ نے یہ اور بیان کیا اور اس پر اتفاق ہے کہ قاصدوں اور دعوت ناموں کا سلسلہ صلح حدیبیہ کے بعد ہوا، اور بیشتر حصہ تفتح مکہ کے بعد، اگر صلح حدیبیہ کے بعد بھی مائیں تو یہ ۶ھ میں ہوئی ہے اس لئے ۵ھ کی آمد قرین قیاس نہیں۔

تیسری بات یہ کہ ضمام بحیثیت وفد آئے، ارشاد ہے ان قومہ اولاد وہ (قوم نے وفد بنا کر بھیجا تھا) اور وفود کی بیشتر آمد ۹ھ میں ہوئی اس لئے اسکا نام سنہ الوفود ہے، اس لئے یہ واقعہ ۵ھ کا نہیں ہو سکتا، علاوہ ازیں جب ضمام قوم کی طرف واپس ہوئے تو وہ ایمان لے آئے جیسا کہ ابن عباس کی حدیث میں ہے، قوم کونسی ہے؟ روایت میں ہے اخو بنی سعد بن بکر یعنی قبیلہ ہوازن کا ایک بطن بنو سعد، یہ لوگ فتح مکہ تک مسلمان نہ تھے، اس کے بعد مختلف غزوات ہوئے اسی میں غزوہ حنین پیش آیا، حنین کے بعد یہ لوگ مسلمان ہوئے؛ اسلئے ان کی آمد کے بارے میں واقدی اور ابن حبیب کا ۵ھ کا خیال غلط ہے، بلکہ ان کی آمد ۹ھ کی ہے جیسا کہ محمد ابن اسحاق اور ابو عبیدہ وغیرہ کی تحقیق ہے، اسی کی تائید طبرانی کی ابن عباسؓ والی روایت سے ہوتی ہے جس میں جاء رجل من بنی سعد بن بکر الی رسول اللہ ﷺ وکان مسترضعا فیہم، مسند احمد اور حاکم کے نزدیک ابن عباس کی اس روایت میں لقدم علینا کے الفاظ بھی ہیں، قدم علینا کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ ابن عباس بھی ان دنوں وہاں موجود تھے اور ابن عباس کا مدینہ آنا فتح مکہ کے بعد کی بات ہے۔

حاکم نے اس روایت سے عالی سند کے حصول کی فضیلت پر استدلال کیا ہے کیونکہ ضمام نے اپنے یہاں آپ کے قاصد کی زبانی یہ تمام باتیں حاصل کر لی تھیں لیکن پھر خود حاضر ہو کر بھی دریافت کیا، معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس کوئی روایت چند واسطوں سے ہے اور کسی شیخ کی اجازت سے ان واسطوں میں کمی آسکتی ہے تو ملاقات کر کے عالی سند حاصل کر لینی چاہئے لیکن حاکم کا یہ استدلال کمزور بلکہ خلاف واقعہ ہے کیونکہ ضمام علوئے سند کیلئے نہیں گئے بلکہ انہیں قوم نے وفد بنا کر بھیجا ہے اور بعض حضرات کے نزدیک تو ضمام خود بھی مسلمان نہیں ہیں، ہاں جہاں تک عالی سند کے حصول کا تعلق ہے وہ بات معقول اور اپنی جگہ ثابت ہے۔

امام بخاری کا مقصد ثابت ہے کہ ضمام آپ کے فرستادہ کی زبانی معلوم کی ہوئی باتوں کو دہراتے رہے اور آپ نے صرف تصدیق فرمائی اور پھر ان کے واپس ہونے کے بعد قوم نے ان کا اعتبار کیا اور سب ایمان لے آئے، معلوم ہوا کہ عرض و قراءت کا طریق بھی معتبر ہے۔

حافظ ابن حجر نے تحریر فرمایا ہے کہ امام بخاری نے موسیٰ بن اسماعیل کی روایت کا موصولاً ذکر اس لئے نہیں کیا کہ امام بخاری کے نزدیک موسیٰ کے استاد سلیمان ابن المغیرہ لائق احتجاج اور ان کی شرائط پر پورے نہیں لیکن علامہ عینی نے اس پر گرفت کی اور حق یہ ہے کہ ان کی گرفت درست اور معقول ہے، فرماتے ہیں کہ حافظ کا یہ فرمانا اس لئے صحیح نہیں ہے کہ خود امام بخاری نے ابواب السترہ میں ان سے احتجاج کیا ہے یعنی ان کے طریق سے روایت لائے ہیں اور پھر اس کی تائید میں کوئی دوسری روایت پیش نہیں کی، نیز یہ کہ امام احمد نے ان کے بارے میں ثَبْتُ، ثَبْتُ، ثَقَّةٌ، ثَقَّةٌ، کے الفاظ استعمال کئے ہیں، ابن سعد نے انہیں ثَقَّةٌ ثَبْتُ کہا ہے اور شعبہ نے انہیں سید اہل البصرہ فرمایا ہے ابوداؤد طیالسی نے کان من خیار الناس فرمایا ہے۔

حَدَّثَنَا مُوسَى بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ ثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ الْمُغِيرَةِ قَالَ ثَنَا ثَابِتٌ عَنْ أَنَسٍ قَالَ لَهَيْنَا فِي الْقُرْآنِ أَنْ نَسْأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَكَانَ يُعْجِبُنَا أَنْ يَجْثِيَ الرَّجُلُ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ الْعَاقِلُ فَيَسْأَلُهُ وَنَحْنُ نَسْمَعُ فَجَاءَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْبَادِيَةِ فَقَالَ أَتَانَا رَسُولُكَ فَاخْبِرْنَا أَلَيْكَ تَزَعَمُ أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ أَرْسَلَكَ قَالَ صَدَقَ فَقَالَ فَمَنْ خَلَقَ السَّمَاءَ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ فَمَنْ خَلَقَ الْأَرْضَ وَالْجِبَالَ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ فَمَنْ جَعَلَ فِيهَا الْمَنَافِعَ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ قَالَ فَبِالَّذِي خَلَقَ السَّمَاءَ وَخَلَقَ الْأَرْضَ وَنَصَبَ الْجِبَالَ وَجَعَلَ فِيهَا الْمَنَافِعَ اللَّهُ أَرْسَلَكَ قَالَ نَعَمْ قَالَ زَعَمَ رَسُولُكَ أَنْ عَلَيْنَا خُمْسَ صَلَوَاتٍ وَزَكَاةٍ فِي أَمْوَالِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ بِالَّذِي أَرْسَلَكَ اللَّهُ أَمَرَكَ بِهَذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنْ

اپنی روایت معری نسخہ میں نہیں ہے اس لئے اس پر حدیث نمبر نہیں ڈالا گیا ہے۔ ۱۲

عَلَيْنَا صَوْمَ شَهْرِي سَنَتِنَا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبَالِدِي أَرْسَلَكَ اللَّهُ أَمْرَكَ بِهَذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ
وَزَعَمَ رَسُولُكَ أَنَّ عَلَيْنَا حِجَّ الْبَيْتِ مَنْ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا قَالَ صَدَقَ قَالَ فَبَالِدِي
أَرْسَلَكَ اللَّهُ أَمْرَكَ بِهَذَا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَوَالِدِي بَعَثَكَ بِالْحَقِّ لَا أَرِيدُ عَلَيْهِمْ شَيْئًا وَلَا
الْقَصُّ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ إِنْ صَدَقَ لَيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ.

ترجمہ | حضرت انسؓ سے روایت ہے، فرمایا کہ ہم کو قرآن کریم میں رسول اکرم ﷺ سے سوالات کرنے سے منع فرمادیا گیا اور ہمیں یہ بات پسند تھی کہ کوئی ہوشیار بدوی آئے اور آپ سے سوالات کرے اور ہم سنیں چنانچہ ایک بدوی آیا اور اس نے کہا کہ ہمارے پاس آپ کا فرستادہ پہونچا اور اس نے ہمیں خبر دی، آپ کہتے ہیں کہ اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے، آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا، پھر اس نے سوال کیا کہ آسمان کس نے پیدا کیا، آپ نے فرمایا اللہ عزوجل نے، اس نے کہا زمین اور پہاڑ کس نے پیدا کئے؟ آپ نے فرمایا اللہ عزوجل نے، اس نے کہا ان چیزوں میں منافع کس نے ودیعت فرمائے؟ آپ نے فرمایا اللہ عزوجل نے، اس نے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا اور جس نے پہاڑوں کو نصب کیا اور اس نے ان چیزوں میں منافع رکھے، کیا آپ کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ آپ نے فرمایا، ہاں، اس شخص نے کہا کہ آپ کے قاصد نے یہ بتلایا کہ ہم پر پانچ نمازیں اور مالوں میں زکوٰۃ واجب ہے، آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا، قاصد نے کہا، قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو رسول بنا یا کیا آپ کو اللہ نے اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! قاصد نے کہا آپ کے فرستادہ نے بتلایا کہ ہم پر سال میں ایک ماہ روزے ہیں، آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا، اس نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو رسول بنایا، کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا جی ہاں، اس نے کہا کہ آپ کے قاصد نے یہ بتلایا کہ اس شخص پر حج بھی ہے جو زاد سفر کی استطاعت بھی رکھتا ہو، آپ نے فرمایا اس نے سچ کہا، اس نے کہا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو رسول بنایا کیا اللہ نے آپ کو اس چیز کا حکم دیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں، پھر اس نے کہا قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا میں ان باتوں پر نہ کچھ زیادہ کروں گا اور نہ کم کروں گا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اگر اس نے دعویٰ کو سچ کر دکھایا تو ضرور داخل جنت ہوگا۔

تشریح حدیث | صنعانی نے کہا ہے کہ یہ حدیث بخاری کے تمام نسخوں میں نہیں ہے صرف اسی نسخہ میں ہے جو فربری سے منقول ہے، فربری امام بخاری کے بلا واسطہ شاگرد ہیں، بہر کیف حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ قرآن کریم میں ہمیں سوال کرنے سے روک دیا گیا تھا، بیکار سوالات سے روکا گیا لیکن بیکار اور کارآمد کی تمیز کون کرے، اس لئے مطلق سوالات ہی بند ہو گئے، لیکن ابھی ایک راستہ تھا کہ باہر کا کوئی سمجھ دار شخص آ کر ایسے سوالات کرے جس سے معلومات میں اضافہ ہو، چونکہ وہ شخص باہر کا ہوگا اس لئے اس پر آداب مجلس کی پابندی نہ ہوگی، انکی

خواہش کے مطابق ایک شخص آیا اور اس نے سوالات کئے اور ایک بادیہ نشین کا جہاں تک خیال پہنچ سکتا ہے وہاں تک اس نے قسمیں بھی دیں، زمین، آسمان، پہاڑ اور منافع کا حوالہ دیکر قسمیں دیں اور ایک ایک چیز کو الگ کر کے پوچھ لیا اور جب اطمینان ہو گیا تو امانت کہا اس کی بحث گزر چکی ہے۔

حدوث عالم کا اثبات | ضمام کے سوال اور آپ کے ارشادات سے زمین، آسمان اور جہاں و منافع کا مخلوق ہونا ثابت ہو گیا، پیغمبر علیہ السلام کے اس ارشاد سے حدوث عالم ثابت ہو گیا، اسلئے فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص عالم کو قدیم مانتا ہے تو وہ کافر ہے کیونکہ حدوث عالم تو اتر سے ثابت ہے، آپ نے اس کے بے کم و کاست عمل کرنے کی قسم پر اس کے لئے دخول جنت کی بشارت دی، کیونکہ اگر بالفرض وہ صرف انہیں تعلیمات پر اکتفاء کر رہا ہے اور سنن و نوافل کو شامل نہیں کر رہا ہے تب بھی دخول جنت کے لئے تو کافی ہے، دخول جنت کے مختلف درجات ہیں، مطلق دخول جنت کے لئے ایمان بھی کافی ہے۔

ترجمہ سے ربط | امام بخاری کا ترجمہ اس روایت سے بھی ثابت ہے کہ ضمام نے فرستادہ سے معلوم کی ہوئی باتوں کو دہرایا اور آپ نے صرف تصدیق فرمائی، معلوم ہوا کہ شیخ کا زبان سے بیان کرنا ہی ضروری نہیں بلکہ شاگرد پڑھے اور شیخ تصدیق کر دے تو یہ بھی معتبر ہے۔

[۷] بَابُ مَا يُذَكَّرُ فِي الْمُنَاوَلَةِ وَكِتَابِ أَهْلِ الْعِلْمِ بِالْعِلْمِ إِلَى الْبُلْدَانِ

وَقَالَ أَنَسُ نَسَخَ عُثْمَانُ الْمَصَاحِفَ فَبَعَثَ بِهَا إِلَى الْأَفَاقِ وَرَأَى عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عُمَرَ وَيَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ وَمَالِكٌ ذَلِكَ جَائِزاً وَاحْتَجَّ بَعْضُ أَهْلِ الْحِجَازِ فِي الْمُنَاوَلَةِ بِحَدِيثِ النَّبِيِّ ﷺ حَيْثُ كَتَبَ لِأَمِيرِ السَّرِيَّةِ كِتَاباً وَقَالَ لَا تَقْرَأْهُ حَتَّى تَبْلُغَ مَكَانَ كَذَا وَكَذَا فَلَمَّا بَلَغَ ذَلِكَ الْمَكَانَ قَرَأَهُ عَلَى النَّاسِ وَأَخْبَرَهُمْ بِأَمْرِ النَّبِيِّ ﷺ .

ترجمہ | باب، جو چیز مناوالت کے بارے میں ذکر کی جاتی ہے اور اہل علم کا شہروں میں علم کی بات لکھ کر بھیجنا۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ حضرت عثمان نے مصاحف کی کتابت کرائی اور انہیں آفاق میں بھیج دیا، عبد اللہ بن عمر صحیح بن سعید اور امام مالک کے نزدیک یہ جائز ہے، بعض اہل حجاز نے مناوالت کے بارے میں رسول اکرم ﷺ کی حدیث سے استدلال کیا ہے، جبکہ آپ نے امیر لشکر کو ایک مکتوب دیا اور فرمایا کہ جب تک فلاں مقام تک نہ پہنچ جاؤ اسے نہ پڑھنا چنانچہ جب وہ اس مقام پر پہنچ گئے تو وہ مکتوب لوگوں کو پڑھ کر سنایا اور انہیں رسول اکرم ﷺ کے علم کی اطلاع دی۔

مقصد ترجمہ | امام بخاری کا مقصد مناوہ کا اثبات ہے، پہلے دو طریق گزر چکے ہیں جن میں پہلا طریق تو بلا اختلاف حجت ہے، دوسرے طریق میں تھوڑا سا ناقابل اعتبار اختلاف ہے، اب مناوہ کا تیسرا طریق پیش کر رہے ہیں، اسکی صورت یہ ہے کہ شیخ تلمیذ کو روایت یا کتاب دیکر یہ کہتا ہے کہ میں نے یہ روایتیں فلاں شیخ سے سنی ہیں یا یہ میری تصنیف ہے، میں تمکو اجازت دیتا ہوں کہ تم اس کتاب کی روایات کو میری سند کیساتھ بیان کرو، اسے مناوہ مقرونہ بالا جازا کہا جاتا ہے، یہ عرض کہ دو صورتوں میں سے ایک صورت ہے، یعنی ایک عرض قراءت اور ایک عرض مناوہ، اسمیں بھی اگرچہ تھوڑا سا اختلاف ہے لیکن جمہور کے نزدیک یہ حجت ہے، گودر جہ میں تحدیث و اخبار سے کم ہے، البتہ اسمیں اختلاف ہوا ہے کہ مناوہ کے طریق میں متعلم کو اس کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ حدیث اور اخبارنا جیسے الفاظ بلا قید استعمال کرے یا نہیں بلکہ ناولسی الشیخ ہکذا یا اخبارنی الشیخ مناوہ کی تصریح ضروری ہے تاکہ سننے والے کو درجہ کی بھی تعیین ہو جائے۔

بعض حضرات کا فیصلہ ہے کہ حدیثنا اور اخبارنا کا استعمال کر سکتا ہے قید کی ضرورت نہیں، یہ قول ایوب سختیانی کی طرف منسوب ہے۔

دوسرا طریقہ کتاب اهل العلم بالعلم کا ہے، یعنی شیخ شاگرد کے پاس تحریر بھیجتا ہے اور اس میں روایات لکھتا ہے اور کہتا ہے اذا وصلک کتابی فاروہ غنی یعنی تم ان روایات کو میری سند سے بیان کر سکتے ہو لیکن اس صورت میں شاگرد کو کتابنی یا حدیثنا کتابۃ کی تصریح کے ساتھ بیان کرنا ہوگا۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد | مقصد ترجمہ کے سلسلہ میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے ارشاد فرمایا کہ امام بخاری قراءت و عرض کے بعد اب مناوہ کا اثبات فرمانا چاہتے ہیں لیکن مناوہ اصطلاحی کے لئے کوئی صریح دلیل ان کے پاس موجود نہیں ہے اسلئے استدلال کے دائرہ کو وسیع کرنیکی غرض سے اس کے مناسب اور مشابہ دوسرا ترجمہ کتاب اهل العلم بالعلم الی البلدان منعقد کر کے مسند حدیثیں ذکر فرمائیں جو ترجمہ ثانی پر صریح دال ہیں مگر مقصود اصلی ان سب سے ترجمہ اولی کا اثبات ہے، متعدد مواقع پر ایسا عمل موجود ہے گما لا یخفی علی الناظرین .

امام بخاری قدس سرہ نے اس کے لئے چند دلیلیں بیان فرمائی ہیں، ایک یہ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصاحف کو نقل کر کے بلاد اسلامیہ میں بھیجا اور ہدایت فرمائی کہ اسی کے مطابق مصاحف کی نقل کی جائے اور اسی پر عمل کیا جائے، حضرت عثمان نے مصاحف لکھوا کر بلاد اسلامیہ میں بھیج انکی تعداد میں اختلاف ہے، کسی نے کہا کہ حضرت عثمان نے پانچ نقلیں کرائیں اور ایک ایک نسخہ شام، حجاز، یمن اور بحرین میں بھیج دیا، ایک نقل اپنے پاس رکھ لی، ابو عمرو دانی نے کہا کہ چار نقلوں پر اکثر علماء متفق ہیں جن میں ایک شام، ایک کوفہ اور ایک بصرہ بھیجا اور چوتھا اپنے پاس رکھ لیا لیکن

ابو حاتم بستانی نے سات نقلیں بتلائی ہیں اور کہا ہے کہ مکہ، شام، یمن، بحرین، بصرہ، کوفہ میں ایک ایک مصحف بھیجا، نسخے جتنے بھی ہوں، بہر کیف یہ ثابت ہو گیا کہ ارسال کتب کا طریقہ بھی ایک معتبر طریقہ ہے۔ اور جب قرآن کریم کے سلسلہ میں مکاتبت کا طریق مستند اور حجت ہو سکتا ہے تو حدیث کے بارے میں بدرجہ اولیٰ معتبر ہونا چاہیے۔

بعض حضرات نے کہا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے کتابت کی صورت معین فرمائی ہے ورنہ اصل قرآن تو تو اتر سے ثابت ہے، یاد رکھیے جہاں تک ترتیب کا تعلق ہے وہ تو عہد نبوی میں مکمل ہو چکا تھا، ہر آیت کے نزول پر کاتب وحی کو بلا کر ارشاد فرمایا جاتا کہ یہ آیت فلاں سورۃ سے متعلق ہے اور فلاں آیت کے بعد اس کی کتابت کی جائے، کاتب وحی حسب ہدایات نبوی آپ کے سامنے اسکی کتابت کرتا، البتہ یہ کتابت مختلف چیزوں پر ہوتی تھی، باریک پتھر کی تختیاں، شانہ کی ہڈیاں، کھجور کے پوست کا قابل کتابت اندرونی حصہ، اوراق وغیرہ، یہ تمام چیزیں مافیہ الکتابہ رہی ہیں، غرض سورۃ سورۃ کے یہ تمام منتشر قطعات علیحدہ علیحدہ محفوظ رکھے جاتے تھے۔ عہد صدیقی میں ہر سورۃ کے انہیں منتشر قطعات کو یکجا کر دیا گیا اب ہر ہر سورۃ پوری پوری یکجا مکتوب ہو کر محفوظ ہو گئی تا اینکه حضرت عثمانؓ کا دور خلافت آیا اور حضرت حذیفہؓ نے بعض غزوات میں مختلف طریقوں پر قراءت کرنے والوں کے باہمی جدال و محاصمت کو دیکھا تو حضرت عثمانؓ سے اپنے تاثرات اور آئندہ حالات کے پیش نظر اس پر زور دیا کہ اب قرآن کو لغت قریش پر جس پر اصل قرآن عزیز کا نزول ہوا ہے جمع کر دیا جائے اور ان عارضی توسعات کو ختم کر کے صورت مکتوب معین کر دی جائے تاکہ اختلافات کا کلی طور پر سد باب ہو جائے؛ چنانچہ حضرت عثمانؓ نے صحابہ سے وہ تمام مختلف مصاحف منگوائے اور وہ مصحف بھی جو حضرت حفصہؓ کے پاس عہد صدیقی کا جمع شدہ تھا منگوا لیا اور اسی کے مطابق ایک جماعت قراء اور حفاظ کو اس خدمت کے لئے منتخب فرما کر تمام سورتوں کو رسم الخط کی تعین کیسا تھ یکجا جمع کر دیا، اسی کی نقول کر کے مختلف بلاد اسلامیہ بھجوا دیں۔

ورای عبد اللہ بن عمر و بحی بن سعید و مالک جازراً، یہ ایک دوسری دلیل ہے کہ حضرت عبد اللہ، یحییٰ بن سعید اور مالک مناوہ کے جواز کے قائل ہیں، عبد اللہ بن عمر سے اغلب یہ ہے کہ عبد اللہ بن عمر عمری مراد ہیں کیونکہ بخاری کے تمام نسخوں میں یہ لفظ بغیر واو کے لکھا ہوا ہے، پھر یہ عمر بن حفص العین بھی ہے اسلئے یہ یا تو عبد اللہ بن عمر ہوئے، حضرت عمر کے صاحبزادے یا عبد اللہ بن عمر عمری ہوئے یعنی عبد اللہ بن عمر ابن عاصم ابن عمر بن الخطاب، حضرت عمر کے پڑپوتے لیکن حضرت عبد اللہ بن عمر سے مناوہ کے سلسلہ میں اس قسم کی کوئی نقل منقول نہیں ہے اس لئے متبادر یہی ہے کہ یہ عبد اللہ بن عمر عمری ہیں۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کے نزدیک یہ حسن کے درجہ کے راوی ہیں، امام ترمذی نے کتاب الحج میں ان کی حدیث کی تحسین فرمائی ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی ان کا نام مقام احتجاج میں ذکر کیا اس سے معلوم ہوا کہ یہ عبد اللہ امام

بخاری کے نزدیک بھی قابل احتجاج ہیں، احناف کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ امام بخاری انہیں ضعیف نہیں مانتے، یہ عبد اللہ عمری حدیث ذوالیدین کے راوی ہیں اور احناف ان سے استدلال کرتے ہیں۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ چونکہ احناف کے ساتھ رواداری برتنا نہیں چاہتے اس لئے کوشش فرماتے ہیں کہ یہ کسی طرح عمری ثابت نہ ہوں بلکہ یا عبد اللہ ابن عمر ہوں یا عبد اللہ بن عمرو بن العاص، چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں ان عبد اللہ بن عمر کو عمری مدنی ہی خیال کرتا تھا لیکن ان کا بچہ بن سعید پر مقدم ذکر کرنا ہلتا ہے کہ یہ بھٹی سے قدر و منزلت میں زیادہ ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے اسلئے یہ عبد اللہ ابن عمر عمری نہیں ہیں، پھر کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے تلاش شروع کی تو عبد اللہ ابن عمر سے صراحتاً تو کچھ نہ مل سکا البتہ ابوالقاسم بن مندہ نے کتاب الوصیۃ میں امام بخاری کے طریق سے عبد الرحمن مٹھلی سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ احادیث کی کوئی کتاب لیکر حضرت عبد اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ آپ اس کتاب کو دیکھ لیجئے جو حدیثیں اس میں معروف ہوں انہیں رہنے دیجئے اور جنہیں آپ غیر معروف سمجھیں انہیں قلم زد فرما دیجئے۔

اس کے بعد حافظ کہتے ہیں کہ عبد الرحمن حبلی نے چونکہ ”عبد اللہ“ مطلق ذکر فرمایا ہے اس لئے اس سے مراد عبد اللہ ابن عمر بھی ہو سکتے ہیں، اور عبد اللہ ابن عمرو بن العاص بھی۔ کیونکہ حبلی نے ابن عمر سے بھی احادیث سنی ہیں اور ابن العاص کے سلسلہ میں تو وہ معروف الروایۃ ہیں ہی۔ لیکن حافظ ابن حجر کی اس پوری گفتگو سے علامہ عینی راضی نہیں ہیں، فرماتے ہیں بچی سے قبل ذکر کرنا ہرگز اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ عمری نہیں ہیں بلکہ اس کی مختلف وجوہ ہو سکتی ہیں، دوسرے یہ کہ حبلی کا ”عبد اللہ“ مطلق ذکر کرنا اصطلاح کے اعتبار سے یہ ہلتا ہے کہ مراد عبد اللہ ابن مسعود ہیں، تیسرے یہ کہ عبد اللہ بن عمرو بن العاص تو کسی بھی صورت مراد ہو ہی نہیں سکتے کیونکہ یہاں واؤند کو نہیں ہے اس لئے اغلب تو یہی ہے کہ اس سے مراد عبد اللہ بن عمر عمری ہیں، ہاں دوسرا احتمال حضرت عبد اللہ بن عمر کا ضرور باقی ہے۔ واللہ اعلم

حمیدی کا استدلال | حمیدی شیخ بخاری نے مناوہ کے جواز پر ایک روایت سے استدلال کیا ہے جو یہاں مختصر ہے مگر دوسری جگہوں پر مفصل ہے اور مسند اور مرسل دونوں طریقوں سے ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عبد اللہ ابن جحش کو ایک چھوٹی سی جماعت کا امیر بنایا انکی تعداد بارہ تھی اور ایک خفیہ تحریر عنایت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ دو دن کی مسافت کے بعد اس کو کھولنا اور ساتھیوں کو پڑھ کر سنانا اور اسی پر عمل کرنا لیکن مجبور کسی کو نہ کرنا، مقام معبود پر پہنچ کر جب تحریر کھولی گئی تو اس میں یہ ہدایت تھی کہ نخلہ کی زمین میں جو مکہ اور طائف کے ماہین ہے، اتر کر قریش کا حال معلوم کیا جاوے اور ہمیں اسکی اطلاع کی جائے، یہ واقعہ جمادی الثانی قبل بدر ۲ھ کا ہے اس سے مناوہ کا اثبات ہو گیا لیکن یہ صورت اصطلاحی مناوہ کی نہیں ہے کیونکہ روایت کا سلسلہ نہ تھا، البتہ پیغمبر علیہ السلام نے تحریر دی، نہ پڑھ کر سنائی اور نہ مضمون بتلایا البتہ تحریر دیکر یہ فرمایا کہ فلاں مقام پر پہنچ کر یہ تحریر اپنے ساتھیوں کو

شاووتا کہ وہ اس کے مطابق عمل کریں، لہذا یہ مناوہ مقرون بالا جازۃ کی صورت ہوگئی اور اس میں مکاتبہ کے معنی بھی موجود ہیں، حضرت انسؓ کی روایت کو ترجمہ کے ساتھ اس طرح مناسبت ہے کہ اسمیں آپ نے بسلسلہ تبلیغ دنیوی حکمرانوں کے نام خطوط بھیجنے کا قصد فرمایا جس سے مکاتبہ کا حجت ہونا کھلے طور پر ثابت ہو گیا لیکن چونکہ ان حضرات کے نزدیک غیر مہر زدہ تحریر اس قابل نہ سمجھی جاتی تھی کہ اسے دیکھا بھی جائے چہ جائیکہ اس پر عمل بھی ہو، اس ضرورت کے پیش نظر چاندی کی ایک مہر جس پر ”محمد رسول اللہ“ کندہ تھا بنوائی گئی۔

اس حدیث کے نقل کرنے سے امام کا مقصد یہ ہے کہ کتاب اهل العلم بالعلم الى البلدان میں اعتبار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ تحریر شبہات سے پاک ہو، یعنی وہ تحریر مہری ہو، لیجانے والا معتمد ہو اور مکتوب الیہ کاتب کا خط اچھی طرح پہنچاتا ہو، غرض تحریر کے متعلق رد و بدل کا واہمہ باقی نہ رہے، لیکن اس قید کے بعد کہ حامل تحریر معتبر ہو مہر کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

رہا الخط يشبه الخط تو حضرت علامہ کشمیریؒ کی تحقیق کے مطابق اس کا تعلق دعاوی سے ہے دوسرے اور معاملات سے نہیں، یعنی اگر عدالت میں کوئی شخص کسی کو اپنا مدیون بتلائے اور ثبوت میں مدعی علیہ کا اقراری خط پیش کر کے چاہے کہ عدالت اس تحریر کی بناء پر اسکو ملزم قرار دیکر مدعی کی ڈگری کر دے تو ایسا نہ ہو سکے گا، بلکہ یا تو مدعی گواہ پیش کرے ورنہ مدعی علیہ سے قسم لی جائے، اس کے بغیر عدالت سے فیصلہ حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں، ورنہ دنیا کے تمام کاروبار تحریر پر چل رہے ہیں، بیع و شراء، نکاح و طلاق وغیرہ میں تحریروں کا اعتبار مسلم ہے، پھر جس طرح خط جعلی ہو سکتا ہے مہر بھی جعلی ہو سکتی ہے۔

رہا یہ کہ مناوہ اور مکاتبہ میں کون راجح اور کون مرجوح ہے تو مناوہ کو بعض حضرات نے اس لئے راجح کہا ہے کہ یہ زور و زکا معاملہ ہے اور مکاتبہ میں ایسا نہیں بلکہ مکتوب الیہ غائب ہوتا ہے مگر دوسری وجہ راجحان مکاتبہ میں ہے کہ شیخ تلمیذ ہی کے لئے روایات لکھتا ہے، اس لئے وہ روایات جو خاص تلمیذ کیلئے لکھی گئی ہیں وہ راجح ہیں۔

(۶۴) حَدَّثَنَا اسْمَعِيلُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ قَالَ حَدَّثَنِي ابْنُ أَبِي هَانِئٍ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحِ بْنِ ابْنِ

شِهَابٍ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ أَنَّ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَبَّاسٍ أَخْبَرَهُ أَنَّ رَسُولَ

اللَّهِ ﷺ بَعَثَ بِكِتَابِهِ رَجُلًا وَأَمَرَهُ أَنْ يَدْفَعَهُ إِلَى عَظِيمِ الْبَحْرَيْنِ فَدَفَعَهُ عَظِيمُ الْبَحْرَيْنِ إِلَى

كِسْرَى فَلَمَّا قَرَأَهُ مَرَّقَهُ فَحَسِبْتُ أَنَّ ابْنَ الْمُسَيَّبِ قَالَ فَدَعَا عَلَيْهِمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ إِنَّ

(آئندہ: ۲۹۳۹، ۲۴۲۴، ۲۶۶۴)

يُمَزَّقُوا كُلُّ مُمَزَّقٍ .

ترجمہ | عتبہ ابن مسعود سے روایت ہے کہ انہیں حضرت ابن عباسؓ نے یہ بتلایا کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنا مکتوب گرامی ایک شخص کو عنایت فرمایا اور انہیں یہ حکم دیا کہ عظیم البحرین کو اسے دیدیں چنانچہ عظیم البحرین

نے آپ کا مکتوب کسری تک پہنچا دیا جب کسری نے اسے پڑھا تو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، ابن شہاب کا بیان ہے کہ مجھے یہ خیال ہے کہ ابن مسیب نے یہ بھی فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے ان لوگوں کے لئے حکومت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کی بددعا فرمائی۔

تشریح حدیث | نبی اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد شاہان عالم کے نام تبلیغی خطوط روانہ فرمائے، ان میں عبداللہ ابن حذافہ سہمی کو جو مکتوب عنایت کیا گیا اس کا تعلق کسری سے تھا، ہدایت یہ کی گئی کہ بحرین کے گورنر منذر بن ساوی کو یہ تحریر پہنچادیں چنانچہ عظیم بحرین نے وہ تحریر کسری تک پہنچا دی۔ کسری کی حکومت زمین کے سب سے وسیع حلقہ پر حاوی تھی، پنجاب سے لیکر مصر تک اسکی حکومت شامل تھی، ہزاروں برس سے حکومت قائم چلی آرہی تھی، یہ زمانہ خسرو پرویز کا ہے، جب آں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا فرمان گرامی اس کے پاس پہنچا تو وہ عرب کے دستور کے مطابق خود آں حضور کے نام گرامی سے شروع ہوتا تھا یعنی من محمد رسول اللہ الی عظیم فارس الخ اسے یہ بات ناگوار ہوئی کہ میرے نام سے ابتداء کیوں نہیں ہے اور اس نے غصہ میں آپ کا فرمان چاک کر دیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ یمن کے گورنر باذان کو حکم بھیجا کہ تم اپنے یہاں سے دو بہادر آدمی عرب بھیج دو تا کہ وہ اس نبی کے احوال سے مجھے باخبر کریں اور زہری کے بیان کے مطابق یہ تحریر بھیجی کہ تم خود جا کر اس شخص کو میرے بارے میں سمجھاؤ، اگر وہ باز آجائے تو اچھا ہے ورنہ معاذ اللہ اس کا سر قلم کر کے میرے پاس بھیج دو، چنانچہ باذان نے آنحضور ﷺ کے پاس اپنی تحریر بھیجی، آنحضور ﷺ نے جواب میں یہ تحریر فرمایا کہ خداوند قدوس نے فلاں وقت اور دن مجھ سے کسری کا کام تمام کر دینے کا وعدہ فرمایا ہے، تحریر پہنچنے پر باذان نے یہ سوچا کہ اگر آپ واقعہ نبی ہیں تو کسری اس مقرر کردہ وقت میں ضرور انتقال کر جائیگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وقت موعود پر اس کا قضیہ تمام ہو گیا، اس شہادت صادقہ کی وجہ سے باذان نے اپنے اور اپنے دوسرے فارسی رفقاء کے اسلام کی اطلاع آنحضور ﷺ کو بھیجی۔

جب حضور اکرم ﷺ کو کسری کے مکتوب گرامی کو چاک کر دینے کی اطلاع پہنچی تو آپ نے بددعا فرمائی کہ الہی جس طرح اس نے میرا مکتوب پرزے پرزے کیا ہے اسی طرح اسکی حکومت کے پرزے ہو جائیں؛ چنانچہ چند ہی سال میں کسری کی حکومت کا تختہ الٹ گیا اور کسری نام کی حکومت دنیا کے پردے سے معدوم ہو گئی، اذا اهلك کسری فلا کسری بعدہ صورت یہ پیش آئی کہ پرویز کالڑ کا شیر و بیہ اپنی مائند پر عاشق ہو گیا اور اس نے یہ سوچا کہ مائند کو جسکا نام شیریں تھا حاصل کرنیکی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ باپ کو قتل کر دے، دوسری لطیفہ کی یہ بات پیش آئی کہ باپ کو بیٹے کے ان خطرناک ارادوں کی اطلاع مل چکی تھی؛ اسلئے اس نے زہر کی ڈبیا پر قوت باہ کا نام لکھ کر اپنے مخصوص خزانہ میں رکھ دیا تا کہ بیٹا بھی زندہ نہ رہ سکے، چنانچہ اس کی ترکیب کامیاب رہی، شیر و بیہ نے قوت باہ کیلئے وہ

زہر کھالیا اور مر گیا، اس کے بعد سلطنت کے معاملات اس کی بیٹی کے سپرد کئے گئے، وہ اس وسیع سلطنت کا انتظام نہ کر سکی، طوائف الملو کی شروع ہو گئی، نتیجہ وہی ہوا جو ایک عورت کے ہاتھ زمام سلطنت دینے کا ہوا کرتا ہے، خلافت عثمانی میں سلطنت کا نام و نشان تک مٹ گیا، اتنی عظیم الشان حکومت پارہ پارہ ہو گئی اور ان کا آخری شہنشاہ یزدجرد جنگلات میں چھپا چھپا پھرتا تھا کہ مبادا کوئی پہچان نہ لے، ایک گڈریہ کے لباس میں حمام میں چھپا ہوا تھا وہیں پکڑا گیا اور قتل کر دیا گیا۔

دوسری عظیم سلطنت رومیوں کی تھی ان کا شہنشاہ قیصر کہلاتا تھا، انہوں نے چونکہ گرامی نامہ کا احترام کیا تھا اس لئے رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان کی حکومت قرن بعد قرن چلے گی، حضرت عمر کے زمانہ میں گوشام سے یہ حکومت ختم ہو گئی مگر جزیرے میں اس کا نام چلتا رہا اور ایک چھوٹی سی حکومت قائم رہی، کئی صدی کے بعد مسلمانوں کا نمائندہ یہاں پہنچا تو ان لوگوں نے کہا کہ ہم تم کو ایسی چیز کی زیارت کراتے ہیں جس کا تم کو شوق ہو گا چنانچہ ان لوگوں نے سونے کی صندوقچی نکالی اور اس میں سے جواہرات کا قلمدان نکالا اور آپ کا دعوتی خط نکالا کہ یہ تمہارے نبی کی تحریر ہے جو یہاں بڑی حفاظت سے چلی آرہی ہے اور جب تک یہ ہمارے یہاں محفوظ رہیگی ہمارا ملک بھی محفوظ رہیگا، بہر حال لسان نبوت سے دونوں عظیم حکومتوں کے بارے میں جو کلمات نکلے تاریخ نے اس کا ثبوت پیش کر دیا۔

ترجمہ و حدیث کا ارتباط | حدیث باب ترجمہ کے دونوں اجزاء کیساتھ پوری طرح منطبق ہے، مناوولہ تو یہ اس وجہ سے ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے عبد اللہ بن حذافہ سہمی کو مکتوب گرامی دے کر یہ حکم دیا کہ وہ عظیم البحرین کو یہ بتادیں کہ یہ مکتوب رسول اللہ ﷺ کا ہے حالانکہ عبد اللہ نے نہ مکتوب سنا تھا اور نہ پڑھا تھا، اسی کا نام مناوولہ ہے۔

رہا ترجمہ کا دوسرا جز کتاب اہل العلم بالعلم الی البلدان تو اس کا انطباق بالکل ظاہر ہے لیکن سچ یہ ہے کہ حدیث جزء اول سے پوری منطبق نہیں کیونکہ اسمیں مناوولہ اصطلاحی کی صورت نہیں بنتی اسلئے اثبات ترجمہ میں حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ارشاد ہی بے تکلف نظر آتا ہے اور اس جیسے تمام مواقع میں حضرت کا یہی اصول کار فرما ہے کہ جہاں ترجمہ کا دامن تنگ ہوتا ہے وہاں امام بخاری اس کے ساتھ دوسرا ترجمہ لگا کر یہی صورت کرتے ہیں، اسی کے قریب حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد ہے فرماتے ہیں مصنف نے ترجمہ میں دو امر ذکر فرمائے مناوولہ اور کتاب اہل العلم الخ پھر باب کی پیش کردہ حدیث سے ترجمہ کا دوسرا جزء ثابت کیا جس سے جزء اول کا ثبوت بطریق اولیٰ نکل آیا۔

(۶۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللَّهِ قَالَ أَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسِ

بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ كَتَبَ النَّبِيُّ ﷺ كِتَابًا أَوْ أَرَادَ أَنْ يَكْتُبَ فَقِيلَ لَهُ إِنَّهُمْ لَا يَقْرَأُونَ

كِتَابًا اَلَا مَخْتُوْمًا فَاتَّخَذَ خَاتِمًا مِنْ فِضَّةٍ نَقَشَهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ كَاتِبًا اَنْظُرْ اِلَى بَيَاضِهِ
فِي يَدِهِ فَقُلْتُ لِقَتَادَةَ مَنْ قَالَ نَقَشَهُ مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ اَنْسُ.

(آئندہ: ۲۹۳۸، ۵۸۷۰، ۵۸۷۲، ۵۸۷۴، ۵۸۷۵، ۵۸۷۷، ۵۸۷۸، ۷۱۲۲)

ترجمہ | حضرت انسؓ بن مالک کا بیان ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے مکتوب گرامی لکھایا لکھنے کا ارادہ فرمایا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ یہ اہل عجم صرف مہر شدہ مکتوب پڑھتے ہیں چنانچہ آپ نے چاندی کی انگٹھی بنوائی جس پر محمد رسول اللہ نقش تھا، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ گویا میں آپ کے دست مبارک میں اس انگٹھی کی چمک دیکھ رہا ہوں، پھر میں (شعبہ) نے قتادہ سے پوچھا کہ یہ کس نے بتلایا کہ اس کا نقش محمد رسول اللہ تھا فرمایا انسؓ نے۔

تشریح حدیث | جب آپ نے سلاطین عالم کے نام تبلیغی فرامین بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو عرض کیا گیا کہ جب تک تحریر مہر شدہ نہیں ہوتی اس وقت تک یہ لوگ ہاتھ نہیں لگاتے اور چونکہ مقصد ان لوگوں کو دعوت پہنچانا ہے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ وہ مکتوب پڑھیں تو اس ضرورت کے ماتحت چاندی کی انگٹھی بنوائی گئی۔ معلوم ہوا کہ ضرورت ہو تو چاندی کی انگٹھی کا استعمال درست ہے، بلا ضرورت چاندی کی انگٹھی سے بھی احترام مناسب ہے کیونکہ زینت تو عورتوں کے مناسب ہے، نہ کہ مردوں کیلئے، رہا سونا تو وہ ہر صورت میں حرام ہے، اس انگٹھی پر محمد رسول اللہ نقش تھا ایک لائن میں محمد دوسری میں رسول اور تیسری میں اللہ اور بعض نے کہا ہے کہ نیچے محمد اور بیچ میں رسول اور اوپر اللہ۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ دست مبارک میں اس انگٹھی کی چمک مجھے آج تک یاد ہے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ نے یہ حدیث پیش کر کے اس بات پر تنبیہ کی ہے کہ اگر تحریر مہر شدہ ہو تو اعتبار ہوگا ورنہ نہیں، یعنی ایک عالم دوسرے عالم کے پاس بغیر مہر کے تحریر بھیجے تو اس کا اعتبار نہیں، گویا حافظ کی نظر میں بخاری ان لوگوں کی موافقت میں ہیں جو مختوم ہونے کی شرط لگاتے ہیں لیکن آگے حافظ بھی مہر کو مدار نہیں قرار دیتے بلکہ اگر مکتوب الیہ کو تحریر پر اعتماد ہے تو عمل درست ہے ورنہ اگر تحریر نہیں پہچانتا اور اعتماد نہیں ہے تو اس پر کتنی ہی مہر ہوں کچھ نہیں ہو سکتا، مہر بھی جعلی ہو سکتی ہے، اسی حدیث کی روشنی میں مکاتبت کے بارے میں اور بھی شرطیں لگائی گئی ہیں کہ مہر شدہ ہو اور مکتوب الیہ تحریر پہچانتا ہو، نیز یہ کہ قاصد قابل اعتبار ہو لیکن ان تمام شرطوں کی وجہ وہی اعتبار ہے اگر لانے والا قابل اعتبار ہے تو مہر کی بھی ضرورت نہیں۔

رابط حدیث و ترجمہ | ترجمہ کے دوسرے جز سے یہ حدیث پوری طرح مربوط ہے، قرآن کریم میں آپ کو امر فرمایا گیا۔

اے رسول آپ اس چیز کی تبلیغ کریں جو آپ کے
رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اور اگر آپ نے ایسا

یا ایہا الرسول بلغ ما نزل
الیک من ربک وان لم تفعل

فما بلغت رسالته . (مائدہ: ۶۷) نہ کیا تو آپ نے اس کے پیغام کی تبلیغ نہیں کی۔

خداوند قدوس کے اس حکم کی بجا آوری کے لئے آپ نے سلاطین عالم کے نام تبلیغی مکاتیب بھیجے خود تشریف لیا کر گفتگو نہیں فرمائی، معلوم ہوا کہ مکاتبت کی صورت بھی مشابہت کی طرح معتبر اور لائق استناد ہے ورنہ اگر اس کا مرتبہ اس صورت سے کسی بھی درجہ میں کم ہوتا تو آپ اس کو گوارا نہ فرماتے کیونکہ اس سے فریضہ تبلیغ کی ادائیگی میں معاذ اللہ قصور ثابت ہوتا ہے۔

بہر کیف اتنا معلوم ہو گیا کہ علم کے سلسلہ میں مکاتبت کا اعتبار ہے لیکن شرط یہی ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تک انتقال میں کوئی کمزوری نہ آئے۔

[۸] بَابُ مَنْ قَعَدَ حَيْثُ يَنْتَهِي بِهِ الْمَجْلِسُ وَ مَنْ رَأَى فُرْجَةَ فِي الْحَلَقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا

(۶۶) حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ إِسْحَقَ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أَبِي طَلْحَةَ أَنَّ

أَبَامُرَّةَ مَوْلَى عَقِيلِ بْنِ أَبِي طَالِبٍ أَخْبَرَهُ عَنْ أَبِي وَقِيدِ اللَّيْثِيِّ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ

بَيْنَمَا هُوَ جَالِسٌ فِي الْمَسْجِدِ وَالنَّاسُ مَعَهُ إِذَا أَقْبَلَ ثَلَاثَةَ نَفَرٍ فَأَقْبَلَ اِثْنَانِ إِلَى رَسُولِ

اللَّهِ ﷺ وَ ذَهَبَ وَاحِدًا قَالَ فَوَقَفَا عَلَى رَسُولِ اللَّهِ ﷺ فَأَمَّا أَحَدُهُمَا فَرَأَى فُرْجَةَ

فِي الْحَلَقَةِ فَجَلَسَ فِيهَا وَأَمَّا الْآخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ وَأَمَّا الثَّلَاثُ فَادْبَرُوا ذَاهِبًا فَلَمَّا فَرَغَ

رَسُولُ اللَّهِ ﷺ قَالَ إِلَّا أَخْبِرْكُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلَاثَةِ أَمَّا أَحَدُهُمْ فَأَرَى إِلَى اللَّهِ فَأَوَاهُ اللَّهُ

إِلَيْهِ وَأَمَّا الْآخَرُ فَاسْتَحَى فَاسْتَحَى اللَّهُ مِنْهُ وَأَمَّا الْآخَرُ فَأَعْرَضَ اللَّهُ عَنْهُ . (آئندہ: ۴۷۳)

ترجمہ | باب، اس شخص کا بیان جو مجلس کے آخر میں بیٹھ گیا اور جس شخص نے حلقہ میں جگہ دیکھی اور وہ اس میں بیٹھ گیا، ابو مرہ، عقیل بن ابی طالب کے مولیٰ نے بتایا کہ ابو واقد اللیثی نے یہ خبر دی کہ رسول اللہ ﷺ اس اثناء میں کہ آپ مسجد میں لوگوں کیساتھ تشریف فرما تھے کہ اچانک تین آدمی آئے ان میں سے دو رسول اکرم ﷺ کی طرف آگئے اور ایک چلا گیا، ابو واقد اللیثی کا بیان ہے کہ وہ دونوں آپ کی مجلس میں کھڑے رہے پھر ان میں سے ایک نے حلقہ میں خالی جگہ دیکھی اور وہ اس میں بیٹھ گیا اور دوسرا شخص ان لوگوں کے پیچھے بیٹھ گیا اور تیسرا پیٹھ پھیرے ہوئے نکلا چلا گیا، جب رسول اکرم ﷺ فارغ ہوئے تو فرمایا، کیا میں تمہیں ان تین آدمیوں کے بارے میں نہ بتلاؤں، بہر حال ان میں سے ایک نے جگہ تلاش کی اللہ تعالیٰ کے قرب میں تو اللہ تعالیٰ نے اسے جگہ دیدی اور دوسرا سو وہ شرم گیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے شرم کی، رہا تیسرا اس نے اعراض کیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس سے اعراض کر لیا۔

مقصد ترجمہ | ترجمہ کا مقصد طالبین علوم کو علمی مجالس میں شرکت کے آداب کی تعلیم دینا ہے کہ علمی مجالس میں جہاں جگہ مل جائے وہاں بیٹھ جائے، خواہ مخواہ لوگوں کو پریشان کرنے کیلئے اندر گھسنے کی کوشش نہ کرے البتہ اگر حلقہ میں جگہ ہو اور وہاں تک پہنچنے میں حاضرین کو تکلیف نہ پہنچے تو حلقہ میں داخل ہونا اولیٰ ہے، گویا ادب یہ ہے کہ علمی مجالس میں پہنچنے تو دیکھے کہ جگہ ہے یا نہیں، اگر جگہ ہے تو اندر چلا جائے ورنہ جہاں آسانی ہو وہیں بیٹھ جائے، ایسا نہ ہونا چاہئے کہ اگر جگہ نہیں مل رہی ہے تو وہاں سے منہ موڑ کر چل دے کیونکہ ایسی صورت میں تو نقصان اپنا ہی ہے اگر مجلس میں بیٹھتا تو علمی فوائد حاصل کرتا، اور مجلس ذکر پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے، اس لئے رحمت کے آغوش میں آتا، اگر بے التفاتی برتا ہے تو اپنا نقصان کرتا ہے۔

مقصد یہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ مجلس کے کنارے پر بیٹھنا بھی خیر میں شریک ہونا ہے، اگر چہ مجلس کے درمیان میں بیٹھنے والا انسان زیادہ اجر کا مستحق ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دونوں نے چونکہ ایک خیر کے حصول کی کوشش کی اس لئے خداوند قدوس نے دونوں کو اجر میں شریک فرما دیا، نیز مقصد اس شخص کا بیان بھی ہو سکتا ہے، جو علم و وعظ کی مجلس میں تاخیر سے حاضر ہوا تو یہ شخص حلقہ کے بیچ میں جگہ لینے کی کوشش کرے یا کنارے ہی پر بیٹھ جائے یا یہ کہ جگہ نہ دیکھ کر واپس ہو جائے، امام بخاری نے ترجمہ منعقد کر کے بتلا دیا کہ اگر جگہ ہو تو صاحب مجلس کے قریب ہی جائے ورنہ کنارے پر بیٹھنے میں بھی اجر ہے، مجلس علمیہ سے اعراض کسی طرح بھی مناسب نہیں پھر یہ اعراض اگر تکبر کی بنا پر ہو تو حرام، اگر قلت مبالاة اور لا پرواہی اس کا باعث ہو تو حرام نہ سہی مگر حرام تو ضرور ہے، ہاں اگر فی الواقع کوئی مجبوری ہو تو معذور سمجھا جائے گا خوب سمجھ لیں۔

تشریح حدیث | باب کے ذیل میں تین آدمیوں کا ذکر ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی مجلس منعقد تھی کہ ادھر سے تین شخص گزرے، ایک تو چلا گیا اور دو ٹھہر گئے، ٹھہرنے والوں میں ایک نے مجلس کے حلقہ میں جگہ دیکھی اور وہ آگے بڑھ گیا اور دوسرا وہیں کنارے پر بیٹھ گیا۔

آپ جب ارشادات سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ میں تمہیں ان تینوں کے بارے میں بتلاؤں کہ ایک شخص نے قریب آنے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اسے جگہ دیدی، معلوم ہوا کہ بہتر شکل یہی ہے جبکہ جگہ ہو اور ایذا کا اندیشہ نہ ہو، کیونکہ روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کے کندھے سے گزریگا تو پل صراط پر الٹا ڈال دیا جائے گا اور لوگ اس کے اوپر سے گزریں گے، لیکن اگر ایذا نہیں ہے تو اس میں ایک تو معلم سے قرب ہے اور دوسرے خالی جگہ کو پر کرنا ہے اس لئے یہ محمود ہے۔

رہا دوسرا شخص تو اس نے حیاء کا معاملہ کیا، اس حیاء کے دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ شرم کی وجہ سے اس نے اہل مجلس سے مزاحمت نہیں کی بلکہ جہاں جگہ ملی وہیں بیٹھ گیا، اس نے سوچا کہ مقصد تو شرکت ہے اس لئے خواہ مخواہ اہل مجلس

کو تکلیف دینے سے کیا فائدہ، جب اس نے ایسا کیا تو خداوند قدوس نے بھی اس کے ساتھ اسی طرح کا معاملہ کیا کہ جب شریک ہوا ہے تو اسے بھی اس کے عمل شرکت کا اجر ملنا چاہئے، دوسرے معنی یہ ہیں کہ بیٹھنے کا خیال تو نہ تھا مگر شرما حضوری میں آکر پیچھے بیٹھ گیا، چنانچہ حاکم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مجلس سے آگے نکل چکا تھا مگر پھر اسے یہ شرم دامن گیر ہوئی کہ پیغمبر کی مجلس سے بغیر استفادہ گزر رہا ہے اسلئے یہ شخص واپس آیا اور بیٹھ گیا، اب مطلب یہ ہے کہ اس شخص نے شرم و حیا کا معاملہ کیا تو خداوند قدوس کی جانب سے بھی اسی قسم کا معاملہ ہوا کہ اسے محروم نہیں کیا گیا بلکہ خیر کا ایک حصہ اسے بھی عنایت فرمادیا لیکن تیسرے شخص نے بے رخی کی تو خداوند قدوس نے بھی بے رخی کا برتاؤ کیا، تم اگر آتے تو لیجاتے لیکن تم نے ضرورت نہیں سمجھی تو ہمیں بھی ضرورت نہیں ہے۔

افئلز مکموها وانتم لها کارهون کیا ہم زبردستی چپ دیں جبکہ تم اس کیلئے تیار نہ ہو۔

لیکن اس بے رخی کے یہ معنی معین نہیں ہیں کہ وہ منافق تھا، یہ بات کسی ثبوت کے بغیر قابل قبول نہیں ہے، کیونکہ اخلاص کے باوجود انسان کو بعض اوقات اپنی ضرورت سے مجبور ہونا پڑتا ہے، ہاں صرف اتنی بات ہے کہ وہ خاص رحمت جو اہل حلقہ پر ہو رہی ہے اس سے محروم رہ گیا، اس حدیث میں جزاء من جنس العمل کے اصول پر تنبیہ ہے۔

بہر کیف امام بخاری نے روایت پیش کر کے یہ بتلادیا کہ مجلس علمی میں شرکت کی کوشش کجائے خواہ پیچھے بیٹھے یا حلقہ میں جگہ مل جائے، بلاوجہ اعراض عن مجلس العلم میں حرمان ہے، روایت سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ میں جگہ حاصل کرنا افضل ہے، ہاں حسن نیت کے اعتبار سے کبھی صف پائیں یا مجلس کے آخر میں بیٹھنا بھی افضل ہو سکتا ہے

كما يظهر من كتب الفقه فيمن ترك موضعه لا كرام الجاني، فتامل- ۱۲

[۹] بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ رَبُّ مُبَلِّغٍ أَوْعَىٰ مِنْ سَامِعٍ

(۶۷) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا بَشْرٌ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنِ ابْنِ سِيرِينَ عَنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ أَبِي بَكْرَةَ عَنِ أَبِيهِ قَالَ ذَكَرَ النَّبِيُّ ﷺ قَعْدَ عَلِيٍّ بَعِيرِهِ وَأَمْسَكَ إِنْسَانٌ بِخِطَامِهِ أَوْ بِرِمَامِهِ ثُمَّ قَالَ أَيُّ يَوْمٍ هَذَا فَسَكَّتْنَا حَتَّى ظَنْنَا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ سَوِيَّ اسْمِهِ قَالَ أَلَيْسَ هَذَا يَوْمَ النَّحْرِ قُلْنَا بَلَىٰ قَالَ فَأَيُّ شَهْرٍ هَذَا فَسَكَّتْنَا حَتَّى ظَنْنَا أَنَّهُ سَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ قَالَ أَلَيْسَ بِذِي الْحِجَّةِ قُلْنَا بَلَىٰ قَالَ فَإِنَّ دِمَاءَكُمْ وَأَمْوَالَكُمْ وَأَعْرَاضَكُمْ بَيْنَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هَذَا فِي بَلَدِكُمْ هَذَا يَبْلُغُ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ فَإِنَّ الشَّاهِدَ عَسَىٰ أَنْ يُبْلَغَ مَنْ هُوَ أَوْعَىٰ لَهُ مِنْهُ.

(آئندہ: ۱۰۵، ۱۷۲، ۱۹۷، ۲۰۷، ۲۶۲، ۵۵۵، ۷۸، ۷۲۷)

ترجمہ | باب، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد کہ کبھی وہ شخص جسے بات پہنچائی گئی ہے اس شخص سے زیادہ فہیم اور یاد رکھنے والا ہوتا ہے جس نے خود سنا، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرہ سے روایت ہے کہ ابو بکرہ نے رسول اکرم ﷺ کا ذکر فرمایا کہ آپ اپنے اونٹ پر بیٹھے تھے اور ایک انسان آپ کے اونٹ کی نگیل یاری تھا ہے ہوتا تھا، پھر آپ نے ارشاد فرمایا یہ کون سا دن ہے، ہم لوگ خاموش رہے یہاں تک کہ ہمیں یہ گمان ہوا کہ آپ اس دن کا کوئی دوسرا نام رکھیں گے پھر آپ نے فرمایا کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟ ہم نے عرض کیا جی ہاں! پھر آپ نے فرمایا کہ یہ کونسا مہینہ ہے؟ ہم لوگ خاموش رہے یہاں تک کہ ہمیں یہ گمان ہوا کہ آپ کوئی دوسرا نام تجویز فرمائیں گے پھر آپ نے فرمایا کیا یہ ماہ ذی الحجہ نہیں ہے، ہم نے عرض کیا جی ہاں! پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ بیشک تمہاری جانیں تمہارے اموال اور تمہاری آبروئیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جیسے آج کے دن اس ماہ میں اس شہر میں حرام ہیں، حاضرین غائبین تک یہ بات پہنچادیں، اس لئے کہ حاضر ممکن ہے اس شخص تک بات پہنچادے جو اس سے زیادہ فہیم اور یاد رکھنے والا ہو۔

مقصد ترجمہ اور باب سابق سے ربط | ترجمہ سے امام بخاری قدس سرہ کا مقصد تبلیغ کی ضرورت اور اس کے فوائد کا اثبات ہے اور وہ اس طرح کہ رسول اکرم ﷺ نے

اوعیٰ کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو دو معنی رکھتا ہے، ایک فہم اور دوسرے حفظ، مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جسے بات پہنچائی گئی ہے سننے والے سے زیادہ سمجھ دار بھی ہو سکتا ہے اور زیادہ یاد رکھنے والا بھی، دراصل اس کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ انسانوں کی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ صرف علم حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا ہی کافی سمجھتے ہیں، بعض لوگ علمی دقائق کے بیان میں بخل کے عادی ہوتے ہیں اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے علمی دقائق دوسرے کو بھی بتلا دیئے تو اس سے اپنی برتری کو نقصان پہونچے گا، کسی کو یہ خیال تبلیغ علم سے مانع ہوتا ہے کہ میاں نااہلوں کو تبلیغ کرنے کا فائدہ کیا ہے، خواہ مخواہ وقت کو ضائع کرنا اور اپنے علم کو برباد کرنا ہے گویا دماغ میں یہ نمایا ہوا ہے کہ سب جاہل ہیں، بد فہم ہیں تو تبلیغ بے نتیجہ رہے گی۔

اس بنا پر تبلیغ کی ضرورت اور اہمیت واضح کر دی گئی کہ تم جتنا جانتے ہو وہ دوسروں تک پہنچا دو، ہو سکتا ہے کہ وہ تم سے زیادہ سمجھ دار اور تم سے زیادہ حافظہ کا قوی ہو، پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا اوتیت جوامع الکلم اس لئے مسائل کا استخراج و استنباط اپنی قوت استنباط پر ہے، اعمش بڑے محدث ہیں اور امام اعظم کے شیخ ہیں، ایک معاملہ میں ابتلاء پیش آیا تو امام اعظم سے مسئلہ دریافت کیا، امام نے بتلادیا، پوچھا کیسے معلوم ہوا، فرمایا اس حدیث سے جو آپ نے بیان کی تھی اور حدیث سنادی، اعمش نے کہا کہ بیشک الفاظ ہمارے پاس ہیں اور معانی تمہارے پاس، غرض تبلیغ میں یہ دو فائدے ظاہر ہیں تو اس کے بالمقابل ترک تبلیغ میں دو نقصان ہوں گے اصل علم کا ضیاع با علمی ترقیات کا ضیاع، فرض

کبھی عالم صاحب کا حافظہ خراب ہو گیا، علمی بات فراموش ہو گئی یا کچھ خلل آ گیا یا انتقال فرما گئے اور وہ علمی خزانہ ان کیساتھ دفن ہو گیا اور کوئی عارض پیش آ گیا جس کے باعث وہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا تو لامحالہ وہ علم ضائع ہو جائیگا اور اگر دوسروں تک پہنچا دیا ہوتا تو سلسلہ بسلسلہ وہ علم محفوظ ہوتا رہتا، دوسرا نقصان تبلیغ نہ کرنے کا یہ ہے کہ اس صورت میں علم محدود ہو کر رہ جائے گا ترقی نہ ہو سکے گی یعنی اگر دوسرے فہیم اور سمجھدار حضرات کے سامنے وہ علمی مواد پیش ہوتا تو بہت ممکن تھا کہ وہ اس سے اپنی خداداد قابلیت اور فطری ذہانت کے مطابق کلام رسول کے وہ بیش بہا جواہر جو الفاظ کی تہ میں مکنون اور مضمحل ہیں اور جس طرف خود پیغمبر علیہ السلام کے ارشاد اوتیت جوامع الکلم میں اشارہ ہے ان کا استنباط اور استخراج کر کے امت مرحومہ کے لئے ایک مکمل دستور سامنے رکھ دیتے، جب حامل علم اس علم کو اپنے تک محدود رکھتا ہے اور وہ اس درجہ کا فہیم نہیں ہے، صرف سرسری اور سطحی نظر رکھتا ہے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ نہ وہ علم اہل فہم کے سامنے آئے گا، نہ مسائل کثیرہ کا استنباط ہو سکے گا اس طرح سے وہ خزانے غیر مفید ہو کر رہ جائیں گے، بہر حال ترک تبلیغ کے یہ دو نقصان کھلے ہوئے ہیں۔

نیز اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ تصور کہ شاگرد استاد کے مقابلہ میں ہمیشہ ادنیٰ اور کمزور ہی ہوتا ہے، غلط اور واقعات کے خلاف ہے، کون نہیں جانتا کہ حضرات ائمہ رحمہم اللہ اور دیگر علماء کبار علم و فضل کے لحاظ سے کس قدر بلند پایہ اور اعلیٰ فضل و کمال کے مالک تھے، خود امام بخاری ہی کو لے لیجئے کہ ان کے اساتذہ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں، اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ فقیہ وہ ہے جو فقیہ اور عالم غیر فقیہ ہر ایک سے علم حاصل کرے، اس بارہ میں عار اور شرم محسوس نہ کرے، کسی کو ادنیٰ اور حقیر سمجھ کر ان کے علوم سے فائدہ نہ اٹھانا سخت نقصان کا باعث ہے، یہیں سے اس باب کی سابق باب سے مناسبت بھی ظاہر ہو گئی یعنی عالم کے لئے نخوت زیبا نہیں، وہ پیچھے بیٹھنے سے متعلق ہو یا اپنے سے ادنیٰ درجہ والے عالم سے علم حاصل کرنے سے متعلق ہو۔

اسی طرح حدیث باب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو خواہ مخواہ نا اہل سمجھ کر تعلیم نہ دینا اور یہ سمجھنا کہ اسے تعلیم دینا وقت اور علم کا ضائع کرنا ہے درست نہیں، کیونکہ اہل و نا اہل ہونے کا فیصلہ ایسی صورت میں قبل از وقت ہے، اس لئے تعلیم و تبلیغ کے سلسلہ میں کسی قسم کا امتیاز روا نہیں ہے، رہی ابن ماجہ کی حدیث۔

نا اہل کے سامنے علم پیش کرنے والا ایسا ہے جیسے

واضع العلم عند غیر اہلہ کمقلد

خنزیر کے گلے میں موتی اور سونے کا ہار ڈالنے والا۔

الخنزیر لولوا و ذہبا

تو اول یہ حدیث ضعیف ہے اور اگر صحیح بھی ہو تو اس کے معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ کسی شخص کے سامنے اسکی سمجھ سے

اونچی بات پیش نہ کرنی چاہئے کیونکہ اس سے بات بھی ضائع ہو جاتی ہے اور وقت بھی برباد ہوتا ہے۔

تشریح حدیث

حجۃ الوداع کا واقعہ ہے نبی اکرم ﷺ اونٹ پر سوار ہیں اور ابو بکرہؓ کیلئے تھامے ہوئے ہیں، اس موقع پر آپ نے حاضرین سے خطاب فرمایا اور پوچھا کہ یہ کونسا دن ہے؟ صحابہ کرام نے خاموشی اختیار کی کیونکہ جب آپ نے یہ سوال فرمایا تو صحابہ کو خیال ہوا کہ یہ بات جب ہم پہلے سے جانتے ہیں تو رسول اکرم ﷺ بھی بخوبی ہم سے زیادہ جانتے ہیں، اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کوئی نئی بات ارشاد فرمائیں گے کیونکہ پیغمبر علیہ السلام اپنے خصوصی اختیارات کی بناء پر دوسرا نام تجویز فرما سکتے ہیں، اس بناء پر صحابہ کرام خاموش رہے، یہ تو کتاب کی روایت ہے اور حضرت ابن عباس کے طریق میں ہے کہ جواب دیا گیا یعنی یہ جواب دیا گیا کہ آج یوم نحر ہے، روایات متعارض ہو گئیں لیکن یہ کوئی تعارض نہیں، مجمع چونکہ زائد تھا اس لئے حضرت ابو بکرہ کے قریب جو لوگ تھے وہ خاموش رہے ہوں اور حضرت ابن عباس کے نزدیک جو لوگ تھے انہوں نے جواب دیا ہو اور ہر شخص نے اپنے علم کے مطابق روایت بیان کی، دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ابو بکرہ کی روایت مفصل ہے اور حضرت ابن عباس کی روایت مجمل، کیونکہ ابو بکرہ کی روایت میں بلسی ہے جو تصدیق کے معنی میں ہے گویا ابتدائی سکوت ہر جگہ ہے مگر انتہاء اقرار ہے، اس انتہائی اقرار کو حضرت ابن عباس نے پہلے ہی لے لیا کہ ہم نے یوم النحر ہونے کا اقرار کیا، بہر کیف جو بھی صورت ہو، آپ نے الگ الگ کر کے پوچھا اس کا مقصد حاضرین پر اہمیت کا واضح کر دینا ہے، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد پوچھتے ہیں اور انتظار و تشویق دلاتے ہیں تاکہ انتظار کے بعد جو چیز حاصل ہو وہ نفس میں اوقع ہو جائے اور اس تمہید کے بعد ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو جس طرح تمہارے ذہن میں یہ بات پہلے سے چلی آ رہی ہے کہ حرم میں اور اشہر حرم میں چھیڑ چھاڑ کرنا، مال لوٹنا اور جانی نقصان پہنچانا سخت گناہ ہے، اسی طرح تم کو یہ بتلاتا ہوں کہ مسلمان کی عزت اور اس کے جان و مال کی حرمت ہمیشہ کیلئے آج ہی کی طرح ہے، ترمذی کی روایت میں ہے کہ مومن کی جان خدا کے نزدیک کعبہ سے زیادہ پیاری ہے، جب کعبہ سے زیادہ پیاری ہے تو یقیناً اشہر حرم اور حرم سے باہر بھی اس سے کھیلنا حرام ہی ہوگا، البتہ حقوق اسلامی کے ماتحت اس قسم کے تمام معاملات جائز اور صحیح قرار دیئے جائیں گے۔

اس موقع پر یہ اشکال پیدا کرنا درست نہیں ہے کہ مومن کی عزت و آبرو اور اسکی جان کی حرمت اشہر حرم کی حرمت سے کہیں زیادہ ہے، لہذا یہ تشبیہ ادنیٰ کی اعلیٰ سے تشبیہ ہے کیونکہ مشبہ بہ کا ہر حیثیت سے مشبہ پر فائق ہونا تشبیہ کے لئے ضروری نہیں صرف شہرت میں زیادہ ہونا بھی کافی ہے، یہاں بھی چونکہ اشہر حرم کی حرمت ان لوگوں کے نزدیک

انسانی کی روایت سے حضرت بلال اور بعض دوسری روایات سے عمرو بن خارجہ کا کلیل پکڑنا معلوم ہوتا ہے لیکن اسماعیلی کی روایت میں حضرت ابن المبارک عن ابن عون کے طریق سے حضرت ابو بکرہ ہی معلوم ہوتے ہیں اور یہی راجح ہے۔ ۱۲

۱۲ یہاں خطام اور زمام میں راوی کا شک ہے بعض حضرات

تو دونوں کے ایک ہی معنی بتلاتے ہیں، اور بعض نے فرق کیا ہے کہ خطام ناک کا وہ حلقہ ہے جس میں رسی ہوتی ہے اور زمام خود وہ رسی ہے یعنی مہار شتر۔ ۱۲

مسلم تھی اس لئے تشبیہ کے ذریعہ انکے ذہن و دماغ پر مومن اور اسکی عزت و آبرو کا وزن ڈال دیا گیا۔ واللہ اعلم
آخر میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ حاضرین کو چاہئے غائبین تک میری بات پہنچادیں، ترجمہ الباب اسی ٹکڑے
سے متعلق ہے اور ترجمہ و حدیث کے درمیان مناسبت ظاہر ہے۔

[۱۰] بَابُ الْعِلْمِ قَبْلَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ

لِقَوْلِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ فَاعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، (محمد: ۱۹) فَبَدَأَ بِالْعِلْمِ وَأَنَّ الْعُلَمَاءَ هُمْ
وَرِثَةُ الْأَنْبِيَاءِ وَرَثُوا الْعِلْمَ مَنْ أَخَذَهُ أَخَذَ بِحِطِّهِ وَافِرٍ وَمَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَطْلُبُ بِهِ عِلْمًا
سَهَّلَ اللَّهُ لَهُ طَرِيقًا إِلَى الْجَنَّةِ وَقَالَ جَلَّ ذِكْرُهُ إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ
(فاطر: ۲۸) وَقَالَ وَمَا يَعْزُبُهَا إِلَّا الْعَالَمُونَ (عنكبوت: ۲۳) وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ أَوْ نَعْقِلُ
مَا كُنَّا فِي أَصْحَابِ السَّعِيرِ (ملك: ۱۰) وَقَالَ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ
لَا يَعْلَمُونَ (زمر: ۹) وَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَإِنَّمَا الْعِلْمُ
بِالْعِلْمِ وَقَالَ أَبُو ذَرٍّ لَوْ وَضَعْتُمُ الصَّمْصِمَةَ عَلَى هَذِهِ وَأَشَارَ إِلَى قَفَاهُ ثُمَّ ظَنَنْتُ أَنِّي أَنْفَذْتُ
كَلِمَةً سَمِعْتُهَا مِنَ النَّبِيِّ ﷺ قَبْلَ أَنْ تُجِزُوا عَلَيَّ لَأَنْفَذْتُهَا وَقَوْلُ النَّبِيِّ ﷺ لِيَبْلُغَ
الشَّاهِدُ الْغَائِبَ وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ كُنُوا أَرْبَابَيْنِ (آل عمران: ۷۹) حُكَمَاءَ عُلَمَاءَ فَفَقَهَاءَ
وَيُقَالُ الرَّبَانِيُّ الَّذِي يُرَبِّي النَّاسَ بِصَغَارِ الْعِلْمِ قَبْلَ كِبَارِهِ .

ترجمہ | باب، علم کا مرتبہ قول اور عمل سے پہلے ہے، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے آپ جانئے کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت
کے لائق نہیں، دیکھئے اللہ تعالیٰ نے علم سے ابتداء کی اور بیشک علماء انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء نے وارثت
میں علم چھوڑا جس نے اس علم کو لیا اس نے انبیاء کی میراث کا وافر حصہ حاصل کیا اور جو شخص چلا کسی راستہ پر تا کہ علم دین
حاصل کرے تو اللہ اس کے لئے جنت کی راہ آسان فرمادے گا اللہ جل ذکرہ کا ارشاد ہے کہ اللہ سے اس کے بندوں
میں صرف علماء ڈرتے ہیں اور ارشاد ہے کہ قرآن کی فرمودہ مثالوں کو صرف عالم ہی سمجھتے ہیں، دوزخی کہیں گے کہ اگر ہم
سننے یا سمجھ لیتے تو دوزخ والوں میں نہ ہوتے، اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے، کیا وہ لوگ برابر ہو سکتے ہیں جو علم رکھتے ہیں اور
جو علم نہیں رکھتے نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے دین میں سمجھ عطا
کرتے ہیں اور علم صرف سیکھنے سے آتا ہے۔

حضرت ابو ذر نے اپنی گردن کی پشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم شمشیر برائے میری گدی
پر رکھ دو اور مجھے یہ خیال ہو کہ میں گردن الگ ہونے سے قبل زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکال سکوں گا، جسے میں نے نبی اکرم

ﷺ سے سنا ہے تو میں ضرور وہ کلمہ ادا کروں گا۔

حضرت ابن عباسؓ نے کونواری بانیین کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ حکیم عالم اور فقیہ ہو جائے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ربانی وہ ہے جو کہ لوگوں کی بڑے بڑے علوم سے قبل چھوٹے چھوٹے علوم سے تربیت کرے۔

مقصد ترجمہ | عام شارحین کے مذاق کے مطابق ترجمہ کا مقصد علم کی عظمت و فخامت کا اثبات ہے، علامہ عینی قدس سرہ کا ارشاد ہے کہ انام اس ترجمہ میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ علم عمل سے مقدم ہے اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اور اپنے درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے بھی، دیکھئے عمل ہو یا قول، جب تک پہلے ان کا علم حاصل نہ ہونہ اس پر عمل ہو سکے گا اور نہ کہنے کی بات کہی جاسکے گی، پھر خیال کیجئے کہ علم اور عمل میں بلحاظ درجہ کیا فرق ہے سو علم قلب کا عمل ہے اور اعمال جوارح یعنی ہاتھ پیر کا عمل اور قلب تمام اعضاء میں اشرف ہے اسلئے اس کا عمل بھی دوسرے اعضاء کے اعمال سے اشرف ہوگا۔

ابن منیر نے ترجمہ کا مقصد یہ قرار دیا کہ بخاری یہ بتانا چاہتا ہے کہ قول ہو یا عمل، بغیر علم کے وہ صحیح نہیں ہو سکتا، کیونکہ عمل کی صحت موقوف ہے نیت کی درستی پر اور وہ موقوف ہے علم پر، پس علم قول اور عمل کی درستی کے لئے شرط ٹھہرا اور اس لحاظ سے عمل پر اس کا تقدم محض ذاتی اور ربی نہ ہوگا بلکہ زمانی بھی ہوگا۔

علامہ سندھی فرماتے ہیں کہ مقصد علمی اشرف کا تقدم بیان کرنا ہے تقدم زمانی سے ترجمہ کا کوئی تعلق نہیں کیونکہ اس سلسلہ میں جس قدر آیات اور آثار مذکور ہیں وہ براہ راست علم کی شرافت اور عظمت سے متعلق ہیں، تقدم زمانی سے ان کا تعلق خلاف ظاہر ہے، حضرت شیخ الہند کے نزدیک ترجمہ کو زمان اور اشرف دونوں سے عام ہی رکھنا مناسب ہے، اقوال مذکورہ فی الباب پر نظر کرنے سے یہی راجح معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ کو زمان یا اشرف کے ساتھ مقید نہ کیا جائے۔ واللہ اعلم

حضرت الاستاذ کا ارشاد | حضرت الاستاذ نے ارشاد فرمایا کہ اس باب کے انعقاد کی اصلی غرض اس بات کی تردید ہے جو لوگوں میں عام طور پر مشہور ہے کہ علم کے سلسلہ میں فضیلت کی آیات واحادیث اس علم کی ساتھ خاص ہیں جس کے ساتھ عمل بھی ہو، چنانچہ عام حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ علم کی تمام فضیلتیں اور ثواب صرف اسی وقت ہے جبکہ اسکے ساتھ عمل بھی ہو، لیکن اگر علم کے ساتھ عمل نہیں ہے تو اس کا کوئی ثمرہ نہیں بلکہ وہ عالم کے لئے وبال ہے، مشہور ہے کہ ویل للجاهل مرة وللعالِم سبعین مرة اور اس بات کے لئے دلیل ایک یہ دی جاتی ہے کہ علم عمل کے لئے وسیلہ ہے اور معلوم ہے کہ وسائل مقصود بالذات نہیں ہوا کرتے؛ اسلئے اصل مقصد عمل ہے اور علم بغیر عمل لائق تعریف نہیں ہے۔

امام بخاری قدس سرہ العزیز نے یہ باب منعقد کر کے یہ بتلادیا کہ یہ مشہور بات درست نہیں ہے، اور علم قول و عمل سے بالکل الگ چیز ہے، اسلئے جو فضائل علم کے بارے میں وارد ہوئے ہیں وہ علم ہی کے مخصوص فضائل ہیں، ہاں علم

کے ساتھ عمل بھی جمع ہو جائے تو اس کی فضیلتیں اور بھی زیادہ ہیں، اس مقصد کے لئے امام بخاری نے جو تعبیر اختیار فرمائی ہے وہ نہایت بلیغ ہے یعنی العلم قبل القول والعمل جب علم قول و عمل سے قہنیت کا درجہ رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مستقل ایک چیز ہے، اس ارشاد کے مطابق ترجمہ کے ذیل میں ذکر کردہ آیات و احادیث پوری طرح منطبق ہو جاتی ہیں اور اگر مقصد وہ قرار دیں جو عام شارحین کا مختار ہے تو ذیل کی احادیث اور اقوال کا ترجمہ الباب سے انطباق نہیں ہوتا۔

اس مقصد کے لئے امام بخاری نے سب سے پہلے حضرت سفیان بن عیینہ کا استدلال نقل فرمایا کہ خداوند قدوس نے کلام پاک میں واعلم انه لا اله الا الله واستغفر للذنبك ارشاد فرمایا، یہاں دو چیزیں مذکور ہیں ایک علم اور دوسرے عمل یعنی استغفار، خداوند قدوس نے علم کو استغفار پر مقدم ذکر فرمایا اور اس طرح کہ پہلے علم کا حکم ہے اور پھر استغفار و عمل کا۔

علم کی مستقل فضیلت کیلئے دوسری دلیل ہے جس سے خاص طور پر علم کی فضیلت، شرافت اور انبیاء کی وراثت برتری معلوم ہوتی ہے، آں حضرت ﷺ کا یہ ارشاد ہے کہ العلماء ورثة الانبياء دنیا میں کمال دو ہی قسم کے ہوتے ہیں ایک علمی اور ایک عملی، ان دونوں کمالات میں علمی کمال عملی کمالات پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ عملی کمال علم کے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا اور علمی کمال عمل کے بغیر ممکن ہے، انبیاء علیہم السلام کے اصل کمالات علمی ہی تھے، اور اسی وجہ سے ان کو تمام دنیا کے مقابلہ پر درجہ شرافت عطا ہوا، گو پیغمبران عظام کے اعمال بھی سب سے اعلیٰ و ارفع ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے کہ امت کی تمام نمازیں پیغمبر کی دو رکعت کے برابر بھی نہیں ہو سکتیں لیکن اس کی وجہ بھی علم ہی ہے کیونکہ ان کی نماز اور اعمال کی یہ فضیلت کیف کی وجہ سے ہے اور کیف اخلاص سے پیدا ہوتا ہے اور اخلاص خشیت سے آتا ہے اور خشیت علم کا ثمرہ ہے، تو درحقیقت موثر علم ہی ہے اور نبی کا علم سب سے زیادہ ہے، غرض انبیاء کا کمال، علمی کمال ہے، جب علمی کمال ہے تو اسکی وراثت عالموں کی طرف منتقل ہوگی کیونکہ پیغمبروں نے وراثت میں دراہم و دنانیر نہیں چھوڑے ہیں بلکہ علم چھوڑا ہے اسلئے جس کے پاس علم زیادہ ہے اس کو نبی کی وراثت کا بڑا حصہ ملا تو عالم کا درجہ علم کی بدولت بہت بڑھا ہوا ہے یہاں وراثت نبی کے لئے یہ ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ جس نے علم حاصل کیا اور اس کے مطابق عمل بھی رکھا بلکہ ارشاد میں صرف علم ہی کا ذکر ہے معلوم ہوا کہ علم عمل کے بغیر بھی اپنے اندر ایک بڑا شرف رکھتا ہے۔

آگے فرماتے ہیں من سلك الخ یہ بھی ایک حدیث کا ٹکڑا ہے، ارشاد ہے کہ جو شخص علم سیکھنے کے لئے نکلتا ہے وہ اپنے لئے جنت کا راستہ آسان کر لیتا ہے، وہ طریق جو مقصد علم کے حصول میں معین ہو خواہ معمولی ہو یا غیر معمولی اور ہو یا نزدیک جنت کی راہ آسان کر دیتا ہے، یہاں بھی علم کیساتھ عمل کا ذکر نہیں ہے، معلوم ہوا کہ عمل کے بغیر بھی علم کا سیکھنا

جنت کی راہ کو آسان کرتا ہے۔

انما ینحسی اللہ آیت کریمہ میں ارشاد ہے کہ خشیت جو بندہ سے مطلوب ہے اس کا تعلق علم سے ہے، عمل سے نہیں، جتنا بڑا عالم ہوگا اسی قدر اس کے قلب میں خشیت زیادہ ہوگی، اور بقدر خشیت اخلاص ہوگا اور بقدر اخلاص عمل میں قبولیت کی شان ہوگی اور مدار خشیت علم پر اسلئے ہے کہ علم کے بعد ہی وہ کیفیت طاری ہو سکتی ہے جو عمل کی محرک ہے، یہاں بھی مدار خشیت علم کو قرار دیا گیا ہے، عمل کا کوئی ذکر نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے عمل تو نتیجہ خشیت ہے تو پھر خشیت کا موقوف علیہ کس طرح ہوگا۔

وما یعقلها الا العالمون قرآن کریم میں جگہ جگہ مثالیں دی گئی ہیں، ان مثالوں سے فوائد حاصل کرنا عالم ہی کا کام ہے، عامل کا نہیں، عالم ہی سمجھ سکتا ہے کہ اس مقصد کے لئے یہ مثال موزوں ہے یہاں بھی العالمون العالمون نہیں فرمایا گیا بلکہ صرف مدار علم رکھا گیا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ عمل نہ کرنے پر گرفت ہو سکتی ہے۔

قالوا لو كنا نسمع او نعقل الاية: انہوں نے کہا کہ اگر ہم سننے کے طریق پر سنتے اور سمجھنے کی طریق پر سمجھتے تو ہم اصحاب سبیر میں سے نہ ہوتے، علم کے حصول کے دو ہی طریق ہیں ایک سمع اور ایک تعقل اور ان لوگوں نے ان دونوں ہی طریقوں سے روگردانی کی، نہ دلائل کو سننے کی کوشش کی اور نہ سوچا کہ عقل سے کام لیتے، بہر کیف ان لوگوں نے دخول نار کا سبب علم نہ ہونا بتلایا، معلوم ہوا کہ علم ایک مستقل چیز ہے جسکی فضیلت اور شرف عمل پر منحصر نہیں ہلستوی الذین الاية اس سے بھی علم کی فضیلت ہی مراد ہے، کیونکہ خداوند قدوس نے یہ فرمایا کہ ان دونوں کے مقامات و مراتب میں بڑا تفاوت ہے۔

من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین ارشاد ہے کہ جس کے ساتھ خداوند قدوس خیر عظیم کا ارادہ فرماتا ہے اس کو دین کے اندر فقہ کی نعمت سے نوازتا ہے، یہ نہیں فرماتے کہ خیر عظیم کے ارادہ پر عمل کی توفیق دیتا ہے، اگرچہ تفقہ فی الدین کا نتیجہ آخر میں عمل ہی ہوتا ہے۔

وانما العلم بالتعلم یہ حضرت امیر معاویہ کی روایت کا ٹکڑا ہے جو طبرانی میں ہے الفاظ یہ ہیں:-
یا ایہا الناس تعلموا انما العلم
بالعلم والفقہ بالفقہ
ومن یرد اللہ بہ خیرا
ارادہ خیر فرماتے ہیں اسے تفقہ فی الدین کی نعمت سے

حضرت عمر بن عبدالعزیز اور امام ابوحنیفہ کی طرف قرأت بالرفع منسوب ہے یعنی انما ینحسی اللہ، یہاں خشیت کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے جو بظاہر درست نہیں معلوم ہوتی، لیکن اس قرأت کے اعتبار سے مراد تعظیم یا رعایت ہوگی اللہ تعالیٰ عالموں کی تعظیم فرماتے ہیں یا انکی رعایت کرتے ہیں اس قرأت کے اعتبار سے بھی ترجمہ ثابت ہوگا کہ یہ قدر و منزلت اور رعایت بھی صرف علم کی وجہ سے ہے۔ ۱۲

نوازتے ہیں۔

یفقہ فی الدین

یعنی جس علم کے فضائل مذکور ہوئے ہیں اس کا مدار صرف تعلم پر ہے عمل ہونہ ہو اس سے بحث نہیں، بخاری کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ فرما کر اسی مقصد کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں جس کی طرف ہم نے ترجمۃ الباب میں اشارہ کیا ہے، یہ جملہ اگرچہ ایک حدیث کا قطعہ ہے مگر بخاری اس کو اس حیثیت میں پیش نہیں کر رہے ہیں۔ واللہ سبحانہ اعلم

قال ابو ذر الخ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ حضرت امیر معاویہؓ کے دور امارت میں شام میں تھے، حضرت ابو ذرؓ زاہد تھے اور حضرت ابو معاویہؓ منتظم، آیت والذین یکنزون الذهب و الفضة کی تفسیر میں اختلاف ہو گیا، حضرت معاویہؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں نازل کی گئی ہے اور حضرت ابو ذرؓ کا ارشاد تھا کہ اہل کتاب کے اور ہمارے سب کے بارے میں نازل کی گئی ہے، ان کی اس صاف گوئی سے امیر معاویہؓ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں یہ بات بڑھ کر عوام میں انتشار کا باعث نہ بن جائے، اسلئے حضرت معاویہؓ نے حضرت عثمانؓ کو لکھا کہ آپ انہیں شام سے بلا لیجئے، حضرت ابو ذرؓ کو بلا لیا گیا، مدینہ پہنچے تو لوگوں نے تنگ کرنا شروع کر دیا تو مدینہ سے ربذہ چلے آئے اور وہیں مقیم ہو گئے، مزاج میں تقشف اور تشدد تھا اسی بناء پر فتویٰ دینے سے روک دئے گئے تھے۔

ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ موسم حج میں جمرہ وسطیٰ کے قریب تشریف فرما تھے، سوالات و جوابات کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک شخص نے حضرت ابو ذرؓ سے کہا کہ کیا آپ کو فتویٰ دینے سے نہیں روکا گیا ہے؟ حضرت ابو ذرؓ نے سر اٹھایا اور فرمایا کیا تو میرے اوپر کو تو ال بنا کر بھیجا گیا ہے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یاد رکھ جب تک میری گردن سالم ہے میں امر حق کی تبلیغ سے رک نہیں سکتا، اگر میری گردن پر تلوار رکھ دی جائے اور میں یہ سمجھوں کہ گردن جدا ہونے سے قبل میں حضور علیہ السلام کا کوئی پیغام پہنچا سکوں تو اندیشہ قتل مجھ کو اس وقت بھی پیغام رسانی اور حق گوئی سے روک نہیں سکے گا کیونکہ پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد ہے بلغو عنی ولو اید حضرت ابو ذرؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جب جان خطرہ میں ہو تب بھی میں تبلیغ کروں گا اور اس وقت جبکہ کوئی خطرہ بھی نہیں، میں کس طرح اس امر خیر سے اپنے آپ کو روک سکتا ہوں، اس میں فضیلت تبلیغ کا اشارہ ہے اور یہ خود مقصود بالذات ہے اس کا یہ خصوصی فضل اہل پر موقوف نہیں قال ابن عباس کونوا ربانین حکماء علماء فقہاء اللہ والے ہو جاؤ، حضرت ابن عباسؓ نے ربانی کے تین درجے قائم فرمائے حکیم، عالم اور فقیہ۔

عالم سب سے پہلا درجہ ہے اس سے اوپر کا درجہ فقیہ کا ہے اس سے بالا تر حکیم کا، اس لئے ترتیب یا اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف ہو یعنی حکماء، فقہاء، علماء یا ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ہو یعنی علماء فقہاء، حکماء لیکن کتاب میں دونوں صورتیں نہیں بلکہ ”علماء“ ہی میں لایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ فقیہ اور حکیم کے سامنے نرے عالم کی کوئی حیثیت نہیں ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جس کو مسائل کا علم ہو وہ عالم ہے لیکن وہ فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان مسائل کی وجوہ اور علل پر اسکی

دسترس نہ ہو، پھر ہر فقیہ حکیم کہلانے کا مستحق نہیں، حکیم وہ فقیہ ہوگا جس کے اوپر احکام شرعیہ کی حکمتیں مکشوف ہوں اور وہ احکام کے منافع و مضار سے باخبر ہو پس معلوم ہوا کہ عالم فقیہ اور حکیم دونوں کے مقابلہ پر ادنیٰ ہے لیکن فقہ اور حکمت کی ارتقائی منزلوں کا زینہ یہی عالم ہے جاہل نہ فقیہ ہو سکتا ہے، نہ حکیم، اس لحاظ سے اس کا وسط میں مذکور ہونا قرین قیاس ہے، غرض مرتبہ کے اعتبار سے عالم محض ادنیٰ درجہ میں ہے اور حکیم سب سے اوپر کے درجہ میں، حکیم کو شریعت کا قانون بھی معلوم اور ساتھ ہی ساتھ قانون کی علت بھی معلوم ہے اور یہ کہ اس قانون میں کن کن مصالح اور حکمتوں کی رعایت رکھی گئی ہے وہ بھی معلوم، اس کا علم نہایت پختہ ہوتا ہے اسی باعث اس کو حکیم کہتے ہیں، اب خیال فرمائیے کہ فقیہ اور حکیم کے سامنے بیچارہ عالم کی کیا حیثیت ہے لہذا درمیان میں رکھ کر اس کو بے توجہی سے بچانا مقصود ہے کہ نظر التفات ادھر بھی رہنی چاہئے، ایک نسخہ میں علماء فقہاء حکماء بھی دیکھا گیا ہے، مقصد اس کا بھی وہی ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے تفسیر میں عالمین کو کوئی مقام نہیں دیا بلکہ علم کے درجات بیان فرمائے نیز ربانی کی وہ تفسیر جو امام بخاریؒ نے یقال سے فرمائی وہ بھی علم ہی سے متعلق ہے، یعنی ربانی وہ ہے جو علمی تربیت میں ترتیب کا خیال رکھے، پہلے چھوٹی باتیں بتلائے اور پھر بڑی یعنی جزئیات سے شروع کر کے کلیات تک پہنچادے یا پہلے مقدمات سکھلائے پھر مقاصد کی تعلیم دے۔

فائدہ:- ربانی کی یاء نسبت کی یاء ہے معنی اول پر یہ نسبت الی الرب ہے اور دوسرے معنی میں منسوب الی التربیت کونوا ربانین، اللہ والے ہو جاؤ، یا مربی، بخاؤ اور دونوں کو جمع کرو تو یوں کہہ لو کہ اللہ والا وہ ہے جس کی تعلیم درجہ بدرجہ ہو یعنی جو معلمین کے احوال کا لحاظ رکھ کر تعلیم دے۔

امام بخاریؒ نے ان ارشادات کے نقل سے یہ بات ثابت کر دی کہ علم خود ایک ذی مناقب ہے اور یہ خیال درست نہیں ہے کہ علم کیساتھ اگر عمل جمع نہ ہو تو اس کی کوئی قیمت نہیں بلکہ علم خود ایک فضیلت ایک کمال اور ایک ذی فضیلت چیز ہے اسکے سیکھنے کی انتہائی کوشش کرنی چاہئے۔

[۱۱] بَابُ مَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُهُمْ بِالْمَوْعِظَةِ وَالْعِلْمِ كَيْ لَا يَنْفِرُوا

(۶۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُونُسَ قَالَ أَنَا سُفْيَانُ عَنِ الْأَعْمَشِ عَنْ أَبِي وَائِلٍ عَنِ

ابْنِ مَسْعُودٍ قَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِالْمَوْعِظَةِ فِي الْأَيَّامِ كَرَاهَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا .

(آئندہ: ۷۰، ۶۳۱۱)

(۶۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ ثَنَا يَحْيَى بْنُ سَعِيدٍ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ

حَدَّثَنِي أَبُو الثَّيَّاحِ عَنْ أَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ يَسْرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا وَبَشُرُوا

(آئندہ: ۶۱۲۵)

وَلَا تُنْفَرُوا .

ترجمہ | باب، رسول اکرم ﷺ وعظ و تعلیم میں صحابہ کرام کے لئے اوقات کی نگہداشت فرماتے تھے تاکہ وہ تنفر نہ ہو جائیں، حضرت ابن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ ہمیں نصیحت فرمانے کی غرض سے دنوں میں ہماری رعایت فرماتے کیونکہ آپ ہم کو تنگ دلی میں مبتلا فرمانا اچھا نہیں سمجھتے تھے حضرت انس سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم آسانی کرو تنگی مت کرو خوشخبری دو نفرت مت پھیلاؤ۔

مقصد ترجمہ | ترجمہ کا مقصد ظاہر ہے کہ علم ہو یا وعظ ہر وقت ہوگا تو سننے پڑھنے والے اس سے اکتا کر نفرت کرنے لگیں گے اور وعظ و نصیحت یا تعلیم کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوگا، لہذا یہ ضروری ہے کہ اس اہم مقصد کے لئے وعظ اور تعلیم میں کچھ ایسے اوقات معین کئے جائیں جن میں متعلم یا سامع فراغت اور اطمینان کے ساتھ اس کام کو جاری رکھ سکے اور خوش دلی کیساتھ یہ کام تکمیل کو پہنچ جائے۔

یہ خیال نہ ہونا چاہئے کہ علم دین کی اہمیت اور اس کی شرافت اور عظمت کا تقاضہ یہ ہے کہ بس دنیا کے تمام کاموں کو چھوڑ کر شب و روز اسی میں لگا رہے اور جو متعین ایام یا اوقات میں تعلیم دے اس کے عمل کو قاصر اور ناقص کہہ دیا جائے، امام بخاری کے پیش نظر اسی قسم کے امور اس ترجمہ کے بواعث اور محرکات معلوم ہوتے ہیں اور ایسے ہی شبہات کو پیغمبر علیہ السلام اور صحابہ کے عمل سے دفع کرنا چاہتے ہیں۔

چنانچہ امام بخاری علیہ الرحمہ نے یہ بات منعقد کر کے بتلادیا کہ رسول اکرم ﷺ حضرات صحابہ کے نشاط و ملال، حوانج و فراغت کا پورا لحاظ فرما کر صحابہ کو تعلیم و تذکیر فرمایا کرتے تھے، حالانکہ آپ کو تعلیم و تذکیر کا بہت ہی زیادہ اہتمام تھا، اس پر یہ طریق عمل صاف بتا رہا ہے کہ علمی اہمیت کا ہی یہ تقاضہ ہے کہ تعلیم اوقات نشاط اور فراغت میں دی جائے تاکہ علم کیساتھ طالب علم کی دلچسپی قائم رہے اور طلب میں روز افزوں ترقی ہو، ایسے ہی عبداللہ ابن مسعود آپ کے بعد یوم خمیس میں اپنے اصحاب کو تذکیر اور وعظ فرماتے تھے اور باوجود اصرار روزانہ تذکیر سے احتراز کرتے تھے، ایسا نہ ہو کہ سامعین ملول ہو کر کوتاہی کرنے لگیں۔

در اصل علم سکھانے کے لئے اول ہی سے سختی کا عمل طالب علم کے دل میں خوف پیدا کر کے اس کو علم سے متنفر کر دیتا ہے، ابتدائی تعلیم میں تو متعلم کو چمکار چمکار کر پیار و محبت سے ہی علم کی راہ پر ڈالا جاسکتا ہے، جب علم کا چسکا پیدا ہو جائے تو موقع سے اصول تربیت کے ماتحت سختی بھی کر سکتے ہیں۔

ترجمہ میں موعظہ اور علم دو چیزیں مذکور ہیں مگر حدیث باب میں صرف موعظہ کا ذکر ہے، اس سے ترجمہ اور حدیث کی مطابقت میں کچھ خلل نظر آتا ہے، مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ موعظہ بھی علم ہی کا ایک فرد ہے تو اہتمام للخاص

سے اہتمام للعام کا مسئلہ خود واضح ہو جاتا ہے اور یہیں سے اس کا جواب بھی سمجھ میں آ جاتا ہے کہ کتاب العلم کے مناسب ترجمہ بتقدیم العلم علی الموعظہ ہونا چاہئے تھا، جواب ظاہر ہے کہ حدیث باب میں موعظہ کا ذکر ہے اور موعظہ سے علم کی طرف انتقال مقصود ہے، لہذا ترتیب میں موعظہ کو مقدم کر دیا۔

الحاصل تذکیر اور تعلیم کا یہ تقاضہ ہے کہ طالب علم کو علم کی طرف کھینچا جائے اور تعلیم کیلئے ایسے اوقات معین کئے جائیں جس میں طالب علم نشاط خاطر کیساتھ علم کی طرف متوجہ رہے، ہمہ وقت کی تعلیم طالب علم کو دل برداشتہ کر کے تعلیم سے متنفر کر دے گی اور مقصد فوت ہو جائے گا۔

آپ چونکہ ربانی تھے اسلئے تربیت کے جملہ اصول آپ استعمال فرماتے تھے، طالب علم کی فراغت و نشاط کا بھی خیال ہے، گفتگو کی طوالت و اختصار پر بھی نظر ہے، اوقات کا بھی خیال ہے، اگرچہ رسول اکرم ﷺ کی تعلیم و تذکیر میں صحابہ کی دل تنگی کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن اکتانا بہر حال بشریت کا تقاضہ ہے نیز یہ کہ آپ کو تعلیم کی ایک سنت جاری کرنی ہے، اسلئے آپ نے صحابہ کی رعایت کر کے تمام طالبین علم کے لئے ایک راہ بنائی تاکہ علم کے ساتھ دلچسپی باقی رہے اور تنگ دلی و نفرت کی نوبت نہ آئے۔

تبشیر و تفسیر کا تقابل | ارشاد فرمایا گیا کہ یسر و آسانی سے کام لو، سخت گیری نہ کرو، بشارت دو، نفرت مت پھیلاؤ
ارشاد میں تیسیر و تعسیر کا تقابل تو درست ہے مگر تبشیر و تفسیر کا تقابل درست نہیں بلکہ تبشیر کا مقابل انذار اور تفسیر کا مقابل تسکین ہے چنانچہ کتاب الادب میں خود مولف نے لاتفسروا کا مقابل سکسوا ذکر فرمایا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ابتداء تعلیم میں انذار کا عمل عموماً تفسیر کا باعث ہوتا ہے اسلئے بشر و اکا مقابلہ لاتفسروا کا ساتھ ڈالا گیا، یعنی کہ ابتداء اسلام کا معاملہ ہے جس میں لوگوں کو دل بڑھاوا دیکر اپنے ساتھ ملانا اور ان میں بتدریج شوق پیدا کر کے اسلام کی طرف کھینچنا منظور ہوتا ہے تو مسلمانوں کیساتھ انذار کا طریق کسی طرح مناسب نہیں، اس سے اور نفرت پیدا ہوگی اور گھبرا کر چھوڑ بیٹھنے کا اندیشہ ہے۔

غرض تعلیم ہو یا تو عیظ یا تذکیر، تشدد کا عمل تو کسی حال مناسب نہیں، البتہ متعلمین اور سامعین میں دلچسپی پیدا کرنے کیلئے دل بڑھاوے کا سامان اختیار کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو شے ابتداء میں محبوب ہوتی ہے اسکی طرف طبیعت خود بخود چلنے لگتی ہے، ایک سوال اور باقی رہ جاتا ہے کہ جب یسر وافرما دیا تو ولا تعسروا کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی وہ تو خود یسر واکے امر سے ثابت ہے، نووی نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ یسر دائمی کا مقصد محض یسر واکہنے سے پورا نہیں ہوتا کیونکہ صیغہ امر میں مامور کا تکرار مقتضائے صیغہ نہیں ہوتا اس کے لئے خارج سے مدد حاصل کرنا پڑتی ہے اور جب یسر واکے بعد ولا تعسروا کہہ دیا گیا تو سخت گیری کی ممانعت سے علی الدوام آسانی برتنے کا حکم صاف ہو گیا۔

واللہ اعلم

حضرت شیخ الہند کا ارشاد

حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز فرماتے تھے کہ یہاں بشر و انذرو کا مقابل نہیں ہے بلکہ انذرو پر مشتمل ہے کیونکہ بشر و انذرو کا حاصل جمعیت خاطر پیدا کرتا ہے چنانچہ یسروا کے بعد لاتعسروا فرما کر بشر و انذرو کا ارشاد اور اس کے ساتھ لاتنفروا کا حکم صاف بتا رہا ہے کہ مقصود اصلی یسروا اور سہولت کا برتاؤ ہے اور سختی کے عمل سے بچانا کہ یہ نفرت پیدا کرنے کا راستہ ہے، لہذا بشر و انذرو کے معنی یہ ہوئے کہ ان لوگوں کو مناسب تدبیروں سے کام پر جمانا چاہئے خواہ تعلیم کا کام ہو یا کچھ اور ہو، کام کے راستہ میں مشکلات حائل کر کے انکو بد کایا اور اکھاڑا نہ جائے کہ اس میں مقصد فوت ہو جاتا ہے اور جب مقصود جمانا اور کام پر لگانا ہو تو پھر شاباش دینا، کمر ٹھونکنا، احسانات کا دباؤ ڈالنا یا ڈرا دھمکا کر راہ پر لانا سب برابر ہیں، غرض بلحاظ مقصد انذار بشارت مطلوبہ کی ضد یا اس کا مقابل نہیں بلکہ اسی کا ایک آخری فرد ہے، خوب سمجھ لیں، اب جبکہ لوگوں کی طبیعتیں مختلف ٹھہریں تو لامحالہ ان پر اثر اندازی کے طریق بھی مختلف ہوئے، کوئی انسان ایسا ہوتا ہے کہ جسے اجمالی کلمات ہی اطمینان خاطر کیلئے کافی ہوتے ہیں، یعنی صرف اتنی بات کہ خداوند قدوس نے جنت میں بہت سی نعمتیں تیار کی ہیں ان کے لئے کافی ہے اور وہ صرف اسی امید پر ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں، بعض طبیعتیں صرف اتنی بات پر قناعت نہیں کرتیں بلکہ جب تک ان کے سامنے خداوند کریم کے بے پایاں احسانات کا جوش و روزان کے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں ذکر نہ کیا جائے اس وقت تک ان میں اطاعت کا جذبہ پیدا نہیں ہوتا؛ اس لئے ان کے سامنے احسانات کا تذکرہ ہی انہیں مقصد کی طرف کھینچ سکے گا، دوسرے طرق سے کامیابی دشوار ہوگی اور بعض طبائع ایسی ہیں کہ ان پر احسانات کا بھی کوئی دباؤ نہیں پڑتا تو انہیں راہ راست پر لانے کے لئے ڈرانے دھمکانے اور وعیدیں سنانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور سرکش قوموں کے نتائج دکھلا کر ان کے قلوب میں خوف پیدا کیا جاتا ہے تاکہ وہ اطاعت کی طرف مائل ہوں۔

الحاصل انذار بھی بعض طبائع میں تبشیر کا کام کرتا ہے تو اس کا مقابل نہ ہو بلکہ اسمیں شامل رہا، یہ تمام طریقے اس لئے استعمال کئے جاتے ہیں کہ کسی طرح حق کے ساتھ شامل ہو جائیں اور اسے اختیار کرنے لگیں خواہ وہ معاملہ ایمان کا ہو یا تعلیم کا تو چونکہ طبیعتیں مختلف ہیں اسلئے طریقہ تاثیر بھی مختلف ہے اب بشر و انذرو کا مفہوم یہ نکلا کہ اجمعوا خواطر ہم بای طریق بکان یعنی جس طرح بھی ہو سکے انکے دلوں کو اپنے ساتھ لگاؤ، اس صورت میں تبشیر، انذار کے مقابل نہیں بلکہ انذار تبشیر میں داخل ہے۔

حضرت علامہ کشمیری یسروا و لاتعسروا، بشر و لاتنفروا کا مفہوم یہ بیان فرماتے تھے کہ ہمیشہ وعیدیں ہی مت سناؤ بلکہ قرآن عزیز کے طرز پر بشارت اور انذار کو ساتھ ساتھ رکھو، پیرایہ بیان ایسا اختیار کرو کہ خوف ورجاء ساتھ ساتھ چلتے رہیں، اگر ہمیشہ بشارت ہی دو گے تو رحمت پر تکیہ کر کے بے خوف ہو جائے گا اور ہمیشہ وعید ہی

وعید سناؤ گے تو رحمت سے مایوس ہو جائے گا اور یہ دونوں ہی خطرناک ہیں ارشاد باری تعالیٰ ہے لا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون، ولا ینس من روح اللہ الا القوم الکافرون۔
بہر کیف علامہ کشمیری کے ارشاد کے مطابق حدیث شریف میں تعلیم و تبلیغ کے لئے ایک درمیانی راہ کی نشان دہی کی گئی ہے۔

[۱۲] باب مَنْ جَعَلَ لِأَهْلِ الْعِلْمِ أَيَّامًا مَعْلُومَةً

(۷۰) حَدَّثَنَا عُمَانُ بْنُ أَبِي شَيْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا جَرِيرٌ عَنْ مَنْصُورٍ عَنْ أَبِي وَائِلٍ قَالَ كَانَ عَبْدُ اللَّهِ يُذَكِّرُ النَّاسَ فِي كُلِّ خَمِيسٍ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ يَا أَبَا عَبْدِ الرَّحْمَنِ لَوِ دِدْتُ أَنَّكَ ذَكَرْتَ تَنَاكُلَ يَوْمٍ قَالَ أَمَا إِنَّهُ يَمْنَعُنِي مِنْ ذَلِكَ أَنِّي أَكْرَهُ أَنْ أَمْلِكُكُمْ وَإِنِّي أَتَخَوَّلُكُمْ بِالْمَوْعِظَةِ كَمَا كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَتَخَوَّلُنَا بِهَا مَخَافَةَ السَّامَةِ عَلَيْنَا.

(گذشتہ: ۶۸)

ترجمہ | باب، بیان میں اس شخص کے جس نے اہل علم کے لئے تعلیم کے دن مقرر کر دیئے۔ ابوزائل سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود ہر جمعرات کے دن لوگوں کو وعظ سنایا کرتے تھے ایک شخص نے ان سے کہا کہ ابو عبدالرحمن میرا جی یہ چاہتا ہے کہ آپ ہمیں روزانہ تذکیر فرمائیں، آپ نے فرمایا تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ مجھے اس فعل سے یہ چیز روکتی ہے کہ میں تمہیں تنگ دل اور ملول کرنا پسند نہیں کرتا اور میں وعظ و پند کے لئے تمہاری نگہداشت رکھتا ہوں، جس طرح کہ پیغمبر علیہ السلام اس اندیشہ سے کہ ہمیں تنگ دلی نہ آجائے تذکیر میں ہماری نگہداشت فرمایا کرتے تھے۔

مقصد ترجمہ | اوپر تنخول کا ذکر آچکا ہے، تنخول انتظام کو چاہتا ہے اس لئے اب دوسرا ترجمہ رکھتے ہیں کہ اگر تعلیم کی غرض سے ایام و اوقات کا تعین کر دین تو اسمیں کوئی خرابی نہیں بلکہ ایک لحاظ سے یہ انتظام بھی ضروری ہے اس تعین کو بدعت نہیں کہا جائیگا اسکی اصل تو عہد نبوی میں قائم ہو چکی ہے، اعیان صحابہ بھی اس کی رعایت فرماتے رہے ہیں، یوں بھی ہر نئی چیز کو بدعت قرار دینا صحیح نہیں، بدعت ہونے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ نئی چیز دین بنادی جائے اور اس پر چلنا صراط مستقیم پر چلنا سمجھا جائے اور اسکے خلاف کو بدعتی اور گمراہی کے ساتھ تعبیر کیا جائے، شیخ شمس الدین عثمینی، نقایہ کی شرح میں بدعت کی تعریف بدیں الفاظ فرماتے ہیں، ما احدث علی خلاف الحق المتلقى عن رسول اللہ ﷺ بنحو شبهة واستحسان ثم جعل دینا قویماً و صراطاً مستقیماً اس کے ماتحت موت کی رسومات، تیجہ، دنواں، چہلم، ششماہی، برسی وغیرہ اور اسی طرح ایصال ثواب کے لئے ایام اور اوقات کا تعین یا بزرگوں کے نیاز کے

سلسلہ میں خاص خاص کھانوں کا تعین یہ سب بدعت قرار پاتے ہیں کیونکہ ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے اور نہ کرنے والوں کو بدوین، بد مذہب، گمراہ اور جانے کیا کیا کہا جاتا ہے، البتہ شادی کی رسومات کو کوئی دین نہیں سمجھتا، لہذا ان کو بدعت کہہ کر نہیں روکا جائے گا ہاں دیگر وجوہ شرعیہ کی بناء پر کہ ان میں تفاخر، نمود، اسراف، لہو و لعب، غیر مشروع باجے، نانچ گانا اور رسوم شرکیہ کفریہ وغیرہ شامل ہیں ان سے احتراز واجباً ضروری ہوگا۔

غرض باب کا مقصد یہ ہے کہ تعلیمی انتظام کی غرض سے ایام کی تعین میں کوئی حرج نہیں ہے اور اسے بے دینی نہیں کہا جاسکتا بلکہ علم ایک عظیم الشان چیز ہے اس لئے اس کی خاطر اہتمام کی ضرورت ہے، اس اہتمام کا تقاضہ ہے کہ ایام کی تعین کر دی جائے تاکہ تعلیم اور تعلم کے عمل میں آسانی رہے اور معلمین نیز متعلمین کا عزیز وقت ضائع نہ ہو اگر تعین نہ کی گئی تو ایسی بھی صورت ہو جائے گی کہ معلم صاحب موجود ہیں اور متعلمین کا پتہ نہیں یا متعلمین تو حاضر ہیں مگر معلم صاحب غائب ہیں۔

تشریح حدیث | حضرت ابووائل، حضرت ابن مسعود کا واقعہ نقل فرماتے ہیں کہ، حضرت ابن مسعود کا معمول یہ تھا کہ وہ ہر جمعرات کو وعظ و نصیحت فرماتے تھے، حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا، ابو عبد الرحمن، ہفتہ میں تعلیم و تذکیر کا صرف ایک دن ہے، اس سے سیری نہیں ہوتی، اس میں اضافہ ہونا چاہئے بلکہ روزانہ ہی ہو جائے تو بہتر ہے، ارشاد فرمایا ہو سکتا ہے کہ تم میں بعض کی یہ خواہش ہو اور وہ دل سے اضافہ کے خواہشمند ہوں مگر میں اس کو خلاف مصلحت سمجھتا ہوں، روزانہ کی تعلیم میں متعلمین کی ملالت اور تنگ دلی کا اندیشہ ہے پھر کہیں پریشان ہو کر کترانے لگیں یا بھاگنے لگیں تو اصل مقصد ہی فوت ہو جائے، دیکھئے آپ جس شوق کا اظہار کر رہے ہیں حضرات صحابہ میں اس سے کہیں زیادہ ذوق تعلیم اور شوق موجود تھا اس کے باوجود پیغمبر علیہ السلام تعلیم اور تذکیر میں ہمارے اوقات نشاط اور فراغت کا لحاظ فرما کر تعلیم فرماتے تھے، آپ کو یہ بات ناپسند تھی کہ تعلیم میں ہمارے لئے ملال خاطر کی صورت پیدا ہو، خواہ حقیقہً ملال نہ ہو، اب تم خود غور کرو کہ نہ تم صحابہ کی طرح تعلیم کے شوقین اور نہ میں پیغمبر علیہ السلام کی طرح شفیق معلم! جب وہاں بھی ملال خاطر کا لحاظ فرماتے ہوئے اوقات نشاط میں تعلیم کا عمل ہوتا تھا تو میرے لئے یہ کس طرح مناسب ہوگا کہ روزانہ تعلیم جاری کروں اور اندیشہ ملالت سے آنکھ بند کر لوں، اثبات ترجمہ کے لئے عبد اللہ ابن مسعود کا عمل بھی کافی ہے کہ انہوں نے ایک دن مقرر کر رکھا ہے اور اس جزو سے بھی ہو سکتا ہے جو آں حضور ﷺ کے بارے میں حضرت ابن مسعود نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح نبی اکرم ﷺ شوق و رغبت کی رعایت فرمایا کرتے تھے اسی طرح میں بھی کرتا ہوں، آں حضور ﷺ نے روزانہ تذکیر مناسب نہیں سمجھی تجدید نشاط کی خاطر تذکیر کے علاوہ ایام جاہلیت کے واقعات اور قصص لطائف و ظرائف مدیحہ قصائد وغیرہ بھی گاہے گاہے ہوتے تھے، اس میں تعلیم و تربیت کا پہلو

غالب رہتا ہے، اس کو محض سامان تفریح نہیں کہہ سکتے، خوب سمجھ لیں۔

[۱۳] بَابٌ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ

(۷۱) حَدَّثَنَا سَعِيدُ بْنُ عَفِيرٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ عَنْ يُونُسَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ قَالَ حَمِيدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ سَمِعْتُ مُعَاوِيَةَ خَطِيبًا يَقُولُ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ مَنْ يُرِدِ اللَّهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّينِ وَإِنَّمَا أَنَا قَاسِمٌ وَاللَّهُ يُعْطِي وَلَنْ تَزَالَ هَذِهِ الْأُمَّةُ قَائِمَةً عَلَى أَمْرِ اللَّهِ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ خَالَفَهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ . (آئندہ: ۳۱۱۶، ۳۶۳۱، ۴۳۱۲، ۷۴۶۰)

ترجمہ | باب، جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اسے تفقہ فی الدین عطا کرتے ہیں، حمید بن عبد الرحمن کا بیان ہے کہ میں نے حضرت معاویہ کو خطبہ دیتے ہوئے سنا، فرماتے تھے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا ہے کہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خیر ارادہ فرماتے ہیں اسے دین میں تفقہ کی نعمت سے نوازتے ہیں اور میں تو صرف تقسیم کرنیوالا ہوں اور اللہ عطا کرنے والا ہے اور یہ امت ہمیشہ اللہ کے حکم پر قائم رہے گی، جو ان کی مخالفت کرے گا وہ انہیں نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔

مقصد ترجمہ | امام بخاری نے اس ترجمہ سے علم اور تفقہ فی الدین کی عظمت و فخامت کا اثبات فرمایا ہے، حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے فرمایا کہ یہ تفقہ فی الدین کا ترجمہ اور اس سے اگلا ترجمہ الفہم فی العلم دونوں قریب قریب ہیں (مقصد یہ ہے کہ حصول علم کیلئے تا بمقدور کوشش کرنی چاہئے) ترجمہ اولیٰ سے جو بعینہ حدیث کا جملہ ہے نیز حدیث مفصل سے جو باب میں مذکور ہے دو امر ظاہر ہوتے ہیں ایک یہ کہ تفقہ فی الدین خیر عظیم ہے، دوسرے یہ کہ تفقہ فی الدین محض عطاء خداوندی ہے حتیٰ کہ نبی کریم ﷺ بھی انما انا قاسم فرما کر اپنا عذر ظاہر فرماتے ہیں جس سے فقہ فی الدین کی عظمت اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے انتہی بعبارتہ الشریفہ فی تراجمہ۔

خیراً کی تنوین | علامہ سندھی نے ارشاد فرمایا کہ اگر من یرد اللہ میں من سے عموم مراد لے لیں تو اس کے یہ معنی ہو جائیں گے کہ جس کے ساتھ بھی ارادہ خیر فرماتے ہیں اسے فقہ دین عنایت کرتے ہیں اور یہ درست نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ایسی بھی صورتیں ہیں جہاں تفقہ نہیں ہے مگر ارادہ خیر ہے جسے کوئی بچپن ہی میں مکلف ہونے سے قبل مرجائے یا آخر عمر میں اسلام لائے اور کسی بھی اسلامی فریضہ کا وقت آنے سے قبل وفات پا جائے وغیرہ، اس لئے ان اعتراضات سے بچنے کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ خیراً کی تنوین کو تعظیم کے لئے لیں، یعنی جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر عظیم کا ارادہ فرماتے ہیں، رہا مطلق ارادہ خیر تو وہ اور حضرات سے بھی متعلق ہو سکتا ہے، ہاں اتنی بات ہے کہ فقہ فی الدین کا مقام ان سے بہت بلند ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کوئی انسان یہ نہیں بتلا سکتا کہ خداوند قدوس کا ارادہ

اس کے ساتھ کیا ہے لیکن فقیہ اس حدیث کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے ساتھ خیر کا ارادہ ہے کیونکہ یہ اللہ کی خاص عنایت ہے۔

اس اشکال کا دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ ”من“ سے مراد مکلفین ہوں کیونکہ یہی شریعت کے مخاطب ہوتے ہیں لہذا نابالغ یا وہ بالغ جس سے ابھی کوئی تکلیف متعلق نہیں ہوئی اسمیں داخل ہی نہیں، کہ وجہ اشکال بنیں، تیسرا جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں بطور مبالغہ فقیہ کی نسبت سے غیر فقیہ کے ساتھ ارادہ خیر کی نفی ہو تو اس میں بھی ”من“ کا عموم باقی رہے گا۔

حضرت معاویہؓ نے خطبہ میں یہ حدیث پیش فرمائی من یرد اللہ بہ خیرا یفقهہ فی الدین
تشریح حدیث
 وانما انا قاسم واللہ یعطی یعنی میرا کام تقسیم کر نیکا ہے، یعنی جو علوم مجھے دئے گئے ہیں میں سب کے سامنے تقسیم کر دیتا ہوں، میری طرف سے کوئی روک یا بخل نہیں ہے جس کی قسمت میں قبول کرنا ہوتا ہے وہ قبول کر لیتا ہے لیکن خیر کی تقسیم ہوتی ہے آپ ہی کی معرفت، آپ صلاح و تقویٰ کے قسام ہیں، رسالت، نبوت صدیقیت، ولایت سب کی تقسیم آپ کی وساطت سے ہوئی، آپ کی ذات تمام کمالات کی اصل ہے، آپ منبع کمالات بنائے گئے ہیں، مخلوقات میں جس کو بھی جو کمال عطا ہوا ہے وہ اسی منبع کمالات کے ذریعہ حاصل ہوا، خداوند کریم نے آپ کو تمام مخلوقات سے قبل خلعت و جو عطا فرمایا،

اول ما خلق اللہ نوری، کنت نبینا و آدم منجدل بین الماء والطين آپ کی ذات عالم کے لئے واسطہ فی العروض کی حیثیت رکھتی ہے آپ تمام عالم کے روحانی باپ ہیں، اسی بناء پر آپ جس طرح نبی الامم ہیں، نبی الانبیاء بھی ہیں، آپ کی بعثت رہتی دنیا تک تمام عالم کے لئے ہے، شفاعت کبریٰ کا حق آپ ہی کو دیا گیا جس میں دوسرے تمام اولوالعزم پیغمبر نفسی نفسی کہتے ہوئے اپنی معذوری کا اظہار فرمائیں گے، حتیٰ کہ آدم علیہ السلام جو تمام انسانوں کے جسمانی باپ ہیں وہ بھی اپنی اولاد کی سفارش کی ہمت نہ فرمائیں گے، دراصل آپ اپنے ظاہری وجود سے ہزار ہا ہزار سال قبل خداوند جل مجدہ کی حقیقی خلافت کے ساتھ سرفراز ہو چکے تھے، اور قیامت تک کے لئے ہو چکے تھے، لہذا عالم کے تمام کمالات خواہ وجودی ہوں یا علمی، عملی ہوں یا اسکے علاوہ ہوں درحقیقت یہ آپ کے کمالات ہیں، آپ کو براہ راست خداوند کریم نے عطا فرمائے ہیں، دوسروں کو آپ کی وساطت سے پہنچے ہیں، جس طرح عالم اسباب میں آفتاب کی نورانیت اصل ہے اور باقی تمام منوارت میں اسی کا فیض نمایاں ہے اسی طرح عالم وجود میں آپ کا وجود باوجود اصل ہے، باقی تمام وجودات اسی کا ظل اور فیض ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کو دوسروں کے املاک میں تصرف حاصل ہے، آپ مدبر کی بیع کر سکتے ہیں، مدبر کیا آپ کو تو ٹھہکی بیع کا بھی حق حاصل ہے آپ بغیر مالک سے پوچھے ہوئے اس کے غلام کو آزاد فرما سکتے تھے مالکین کی ملکیت کے مقابلہ پر آپ کا حق ملکیت قوی تھا جس طرح غلام کے مقابلہ میں آقا کا حق۔

الحاصل فقہ فی الدین ایک عظیم نعمت اور اعلیٰ کمال ہے اور ہر کمال کی تقسیم آپ کی ذات مجمع کمالات سے متعلق ہے اور آپ کا فیض قیامت تک باقی رہنے والا ہے تو لامحالہ اس فیض سے فیضیاب ہونے والے بھی تا قیامت رہنے چاہئیں اسی کی پیش گوئی سن تیزال میں فرمائی گئی ہے یعنی اس امت میں ہمیشہ ایسے افراد رہیں گے جن کی زبانوں پر ہمیشہ کلمہ حق رہے گا، گوان کی مخالفت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے گا مگر ان کی مخالفت کرنیوالی جماعت ان کے طور طریق کو بدل نہ سکے گی اور نہ ان کے مٹانے میں کامیاب ہو سکے گی۔

حتیٰ یاتسی امر اللہ سے وہ ہو امراد ہے جو قرب قیامت میں چل کر تمام مومنین کی ارواح کو قبض کر لے گی اس کے بعد صرف اشرار اور کفار باقی رہ جائیں گے جب یہ قیامت قائم ہوگی یعنی جب تک دنیا میں مومن باقی رہیں گے، یہ طائفہ بھی باقی رہے گا جو حق کو سنبھالے رہے گا، اور یا پھر یہ تاکید کے لئے ہے جیسے خال دین فیہا مادامت السموات والارض میں مادامت تاکید کے لئے ہے۔

جماعت سے کیا مراد ہے؟ | اعلان فرمایا جا رہا ہے کہ مجموعی امت میں ایسے لوگ رہیں گے، نہ جگہ معین ہے اور نہ جماعت معین ہے اور نہ اسکا یکجا ہونا ضروری ہے اس بارے میں لوگوں نے مختلف خیالات ظاہر فرمائے ہیں مگر صحیح یہ ہے کہ اسکا کسی فرقہ یا گروہ سے تعلق نہ ہوگا اہل حق کے تمام فرقوں میں ایسے لوگ موجود ہیں گے جن کی حیثیت مجاہد فی الدین کی ہوگی جو مخالفین کی پرواہ کئے بغیر حق کی آواز بلند کرتے رہیں گے خواہ اس راہ میں بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے مگر انہیں صراط مستقیم سے کوئی ہٹا سکا، حدیث میں امت قائمہ فرمایا گیا ہے کسی جماعت کا نام نہیں لیا گیا البتہ ان کی نشان دہی جن الفاظ کے ذریعہ فرمائی گئی یعنی جوان کا وصف بیان کیا گیا ہے وہ اس امر کی واضح دلیل ہے، امام احمد نے فرمایا کہ اگر یہ طائفہ اہل سنت والجماعت نہ ہوا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون ہوں گے، قاضی عیاض نے کہا کہ اہل حدیث سے امام احمد نے اہل سنت والجماعت مراد لئے ہیں، حضرت علامہ کشمیری فرماتے تھے کہ حدیث میں تو مجاہدین کی تصریح ہے لیکن امام احمد اہل سنت والجماعت کو فرما رہے ہیں، اسلئے مجھے امام احمد کی بات پر ایک عرصہ تک حیرت رہی لیکن ایک عرصہ کے بعد تاریخ کے تتبع سے معلوم ہوا کہ مجاہدین اور اہل سنت والجماعت مصداق کے اعتبار سے ایک ہی ہیں، کیونکہ اسلام کے چودہ سو سالہ تاریخی دور میں جہاد صرف اہل سنت والجماعت نے کیا ہے، گویا حضرت امام احمد نے اہل سنت والجماعت کی تعیین عقائد کی رو سے نہیں بلکہ تاریخی شہادت کی وجہ سے فرمائی ہے۔

۱۔ حدیث میں امت کا لفظ ہے اسی لئے یہ ضروری نہیں کہ حق پر قائم رہنے والی پوری جماعت ہی ہو، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ ہر جگہ ہو بلکہ صرف یہ اعلان ہے کہ مجموعی طور پر امت خالی نہیں رہے گی، اسلئے کہ امت کا اطلاق ایک پر بھی آتا ہے، ارشاد ہے ان ابراہیم کان امۃ ۱۲

[۱۴] بَابُ الْفَهْمِ فِي الْعِلْمِ

(۷۲) حَدَّثَنَا عَلِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ قَالَ لِي ابْنُ أَبِي نَجِيحٍ عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ
صَحِبْتُ ابْنَ عُمَرَ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلَمْ أَسْمَعُهُ يُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ إِلَّا حَدِيثًا
وَاحِدًا قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَأَتَى بِجُمَارٍ فَقَالَ إِنَّ مِنَ الشَّجَرَةِ شَجْرَةً مِثْلَهَا كَمَثَلِ
الْمُسْلِمِ فَأَرَدْتُ أَنْ أَقُولَ هِيَ النَّخْلَةُ فَإِذَا أَنَا أَضْعُرُ الْقَوْمَ فَسَكَتُ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ هِيَ
النَّخْلَةُ .
(گذشتہ: ۶۱)

ترجمہ | باب، علم میں فہم حاصل کرنیکی فضیلت۔ مجاہد سے روایت ہے کہ میں مدینہ تک حضرت ابن عمر کے ساتھ رہا
لیکن ایک حدیث کے علاوہ اور کوئی چیز انہیں رسول اکرم ﷺ سے بیان کرتے ہوئے نہیں سنا، انہوں نے
کہا کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ آپکی خدمت میں کھجور کا چنور لایا گیا، آپ نے فرمایا کہ درختوں میں
ایک ایسا درخت ہے جس کی مثال مسلمان کی مثال ہے، میں نے یہ کہنا چاہا کہ وہ نخلہ ہے لیکن میں لوگوں میں سب سے
چھوٹا تھا اس لئے خاموش رہا، رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ وہ کھجور ہے۔

مقصد ترجمہ | ترجمہ کا مقصد مصنف نے کچھ معین نہیں کیا، اس لئے شارحین اپنے اپنے مذاق کے مطابق مختلف
مقاصد کی طرف گئے ہیں، کسی نے کہا کہ الفہم فی العلم مختلف یعنی علم کے اندر سب کا فہم
برابر نہیں ہوتا کسی کا زائد ہوتا ہے کسی کا کم، یعنی کوئی شخص تو مقصد جلد سمجھ جاتا ہے اور کوئی بدیر سمجھ پاتا ہے اور کوئی بالکل ہی
بے بہرہ رہتا ہے، یہ مقصد علامہ سندھی نے قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ چونکہ حدیث باب میں فضل فہم کا کوئی اشارہ نہیں
ہے اس لئے اسے باب فضل العلم نہیں قرار دے سکتے بلکہ مقصد یہ ہے کہ علم کے اندر لوگوں کی افہام مختلف ہیں، کسی نے کہا
کہ ترجمہ الفہم فی العلم مطلوب ہے، مطلب یہ ہے کہ تم تو انتظام کیسا تمہیں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھو اور تمہاری
نیت حصول تفقہ کی ہونی چاہئے، اگر قسمت نے یاوری کی توفیق ہو کر من یرد اللہ بہ خیرا یفقہہ فی الدین
میں داخل ہو جاؤ گے اور اگر فقیہ نہ بن سکے تو فہم فی العلم تو حاصل ہو ہی جائے گی اور یہ بھی مطلوب ہے جیسے کیمیا گر کوشش
تو یہی کرتا ہے کہ سونا چاندی بنانا آجائے اگر مقصد میں کامیابی ہوگی تو اچھا ہے ورنہ کم از کم کشتے تو پھونکنے آ ہی جاتے ہیں
تو پہلے درجہ پر تفقہ مطلوب ہے اور دوسرے درجہ پر فہم۔

حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ مقصد باب فضل الفہم فی العلم
حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ارشاد | ہی ہے یعنی تفقہ کا درجہ تو افضل ہے ہی لیکن فہم فی العلم بھی فضیلت
سے خالی نہیں، اس ارشاد پر شبہ ہوتا ہے کہ اگر مقصد فہم کی فضیلت کا بیان ہے تو حدیث باب میں فضیلت کا ذکر

ہونا چاہئے، حالانکہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں دور تک فضیلت کا ذکر نہیں لیکن حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے اس کے لئے ارشاد فرمایا کہ بخاریؒ کبھی کبھی ایسا بھی کرتے ہیں کہ حدیث مجمل و مختصر پر مفصل حدیث کا ترجمہ رکھ دیتے ہیں اور کتاب میں دوسری جگہ اس حدیث کو مفصل لے آتے ہیں، اب جو لوگ امام بخاریؒ کے طرز سے واقف نہیں، اور جنہوں نے کتاب کا تتبع نہیں کیا انہیں اعتراض پیش آجاتا ہے، یہاں بھی کتاب العلم کے آخر میں یہ روایت تفصیل سے مذکور ہے اسمیں حضرت ابن عمرؓ نے والد صاحب سے عرض کیا کہ رسول اکرم ﷺ کے مقصد کو میں سمجھ گیا تھا لیکن بڑوں کو خاموش دیکھ کر خاموش ہی رہا کہ کہیں آپ کو ناگواری نہ ہو، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ اگر اس کو ظاہر کر دیتے تو مجھے اس قدر خوشی ہوتی کہ سرخ اونٹوں کے بلنے سے بھی نہیں ہوتی، معلوم ہوا کہ فہم فی العلم ایک بڑی فضیلت کی چیز ہے۔

[۱۵] بَابُ الْإِغْتِبَاطِ فِي الْعِلْمِ وَالْحِكْمَةِ

وَقَالَ عُمَرُ تَفَقَّهُهُ أَقْبَلَ أَنْ تُسَوِّدُوا، قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ وَبَعْدَانُ تُسَوِّدُوا وَقَدْ تَعَلَّمْ

أَصْحَابُ النَّبِيِّ ﷺ بَعْدَ كِبَرِ سِنِّهِمْ

(۷۳) حَدَّثَنَا الْحَمِيدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ بْنُ أَبِي خَالِدٍ

عَلِيٍّ غَيْرِ مَا حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ قَالَ سَمِعْتُ قَيْسَ بْنَ أَبِي حَازِمٍ قَالَ سَمِعْتُ

عَبْدَ اللَّهِ بْنَ مَسْعُودٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ مَالًا

فَسَلَطَهُ عَلَى هَلَكْتِهِ فِي الْحَقِّ وَرَجُلٌ آتَاهُ اللَّهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِي بِهَا وَيَعْلَمُهَا .

(آئندہ: ۱۳۰۹، ۱۳۱۱، ۷۳۱۶)

ترجمہ | باب، علم و حکمت میں رشک کرنا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ سردار بننے سے پہلے علم حاصل کرو، ابو عبد اللہ البخاری نے کہا کہ سیادت کے بعد بھی، نبی اکرم ﷺ کے اصحاب نے بڑی عمر میں علم حاصل کیا، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ دو چیزوں کے علاوہ کسی میں حسد جائز نہیں ہے، ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور حق کی راہ میں اس کے خرچ پر بھی مسلط کر دیا اور ایک ایسا شخص جسے اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمائی پس وہ اسکے ذریعہ سے فیصلہ کرتا ہے اور لوگوں کو اسکی تعلیم دیتا ہے۔

مقصد ترجمہ اور باب سابق سے ربط | اب تک یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ علم ایک اعلیٰ وارفع چیز ہے، بہت سے فضائل و مناقب صرف علم ہی سے متعلق ہیں، پیغمبر علیہ السلام اور صحابہ کرامؓ نے اسکے لئے انتظامات فرمائے، نیز اس سلسلہ میں تفقہ اور فہم بھی مطلوب ہے، جب علم اس درجہ قابل قدر

چیز ہے تو اس کے حصول کی کوشش ہونی چاہئے اور اگر کسی شخص کے پاس یہ نعمت موجود ہے تو وہ غبطہ کے قابل ہے غبطہ کہتے ہیں ریس کرنے کو یعنی کسی کی اچھی حالت دیکھ کر یہ تمنا کرنا کہ خداوند قدوس مجھے بھی اس جیسا بنا دے اور حسد میں یہ بات نہیں بلکہ وہاں تمنا یہ ہوتی ہے کہ اس کی اچھی حالت زائل ہو جائے اور مجھے وہ چیز حاصل ہو جائے کیونکہ بعض انسانوں کی فطرت یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنا جنس کی برتری دیکھ نہیں سکتے۔

بہر کیف باب کا مقصد یہ ہے کہ علم و حکمت قابل غبطہ چیز ہے، حدیث میں حسد کا لفظ بولا گیا ہے کیونکہ حسد اور غبطہ میں حصول کی تمنا بطور قدر مشترک پائی جاتی ہے اسلئے غبطہ کی جگہ حسد کا لفظ استعمال کر لیا گیا حکمت دانائی کی بات کو کہتے ہیں، سوچ سمجھ کر ایسی بات کہنا جو عقلاء کے نزدیک مسلم ہو اور جس کا کوئی انکار نہ کر سکے، چونکہ حکمت کا درجہ علم کے بعد کا ہے اسلئے علم کو مقدم رکھا اور حکمت کو مؤخر یا یوں کہہ لیجئے کہ حدیث میں لفظ حکمت سے علم مراد ہے جس طرح لفظ حسد سے غبطہ۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد | حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا تفقہوا قبل ان تسودوا سیادت سے قبل تفقہ حاصل کرو، یعنی جب علم قابل غبطہ چیز ہے تو کوشش یہ ہونی چاہئے کہ خداوند قدوس تمہیں وہ درجہ عطا فرمائے جس سے تم ہر کلام کی غرض کو سمجھ سکو اور عموماً ایسی کوشش وہی شخص کر سکتا ہے، جو ذمہ داریوں سے فارغ ہو اور کچھ ذمہ داریاں بھی اگر اس کے سر ہوں گی تو حصول تفقہ کے لئے مواقع کم ملیں گے اور وہ شرف و فضیلت سے محروم رہے گا، سیادت کے لئے ضروری نہیں کہ قاضی یا حاکم ہی بنے بلکہ ہر شخص کو کچھ نہ کچھ ذمہ داری سنبھالنی ہی پڑتی ہے اور کم از کم یہ کہ وہ گھر کا سید بنے گا، سیادت ملنے کے بعد تحصیل علم میں مختلف راستوں سے دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں، کبھی یہ خیال آ گیا کہ اب میں بڑا آدمی ہو گیا ہوں، لوگ میری تعظیم و تکریم کرتے ہیں، اب میں کسی کے سامنے کتاب کھولوں، بڑی شرم و غیرت کی بات ہے، لوگ مجھے کیا کہیں گے، نیز سیادت کے بعد اس کے متعلقہ حقوق و فرائض کی ادائیگی میں اتنی فرصت ہی کہاں مل سکتی ہے، ان وجوہ کے باعث حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ سیادت سے قبل علم حاصل کرو ورنہ بعد میں پچھتاؤ گے اور ممکن ہے کہ کسی کو دیکھ کر جلنے لگو اور ہمہ وقت یہ فکر سوہان روح بن جاوے کہ کسی طرح اس کی سیادت اور اقتدار خاک میں مل جائے اور میں برسراقتہم آ جاؤں، حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے تسودوا کے یہ معنی ارشاد فرمائے ہیں، شارحین میں کسی نے اس کی معنی شادی ہونے کے لئے ہیں چنانچہ عینی میں شمر لغوی کے حوالہ سے قبل ان تسودوا کا ترجمہ قبل ان تزوجوا بھی نقل ہوا ہے، لیکن سیادت اس میں منحصر نہیں، البتہ یہ بھی ایک قسم کی سیادت ہے اور کسی نے اس کے معنی داڑھی کے لئے ہیں یعنی داڑھی آنے سے قبل بچپن ہی میں تحصیل علم کی کوشش کرو۔

قال ابو عبد اللہ امام بخاری فرماتے ہیں کہ ارشاد حضرت عمر تفقہوا قبل ان تسودوا سے یہ غلط نہیں نہ ہونی چاہئے کہ وہ بعد الیادۃ علم حاصل کرنے سے منع فرما رہے ہیں کہ جسے سیکھنا ہو وہ قبل از سیادۃ سیکھے بعد میں نہیں سیکھ

سکتا، حاشا کہ حضرت عمر کا یہ مقصد ہو بلکہ وہ تو علم کی اہمیت اور عظمت کے پیش نظر اس امر پر زور ڈالنا چاہ رہے ہیں، ارے بھائیو جتنا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر سکتے ہو اس کے لئے قبل السیادة کے وقت کو غنیمت سمجھو کہ اس میں ہر قسم کی آزادی میسر ہے ورنہ خدا نخواستہ اگر پہلے سے اس کی طرف توجہ نہیں ہوئی یا اس کے حالات میسر نہ آسکے ہوں تو علم ایسی دولت نہیں ہے کہ یہ خیال کر لیا جائے کہ میاں اب تو وقت نکل گیا اب کیا سیکھیں نہیں اگر اس وقت نہیں سیکھا تھا تو اب سیکھنا پڑے گا، دیکھئے حضرات صحابہ نے کس طرح کبر سن کے باوجود کہ عموماً ہر ایک کو اپنے گھر سیادت حاصل تھی تحصیل علم میں سعی بلیغ فرمائی۔

تشریح حدیث | آگے حدیث لار ہے ہیں کہ صرف دو چیزیں حسد کے لائق ہیں ارشاد ہے لا حسد الا فی اثنتین یعنی حسد صرف دو چیزوں میں ہے، بخاری نے ترجمہ میں غبطہ کا لفظ بڑھا کر یہ بتلا دیا کہ یہاں حسد سے غبطہ مراد ہے اس طور پر کسی تاویل کی ضرورت نہیں بلکہ صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ حسد غبطہ کے معنی میں ہے اور اگر حسد کو اپنی حقیقت پر رکھیں تو معنی یہ ہوں گے کہ اگر کوئی چیز قابل حسد ہو سکتی ہے تو وہ صرف دو ہیں ایک کمال علمی ہے اور دوسرا کمال عملی جو جو دو سخا سے متعلق ہے، اس وقت معنی یہ ہوں گے کہ لو کان الحسد جائزاً لکان فی ہذین ولکنہ ممنوع فی ہذین ایضاً فہو ممنوع فی غیر ہما یقیناً۔ یعنی اگر حسد کا جواز ہوتا تو وہ صرف ان دو چیزوں کے لئے ہوتا لیکن یہ بھی روا نہیں ہے تو دوسری جگہوں پر یقینی طور پر ناروا ہے۔

وہ دو شخص کون ہیں؟ فرماتے ہیں ایک وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا، مال دار کا حال عموماً یہ ہوتا ہے کہ مال اس کے قلب پر حاوی ہوتا ہے لیکن فرماتے ہیں کہ اللہ نے مال دیا اور حق کی راہ میں خرچ کر نیکی تو نیک تو نیک بھی دی سلطہ علی ہلکتہ یعنی پورے طور پر خرچ کرتا ہے اور فی الحق کی قید لگا دی تاکہ اسراف کا گمان نہ ہو اور دوسرا شخص وہ ہے جسے اللہ نے علم و حکمت کے خزانے دیئے وہ انہیں خرچ کرتا ہے اور ان کی تعلیم دیتا ہے، حضرت ابن عمر کی روایت میں اعطاه اللہ القرآن یقوم بہا آناء اللیل و آناء النہار کے الفاظ ہیں، قیام میں قرآن کریم کی تلاوت بھی آجاتی ہے خواہ اندرونِ صلوة ہو یا بیرونِ صلوة، اسی طرح قرآن کریم کی تعلیم بھی آگئی اس کے مطابق عمل بھی آگیا، غرض تمام چیزیں قیام میں داخل ہو گئیں، بہر کیف حدیث میں کمال علمی اور کمال عملی یا کمال ظاہری اور کمال باطنی دونوں کا ذکر موجود ہے، لیکن یہاں ایک بات رہ جاتی ہے کہ امام بخاری قدس سرہ العزیز نے یہاں حسد سے غبطہ مراد لیا ہے، اس مراد کے لئے ان کے پاس دلیل کیا ہے؟ تو اسی بخاری میں باب فضائل القرآن میں حضرت ابو ہریرہ کے طریق سے اس روایت میں یہ زیادتی موجود ہے۔

کاش مجھے فلاں انسان جیسا مال ملتا اور میں

لیتتی او تبت مثل ما اوتی فلان

اس میں وہی کام کرتا جو وہ کرتا ہے۔

فعملت مثل ما یعمل

یہ تفسیر صرف غبطہ کی ہو سکتی ہے، حسد کی نہیں ہو سکتی، دوسرے یہ کہ ترمذی شریف میں حضرت ابو کبشہ انماری کے طریق سے ایک حدیث طویل نقل کی گئی ہے جس کا ایک ٹکڑا ہے۔

وَعَبْدُ رِزْقِهِ اللَّهُ عِلْمًا وَلَمْ يَرْزُقْهُ
مَالًا فَهُوَ صَادِقُ النِّيَّةِ يَقُولُ لَوْ
ان لِي مَالًا لَعَمِلْتُ مِثْلَ مَا يَعْمَلُ فُلَانُ
فَاجِرٌ هُمَا سَوَاءٌ .
اور ایک وہ بندہ ہے جسے اللہ نے علم دیا ہے مال
نہیں دیا لیکن نیت کا صادق ہے، کہتا ہے کہ اگر
میرے پاس مال ہوتا تو میں فلاں جیسا عمل کرتا پس
ان دونوں کا ثواب برابر ہے۔

حدیث کا یہ ٹکڑا بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ حدیث شریف میں حسد سے غبطہ مراد ہے، اسی کے پیش نظر امام بخاری نے ترجمہ میں یہ وضاحت فرمادی تھی کہ حسد سے حدیث میں غبطہ مراد ہے۔ واللہ اعلم
ایک بات اور سمجھ لیں کہ حسد ہمیشہ کسی خوبی اور کمال ہی پر ہوا کرتا ہے خواہ وہ کمال علمی ہو یا عملی، متعدی ہو یا
لازمی، حدیث کے پہلے جملہ کا تعلق کمال علمی سے ہے اور دوسرے کا عملی سے، اسی طرح یہ بھی واضح رہے کہ فضائل دو طرح
کے ہوتے ہیں ظاہری اور باطنی اور خارجی اور داخلی، فضائل خارجیہ میں اصل اصول مالداری ہے اور داخلی فضائل میں اصل
اول علم ہے پھر علم میں قضا اور تعلیم متعدی ہے، جس طرح مالداری کے بعد اس کا انفاق فی الغیر متعدی ہے۔ واللہ اعلم

[۱۶] بَابُ مَا ذُكِرَ فِي ذَهَابِ مُوسَى فِي الْبَحْرِ إِلَى الْخَضِرِ

وَقَوْلِهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى هَلْ اتَّبَعَكَ عَلَىٰ أَنْ تُعَلِّمَنِي الْآيَةَ (كهف: ۶۶)

(۷۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ غُرَيْرٍ الزُّهْرِيُّ قَالَ تَنَا يَعْقُوبُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ قَالَ تَنَا ابْنِي عَنْ
صَالِحِ يَعْنِي ابْنَ كَيْسَانَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ حَدَّثَهُ أَنَّ عُبَيْدَ اللَّهِ أَخْبَرَهُ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ أَنَّهُ
تَمَارِيُّ هُوَ وَالْحُرُّ بْنُ قَيْسِ بْنِ حِصْنِ الْفَزَارِيِّ فِي صَاحِبِ مُوسَى قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ هُوَ
خَضِرٌ فَمَرَّبَهُمَا أَبِي بْنُ كَعْبٍ فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ إِنِّي تَمَارِيْتُ أَنَا وَصَاحِبِي هَذَا
فِي صَاحِبِ مُوسَى الَّذِي سَأَلَ مُوسَى السَّبِيلَ إِلَى لُقْيِهِ هَلْ سَمِعْتَ النَّبِيَّ ﷺ
يَذْكُرُ شَأْنَهُ قَالَ نَعَمْ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُولُ بَيْنَمَا مُوسَى فِي مَلَأٍ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ
إِذْ جَاءَهُ رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ قَالَ مُوسَى لَا فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيَّ مُوسَى
بَلَى عَبْدُنَا خَضِرٌ فَسَأَلَ مُوسَى السَّبِيلَ إِلَيْهِ فَجَعَلَ اللَّهُ لَهُ الْحُوتَ آيَةً وَقِيلَ لَهُ
إِذَا فَقَدْتَ الْحُوتَ فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ فَكَانَ يَتَّبِعُ آثَرَ الْحُوتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ
لِمُوسَى فَتَاهُ أَرَأَيْتَ إِذَا وُتْنَا إِلَى الصُّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا نَسِيتُهُ إِلَّا

الشَّيْطَانُ أَنْ أذَكَرَهُ قَالَ ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ فَارْتَدَّا عَلَىٰ آثَارِهِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا خَضِرًا
فَكَانَ مِنْ شَأْنِهِمَا مَا قَصَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ .

(آئندہ: ۷۸، ۱۲۲، ۲۲۶۷، ۲۲۲۸، ۳۲۷۸، ۳۳۰۰، ۳۳۰۱، ۳۳۲۵، ۳۳۲۶، ۳۳۲۷، ۳۳۲۸، ۳۳۲۹، ۳۳۳۰، ۳۳۳۱)

ترجمہ | باب، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سمندر میں حضرت خضرؑ کی طرف جانے کا ذکر اور باری تعالیٰ کا حضرت موسیٰ کی حکایت فرماتے ہوئے یہ ارشاد کہ کیا میں آپ کیساتھ چلوں اس شرط پر کہ آپ مجھے تعلیم دیں الی آخر الیہ۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ وہ اور حریز بن قیس بن حصن الفزازی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے بارے میں ایک دوسرے سے جھگڑے، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ ساتھی حضرت خضر ہیں، چنانچہ ان دونوں کے پاس سے ابی ابن کعب گزرے، ابن عباس نے انہیں بلایا اور کہا کہ میں اور میرے یہ ساتھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھی کے بارے میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں جن کی ملاقات کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے راستہ دریافت کیا تھا، کیا آپ نے نبی اکرم ﷺ سے ان کا حال ذکر کرتے ہوئے کچھ سنا ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں میں نے رسول اکرم ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ اس اثناء میں کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں تھے کہ اچانک ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کیا آپ کسی شخص کو اپنے سے زیادہ عالم جانتے ہیں، حضرت موسیٰ نے فرمایا نہیں، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر وحی نازل فرمائی کیوں نہیں! ہمارا بندہ خضر تم سے زیادہ دانا ہے پھر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ سے ان تک پہنچنے کا راستہ پوچھا پس اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے مچھلی کو نشان کر دیا اور ان سے یہ کہہ دیا گیا کہ جب تم مچھلی کو گم پاؤ تو لوٹ پڑنا یقین رکھو کہ قریب ہی تمہاری ملاقات ہو جائیگی پس موسیٰ چل رہے تھے تاکہ پانی میں مچھلی کا نشان معلوم کریں، پس حضرت موسیٰ سے ان کے نوجوان رفیق نے کہا، کیا آپ نے دیکھا جب ہم صحرہ کے پاس ٹھیرے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا اور نہیں بھلایا مجھ کو مگر شیطان نے کہ میں اسے یاد رکھتا اور اس کا ذکر آپ سے کرتا، فرمایا یہی تو وہ چیز تھی جس کے ہم متلاشی تھے چنانچہ دونوں اپنے نقش ہائے قدم پر تلاش کرتے ہوئے واپس ہوئے تو حضرت خضر سے ملاقات ہو گئی، پھر ان دونوں کا وہ معاملہ ہوا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔

مقصد ترجمہ | ترجمہ منعقد فرماتے ہیں کہ اس میں حضرت موسیٰ کا خضر کے پاس تشریف لیجانا مذکور ہے ظاہر تو یہ ہے کہ مقصد قصہ کا بیان نہیں ہے بلکہ کتاب العلم میں مذکور ہونے کی وجہ سے کوئی ایسی چیز مقصود ہے جس کا علم سے تعلق ہو، بظاہر ترجمہ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحصیل علم کیلئے سفر کی اجازت دے رہے ہیں یعنی اگر کسی شخص کو اپنے وطن میں رہتے ہوئے اس شرف کے حصول میں کامیابی نہ ہو تو اس کے لئے سفر لا بدی ہے لیکن اشکال یہ پیدا

ہوتا ہے کہ اس سے اگلا باب "الخروج فی طلب العلم" (طلب علم کے لئے باہر جانا) کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے، اب اگر زیر بحث ترجمہ کا مقصد بھی اجازت سفر ہی رکھیں تو یہ خواہ مخواہ کا تکرار ہوگا جو امام بخاری کی جلالت قدر کے پیش نظر مستبعد معلوم ہوتا ہے۔

اس الزام تکرار سے بچنے کے لئے سفر میں تنوع مان کر سفر کے دو حصہ کرنے ہوں گے، ایک سفر بری اور ایک سفر بحری، زیر بحث ترجمہ سفر بحری سے متعلق ہے اور اگلا ترجمہ سفر بری سے لیکن اس تنوع کے اختیار کرنے پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر سفر کے دو حصہ کئے گئے ہیں تو اس حصہ کو مقدم لانا چاہئے جو طبعاً مقدم ہے یعنی سفر بری لیکن امام بخاری ایسا نہیں فرماتے بلکہ سفر بحری کو سفر بری پر مقدم لارہے ہیں، اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بحر کے سفر میں چونکہ خطرات زیادہ ہیں اسلئے اصل اشکال اسی سفر پر ہو سکتا تھا کہ آیا تحصیل علم کے لئے بھی خطرات مول لینے کی اجازت ہے یا نہیں، امام بخاری نے ترجمہ سے ثابت کر دیا کہ تحصیل علم کے لئے ہر قسم کی صعوبت و مشقت کو برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن اگر بحر سفر کو مقدم کرنے کا مقصد یہ قرار دیا جائے گا کہ تحصیل علم کی خاطر ہر قسم کی صعوبتوں اور مشقتوں کو برداشت کیا جاسکتا ہے حتیٰ کہ یہ مقصد اعظم اگر بحر سفر اختیار کئے بغیر حاصل نہ ہو سکتا ہو تو سفر فی البحر بھی اختیار کرنا ہوگا، تو بری سفر کا معاملہ خود بخود ثابت ہو جاتا ہے، اس کے لئے مستقل باب منعقد کرنا درست نہیں معلوم ہوتا، ان اشکالات کی وجہ سے ہمیں کسی دوسرے طریق پر سوچنا ہوگا۔

حضرت شیخ الہند کی رائے گرامی | حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز امام بخاری کی عادت و شان کے مطابق ایک نہایت قیمتی بات ارشاد فرماتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر کسی باب میں کوئی بات

مجمّل اور تفصیل طلب رہ جاتی ہے تو امام بخاری دوسرا باب منعقد فرما کر اس اجمال کی تفصیل کے ذریعہ اپنے مقصد کی تکمیل فرما دیا کرتے ہیں چنانچہ یہاں بھی ایسی ہی صورت واقع ہو رہی ہے؛ چونکہ باب سابق میں قد تعلم اصحاب النبی ﷺ بعد کبر سنہم جملاً بذیل ترجمہ بیان کیا تھا، اب اس باب میں اس کی تکمیل بالاستقلال فرمادی، وہاں تو یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرات صحابہ کبر سن میں تعلیم حاصل کرنا بدرجہ مجبوری تھا کیونکہ نوعمری کے زمانے میں انہیں کوئی معلم خیر میسر نہ تھا یا اس خیر کی طرف رغبت نہ تھی، اس بنا پر جب اسلام میں داخل ہوئے اور معلم خیر سے تعلق پیدا ہوا جب ہی تو تفقہ فی الدین کا موقع مل سکا، لہذا بعد السیادة ان کا تعلم اس مسئلہ پر دلیل نہیں بن سکتا کہ قبل السیادة تحصیل علم کے مواقع بہم ہو چکے باوجود اگر علم حاصل نہ کیا ہو تو بعد السیادة علم حاصل کرنا ضروری ہوگا، اس اجمال اور اس اعتراض کے پیش نظر دعویٰ کو قوی دلائل سے ثابت کرنے کے لئے امام بخاری قدس سرہ العزیز کو یہ دوسرا باب منعقد کرنا پڑا جس میں امام بخاری نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے ناقابل تردید استدلال کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نبوت کے بعد جبکہ وہ جلیل القدر صاحب کتاب پیغمبر ہیں سفر فرمایا جس کا مقصد ایک زائد از ضرورت علم کا حصول تھا کیونکہ ان کے پاس

ضروری علوم پورے طور پر موجود تھے، گویا اس باب میں یہ بات پوری طرح ثابت ہوگئی کہ حصول علم کی راہ میں سیادت کا آڑ نہ بنانا چاہئے بلکہ علم میں جہاں تک ہو سکے ترقی کرتے رہنا چاہئے۔

حضرت عمرؓ کا مقولہ | حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مقولہ تفقہوا قبل ان تسودوا سیادت سے قبل تفقہ حاصل کرو) کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ سیادت کے بعد علم حاصل نہ کرنا چاہئے اور سیادت کا حصول علم کے لئے مانع اور روک سمجھنا چاہئے بلکہ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے سیادت سے قبل علم سیکھنے کی کوشش نہ کی تو جب تم اپنے دور سیادت میں علم کی ضرورت اور علماء کی قدر و منزلت دیکھو گے تو تمہیں عمر عزیز کے ضیاع پر افسوس ہوگا اور ممکن ہے کہ یہ افسوس حسد تک پہنچا دے اس لئے بعد الیادۃ اس کی تلافی لازم رہے گی؛ اسی لئے امام بخاری نے ایک پختہ دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے طلب علم کی دی ہے کہ وہ ایک اولوالعزم پیغمبر ہیں، شریعت کاملہ ان کے پاس ہے تو راۃ ان پر نازل کی گئی ہے جس کی شان تیسانا لکل شئی ہے لیکن ان تمام چیزوں کے باوصف تحصیل علم کی خلش حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سفر بحر پر مجبور کر رہی ہے۔

سفر موسیٰ علیہ السلام کی تحقیق | جہاں حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سفر کے متعلق تفصیلی روایت آتی ہے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا سفر بحری نہیں بری ہے، آپ بری سفر قطع فرماتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے کہ جہاں حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوگئی اس لئے ذہاب موسیٰ فی البحر الی الخضر (حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بحر میں خضر کی طرف جانا) درست نہیں بلکہ واقعہ کے خلاف ہے، امام بخاری کا بھی یہی مختار ہے، اور آگے روایت کے الفاظ بحر جا یمشیان بھی اسی کے متقاضی ہیں۔ مسند احمد کی ایک روایت میں فاتیا الصخرة ہے جو بری سفر کیلئے مناسب ہے، اس لئے لامحالہ کسی توجیہ کی ضرورت ہوگی۔

حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی توجیہ | حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے یہ توجیہ فرمائی ہے کہ یہاں مضاف محذوف ہے اور یہ دو جگہ ہو سکتا ہے۔

(۱) ایک تو یہ کہ خضر سے پہلے مضاف محذوف مان کر الی مقصد الخضر کہا جائے۔

(۲) دوسرے یہ کہ بحر سے پہلے محذوف مان کر الی ساحل البحر کہا جائے۔

پہلی توجیہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا بحری سفر اپنے مقصد کے تحت نہیں ہے بلکہ وہ خضر کے ساتھ حضرت خضر ہی کے مقصد کے لئے ہے لیکن حافظ ابن حجر کی اس توجیہ پر اھکال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد سفر حضرت خضر کی ذات نہیں بلکہ حضرت خضر سے تحصیل علم ہے جیسا کہ آیت کریمہ تلاتی ہے۔

هل اتبعك على ان تعلمني | کیا میں آپ کے ساتھ چلوں اس شرط پر کہ آپ مجھے تعلیم دیں

اس بنا پر الی مقصد الخضر نہیں بلکہ الی مقصد التعليم ہونا چاہئے، اسی طرح دوسری توجیہ یہ ہے جہاں بحر سے قبل ساحل محذوف مانا گیا ہے، اس توجیہ کا مقصد یہ ہے کہ سفر بحر کے کنارے کنارے ہوا، اس صورت میں فی ساحل البحر کے بعد الی الخضر کہنا ایک زائد از ضرورت بات ہے اور ساحل کی تقدیر سے ناحیہ یا جانب کی تقدیر اولیٰ ہے۔

قسطانی کا رجحان | قسطانی کا رجحان حافظ ابن حجر کی اس رائے کی طرف ہے کہ سفر کہ دو حصہ ہیں ایک بری اور دوسرا بحری، بحری سفر حضرت خضر علیہ السلام کی ملاقات کے بعد قطع کیا گیا ہے لیکن چونکہ مقصد سفر حضرت خضر علیہ السلام کیساتھ رہنے سے پورا ہوتا ہے جو سفر بحر کے بعد حاصل ہوا ہے اسلئے مجموعہ پر ذہاب و سفر کا اطلاق کر دیا گیا جس طرح کہ کل پر جز کا اطلاق کر دیتے ہیں یا سبب پر مقصد کا۔

ابن منیر کا جواب | فی ذہاب موسیٰ الی الخضر میں ابن منیر الی کومع کے معنی میں لے رہے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت خضر کی معیت میں سفر بحر طے ہوا ہے اور الی کومع کے معنی میں لینا محاورات، عرب کے خلاف نہیں ہے خود قرآن کریم میں یہ استعمال موجود ہے، ارشاد ہے

لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِهِمْ
تم ان کے اموال اپنے مالوں کیساتھ ملا کر نہ کھاؤ

یہاں الی مع کے معنی میں ہے، یہ توجیہ ایک درجہ میں قابل تسلیم ہے۔

ابن رشید کی رائے اور حافظ ابن حجر کی تائید | ابن رشید نے فرمایا کہ اس کا بھی تو احتمال ہے کہ بخاری کی رائے میں سفر بحر ہی کا ہو، ابن رشید تو صرف اتنا کہہ کر خاموش

ہو گئے، اب حافظ نے اسکی تائید کی کہ حدیث کے الفاظ ہیں کَانَ يَتَّبِعُ اثْرَ الْحَوَاتِ فِي الْبَحْرِ . ”فی“ کے اندر دو احتمال ہیں یہ موسیٰ سے بھی متعلق ہو سکتا ہے اور حوت سے بھی، موسیٰ سے متعلق ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت موسیٰ سمندر میں مچھلی کے اثر پر چل رہے تھے اور اگر حوت سے متعلق ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت موسیٰ تلاش فرما رہے تھے مچھلی کے نشان کو جو اس نے بحر میں قائم کر دیا تھا یعنی اذا فُقدت الحوت فهُو ثَمَّه میں جس چیز کی نشاندہی فرمائی گئی تھی موسیٰ چلکر اسکی تلاش کر رہے ہیں کہ وہ نشان بحر کے کس حصہ میں بنا ہے، اس تقدیر پر خود موسیٰ علیہ السلام بحر میں نہیں ہیں بلکہ بحر میں مچھلی ہے جو نشان بناتے ہوئے اندر داخل ہو گئی تو ظرف کے اندر یہ دونوں احتمال ہیں پہلے احتمال پر موسیٰ علیہ السلام سمندر کے اندر ہیں اور دوسرے پر باہر، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ شاید ابن رشید کے نزدیک پہلا احتمال کسی وجہ سے قوی ہو گیا ہو اور اس قوت کے لئے حافظ نے مسند عبد بن حمید سے ابو العالیہ کی ایک روایت پیش کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں۔

ان موسیٰ التقی بالخضر فی

موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات خضر سے سمندر

جزیرۃ من جزائر البحر کے جزیروں میں سے کسی جزیرہ میں ہوئی۔

اس روایت میں حضرت خضرؑ کی ملاقات جزیرہ میں دکھائی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بحری سفر طے کر کے حضرت خضر کے پاس پہنچے ہیں کیونکہ بحری سفر طے کئے بغیر جزیرہ میں پہنچنا سمجھ میں نہیں آتا اور پھر مسند عبد حمید ہی سے دوسری روایت ربیع بن انس کے طریق سے لارہے ہیں اس کے الفاظ یہ ہیں۔

قال انجاب الماء عن مسلك الحوت فصار طاقة مفتوحة فدخلها موسى على اثر الحوت حتى انتهى الى الخضر۔

جس راستے پر مچھلی پانی میں داخل ہوئی وہاں پانی میں طاق کی طرح راستہ کھل گیا اور اسمیں سرنگ بن گئی انہیں نشانات پر موسیٰ علیہ السلام پانی میں داخل ہوئے اور جس مقام پر اثر حوت ختم ہوا وہاں حضرت خضر سے ملاقات ہوئی

اس روایت میں بھی صاف طور پر سفر بحر اور اسکی تفصیل موجود ہے لیکن اگر ان روایات میں روادا کی ثقاہت سے قطع نظر انقطاع روایات وجہ تامل ہو اور اس قول مشہور کا اعتبار کریں جس میں دونوں کی ملاقات مجمع البحرین میں بتلائی گئی ہے تو حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز کی بات سب سے زیادہ صاف اور قوی ہے۔

حضرت شیخ الہند کا ارشاد | حضرت شیخ الہند قدس سرہ ان تمام تکلفات سے الگ ہو کر یہ فرماتے ہیں کہ فی ذہاب موسیٰ فی البحر الی الخضر میں واو عاطفہ محذوف ہے اور اہل عرب بلکہ ہرزبان والے قرآن اور ذہن سامع پر اعتماد کر کے ایسا کر دیتے ہیں، اب ان کے معنی یہ ہوں گے کہ سفر دو ہیں ایک بری اور دوسرا بحری "الی الخضر" کا سفر بری ہے جو ملاقات خضر علیہ السلام کے لئے ہے اور دوسرا سفر بحری جسے "فی البحر" سے تعبیر کیا گیا ہے، یہ حضرت خضر کی معیت میں ہے، یہ بات بالکل بے غبار ہے لیکن اس پر یہ اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ واقعہ کی ترتیب کے مطابق الی الخضر فی البحر ہونا چاہئے تھا کیونکہ بری سفر پہلے ہے اور بحری بعد میں حالانکہ امام بخاری نے فی البحر کو مقدم رکھا ہے، اس تقدیم کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بر کا سفر وسیلہ ہے اور بحر کا مقصود نیز یہ کہ بحر کے سفر میں خطرات زیادہ ہیں اس لئے سفر بحر کو سفر بر پر مقدم رکھا۔

تشریح حدیث | حدیث شریف میں ہے کہ حضرت ابن عباس اور حبن قیس کا آپس میں یہ اختلاف ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کس کے پاس سفر کر کے گئے تھے، ایک طرف ابن عباس اور دوسری طرف حبن قیس، ابن عباس تو خضر بتاتے ہیں لیکن حر کے متعلق معلوم نہیں کہ ان کی رائے کیا تھی، لیکن جھگڑے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خضر کے علاوہ اور کسی کے بارے میں فرماتے ہوں گے، بخاری جلد ثانی کتاب التفسیر میں سعید بن جبیر اور نوف بکالی کا اختلاف ہوا ہے کہ موسیٰ سے مراد پیغمبر بنی اسرائیل ہیں یا موسیٰ ابن یثا ابن یوسف بن یعقوب علیہ السلام ہیں، یہ دونوں اختلافات الگ الگ ہیں، حبن قیس اور ابن عباس باہم دگر جھگڑ رہے تھے کہ حضرت ابی بن کعب ادھر سے گزرے،

حضرت ابن عباس نے بلایا اور کہا کہ حضور ہمارا فیصلہ کر دیجئے شاید آپ نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کچھ سنا ہو، حضرت ابی نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے یہ ارشاد سنا ہے کہ ایک دن حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کے بڑے مجمع میں نصیحت فرما رہے تھے ایک شخص نے یہ پوچھا کیا آپ کے علم میں کوئی ایسا شخص ہے جو علم میں آپ سے زائد ہو، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ میرے علم میں ایسا کوئی نہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب واقعہ کے اعتبار سے بالکل درست ہے کہ آپ پیغمبر ہیں اور پیغمبر کے علم کے مقابلہ پر غیر پیغمبر کا علم ہیچ ہوتا ہے، پھر یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ فرمایا کہ میرے علم میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے یہ بات قابل اعتراض نہیں، لیکن موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ شان رفیع کے لحاظ سے یہ جواب نامناسب تھا اسلئے اس پر گرفت ہوئی، مناسب جواب یہ تھا کہ اللہ اعلم کہتے اس لئے کہ فوق کل ذی علم علیم پھر وحی آئی بلسی عبدنا خضر یعنی ہم نے خضر کو اور دوسرے علوم دئے ہیں جو آپ کے پاس نہیں ہیں اسلئے وہ اعلم ہے، اب موسیٰ علیہ السلام کو شوق ہوا اور خداوند قدوس سے عرض کیا کہ ان سے ملاقات کی کیا سبیل ہے، اللہ تعالیٰ نے راستہ عجیب و غریب بتلادیا جس کو ظاہری طور پر سمجھنا بہت مشکل ہے، یہ نہیں بتلاتے کہ فلاں سمت جاؤ، یا اتنی منزل طے کرنے کے بعد ملاقات ہوگی بلکہ فرماتے ہیں مچھلی پکا کر رکھ لو، جہاں مچھلی گم ہو جائے وہاں ملاقات ہوگی، یہ جدوجہد ہے اور اس میں ہر چیز مجمل ہے اور یہ اجمال وجدوجہد اس لئے ہے کہ مقام عتاب کا ہے، شفقت کا نہیں ہے، اس لئے بالا جمال یہ بتلادیا کہ آپ مچھلی پکا کر ساتھ رکھ لیں جہاں گم ہو جائے وہیں حضرت خضر سے ملاقات ہوگی، جیسے وہ بات عجیب تھی کہ جلیل القدر صاحب شرع کے مقابل دوسرا شخص علم میں زائد ہو جائے ایسے ہی یہ سبیل بھی عجیب ہے کہ مچھلی جو پکائی اور کھائی جا چکی ہے راہنمائی کرے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی پکا کر ساتھ رکھ لی اور اپنے شاگرد یوشع کو جو حضرت موسیٰ کے بعد نبی بنائے گئے یہ بتلادیا جہاں مچھلی گم ہو مجھے بتلادینا، اس عجیب و غریب معاملہ کے باوجود مچھلی گم ہوئی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام آگے نکلے چلے گئے اور انہیں اطلاع نہ ہو سکی، اس منصب عظیم اور عالمیت کے دعویٰ کے لحاظ سے تنبیہ ہے کہ آپ کو کیا غرہ ہے، تم بکمال احتیاط مچھلی کرنگرانی کرو گے مگر مچھلی گم ہو جائیگی اور تمہیں پتہ نہ چل سکے گا۔

وقیل له اذا فقدت الحوت فارجع فانك ستلقاه فكان موسیٰ يتبع اثر الحوت فی البحر حضرت موسیٰ سے یہ کہہ دیا گیا کہ جب آپ مچھلی گم پائیں تو لوٹ جائیں آپ کی ملاقات ان سے ہو جائیگی، چنانچہ موسیٰ سمندر میں مچھلی کا نشان تلاش کر رہے تھے، مچھلی کے نشان تلاش کرنے کا معاملہ اگر جاتے وقت کا ہے تو معنی یہ ہیں کہ

بخاری جلد ثانی کتاب التفسیر میں اس جگہ سوال ای الناس اعلم کے الفاظ کے ساتھ ہے اور حضرت موسیٰ کا جواب وہاں بھی نفی میں ہے، یہ چیز واقعہ لائق اعتراض تھی کہ یہاں اپنے علم میں نفی نہیں، بلکہ مطلق نفی ہے دونوں روایتوں کے لفظوں کی تطبیق اپنی جگہ آجائے گی۔ ۱۲

حضرت موسیٰ علیہ السلام مچھلی کے غائب ہونے کے انتظار میں تھے کیونکہ مچھلی کا گم ہونا ملاقات کی علامت بتلایا گیا تھا اور اگر یہ واپسی کا واقعہ ہے تو معنی یہ ہیں کہ مچھلی گم ہو گئی، حضرت موسیٰ آگے نکل گئے، بھوک لگی تو شاگرد سے ناشتہ مانگا، شاگرد نے کہا کہ عجیب تماشہ پیش آیا، مچھلی تو اسی پتھر کے پاس گم ہو گئی تھی جہاں آپ آرام فرماتے تھے، ارادہ تھا کہ آپ بیدار ہوں گے تو بتلا دوں گا لیکن برا ہو کم بخت شیطان کا، تذکرہ کرنا ہی بھلا دیا، اب مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سمندر میں مچھلی کے نشانات تلاش فرما رہے تھے، مچھلی جو ناشتہ دان سے زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی تھی آدھی کھائی جا چکی تھی وہ مچھلی کس طرح زندہ ہو گئی، کہا جاتا ہے کہ صحرہ کے پاس آب حیات کا چشمہ تھا اس کا چھینٹا کسی طرح زمبیل میں پڑ گیا اور ممکن ہے کہ حضرت یوشع وضو کر رہے ہوں اس وقت کوئی قطرہ مچھلی پر ٹپک گیا ہو اور مچھلی بقدر الہی زندہ ہو کر زمبیل سے ریگ گئی ہو، اور یوشع اس خرق عادت امر کو دیکھ کر کچھ ایسے مہبوت اور از خود رفته ہو گئے ہوں کہ اور تمام خیالات دماغ سے نکل گئے اور وہ بات یاد نہ رہی ہو کہ مجھے کیا ذمہ داری سوچنی گئی ہے۔

واللہ اعلم

اس آدھا سر کھائی ہوئی مچھلی کی نسل دریائے نیل میں آج بھی موجود ہے، یہ قدرت کی باتیں ہیں فکنا یقسان من اثار ہما قصصاً اپنے نشانات قدم تلاش کرتے ہوئے واپس ہو رہے تھے گویا واپسی میں دو چیزوں پر نظر ہے، ایک اپنے نشانات قدم پر تا کہ راستہ غلط نہ ہو جائے اور کہیں سے کہیں نہ نکل جائیں اور دوسرے مچھلی کے اثر کی تلاش ہے، زمین پر اپنے نشانات اور پانی میں مچھلی کا اثر ڈھونڈ رہے ہیں، غرض حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہو گئی اور وہ واقعہ پیش آیا جس کی تفصیل قرآن کریم میں ہے۔

[۱۷] بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ اَللّٰهُمَّ عَلِّمْنِي الْكِتَابَ

(۷۵) حَدَّثَنَا أَبُو مَعْمَرٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ ثَنَا خَالِدٌ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ

قَالَ ضَمَّنِي رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَقَالَ اَللّٰهُمَّ عَلِّمْنِي الْكِتَابَ. (آئندہ: ۱۲۳، ۳۷۵۶، ۷۲۷۰)

ترجمہ | باب، رسول اکرم ﷺ کا ارشاد کہ اے اللہ! اسے علم کتاب سکھا دے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے مجھے سینہ سے لگایا اور فرمایا اے اللہ! اسے علم کتاب عطا فرما۔

مقصد ترجمہ | حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ترجمہ میں حدیث کے الفاظ رکھ دیئے، یہ پتہ نہیں دیا کہ ان دعائیہ کلمات کا تعلق کسی خاص ذات سے ہے، اس میں اشارہ ہے کہ ان الفاظ کا استعمال دوسروں کے لئے بھی ہو سکتا ہے، یہ جواز ابن عباس کی خصوصیت نہیں ہے، اس معنی کے لحاظ سے علمہ کا مرجع کوئی مخصوص شخص نہ ہوگا اور یہ ہو سکتا ہے کہ مرجع ضمیر ابن عباس ہوں جنکا ذکر سابق باب کی حدیث میں آچکا ہے اور اس طرف اشارہ ہو کہ خربن قیس کے مقابلہ پر ابن عباس کی کامیابی پیغمبر علیہ السلام کی اسی دعاء کا اثر تھا، علامہ عینی بھی قریب قریب یہی فرما رہے ہیں،

رسول اکرم ﷺ نے حضرت ابن عباس کے لئے علم کتاب کے عطا ہونے کی دعا فرمائی، اس سے ایک طرف تو علم دین کا فضل و شرف ظاہر ہو رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ حضرت ابن عباس کا ایک خصوصی فضل بھی واضح ہے، اسی وجہ سے امام بخاری نے اس روایت کو یہاں اور مناقب ابن عباس دونوں جگہ ذکر فرمایا ہے۔

حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ علم اور حضرت ابن عباس کی منقبت کے علاوہ اس ترجمہ سے امام بخاری ایک دوسرے امر پر تشبیہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ کہ علم کا قابل غبطہ ہونا، معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس مشکل ترین سفر کا مقصد زائد از ضرورت علم کا حصول تھا، جس سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ طلب علم کے سلسلہ میں انسان کو زیادہ سے زیادہ مشقت برداشت کرنی چاہئے، خاص طور پر علم کتاب اور بھی زیادہ توجہات اور جان سپاری کا متقاضی ہے کیونکہ کتاب اللہ کا علم خداوند کریم کا خصوصی فضل اور عظیم الشان انعام ہے، ہر شخص اس کا مستحق نہیں ہو سکتا، یہ تو انہیں حضرات کو مل سکتا ہے جن کا طریق انابت الی اللہ رہا ہو اور ہمہ وقت اس کی بارگاہ عالی میں عاجزانہ تضرع اور زاری کے ساتھ اپنی التجا پیش کرتے رہے ہوں۔

الحاصل اس ترجمہ میں اس پر زور دینا مقصود ہے کہ ضروریات تعلیم میں جہاں متعلم کی اپنی سعی و کوشش ضروری ہے وہاں اس سے زیادہ دعا اور التجاء الی اللہ کی ضرورت ہے اس کے بغیر اس مقصد کی کامیابی دشوار ہے تحصیل علم کے سلسلہ میں انسان کو اپنی ذکاوت و ذہانت اور سعی و جدوجہد کے اعتماد پر نہ بیٹھنا چاہئے بلکہ یہ چیز خداوند قدوس کا خاص انعام ہے اور اس کا حصول خداوند قدوس کی مہربانی کے بغیر ناممکن ہے اور وہ مہربانی صالحین کی دعا کے بغیر مشکل ہے، صالحین کی خدمت میں حاضری دو اور پورے ادب کیساتھ ان کا ائصال کرتے ہوئے ان کو اپنی طرف متوجہ کر نیکی سعی میں لگے رہو اور موقعہ بہ موقعہ ان سے دعاء کی درخواست کرو وہ تمہاری درخواست پر یا از خود بتقاضائے حسن احوال تمہارے لئے ہر قسم کی خیر کی دعاء فرمادیں گے، خصوصیت کے ساتھ علوم کتاب کی تمہارا بیڑہ پار ہو جائیگا اور تم اپنے مقصد میں فائز الرام اور کامیاب ہو گے، اسلئے حصول علم کی خاطر ذکاوت و ذہانت، سعی و جدوجہد کے ساتھ ساتھ دعا و التجاء اور انابت الی اللہ کی خاص ضرورت ہے۔

تشریح حدیث | حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے مجھے سینہ سے لگا کر یہ دعا دی کہ اللھم علمہ الكتاب، کتاب کے اندر پورے احکام شرعیہ آجاتے ہیں، معلوم ہوا کہ احکام شرعیہ اور علوم دینیہ کا سرچشمہ پیغمبر علیہ السلام کا صدر ہے جس کو بھی یہ دولت ملے گی آپ ہی کے صدر سے ملے گی، جس کا جس قدر صدر پیغمبر علیہ السلام کے صدر کے محاذ میں ہوگا اسی قدر اسی پر فیضانِ علوم ہوگا، اور محاذات صدر کا دار و مدار ہے اتباع سنت اور بجا آوری احکام خداوندی پر جس قدر اطاعت ہوگی اسی قدر پیغمبر علیہ السلام سے قربت ہوگی، یہاں حضرت ابن عباس کے سینہ کو اپنے صدر مبارک سے ملا کر افاضہ علوم فرمایا اور حضرت ابو ہریرہ کی طلب پر صدر مبارک سے کوئی چیز

نکال کر انکی چادر میں رکھ دی اور ارشاد ہوا کہ اسے اپنے سینے سے لگا لو جس سے ابو ہریرہ کا سینہ گنجینہ علوم نبوی بن گیا اور دیکھئے انتقال علوم کا یہی طریق حضرت حق جل مجدہ کی نیابت میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ کے ساتھ اختیار کیا تھا، صالحین امت میں بعض اہل اللہ کا عمل بھی اسی قسم کا رہا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کو رسول اکرم ﷺ کی جو یہ مخصوص شفقت حاصل ہوئی اس کے لئے حدیث میں دو واقعے ملتے ہیں ایک کا تعلق خدمت سے ہے اور دوسرے کا ادب و احترام سے، دونوں ہی واقعات دعا کا سبب ہو سکتے ہیں، ایک واقعہ تو یہ کہ حضرت ابن عباسؓ اپنی خالہ میمونہ کے مکان میں والد کے حکم سے حاضر ہوئے کہ پیغمبر علیہ السلام کے رات کے اعمال کو دیکھیں اور اس سے والد کو مطلع کریں یعنی یہ دیکھیں کہ آپ کی رات کی عبادت کیا ہے، کتنی رکعات ہیں، وقت کیا ہے، شان کیسی ہے وغیرہ وغیرہ تو حضرت ابن عباسؓ موجود تھے، رسول اکرم ﷺ قضائے حاجت کی ضرورت سے تشریف لے گئے تو حضرت ابن عباسؓ نے آرام کی غرض سے پانی بھر کر رکھ دیا، آپ تشریف لائے پوچھا کہ پانی کس نے رکھا ہے، معلوم ہوا ابن عباسؓ نے، آپ خوش ہوئے اور دعا دی، اس عمل میں ایسی کون سی بات ہے جس نے ان کو اس خصوصی دعا کا مستحق بنایا تو بات یہ ہے کہ جب آپ قضاء حاجت کے لئے بیت الخلاء میں تشریف لے گئے تو ابن عباسؓ نے سوچا کہ جب میں یہاں حاضر ہوں تو مجھے کوئی خدمت انجام دینا چاہئے، اس سلسلہ میں تین صورتیں سامنے آئیں، پانی لیکر خلاء میں حاضر ہونا، بیت الخلاء کے باہر آپ کے قریب پانی رکھ دینا، یا آپ کی طلب پر پانی حاضر کرنا، سو پہلی صورت میں بے پردگی تھی اور تیسری صورت میں تاخیر عمل کا خطرہ تھا البتہ دوسری صورت میں تستر کی بھی رعایت تھی اور فوری طور پر خلا سے باہر تشریف لا کر استنجاء بالماء میں انکی اعانت بھی ہوتی تھی، لہذا اسی کو اختیار کیا، درحقیقت یہ ان کی ذکاوت اور سمجھداری کی بات تھی جزاء من جنس العمل کے اصول پر آپ نے اللہم علمہ علم الكتاب کی دعا فرمائی یعنی حق تعالیٰ ان کو اور زیادہ فہم سلیم اور دانائی عطا فرمائے، معلوم ہوا کہ بزرگوں کی خدمت اور اس کے صلہ میں دعاؤں کا حصول علم کے لئے مدد و معاون ہے، یہ روایت خود بخاری شریف میں کتاب الوضوء میں موجود ہے۔

دوسری روایت مسند احمد میں موجود ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے حضرت ابن عباسؓ کو تہجد کی نماز میں داہنی طرف اپنے برابر کھڑا کر لیا، ابن عباسؓ پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو گئے، آپ نے پھر برابر میں کھڑا کیا، پھر پیچھے ہو گئے، اب حضرت ابن عباسؓ سے آپ نے فرمایا کہ تمہیں کیا ہو گیا کہ میں تو تمہیں بار بار اپنے برابر کھڑا کرتا ہوں اور تم پیچھے ہو جاتے ہو، اس پر حضرت ابن عباسؓ نے جواب میں عرض کیا کہ کیا کسی شخص کے لئے یہ مناسب ہوگا کہ وہ آپ کے

دوسری روایات سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ زمانہ حضرت میمونہ کے حیض کا زمانہ تھا اس لئے یہ شبہ غلط ہے کہ ایسے کمرہ میں جہاں دو آدمیوں کی جگہ بھی مشکل سے نکلتی ہو ایک تیسرے انسان کا خانگی معاملات کا جائزہ لینے کیلئے رات کے وقت قیام کرنا کس طرح درست ہو سکتا ہے۔ ۱۲

برابر کھڑا ہو حالانکہ آپ اللہ کے رسول ہیں یعنی رسول کے برابر کھڑا ہونا بے ادبی ہے، آپ اس جواب سے خوش ہوئے اور دعادی اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کا ادب و احترام بھی ان کی دعائیں حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ بہر کیف حدیث سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ فہم و ذکاوت اور محنت کے علاوہ بزرگوں کی دعائیں بھی حصول علم کے لئے نہایت ضروری ہیں اور ان دعاؤں کے حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ بزرگوں کی خدمت کیجائے اور ان کے ادب و احترام کا پورا پورا لحاظ کیا جائے جیسا کہ حضرت ابن عباسؓ نے رسول اکرم ﷺ سے علم کتاب کی دعا حاصل کی اور صحابہ کرام کے درمیان علمی اعتبار سے امتیازی مقام حاصل کیا۔

[۱۸] بَابُ مَتَى يَصِحُّ سَمَاعُ الصَّغِيرِ

(۷۶) حَدَّثَنَا إِسْمَاعِيلُ قَالَ حَدَّثَنِي مَالِكٌ عَنْ ابْنِ شَهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُتْبَةَ عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَقْبَلْتُ رَاكِبًا عَلَى حِمَارٍ أَتَانِ وَأَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْإِحْتِلَامَ وَرَسُولُ اللَّهِ ﷺ يُصَلِّي بِمَنَى إِلَى غَيْرِ جِدَارٍ فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِّ وَأَرْسَلْتُ الْإِتَانَ تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ فَلَمْ يُنْكِرْ ذَلِكَ عَلَيَّ .

(آئندہ: ۲۹۳، ۸۶۱، ۱۸۵۷، ۴۲۱۲)

ترجمہ | باب، نابالغ کا حدیث سننا کب درست ہے، حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے کہ میں گدھیا کی سواری پر سوار ہو کر آیا اور میں اس رقت قریب الاحتمام تھا، رسول اکرم ﷺ منیٰ میں دیوار کا سترہ بنائے بغیر نماز ادا فرما رہے تھے، میں کچھ صف کے سامنے سے گزرا اور میں نے گدھی کو چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور صف میں شریک ہو گیا، چنانچہ کسی نے اس بارے میں مجھ پر اعتراض نہیں کیا۔

ترجمہ کا مقصد اور باب سابق سے ربط | پچھلے باب میں گزر چکا ہے کہ بچپن میں حضرت ابن عباسؓ نے آن حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعائیں حاصل کیں اور نابالغ

ہونے کے بعد ان دعاؤں کو نقل کیا اور آپ کی اس نقل پر پورا پورا اعتماد کیا گیا، ابن عباس صغیر تھے، اسی مناسبت سے یہ دوسرا باب متی یصح سماع الصغیر رکھ دیا، حافظ ابن حجر نے باب کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ تحمل حدیث کے وقت نابالغ ہونا شرط نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اگرچہ اداء حدیث کے وقت راوی کا نابالغ ہونا شرط ہے لیکن تحمل کے لئے بلوغ مشروط نہیں، اگر کوئی بچہ اچھے برے کی تمیز رکھتا ہے تو وہ اس عمر کے واقعات بلوغ کے بعد نقل کر سکتا ہے، علامہ سندھی نے بھی یہی نتیجہ نکالا ہے کہ باب کے ذیل میں نقل کی ہوئی دونوں حدیثیں بتلاتی ہیں کہ تحمل

حدیث کے لئے کسی خاص عمر کی قید یا بلوغ کی شرط نہیں بلکہ سن تخل مطلقاً سن تعقل ہے، جب بچہ سمجھدار ہو جائے تو وہ حامل حدیث ہو سکتا ہے۔

ان تمام ارشادات سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ محدثین کرام اداء حدیث کے وقت تو بالاتفاق بلوغ کی قید لگاتے ہیں، لیکن یہ بات مختلف فیہ ہے کہ تخل کے وقت بھی اس کی قید ہے یا نہیں، یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ کم از کم تخل حدیث کے وقت راوی کی عمر پندرہ سال ہونی چاہئے، دوسرے بعض حضرات سے عمر کے سلسلہ میں پانچ یا نو سال کے اقوال بھی منقول ہوئے ہیں، لیکن یہ تحدید مذاق جمہور کے خلاف ہے کیونکہ صحابہ کرام نے ابن عباس، ابن زبیر، نعمان بن بشیر اور انس رضی اللہ عنہم اجمعین کی روایات کو بغیر شک و شبہ اور عمر کے بارے میں کسی استفسار کے بغیر قابل قبول قرار دیا، خصوصاً حضرت عبداللہ بن زبیر اور نعمان بن بشیر کہ ان کی عمر آپ کی وفات کے وقت دس سال سے کم تھی عمر کے بارے میں اگر کوئی تحدید ہوتی تو ان لوگوں سے روایت بیان کرتے وقت عمر کے بارے میں استفسار ہوتا کہ آپ نے جس وقت زبان رسالت سے یہ ارشاد سنا تھا تو اس وقت آپ کی عمر کیا تھی لیکن ایسا نہیں کیا گیا، معلوم ہوا کہ عمر کے بارے میں کوئی تحدید نہیں ہے بلکہ مدار صرف ہوشیاری و سمجھداری ہے، سمجھدار بچہ اگر بچپن کی کوئی بات بلوغ کے بعد نقل کرتا ہے تو وہ معتبر ہے اور اعتبار کی دلیل یہ ہے کہ اس حدیث پر محدثین اور فقہاء نے متعدد مسائل کی بنیاد رکھی ہے اور استدلال کیا ہے، مثلاً یہ کہ جنگل میں بغیر سترہ کے نماز درست ہے، یا جنگل میں دیوار کے علاوہ کسی اور چیز کا سترہ بنانا درست ہے اور امام کا سترہ مقتدیوں کا سترہ شمار کیا جائیگا، اور حمار کی سواری جائز ہے، خواہ مادہ خربہ کیوں نہ ہو، اور یہ کہ حمار کا نماز کے سامنے سے گزرنا نماز میں فساد نہیں پیدا کرتا اور یہ کہ جب امام سترہ کی طرف نماز پڑھ رہا ہو تو کسی انسان یا حیوان کا صف کے اندر سے گزرنا مضرت نہیں، ہاں امام اور سترہ کے مابین گزرنا جرم قرار دیا جائے گا۔

تشریح حدیث | یہ ۱۰ھ حجۃ الوداع کا ذکر ہے کہ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں منیٰ میں ایک گدھیا پر سوار ہو کر پہنچا، اس وقت میں ختم تو نہ تھا لیکن قریب الاحتمام تھا اور آپ غیر دیوار کی جانب نماز پڑھا رہے تھے یعنی آپ نے دیوار کا سترہ نہیں بنایا تھا بلکہ کسی اور چیز کا سترہ تھا، بیہقی نے اس کے معنی الی غیر سترة کے لئے ہیں یعنی نماز بغیر سترہ کے ہو رہی تھی، بیہقی نے یہ معنی حضرت امام شافعی سے لئے ہیں لیکن امام بخاری اس کی تائید نہیں کرتے بلکہ الی سترة غیر جدار فرماتے ہیں کیونکہ امام بخاری نے اسی روایت پر کتاب الصلوٰۃ میں سترة الامام سترة لمن خلفہ ترجمہ رکھا ہے، معلوم ہوا کہ امام کی نظر میں نماز بغیر سترہ کے نہیں ہے، ہاں وہ سترہ دیوار نہ تھی

یہاں امام بخاری نے حصار اقان دونوں لفظ نقل فرمائے ہیں اتان حمار کی صفت بھی ہو سکتا ہے اور بدل بھی اور اس لفظ کو بڑھانے کا فائدہ یہ ہے کہ حمار اسم جنس ہے اور اس کا اطلاق مذکر و مؤنث دونوں پر کیا جاتا ہے، ایسی صورت میں اگر صرف حمار فرماتے تو گدھیا کے معنی معین نہ ہوتے، ہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ حمار کا مادین ہونا ہی بتلانا مقصود تھا

تو حمارۃ فرمادیتے اتان کی ضرورت نہ تھی، اس کے علامہ عینی رحمہ اللہ نے دو جواب دیئے ہیں، ایک شیخ شمس الدین صنعانی لاہوری حنفی کے واسطے سے یہ صاحب نسخہ بخاری اور امام لغت ہیں، فرماتے ہیں کہ حمارۃ کا اطلاق مشترک طور پر حماراٹی اور فرس جبین (یعنی دوغلا گھوڑا) پر آتا ہے اس لئے حمارۃ سے بھی معنی معین نہ ہوتے اور غلط فہمی کے علاوہ خاص مقصد جو اس سے متعلق ہے کہ حمار کا مصلی کے سامنے سے گزرنا قاطع الصلوٰۃ نہیں ہے، حاصل نہ ہو سکتا، دوسرا جواب صحاح جوہری سے نقل کرتے ہیں کہ حمارۃ کا اطلاق مادیں پر شاذ ہے دونوں جواب عمدہ ہیں۔

آگے فرماتے ہیں کہ میں بحالت رکوب صف کے سامنے ہوتا ہوا ایک طرف کو اتر کر صف میں شامل ہو گیا اور سواری کو چھوڑ دیا کہ چرتی پھرے، پھر کسی نے اس سلسلہ میں مجھ سے باز پرس نہیں کی اور نہ اس پر انکار کیا یعنی نہ نماز کی حالت میں، نہ نماز سے باہر ہونے کے بعد، نہ اشارہ سے نہ کلام کے ذریعہ، معلوم ہوا کہ گدھیا کے سامنے سے گزرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، جب گدھیا سے نہیں ہوتی تو عورت کے گزرنے سے بدرجہ اولیٰ نہ ہوگی، اس باز پرس نہ کرنے سے وہ تمام مسائل اس حدیث سے نکالے گئے ہیں جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

یہاں ایک اشکال یہ ہو سکتا ہے کہ جب یہ سب حضرات شریک نماز تھے تو باز پرس کون کرتا لیکن یہ درست نہیں، اول تو اشارہ سے بھی منع کیا جاسکتا تھا اور نہ کم از کم نماز کے بعد ضرور یہی تنبیہ کی جاتی لیکن دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت بھی پیش نہیں آئی معلوم ہوا کہ اس میں کوئی حرج ہی نہیں۔

بہر کیف حضرت ابن عباس کی صغریٰ کے باوجود اس روایت کو لیا گیا اور اس سے مسائل کا استخراج کیا گیا، ترجمہ ثابت ہو گیا کہ اگر ہوشیار بچہ بلوغ سے قبل کی بات بلوغ کے بعد بیان کرے تو اس کا اعتبار ہوگا۔

(۷۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ يُوسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُو مُسْهِرٍ قَالَ حَدَّثَنِي مُحَمَّدُ بْنُ

حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنِي الزُّبَيْدِيُّ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنِ مَحْمُودِ بْنِ الرَّبِيعِ قَالَ عَقَلْتُ مِنَ النَّبِيِّ

ﷺ مَجَّةً مَجَّهَا فِي وَجْهِهِ وَأَنَا ابْنُ خَمْسِ سِنِينَ مِنْ دَلْوٍ .

(آئندہ: ۱۸۹، ۸۳۹، ۱۱۸۵، ۶۳۵۳، ۶۳۲۲)

ترجمہ حضرت محمود بن الربیع سے روایت ہے کہ مجھے رسول اکرم ﷺ کی وہ کلی یاد ہے جو آپ نے ڈول سے پانی لیکر میرے منہ پر کی تھی اور اس وقت میں پانچ سال کا تھا۔

تشریح حدیث اس مقصد کے لئے دوسرا واقعہ حضرت محمود بن الربیع کا لار ہے ہیں، نبی اکرم ﷺ ان کے گھر تشریف لے گئے اور پانی طلب کیا، انہوں نے پانی پیش کیا، آپ نے پانی پیا اور ایک کلی

ان کے منہ پر ڈال دی، اس وقت عمر پانچ سال کی تھی، اس حدیث سے یہ چند مسائل نکالے گئے ہیں کہ بچوں سے مذاق کرنا بشرطیکہ فتنہ کا اندیشہ نہ ہو جائز ہے، کسی مقتدی کا برکت دینے کی غرض سے کسی کے منہ پر کلی ڈالنا یا اور کسی طرح

برکت دینا جائز ہے، ایک یہ نکلا کہ لعاب دہن ناپاک نہیں ہے، یہی جمہور کا مسلک بھی ہے اور کچھ بھی نہ ہو تو اس بیان سے محمود بن ربیع کا صحابی ہونا ثابت ہو رہا ہے۔

حاصل یہ کہ بخاری نے دو واقعات پیش کر کے یہ بتلا دیا کہ اگر تحمل روایت کے لئے بلوغ کی شرط ہوتی تو بہت سی ایسی روایات جن سے سنن پر استدلال ہوتا ہے ختم ہو جاتیں، یہاں امام بخاری نے ابن زبیر کا واقعہ نقل نہیں فرمایا کہ انہوں نے غزوہ احزاب میں اپنے والد کو دیکھا کہ بڑھ بڑھ کے بنو قریظہ کی طرف جا رہے ہیں اور اس وقت ان کی عمر تین سال کی تھی، غالباً نقل نہ کرنے کی وجہ یہ ہوگی کہ بخاری نے ایسی روایات لی ہیں جن سے مسائل یا سنن کا ثبوت ہوتا ہے، باقی وہ روایات جن سے کوئی مسئلہ متعلق نہیں ہے امام نے ذکر نہیں فرمائیں کیونکہ صرف یہ ارشاد کہ آپ بڑھ بڑھ کر بنو قریظہ کی طرف جا رہے تھے، ایک واقعہ کا ذکر ہے کوئی مسئلہ نہیں۔
واللہ اعلم

[۱۹] بَابُ الْخُرُوجِ فِي طَلَبِ الْعِلْمِ

وَرَحَلَ جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللَّهِ مَسِيرَةَ شَهْرِ إِلَى عَبْدِ اللَّهِ بْنِ أُتَيْسٍ فِي حَدِيثٍ وَاحِدٍ
(۷۸) حَدَّثَنَا أَبُو الْقَاسِمِ خَالِدُ بْنُ خَلِيٍّ قَاضِي حِمصَ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ
الْأَوْزَاعِيُّ أَخْبَرَنَا الزُّهْرِيُّ عَنْ عُبيدِ اللَّهِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عُتْبَةَ بْنِ مَسْعُودٍ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ
أَنَّهُ تَمَارِيُّ هُوَ وَالْحَرُثِيُّ بْنُ قَيْسٍ بْنِ حِصْنِ الْفَزَارِيِّ فِي صَاحِبِ مُوسَى فَمَرَّ بِهِمَا أَبِي بْنُ
كَعْبٍ فَدَعَاهُ ابْنُ عَبَّاسٍ فَقَالَ إِنِّي تَمَارِيْتُ أَنَا وَصَاحِبِي هَذَا فِي صَاحِبِ مُوسَى الَّذِي
سَأَلَ السَّبِيلَ إِلَى لُقْيِهِ هَلْ سَمِعْتَ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَذْكُرُ شَأْنَهُ فَقَالَ أَبِي نَعَمْ سَمِعْتُ
رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَذْكُرُ شَأْنَهُ يَقُولُ بَيْنَمَا مُوسَى فِي مَلَأَ مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ إِذْ جَاءَهُ
رَجُلٌ فَقَالَ هَلْ تَعْلَمُ أَحَدًا أَعْلَمَ مِنْكَ قَالَ مُوسَى لَا فَأَوْحَى اللَّهُ إِلَيَّ مُوسَى بَلَى عَبْدُنَا
خَضِرٌ فَسَأَلَ السَّبِيلَ إِلَى لُقْيِهِ فَجَعَلَ اللَّهُ لَهُ الْحُوتَ آيَةً وَقِيلَ لَهُ إِذَا فَقَدْتَ الْحُوتَ
فَارْجِعْ فَإِنَّكَ سَتَلْقَاهُ فَكَانَ مُوسَى يَتَّبِعُ آثَرَ الْحُوتِ فِي الْبَحْرِ فَقَالَ فَتَى مُوسَى لِمُوسَى
أَرَأَيْتَ إِذْ أَوَيْنَا إِلَى الصَّخْرَةِ فَإِنِّي نَسِيتُ الْحُوتَ وَمَا أَنْسَانِيهِ إِلَّا الشَّيْطَانُ أَنْ أَذْكُرَهُ
قَالَ مُوسَى ذَلِكَ مَا كُنَّا نَبْعُ فَارْتَدَّا عَلَى آثَارِهِمَا قَصَصًا فَوَجَدَا خَضِرًا فَكَانَ مِنْ
شَاهِمَا مَا قَصَّ اللَّهُ فِي كِتَابِهِ .
(گذشتہ: ۷۳)

ترجمہ | باب، حصول علم کے لئے سفر کرنا، حضرت جابر بن عبد اللہ نے ایک حدیث کے لئے حضرت عبد اللہ ابن انیس کی طرف ایک ماہ کی مسافت کا سفر کیا، حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ وہ اور حرث بن قیس بن حصن

الفراری حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی کے بارے میں جھگڑے چنانچہ ان دونوں کے پاس سے ابی بن کعب گزرے، ابن عباس نے انہیں بلایا اور کہا کہ میرے اور میرے ان ساتھی کے درمیان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ساتھی کے بارے میں جھگڑا ہوا جن کی ملاقات کیلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے راستہ پوچھا تھا، کیا آپ نے رسول اکرم ﷺ سے ان کا حال بیان کرتے ہوئے کچھ سنا ہے؟ حضرت ابی نے فرمایا ہاں میں نے رسول اکرم ﷺ کو ان کا حال بیان فرماتے سنا ہے، فرماتے تھے، اس اثناء میں کہ موسیٰ بنی اسرائیل کی ایک جماعت میں تھے کہ اچانک ایک آدمی آیا اور اس نے کہا کیا آپ کسی کو اپنے سے زیادہ عالم جانتے ہیں، حضرت موسیٰ نے فرمایا نہیں، پس اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر وحی نازل فرمائی، کیوں نہیں! ہمارا بندہ خضر آپ سے زیادہ دانا ہے، حضرت موسیٰ نے ان تک پہنچنے کا راستہ پوچھا پس اللہ نے ان کے لئے مچھلی کو نشان کر دیا اور ان سے یہ کہہ دیا گیا کہ جب تم مچھلی کو گم پاؤ تو لوٹ پڑنا یقین رکھو کہ قریب ہی تمہاری ملاقات ہو جائیگی، پس موسیٰ تھے کہ چل رہے تھے تاکہ پانی میں مچھلی کے نشان کو معلوم کریں، پس حضرت موسیٰ سے ان کے نوجوان رفیق سفر نے کہا کیا آپ نے دیکھا جب ہم صحرہ کے پاس ٹھہرے تھے تو میں مچھلی کو بھول گیا اور نہیں بھلایا مجھ کو مگر شیطان نے کہ میں اسے یاد رکھتا اور اس کا ذکر آپ سے کرتا، موسیٰ نے فرمایا یہی تو وہ چیز تھی جس کے ہم متلاشی تھے، چنانچہ دونوں اپنے نقشہائے قدم پر تلاش کرتے ہوئے واپس ہوئے تو حضرت خضر سے ملاقات ہو گئی، پھر دونوں کا وہ معاملہ ہوا جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اپنے کتاب میں فرمایا ہے۔

مقصد ترجمہ | پچھلے ابواب میں علم کی اہمیت پر پورا پورا زور دیا جا چکا ہے اور اس کے حصول کے بھی مختلف طریقے ذکر ہو چکے ہیں، بخاری یہ بتلاتے ہیں کہ جب علم کی ضرورت معلوم ہوگی اور واضح ہو گیا کہ دین اور دنیا کا کوئی کام علم کے بغیر ناممکن ہے حتیٰ کہ دنیوی کاموں میں تجارت، زراعت تک علم کے محتاج ہیں تو دینی ضرورت کا معاملہ تو نہایت اہم اور واضح ہے، جب علم اس درجہ ضروری ہے تو اگر آپ کو اپنی جگہ پر ضرورت پوری ہوتی نظر نہ آئے تو باہر بھی جانا ضروری ہوگا تاکہ آپ دوسرے مقامات کے علماء سے اپنی علمی ضرورت کو پورا کر سکیں لیکن ان تمام ضرورتوں کے باوجود سفر کا معاملہ روایات پر نظر ڈالتے ہوئے کچھ ممنوع سا معلوم ہوتا ہے، اول تو مطلقاً سفر کو سامان مصیبت قرار دیا گیا ہے چنانچہ

السفر قطعة من العذاب يمنع احدكم

طعامه وشرابه ونومه فاذا قضی احدكم

نہمته فلیتعجل الی اہله.

سفر عذاب کا ایک ٹکڑا ہے جو کھانا، پینا اور سونا حرام کر دیتا ہے اس لئے جب بھی کوئی اپنی ضرورت پوری کر لے تو فوراً اپنے اہل میں واپس آجائے۔

سے اس کی ناپسندیدگی ظاہر ہو رہی ہے، پھر خصوصیت کیساتھ بحری سفر کا معاملہ اور بھی منحوش نظر آتا ہے، دیکھئے ابوداؤد میں بروایت ابن عمر یہ الفاظ منقول ہوئے ہیں۔

لا یوکب البحر الاحاج او معتمر
او غازی فی سبیل اللہ

سمندر میں حاجی، معتمر اور غازی فی سبیل اللہ کے
علاوہ اور کوئی سفر نہ کرے۔

ترمذی شریف میں حضرت عمرو بن العاص کی روایت بایں الفاظ مذکور ہے۔

ان تحت البحر ناراً
بلاشبہ سمندر کے نیچے آگ ہے

ان تمام روایات کے پیش نظر تحصیل علم کا سفر مشتبہ ہو رہا ہے، پھر دوسرا طریقہ سوچنے کا یہ ہے کہ عہد نبوی میں اور عہد صحابہ میں بھی تحصیل علم کے لئے سفر ہوا ہے یا نہیں، اگر نہیں ہوا بلکہ صحابہ اپنے اپنے مقام پر تحصیل علم فرماتے رہے ہیں، تو پھر ہمارے لئے اس کی اجازت اور دشوار ہو جاتی ہے، اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ حصول علم کے لئے باہر جانے کی اجازت ہے یا نہیں، پھر خشکی ہی کی اجازت ہے یا بحر کی بھی، نیز قریب ہی مقامات تک جاسکتا ہے یا دور کی بھی اجازت ہے، اس مقصد کیلئے امام بخاری نے ترجمہ رکھ دیا الخروج فی طلب العلم سفر قریب کا ہو یا بعید کا، خشکی کا ہو یا سمندر کا، علم کی ضرورت کا تقاضہ یہ ہے کہ جہاں تک ضرورت ہو وہاں تک جاؤ۔

اس کے لئے امام بخاری نے دو چیزوں سے استدلال کیا ہے۔ ایک تو عہد صحابہ سے نظیر پیش فرمادی کہ

حضرت جابر بن عبد اللہ نے حضرت عبد اللہ بن انیس سے ایک ایسی حدیث سننے کے لئے جو ان کے پاس بالواسطہ پہنچ چکی تھی ایک ماہ کا سفر فرمایا تا کہ ان کی سند عالی ہو جائے، حالانکہ اس دور میں مشکلات سفر کا آپ کو علم ہے، مسند احمد میں اس سفر کی تفصیل اس طرح مذکور ہے کہ حضرت جابر نے سفر کے لئے اونٹ خریدا اور اونٹ پر ایک ماہ سفر کر کے شام پہنچے، لوگوں سے مکان دریافت فرمایا، جا کر دستک دی، خادم آیا، فرمایا کہہ دو جابر بن عبد اللہ موجود ہیں، عبد اللہ ابن انیس تشریف لاتے ہیں، معانقہ ہوتا ہے وہ ٹھہرنے پر اصرار فرماتے ہیں لیکن جابر فرماتے ہیں کہ سفر کھوٹا نہیں کرتا حدیث سنا دو، یہی میرے سفر کا مقصد ہے میں اور کچھ نہیں چاہتا؛ چنانچہ یہ زمین پر گردن جھکائے مودب کھڑے رہتے ہیں اور حدیث سنتے ہیں اور فوراً واپس ہو جاتے ہیں، جب صرف علوسند کے لئے سفر کا جواز ہے تو اصل علم کی تحصیل تو اس سے کہیں زیادہ اہم ہے تو پھر اس کی خاطر سفر کے جواز میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، دور صحابہ میں تنہا یہی سفر نہیں بلکہ اس کے بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں، حضرت ابو ایوب انصاری نے حضرت عقبہ بن عامر سے صرف ایک حدیث کی خاطر مدینہ سے مصر تک سفر فرمایا جو ایک ماہ کی مسافت ہے، حضرت عبید اللہ بن عدی نے حضرت علی سے حدیث سننے کیلئے مدینہ طیبہ سے عراق کا سفر فرمایا جو ایک ماہ کی مسافت ہے، جب صحابہ کرام نے ایک حدیث کی خاطر اس قدر طول و طویل اسفار اختیار فرمائے تو معلوم ہوا کہ علمی ضرورت اور احتیاج کے لئے اس سے زیادہ اسفار کی بھی اجازت ہو سکتی ہے۔

امام بخاری کا دوسرا استدلال حدیث باب سے ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ علم ایسی نایاب دولت ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ سیکھنے کے بعد بھی بے نیازی کا اظہار نہیں کر سکتا، حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کمال علمی کے باوجود

جب یہ معلوم کرتے ہیں کہ خدا کا ایک بندہ مجھ سے زیادہ علم رکھتا ہے، تو اس سے ملاقات اور علم سیکھنے کے لئے راستہ پوچھتے ہیں ملاقات کے بعد انکی شرائط قبول کرتے ہیں کہ میں خاموش رہوں گا کچھ نہ پوچھوں گا صحابی اور آگے جلیل القدر پیغمبر کا سفر پیش کر کے امام بخاری نے بتلادیا کہ طلب علم کے لئے سفر صرف مطلوب ہی نہیں بلکہ ضروری ہے، روایت گزر چکی ہے۔

اب رہیں وہ روایات جن سے سفر کا ممنوع ہونا معلوم ہوتا ہے تو دراصل وہ خروج الی العلم سے مانع نہیں، پہلی روایت جس میں سفر کو قطعاً عذاب بتلایا گیا ہے خود سفر کی اجازت بتلاتی ہے کیونکہ اس میں ارشاد ہے کہ جب مقصد پورا ہو جائے تو واپس ہو جاؤ، جب دنیوی ضرورت سے سفر درست ہو تو دینی ضرورت تو اس سے کہیں اہم ہے، پھر قطعاً من العذاب تو اس حیثیت سے ہے کہ انسان گھر سے باہر نکلتا ہے تو سارے عیش و آرام ختم ہو جاتے ہیں، اہل و عیال اور اعزاء و رفقاء سے دوری ہو جاتی ہے، کھانے پینے کے اوقات بدل جاتے ہیں؛ اسلئے وہ گویا عذاب ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسکی اجازت نہیں ہے، اسی طرح حضرت عمر و ابن العاص کی روایت صرف صعوبت و مشقت بیان کرنے کے لئے ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ بحری سفر حرام ہے نیز حضرت ابن عمر کی وہ حدیث جس میں صیغہ حصر کے ساتھ بحری سفر کے مواقع بتلائے گئے ہیں وہ بھی اول تو قابل استدلال نہیں اور اگر اسے قابل استدلال قرار دیں تو مقصد یہ ہے کہ بغیر ضرورت کے بحری سفر نہ کیا جائے البتہ اگر ضرورت ہے جیسے تین ضرورتوں کا ذکر خود حدیث میں ہے یا کوئی اور ضرورت ہے جیسے طلب علم ہے یا تجارت ہے تو اس کی اجازت ہے۔

بہر حال امام بخاری نے عہد صحابہ کے ایک واقعہ سے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس سفر سے طلب علم کے لئے ہر طرح کے سفر کا جواز بلکہ استحباب و ضرورت کو ثابت کر دیا۔

واللہ اعلم

[۲۰] بَابُ فَضْلِ مَنْ عِلِمَ وَعَلِمَ

(۷۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَادُ بْنُ أَسَامَةَ عَنْ بُرَيْدِ بْنِ عَبْدِ اللَّهِ عَنْ أَبِي بُرَيْدَةَ عَنْ أَبِي مُوسَى عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَثَلُ مَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ مِنَ الْهُدَى وَالْعِلْمِ كَمَثَلِ الْغَيْثِ الْكَثِيرِ أَصَابَ أَرْضًا فَكَانَ مِنْهَا نَقِيَّةٌ قَبِلَتْ الْمَاءَ فَانْبَتَتِ الْكَلَاءُ وَالْعُشْبُ الْكَثِيرُ وَكَانَتْ مِنْهَا أَجَادِبُ أَمْسَكَتِ الْمَاءَ فَفَعَّ اللَّهُ بِهَا النَّاسَ فَشَرِبُوا وَسَقَوْا وَزَرَعُوا وَأَصَابَ مِنْهَا طَائِفَةٌ أُخْرَى إِنَّمَا هِيَ قَيْعَانٌ لَا تُمْسِكُ مَاءً أَوْ لَا تَنْبِتُ كَلَاءً فَذَلِكَ مَثَلُ مَنْ فَقَّهَ فِي دِينِ اللَّهِ وَنَفَعَهُ بِمَا بَعَثَنِي اللَّهُ بِهِ فَعِلِمَ وَعِلْمَ وَمَثَلُ مَنْ لَمْ يَرْفَعْ بِذَلِكَ رَأْسًا وَلَمْ يَقْبَلْ هُدَى اللَّهِ الَّذِي أُرْسِلْتُ بِهِ قَالَ أَبُو عَبْدِ اللَّهِ قَالَ إِسْحَقُ وَكَانَ مِنْهَا طَائِفَةٌ قَبِلَتْ

الماء قاع يغلوهُ الماء وَ الصَّفَصُفُ الْمُسْتَوِي مِنَ الْأَرْضِ .

ترجمہ | باب، اس شخص کی فضیلت جس نے علم سیکھا اور سکھلایا۔ حضرت ابو موسیٰ الاشعریؓ اس حضور ﷺ سے روایت کرتے ہیں، کہ آپ نے فرمایا اس چیز کی مثال جو مجھے اللہ نے ہدایت اور علم سے نواز کر بھیجا ہے اس بروقت اور زیادہ بارش کی ہے جو زمین پر اتری پس اس زمین میں سے ایک صاف زمین تھی جس نے پانی کو قبول کیا اور خشک و تر و سرسبز گھاسیں بہت اگائیں اور اسی میں سے دوسری زمین سخت تھی جس نے پانی روک لیا پس اللہ نے اس سے لوگوں کو نفع پہنچایا، انہوں نے وہ پانی پیا اور پلایا اور اپنی کھیتوں کو سیراب کیا اور وہ بارش ایک دوسری زمین پر اتری، جو چٹیل میدان تھی جو نہ پانی کو روکتی ہے اور نہ گھاس اگاتی ہے، یہ مثال ہے اس شخص کی جس نے اللہ کے دین میں سمجھ حاصل کی اور اسے ان چیزوں نے فائدہ دیا جنہیں دیکر اللہ نے مجھے بھیجا ہے پس اس نے علم حاصل کیا اور پھر دوسروں کو سکھلایا اور مثال ہے اس شخص کی جس نے سراٹھا کر توجہ بھی نہیں کی اور نہ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کیا جسے لیکر میں آیا ہوں، ابو عبد اللہ بخاری نے کہا کہ املح نے وکان منها طائفة قیل الماء کہا ہے قاع اس زمین کو کہتے ہیں جس پر پانی چڑھتا ہوا گزر جائے اور صفف برابر اور ہموار زمین ہے۔

مقصد ترجمہ اور تشریح حدیث | علم کی فضیلت کے ابواب تو آہی رہے ہیں، اب بخاری نے اس کے ساتھ دوسری شئی بھی شامل کر دی اور وہ یہ کہ سیکھنے کے بعد دوسروں کو بھی سکھاؤ، صرف سیکھنا بھی ایک کمال ہے لیکن اس کے ساتھ سکھلانا بھی جمع ہو جائے تو یہ شرف بالائے شرف ہو جاتا ہے، اس ترجمہ کا مقصد اس شخص کی فضیلت بیان کرنا ہے جو ان دونوں فضیلتوں کا جامع ہو کہ سیکھے اور سکھلائے اس تمثیل میں فعلم و علم کو سیاق مدح میں بیان فرمانے سے یہ صاف واضح ہو رہا ہے کہ عالم معلم، مجرد عالم کے مقابلہ میں افضل اور بہتر ہے اور یہی ترجمہ کا مقصد تھا، مثبت المدعی۔

رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خداوند قدوس نے جو ہدایت اور علم مجھے دیکر بھیجا ہے اس کی مثال ایسی سمجھو جیسی ضرورت کے وقت کی زوردار بارش جو زمین کے مختلف مقامات پر برسی، زمین کے بعض حصے صاف سترے اور پاکیزہ تھے جن میں پانی جذب کرنے کی صلاحیت تھی؛ چنانچہ انہوں نے پانی قبول کیا اور اسکے بعد خشک و تر اور سرسبز گھاسیں اگائیں، کچھ زمینیں ایسی ہیں جو ذی مسام تو نہیں ہیں کہ پانی کو جذب کر کے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور ثمرات کے ذریعہ دوسروں کو فائدہ پہنچائیں البتہ گہراؤ رکھتی ہیں کہ جس قدر پانی اس میں پہنچتا ہے اسے محفوظ رکھتی ہیں جس سے انسان اور حیوان فائدہ اٹھاتے ہیں، خود پیتے ہیں، جانوروں کو پلاتے ہیں اور کھیتیاں کرتے ہیں، اور تیسری زمین وہ ہے جس میں نہ انبات کی صلاحیت ہے اور نہ اس میں گڑھے ہیں کہ لوگوں کے نفع کے لئے پانی ادھر ادھر سے جمع ہو جائے، یہ ان لوگوں کے مثال ہے جنہوں نے دین سمجھا اور میری لائی ہوئی شریعت سے فائدہ اٹھایا اور ان لوگوں کی

جنہوں نے مڑ کر بھی اس طرف نہیں دیکھا اور نہ میری لائی ہوئی شریعت کو قبول کیا۔

مثال اور مثال لہ کی تطبیق | لیکن یہاں ایک اشکال رہ جاتا ہے کہ مثال اور مثال لہ میں مطابقت نہیں، مثال میں تین چیزیں ہیں اور مثال لہ میں دو، مثال میں فرمایا گیا ہے کہ زمین کی تین قسمیں

ہیں ایک وہ جو پانی چوس لے اور روئیدگی لائے، دوسری وہ زمین ہے جو پانی چوستی نہیں روکتی ہے اور تیسری زمین وہ ہے جو ان دونوں سے محروم ہے لیکن اسکے بالمقابل مثال لہ میں صرف دو چیزوں کا ذکر ہے ایک وہ جنہوں نے علم دین میں سمجھ حاصل کی خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچایا اور دوسرے وہ جنہوں نے توجہ بھی نہیں کی۔

اس اعتراض کی مختلف جوابات دیئے جاسکتے ہیں، اگر تقسیم ثلاثی قرار دیں تو مثال کی طرح مثال لہ میں بھی تین قسمیں بنالیں اور اگر تقسیم کو ثنائی قرار دیں تو مثال لہ کی طرح مثال کو بھی ثنائی بنالیں، زمین کی تین قسموں کی طرح مثال لہ کی بھی تین قسمیں اس طرح بنائی جاسکتی ہیں، ایک تو من فقہ فی دین اللہ دوسرے من نفعہ بما بعثنی اللہ بہ فعلم و علم اور تیسرے من لم یرفع بذلك راساً اس تثلیث کیلئے نفعہ سے قبل من موصولہ مقدر ماننا پڑا ہے اور ما قبل پر اسکا عطف کر دیا گیا ہے، ایسا کرنا قواعد کے خلاف نہیں ہے اور یہ ایسا ہے کہ جیسا حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے اس شعر میں۔

امن یہ جور رسول اللہ منکم و بمدحہ وینصرہ سواء

یمدح سے قبل من موصولہ مقدر ہے اور بقرینہ سابق اصل عبارت یوں ہے۔

امن یہ جور رسول اللہ منکم و من یمدحہ وینصرہ سواء

اب مثال اور مثال لہ میں مطابقت ہوگئی اس وقت فقہ کے معنی حامل الفقہ کے ہوں گے اور یہ اجادب کے مقابل ہوگا اور دوسری قسم جس میں علم و علم ہے پاکیزہ اور ذی مسام زمین کے مقابل ہوگا اور تیسری قسم تقابل کی ظاہر ہے ہی، رہی یہ بات کہ موصول کے حذف میں کوئی علمی لطیفہ تو ہونا ہی چاہئے تو اس کے حذف میں ایک لطیف اشارہ اس طرف ہو سکتا ہے کہ علم کی ان دونوں صورتوں میں نفع رسانی کا وصف مشترک ہے گو نوعیت انتفاع مختلف ہے جیسا کہ مثال میں دونوں زمینوں کا قابل انتفاع ہونا نہیں ایک سلسلہ میں پرودیتا ہے۔

جواب کی دوسری صورت یہ ہے کہ تقسیم کو ثنائی قرار دیں اور وہ ایسے کہ جس طرح مثال لہ میں دو چیزیں ہیں۔

ایسے ہی مثال میں صرف دو چیزوں کا اعتبار کریں جیسا کہ علامہ طیبی علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ حدیث میں صرف دو جانبوں کا ذکر ہے اعلیٰ فی الہدایۃ اور اعلیٰ فی الضلال ان کے مابین جو اور دو درجے ہیں ایک وہ کہ جس نے علم سے خود فائدہ اٹھایا مگر دوسروں کو فائدہ نہیں پہنچایا اور دوسرا وہ کہ جس نے اوروں کو تو نفع پہنچایا مگر خود اس سے محروم رہا،

۱۲۔ کیا وہ شخص جو تم میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جھوکتا ہے اور جو آپ کی تعریف و مدد کرتا ہے برابر ہو سکتے ہے۔

متروک ہیں، اعلیٰ فی الہدایت کو من فقہ کے عنوان سے اور اعلیٰ فی الضلال کو لم یرفع اہ کے عنوان سے ذکر فرما کر بطور عطف تفسیری فقہ کے بعد و نفعہ بما بعثنی اللہ اور لم یرفع بذالک راسا کے بعد ولم یقبل ہدی اللہ ذکر فرمایا جس سے جانہین کی مکمل تصویر سامنے آگئی کہ اعلیٰ درجہ کا ہدایت یاب تو وہ شخص ہوگا کہ جس نے علم حاصل کر کے خود اس کے مطابق عمل کیا ہو اور دوسروں کو ہدایت و عمل کا راستہ بتایا ہو اور انتہا درجہ میں گمراہ وہ شخص ہوگا کہ جس نے پیغمبر علیہ السلام کی لائی ہدایت کو قبول کرنا تو درکنار ازراہ تکبر اس طرف سر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا، پس جس طرح یہاں مثال لہ میں صرف دو چیزیں ہیں اسی طرح مثال میں بھی صرف دو چیزوں کا ذکر ہے، ایک نفع بخش زمین اور دوسرے بنجر اور ناقابل نفع، پھر جس طرح نفع بخش زمین کی دو صورتیں ہیں ایک وہ جو خود بھی نفع اٹھائے اور دوسروں کو بھی نفع پہنچائے اور دوسرے وہ جو صرف دوسروں کو نفع دے، اسی طرح ہدایت و فقہ والے انسانوں کی بھی دو صورتیں ہیں ایک وہ جو خود بھی نفع اٹھائیں اور دوسروں کو بھی نفع پہنچائیں، اور دوسرے وہ جو صرف دوسروں کو نفع پہنچائے اور خود نفع نہ اٹھائے لیکن اس ثنائی تقسیم کے بارے میں علامہ سندھی کا ارشاد سب سے اہم ہے۔

علامہ سندھی کا ارشاد | علامہ سندھی فرماتے ہیں کہ حدیث میں کمثل الغیث الکثیر اصاب ارضاً فرمایا گیا ہے یہاں ارضاً سے مراد ”ارضاً ہی محل الانتفاع“ ہے اور اس قید کو سماع کی فہم پر چھوڑ دیا گیا ہے کیونکہ تفصیل میں جن دو صورتوں کا ذکر ہے وہ قابل انتفاع ہیں اور آگے چل کر جس زمین سے تقابل کیا گیا ہے وہ ناقابل انتفاع ہے اسلئے یہاں صرف دو تقسیم ہوئیں۔ ایک ارضاً ہی محل الانتفاع اور دوسری انما ہی قیعان لا تمسک ماء ولا تبت کلاً ہے اس ارشاد پر اصاب منها کا عطف اصاب ارضاً پر ہوگا جو ابتداء کلام میں مذکور ہے اور کانت منها اجادب میں منها کی ضمیر کا مرجع مطلق ارض ہوگا جو بضمن ”اصاب ارضاً نقیہ“ مذکور ہے، ارض نقیہ اس کا مرجع نہ ہوگا کما ہو الظاہر، غرض بارش کی مثال دیکر جو زمین کی تقسیم ہوئی ہے وہ صرف دو قسموں پر شامل ہے ایک محل انتفاع اور دوسرے ناقابل انتفاع، پھر اس کے بعد محل انتفاع کو دو جانب تقسیم کر دیا گیا ہے، اس تقریر سے مثال اور مثال لہ کے درمیان تطبیق نہ ہونے کا اعتراض ختم ہو گیا۔

پس جس طرح مثال میں قابل انتفاع زمین پر برسنے والی بارش کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ زمین جو خود بھی مستفید ہو اور دوسروں کو بھی اس کے فوائد سے بہرہ اندوز ہونے دے اور دوسرے وہ جو خود تو نفع نہ اٹھائے لیکن دوسروں کے لئے نفع رسانی کا سامان بہم پہنچادے، اسی طرح ہدایت و علم والے انسانوں کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جو خود بھی نفع اٹھائیں کہ اس ہدایت اور علم کی بارش کو اول اپنے قلب میں جگہ دیں اور اس کے مطابق اپنے خیالات و اعتقادات کو درست اور مضبوط بنا کر عمل کے ثمرات اور نتائج سے خود کو مزین کریں اور دوسروں کو رشد و ہدایت کی راہ دکھلائیں اور دوسرے وہ جو خود تو نفع نہ اٹھائیں لیکن دوسروں کے لئے سامان ہدایت مہیا کریں کہ یہ بھی بمصداق الضلال علی

الخیر کفاعله فی الجملہ خیر میں شامل ہیں، اول مثال فقہاء امت کی ہے اور دوسری مثال محدثین کی ہے، مثال اور مثل لہ کے انطباق کی سلسلہ میں علامہ سندھی کا ارشاد آب زر سے لکھنے کے قابل ہے لیکن وجہ شبہ کے بیان میں مسامحت ہوگئی، فرماتے ہیں کہ وحی کے ذریعہ خداوند قدوس کے دیئے ہوئے علوم کو آپ نے بارش سے تشبیہ دی اس لئے کہ پاکیزگی اور صفائی ستھرائی میں، اسی طرح اوپر سے نیچے اترنے میں یہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں لیکن پاکیزگی اور اوپر سے نیچے اترنا کوئی اہم بات نہیں ایک ضمنی اور طردی بات ہے۔

وجہ شبہ میں سب سے عمدہ بات احیاء کی ہے کہ جس طرح عالم اسباب میں زمین کی زندگی اور موت کا تعلق پانی سے ہے بارش ہوگئی تو زمین کو نئی تازگی مل گئی، سرسبزی و شادابی چھا گئی، اسی طرح جب علوم کا فیضان قلوب پر ہوتا ہے تو انہیں نئی زندگی مل جاتی ہے۔

رہا ترجمہ و حدیث کا انطباق تو امام بخاری نے حدیث ذیل سے یہ بات واضح کر دی کہ جس طرح زمین کی سب سے عالی قسم وہ ہے جو خود بھی نفع اندوز ہو اور دوسروں کے لئے بھی نفع رسانی کا ذریعہ بنے، اسی طرح وہ عالم سب سے افضل ہے جو خود بھی علم کے ثمرات سے فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی نفع اٹھانے کی مواقع بہم پہنچائے۔

قال ابو عبد اللہ الخ امام فرماتے ہیں کہ اسحاق بن راہویہ کی روایت میں قبلت الماء کی جگہ قبلت الماء آیا ہے یہ قبل سے ہے اس پانی کو کہتے ہیں جو دوپہر کے وقت پیا جائے اور دوپہر میں پیاس زیادہ ہوتی ہے اس لئے مفہوم یہ ہوگا کہ زمین نے پانی زیادہ پیا۔

قاع یعلوہ الماء والصفصف المستوی من الارض حدیث میں جو قیغان مذکور ہے بخاری نے بتا دیا کہ یہ قاع کی جمع ہے اور قاع اس ہموار زمین کو کہتے ہیں جس پر پانی گزرتا ہوا نکل جائے پھر اس کی مناسبت سے قرآن عزیز میں جو قاعا صفا آیا ہے اس کی بھی تفسیر فرمادی کہ صفصف ہموار زمین کو کہتے ہیں جس میں نشیب و فراز کچھ نہ ہو، یہ بھی آپ کی ایک عادت ہے کہ ادنی ادنی مناسبت سے قرآنی الفاظ کی تفسیر کر جایا کرتے ہیں۔

حدیث میں کلاً اور عشب کے الفاظ مذکور ہیں کلاً عام ہے خشک نبات ہو یا تر، دونوں پر اس کا اطلاق آتا ہے

فائدہ کذا صرح بہ ابن الفارس والجوہری فی الصحاح والقاضی عیاض اس مقام پر صاحب فیض الباری کو سہو ہوا ان کے قلم سے یہ نکل گیا کہ عشب رطب اور کلاً دونوں کو شامل ہے حالانکہ عشب مخصوص بالرطب ہے جس طرح حشیش مختص بالیابس ہے حضرت شاہ صاحب کی طرف اس کا انتساب صحیح نہیں۔ واللہ اعلم

[۲۱] بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ

وَقَالَ رَبِيعَةُ لَا يَنْبَغِي لِأَحَدٍ عِنْدَهُ شَيْءٌ مِنَ الْعِلْمِ أَنْ يُضَيِّعَ نَفْسَهُ

(۸۰) حَدَّثَنَا عِمْرَانُ بْنُ مَيْسَرَةَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ أَبِي الثَّيَّاحِ عَنْ أَنَسٍ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِنَّ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يُرْفَعَ الْعِلْمُ وَيُنْفِكَ الْجَهْلُ وَتُشْرَبَ الْخَمْرُ وَيُظْهَرَ الزِّنَا.

(آئندہ: ۸۱، ۵۲۳۱، ۵۵۷۷، ۶۸۰۸)

ترجمہ | باب، علم کا اٹھایا جانا اور جہالت کا لوگوں میں ظاہر ہو جانا۔ ربیعہ الرائی کا ارشاد ہے کسی ایسے شخص کے لئے جس کے پاس علم کا کچھ بھی حصہ ہے یہ درست نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ضائع کر دے، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا، بیشک قیامت کے علامتوں میں سے یہ ہے کہ لوگوں میں سے علم اٹھالیا جائیگا اور جہالت جمادی جائیگی، شرابیں پی جائیں گی اور زنا پھیل جائے گا۔

مقصد ترجمہ | فضل من علم و علم کے بعد اس باب کا ذکر صاف بتا رہا ہے کہ یہاں مقصد تعلیم پر زور دینا ہے تاکہ اس ذریعہ سے علماء پیدا ہوتے رہے اور جہالت زور نہ پکڑ سکے، ورنہ قیامت قائم ہو جائے گی اور اسکی تمام ترمذی ان علماء پر رہے گی جنہوں نے باوجود استطاعت و قدرت علم پھیلانے کی سعی نہیں کی اور اپنے علم کو اپنے ساتھ قبروں میں مدفون کر دیا، یہ دنیا عالم اسباب ہے یہاں رہتے ہوئے اسباب سے صرف نظر نہیں کر سکتے قیامت آئیگی اور یقیناً آئے گی اور علم الہی میں اس کا وقت بھی معین ہے، لیکن اس فناء کلی کے اسباب ضرور ہیں جن سے بتدریج عالم فناء ہوتا رہیگا اور یہی فنا کی تدریجی رفتار بالآخر فناء کلی کا سبب بن جائے گی، اس لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ قیامت آئے گی کسی کے روکے سے رک نہیں سکتی پھر یہ خیال کرنا کہ تعلیم و تبلیغ ہوگی تو جہالت زور نہ پکڑ سکے گی جس کے بعد قیامت کا آنا یقینی ہو جائے گا، بے معنی سی بات ہے، جواب یہ ہے کہ ہمیں قیامت کا وقت نہیں بتلایا گیا ہے البتہ رفع علم اور ظہور جہل کو اس کی آمد کا پیش خیمہ فرمایا ہے تو ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے اختیار سے کوئی ایسا عمل نہ کریں جو قیامت لانے کا سبب بن جائے ورنہ سارا الزام ہم پر عائد ہوگا کہ تم نے تعلیم و تبلیغ میں کوتاہی کر کے قیامت کو دعوت دی خوب سمجھ لیں۔

قال ربیعہ: یہ ربیعہ بڑے فقیہ اور صاحب علم ہیں، امام مالک نے ان سے بہت کچھ حاصل کیا ہے ان کو ربیعہ الرائی کہا جاتا ہے یعنی اپنے وقت کے بڑے شیخ اور صاحب اجتہاد ہیں، سلف میں صاحب الرائی ہونا اعلیٰ درجہ کی مدح سمجھا جاتا ہے چنانچہ فقہاء کوفہ اہل الرائی کہلاتے تھے یعنی اہل اجتہاد و تفقہ، علماء امت میں ان کی فقاہت مسلم تھی افسوس کہ اس لفظ کو آج مذمت کا کلمہ قرار دیا گیا، والی اللہ المہشکی۔

ربیعہ فرماتے ہیں کسی ایسے شخص کے لئے جس کے پاس علم کا کچھ حصہ ہو یہ مناسب نہ ہوگا کہ اپنے آپ کو ضائع

لے رفع علم کے لئے ظہور جہل لازم ہے اس کے ذکر سے دراصل جہل کے مفاسد پر تشبیہ مقصود ہے کہ نیچے جہل، ضلال اور اضلال ہے اور اس سے جو جہالت اور بربادی عالم میں آئے گی وہ ظاہر ہے۔

کرے، علامہ عینی اور حافظ ابن حجر تھوڑے تھوڑے تغیر سے یہ فرما رہے ہیں کہ جس کے پاس فہم ہو، اسکو علم سمجھ لینا چاہئے ربیعہ کے قول میں جو شبی من العلم آیا تھا اسکی وضاحت ہوگئی کہ اس سے فہم مراد ہے، فہم والے کو اپنا ضائع کر دینا مناسب نہ ہوگا، علامہ عینی اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس باب میں علم سیکھنے کی طرف شوق دلایا گیا ہے کہ اگر متعلمین مناسب نہ ہوگا، علامہ عینی اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس باب میں علم کا رافع نہ ہوگا جو کہ قیام ساعۃ کی علامت ہے علم سیکھتے رہے اور اس طریقہ سے علماء پیدا ہوتے رہیں گے تو ظاہر ہے کہ علم بھی باقی رہے گا۔

وجہ یہ ہے کہ علم اٹھے گا علماء کے اٹھ جانے سے اور جب علماء پیدا ہوتے رہیں گے تو ظاہر ہے کہ علم بھی باقی رہے گا۔ مگر یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ شی من العلم کے یہ معنی کیسے اختیار کئے گئے، اسکے لئے علامہ عینی نے ارشاد فرمایا کہ آدمی دراصل دو طرح کے ہیں فہیم اور بلید، بلید تو خود ہی ضائع ہے اسلئے وہ تو قابل خطاب نہیں ہے البتہ فہیم سے خطاب متعلق ہے، اب اگر فہیم بھی اپنی صلاحیتیں برباد کر دیتا ہے اور طلب علم میں مشغول نہیں ہوتا تو علم کا ضائع ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے لیکن ربیعہ کے قول کے یہ معنی لینا مقصد باب سے صرف نظر کر لینا ہے۔

بے تکلف بات وہ ہے جسے علامہ عینی نے دوسرے نمبر پر ذکر فرمایا ہے کہ امام بخاری اس باب کے انعقاد سے تعلیم و تبلیغ پر زور دینا چاہتے ہیں یعنی اگر عالم تبلیغ و تعلیم کے فرائض انجام نہیں دیتا تو ایک طرف وہ علم پر ظلم کر رہا ہے کیونکہ اگر وہ انتقال کر گیا یا اس کے حافظہ سے یہ بات فراموش ہوگئی تو علم کا ایک بیش بہا ذخیرہ تلف ہو گیا، حافظ نے بھی اصل مقصد کے بعد بطور احتمال اس کا ذکر فرمایا ہے، بلکہ امام بخاری کا اس باب کو فضل من علم و علم کے بعد لانا بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے کہ امام تبلیغ و تعلیم کی جانب علماء کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور ربیعہ الراعی کا ارشاد بھی اس مقصد کے لئے ہے کہ جسے اللہ نے علم عطا فرمایا ہے اسے اپنا علم ضائع نہ کرنا چاہئے اور ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے اسباب اختیار کر لے جن سے اسکا علم محدود ہو کر رہ جائے کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو متاع علمی بتدریج کم ہوتی رہے گی اور بالآخر ختم ہو جائے گی جو قیامت کی علامت ہے حالانکہ علامات قیامت کا دفعیہ بقدر طاقت ہر عالم کا فرض ہے اور اس علامت کے رفع کرنے کی شکل یہ ہے کہ عالم اپنے علم کی توسیع و اشاعت کے لئے ہر ممکن جدوجہد فرمائے، حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز نے بھی ارشاد فرمایا کہ اشاعت نفس سے مراد علم کا چھپانا یا تبلیغ نہ کرنا ہے چنانچہ حضرت کا ارشاد بعینہ تراجم ابواب سے نقل کیا جاتا ہے، مؤلف کی غرض یہ ہے کہ رفع علم اور ظہور جہل علامت قیامت ہے جیسا کہ حدیثین مذکورین فی الباب میں مصرح موجود ہے شرائط ساعۃ کا انسداد اور ان سے احتراز ضروری ہے سورفع علم اور ظہور جہل کے انسداد اور اس سے احتراز کی یہی صورت ہے کہ تبلیغ و اشاعت علم میں سعی کی جائے کیونکہ ظہور جہل کی یہی صورت ہوگی کہ اہل علم ختم ہو جائیں اور جہال باقی رہ جاویں کماوروفی الحدیث۔

یہیں سے یہ بات بھی نکل آتی ہے کہ اگر عالم کسی ایسی جگہ پیدا ہوا ہے جہاں علم کی بے قدری ہے یا ایسے ماحول میں زندگی گزار رہا ہے جہاں اس کے علم کی پوچھ اور قدر نہیں تو اسے جگہ اور ماحول میں تبدیلی کرنی چاہئے تاکہ دوسری جگہ اس کے علوم سے فائدہ اٹھایا جاسکے جیسے خود علامہ عینی ہی ہیں، لیکن تاب نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے لیکن

علم کی توسیع کے لئے انہوں نے اپنا مستقر مصر کو بنایا، اسی طرح امام طحاوی طحاوہ سے مصر پہنچے، یا حضرت عبدالقادر جیلانی نے جیلان چھوڑ کر بغداد کو اپنے علوم کا مرکز بنایا، دنیا ان کے علوم سے فیضیاب ہوئی، دیہات میں پڑے رہتے تو انہیں کون پہچانتا اور ان کے علمی جواہرات کس طرح منظر عام پر آتے۔

اضاعتِ علم کے ایک معنی یہ بھی بیان کئے گئے ہیں کہ عالم کو اپنا مقام پہچاننا چاہئے، اگر کوئی عالم اپنا مقام نہیں پہچانتا بلکہ علم کو ذلیل کرتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے، جو عالم علم کے ذریعہ امراء اور اہل دنیا کا تقرب چاہتا ہے وہ خود بھی ذلیل ہوتا ہے اور علم کو بھی ذلیل کرتا ہے، اسی طرح عالم کا یہ کام ہے کہ وہ حق کے اظہار میں کسی کی پرواہ نہ کرے، اگر ایسا نہیں کرتا ہے تو وہ مد اہن فی الدین ہے، مشہور بات ہے۔

نعم الامیر علی باب الفقیر و بنس

امیر فقیر کے دروازہ پر اچھا لگتا ہے اور فقیر امیر کے دروازہ پر برا۔

الفقیر علی باب الامیر

بہر حال اس اضاعتِ علم کے مفہوم میں سب آسکتے ہیں مگر مقصد باب کے لحاظ سے معنی اول ہی مناسب ہیں یعنی علم کو چھپائے رکھنا اور تعلیم و تبلیغ نہ کرنا۔

تشریح حدیث | فرماتے ہیں کہ علم کا اٹھ جانا قیامت کے علامت ہے علم کے اٹھنے کی صورت یہ ہے کہ علماء اٹھائے جائیں اگر علماء پیدا ہوتے رہیں تو علم میں کمی نہیں آتی، ایک عالم اٹھے تو دوسرا اس کی جگہ سنبھال لے؛ لیکن فرماتے ہیں کہ جب علماء ختم ہو جائیں گے تو قیامت قریب ہو جائے گی اور علماء کے مناصب جہاں میں تقسیم ہونے لگیں گے حتیٰ کہ قاضی اور مفتی بھی جاہل ہوں گے، غلط فیصلے ہوں گے، غلط فتویٰ دیئے جائیں گے یہیں سے فتنہ فساد کا دروازہ کھل جائیگا اور دنیا تباہی کی طرف چل پڑے گی اور انجام کار قیامت پر یہ سلسلہ ختم ہوگا، دوسری حدیث کے ذیل میں اسکی تفصیل آرہی ہے۔

(۸۱) حَدَّثَنَا مُسَدُّ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى عَنْ شُعْبَةَ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ لِأَحَدٍ ثَنَكُم حَدِيثًا لَا يُحَدِّثُكُمْ أَحَدٌ بَعْدِي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ مِنْ أَشْرَاطِ السَّاعَةِ أَنْ يَقِلَّ الْعِلْمُ وَيَظْهَرَ الْجَهْلُ وَيَظْهَرَ الزَّوْنُ وَتَكْثُرُ النِّسَاءُ وَيَقِلَّ الرِّجَالُ حَتَّى يَكُونَ لِخَمْسِينَ امْرَأَةً الْقِيمُ الْوَاحِدُ .

(گذشتہ: ۸۰)

ترجمہ | حضرت انسؓ کا ارشاد ہے کہ میں تمہیں ایسی حدیث سنا تا ہوں جو میرے بعد تمہیں کوئی نہیں سنائے گا، میں نے رسول اکرم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہے کہ علم کم ہو جائے، جہالت زور پکڑ جائے اور زنا کا غلبہ ہو جائے عورتیں زیادہ ہو جائیں اور مرد کم ہو جائیں حتیٰ کہ چھاس چھاس عورتوں کے لئے ایک ہی نگرہاں ہو جائے۔

تشریح حدیث

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں ایک حدیث بیان کرنا چاہتا ہوں وہ حدیث تم صرف میری ہی زبان سے سن سکو گے میرے بعد اس کا سنانے والا کوئی نہیں ملے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت انسؓ اہل بصرہ سے خطاب فرما رہے ہیں اور بصرہ میں حضرت انسؓ کی وفات تمام اصحاب کرام کے بعد ہوئی ہے یعنی اب اور کوئی سنانے والا زندہ نہیں ہے یا موجودین میں کسی نے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ ارشاد نہ سنا ہو، بہر کیف حضرت انسؓ کا مقصد یہ ہے کہ جو چیز میں بیان کر رہا ہوں وہ نہایت اہم اور عظیم الشان ہے اس لئے اسے توجہ سے سنو اور اس کو منطوبی سے پکڑ لو۔

فرماتے ہیں کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا کہ علم کا کم ہو جانا یہ قیامت کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے سابق روایت میں رفع علم کو قیامت کی علامت بتلایا گیا ہے اور یہاں قلت علم کو، قلت علم اور رفع علم میں بظاہر تضاد ہے کہ قلت اس کے وجود کو ظاہر کرتا ہے اور رفع اسکے عدم کو، لیکن دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے کم ہونا ابتدائی مرحلہ ہے اور ختم ہونا آخری یعنی قیامت کے قرب میں آہستہ آہستہ علم کم ہونا شروع ہوگا اور بالآخر ختم ہو جائے اور علم ختم ہونے اور اٹھنے کی یہ صورت نہ ہوگی کہ اک دم سینوں سے نکال لیا جائے بلکہ علماء اٹھائے جائیں گے اور دوسرے علماء ان کی جگہ سنبھالنے والے نمل سکیں گے، نیز بقل، یعدم کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، اب ابتدائی اور آخری مراحل قرار دینے کی ضرورت نہیں۔

دوسری روایت میں جو نسائی کے حاشیہ پر ہے یکثر العلم فرمایا گیا ہے یعنی علم کی کثرت قیامت کی علامت ہے، اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ گننے کے لئے تو علماء کی تعداد بڑھ جائیگی لیکن خود علم کم ہوتا چلا جائیگا جیسا کہ ہم اس دور کا مشاہدہ کر رہے ہیں، کہ علماء کی بہتات ہے اور علم مفقود، اس کا نام کثرت قلت ہے، متنبی نے کہا

لا تکثر الاموات کثرة قلة
الا اذا شقیت بک الایماء

اسلئے دنیا میں علم کو باقی رکھنے کے لئے سلسلہ تعلیم کو مضبوط کیا جائے تاکہ ایک اٹھے تو دوسرا اس کا مقام سنبھال سکے، دوسری علامت یہ ہے کہ زنا کھل جائے گا اور اس میں کوئی باک نہ رہے گا، نبی اکرم ﷺ کے دور میں یہ چیز نہ ہونیکے درجہ میں تھی ایک آدھ کوئی واقعہ پیش آیا اور وہ بھی اس طرح کہ ارتکاب کے بعد فوراً مرتکب کو تنبیہ ہو اور اس نے دربار رسالت میں آکر جرم کا اقبال کیا اور اس پر قانون اسلامی کی رو سے حد جاری کر دی گئی لیکن قیامت کے قرب میں اسکی کثرت ہوگی، احادیث میں آتا ہے کہ یہ بے حیائی اس درجہ زور پکڑے گی کہ گلی کوچوں میں گدھوں کی طرح بے محابا زنا پھیل جائے گا، گدھے اس فعل میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے، یہی حال انسانوں کا ہوگا۔

تیسری علامت یہ کہ عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہو جائے گی، ایک تو عمومی طور پر عورتوں کی تعداد

انہیں زیادہ ہوتے ہیں مردے زیادہ ہونا مع قلت کے، مگر جب تیری طرف سے زندے بد بخت ہو جائیں، پہلے مصرعے کا مفہوم یہ ہے کہ اموات کی تعداد اگرچہ فی الواقع بہت زیادہ ہے مگر اے مدوح تیری نظر میں وہ زیادتی کچھ زیادتی نہیں کیونکہ تیری ہمت اور حوصلہ اس سے بدرجہا زائد کثرت کی متقاضی ہے۔ ۱۲

مردوں سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے ایک مرد کو چار عورتیں رکھنے کا حق ہے، اگر عورتیں کم یا مردوں کے برابر ہوتیں تو ایک مرد کو صرف ایک عورت کو رکھنے کا حق ہوتا لیکن قرب قیامت میں یہ تعداد اور بڑھ جائے گی اور اسکی وجہ یہ ہے کہ قرب قیامت میں زنا بہت ہوگا اور واقعات شاہد ہیں کہ زنا کر نیوالوہاں کے یہاں اولاد ذکر کم ہوتی ہے اور اسکی وجہ عقل کے اعتبار سے یہ ہے کہ جب اس شخص نے دوسرے لوگوں کی عزت و آبرو پر دست درازی کی ہے تو قدرت اس کے ساتھ یہی معاملہ کرتی ہے تاکہ وہ ان لڑکیوں کی تربیت اور حفاظت میں رہے اور اسے اپنی گزشتہ زندگی سے عبرت ہو، مردوں کی کمی کی دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ قرب قیامت میں فتنے اور لڑائیاں زیادہ ہونگی مرد کام آئیں گے اور عورتیں باقی رہ جائیں گی، عورتوں کی اس زیادتی کے متعلق یہ دونوں باتیں استبعاد کے دفعیہ کے لئے ہیں ورنہ اس تاویل کی قطعاً ضرورت نہیں بلکہ ان کی تعداد روز افزوں ہے، ارشاد فرمایا گیا کہ یہ تعداد اس درجہ بڑھے گی کہ ایک ایک مرد کی نگرانی میں پچاس پچاس عورتیں ہو جائیں گی، یہ مفہوم نہیں ہے کہ ایک مرد کے گھر میں پچاس پچاس عورتیں جائز و ناجائز طور پر جمع ہو جائیں گی بلکہ حدیث کے الفاظ اس طرح کے ہیں کہ پچاس کا ایک امین اور مصلح نگران ہوگا یعنی مردوں کی، اول تو کتنی کم ہوگی پھر انہیں اہل صلاح بالکل ہی کم ہوں گے حتیٰ کہ پچاس پچاس عورتوں کے لئے ایک ایک مرد نگران مل سکے گا۔

دونوں روایات کی علامتیں | دونوں حدیثوں میں جو علامات قیامت بیان فرمائی گئی ہیں انکی تعداد چار ہے، ایک علم کا فقدان، دوسرے شراب خوری، تیسرے زنا کاری، چوتھے عورتوں کی کثرت اور مردوں کی کمی، اور اگر دوسری روایات بھی ملا لیں جس میں فتنوں کا ذکر ہے تو یہ علامتیں پانچ ہو جاتی ہیں اور چونکہ یہ علامتیں الگ الگ نہیں ہیں بلکہ بصیغہ واؤ ہیں جو مطلق جمع کے لئے آتا ہے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جب یہ علامتیں جمع ہو جائیں تو سمجھو کہ قیامت قریب آگئی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ انہیں پانچ چیزوں کو علامات قیامت کیوں شمار کیا گیا، تو دراصل دنیا کے نظام کا تعلق پانچ چیزوں سے ہے، ایک دین، دوسرے عقل، تیسرے نسب، چوتھے مال اور پانچویں نفس جب یہ پانچوں چیزیں زوال پذیر ہونے لگیں جن سے نظام عالم استوار ہے تو سمجھو کہ قیامت نزدیک ہے اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ یہ علامتیں ان پانچوں میں کس کس کو متاثر کر رہی ہیں تو سب سے پہلی وہ چیز جس سے نظام کی استواری کا تعلق ہے دین ہے اور دین کا محافظ علم ہے، جب علم ختم ہونے لگے اور اس کی جگہ جہالت عام ہو جائے تو سمجھو کہ دین ختم ہو رہا ہے اس طرح علم کے فقدان سے نظام عالم کی استواری کا بڑا رکن اختتام پذیر ہے، نظام کے لئے دوسری ضرورت عقل کی ہے اور جب شراب کی کثرت ہوگی تو عقل کا مغلوب ہونا بالکل یقینی امر ہے، شراب کی مدہوشی میں عقل کہاں اس لئے شراب سے نظام عالم کا دوسرا رکن منہدم ہو جائے گا اور تیسری وہ چیز جو دنیا والوں کو بہت زیادہ عزیز ہے اور جس سے قبائل اور اقوام کا نظام استوار ہے نسب ہے اسی لئے اس کی بہت زیادہ حفاظت کی جاتی ہے، لیکن جب زنا کی کثرت ہوگی تو نسب کی حفاظت

قطعاً مشکل ہو جائے گی اور چوتھی چیز ہے مال اور پانچویں نفس جب قرب قیامت میں فتنوں کی کثرت ہوگی تو مال اور نفس دونوں کا اتلاف ہوگا، نظام عالم کی حفاظت انہیں چیزوں سے متعلق تھی اس لئے ان کے زوال سے عالم زوال پذیر ہو جائے گا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ مجموعہ قیامت کی علامت نہیں بلکہ الگ الگ بھی علامتیں ہیں اور ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ رفع العلم کو مستقل حیثیت حاصل ہے یعنی سب سے پہلی وہ علامت جو ظہور میں آئے گی علم کا رفع ہے اور پھر آہستہ آہستہ دوسری چیزیں ختم ہوں گی۔



الی هنا تم الجلد الأول من ایضاح البخاری ویتلوہ الجلد الثاني انشاء اللہ تعالیٰ
 واولہ باب فضل العلم